جدید ہندوستان

1885-1947

مصنف

سمت سرکار

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

جدید ہندوستان

1885-1947

مصنف

سمت سرکار

مترجم

ڈاکٹر مسعود ہاشمی

قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان

وزارت ترقی انسانی وسائل (حکومت ہند)

ویسٹ بلاک ۱، آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی۔110066

Jadeed Hindustan – 1885 - 1947

By : Sumit Sarkar

© قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

سنہ اشاعت : جنوری۔مارچ 2003 شک 1924

پہلا اڈیشن : 1100

قیمت : =/314

سلسلۂ مطبوعات : 1074

ناشر: ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 1، آر. کے. پورم، نئی دہلی 110066

طابع: لاہوتی پرنٹ ایڈس، جامع مسجد، دہلی 110006

پیش لفظ

انسان اور حیوان میں بنیادی فرق نطق اور شعور کا ہے۔ ان دو خداداد صلاحیتوں نے انسان کو نہ صرف اشرف المخلوقات کا درجہ دیا بلکہ اسے کائنات کے اُن اسرار و رموز سے بھی آشنا کیا جو اسے ذہنی اور روحانی ترقی کی معراج تک لے جاسکتے تھے۔ حیات و کائنات کے مخفی عوامل سے آگہی کا نام ہی علم ہے۔ علم کی دو اساسی شاخیں ہیں باطنی علوم اور ظاہری علوم۔ باطنی علوم کا تعلق انسان کی داخلی دنیا اور اس دنیا کی تہذیب و تطہیر سے رہا ہے۔ مقدس پیغمبروں کے علاوہ، خدارسیدہ بزرگوں، سچے صوفیوں اور سنتوں اور فکر رسا رکھنے والے شاعروں نے انسان کے باطن کو سنوارنے اور نکھارنے کے لیے جو کوششیں کی ہیں وہ سب اسی سلسلے کی مختلف کڑیاں ہیں۔ ظاہری علوم کا تعلق انسان کی خارجی دنیا اور اس کی تشکیل و تعمیر سے ہے۔ تاریخ اور فلسفہ، سیاست اور اقتصاد، سماج اور سائنس وغیرہ علم کے ایسے ہی شعبے ہیں۔ علوم داخلی ہوں یا خارجی اُن کے تحفظ و ترویج میں بنیادی کردار لفظ نے ادا کیا ہے۔ بولا ہوا لفظ ہو یا لکھا ہوا لفظ، ایک نسل سے دوسری نسل تک علم کی منتقلی کا سب سے موثر وسیلہ رہا ہے۔ لکھے ہوئے لفظ کی عمر بولے ہوئے لفظ سے زیادہ ہوتی ہے۔ اسی لیے انسان نے تحریر کا فن ایجاد کیا اور جب آگے چل کر چھپائی کا فن ایجاد ہوا تو لفظ کی زندگی اور اس کے حلقۂ اثر میں اور بھی اضافہ ہوگیا۔

کتابیں لفظوں کا ذخیرہ ہیں اور اسی نسبت سے مختلف علوم و فنون کا سرچشمہ۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کا بنیادی مقصد اردو میں اچھی کتابیں طبع کرنا اور انھیں کم سے کم قیمت پر علم و ادب کے شائقین تک پہنچانا ہے۔ اردو پورے ملک میں سمجھی جانے والی بولی جانے والی اور پڑھی جانے والی زبان ہے بلکہ اس کے سمجھنے، بولنے اور پڑھنے والے اب

ساری دنیا میں پھیل گئے ہیں۔ کونسل کی کوشش ہے کہ عوام اور خواص میں یکساں مقبول اس ہر دلعزیز زبان میں اچھی نصابی اور غیر نصابی کتابیں تیار کرائی جائیں اور انھیں بہتر سے بہتر انداز میں شائع کیا جائے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے کونسل نے مختلف النوع موضوعات پر طبع زاد کتابوں کے ساتھ ساتھ دوسری زبانوں کی معیاری کتابوں کے تراجم کی اشاعت پر بھی پوری توجہ صرف کی ہے۔

یہ امر ہمارے لیے موجب اطمینان ہے کہ ترقی اردو بیورو نے اور اپنی تشکیل کے بعد قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے مختلف علوم و فنون کی جو کتابیں شائع کیں ہیں، اردو قارئین نے ان کی بھرپور پذیرائی کی ہے۔ کونسل نے اب ایک مرتب پروگرام کے تحت بنیادی اہمیت کی کتابیں چھاپنے کا پروگرام شروع کیا ہے، یہ کتاب اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے جو امید ہے کہ ایک اہم علمی ضرورت کو پورا کرے گی۔

اہلِ علم سے میں یہ گزارش بھی کروں گا کہ اگر کتاب میں انھیں کوئی بات نادرست نظر آئے تو ہمیں لکھیں تاکہ جو خامی رہ گئی ہو وہ اگلی اشاعت میں دور کردی جائے۔

ڈاکٹر محمد حمیداللہ بھٹ
ڈائرکٹر
قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند، نئی دہلی

مشمولات

باب ایک

تعارف

	صفحہ نمبر
تبدیلی اور تسلسل	17
قدیم اور جدید زاویہ ہائے نگاہ	20

باب دو

1885-1905: سیاسی اور معاشی ڈھانچہ

سامراجی ڈھانچہ اور پالیسیاں	28
وائسرائی رویے	29
خارجہ پالیسی	30
فوج	32
مالیاتی اور انتظامی دباؤ	33
لوکل سیلف گورنمنٹ اور کونسل کی اصلاح	35
لڑاؤ اور حکومت کرو	36
گوری نسل پرستی	38
نوآبادیاتی معیشت	40
دولت کا بہاؤ	41
صنعتی تباہی	45
زراعت کی تجارت کاری	47
زمین سے متعلق روابط	50
زرعی پیداوار	53
غیر ملکی سرمایہ	54
ہندوستان کی سرمایہ جاتی ترقی	56

باب تین

1885-1905: سماجی اور سیاسی تحریکیں 60

نچلی سطح سے تاریخ، کی طرف

قبائلی تحریکیں 61

بھڑکے 65

موپلا 66

دکن کے بلوے 68

پبنا (پابنا) 68

لگان میں اضافے کے خلاف تحریکیں 70

ذات پات کا شعور 72

فرقہ واریت 77

محنت کش طبقہ 79

تاجر گروپ اور اعلا طبقے

تاجر گروپ 81

راجے مہاراجے اور زمیندار 82

متوسط طبقوں کا شعور اور سیاست

دانشور طبقے کی سماجی اساس 84

ہندو اصلاح اور احیاء پسندی 89

ہندوستانی اسلام کے رجحانات 95

ادب میں وطن پرستی 101

قوم پرستانہ معاشی نظریہ 105

کانگریس کی اساس 107

اعتدال پسند کانگریس: مقاصد اور طریقۂ کار 108

اعتدال پسندانہ سیاست کے مراحل 112

انتہا پسندی کی جڑیں 115

باب چار

1905-1917: سیاسی اور سماجی تحریکیں

کرزن کی وائسرائیت 121
خارجہ پالیسی 121
انتظامی اصلاحات 122
کرزن اور قوم پرست رہنما 125
تقسیم بنگال 126
1905-1908: بنگال میں سودیشی تحریک 132
رجحانات 133
بائیکاٹ اور سودیشی تحریک 136
قومی تعلیم 138
محنت کش طبقے میں بے چینی 139
سمیتیاں 140
ہندو مسلم روابط 142
دہشت پسندی کی طرف جھکاؤ 144
1905-1908: دوسرے صوبوں میں انتہا پسندی 146
پنجاب 147
مدراس 151
مہاراشٹر 154
کانگریس کی تقسیم 157

1909-1914: جبر واستبداد، مصالحت نیز لڑاؤ اور حکومت کرو

مارلے اور منٹو 160
شملہ وفد اور مسلم لیگ 163
انقلابی دہشت پسندی 167

جنگ اور ہندوستانی سیاست 169

انقلابی سرگرمیاں 169
اتحاد لکھنؤ 173
ہوم رول ایجی ٹیشن 174

1905-1917: نچلی سطح کے لوگوں کی تحریکیں 177

قبائلی بغاوتیں 177
کسان تحریکیں 178
فرقہ واریت 180
ذات پات 181
علاقائی جذبات اور زبانیں 186

باب پانچ

1917-1927: عوامی قوم پرستی -- ظہور اور مسائل

جنگ، اصلاحات اور سماج

مونٹفورڈ اصلاحات 189
جنگ کے اثرات 192

مہاتما گاندھی 202

گاندھی کی کشش 202
افواہوں کی کارفرمائی 206

چمپارن، کھیڑا، احمد آباد 207

رولٹ ستیہ گرہ 212

1919-1920: رہنما اور عوام

گاندھی، خلافت اور کانگریس 219

نچلی سطحوں کا دباؤ 224

1921-1922: عدم تعاون اور خلافت 229

کل ہند تحریک 229

سماجی بناوٹ 231

علاقائی عدم یکسانیت 235

چوری چورا 251

1922-1927: زوال اور تقسیم 253

تبدیلی مخالف گروپ اور سوراجی گروپ 254

ناگ پور، بارساڈ اور ویکم 255

تعمیراتی کام 257

سوراجی سیاست 259

فرقہ واریت 261

1922-1927: نئی قوتوں کا ظہور 265

سیاسی اور معاشی تناؤ 265

قبائلی اور کسان تحریکیں 268

ذات پات کی تحریکیں 271

مزدور طبقہ 273

کمیونسٹوں کا ظہور 276

انقلابی دہشت پسندی 280

سبھاش اور جواہر لال 282

باب چھ

1928-1937: قوم پرستانہ پیش قدمی اور معاشی کساد بازاری

ایک طائرانہ نظر 283

سیاسی اتھل پتھل 283

کساد بازاری اور ہندوستان 286

1928-1929: سائمن کا بائیکاٹ اور محنت کش طبقے میں ابال

سائمن کمیشن اور نہرو رپورٹ 291

نوجوانوں کی تحریکیں 296

ہندوستان سوشلسٹ ری پبلکن آرمی (HSRA) 298

محنت کش طبقے میں ہل چل اور کمیونسٹ رہنما 300

کسان تحریکیں اور باردولی 305

کاروباری طبقے کا رویہ 310

ڈومنی ان درجے سے مکمل سوراج تک 312

1930-31: سول نافرمانی تحریک

نمک ستیہ گرہ 315

چٹا گانگ، پشاور، شولاپور 318

سول نافرمانی کے مرحلے 320

علاقائی سطح کے تجزیے 327

گول میز کانفرنس 339

گاندھی۔اروِن معاہدہ 341

مارچ، دسمبر 1931: پر طوفان خاموشی

ابہامات 342

نچلی سطح کا دباؤ 345

سرکاری رویہ 349

34-1932 سول نافرمانی کی دوسری تحریک

استبداد اور مزاحمت 352
تاجر طبقے کی نئی صف بندی 356
ہری جن مہم 359
کونسلی سیاست کی طرف مراجعت 362
اشتراکی متبادل 363

37-1935: آئین اور کانگریس

1935 کا ایکٹ 368
محنت کشوں اور کسانوں کی تحریک 370
ادب میں اشتراکیت 374
لکھنؤ اور فیض پور 375
رجعت پسندوں کا استحکام اور تجارتی حلقوں کا دباؤ 376

باب سات

سیاسی تحریکیں اور جنگ

39-1937: کانگریسی وزارتیں

انتخابات اور وزارت سازی 381
کانگریس اور افسر شاہی 383
فرقہ وارانہ مسئلہ 384
گاندھیائی اصلاحات 389
سرمایہ دار طبقہ اور کانگریس 390
کانگریس اور محنت کش طبقہ 393
کانگریس اور کسان 395
ریاستوں میں عوامی تحریک 398
کانگریس کے اندر بایاں گروپ 402
تری پوری کا بحران 404

1932-42: جنگ اور ہندوستان کی سیاست..... پہلا مرحلہ

سرکار کی جوابی کارروائی 408
مسلم لیگ اور پاکستان 410
کانگریس کے اندر رجحانات 413
معاشی عواقب 416
جنگ کا نیا مرحلہ 417
کرپس مشن 418

1942-45: ہندوستان چھوڑو تحریک۔ قحط اور جنگ کا آخری مرحلہ

سرکشی کا سرچشمہ 421
کل ہند وضع 427
سماجی بناوٹ 430
علاقائی فرق 432

جنگ اور ہندوستانی معیشت

قحط اور غیر معمولی (زاید) منافع خوری 439
مسلم لیگ کا عروج 442
آزاد ہند فوج 444
کیمونسٹ اور عوام کی جنگ 446

باب آٹھ

1945-47: آزادی اور ملک کی تقسیم 449

1945-46: آتش فشاں کا سرِ آغاز

گفت و شنید کی تمہید 450
شملہ کانفرنس 451
آزاد ہند فوج مقدمہ 453
بحری فوج میں بغاوت 459

مارچ۔اگست،1946: کیبنٹ مشن

انتخابات	462
کیبنٹ مشن	464

1946-47: فرقہ وارانہ تباہ کاری اور کسان بغاوت

کلکتہ، نوا کھالی، بہار، پنجاب	468
گاندھی کے بہترین لمحات	473
تبھاگا	476
پناپرا۔۔ویالار	478
تلنگانہ	479
1947: آزادی اور ملک کی تقسیم	483
ماؤنٹ بیٹن کا منصوبہ	484
ریاستوں کا الحاق	487
پندرہ اگست	490
اشاریہ	493

پیش لفظ

جدید ہندوستان 1947-1885 کا منصوبہ دراصل چند سال قبل چھ جلدی تاریخ ہند کی تدوین کی اجتماعی کوشش کے ایک حصہ کے طور پر تیار کیا گیا تھا۔ اب چونکہ یہ کتاب ایک جداگانہ کاوش کے طور پر شائع کی جا رہی ہے، اس کے نقطۂ آغاز کی مختصر توجیہ ضروری معلوم ہوتی ہے۔ یوں تو 1885 کا انتخاب محض سہولت کے لیے کیا گیا ہے تاہم یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ جدید ہندوستان کے خدوخال مغلیہ عہد کے زوال یا پلاسی کی جنگ کی بجائے 19ویں صدی کے نصف آخر کے دوران واضح ہونا شروع ہوئے تھے۔ انیسویں صدی کے نصف آخر کی انھیں دہائیوں کے دوران ہی، نو آبادیاتی سیاسی و معاشی تسلط کو واضح استحکام حاصل ہوا اور عوامی تحریکوں نیز کل ہند سطح پر "متوسط" اور روشن خیال طبقے کی قوم پرستی کی شکل میں اس نو آبادیاتی تسلط کے لیے چیلنج بھی پیدا ہونا شروع ہو گیا تھا، اس کتاب میں میں نے جس دور کا جائزہ لیا ہے وہ حصول آزادی تک سامنے آنے والے اسی طرح کے تضادات سے عبارت ہے۔

اس کاوش میں دو مقاصد کو مد نظر رکھا گیا ہے۔ ان اعداد و شمار کے درمیان امتزاج قائم کرنے کی کوشش کی گئی ہے جو کہ سیاسی، سماجی اور اقتصادی تاریخ کے مخصوص مسائل کے موضوع پر تالیف کیے گئے مختلف رسالوں (Monographs) کے ذریعے حال ہی میں ایک سیلاب کی طرح سامنے آئے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی اس کتاب میں تحقیقی دلچسپیوں کی روشنی میں "سماج کی نچلی سطح سے تاریخ نگاری" کے امکانات کا پتہ لگانے کی بھی کوشش کی گئی ہے۔ سماج کی نچلی سطح پر مبنی تاریخ نگاری کی یہ کوشش ہندوستان کی قومی تحریک کی تاریخ نگاری کے اب تک کے اس عام رجحان سے قطعی مختلف ہے جس میں ساری توجہ محض رہنماؤں کی سرگرمیوں، ان کے افکار و تصورات اور گروہی جوڑ توڑ پر ہی مرکوز رکھی جاتی ہے۔

حال کے برسوں میں "جدید ہندوستان" کے موضوع پر کی گئی زبردست تحقیقی کاوشوں سے صرف نظر کر کے اس کتاب کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اس کتاب کے فارمیٹ کی وجہ سے راست اقتباسات کے ماسوا، باقی حوالوں کی پانوشت (فٹ نوٹ) کے ذریعے نشان دہی کرنا ممکن نہیں تھا۔ تاہم میں نے کتاب کے آخر میں 'Further readings' کی باب وار فہرست کی شکل میں احساس ممنونیت کے بوجھ کو ہلکا کرنے کی کوشش کی ہے۔

میں یہاں جدید ہندوستانی تاریخ کے اپنے ان طلباء کے تئیں اظہار تشکر کرنا چاہوں گا جن کے وسیلے سے میں یہاں برسوں سے پروان چڑھنے والے تصورات کی آزمائش کرتا آیا ہوں۔ ان طلبائے عزیز کے سوالات اور ان کی تنقیدیں میری فکر مولا سازیوں کے لیے ناگزیر رہی ہیں۔

میں 'برن ڈے'، اشوک سین، امیہ باگچی اور گیان پانڈے کا بھی شکر گزار ہوں کہ ان حضرات نے جزوی یا کلی طور پر اس کتاب کے مسودے پر تنقیدی نظر ڈالی اور اپنی رائے اور مشوروں سے نوازا۔ مجھے 1977 میں برکلن میں رنجیت گوہا کے ساتھ رات بھر کا وہ تبادلہ خیال بھی انبساط اور احساس امتنان کے ساتھ بخوبی یاد ہے جس کے نتیجے میں ترمیم واصلاح کا موقع ایک ایسے وقت میں ملا تھا جب کہ میں نے اس کتاب کے لیے مواد جمع کرنا شروع ہی کیا تھا۔ ان کا سلسلۂ مضامین 'The Subaltern Studies' بد قسمتی سے مجھ تک اس وقت پہونچا جبکہ اس کتاب کا مسودہ طباعت کی غرض سے پریس بھیجا جا چکا تھا۔

میرے والد مکرم نے اس کتاب کی تصنیف پر پوری دلچسپی کے ساتھ نظر رکھی مگر مجھے اس بات کا ہمیشہ قلق رہے گا کہ میں اپنی اس کاوش کو ان کی زندگی میں مکمل نہیں کر سکا۔ تانیکا ہمیشہ کی ہی طرح لامتناہی تنقید کے ساتھ ساتھ تقویت کا بھی وسیلہ بنی رہیں۔ البتہ آدیپنے انبساط آمیز فکری انتشار پیدا کرتے رہنے میں کوئی کسر باقی نہیں رکھی۔

میں اپنے ناشرین کا بھی شکریہ ادا کرنا چاہوں گا جنھوں نے مجھ جیسے کاہل مصنف سے بھی کتاب کا مسودہ مکمل کرالیا اور ٹائپنگ اور تدوین کے سلسلے میں ناگزیر مدد فراہم کی۔

اغلاط کی ذمہ داری صرف مجھ پر ہے

سمت سرکار　　　　دہلی یونیورسٹی

اکتوبر 1982

باب ایک

تعارف

تبدیلی اور تسلسل

1885 میں انڈین نیشنل کانگریس کے قیام اور اگست 1947 میں حصول آزادی کے درمیان کا تقریباً ساٹھ سال کا زمانہ ہندوستان کی طویل تاریخ میں زبردست تبدیلیوں کا دور ثابت ہوا۔ یہ تبدیلیاں کئی لحاظ سے نامکمل رہنے کے باوجود بھی اس تجزیے کا ایک مناسب نقطہ آغاز ثابت ہو سکتی ہیں۔

کانگریس کی تشکیل سے محض آٹھ سال پہلے، بدترین قحط سالی کے پس منظر میں ایک پر شکوہ درباری جشن کے ساتھ ہندوستان کو باقاعدہ طریقے پر تاج برطانیہ کے زیر نگیں کر دینے کا اعلان کیا گیا تھا، گویا 1885 میں بھی انگریز اس فریب میں مبتلا تھے کہ ہندوستان میں ان کے اقتدار کا سورج کبھی غروب نہیں ہوگا۔ اس کے ساتھ ہی ہندوستانیوں کو یہ باور کرانے کی بھی کوشش کی جارہی تھی کہ انگریز تو یہاں محض امین (امانت دار) کا رول ادا کر کے ہندوستانیوں کو اپنی حکومت کے لیے تیار کر رہے ہیں جبکہ حقیقت یہ تھی کہ برطانوی راج ناگزیر طور پر ایک جابرانہ اور گوروں کا راج تھا جس میں سیاسی فیصلے اور حکومت چلانے کا سارا اختیار یوروپیوں کے ہاتھوں میں تھا۔ 1880 کی دہائی میں انڈین سول سروس کی کل 900 آسامیوں میں 16 کے علاوہ باقی سب پر یوروپی ہی فائز تھے۔ 1861 میں مٹھی بھر ہندوستانی صوبائی کاؤنسلوں اور سپریم کاؤنسل میں شامل کیے گئے تھے مگر اس طرح کہ سپریم کاؤنسل کے ان نامزد ہندوستانی ممبروں کے اختیارات کافی حد تک کم کر دیے گئے تھے۔ رپن (Ripon) کے بھاری بھرکم دعوؤں کے ساتھ شروع کی گئی لوکل سیلف گورنمنٹ کی حیثیت بھی ایک ایسے مالیاتی بندوبست بھر تھی جو کہ مالیات کو غیر مرکزی بنانے کے لیے ناگزیر ہو گیا تھا۔ اس سلسلے میں فنانس ممبر ایولین بارنگ (Evelyn Baring) کی یہ شہادت آج بھی موجود ہے کہ ''ہم بنگالی بابو کو اس کے اسکولوں اور نالیوں کے سلسلے میں بحث کی اجازت دے کر مملکت برطانیہ کو تباہ نہیں ہونے دیں گے۔'' بری فوج (آرمی) جیسے اہم شعبے کے دروازے بھی ہندوستانیوں پر بند تھے۔ 1947 تک کوئی بھی ہندوستانی بریگیڈیر کے درجے سے اوپر ترقی نہیں پا سکتا تھا۔

ہندوستان جیسے ایک بڑے ملک کے روزمرہ کے امور کی انجام دہی کے لیے مقامی اہل کار انگریزوں کے لیے ناگزیر تھے۔ انگریزوں کی خود اعتمادی کو سب سے زیادہ تقویت اس بات سے ملی

کہ انھیں یہ اہل کار کافی آسانی سے دستیاب تھے۔ 1857 کے بعد کے برسوں میں راجوں، نوابوں، زمینداروں اور دوسرے سرکردہ لوگوں کے ساتھ انگریزوں کے روابط کی نہ صرف یہ کہ تجدید ہوئی بلکہ ان میں مضبوطی بھی آئی۔ بالخصوص چھوٹی بڑی 662 ریاستوں کے حکمراں تو آخر تک انگریزوں کے سب سے زیادہ وفادار رہے۔ یہ درست ہے کہ میکالے (Macavlay) نے ایسے جس انگریزی تعلیم یافتہ طبقے کا تصور کیا تھا جو رنگ روپ (نسل) کے اعتبار سے ہندوستانی اور فکروذوق کے اعتبار سے گورا ہو، وہ بھی 1880 کی دہائی کے آتے آتے خود کو نامطمئن محسوس کرنے لگا تھا۔ تاہم متوسط طبقے کی جو آرزو مندی کلکتہ، ممبئی، پونا اور مدراس میں صوبائی سطح کی انجمنوں کی شکل اختیار کر چکی تھی، اور جسے انڈین نیشنل کانگریس کی شکل میں ایک وسیلہ اظہار مل گیا تھا، وہ ہیجان کی کیفیت سے آگے نہیں بڑھ سکی تھی۔ ایک اور غدر سے بچنے کی خاطر کانگریس کو سرکاری سرپرستی میں لینے کے لیے ہیوم کی اپیلوں کو ڈفرن (Dufferin) نے یہ کہہ کر بڑی حقارت سے ٹھکرا دیا تھا کہ "وہ (ہیوم) زیرک بھی ہے اور شریف النفس بھی مگر اسے شاید کچھ خبط سا ہو گیا ہے"۔

1888 میں وائسرائے نے کانگریس کو محض مٹھی بھر لوگوں کی جماعت بتایا تھا اور سر جان اسٹریچی (Strachey) نے کیمبرج کے طلباء کو یہ یقین دلانے کی بھرپور کوشش کی تھی کہ ......" نہ تو اس وقت ہی ہندوستان نام کا کوئی ملک ہے اور نہ ہی پہلے کبھی تھا...... ہندوستانی قوم...... ہندوستانی عوام نام کی بھی کبھی کوئی چیز نہیں رہی ہے جس کا کہ ان دنوں کافی چرچا ہے" اور یہ کہ ......"پنجاب، بنگال، شمالی مغربی صوبوں اور مدراس کے لوگ کبھی یہ بھی سوچ سکتے ہیں کہ وہ ایک عظیم ہندوستانی قوم کے فرد ہیں، ایسا ناممکن ہے۔" انگریزوں کے اس طرح کے بیانات میں پروپیگنڈے کے عنصر کو یقیناً نظر انداز کر دینا چاہیے مگر واقعہ یہ ہے کہ 1880ء کی دہائی میں اس طرح کی باتیں اتنی غیر حقیقی بھی نہیں معلوم ہوتی تھیں۔ کل ہند سطح کے روابط ابھی تک انگریزی تعلیم یافتہ اعلا طبقوں اور ان سے وابستہ پیشہ ور گروپوں تک ہی محدود تھے۔ کانگریس اپنے سالانہ اجلاسوں کی قرار دادوں کی شکل میں جو مطالبے انتہائی خاکسارانہ انداز میں پیش کرتی آ رہی تھی ان کی بازگشت ابھی تک ملک کے کروڑوں کی دیہی آبادی، خصوصاً کسانوں میں پیدا نہیں ہو سکی تھی۔ باوجودیکہ یہ مطالبے سرمایہ دارانہ آزاد معیشت کے فارمولے پر مبنی ہوتے تھے میں (جو کہ قوم پرستی کی نشوونما کے سلسلے میں اعتدال پسند لیڈروں کی جدوجہد کا بھی ایک نتیجہ ہے) مگر اس وقت ملک میں جو متوسط بورژوائی طبقہ ابھر رہا تھا، اس کا ردِ عمل بھی بہت معمولی تھا..... مشرقی بنگال میں مسلم دہقانوں اور ہندو امراء کے درمیان؛ مالابار علاقے میں مسلم موپلا کاشت کاروں نیز اونچی ذات کے (نائر، نمبودری) ہندو زمینداروں کے درمیان؛ صوبہ جات متحدہ کے کچھ علاقوں میں مسلم زمینداروں اور ہندو لگان داروں کے درمیان؛ اسی طرح پنجاب میں ہندو مہاجنوں اور ساہوکاروں

نیز مسلم یا سکھ دہقانوں کے درمیان ٹکراؤ پیدا ہو چکا تھا۔

ان تمام باتوں کے باوجود قومی تحریک کا دائرہ اعلا اور دانشور طبقوں تک ہی محدود نہ رہ کر، بڑی تیزی سے پھیلتا چلا گیا، چنانچہ 1936 میں صدر کانگریس کا یہ دعوا بالکل درست تھا کہ اب کانگریس ملک کے عوام کی سب سے بڑی تنظیم ہے۔ان عام لوگوں میں زیادہ تر دیہی عوام تھے جن میں کروڑوں دہقانوں اور کسانوں کے دوش بدوش صنعتی شعبے کے لوگ اور دوسرے کارکن بھی شامل تھے۔ چنانچہ یہ تحریک مختلف مرحلوں سے گزرتی ہوئی، جغرافیائی اور سماجی، دونوں ہی لحاظ سے بڑی تیزی سے پھیلتی گئی، 8-1905، 1919، 1922، 1934-1928، 1942، 46-1945 کانگریس کے پھیلاؤ اور اس کی طاقت کے لحاظ سے بہت اہم مرحلے ثابت ہوئے۔ابتدا پسندانہ مرحلے میں بنگال، مہاراشٹر اور پنجاب کو مرکزیت حاصل رہی، جبکہ گاندھیائی قیادت کے مرحلے میں گجرات، بہار اور یوپی جیسے نئے علاقے کانگریس کی سرگرمیوں کا مرکز رہے۔اسی طرح محدود شہری دانشور طبقے کی جگہ پر اب چھوٹے شہروں اور قصبوں کے نچلے متوسط طبقوں، دہقانوں اور بااثر بورژوائی گروپوں نے نمایاں حیثیت حاصل کر لی تھی۔اس کے ساتھ ہی سودیشی، بائیکاٹ، تحملانہ بائیکاٹ، گاندھیائی ستیہ گرہ، گاؤں میں تعمیری کام جیسی کئی نئی چیزوں کا بھی ارتقا ہوا۔ان کے علاوہ 'انقلابی دہشت گردی'، 'ہڑتال' شہری، دیہی قبائلی تشدد، جیسے کچھ نئے طریقے اور نئی اصطلاحیں بھی وجود میں آئیں جو کہ تحریک کے رہنماؤں کے نزدیک غلط یا ناپسندیدہ ہونے کے باوجود بھی اپنے اپنے وقت میں کافی اہم ثابت ہوئیں۔1930 کی دہائی میں "کسان سبھائیں"، اور مزدور تنظیمیں ملک کے بہت سے حصوں میں بڑی تیزی سے حقیقی طاقت کی شکل اختیار کر چکی تھیں۔بہت سے رجواڑوں میں بھی عوامی تحریکیں سر ابھار رہی تھیں۔راہ کی دشواریوں، رکاوٹوں اور تضادات کے باوجود بھی یہ سب باتیں اس تاریخ ساز حقیقت کی غماز تھیں کہ اب ملک کے عوام بڑی تیزی سے سرگرم سیاسی زندگی میں شریک ہو رہے تھے۔حالانکہ پانچ سال قبل ہی برطانوی وزیراعظم کا یہ اعلان تھا کہ "وہ اتنے بڑے عہدے پر برطانوی مملکت کے خاتمے کی کارروائی کی صدارت کرنے کے لیے فائز نہیں ہوا ہے۔" مگر بین الاقوامی حالات میں تبدیلی اور عوام کے زبردست دباؤ نے انگریزوں کو ہندوستان چھوڑ دینے پر مجبور کر دیا۔ فوراً بعد ہی رجواڑوں کا بھی خاتمہ ہو گیا۔زمینداری توڑ دی گئی اور برصغیر کے اس بڑے حصے میں عام رائے دہی پر مبنی جمہوری نظام قائم ہوا۔اس اثناء میں زبردست سماجی تبدیلی کا عمل بھی جاری رہا جس کے نتیجے میں کئی دہقانی گروپ ابھرے اور متوسط شہری طبقے کو بھی استحکام حاصل ہوا۔ تاہم پوری تحریک باہم متصادم رجحانات سے بھی عبارت رہی، تسلسل کے ساتھ ساتھ تبدیلی کا عمل بھی جاری رہا۔کانگریس کی ساری لڑائی 'راج' کے خلاف رہی تھی مگر وہ خود بھی بتدریج 'راج' میں تبدیل ہوتی چلی گئی جس

کے نتیجے میں اس نے انگریزوں کی تیار کردہ افسر شاہی، فوجی ڈھانچے اور دوسری دنیا کی چیز سمجھی جانے والی سول سروس کو من و عن اختیار کر لیا۔ گویا کہ سب کچھ پہلے ہی جیسا رہا۔ بس اتنا ہی فرق تھا کہ گوروں کی جگہ پر ہندوستانی آ گئے تھے۔ یوم آزادی بھی ان گنت تضادات کے ساتھ منایا گیا، جہاں ایک طرف عوام کی خوشیاں منانے کے مناظر تھے تو دوسری طرف لارڈ ماؤنٹ بیٹن پوری ملوکانہ شان و شوکت کے ساتھ 1930 کی دہائی کے ایک شعلہ بیان انقلابی لیڈر کو وزارت عظمٰی کا حلف دلا رہے تھے جب کہ دوسری طرف بابائے قوم تھے جن کا یہ کہنا تھا کہ ان کے پاس دینے کے لیے اب کوئی پیغام نہیں ہے اور جنہیں اپنی زندگی کے چند آخری ماہ فرقہ وارانہ تشدد کے خلاف تن تنہا مایوس کن جدوجہد میں بتانے پڑے تھے۔ فسادات اور تقسیم ملک کو قومی تحریک کے آدرشوں کے نقطہ نظر سے دو بڑی ناکامیوں سے موسوم کیا جا سکتا ہے۔ اس سے بھی زیادہ بنیادی بات یہ ہے کہ قومی تحریک کے دوران لوگوں کے دلوں میں جو بہت سی آرزوئیں جگادی گئی تھیں، اُن میں بیشتر تشنہ تکمیل ہی رہیں۔ گاندھی جی کا دکھایا ہوا 'رام راجیہ' کا خواب اور بائیں بازو کے سماجی انقلاب کے آدرش محض خواب اور آدرش ہی رہے۔ جیسا کہ آزاد ہندوستان، پاکستان (اور بنگلہ دیش) کی تاریخ ہمیں بتاتی ہے، 1947 میں اقتدار کی منتقلی سے نہ تو متوسط طبقے کا کایا پلٹ ہوئی اور نہ ہی سرمایہ دارانہ ترقی کے مسائل ہی حل ہوئے۔

اس لحاظ سے ہمارا سارا زور اس مبہم اور متضاد رویے کے اصل اسباب کی تلاش پر ہونا چاہیے جس میں جدید ہندوستان میں سامراج مخالف تحریکوں کی پیچیدہ اور تضادات سے پُر تاریخ مرکزی نقطے کی حیثیت رکھتی ہے۔ البتہ ابتدائیہ کے طور پر، اس موضوع کے سلسلے میں دستیاب تاریخی مواد کی موجودہ نوعیت پر ایک طائرانہ نظر بھی ضروری ہے۔

قدیم اور جدید زاویہ ہائے نگاہ

ہماری قومی تحریک کے سلسلے میں حال ہی میں تفصیلی مطالعات کا جو سیلاب سا آ گیا ہے اس کے مدنظر برطانوی راج کے آخری ساٹھ برسوں کی عام تاریخ لکھنا پہلے سے کہیں زیادہ ہیجان انگیز اور مشکل ہو گیا ہے۔ تقریباً ایک دہائی قبل تک اس سلسلے میں دستیاب سارا لٹریچر دانشوراؤں کے مطالعات، آئین کی نشو و نما سے متعلق کام، ہندوستانی رہنماؤں کے سوانح، اور خود ان کی اپنی تحریروں نیز قوم پرستی کی نشو و نما سے متعلق کل ہند جائزوں تک ہی محدود تھا۔ زیادہ تر جائزے ثانوی درجے کے شائع شدہ ماخذات پر ہی مبنی ہوتے تھے، کیونکہ محض حال کے زمانے تک ہی سرکاری ریکارڈ تک رسائی ممکن تھی اور نجی نوعیت کے مقالات کی تیاری کے لیے تلاش و جستجو کا کام زیادہ منظم اور سائنٹیفک طریقے پر نہیں ہو پاتا تھا۔ چرولی (Chirol) سیتار میا، تاراچند یا

آر سی مجمدار جیسے مورخوں کے زاویۂ نگاہ میں بھاری اختلاف ہونے کے باوجود بھی کہیں نہ کہیں نقطۂ اتفاق بھی تھا۔ چنانچہ ان سبھی کے نزدیک بنیادی خاکہ انگریزی تعلیم یافتہ اس طبقے کا تھا جو برطانوی راج کے زیر سایہ پروان چڑھا تھا، جو نشاۃ ثانیہ کی سرگرمیوں میں ملوث تھااور جسنے بالآخر اپنے آقاؤں سے برگشتہ ہوکر جدید قوم پرستی کو جنم دیا تھا،اس طبقے نے ایسایاتو خود غرضانہ آرزوؤں کی تکمیل نہ ہونے کی وجہ سے یامغربی تہذیب سے ماخوذ وطن پرستی اور جمہوری آدرشوں کی وجہ سے یاپھر غیر ملکی اقتدار کے خلاف فطری بغاوت کی وجہ سے کیا تھا۔ گویاکہ سارادارومدار تاریخ نولیس کے اپنے منفرد زاویہ نظر پر ہی ہوتا تھا۔ چنانچہ سامراجی اثرات کے حامل مورخین کا سارا زور ہندوستانی معاشرے کی تقسیم در تقسیم ،گاندھی کے زیر قیادت کانگریس کی محدود اور غیر مستقل اپیل، مسلمانوں کی علاحدگی پسندی اور ملک کی تقسیم پر رہتا تھاجبکہ قوم پرست مورخین کے نزدیک عوام کی پیش قدمی متاثر کن بھی تھی اور فطری بھی!کیونکہ تمام ہندوستانیوں کے مفادات لازمی طور پر غیر ملکی اقتدار سے متصادم تھے،اگر کمی تھی تو ایک کرشمہ ساز رہنما کی تھی۔ تاریخ نولیس کے اس طرح کے رجحان کی وجہ سے قومی تحریک سے متعلق قوم پرستانہ تحریریں ناکافی رہیں۔پیشہ ور مورخ اس طرح کے موضوعات سے 1950 کی دہائی تک دامن کش رہے تھے(ان مورخین نے اپنی وطن پرستی کے اظہار کے لیے مغل اقتدار کے خلاف راجپوتوں اور مراٹھوں کی تحریکوں کو ایک محفوظ اور ترجیحی وسیلے کے طور پر استعمال کیا) جبکہ علاقائی اور فرقہ وارانہ نوعیت کے معاملات کو توڑمروڑ کر پیش کرنے کا رجحان ہمیشہ غالب رہا۔ مثال کے طور پر آر۔ سی مجمدار کی مرتبہ قومی تحریک کی طویل تاریخ میں تعلیم یافتہ بنگالی ہندوؤں کے ایک حلقے کو دو قومی نظریہ کا حامی دکھایا گیا ہے۔ ہندوستان کے عہد وسطیٰ کی تاریخ کی بعض کتابوں میں ہندوؤں اور مسلمانوں کو دو ایسے ہم جنس گروہوں کے طور پر پیش کیا جاتا رہا ہے جو ایک دوسرے کی مخالفت کے لیے ہی پیدا کیے گئے ہیں۔ موجودہ زمانے کی فرقہ وارانہ جانب داری بھی اس کی ایک واضح مثال ہے۔ قوم پرستانہ زاویۂ نگاہ سے لکھی جانے والی تاریخی کتب میں بھی، قوم یا عوام کے اجمالی تذکرے میں طبقہ اولیٰ کا غلبہ در آیا ہے بلکہ چیدہ چیدہ لیڈروں کے سلسلے میں کافی مبالغے سے کام لیا گیا۔ جہاں تک قومی تحریک کی سماجی معاشی اساس اور اس کے پہلوؤں کا تعلق ہے، سامراجی مورخین کا اس طرح کے موضوعات سے صرف نظر کر جانا ایک فطری امر تھا، مگر قوم پرست مورخین کا وطیرہ بھی کچھ زیادہ اچھا نہیں رہا۔ لیکن ان میں سے چند کے ماسوا بیشتر نے جدید ہندوستان کی تاریخ کو بلکہ نارو جی، دت کی نسل کے قوم پرست ماہرین معاشیات کی تحقیقات کو بھی اپنی تاویلات سے ہم آہنگ کرنے کی بہت کم کوشش کی۔ ہمارے اپنے عہد کے سلسلے میں آر۔پی دت جیسے ابتدائی مارکسی مورخین، بلکہ ایم،این، رائے ،اے آر ڈیسائی اور چند سوویت مورخین کی سنجیدہ تحقیقات کے عوام گریز ہونے یا نو

آبادیاتی ڈھانچے کو نظر انداز کردینے کاالزام نہیں لگایا جاسکتا۔ مگر یہ مورخین کوئی مکمل اطمینان بخش متبادل نہیں پیش کرسکے۔ کیونکہ ان لوگوں نے اپنے طبقاتی تجزیوں میں نہ صرف یہ کہ بہت زیادہ عمومیت پسندی(Generalisation) سے کام لیا بلکہ بعض اوقات اس سلسلے میں میکانکی طریقے بھی بروئے کار لائے۔

محافظ خانوں میں بند دستاویزات کے اب زیادہ استعمال، تحقیقی مقالات کی نجی طور پر تیاری، نیز موقع پر مطالعے کے ذریعے حاصل ہونے والی معلومات اور ان کے ماخذات کی بدولت آج ہمارا یہ موضوع، خواہ بظاہر ہر سہی بالکل نیا چولا اختیار کرچکا ہے۔ اب آثار قدیمہ کے سرکاری محکموں کے دروازے عالموں کے لیے کھولے جاچکے ہیں، اور نئی دہلی کی نہرو میوزیم لائبریری جیسے مقامات پر بہت ہی اہم مقالے تیار کیے گئے ہیں اور موقع پر مطالعہ کرنے اور انٹرویو کی اہمیت بھی اجاگر ہوچکی ہے۔ بہر حال اس معاملے میں جدید فرضیہ (Hypothesis) کا بھی بہت اہم رول ہے۔ فرضیہ اگرچہ ہمیشہ متنازعہ رہنے کے ساتھ ساتھ بسااوقات مبہم بھی معلوم ہوتا ہے، لیکن اس کے باوجود بھی ہمیشہ تحریک بھی دیتا رہتا ہے اور اس معاملے میں نام نہاد کیمبرج مکتب فکر (School)کافی زرخیز ثابت ہوا ہے۔ ابتدائی دور کی ہندوستانی قوم پرستی کے موضوع پر انل سیل (Anil Seal)، بنگال کے سلسلے میں امریکی مورخ بروم فیلڈ اور ایک حد تک گاندھیائی فکر کے عروج کے موضوع پر جوڈتھ براؤن کے مطالعات سے قوم پرستی کی تاویل غیر مساویانہ ترقی اور ذات پات پر مبنی بین صوبائی مقابلہ آرائی کے تناظر میں پیش کرنے کا چلن پیدا ہوا۔ مزید یہ مفروضہ کہ قوم پرستی دراصل تنگ نظری اور خود غرضی پر مبنی مادی اغراض کی معقولیت کاری (Rationalisation) کا ہی دوسرا نام ہے برطانوی راج کے بعض ترجمانوں نیز ولنٹائین چرول(Valentine Chirol) جیسے سامراجی مورخین کے پیش کردہ مفروضے سے مختلف نہیں تھا۔ بہر حال 1973ء میں کافی زور و شور کے ساتھ کیمبرج مکتب فکر کا یہ اعلان سامنے آیا کہ اب اشرافی طریقہ کار (Elite Approach) کے لیے تاریخ نویسی میں کوئی جگہ نہیں رہی ہے اور یہ کہ اب تاریخ نویس کو صوبے اور طبقہ اشرافیہ کی جگہ پر زیر مطالعہ مقام اور گروہوں کو مرکز توجہ بنانا ہوگا۔ چونکہ انگریزوں نے ہندوستانیوں کی کمر پر بوجھ بڑھادینے کے ساتھ ساتھ آئینی اصلاحات کے پردے میں اپنے لیے نئے معاونین کار پیدا کرنے کی بھی کوشش جاری رکھی تھی۔ اس لیے انتظامی امور کے دباؤ اور مواقع کی نوعیت سے اس بات کی وضاحت کی جاسکے گی کہ مقامی آقاؤں اور ان کے حاشیہ برداروں کا باہمی ربط وضبط صوبائی اور قومی پلیٹ فارموں کی شکل اختیار کرتا گیا تھا۔ Wash brook اور Baker کے ذریعے جنوبی ہند کے سلسلے میں، Bayly کے ذریعے الہ آباد کے سلسلے میں اور Gordon Johnson کے ذریعے ممبئی کے انتہاپسندوں اور

اعتدال پسندوں کے سلسلے میں اور یوپی کے مسلمانوں کے سلسلے میںRobinson کے ذریعے اس طریقہ کار کا اطلاق نئے اعداد و شمار کے نقطہ نظر سے یقیناً کافی نتیجہ خیز ثابت ہوا۔

بہر حال کیمبرج مکتبِ فکر کے ابتدائی طریقہ کار اور اس ترمیم شدہ طریقہ کار کے درمیان کئی لحاظ سے اب بھی تسلسل موجود ہے۔ Bayly کے استثناء کے ساتھ یہ کہا جا سکتا ہے کہ آزادی کے آدرش اور قومی تحریک، خاص طور پر قوم پرستانہ ترغیب کو غیر اہم بنا کر پیش کرنے کا رجحان عام طور پر اب بھی موجود ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ اس طرح کے رویے سے اس ہیرو پرستی کی کسی قدر اصلاح ہوئی جو کہ قوم پرست تاریخ نگاروں کی خصوصیت رہی تھی۔ بہر حال متعینہ آدرشوں اور بعض خود غرضانہ مقاصد کے درمیان خط امتیاز قائم کرنا بہت ضروری ہے۔ بنکم چندرا کے قوم پرستانہ ناولوں کا محرک روزگار رہا ہو یا نہ رہا ہو۔ مگر ان ناولوں کا مجموعی تاثر ایک تاریخی حقیقت ہے۔ مگر اس سے بھی زیادہ اہم بات یہ ہے کہ نو آبادیاتی دور میں معاشی اور نسلی پہلو اس طرح ایک دوسرے میں مدغم تھے کہ ان کی انفرادی شناخت مشکل تھی۔ Washbrook کے تجزیے کے مطابق جنوبی ہند میں دیہی علاقوں کے دیہی آقا ہر لحاظ سے نوآبادیاتی سیاست و معیشت کی ہی پیداوار تھے۔ اس سلسلے میں یہ بیان کہ "مدراس کے گورنر اور اس کے حواریوں نے سیاسی نظام کے باقی ماندہ فوائد کی بندر بانٹ مچا رکھی تھی"، حیرت انگیز طریقے پر اس حقیقت سے ٹکراتا ہے کہ بیسویں صدی کے اوائل میں وائسرائے کے پاس 700 خدام کی فوج ہوتی تھی اور تنخواہ برطانیہ کے وزیر اعظم کی تنخواہ سے دوگناہ تھی یا یہاں تک کہ 1930 کی دہائی میں بھی جیسا کہ گاندھی جی نے بھ ڈانڈی مارچ کے موقع پر لارڈ اروِن کے گوش گزار کرنے کی کوشش کی تھی، وائسرائے کی تنخواہ ایک اوسط ہندوستانی کی تنخواہ سے پانچ ہزار گنا تھی، جبکہ بنگال کا ایک گورا جونیر جیل گورنر Hijli میں سیاسی قیدیوں کو گولی سے اڑا دینے کے فوراً بعد اپنی تعطیل بڑی آسانی سے پوری دنیا کی سیاحت میں بتا سکتا تھا۔ مقامی آقاؤں اور ان کے حاشیہ برداروں پر مشتمل جس نئے ماڈل کا بھی ذکر کیا گیا ہے، اس میں اس وقت مزید توسیع کا احساس ہوتا ہے جب اس کا اطلاق الہ آباد کے ٹنڈن تجارتی گروپ کے ساتھ مالویہ کے اواسط نیز مشرقی بنگال میں ہندو زمینداروں اور مسلم دہقانوں کے آپسی تعلقات کی نوعیت کے سلسلے میں کیا جاتا ہے۔ کیمبرج مکتبِ فکر کے علماء سیاسیات کا موازنہ گروپ بندی کے ساتھ کرنے کے سلسلے میں Namier کے ذریعے اٹھارویں صدی کے وسط کے انگلینڈ کی تاریخ نگاری کو اپنا ماڈل بناتے ہیں۔ اشرافی سیاست نیز بنیاد پرستانہکشید گیوں والے ادوار پر روشنی ڈالنے کے سلسلے میں یہ طریقہ کار اس وقت اپنی افادیت کھو دیتا ہے جب بڑے عوامی گروپوں کے درمیان تصادم کا تجزیہ کرنے کا سوال پیدا ہوتا ہے۔ Namier کے طریقہ کار میں اہم تحریکوں اور ادوار سے سرسری طور پر گریز جانے یا انہیں بالکل ہی نظر انداز کر دینے کے

رجحان کا احساس ہوتا ہے۔ چنانچہ الہ آباد کے سلسلے میں Bayly کا تجزیہ، جو کہ بصورت دیگر کافی گراں قدر ثابت ہو سکتا تھا۔ 1920 پر اچانک ہی اختتام پذیر ہو جاتا ہے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ تاریخی تجزیوں میں اصل مقام کو ہی مرکزیت حاصل ہو جانے کے باوجود بھی طبقہ اولیٰ کو ہی اصل اہمیت حاصل رہنے کا امکان بدرجہ اتم موجود رہتا ہے۔ Washbrook کے مطابق تحریک کے رہنماؤں کا تجزیہ کرتے پوری احتیاط سے کام لینا ضروری ہے، کیونکہ تحریک کے بیشتر اسباب کی نشان دہی ان رہنماؤں کے اپنے اپنے مقاصد کی شکل میں بھی کی جا سکتی ہے۔ پچھلے کچھ عرصہ سے ایسا محسوس ہونے لگا ہے کہ Washbrook اور Baker، Bayly جیسے مورخ بھی اپنے تجزیوں میں مقامی آقاؤں اور ان کے طفیلیوں کو مرکزی حیثیت نہ دے کر براہ راست طور پر اقتصادی تاریخ پر توجہ مرکوز کرنے لگے ہیں۔

گذشتہ ایک دہائی میں ہندوستانی اور غیر ملکی مورخین نے کافی اہم تحقیقی کام کیا ہے۔ اگر اس گراں قدر کام کو کیمبرج مکتبِ فکر کے ان مورخین کے ذریعے جو کہ بدنامی کی حد تک شہرت یافتہ ہیں۔ دھندھلا کرنے کی اجازت دی گئی تو یہ بدقسمتی کی بات ہوگی D.A. Law سے وابستہ Sussex اور Canberra کے بعض مورخ فرضیہ (Hypothesis) کے معاملے میں زیادہ سائنٹفک یا زرخیز ثابت نہیں ہوئے، مگر اپنے تصورات کے معاملے میں کافی کشادہ ذہن رہے ہیں۔ رولٹ (Rowlalt) ستیہ گرہ، اور حال ہی میں کانگریس اور راج کے موضوع پر جو مقالات تیار کیے گئے ہیں ان میں عوامی سورش کے ادوار کا تجزیہ بلا جھجک طریقے پر کیا گیا ہے۔ اس کے مقابلے میں کسان تحریکوں کا ذکر کافی فخر و احترام کے ساتھ کیا گیا ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ ہر بااثر دیہی گروپوں یا حمول کسانوں کے رول کے بارے میں برتی گئی تعمیم (generalasation) قابل قبول ہو بھی سکتی ہے اور نہیں بھی۔ شاہی فیصلہ سازی کے تجزیے کا اب فیشن نہیں رہا ہے۔ مگر یہاں پر ملوکیت کی بابت برطانوی لیبر پارٹی کے رویے کے موضوع پر بی ایس گپتا کی تحقیق، وفاقی تجربے کے نشیب و فراز کے بارے میں آر۔ جے۔ مور (Moore) کی تصنیف نیز دو عملی نظام حکومت (Dyarchy) کی تشکیل کے موضوع پر (Peter Robb) کے کام کا تذکرہ ضروری ہے۔ آریہ سماج، نیز پنجاب کی قوم پرستی، جنوبی ہند میں ذات پات اور برادری کی سیاست، بہار کی دیہی تحریکوں کے بارے میں امریکی مورخین کی کاوشیں، خاص طور پر حال ہی میں کانگریس کے ابتدائی دور سے متعلق جے۔ آر میک لین (Mclwne) کی تحقیق بہت اہمیت رکھتی ہے۔ مسلمانوں کے سماجی اور سیاسی رجحانات سے متعلق جو متعدد تجزیے منظر شہود پر آئے ہیں ان میں اسلامی جدت پسند کے موضوع پر عزیز احمد کی کاوش دیوبندی مکتبِ فکر کے بارے میں ضیاء الحسن فاروقی کی تحقیق Peter Hardy کا ایک عمومی تجزیہ نیز مشیر الحسن، رفیع الدین احمد، اور Gail

Minualt کی حالیہ تصنیفات قابلِ ذکر ہیں۔ سامراج مخالف تحریکوں کو کم اہم بنا کر پیش کرنے کی کیمبرج مکتبِ فکر کی کوششوں پر ہندوستان کے مارکسی مورخوں کا محض ردعمل ہی سامنے آیا بلکہ ان مارکسی مورخین نے ایک ایسا موقف بھی اختیار کیا جسے روایتی قوم پرستی سے ممیز کرنا مشکل تھا۔ قومی قیادت کی بابت فرقہ وارانہ رویے اور ناواجب منفی قیاسات (جو کہ آر۔ پی۔ دت اور کچھ سوویت مورخین کی خصوصیت رہی ہے) کی جگہ ہیرو پرستی (تلک، گاندھی، نہرو) نے لے لی۔ تاہم مارکسی مورخین نے اعتدال پسندانہ معاشی نظریے، نیز بنگال اور آسام کی سیاسی تحریکوں کا بھی تفصیل سے جائزہ لیا اور بائیں بازو کی تحریکوں کے بارے میں بھی کافی مواد چھوڑا۔ اس کے علاوہ مارکسی اور غیر مارکسی یعنی دونوں ہی مکتبِ فکر کے مورخین اب اپنی توجہ بڑی تیزی سے گاؤں کی سطح کے اعداد و شمار پر مبنی عام لوگوں کے مطالعے پر مرکوز کرتے جارہے ہیں۔ ڈیوڈ ہارڈین، حامد صدیقی، کپل کمار، گیان پانڈے، اسٹیفن ہینن گم، اور مہیش سانیال جیسے مورخ اب گجرات کے پٹی داروں، یوپی کے کسانوں، بہار کے دہقانوں نیز بنگال کے کچھ حصوں میں دیہی گاندھیائی تحریکوں کا بھی جائزہ لینے لگے ہیں۔ اس طرح کے مطالعات کے نتیجے میں اس بات پر زور دیا جانے لگا ہے کہ تاریخ نویسی کا سلسلہ سماج کے نچلے طبقوں سے شروع کیا جانا چاہیے۔ یہ طریقہ کار تاریخ نویسی کے اشرافی طریقہ کار سے قطعی مختلف ہے۔

اس طرح کے فیلڈ ورک کا ایک فائدہ یہ ہے کہ اس طرح تاریخ نویس کا واسطہ سماجیات اور سماجی بشریات جیسے دوسرے علوم کے ساتھ بھی قائم ہو جاتا ہے، جس کے نتیجے میں اس باہمی تفاعل کو بھی یقیناً بڑھاوا ملتا ہے جس کا اس ملک میں ابھی تک فقدان رہا ہے۔ ہندوستان میں علم بشریات حال تک محض قبائلی زندگی کے مطالعے تک ہی محدود تھا۔ پھر یہ کہ 1950 کی دہائی سے ذات برادری کے بنیادی ڈھانچوں، تحریکوں اور تنظیموں کے مطالعے کا فیشن سا ہو گیا۔ اگرچہ اس طرح کے تحقیقی مطالعوں کے ذریعے حاصل اعداد و شمار کو نظر انداز کر دینا جدید تاریخ نویسوں کے لیے ممکن نہیں ہے مگر ان کے لیے Andre Beteille کی اس وارننگ کو ذہن نشیں رکھنا ضروری ہے کہ، ذات برادری پر مبنی سرگرمیوں کے پسِ پشت کبھی کبھی محض اعلا طبقات کے ہی مقاصد کار فرما ہوتے ہیں۔

Rudolph کی مشہور تصنیف Modernity of Tradition پر تبصرہ کرتے ہوئے Beteille نے یہ بھی کہا تھا کہ ماہر سماجیات کے لیے یہ یقیناً ایک حیرت انگیز بات ہوگی کہ ذات پات کا مطالعہ تو اتنی تفصیل کے ساتھ کیا جاتا رہا مگر دیہی علاقوں کی تحریکوں اور تنظیموں پر اتنی توجہ نہیں دی گئی۔

بدقسمتی سے ہندوستان میں سماجی تاریخ کے تئیں اب بھی مدھم تو بھی سے کام کیا جارہا ہے

اور یہ کہ اکثر سماجی اصلاحات کی کوششوں کے مطالعے کو ہی سماجی تاریخ نگاری سمجھ لیا جاتا ہے۔ طبقات کی تشکیل اور طبقاتی شعور کے سلسلے میں جو کام ہو رہا ہے وہ محض ابتداء ہے۔ اگرچہ مقامی بولیوں میں ادب کا ارتقاء جدید ہندوستان کی تاریخ کے لحاظ سے کافی اہمیت رکھتا ہے، مگر یہ واقعہ ہے کہ اس طرح کی چیزوں کی سائنٹفک، تاریخی یا سماجیاتی تحقیق و مطالعے کی سمت میں کوئی پیش رفت نہیں ہو رہی ہے۔ ایک ایسے ملک میں جس کی بیشتر آبادی ناخواندہ ہو، تحریری ادب سے محض ایک بہت ہی چھوٹے طبقے کے افکار و اقدار کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ حال ہی میں ایک فرانسیسی مورخ نے دیہی آبادی کے ذہن میں جھانکنے کے لیے اندرونی دیہی علاقوں کے لوگوں کے ناچ گانوں، کہاوتوں، قصے کہانیوں اور تصویروں کے مطالعے کی ضرورت پر زور دیا ہے۔ ہندوستان میں اس طریقہ کار کو ابھی تک بروئے کار نہیں لایا گیا ہے۔

عہد حاضر کے ہندوستانی مورخوں کو زیادہ تر ماہرین اقتصادیات پر انحصار کرنا پڑتا ہے۔ مگر اِس میں مشکل یہ ہے کہ بعض اوقات اقتصادی تاریخ کو اعتبار کی نظر سے نہیں دیکھا جاتا، وجہ یہ ہے کہ ریاضیاتی ذہنیت والے ماہرین اقتصادیات ہر چیز کو دو دو چار کے اصول سے دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ نو آبادیاتی معیشت کے تمام پہلوؤں کی بہتر تفہیم کے لیے ہمیں اب بھی زیادہ تر 19ویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے اوائل کے ان قوم پرست ماہرین اقتصادیات کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے جن کی تحقیق اپنے زمانے میں بھلے ہی عام روش سے ہٹ کر رہی ہو۔ مگر اب اُن کی تاریخی افادیت خاصی کم ہو چکی ہے۔ ان مورخین نے اٹھارویں صدی اور انیسویں صدی میں تجارت، مالیات، مالی پالیسیوں اور زرعی روابط کے سلسلے میں اپنے طور پر قابل قدر کام کیا مگر 1900 کے بعد کے زمانے کے بارے میں نسبتاً کم کام ہوا ہے۔ اس زمانے میں بڑھتی ہوئی پیچیدگیوں اور اعداد و شمار کی فراوانی کے مد نظر اقتصادیات کے میدان میں کسی قدر تکنیکی تربیت بہت گراں قدر ثابت ہوئی۔ اِس کی اہمیت کا ذکر Thorners کے مضامین نیز George Blyn کے ذریعے زرعی پیداوار یت کے مطالعے، امیہ باگچی کے ذریعے ہندوستان میں دیسی سرمایہ کاری پر نو آبادیاتی دباؤ کے مطالعے اور اکونومک اینڈ پولٹیکل ویکلی جیسے جرائد میں شائع ہونے والے متعدد تحقیقی مقالات میں بخوبی میں کیا گیا ہے۔

گذشتہ دہائی کے دوران جدید ہندوستان کی بابت تحقیقی سرگرمیوں میں اچانک بہت زیادہ وسعت آ جانے کی وجہ سے موجودہ نصابی کتابیں اور عام تجزیے از کار رفتہ ہو گئے ہیں۔ نئے مواد کی شکل میں سامنے آنے والے اس علمی سرمائے کا تجزیہ ضروری ہے۔ میرا خود کا معاملہ یہ رہا ہے کہ دستیاب کتب اور شائع شدہ مقالات پر انحصار کرنے کے ساتھ ساتھ اعداد و شمار یا طریقہ کار کے خلا، کو پُر کرنے لیے مجھے اپنے طور پر بھی تحقیق و تلاش کا سہارا لینا پڑا ہے۔ ہر مورخ میں تھوڑی

بہت جانب داری ہوتی ہے اور یہ کہ مخفی اور غیر شعوری جانب داری کہیں زیادہ خطرناک ثابت ہوتی ہے، اس لیے اس نقطے پر مجھے اپنے نقطہ نظر کی صاف صاف وضاحت کر دینی چاہیے۔ اول تو یہ کہ میں نو آبادیاتی استحصال کے خلاف جدو جہد کو زیر مطالعہ دور کا مرکزی نقطہ سمجھتا ہوں۔ دوسرے یہ کہ بیشتر قوم پرست مورخین کی پیروی کرتے ہوئے ہندوستانی معاشرے میں موجود کشیدگیوں کو نظر انداز کر دینا غلط اور گمراکن ہوگا۔ تیسرے یہ کہ اگرچہ گروہی ٹکراؤ بھی ہمارے اس مطالعے کا ایک حصہ ہے مگر طبقاتی کشیدگی بھی آگے چل کر فیصلہ کن ثابت ہوئی۔ طبقہ بندی اور طبقاتی شعور تجزیاتی مطالعہ کا ایسا وسیلہ ہیں جن کے استعمال کے لیے چابکدستی اور احتیاط ضروری ہوتی ہے مگر بعض اوقات ایسا نہیں ہو سکا ہے۔ آخر میں یہ کہ روایتی قوم پرست مورخوں، فرقہ پرست مورخوں، کیمبرج مورخوں اور یہاں تک کہ بعض مارکسی مورخوں کے ساتھ میری بنیادی لڑائی اس بات پر رہی ہے کہ اشرافی (Elitist) رویہ ان تمام باہم مخالف مورخوں کی قدر مشترک رہی ہے۔ میں یہ بھی سمجھتا ہوں کہ ہمارے ملک میں سامراج مخالف نظریہ اشرافی سطح کا حامل ہونے کے ساتھ ساتھ ایک نعرہ بھی رہا ہے اور محض اس وجہ سے کہ اشرافی سطح کا مطالعہ نسبتاً آسان ہے، اس کے نعرے والے عنصر کو ہرگز نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔ ان دونوں سطحوں کے باہمی عمل (تفاعل) کے ذریعے ہی تبدیلی کے ساتھ ساتھ تسلسل کا رویہ بھی ابھر تا رہا ہے جو کہ میرے خیال میں زیر مطالعہ دور کا ایک غالب عنصر رہا ہے۔

1890 میں جبکہ اعتدال پسند کانگریس کی گداگرانہ سیاست ہی حقیقی قوم پرستی معلوم ہوتی تھی، ممبئی کے ایک گورنر نے وائسرائے کو یہ لکھا تھا "جنگلاتی پالیسی آبکاری پالیسی، نمک محصول اور لگان میں مزید سختی نے ہمیں قابل نفرت بنا کر رکھ دیا ہے۔ دیسی تعلیم یافتہ طبقہ ہم سے کیا چاہتا ہے ہم بخوبی جانتے ہیں مگر ہمیں یہ نہیں معلوم ہے کہ غیر تعلیم یافتہ طبقوں کے احساسات کیا ہیں۔ (ری بنام لینس ڈاؤن مورخہ 20 فروری 1890) یہ زیر سطح بھڑک رہی آگ کا حقیقی ادراک تھا۔ کیونکہ اس کے چالیس سال بعد ہی مہاتما گاندھی نے نمک، لگان، آب کاری اور جنگلاتی حقوق کو بنیاد بنا کر ایک ملک گیر تحریک چھیڑ دی تھی۔

باب دو

سیاسی اور معاشی ڈھانچہ: 1885-1905

سامراجی ڈھانچہ اور پالیسیاں

بیسویں صدی شروع ہو جانے کے بعد تک بھی ہندوستان میں برطانوی حکومت وائسرائے اور سکریٹری آف اسٹیٹ کی قیادت میں درجہ بند اور منظم افسروں پر مشتمل ایک مطلق العنان حکومت تھی۔ اس حکومت پر برطانوی پارلیمنٹ کا کنٹرول محض قیاسی اور غیر مسلسل نوعیت کا تھا۔ 1857 کے بعد کے واقعات کے نتیجے میں وائسرائے اور سکریٹری آف اسٹیٹ کا رول اور بھی وسیع ہو گیا تھا۔ یہ دونوں عہدہ دار زیر سمندر کیبل اور نہر سویز کی تعمیر (69-1865) کی شکل میں رونما ہونے والے مواصلاتی انقلاب کی بدولت ایک دوسرے سے اور زیادہ قریب ہو گئے تھے۔ برطانیہ میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے امور کو سرگرم سیاسی اور معاشی موضوعات کی حیثیت حاصل رہی تھی اور چارٹرایکٹوں کی تجدید کے نتیجے میں پارلیمنٹ میں زوردار بحث کا ماحول پیدا ہو گیا تھا۔ 1858 کے بعد ہندوستان کے مالی گوشواروں نیز اخلاقی و مادی پیش رفت رپورٹوں کی سالانہ پیشی نے دارالعوام کو سنسان کر کے رکھ دیا تھا۔ کورٹ آف دائریکٹرس اپنے سرپرستانہ کاموں کی بدولت اپنا اثر رسوخ برقرار رکھے ہوئے تھی۔ سکریٹری آف اسٹیٹ پر قدغن لگانے کے مقصد سے لارڈ اسٹینلے (Stanley) ایکٹ کے ذریعے قائم کی گئی کاؤنسل آف انڈیا کو کبھی بھی واجب اہمیت حاصل نہیں ہو سکی تھی کیونکہ بیشتر معاملات کے سلسلے میں وائسرائے کے نام "ارجنٹ پیغام" یا کسی "خفیہ حکم" کے ذریعے اسے نظرانداز کر دیا جاتا تھا۔ ہندوستان میں بھی ریلوے اور ٹیلی گراف کی وجہ سے مقامی حکومتیں کلکتہ کے بہت قریب آ گئی تھیں جبکہ Coupland کا بیان ہے کہ 1919 سے پہلے وفاقی تصور کے کوئی آثار نہیں ملتے۔ 1861 کے انڈین کاؤنسلز ایکٹ کی وجہ سے بھی ایکزیکیٹو کاؤنسل پر وائسرائے کی گرفت کافی مضبوط ہو گئی تھی۔ اس ایکٹ کے ذریعے قائم کی گئی یا توسیع یافتہ امپریل کاؤنسل اور مقامی قانون ساز کاؤنسلوں میں چند غیر سرکاری ہندوستانیوں کو بھی شامل کیا گیا مگر ان کی حیثیت زیادہ تر نمائشی ہی تھی۔ چونکہ ان کاؤنسلوں کی حیثیت 1892 تک نامزد اداروں کی ہی رہی تھی، اس لیے 1892 کی اصلاحات سے پہلے ان کاؤنسلوں کو بجٹ کے بارے میں بحث کرنے یا سوال پوچھنے کا کوئی آئینی اختیار حاصل نہیں تھا۔ اس سیاسی ڈھانچے کی بدولت سارے اہم اختیارات وائسرائے اور سکریٹری آف اسٹیٹ کے ہاتھوں میں مرتکز ہو کر رہ گئے تھے۔ اگرچہ برطانوی ہند کی

تاریخ کو وائسرائوں کے ادوار میں تقسیم کرنے کا چلن اب ختم ہو گیا ہے تاہم ان دونوں عہدہ داروں کے ذاتی رویوں اور ان کی سیاسی وابستگیوں کی بھی ایک اہمیت ہے۔

وائسرائی رویے

1885 میں سیاسی طور پر باشعور ہندوستانی مختلف وائسرائوں کے مابین فرق سے، اور سب سے بڑھ کر Ripon کے ساتھ Lytton کے کالے۔ گورے کے تقابلی فرق سے بخوبی آگاہ تھے۔ وہ ہر تبدیلی کو برطانوی سیاست میں امپریل پارٹی اور ٹوری پارٹی کے درمیان راست ٹکراؤ کے تناظر میں دیکھنے کی کوشش کرتے تھے۔ اعتدال پسند کانگریسی لیڈر امبیکا چرن مزمدار نے 1915 میں ہندوستانی قومی ارتقاء کی تاریخ مرتب کرتے ہوئے لارڈ لٹن کے دور میں "مہیب بادلوں کے جماؤ" کا موازنہ Ripon اور Dufferin کے دور میں "بادلوں کے چھٹنے" اور "روشنی کی کرن پھوٹنے" سے کیا ہے۔ بلکہ حال ہی میں ایک بہت ہی منجھے ہوئے مورخ نے 80-1869 کی کنزرویٹیو مہم جوئی" کا تقابل 1880-88 کے لبرل تجربے سے کیا ہے (ایس گوپال۔ برٹش پالیسی ان انڈیا)

زور بیانی سے قطع نظر اس فرق کو 1880 کی دہائی میں ہندوستانی کارندوں کا دائرہ راجوں، نوابوں اور زمینداروں سے آگے بڑھا کر اس میں انگریزی تعلیم یافتہ متوسط طبقے کے لوگوں کو بھی شامل کرنے کی مختصر سی کوشش میں بہ آسانی محسوس کیا جاسکتا ہے۔ لٹن نے آخرالذکر کو یہ کہہ کر مسترد کر دیا تھا کہ "یہ وہ بابو ہیں جنھیں ہم نے دیسی اخبارات میں نیم باغیانہ مضامین لکھنے کے لیے تعلیم یافتہ بنایا ہے" اس کے برعکس Ripon "تعلیم یافتہ لوگوں کو حکومت کا دشمن بنانے کی بجائے حکومت کا دوست بنانے کی ضرورت" کی بات پسند کرتا تھا۔ 1883 میں لبرل بل پر اینگلو انڈین آبادی کے غیر متوقع شدید رد عمل کی وجہ سے یہ تجربہ ناکام ہو گیا تھا۔ ڈفرن کے دور (1884-88)، لینس ڈاؤن کے دور (1888-93) اور Elgin کے دور (1893-98) میں ہندوستان کے تئیں لبرل اور کنزرویٹو لیڈروں کے رویوں میں فرق اتنا زیادہ نمایاں نہیں رہا۔ لارڈ ڈفرن نے بالائی برما کے انضمام کے معاملے میں گوروں کے تجارتی دباؤ کے آگے ہتھیار ڈال کر، نیز بنگال اور اودھ میں لگان کے بلوں میں زمینداروں کے حق میں ترمیم کر کے اور کچھ عرصہ کے لیے ہیوم کے ساتھ لگاوٹ کا اظہار کر کے اور پھر اپنی روانگی سے ذرا ہی پہلے سینٹ آندریوز کے عشائیہ میں کانگریس پر حملہ کر کے حالات کو اپنے موافق بنانے کی ہر ممکن کوشش کی جو کامیاب نہیں رہی جیسا کہ (Din- Shaw- Wacha) نے بھی دادابھائی نارو جی کے نام اپنے ایک ذاتی خط میں ذکر کیا ہے، ڈفرن آخرکار کسی کو بھی خوش نہیں کر سکا۔ Din- Shaw Wacha نے 1888 میں یہ بھی کہہ دیا تھا کہ "وہ لٹن جیسے شخص کو تو برداشت کر سکتے ہیں مگر ڈفرن جیسے شخص کو

ہر گز نہیں"۔ ہندوستان کے تعلق سے برطانیہ کی دونوں مذکورہ پارٹیوں کا باہمی اختلاف رائے کس حد تک بے معنی ہو کر رہ گیا تھا، اس کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ ٹوری پارٹی کی سیلسبری (Salisbory) وزارت کے ماموره کرده (Lansdowne) نے صوبائی کاؤنسلوں میں کچھ نمائندہ ممبروں کی شمولیت کے لیے ڈفرن کی نجی درخواستوں پر فوراً توجہ دی تھی بلکہ دونوں کی یہ دلیل بھی ایک جیسی ہی تھی کہ اس طرح کے اقدام سے "کانگریس کا زور ٹوٹ جائے گا"۔ ہندوستانی کپاس پر تلافی محصول کے ذریعے لنکاشائر کو رعایت دینے کا فیصلہ Elgin کے دور میں کیا گیا تھا۔ جسے گلیڈاسٹون (Gladstone) کے آخری دور حکومت میں وائسرائے بنایا گیا تھا جبکہ خود اس "عظیم مرد بزرگ" نے 1892 میں لارڈ کراس بل میں ترمیم کی تائید سے انکار کر کے اپنے ہندوستانی بہی خواہوں کو عین وقت پر دھوکہ دیدیا تھا اور پھر 1893 میں بھی، کیمبرلے (Kimberley) اور لینس ڈاون (Lansdowne) کو آئی سی ایس کے امتحانات ایک ساتھ کرانے سے متعلق دارالعوام کی قرارداد کو نظرانداز کر دینے کی اجازت دے کر بھی ایسا ہی کیا تھا۔

برطانیہ کی سیاسی پارٹیوں کے باہمی اختلاف رائے کی عدم اہمیت کا کچھ نہ کچھ تعلق 1880 کی دہائی کے آخری برسوں میں برطانیہ میں موجود سیاسی ابہام سے بھی تھا جبکہ گلیڈاسٹون کے آئرش ہوم رول کے سوال پر لبرل پارٹی بھی دو حصوں میں تقسیم ہو گئی تھی۔ واقعہ یہ ہے کہ کسی بھی معاملے میں ابہام کا شکار ہو جانا لبرل پارٹی کی روایت رہی ہے۔ مثلاً دھیگ (Whig) حامیوں کے ذریعہ آمرانہ قیادت کی ستائش، انقلاب پسندوں کے ذریعے عظیم تر جمہوریت کی تائید، خارجہ پالیسی کے سلسلے میں لبرل استعمار پسندوں اور قدامت پرستوں کے درمیان امتیاز نہ ہونا۔ اور نسبتاً ایک چھوٹے انگلینڈ کا نعرہ بلند کرنے والوں کے ذریعے فوجی توسیع پسندی، اسی ابہام میں ہی شامل ہیں۔ نو آبادیاتی صورت حال کے عواقب سیاسی تصورات سے کہیں زیادہ اہم تھے اور یہی وہ طویل مدتی رجحانات ہیں جن کی طرف ہمیں اب واپس لوٹ آنا چاہیے۔

خارجہ پالیسی

برطانوی ہندوستان کی خارجہ پالیسی میں ماقبل کرزن عہد سے لٹن کے سامراجی دور تک فائدے کی کوئی بات نہیں رہی تھی اور اس سارے عرصے میں حکومت کا رویہ "1860 کی دہائی کی مثالی بے عملی" کے برخلاف کہیں زیادہ جارحانہ رہا۔ افغانستان اور فارس کی طرف روس کی پیش قدمی نیز ہند۔ چینی علاقوں پر فرانس کے کنٹرول کے ساتھ ساتھ بڑھتی گئی سامراجی رقابتوں کے حوالے سے اس جارحانہ رویے کو بخوبی سمجھا جا سکتا ہے۔ لبرل ممبروں نے جو کہ اس وقت اپوزیشن میں تھے، لٹن کی افغان مہم کی سخت مذمت کی تھی، جبکہ آخر میں Ripon کی بھی یہی پالیسی رہی

تھی۔ افغانستان کو توڑ دینے کا منصوبہ اور کابل میں ریجنٹ رکھنے کا مطالبہ ترک کر دیا گیا البتہ ایک مخصوص امدادی رقم کے بدلے میں افغانستان کی خارجہ پالیسی پر کنٹرول کے ساتھ ساتھ (لٹن کی پسند) عبدالرحمٰن کو امیر کی حیثیت میں بر قرار رہنے دیا گیا۔ برطانیہ نے Pishin اور Sibi کے علاقے اپنے پاس رکھے جنھیں 1887 میں برطانوی بلوچستان میں تبدیل کر دیا گیا۔

ڈفرن کے زمانے میں افغانستان کی سرحدی چوکی پنج دہ (Panjdeh) پر روس کے قبضے (مارچ 1885) کے نتیجے میں شدید کشیدگی پیدا ہو گئی تھی مگر جلد ہی یہ معاملہ ڈنمارک کے بادشاہ کے فیصلے پر چھوڑ دیا گیا۔ اور جولائی 1887 میں افغان سرحد کے سلسلے میں روس کے ساتھ سمجھوتا ہو گیا۔ فوجی مزاج لارڈ رابرٹس 1887 سے 1892 تک کمانڈر ان چیف رہا۔۔ چنانچہ شمال مغرب کی سرحد کے سلسلے میں پیش رسی کی پالیسی اپنائی گئی، جس کے نتیجے میں قبائلوں کے خلاف متعدد مہمیں انجام دی گئیں جن کی اہمیت کے لحاظ سے ریلوے نظام قائم کیا گیا، ہند۔ افغان سرحد کے تعین کے لیے 1893 کا ڈیورنڈ لائین سمجھوتا لاگو کیا گیا اور چترال چترال علاقے پر قبضہ کر کے اسے اپنی عملداری میں رکھا گیا۔

برطانوی ہند کے علاقوں میں بڑی اور آخری توسیع ڈفرن کے ہی زمانے میں ہوئی، اور جنوری 1886 میں بالائی برما کا انضمام کر لیا گیا۔ مارچ 1885 میں برطانوی فوجوں کی پیش قدمی کے پس پشت متعدد سیاسی اور تجارتی عوامل کار فرما تھے۔ انگریز دراصل ہند۔ چینی علاقے تک پھیلے ہوئے برما پر فرانس کے بڑھتے ہوئے اثرات کو شک وشبہے کی نظر سے دیکھتے تھے اور خاص طور پر اس لیے بھی کہ شاہ Thibaw جنوری 1885 میں تجارتی معاہدے پر دستخط کر چکے تھے اور جولائی میں ایک فرانسیسی کمپنی کے ساتھ ایک ریلوے معاہدہ بھی ہو چکا تھا۔ رنگون کا برطانوی ایوان تجارت بھی بالائی برما کو ہندوستان میں ضم کر لینے کے لیے بے تاب تھا۔ خلاف ضابطہ حرکتوں کے سلسلے میں برطانیہ کی ایک ٹمبر کمپنی کے خلاف Thibaw کے ذریعے اگست 1885 میں بھاری جرمانہ عائد کیے جانے کے بعد یہ بے تابی اور بھی بڑھ گئی تھی۔ اینڈولف چرچل نے ڈفرن کو یقین دلا دیا تھا کہ برطانیہ میں بھی بڑے تجارتی حلقے اور مانچسٹر وغیرہ اس انضمام کی گرم جوشی سے تائید کریں گے۔ بالائی برما انگریزوں کے لیے اس لیے بھی کشش رکھتا تھا کہ یہ علاقہ Yunnan اور جنوب مغربی چین کے لیے باب داخلہ ثابت ہو سکتا تھا۔ سیلسبری وزارت نے اس معاملے میں ڈفرن کی مکمل کر تائید کی اور گلیڈ اسٹون وزارت بھی، جو کہ اس کارروائی کا فارمولہ تیار کیے جانے کے وقت برسر اقتدار آئی تھی، شروع میں ضمیر کی دہائی دینے کے بعد اس کے لیے بالآخر رضامند ہو گئی تھی۔ یہی وہ فرق ہے جو اس دور میں ٹوری پارٹی اور لبرل پارٹی کے درمیان خط امتیاز کا کام کرتا ہے۔ اسی طرح ناکارہ Mandalay کورٹ مخالفت میں کوئی آواز بلند کیے بغیر ہی ڈھیر ہو گئی تھی۔

یہ دوسری بات ہے کہ علاقے کے عوام کی چھاپہ مار مزاحمت کو چالیس ہزار فوجوں کے ساتھ پورے پانچ برسوں میں کچلا جاسکا تھا۔

فوج

اس طرح کی مہموں کا مطلب تھا فوج کے اخراجات کا بہت بڑھ جانا۔ ان اخراجات میں رپن کے احتجاج کے باوجود، گلیڈ اسٹون کے ذریعے غیر ملکوں میں اور خاص طور پر 1882 میں مصر میں، 89-1888 میں مہدی تحریک کے خلاف سوڈان میں اور پھر 1896 میں اور 1900 میں باکسروں کے خلاف چین میں ہندوستانی فوجوں کی تعیناتی کے نتیجے میں ہندوستانی خزانے پر پڑنے والا بوجھ بھی شامل کیا جاسکتا ہے۔ پنج دہ جنگ کا ہوا کھڑا کر کے آرمی میں 30 ہزار نفری کا اضافہ کیا گیا۔ اس طرح فوجی مصارف 82-1881 میں حکومت ہند کے بجٹ کے 41.9 فی صد تک اور دس سال بعد 45.4 فی صد تک پہونچ گئے۔ 05-1904 میں کرزن کے دور میں فوجی مصارف 51.9 فی صد تک پہونچ گئے تھے۔ فوجی پالیسی کے وسیلے سے نوآبادیاتی حکومت کی اصل نوعیت کو کافی حد تک سمجھا جاسکتا ہے۔ 1857 کے واقعات کی یاد ابھی تک ایک مؤثر عنصر کا کام کر رہی تھی۔ چنانچہ 1888 میں ڈفرن نے بڑے طمطراق سے یہ کہا تھا کہ

"انگریزوں کو وہ سبق ہر حال میں یاد رکھنا ہوگا، جو ہم نے 30 سال پہلے بھیانک تجربات سے سیکھا تھا۔"

1859 اور 1879 کے کمیشنوں کا اصرار اس بات پر تھا کہ فوج کا ایک تہائی حصہ انگریزوں پر مشتمل ہو (1857 سے پہلے یہ حصہ محض 14 فیصد تھا)، توپ خانے پر صرف انگریزوں یا یورپیوں کا ہی اجارہ ہو، (1900ء تک ہندوستانی فوجیوں کو رائفلیں بھی کم تر درجے کی دی جاتی تھیں) اور یہ کہ فرقہ، مذہب، ذات، نسل یا مقامی ہمدردی کے احساس سے پیدا ہونے والی کسی بھی طرح کی خطرناک شناخت کو پروان چڑھنے سے روکا جائے۔ سر جان اسٹریچی نے اسے ایک سوتیع پر انگریزوں کی Water-tight compartments پالیسی کا نام دیا تھا۔ (India page:63)۔ لڑاؤ اور حکومت کرو کے اصول کی وضاحت 1862 میں Wood نے اس طرح کی تھی "میں مختلف رجمنٹوں میں ایک دوسرے سے مختلف اور باہم حریفانہ جذبہ چاہتا ہوں تاکہ ضرورت پڑنے پر سکھ ہندوؤں پر اور گورکھا ان دونوں پر بے جھجک گولی داغ سکے"۔ 1879 کے آرمی کمیشن نے بھی اسی بات پر اس طرح زور دیا تھا "ایک مضبوط متوازی یوروپی فوج کے بعد دوسرا نمبر مقامی لوگوں کے مقابلے پر مقامی لوگوں کی متوازی فوج کا ہوتا ہے"۔ عسکری نسل سے متعلق اس نظریے کو کہ اچھے فوجی کچھ مخصوص فرقوں میں ہی پیدا ہوتے ہیں، 1880 کی دہائی میں لارڈ رابرٹس کے زمانے میں فروغ

حاصل ہوا۔ اس تصور کو دراصل سکھوں اور گورکھوں کی بھرتی کی پالیسی کو حق بجانب ثابت کرنے کے مقصد سے بروئے کار لایا گیا تھا۔ اس طرح نسلی مساوات کا یا فوج کو ہندیانے کا کوئی سوال نہیں تھا۔ تنخواہوں میں معمولی اضافے کے بعد بھی 1895 میں ایک ہندوستانی پیدل فوجی کی تنخواہ 9 روپے ماہانہ تھی جبکہ اس کے برطانوی ہم رتبہ کی تنخواہ تقریباً 24 روپے تھی اور دوسرے بھتے اس کے علاوہ تھے یہاں تک کہ 1926 میں سینڈھرسٹ کمیٹی فوجی افسروں میں ہندوستانیوں کا تناسب 1952 تک پچاس فی صد کر دینے کی بات محض سوچ رہی تھی۔

مالیاتی اور انتظامی دباؤ

غیر ملکی مہموں اور آرمی میں توسیع کا مطلب تھا مالیاتی دباؤ میں بھاری اضافہ! 1873 کے بعد سونے کے مقابلے میں چاندی کے سکے کی قدر زر میں بھاری گراوٹ آجانے کے نتیجے میں ہندوستانی خزانے پر دباؤ بہت بڑھ گیا تھا۔ انگریز سول اور آرمی افسروں کی پنشن، سکریٹری آف اسٹیٹ کے دفتر کے مصارف، ہندوستانی قرضوں پر سود جیسے ہندوستانی اخراجات کا بہت بڑا حصہ اسٹرلنگ میں ادا کرنا پڑتا تھا۔ روپے کی جو قدر 1872 میں دو شلنگ تھی وہ 94-1893 میں ایک شلنگ دو پنیس سے کسی قدر زائد تھی۔ "راج" کی مالیاتی اساس کا سبیہ ساچی بھٹاچارجی نے حال میں تفصیل سے جائزہ لیا ہے جبکہ کیمبرج مورخین نے اس طرح کے مالیاتی مسائل کے باہمی تعلق، انتظامی دباؤ، قدر زر میں کمی نیز قوم پرستانہ تحریکوں کے مابین تعلق باہم پر روشنی ڈالنے کے سلسلے میں بہت کام کیا ہے۔ انل سیل کے الفاظ میں........ "مقامی امور میں 'راج' کی زبردست دخل اندازی کی وجہ سے انتظامی ڈھانچے پر دباؤ بہت بڑھ گیا تھا" اس سے بھی زیادہ واضح لفظوں میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس میں ٹیکس وصولی کی پرانی صورتوں کو برقرار رکھتے ہوئے نئے طریقوں کی تلاش کی کوشش بھی شامل تھی۔ یہ ایک ایسا عمل ہے جس میں دوسرے بہت سارے مسائل بھی مضمر ہوتے ہیں۔ کیونکہ اس وقت حکومت کو باہم متضاد مشکلات کا سامنا تھا۔

لگان کو آمدنی کے سب سے بڑے واحد وسیلے کی حیثیت حاصل رہی۔ استمراری بندوبست میں توسیع کی جو بات غدر کے فوراً بعد کے زمانے میں، جبکہ حکومت کو وفادار اور بھروسے مند زمینداروں کی تلاش تھی، بہت عام تھی، اب فطری طور پر بھلا دی گئی تھی۔ مالیہ کی جو وصولی 82-1881 میں 19.67 کروڑ روپے تھی، 02-1901 میں 23.99 کروڑ روپے ہو گئی تھی حالانکہ 1890 کی دہائی میں متعدد بار شدید خشک سالی کا بھی سامنا رہا تھا۔ اس طرح ملک میں قوم پرستانہ شکایت کا موقع پیدا ہو گیا تھا، جس کا بعد میں جائزہ لیا جائے گا۔ بہر حال زمین کے محصول (مال گزاری) میں بہت زیادہ اضافہ سیاسی اعتبار سے خطرناک اور معاشی اعتبار سے غیر دانشمندانہ اقدام

محسوس کیا جانے لگا تھا۔ کیونکہ انگریز بھی خام کپاس، شکر، جوٹ، گندم اور دوسری زرعی اشیاء کی بر آمدکاری کو جلد از جلد ترقی دینا چاہتے تھے، بہر حال کل سرکاری آمدنی کے لحاظ سے مال گزاری کا تناسب بتدریج گھٹتا جارہا تھا (مذکورہ بالا برسوں میں کل مال گزاری بالترتیب 46.86 کروڑ روپے اور 60.79 کروڑ روپے رہی تھی)۔ در آمدی محصولات کے ذریعے ایک طرف تو بجٹ سازی میں آسانی پیدا کی جاسکتی تھی اور دوسری طرف سیاسی طور پر باشعور ہندوستانیوں کو خوش بھی کیا جاسکتا تھا مگر اس معاملے میں بھی لنکا شائر کے ہی مفادات کو ترجیح دی گئی۔ مانچسٹر لابی نے کپاس محصولات کو 1870 کے وسط سے ہی نشانہ بنار کھا تھا اور اس معاملے میں اسے سیلسبری کی تائید بھی حاصل تھی۔ Lytton نے تو افغان جنگ کے باوجود بھی یہ محصولات 79-1878 میں کافی کم کردیئے تھے اور Ripon نے انھیں 1882 میں بالکل ہی ختم کردیا اور جب 1890 کی دہائی میں زبردست خسارے کی وجہ سے ان محصولات کو بحال کرنا ناگزیر ہو گیا تو 1894 اور 1896 میں بحال شدہ محصولات کے ساتھ ساتھ ہندوستانی کپڑوں پر بدنام زمانہ تلافی محصول بھی لگادیا گیا۔ 1860 میں جیمس ولسن کے علاوہ وائسرائے کونسل کے برطانوی ممبران فنانس گوروں اور با اثر ہندوستانیوں کے زبردست احتجاج کے باوجود بھی انکم ٹیکس لگانے کی بات کرتے آرہے تھے۔ پنج دہ اور برما کی مہموں کے بعد 1886 میں ڈفرن نے اسے ایک باقاعدہ اور مستقل شکل دیدی۔ دو سال بعد بھاری سیلز ٹیکس بھی لگادیا گیا۔

الہ آباد سے متعلق Bayly کے تجزیے نیز جنوبی ہند سے متعلق Washbrook کے مطالعے میں 1880 کی دہائی کے وسط میں ٹیکسوں کی اس باڑھ پر خاص توجہ دی گئی ہے۔ ان ٹیکسوں کی وجہ سے ہی کانگریس کے مدراس اجلاس (1887) اور الہ آباد اجلاس (1888) کے لیے عوامی تائید کا دائرہ غیر معمولی طریقے پر بہت وسیع ہو گیا تھا۔ Washbrook نے بھی صوبائی سطح پر طویل مدتی رجحانات کے سلسلے میں کافی دلچسپ اعداد و شمار جمع کیے۔ مثلاً مدراس میں 1880 میں مال گزاری سے ہونے والی آمدنی کل سرکاری آمدنی کے 57 فی صد کے بقدر اور 1920 میں محض 20 فی صد کے بقدر تھی۔ اس کے مقابلے میں شراب کی صنعت پر لگایا گیا جو آب کاری محصول 83-1882 میں 60 لاکھ روپے تھا 1920 تک بڑھ کر 5.2 کروڑ روپے ہو گیا تھا۔ اس کے علاوہ جنگلات سے ہونے والی آمدنی میں بھی بھاری اضافہ ہوا۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ قبائلیوں اور غریب کسانوں کے صدیوں پرانے چارے اور ایندھن کے حقوق پر پابندی لگادی گئی تھی۔ صوبائی سطح کی تنظیمیں جنگلاتی قوانین نیز 1880 کی دہائی میں مدراس میں اور 1890 کی دہائی میں آسام میں چارے کے حق پر لگائی گئی پابندی کے خلاف پہلے ہی سے احتجاج کرتی آرہی تھیں۔ اور جیسا کہ بعد میں جائزہ لیا جائے گا، یہ معاملہ کانگریس کے سالانہ اجلاسوں میں بھی بار بار اٹھایا جاتا رہا تھا۔

کلنور میں 19ویں صدی کے اوائل میں پبلک ایڈمنسٹریشن کے موضوع پر Frykenburg کی کتاب میں ماتحت ہندوستانی افسروں کو حاصل آزادی اور فوائد پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ Frykenburg کے مطابق بااثر مقامی لوگوں کے ساتھ ان ہندوستانی افسروں کے بہت قریبی مراسم کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اس وقت کمپنی کا انتظام بہت ڈھیلا تھا۔ 1858 کے بعد، مالی دباؤ کو کم کرنے کی غرض سے کیے گئے اقدامات کے نتیجے میں اس طرح کی آزادی کا ختم ہو جانا فطری تھا۔ اس سلسلے میں Washbrook کی تصنیف میں مدراس کے حالات کا تفصیل سے جائزہ لیا گیا ہے۔ اس کی توثیق بہت دلچسپ طریقے پر مشرقی بنگال میں سلہٹ کے حالات سے بھی ہوتی ہے جس کے سلسلے میں ہین پال نے زمینداروں کے اختیارات میں بتدریج کمی کا جائزہ لیا ہے۔

لوکل سیلف گورنمنٹ اور کونسل کی اصلاح

اگر بالفرض مالی اور انتظامی دباؤ سیاسی اعتبار سے خطرناک نہیں بھی ثابت ہوئے مگر اس میں شک نہیں کہ ان دونوں طرح کے دباؤ کا تعلق زیادہ سے زیادہ ہندوستانی معاونین کی تلاش سے یقینا تھا۔ انل سیل کے کے مطابق "نامزدگی، نمائندگی اور انتخاب جیسے سارے طریق کار کا اصل مقصد سامراجی عزائم کی تکمیل کے لیے ہندوستانیوں سے کام لینا تھا۔" (لوکلیٹی، پروونس اینڈ نیشن، صفحہ 10)۔ لوکل سیلف گورنمنٹ کی نشوونما کے پس پشت مالی اور سیاسی مقاصد ہی کارفرما تھے۔ اس عمل کی ابتداء کنزرویٹو پارٹی کے Mayo کی بجائے لبرل پارٹی کے Ripon کے عہد سے ہو چکی تھی۔ سب سے بڑا مقصد یہ تھا کہ مالی دشواریوں پر قابو پانے کے لیے مقامی ضروریات کے اخراجات کو نئے مقامی ٹیکسوں کے ذریعے پورا کیا جا سکے۔ لیکن Mayo کا بھی یہی خیال تھا کہ "ہمیں اس ملک کی حکومت میں اپنے ساتھ مقامی لوگوں کو بھی بتدریج شامل کرتے جانا چاہیے" اور دوسرے یہ کہ سیاسی دباؤ کا اشارہ Ripon کی مشہور مئی 1882 کی اس قرارداد سے بھی ملتا ہے جس کے ذریعے مقامی جمہوری اداروں میں منتخبہ اکثریتوں اور چیرمینوں کا وعدہ کیا گیا تھا۔ یہ دوسری بات ہے کہ بیشتر صوبائی افسر شاہی کی مزاحمت کی وجہ سے اس وعدے کو کافی سست رفتاری سے اور نامکمل طریقے پر پورا کرنے کی کوشش کی گئی۔ اس سارے عمل کے دوران اس کے مالی پہلو کی اہمیت کا اندازہ، بعد کی ایک دوسری مثال سے کیا جا سکتا ہے: 20-1819 میں بنگال میں یونین بورڈ قائم کیے گئے تھے جس کا مقصد چوکیدار ٹیکس میں پچاس فیصد اضافہ کرنا تھا جس پر مدنا پور علاقے میں کامیاب اور عوامی قوم پرستانہ احتجاج شروع ہو گیا تھا۔

1880 کی دہائی کے اواخر میں اور پھر اس کے بعد بھی کانگریس کے عروج کا مطلب یہ تھا کہ اب نسبتاً اعلا سطحوں پر ہندوستانیوں کا اشتراک عمل قانون ساز اسمبلیوں کی اصلاح کے بہانے

حاصل کیا جاسکتا تھا۔ مثال کے طور پر لارڈ کراس کے انڈین کونسلز ایکٹ بابت 1897 کے ذریعے غیر سرکاری ممبروں کی تعداد میں اضافہ کردیا گیا جس کی رو سے 16 ممبری امپریل کونسل میں غیر سرکاری ممبروں کی تعداد 10 کردی گئی۔ اگرچہ الیکشن کی بات کھل کر نہیں مانی گئی مگر ممبران کی نامزدگی کے سلسلے میں ہندوستانی حکام کو مقامی جمہوری اداروں، یونیورسٹیوں کی مجلسوں، ایوان ہائے تجارت، اور زمینداروں کی انجمنوں سے صلاح مشورہ کرنے کا اختیار دیدیا گیا تھا۔ کونسل کے ممبروں نے اگرچہ بجٹ پر بحث کرنے اور سوال پوچھنے کا حق حاصل کرلیا تھا مگر انھیں کسی طرح کی ترمیم پیش کرنے، بجٹ پر ووٹ دینے یا ضمنی سوال پوچھنے کا اختیار نہیں تھا۔

اس طرح کی نام نہاد آئینی اصلاح کا عمل سرکاری پالیسی کے دو دوسرے پہلوؤں، یعنی اعتدال پسندوں کو یکجا کرنے کی وقتاً فوقتاً کوشش (جو اگرچہ منٹو کا فارمولا تھا مگر اس طرح کی کوشش کافی پہلے شروع ہو چکی تھی) اور لڑاؤ اور حکومت کرو کے طریقوں کے چابک دستانہ استعمال سے بھی جڑا ہوا تھا۔ Ripon کی بڑی امیدوں کے باوجود بھی لوکل سیلف گورنمنٹ کا حربہ بطور خاص پہلے مقصد کے حصول میں ناکام ثابت ہوا، کیونکہ میونسپلٹیوں اور ضلع بورڈوں کو بہت کم مالی اور انتظامی اختیارات دیئے گئے۔ قوم پرست اس طرح کے مقامی جمہور اداروں میں شامل بھی ہوئے اور انھوں نے اپنے مربیانہ امکانات کو بروئے کار لانے کی کوشش بھی کی مگر وہ اپنی ساری توانائیوں کو محض سڑکوں اور نالیوں کی مرمت تک ہی محدود رکھنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ بہر حال 1892 کی اصلاحات سے کچھ برسوں کے لیے کانگریس کے احتجاج کا زور کم کرنے میں مدد ملی اور کچھ سر کردہ لیڈر امپریل کاؤنسل اور صوبائی کاؤنسلوں میں پہونچ گئے، مثال کے طور پر لال موہن گھوش، ڈبلو۔ سی۔ بنرجی اور سریندر ناتھ بنگال میں، فیروز شاہ مہتہ، گوکھلے اور کچھ عرصہ کے لیے تلک بھی بمبئی میں اور پھر مہتہ کے بعد گوکھلے امپریل کاؤنسل میں پہونچ گئے تھے۔ 1894 اور 1900 کے درمیان کانگریس کے سالانہ اجلاسوں کے ایجنڈے میں کونسل اصلاحات کے مطالبے کو نمایاں اہمیت حاصل نہیں رہی تھی۔ بہر حال یہ اثر دیرپا ثابت نہیں ہوا اور انھیں برسوں کے دوران انتہا پسندی نے بھی سر ابھارنا شروع کردیا تھا اور 1904 کے آتے آتے کونسل اصلاح کے مطالبے پر پھر پوری قوت سے زور دیا جانا شروع ہو گیا تھا۔

لڑاؤ اور حکومت کرو

ہندوستان کے اعلا طبقات کے درمیان سب سے زیادہ مذہب کی بنیاد پر اور بعض اوقات ذات پات اور علاقے کی بنیاد پر نفاق کی حوصلہ افزائی کی پالیسی سب سے اہم ثابت ہوئی۔ اس طرح کی پھوٹ کی جڑیں بہت گہری تھیں مگر اس میں بھی شک نہیں کہ قوم پرست حلقے اس سلسلے میں

انگریزوں کی براہ راست اور شعوری کوشش کو مبالغہ آرائی سے بھی پیش کرتے آئے ہیں، مگر جیسا کہ ہم آگے چل کر جائزہ لیں گے نو آبادیاتی دور میں ہندوستان کی پس ماندگی یا عدم ترقی کے پس پشت انگریزوں کی پالیسیوں کے علاوہ تعلیم، انتظامی نوکریوں کے مواقع کی کمی اور بعد میں سیاسی رقابتوں کا بھی بڑا دخل رہا ہے۔ اس پورے دور میں اس طرح کی سیاسی اصلاحات نے سیاسی رقابتوں کو بڑھانے اور تیز کرنے میں اہم رول ادا کیا۔ ہنٹر (Hunter) کی تصنیف Indain Musalman سے سرکاری حلقوں میں مسلمانوں کو ایک پس ماندہ فرقے کے طور پر پیش کرنے اور سمجھنے کا فیشن سا ہو گیا تھا۔ 1888 میں ڈفرن نے مسلمانوں کو "پانچ کروڑ کی ایک ایسی قوم" بتلایا تھا جو مبینہ طور پر سماجی اور مذہبی طور طریقوں کے لحاظ سے یکسانیت کی حامل ہے، دہلی پر حکمرانی کی یاد اس کے ذہن میں ابھی تک تازہ ہے اور جس کا ہمالہ سے کنیا کماری تک دبدبہ تھا۔ (ڈفرن بنام کراس، 8 نومبر 1888)۔ یہ مفروضات تاریخی اعتبار سے جس قدر غلط تھے، ہمارے غیر ملکی حکمرانوں کے لیے اتنے ہی مفید مطلب ثابت ہوئے۔ صوبہ جات متحدہ کی بابت فرانسس رابن سن کے تجزیے اور پنجاب کی بابت این جی Barrier کے تجزیے سے واضح طور پر پتہ چلتا ہے کہ میونسپلٹیوں کے لیے الیکشن کا طریقہ شروع ہوتے ہی ان دونوں صوبوں میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان کس طرح کشیدگی بڑھ گئی تھی، پنجاب میں Lyall کی حکومت 1886 میں ہوشیارپور، لاہور اور ملتان جیسے شہروں میں جداگانہ انتخاب کا طریقہ بھی روشناس کرا چکی تھی۔ Barrier کے مطابق ہو سکتا ہے کہ اس کا مقصد پہلے سے موجود کشیدگی کو کم کرنا بھی رہا ہو۔ لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ جداگانہ طریقہ انتخاب سے تقسیم کے خطوط اور بھی واضح اور گہرے ہو گئے اور فرقے کے لیڈروں کو اپنی اپنی قیادت کا دائرہ فرقہ وارانہ بنیاد پر بڑھانے کی ترغیب ملی یا وہ ایسا کرنے کے لیے مجبور کر دیئے گئے تھے۔ کونسل کی اصلاح کی سطح پر 1893 میں Lansdowne کا اصرار اس بات پر تھا کہ نمائندگی علاقے یا آبادی کی تعداد کی بجائے نوع یا طبقوں کی بنیاد پر ہونی چاہیے، گویا اس طرح اب جداگانہ طریقہ انتخاب کے مطالبے کو تسلیم کر لینا زیادہ دور نہیں تھا۔ بہر حال ایک حد سے زیادہ فرقہ وارانہ کشیدگی امن و قانون کے لیے ایک سنگین خطرہ بھی بن سکتی تھی۔ تاہم 7 مئی 1897 کو Elgin کے نام سکریٹری آف اسٹیٹ ہملٹن کے بصیغۂ راز مراسلے سے اس سلسلے میں انگریزوں کے انداز فکر کی شاید سب سے زیادہ وضاحت ہوتی ہے۔ "شمال مغرب اور پنجاب میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان بڑھتی ہوئی دوری کے بارے میں سن کر مجھے افسوس ہوا، یہ طے کرنا بہت مشکل ہے کہ کون سا لائحۂ عمل اختیار کیا جائے، کیونکہ فکر و عمل کا اتحاد سیاسی طور پر خطرناک ثابت ہوگا جبکہ فکری اختلاف اور ٹکراؤ انتظامی اعتبار سے پریشان کن ثابت ہو سکتے ہیں، بہر حال آخر الذکر میں خطرہ کم ہے۔ البتہ موقع پر موجود لوگوں کی تشویش اور

ذمہ داری یقیناً بڑھ جاتی ہے۔"

برطانوی ہند کی سیاسی مشینری ہی اب تک ہمارا موضوع گفتگو رہی ہے اور یہی وہ میدان ہے جہاں کیمبرج مکتب فکر کی کارکردگی بہت اچھی رہی ہے۔ لیکن یہ بلا شبہ ایک ایسی عجیب کم بصری (Myopia) ہے جس میں انتظامیہ یا سیاست کو ہی سب کچھ، یعنی اصل نصب العین سمجھ لیا جاتا ہے اور یہ اصرار کیا جاتا ہے کہ "ہندوستان میں غیر ملکیوں کی حکمرانی نے ہی رعایا کو اس کے خلاف صف آراء ہو جانے پر مجبور کر دیا تھا، یہ ہمارا موضوع گفتگو نہیں ہے"۔ انل سیل نے بھی اپنے 1973 کے مضمون میں اسی بات پر زور دیا ہے (لوکلٹی، پرووِنس، اینڈ نیشن صفحہ 5 اور 6)۔

دو دوسرے پہلوؤں کو، جو کہ قومی تحریک اور بالعموم جدید ہندوستان کی تاریخ کی تفہیم کے لحاظ سے بہت اہمیت رکھتے ہیں، کیمبرج مکتبِ فکر کے تجزیوں میں نظرانداز کیا جاتا رہا ہے۔ برطانوی راج کا ایک بہت بڑا پہلو نسلی امتیاز کا بھی تھا جسے نوآبادیاتی استحصال کے ایک حربے کے طور پر تحفظ بھی فراہم کیا گیا تھا۔

گوری نسل پرستی

ہندوستان میں انگریزوں کو اس بات کا پورا شعور تھا کہ ان کا تعلق حکمراں نسل سے ہے۔ چنانچہ مقامی سماج کے بڑے سے بڑے فرد کو بھی اس وقت اپنی اوقات معلوم ہو جاتی تھی جب وہ ریل کے کسی محفوظ ڈبے میں یا دخانی جہاز (اسٹیمر) میں کوئی غلطی کر بیٹھتا تھا یا پھر نوکری یا کسی پیشے میں ترقی کے وقت اسے بہت ساری رکاوٹوں کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ مثال کے طور پر جب 1878 میں متھو سوامی ایئر کو مدراس ہائی کورٹ کا جج بنایا گیا تو گورے تاجروں کے ترجمان مدراس میل نے اس بنیاد پر اس کی مخالفت کی تھی کہ دیسی افسروں کو ایک جیسے حالات میں یوروپی افسروں جیسی شرح پر ہرگز تنخواہ نہیں ملنی چاہیے (پولٹکس اینڈ نیشنلسٹ اویکننگ ان ساؤتھ انڈیا۔ 91-1852)۔ یہ ہنگامہ ہی قوم پرست انگریزی اخبار ہندو کے اجراء کا راست سبب بنا۔ کم نصیبوں کے لیے یہ نسل پرستی اکثر لاتوں گھونسوں کی شکل میں سامنے آتی تھی یا پنکھا کھینچنے والے قلی یا شکار کے موقع پر کسی دیسی کے آگے پڑ جانے پر غلطی کی سزا یا اصلاح کے طور پر "اتفاقاً" شوٹ کر دیئے جانے کی شکل میں بھی سامنے آتی تھی۔ 1880 اور 1900 کے درمیان "صاحب" کی اس طرح کے حادثاتی شوٹنگ کے تقریباً 80 واقعات ریکارڈ کیے گئے تھے، گوروں کے غلبے والی عدالتیں اس طرح کے بھیانک جرائم کی بہت ہلکی سزائیں سنایا کرتی تھیں۔ اس زمانے کے ہندوستانی رسالوں اور اخباروں پر ایک طائرانہ نظر سے ہی یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ قوم پرستی کے جذبے کے فروغ کے لیے اس طرح کی باتوں نے مہمیز کا کام کیا۔ چنانچہ 30 اکتوبر 1891 کو واچا نے نوروجی سے یہ شکایت کی تھی کہ "یوروپیوں کے

ہاتھوں دیسی لوگوں کے قتل کے واقعات میں روز بروز اضافہ ہو تا جارہا ہے اور انگریز فوجی اور سپاہی تو اس معاملے میں اور زیادہ سفاکی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ اور یہ کہ ان لوگوں کو اکثر کسی نہ کسی بہانے قتل کے الزام سے بری کر دیا جاتا ہے۔ (آر۔ پی۔ بیورد ھن، صفحہ 265)۔ نسلی بنیاد پر امتیازی سلوک اور سفاکی در حقیقت ایسے معاملے تھے جن کی وجہ سے اعلا طبقوں اور نچلے طبقوں میں محرومی اور ناانصافی کا احساس مشترک طور پر پیدا ہو جاتا تھا۔ اور یہ مشترک احساس ہی بعض اوقات ان دونوں طبقوں کے درمیان نقطہ اتحاد بھی ثابت ہو تا تھا۔

برطانوی ہند کے دردمند اور دوراندیش مدبرین نے اس طرح کی نسل پرستانہ سفاکیوں پر روک لگانے کی کوشش کی اور صرف Ripon کو ہی نہیں بلکہ کرزن کو بھی اس معاملے میں ہم نسل گوروں کی ناپسندیدگیوں کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ کرزن نے دو مشہور واقعات میں ملوث انگریز سپاہیوں کے خلاف کارروائی بھی کی تھی۔ ان میں سے ایک واقعے کا تعلق برما کی ایک خاتون کی اجتماعی آبروریزی سے اور دوسرے واقعے کا تعلق ایک ہندوستانی خانساماں کو قتل کر دینے سے تھا جس نے دلالی سے انکار کر دیا تھا۔ اتفاق سے یوروپی برادری نے دوسرے واقعے میں ملوث رجمنٹ کو 1903 کے دہلی دربار میں ہیروؤں کی طرح کا استقبالیہ بھی دیا تھا۔ بہر حال یہ ذہن نشیں رکھنا ضروری ہے کہ نو آبادیاتی ہندوستان کے سیاسی اور معاشی ڈھانچے میں سفید نسل پرستی کا بھی کچھ نہ کچھ رول یقیناً رہا۔ اگر ہندوستانیوں کو فوج اور انتظامیہ کے اعلا عہدوں سے دور رکھا گیا تو انگریزوں کے نقطہ نظر سے یہ کوئی غیر منطقی بات بھی نہ تھی۔ اسی طرح ہندوستان میں آئی سی ایس کے امتحانات ایک ساتھ کرانے کے حقیر سے مطالبے کی بھی پچاس برس تک مخالفت جاری رہی تھی۔ جولائی 1895 میں Elgin نے سر راس ہیری کو اپنے مراسلے میں لکھا تھا کہ ہم اس حقیقت کو برقرار رکھ کر ہی یہاں حکومت کر سکتے ہیں کہ ہم ایک غالب اور حاکم نسل کے لوگ ہیں۔ افواج میں ہندوستانیوں کی بھلے ہی حوصلہ افزائی ہونی چاہیے مگر ایک ایسا نقطہ بھی ہے جہاں پہونچ کر ہمیں سارا کنٹرول اپنے ہی ہاتھوں میں رکھنا ہو گا، اگر ہم یہاں باقی رہنا چاہتے ہیں۔"

اس نسل پرستی کے معاشی پہلو تو اس سے بھی زیادہ اہم ثابت ہوئے جس کا کہ امیہ باگچی نے بخوبی جائزہ لیا ہے۔ ہندوستان میں تجارتی حریف بننے کے امکانات رکھنے والے مقامی تاجروں کے خلاف گورے تاجروں کے باہمی اتحاد کو برقرار رکھنے میں رنگ اور نسل نے بہت اہم رول ادا کیا۔ گوروں کے مختلف ایوان ہائے تجارت، تجارتی انجمنوں نیز جوٹ، چائے اور کان کنی کے شعبوں سے متعلق مختلف تنظیموں کے طریقہ کار سے صاف پتہ چلتا ہے کہ یوروپی تاجر دوسروں کے لیے تجارتی مقابلے کی خوبیوں میں بھلے ہی یقین کیوں نہ رکھتے ہوں، مگر ان کا سب سے زیادہ یقین آپس میں ہی معقول سودے بازی اور ایک دوسرے کے لیے گنجائش رکھنے میں تھا۔ (باگچی، پرائیویٹ

انسویسمنٹ ان انڈیا صفحہ 170)۔ مختلف قسم کے تنازعات نیز افسروں کے تحقیری رویوں کی وجہ سے تجارت میں پیدا ہونے والی رکاوٹوں کے باوجود بھی، ہندوستان میں مامور گورے افسروں اور گورے تاجروں کے درمیان ذاتی نوعیت کے اور کافی حد تک "کلب کی زندگی" کے تعلقات رہتے تھے۔1903 میں لارڈ کرزن نے انگریز کان مالکان سے خطاب کرتے ہوئے حکومت اور تجارتی حلقوں کے درمیان تعلقات کی نوعیت کا خلاصہ اس طرح پیش کیا تھا۔ میرا کام انتظام سے اور آپ کا کام کسب منفعت سے تعلق رکھتا ہے مگر دراصل یہ دونوں کام ایک ہی فریضہ اور ایک ہی سوال کے دورخ ہیں"(مک لین انڈین نیشنلزم اینڈ ارلی کانگریس، صفحہ 37) تا آنکہ 1944 میں بھی ہندوستانی تاجروں اور صنعت کاروں کو "سرزمین کے حکمرانوں کے ساتھ نسلی رشتے کے نتیجے میں یوروپی تاجروں کو حاصل خاموش ہمدردی کے بارے میں سخت شکایت تھی" کیونکہ "یہ نسلی رشتہ دیسی تاجروں اور کاروباری حلقوں کے ساتھ مقابلے میں ان گورے تاجروں کے لیے بہت سے فوائد کا ضامن تھا"۔ (باگچی صفحہ 166)۔

باگچی کے الفاظ میں اس طرح انگریزی نسل پرستی سے یوروپی تاجروں کی "اجتماعی اجارہ داری" کو استحکام حاصل ہو تا گیا جو کہ بطور خاص مشرقی ہند کی صنعتی اور کاروباری زندگی کی ایک بہت ہی نمایاں خصوصیت تھی۔اب ہمیں اس جابرانہ معاشی استحصال کی تغیر پذیر صورتوں اور ان کے مضمرات کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔

نو آبادیاتی معیشت

آر۔پی۔دت کی تصنیف انڈیا ٹوڈے میں، جو کہ اپنی پہلی اشاعت کے چالیس سال بعد بھی ہندوستان کی نو آبادیاتی معیشت کے بہترین تجزیے کی حیثیت رکھتی ہے، مارکس کے بعض سرسری بیانات کو انگریزوں کے ذریعے ہندوستان کے استحصال کے تین مرحلوں کے تناظر میں ایک نظریے کی شکل میں پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ 1757 سے 1813 تک کا پہلا سوداگرانہ (Mercantilist) مرحلہ براہ راست لوٹ کھسوٹ اور ایسٹ انڈیا کمپنی کی اجارہ دارانہ تجارت سے عبارت تھا۔ اس اجارہ دارانہ تجارت کا طریقہ یہ تھا کہ فاضل آمدنی سے ہندوستان خصوصاً بنگال کی تیار اشیاء کو من مانے اور سستے داموں خرید کر انگلینڈ نیز یورپ کے دوسرے ملکوں کو برآمد کر دیا جاتا تھا۔ انگلینڈ کے صنعتی انقلاب کے نتیجے میں تجارت کی ساری وضع ہی الٹ پلٹ ہو گئی اور 1813 سے 1858 تک کے برسوں میں آزاد تجارت پر مبنی صنعتی سرمایہ دارانہ استحصال کا ایک بالکل نیا دور سامنے آیا جس کے نتیجے میں ہندوستان کو مانچسٹر کے کپڑوں کی ایک وسیع منڈی اور خام مال فراہم کرنے والے ملک کی حیثیت دیدی گئی اور ہندوستان کی روایتی دستکاریوں اور

حرفوں کا گلا گھونٹ دیا گیا۔ یہ وہ دور تھا جس میں "کپاس پیدا کرنے والی سرزمین میں ہی کپاس کی بھرمار کردی گئی تھی" (مارکس)۔ انیسویں صدی کے نصف آخر سے اصل سرمایے کی کسی قدر برآمد کاری نیز برطانوی کنٹرول والے بنکوں، تجارتی فرموں اور انتظامی ایجنسیوں کے جال کے پھیلاؤ کی شکل میں مالیاتی سامراج کا شکنجہ مضبوط ہوتا چلا گیا۔

جیسا کہ خود آر۔ پی۔ دت نے بھی متعدد بار اشارہ دیا ہے، اس صورت حال کی مختلف ادوار میں تقسیم (Periodisation) من مانے اور غیر منطقی طریقے پر کی گئی ہے۔ زیادہ حقیقت پسندانہ اور کارآمد طریقہ یہ ہوگا کہ اس تصور سے کام لیا جائے کہ مختلف مرحلے اس طرح غیر محسوس طریقے پر باہم مدغم رہے ہیں کہ استحصال کی پرانی شکلیں بالکل ختم نہیں ہوئیں بلکہ استحصال کے جدید طریقوں سے مربوط ہوتی گئیں۔ یہ بات 1870 کی دہائی میں اور اس کے بعد دولت کے بہاؤ (Drain of Wealth) پر ایک طائرانہ نظر سے اور بھی واضح ہو جاتی ہے جو کہ بہت جلد قوم پرستوں کی شکایت کا ایک اہم موضوع بن گیا تھا۔

دولت کا بہاؤ (Drain of Wealth)

1757 تک یورپی تاجر اپنے ملک میں زبردست مخالفت کے باوجود بھی ہندوستان میں چاندی لانے کے لیے مجبور تھے، کیونکہ ہندوستان کی سوتی اور ریشمی مصنوعات کی یورپ میں بہت کھپت تھی جبکہ مغربی مصنوعات (برطانیہ کے اونی کپڑے وغیرہ) کی ہندوستان میں برائے نام مانگ تھی۔ اس مسئلے کو پلاسی نے ڈرامائی طریقے پر حل کر دیا۔ اب بنگال کا مال غنیمت، اندرون ملک بلا محصول تجارت سے حاصل منافع اور فاضل دیوانی مالیہ ہندوستان میں انگریزوں کی اصطلاح میں "سرمایہ کاری" کے لیے کافی تھا، جو کہ دراصل ہندوستان کے خزانے کو خالی کر دینے (Drain) کا ہی ایک عمل تھا۔ کیونکہ بنگال میں فوجی فتوحات سے حاصل فوائد کو بنگال سے برآمداتی سامان کی خریداری کے لیے استعمال کیا جانے لگا تھا۔ مانچسٹر کے مقابلے کی وجہ سے بنگال کی سوتی اور ریشمی اشیاء کی برآمد کاری میں کمی کے نتیجے میں کمپنی کے علاوہ اس کے ملازمین نیز نجی تاجروں کے لیے ترسیل زر (Remittance) کے مسائل پیدا ہو گئے تھے۔ ترسیل زر کے مسئلے کو نیل کی کاشت کو ترقی دے کر اور چائے کی خریداری کے لیے چین سے افیون برآمد کر کے ابتدائی طور پر حل کرنے کی کوشش کی گئی اور پھر 1850 کی دہائی کے بعد ہندوستان سے، خصوصاً مغربی ہندوستان سے کپاس، پنجاب سے گندم، بنگال سے جوٹ، آسام سے چائے، جنوبی ہند سے تلہن، چمڑے وغیرہ جیسی اشیاء کی برآمد کاری میں تیزی سے اضافے کے ذریعے اس مسئلے کو کامیاب طریقے پر حل کیا گیا۔ برطانیہ کو رقوم کی یک طرفہ منتقلی کی ضرورت نہ صرف یہ کہ ہمیشہ ایک اہم

فیکٹر ہی رہی بلکہ وقت کے ساتھ ساتھ یہ ضرورت اور بھی بڑھتی گئی۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے لندن کے اخراجات نیز کمپنی کے حصے داروں کو منافع کی تقسیم کا سارا بار 1858 کے بعد سکریٹری آف اسٹیٹ کے انڈیا آفس کے مصارف میں تبدیل ہو گیا۔ جبکہ کمپنی کی فوجی کارروائیوں اور غدر کو کچلنے کی کارروائیوں کے اخراجات کی بدولت انگلینڈ میں ہندوستانی قرض پہلے ہی کافی بڑھ چکا تھا۔ اس سال کمپنی کے حصہ داروں کو معاوضے کی ادائیگی کے مصارف بھی شامل ہو جانے پر یہ قرض بے تحاشا بڑھ گیا تھا۔ اس کے ملکی اخراجات میں، برطانیہ کے ہندوستانی شعبوں، آرمی کے افسروں کی پنشن، نیز انگلینڈ میں فوجی اور دوسرے سامان کی خریداری نیز ہندوستان سے باہر آرمی کی تربیت، ٹرانسپورٹ اور مہموں کے اخراجات اور ریلوے کے سلسلے میں گارنٹی شدہ سود کی ادائیگی کے اخراجات بھی شامل تھے۔ مثال کے طور پر 02-1901 میں یہ گھریلو اخراجات (Home Charges) 17.3 ملین پونڈ (ایک کروڑ 73 لاکھ پونڈ) کے بقدر تھے جن میں سب سے بڑا حصہ، 6.4 ملین پونڈ، ریلوے سود کا تھا۔ ہندوستانی قرضے کا سود تین ملین پونڈ، آرمی کے اخراجات 1.3 ملین پونڈ، اسٹور سامان کی خریداری 1.9 ملین پونڈ اور پنشن اخراجات 1.3 ملین پونڈ کے بقدر تھے۔ اس سرکاری کھاتے میں ہندوستان میں تعینات انگریز عملے کے ذریعے ترسیل زر (Remittance) نیز ہندوستان میں پرائیویٹ انگریز تاجروں کے ذریعے ترسیل منافع کی رقم کو بھی شامل کرنا چاہیے۔ پونڈ اسٹرلنگ کے مقابلے میں چاندی کے سکے (روپے) کی قدر زر میں کمی آجانے کے نتیجے میں گھریلو اخراجات نیز ترسیل زر کے بار میں 1870 کی دہائی سے تیزی سے اضافہ ہوتا گیا۔

سر جان اسٹریچی نے اپنے 1888 کے خطبات میں دولت کے بہاؤ (Draim of Wealth) کے طریقہ کار کی بڑی صفائی کے ساتھ اور کسی لاگ لپیٹ کے بغیر وضاحت کی تھی۔ "سکریٹری آف اسٹیٹ بلوں کی ادائیگی ہندوستان میں سرکاری خزانے سے کراتے ہیں اور ہندوستان میں عوامی مالیہ سے ادا کیے جانے والے ان بلوں کے ذریعے سوداگر وہ رقم حاصل کر لیتا ہے جس کی اسے ہندوستان میں ضرورت ہوتی ہے اور سکریٹری آف اسٹیٹ کو وہ رقم حاصل ہو جاتی ہے جس کی انگلینڈ میں ضرورت ہوتی ہے" انڈیا صفحہ 115)۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ ہندوستان میں برآمداتی سامان کی خریداری کا ارادہ رکھنے والے انگریز تاجر اسٹرلنگ (جو کہ ہوم اخراجات کے لیے مستعمل تھا) کے بدلے میں سکریٹری آف اسٹیٹ سے کاؤنسل کے بلوں کو خرید لیتے تھے اس کے بعد ان کاؤنسل بلوں کو حکومت ہند کے مالیہ سے روپے میں تبدیل کرالیا جاتا تھا اور اس روپے سے ہندوستان کے برآمداتی سامان کی خریداری کا کام لیا جاتا تھا۔ دوسری طرف ہندوستان میں تعینات انگریز عملہ اور انگریز تاجر اپنی تنخواہ یا منافع کی رقم سے جو کہ روپے کی شکل میں ہوتی تھی انگریزوں کے ایکسچینج بنکوں سے اسٹرلنگ بل خرید لیتے تھے اور ان ایکسچینج بنکوں کی

لندن شاخ ان اسٹرلنگ بلوں کا بھگتان پونڈ کی شکل میں اس رقم سے کرتی تھی جو ان ہندوستانی برآمدات سے حاصل ہوتی تھیں جس کی خریداری اسٹرلنگ بلوں کی فروخت کے ذریعے حاصل کیے گئے روپے سے کی گئی تھی۔اس سلسلے میں حسب ذیل ڈایاگرام مددگار ہو سکتا ہے۔

حکومت ہند کا مالیہ
ہندوستانی سامان کی خریداری کے لیے درکار روپے
روپے میں بھنائے گئے کاؤنسل بل
گھریلو اخراجات کے لیے درکار پونڈ
سکریٹری آف اسٹیٹ
ہندوستانی برآمدات
ہندوستانی سامان کے انگریز خریدار
کاؤنسل بل
ہندوستانی برآمدات
ایکسچینج بنک
(ہندوستانی شاخیں)
پونڈ میں فروخت کی گئی ہندوستانی برآمدات
ایکسچینج بنک (انگلینڈ تاجر)
ہندوستانی برآمدات کی خریداری میں استعمال روپیہ
پونڈ میں بھنائے گئے اسٹرلنگ بل
اسٹرلنگ بل
پونڈ
نجی ترسیل زر

اس طرح گھریلو اخراجات اور ترسیل زر کے لیے ہندوستانی بر آمدات کا وسیلہ اختیار کیا جاتا رہا اور جیسا کہ ناروجی اور ان کے بعد دیگر قوم پرست ماہرین اقتصادیات کا بھی کہنا تھا، ہندوستان کے خزانے کو خالی کر کے انگلینڈ کے خزانے کو بھرنے (Drain of wealth) کا یہ عمل ہندوستان کی بر آمداتی توفیر (Surplus) کی شکل میں جاری رہا۔ چنانچہ دولت کا سوداگرانہ بہاؤ در اصل آزاد تجارت کی شکل میں کیے جانے والے استحصال کے ساتھ ساتھ برطانوی ہند کی مالیاتی سرمایہ دارانہ ذہنیت سے بھی جڑا ہوا تھا۔

ہندوستان کی یہ برآمداتی توفیر (Export Surplus) انیسویں صدی کے اواخر میں برطانیہ کی ادائیگیوں کے توازن کے پیچیدہ طریقہ کار کے لیے بہت اہم ہو گئی تھی۔ امریکہ اور مغربی یوروپ کی دوسری ترقی پذیر معیشتوں میں تجارتی محصولات کی ایک مضبوط دیوار کھڑی ہو جانے کی وجہ سے برطانیہ کی اپنی معیشت زبردست خسارے کا شکار ہو گئی تھی۔ کیونکہ زرعی اشیاء در آمد کرنے کی اسے اب بھی بہت ضرورت تھی جبکہ تحفظاتی پالیسیوں کی وجہ سے اس کے اپنے تاجروں اور پیداکاروں کے لیے منڈیاں نہیں مل رہی تھیں۔ اس سلسلے میں ہندوستان دو لحاظ سے بہت اہم ثابت ہوا۔ ہندوستان میں اسٹریچی کے لفظوں میں "مکمل آزاد تجارت کے نظریے کو کسی دوسرے ملک کی بہ نسبت زیادہ سختی سے برقرار رکھنے کا عملاً مطلب یہ تھا کہ ہندوسان کو لنکاشائر کے کپڑوں کی کھپت کے لیے ایک یرغمالی منڈی بنائے رکھا جا سکے۔ دوسرے یہ کہ بڑے پیمانے پر زرعی اشیاء اور دوسرے خام مال کی برآمدکاری کی وجہ سے برطانیہ کے علاوہ دوسرے ملکوں کے ساتھ بھی ہندوستان کی برآمداتی توفیر سے دوسرے ملکوں کے ساتھ ساتھ برطانیہ کے تجارتی خسارے کو بھی پورا کر دیا جاتا تھا۔ یہ صورت حال جنگی اور فوجی فوائد کے علاوہ دوسرے کئی لحاظ سے بھی برطانیہ کے لیے بہت سود مند ثابت ہوئی۔

دولت کے بہاؤ کے نظریے کو شروع سے ہی تنقید کا نشانہ بنایا جاتا رہا ہے اور اس سلسلے میں قوم پرستوں کے بعض فارمولے اب کسی قدر تشنہ اور مبالغہ آمیز معلوم ہونے لگے ہیں۔ یہ کہا جاتا ہے کہ دولت کے بہاؤ کے سلسلے میں قوم پرستوں نے مبالغے سے کام لیا ہے کیونکہ غیر ملکی تجارت اور برآمداتی توفیر ہندوستان کی قومی آمدنی کا ایک معمولی حصہ رہی ہوگی۔ مگر ناروجی کی بات میں یقیناً بہت وزن تھا جب انھوں نے 1895 میں Welby کمیشن کو بیان دیتے ہوئے یہ کہا تھا کہ ہندوستان سے ہماری جو دولت باہر لے جائی جا رہی ہے وہ ایک ایسا Surplus (توفیر) ثابت ہو سکتی تھی جو ملک میں مناسب سرمایہ کاری کی صورت میں ہندوستان کی آمدنی میں قابل لحاظ اضافے کا باعث ہوتی۔ اس سلسلے میں سامراجی حلقوں کی طرف سے دفاع کرتے ہوئے اسٹریچی کا یہ کہنا تھا کہ "ہندوستان میں انجام دی گئی انگریزی خدمات کے معاوضے یا انگلینڈ کے

سرمائے میں توسیع کے علاوہ برطانیہ کو ہندوستان سے کچھ اور نہیں ملتا ہے۔"(صفحہ 11)۔اس دلیل کے پہلے حصے سے واضح طور پر اچھی حکومت اور امن و قانون کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جو انگریزوں کی دین ہے اور کسی قدر بحث کی متقاضی بھی ہے۔اس بہاؤ کے معاشی پہلوؤں کا دفاع اس بنیاد پر کیا گیا ہے کہ انگلینڈ میں اسٹور کی خریداری کی جارہی تھی اور لندن کے سرمایہ بازاروں سے اتنی کم شرح سود پر قرضے حاصل ہو رہے تھے جو کہ 19ویں صدی کے ہندوستان میں ممکن نہیں تھے۔ویسے یہ بھی کہا جاسکتا ہے،اور قوم پرست ماہرین اقتصادیات نے ایسا کہا بھی ہے کہ (یہ قرضے اور یہ خریداریاں ہندوستان میں ہونے کی صورت میں)اگر نسبتاً زیادہ ادائیگی کرنی بھی پڑتی تو بھی وہ رقم ملک کے اندر ہی رہی ہوتی۔ بہر حال اہم نکتہ وہ ہے جس کی طرف اسٹریچی نے "برطانیہ کے اصل سرمائے میں توسیع" سے اشارہ کیا ہے۔ریلوے،چائے کے باغات کانوں یا ملوں میں کی گئی انگریزی سرمایہ کاری سے حاصل منافع کی ترسیل زر کو اس بنیاد پر حق بجانب ثابت کرنے کی کوشش کی گئی کہ اس طرح کی باتوں سے بالآخر ہندوستان کی ترقی اور جدید کاری بھی تو ہو رہی تھی۔ بنیادی موضوع ترقی کی وضع ہے اور یہ مفروضہ،جو کہ کبھی بہت عام تھا کہ برطانوی حکمرانی سے یورپ والی خطوط پر ہندوستان میں بھی حقیقی جدید کاری کا عمل سست رفتاری سے ہی بالکل اسی طرح جاری تھا جس طرح کہ اس سے پہلے مغربی یورپ میں جاری رہ چکا تھا،شدید نکتہ چینی کا موضوع بنا ہے۔

صنعتی تباہی(Deindustrilisation)

برطانوی افسران میں ہندستانی کی دست کاریوں اور دیسی مصنوعات کے زوال کے تئیں چشم پوشی سے کام لینے کا رجحان عام تھا۔جو کہ ایک افسوس ناک مگر ناگزیر حقیقت تھی۔جدید کاری کی قیمت کے طور پر ہندوستان میں بھی مشینوں کے سبب دست کاریوں کا زوال ناگزیر تھا۔ بہر حال انگلینڈ میں دست کاریوں کے زوال کے نتیجے میں پیدا ہونی والی مشکلات کا روزگار اور آمدنی کے بھاری مواقع والے کارخانوں کی وجہ سے بہت جلد ازالہ ہو گیا۔ جہاں تک ہندوستان کی نوآبادیاتی صورتحال کا سوال تھا تو چھ ہزار میل دور حاصل کی جارہی ترقی کا بار یہاں کی دست کاریوں کو برداشت کرنا پڑ رہا تھا کیونکہ ہندوستان میں 1850 اور 1860 کی دہائیوں سے پہلے فیکٹری کارخانے نام کی کسی چیز کا وجود تک عمل میں نہیں آیا تھا اور اس کے بعد بھی صنعت کاری کا عمل تکلیف دہ حد تک سست رفتاری کا ہی شکار رہا تھا،یہ بات تو کہیں اب جاکر امریکی مورخ مورس ڈی مورس کو کہنی پڑی ہے کہ نا صنعت کاری(Deindustrilisation) کا یہ عمل بذات خود ایک محض خیالی بات (Myth) ہے۔ مردم شماری کے ماقبل دور اور مردم شماری کے بعد کے دور میں دست کاریوں کے زوال کو اعداد و شمار کے ذریعے ثابت کرنا یقیناً مشکل ہے۔کیونکہ 1881 اور 1931 کے دوران کی

مردم شماری کے اعداد و شمار، جن کا قوم پرست مسلسل حوالہ دیتے رہے ہیں Daniel Thorner کے مطابق درجہ بندیوں کے سلسلے میں ابہام کا شکار رہے ہیں اس لیے ان سے مختلف صنعتوں پر منحصر آبادیوں کے باہمی تناسب کی بابت کوئی واضح اشارہ نہیں مل پاتا۔ قوم پرستوں نے غیر ملکی تجارت کے سلسلے میں ان اعداد و شمار پر بہت زیادہ انحصار کیا جن سے ہندوستانی کپڑوں کی روایتی برآمد کاری میں بھاری کمی اور لنکا شائر کے کپڑوں کی درآمد کاری میں تیز رفتار اضافے کی نشان دہی ہوتی تھی مگر ان اعداد و شمار کو ہندوستان کی کل داخلی پیداوار میں کمی کے ثبوت کے طور پر تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔ مزید یہ کہ دست کاریوں اور حرفوں کے زوال کو قوم پرستوں کے عوامی لٹریچر کا واحد یکساں محرک بھی قرار نہیں دیا جا سکتا۔ مقامی درباروں اور بیرون ملک مانگ ختم ہو جانے پر سب سے پہلے ڈھاکہ اور مرشد آباد کی اعلا قسم کی سوتی اور ریشمی ململ کی صنعت پر زد پڑی ہو گی جو کہ شہری تعیش کی چیز تھی۔ دور دراز کے علاقوں اور خاص طور پر مشرقی ہند کے ماسوا علاقوں میں جہاں کہ انگریزی تسلط بہت بعد میں قائم ہوا دست کاریاں کافی عرصے تک باقی رہیں اور اگر یہ دست کاریاں ان علاقوں میں متاثر ہوئیں بھی تو ریلوے نظام کے آغاز کے بعد! جَجمانی نظام بھی کافی بعد تک برقرار رہا جس کے تحت دست کار طبقے فصل کی کٹائی کے وقت غلے کی متعینہ مقدار کے بدلے میں کسان اور اس کے اہل خاندان کو اپنی خدمات فراہم کرتے تھے۔ 1930 کی دہائی سے یہ طریقہ کار Weiser اور Beidelmann جیسے ماہرین سماجیات کی تحقیق کا موضوع رہا ہے۔ تارا شنکر بندھو پدھائے کے گن دیوتا۔ جیسے ناولوں میں 1920 اور 1930 کی دہائیوں کے دوران مغربی بنگال کے ایک اندرونی ضلع کی دیہی زندگی کا نقشہ کھینچتے ہوئے جَجمانی نظام کے زوال کو ایک انوکھی بات بتایا گیا ہے۔

صنعتی تباہی کے نظریے کا توڑ کرتے ہوئے موریس نے جو دلیلیں پیش کی ہیں وہ قیاسی اور مبہم معلوم ہوتی ہیں۔ موریس کا کہنا ہے کہ لنکا شائر کے کپڑے کی درآمد کاری میں اضافے کے باوجود بھی خود اندرون ملک ہندوستانی کپڑوں کی صرف یہ کہ برقرار رہی ہو گی بلکہ اس میں اضافہ بھی ہوا ہو گا کیونکہ کپڑوں کی مانگ سپلائی سے زیادہ رہی ہو گی، مگر اندرون ملک دیسی کپڑے کی مانگ میں اضافے سے متعلق کسی طرح کے اعداد و شمار نہیں دیئے گئے ہیں اور اس دلیل میں کہ درآمد شدہ سوت کی قیمت کم ہونے کی وجہ سے دیسی بنکروں کو فائدہ پہونچا ہو گا، اس حقیقت کو نظر انداز کر دیا گیا کہ ہندوستانی کتائی کار (Spinners) تباہ ہو گئے تھے اور بنی ہوئی اشیاء کی قیمتوں میں بھاری گراوٹ لازمی تھی جبکہ اس طرح کی مشینوں کا استعمال ہندوستان سے ہزاروں میل دور انگلینڈ میں ہو رہا تھا۔ کتائی اور بنائی، دونوں کی لاگت میں کمی آ جانے کے نتیجے میں لنکا شائر کے کپڑا صنعت کاروں کو زبردست فائدہ ہوا، سستے درآمدی سوت کے استعمال سے ہندوستانی بنکروں کو بھی فائدہ تو ہوا مگر

بنائی کی لاگت میں کوئی کمی نہیں آئی اور اس پر بھی انھیں در آمدی کپڑوں کی کم قیمت کا بھی مقابلہ کرنا پڑتا تھا جیسا کہ Toru Matsui نے موریس کو ترکی بہ ترکی جواب دیتے ہوئے لکھا تھا کہ ان حالات میں "ہندوستانی بنکروں کی حالت میں سدھار بہت مشکل تھا" (انڈین اکونومک اینڈ سوشل ہسٹری ریویو 1968)۔

صنعت کی تباہ کاری (Deindustrilisation) کو ایک حقیقت سمجھا جاتا تھا اور مردم شماری، خشک سالی سے متعلق رپورٹوں اور علاقائی صنعتی جائزوں جیسے سرکاری ماخذات کی بنیاد پر اس سلسلے میں بہت سارے منتشر اعداد و شمار بھی پیش کیے گئے۔ یہاں بنگال کے پیداکاروں سے متعلق 1890 میں Collin کے سروے اور 1908 میں Cummings کے سروے کا حوالہ دیا جا سکتا تھا۔ آخرالذکر سروے میں یہ دلچسپ نکتہ بھی پیش کیا گیا ہے کہ 1905 کی سودیشی تحریک بہت سارے دیسی حرفوں کے لیے نجات دہندہ ثابت ہوئی تھی کیونکہ اس تحریک کی وجہ سے دیسی چیزوں کی مانگ میں اچانک بہت اضافہ ہو گیا تھا۔ حال ہی میں امیہ باگچی نے انیسویں صدی کے اوائل کے بہار کے چند اضلاع سے متعلق Bachanan اور Hamilton کے سروے کا 1901 کی مردم شماری کے اعداد و شمار کے ساتھ شماریاتی موازنہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کے اخذ کردہ نتائج کے مطابق صنعتوں پر منحصر آبادی کا تناسب 18 فی صد سے گھٹ کر 8 فیصد رہ گیا تھا اور کتائی کاروں اور بنکروں کی تعداد میں بھی بھاری کمی آگئی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس معاملے میں قوم پرست ماہرین اقتصادیات غلطی پر نہیں تھے (ڈی انڈسٹری لائی زیشن ان گنجیٹک بہار 1901-1809)۔ زیر نظر دور کی تحریکات کو سمجھنے کے لیے دست کار طبقے کی مشکلات کو ایک اہم عامل کے طور پر ذہن نشیں رکھنا ضروری ہے، یعنی یہ کہ ہندوستانی صنعتوں کی تباہی کے عمل نے کس طرح انتہا پسند، مارکسی، اور گاندھیائی غرضیکہ ہر طرح کے انداز فکر کے حامل دانشور طبقے کو قوم پرستانہ جذبات سے معمور کر دیا تھا اور یہ کہ دیہی اور شہری علاقوں میں بسا اوقات کس طرح تشدد بھڑک اٹھنے کا باعث ہوتا تھا۔

زراعت کی تجارت کاری

ریلوے کی تعمیر (1859 میں محض 432 میل، محض دس سال بعد 5000 میل، اور صدی کے خاتمے تک تقریباً 25000 میل)، بر آمدات میں اضافے (بالخصوص 1860 کی دہائی میں جب امریکہ کی خانہ جنگی کی وجہ سے لنکاشائر کے کپڑا مل چند برسوں کے لیے دکن کی کپاس پر منحصر ہو کر رہ گئے تھے)۔ پھر 1880 کی دہائی میں اور 1890 کے اوائل میں کپاس کی افراط اور زراعت کی تجارت کاری کے باہم مربوط عمل کو بسا اوقات ہندوستان کی جدید کاری کی علامت کے طور پر پیش

کیا جاتا ہے۔ رجعت پسندانہ معاشیات میں تجارت کاری کا رشتہ زرعی پیداوار کی توفیر (Surplus) کی ترقی اور دیہی خوش حالی کے ساتھ قائم کیا جاتا ہے۔ اس سلسلے میں کاشت کار طبقوں کے مابین تفریق کے ذریعے سرمایہ دارانہ کاشت کی بات بھی کہی جا سکتی ہے جس میں غریب کسانوں کی مشکلات تو بڑھتی ہیں مگر پیداوار میں بتدریج اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ مگر دوسرے امور کی طرح اس معاملے میں بھی نوآبادیاتی نظام کی اپنی ہی گڑھی ہوئی بالکل الگ منطق تھی کیونکہ تجزیہ کرنے پر زراعت کی تجارت کاری ایک ایسے مصنوعی اور جبریہ عمل کی شکل میں سامنے آتی ہے جس میں کسی حقیقی زرعی نمو کے بغیر بھی کسان طبقات کے مابین خط امتیاز قائم کیا جاتا ہے۔

تجارت کاری کا عمل فصل بہ فصل ایک دوسرے سے مختلف نوعیت کا تھا۔ چنانچہ چائے کے لیے جو کہ کم آبادی والے علاقوں کے لیے ایک اختراع تھی، براہ راست انگریزوں کے ذریعے بندوبست کی ضرورت تھی جبکہ اس کے لیے مزدوروں کی بھرتی دور دراز کے علاقوں سے قرار نامے کی بنیاد پر ہوتی تھی جو کہ ایک طرح کیغلامی ہی ہوتی تھی۔ مغربی بنگال میں نیل کی کھیتی کسان ہی کرتے تھے مگر وہ بھی محض ناپسندیدہ قسم کے گورے کاشت کاروں کے جبر و تشدد کے ذریعے یہ کھیتی کرتے تھے۔ انگریز کاشت کار اپنی رعیت کو پیشگی رقم لینے کے لئے مجبور کر دیتے تھے، کیونکہ نیل کی کاشت سے منافع بہت کم ہونے کے علاوہ اکثر غیر یقینی بھی رہتا تھا جس کی وجہ سے فصل کا چکر ٹوٹ جایا کرتا تھا۔ بہر حال مغربی بنگال میں جوٹ کی کاشت کے سلسلے میں کسی طرح کے جبر کی ضرورت نہیں پڑتی تھی کیونکہ اس کی کھیتی چاول کی کھیتی سے زیادہ سود مند تھی۔ فصل بہ فصل اس طرح کا فرق موجود ہونے کے باوجود بھی کچھ مشترک خصوصیات بھی تھیں۔

19ویں صدی کے نصف آخر تک ملک کی غیر ملکی تجارت، جہاز رانی اور بیمے پر برطانیہ کے کاروباری گھرانوں کا مکمل کنٹرول قائم ہو چکا تھا۔ چنانچہ برآمدات سے حاصل آمدنی کا سب سے بڑا حصہ غیر ملکی فرموں کی دست برد میں آکر Foreign Leakages کی شکل میں ملک سے باہر چلا جاتا تھا۔ اس آمدنی میں دوسرا بڑا حصہ ہندوستانی تاجروں، مہاجنوں اور ان بچولیوں کا ہوتا تھا جو کسانوں کو زر پیشگی دیا کرتے تھے اور اس طرح پیداوار پر اپنا کنٹرول قائم کر لیتے تھے۔ ان پیشگی رقموں کی ضرورت لگان کی وجہ سے پیش آتی تھی جیسا کہ حال ہی میں ضلع گورکھپور میں گنے کی کاشت کے تجزیے کے نتیجے میں بھی یہ بات سامنے آئی ہے۔ سرمایہ دارانہ عمل دخل بہت بڑھ جانے کے نتیجے میں زمینداروں اور مہاجنوں کے استحصالی ڈھانچے کو مزید استحکام حاصل ہوتا ہے۔ (چینی ملیں کسانوں سے گنا اکٹھا کرنے کے لیے مقامی زمینداروں اور مہاجنوں کی خدمات ٹھیکدار کی حیثیت میں حاصل کر لیتی ہیں)۔ اب بعض علاقوں میں کچھ متمول کسان بھی یہی کردار اختیار کرنے لگے ہیں۔ چنانچہ دکن میں کپاس کی پٹی، یعنی آندھرا پردیش اور تامل ناڈو میں گوداوری، کرشنا

اور کاویری کے ڈیلٹا میں اور پنجاب میں آب پاشی کی سہولت سے مالا مال علاقوں میں بھی ایسا ہی ہو رہا ہے۔ بہر حال ہندوستانی کسان کو سات سمندر پار کی ایک ایسی انجان غیر ملکی منڈی کا محتاج بنا دیا گیا تھا جس کے ساتھ اس کا کسی بھی طرح کا تعلق محض دلالوں کے وسیلے سے تھا اور قیمتوں میں اتار چڑھاؤ کا بار بھی اسے ہی برداشت کرنا پڑتا تھا۔ 1880 کی دہائی کی کپاس کی گرم بازاری اتنے ہی ڈرامائی طریقے پر ٹھنڈی بھی پڑ گئی تھی (بمبئی میں ایک پاؤنڈ خام کپاس کی قیمت 1859 میں دو آنے سات پائی، 1864 میں گیارہ آنے پانچ پائی اور 1868 میں محض چھ آنے دو پائی تھی)۔ 1860 کی دہائی میں دکن میں کپاس کی پٹی کی خوش حالی 1870 کی دہائی کے وسط کی قرضداری، خشک سالی اور زرعی بلوے فساد کا شکار ہو گئی۔ 1870 کی دہائی سے 1890 کی دہائی تک زرعی اشیاء کی عالمی قیمتوں میں گراوٹ سے (جس کی وجہ شمالی امریکہ، ارجنٹینا اور آسٹریلیا کی طرف سے سپلائی میں بھاری اضافہ تھا) ہندوستانی گندم ور کپاس بھی متاثر ہوئی۔ جیسا کہ آگے چل کر جائزہ لیا جائے گا، انیسویں صدی میں اسٹرلنگ کے مقابلے میں روپے کی قدر زر میں مصنوعی کمی کا بہت خراب اثر 1930 کی دہائی کی بھیانک سرد بازاری (Depression) کی شکل میں سامنے آیا۔

بڑی برآمد کار فرموں، چابکدست اور ماہر ہندوستانی تاجروں اور مہاجنوں کی پوزیشن ایسی تھی کہ وہ قیمتوں میں چڑھاؤ کے علاوہ قیمتوں میں اتار کی حالت میں بھی منافع کما سکتے تھے، البتہ پیداواری سرمایہ کاری یا تجدید کاری میں ہر حال میں جوکھم ہوتا تھا۔ جو کسان تھوڑی بہت رقم بٹور لیتا تھا وہ تجارت کی طرف یا سود خوری کی طرف رخ کر لیتا یا اپنی زمین کو ذیلی لگان داری یا بٹائی پر دے دیتا تھا۔ اس طرح وہ اپنی جمع پونجی کو کھیتی میں نہ لگا کر، سارے پیداواری جوکھموں کو کہیں اور منتقل کر دیتا تھا، جہاں تک بڑی اکثریت والے غریب کسانوں کا تعلق تھا تو زراعت کی تجارت کاری ان کے لیے ایک جبریہ عمل بن گئی تھی کیونکہ مال گزاری اور لگان کی ادائگی کے لیے نقد رقم کی ضرورت ہوتی تھی۔ ایک مرتبہ کوئمبٹور کے کسانوں نے انگریز کلکٹر سے یہ کہا تھا کہ وہ محض اس لیے کپاس پیدا کرتے ہیں کہ وہ اسے کھا نہیں سکتے۔ اگر وہ کوئی اناج پیدا کر رہے ہوتے تو اسے خود ہی کھا جاتے۔ وہ اب اگرچہ بھوکے پیٹ رہتے ہیں مگر ان کے پاس کم سے کم اتنا تو پیسہ ہوتا ہی ہے کہ وہ مال گزاری ادا کر سکیں۔ مال گزاری اور لگان کے دباؤ کی وجہ سے گیہوں جیسی تجارتی اور نسبتاً مہنگی فصلوں کی کاشت شروع ہو گئی تھی جس کی وجہ سے غریب لوگوں کا پیٹ بھرنے والے جوار، باجرہ اور مکئی جیسے موٹے اناج اور دالوں وغیرہ کی کاشت کا کم ہو جانا لازمی تھا، جس کی وجہ سے اکثر خشک سالی کے زمانے میں حالات بہت خراب ہو جاتے تھے۔ مہاجنوں پر بڑھتا ہوا انحصار بھی اس کا ایک دوسرا ناگزیر نتیجہ تھا، کیونکہ تجارتی فصلوں کی تیاری میں زیادہ لاگت کی ضرورت ہوتی تھی جس کے لیے زیادہ پیشگی رقم لینی پڑتی تھی۔ اس طرح زراعت کی تجارت کاری کسان طبقوں کے مابین تفریق کو بڑھاوا دینے کا

سبب تو بنی مگر اس سے پیداوار میں حقیقی اضافے میں کوئی خاص مدد نہیں ملی۔

زمین سے متعلق روابط (Land Relations)

زراعت کی تجارت کاری کے بعض متعین نتائج زمینی ارابط کے ڈھانچے سے جڑے ہوئے تھے۔ یہ روابط انگریزوں کی مال گزاری اور لگان کی پالیسیوں کے نتیجے میں پیدا اور مستحکم ہوئے تھے۔ زمینداری اور رعیت واڑی کے نظام کے ارتقاء کو اس مطالعے کے دائرہ کار سے باہر رکھا گیا ہے۔ یہاں ہمیں صرف چند طویل مدتی رویّوں کو ہی نوٹ کرنے کی ضرورت ہوگی۔ انگریزوں کی زرعی پالیسیوں کی تشکیل میں زیادہ سے زیادہ مالیہ کمانے کی حرص اور برآمد کاری کے لیے مخصوص زرعی پیداوار کی حوصلہ افزائی کی خواہش کار فرما رہی تھی جبکہ سیاسی اتحادی اور انتظامی سہولیات پیدا کرنے اور قائم رکھنے کی ضرورت اور تغیر پذیر نظریاتی مفروضات نے بھی اس سلسلے میں اہم رول ادا کیا۔ اس کے علاوہ ارادوں میں مسلسل تبدیلی بھی قابل غور ہے۔ اس طرح استمراری بندوبست کو تشکیل دینے والوں کا یہ خیال کہ "جائداد کی جادوئی چھڑی سے چھودینے سے ہی......... ایک پیداواری اصول روبہ عمل آجائے گا" کبھی بھی شرمندۂ تکمیل نہیں ہوا۔ چنانچہ بنگال کے زمیندار کبھی بھی 18ویں صدی کے انگریز زمیندار والی پوزیشن حاصل نہیں کرسکے۔ من مانے طریقے پر مال گزاری وصول کرنے کی آزادی تو انھیں حاصل رہی جبکہ مالیہ جوں کا توں رہا، مگر ان زمینداروں نے سرمایہ جاتی کھیتی میں سرمایہ کاری کے جوکھم کے مقابلے میں جاگیردارانہ استحصال اور سود خوری کو ترجیح دی۔ مال گزاری میں اضافہ آسان تھا کیونکہ عوام 1770 کے قحط کے اثرات پر کسی قدر قابو حاصل کرچکے تھے اور 1815 میں Moira "کاشت کار طبقے کی تونگری" کی بات کر رہا تھا۔ بڑی بڑی جائیدادوں کی تشکیل کی بجائے زمینداری حصہ در حصہ ہوتی گئی تھی۔ انیسویں صدی ک اواخر میں بنگال اور بہار کی 110,486 بڑی بڑی جائیدادوں میں 88.5 فی صد کا رقبہ 500 ایکڑ سے کم تھا۔ ان بڑی جائیدادوں (زمینداریوں) کے تحت درمیان کی لگان داریاں بھی ہوتی تھیں جو بنگالی 'بھدرلوک' کے لیے سب سے بڑی معاشی اساس فراہم کرتی تھیں۔ چھوٹے زمیندار اور لگان دار کے لیے متمول ہونا لازمی نہیں تھا، بلکہ صدی کے خاتمے پر قیمتوں میں اضافے، سرکاری اور پیشہ جاتی نوکریوں کے مواقع میں کمی نیز لگان میں اضافے پر بندش کے نتیجے میں اس طبقے پر سخت زد پڑی تھی۔ لیکن زمین سے حاصل ہونے والی آمدنی کی وسیلہ جاتی نوعیت برقرار رہی۔ اس سے انجاپسندی اور سماجی کم آمیزی کے رویوں کو ایک دوسرے کے قریب آنے کا موقعہ ملا جس کا ہم بنگال میں قوم پرستی کی اساس کے طور پر جائزہ لیں گے۔

جہاں تک استمراری بندوبست والے علاقوں کے کسانوں کا تعلق تھا تو انگریزوں نے 1850

کی دہائی کے بعد وقتاً فوقتاً اپنی پالیسیوں کے ذریعے انگلینڈ کے معافی دار (Yeoman) کاشت کاروں کی طرز پر یہاں بھی کاروبار رعیت کا طبقہ تشکیل کرنے کی کوشش کی، مگر نو آبادیاتی صورت حال کی وجہ سے اس کوشش کا نتیجہ بالکل برعکس شکل میں سامنے آیا۔ جن مٹھی بھر مراعات یافتہ پٹہ داروں کو 1859 اور 1885 میں من مانی بے دخلی یا لگان میں یکطرفہ اضافے کے خلاف تحفظ فراہم کیا گیا تھا انھوں نے خود بہت کم کھیتی کی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ فصل کی بٹائی یا نزیلی لگان داری کے ذریعے کاشت کے مصارف اور جوکھم کو اپنے سے نیچے کے لوگوں کو منتقل کر دینے کا طریقہ برقرار رہا تھا۔ چنانچہ حقیقی پیداکار (جوت دار) اتنا دبا دیا گیا تھا کہ اس معاملے میں اس کی اپنی مرضی کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا جب کہ اس سے اوپر کے لوگوں نے منافع خوروں (Rentiers) کی ایک لمبی درجہ بندی قائم کر لی تھی جسے کسی طرح کا کاروباری جوکھم اٹھانے کی کوئی ضرورت نہیں ہوتی تھی اور اس کے نتیجے میں کسی زرعی اختراع یا ایجاد کی بھی کوئی گنجائش نہیں تھی۔

رعیت واڑی علاقوں میں بھی بنیادی وضع ایک دوسرے سے زیادہ مختلف نہیں تھی۔ کاشت کاروں کے ساتھ براہ راست معاملہ کر لینے کے نظریے کے باوجود بھی مدراس کی رعیت دھرم کمار کے الفاظ میں "اکثر ایسے زمیندار کی حیثیت حاصل کر لیتی تھی جو اپنی زمین لگان پر دیدیا کرتا تھا اور ایسا بطور خاص 1850 کی دہائی کے بعد ہوا کیونکہ لگان کی زیادہ تشخیص (اس سے پہلے جس کے لیے مالیہ افسروں کے ذریعے اذیت رسانی بھی ضروری سمجھی جاتی تھی) بتدریج کم کر دی گئی تھی (لینڈ اینڈ کاسٹ ان ساؤتھ انڈیا صفحہ 85)۔ رعیت واڑی علاقے کے لگان داروں کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا جن کی مشکلات اس وجہ سے اور بھی بڑھ گئی تھیں کہ وہ قانون سے ناواقف ہوتے تھے۔ حالیہ تفصیلی مطالعات سے اس سلسلے میں علاقائی فرق بھی سامنے آئے ہیں، مثلاً تنجاور کے بااثر رعیت واڑی زمیندار زرعی مزدوروں سے کام لیتے تھے، تامل ناڈو اور رایل سیما کے اندرونی غیر بارانی خطوں کے متمول کسانوں پر مشتمل اعلا طبقہ جو کہ بہت چھوٹا اور بکھرا ہوا تھا، تجارت اور سود خوری کی وجہ سے کاشت کار طبقے پر بری طرح حاوی تھا، جبکہ آندھرا ڈیلٹا میں متوسط درجے کے کسانوں کا ایک بہت بڑا طبقہ ترقی کر رہا تھا۔ گویا کی زمین کی نوعیت اور آب پاشی کی صورت حال نے کسانوں کی الگ الگ درجہ بندی کے معاملے میں اہم رول ادا کیا۔ مثال کے طور پر اس طرح بنگال میں، جہاں صدیوں سے دریاؤں کے پانی کا بہاؤ مشرق کی طرف منتقل ہوتا آرہا ہے، موری بند ڈیلٹا کے مغربی اضلاع میں اور مشرقی بنگال کے خوش حال اور متحرک ڈیلٹا میں ایک دوسرے سے قطعی مختلف صورتحال سامنے آتی ہے، وہ اس طرح کی موری بند ڈیلٹا میں کسان متمول کاشت کاروں کی، یا جوت داروں یا "برگ داروں" کی حیثیت حاصل کرتے جا رہے تھے جبکہ مشرقی بنگال کے خوش حال اور سرگرم ڈیلٹا میں موسم کی سازگاری اور جوٹ کے منافع کی وجہ سے چھوٹے اور درمیانی

درجے کے آزاد کسانوں کا بہت بڑا تناسب پیدا ہو رہا تھا۔ اس طرح علاقائی اختلافات آگے چل کر زبردست سیاسی مضمرات کے حامل ثابت ہوئے۔

جوت دار کسانوں اور لگان داروں کے نیچے زرعی مزدوروں کا ایک بہت بڑا انبوہ تھا جو قبائلی طبقوں اور نچلی ذاتوں سے تعلق رکھتے تھے۔ ایک تخمینے کے مطابق 1901ء میں ان کی اور ان کے لواحقین کی تعداد 52.4 ملین (پانچ کروڑ 24 لاکھ) یا کل آبادی کے 20 فیصد کے بقدر تھی۔ حال کی تحقیق سے پتہ چلتا ہے کہ یہ زرعی مزدور قوم پرستوں کی رائے کے برخلاف، نو آبادیاتی دور کی پیداوار نہیں تھے۔ یہ ممکن ہے کہ نو آبادیاتی حکومت سے منسوب بعض حالات اور اقدامات کے نتیجے میں دیہی پرولتاری طبقے کی تعداد اور خستہ حالی میں مزید اضافہ ہو گیا ہو۔ مثلاً جنوبی ہند میں نو آبادیاتی حکومت سے پہلے بھی ایسے کاشت کار بہت بڑی تعداد میں تھے جن کے پاس اتنی زیادہ زیر کاشت زمینیں ہوتی تھیں جن پر محض افراد کنبہ کے ذریعے کھیتی کرنا ممکن نہیں تھا، پھر یہ کہ بڑے طبقوں کے لوگ اپنے ہاتھ سے کام کرنا کسر شان سمجھتے تھے، پھر یہ کہ مالا بار علاقے کے چیرو مان (Cherumans) اور تامل علاقوں کے پارے یان (Paraiyans) جیسے اچھوت زرعی مزدوروں کی موجودگی کی بابت بھی کافی شواہد دستیاب ہیں۔ (دھرم کمار، لینڈ اینڈ کاسٹ ان ساؤتھ انڈیا)۔ اس معاملے میں ذات پات کے نظام نے بہت اہم رول ادا کیا تھا۔ کچھ گروپوں کے لیے فاضل زمینوں والے علاقوں میں بھی جوت داری کے دروازے مسدود کر دیئے گئے تھے اور اونچی ذات کے کاشت کاروں کو ان نیم غلام یا بندھوا مزدوروں کو اپنے طور پر کنٹرول کرنے دیا گیا۔ خاص طور پر فصلوں کی کٹائی کے موسم میں یا مزدوروں کی کمی کے حالات میں ان کاشت کاروں کو پوری چھوٹ حاصل رہی تھی۔ اس سلسلے میں سماجی دباؤ کے ساتھ ساتھ سود خوری کے کاروبار سے بھی کام لیا گیا۔ جیسا کہ جان بریمن (Breman) نے سورت کے اناول (Anavil) براہمنوں کی ڈبلا (Dubla) مقروض رعیت کا مطالعہ کرتے ہوئے دکھایا ہے کہ روایتی نظام میں استحصال سرپرستانہ تعلق کی وجہ سے کافی پیچیدہ ہونے کے ساتھ ساتھ کسی قدر قابل برداشت (MItigated) بھی ہو گیا تھا۔ چنانچہ ڈبلا مقروض مزدور (ہالی) اپنے آقاؤں کو دھن یامو، (دولت اور تحفظ فراہم کرنے والا) سمجھتے تھے۔ نو آبادیاتی (اور مابعد نو آبادیاتی) جدید کاری کے دور میں اس "سرپرستانہ تعلق" میں کمی کا رجحان رہا جس کے نتیجے میں استحصال ہنگامہ آرائی کا موضوع بن گیا اور اس سرپرستانہ تعلق کو قرض کی شرط پر مبنی لیز معاہدے میں تبدیل کر دیا گیا (جان بریمن، پیٹرونیج اینڈ ایکسپلائی ٹیشن، صفحہ 189)۔ Daniel Thorner کا کہنا ہے کہ "تاریخ ہند کے کسی بھی دوسرے دور میں اور متمول زمینداروں کے اتنے بڑے، اتنے منظم اور اتنے محفوظ کسی ایسے دوسرے گروپ کی نشانی ہی نہیں ہوتی جو اس طرح 1790 اور 1940 کی دہائیوں کے دوران

پروان چڑھا اور پھولا پھلا ہو" (لینڈ اینڈ لیبر ان انڈیا)۔

زمیندار اور متمول کسان اکثر تجارت کاری کے عمل میں بھی ملوث رہتے تھے، البتہ براہ راست زرعی پیداکاری میں سرمایہ کاری کی باقاعدہ ضرورت کا ہمیشہ فقدان رہا۔ سرمایہ کاری پر مبنی زراعت کے مقابلے میں، زمین کی ذیلی لگان داری، سود خوری اور تجارت وغیرہ کہیں زیادہ محفوظ اور منافع بخش تھی، جہاں کہیں بڑے بڑے کسان زرعی مزدوروں سے کام کراتے بھی تھے تو بھی کسی طرح کی تکنیکی اختراع (جدت) کے لیے کوئی ترغیب نہیں ہوتی تھی، کیونکہ ذات پات کے نظام، قرض داری اور سماجی دباؤ کا مارا ہوا۔ پرولتاری طبقہ بہت بڑی تعداد میں تھا، جس کا سارا انحصار اسی زرعی مزدوری پر تھا۔ چنانچہ نیم جاگردارانہ روابط کا استحکام ہمارے زرعی منظرنامے پر جدت کی بجائے نو آبادیاتی اثرات کی شکل میں ظاہر ہوا۔

زرعی پیداوار

1870 کی دہائی سے مرغ بانی وغیرہ کے لیے کچھ تقاوی قرضوں کے علاوہ حکومت نے زراعت کی بہتری پر کافی عرصے تک کوئی توجہ نہیں دی۔ البتہ پنجاب، مغربی اتر پردیش میں اور مدراس کے کچھ حصوں میں نہروں کے ذریعے آب پاشی کا بندوبست کیا گیا۔ یہ ایک دلچسپ بات ہے کہ استمراری بندوبست والے مشرقی ہندوستان میں آب پاشی کے لیے کسی طرح کی سرمایہ کاری نہیں کی گئی اور اس کی واحد وجہ بلاشبہ یہ رہی ہوگی کہ حکومت کو ان علاقوں میں زرعی پیداوار میں بہتری سے اپنے فائدے کی امید نہیں رہی ہوگی۔ قوم پرستوں کو آب پاشی کے محدود مگر حقیقی فوائد تسلیم تھے لیکن صوبہ جات متحدہ کی بابت Elizabeth Whilcombe کی حالیہ تحقیق میں برطانوی حکومت کے اس پہلو کو بھی تشکیک کی نظر سے دیکھا گیا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ روایتی کچے کنوؤں کے مقابلے میں انگریزوں کی بنائی ہوئی یہ نہریں ہندوستان کے مخصوص حالات سے بہت کم سازگار ثابت ہوئیں، بلکہ یہ نہریں اکثر زمین کو دلدلی بنا دینے یا شوریت میں اضافے کا بھی باعث ثابت ہوئیں۔ مزید یہ کہ اس کے سارے فوائد مٹھی بھر خوش حال اور بڑے کاشت کاروں تک ہی محدود رہے، کیونکہ نہری پانی کی شرحیں بہت زیادہ تھیں۔ پھر یہ کہ آب پاشی کے ذریعے گنے، کپاس اور گندم جیسی چیزوں کی کھیتی کی حوصلہ افزائی کے نتیجے میں موٹے اناج اور دالوں وغیرہ کی پیداوار کافی گھٹ گئی تھی جو کہ غریبوں کا پیٹ بھرنے کا ذریعہ تھیں۔ اس کے ساتھ ہی پنجاب جیسے علاقوں میں نہروں سے کچھ دوسرے فائدے بھی ہوئے جہاں بیکار پڑی ہوئی زمینوں پر بھی انگریزوں کی بنائی ہوئی نہروں کے ذریعے کھیتی شروع ہوئی۔ Deniel Thorner ہی کے الفاظ میں۔ "نو آبادیاتی ڈھانچے کی جو نوعیت تھی اس میں ہندوستان کی زرعی معیشت کی پسماندگی

میں بتدریج اضافہ لازمی تھا۔ اس بات کا واضح اشارہ 1870 کی دہائی کے اور پھر 1890 کی دہائی کے اواخر کے بھیانک قحط سے بھی ملتا ہے، جبکہ آخر الذکر قحط کے ساتھ ساتھ بھیانک طاعون بھی پھوٹ پڑا تھا، اور پھر اس کے 20 سال بعد ہی انفلوئنزا کی مہلک بیماری میں بیسیوں لاکھ لوگ لقمۂ اجل ہو گئے تھے۔ 1921 تک آبادی میں اضافہ بہت سست رفتاری سے یا بالکل ہی نہیں ہوا۔ (1891 میں 28 کروڑ 20 لاکھ، 1901 میں 28 کروڑ پچاس لاکھ، 1911ء میں 30 کروڑ 30 لاکھ اور 1921 میں 30 کروڑ 60 لاکھ)۔ ہندوستان میں عام غربت کے جو بھی اسباب رہے ہوں، مگر اس کی وجہ آبادی ہر گز نہیں تھی۔ یہ دوسری بات ہے کہ کچھ معذرت خواہ قسم کے مورخ اس طرح کی بات بھی کہہ چکے ہیں۔

نسبتاً زیادہ طویل مدتی سطح پر 1893 سے 1943 تک کے زرعی اعداد و شمار سے متعلق جارج Blyn کی تلاش و تحقیق سے ہندوستان کے زرعی ٹھہراؤ بلکہ زرعی زوال کی نشان دہی ہوتی ہے۔ 1893-96 کو بنیادی مدت مان کر 1936-1946 کی مدت میں اجناس کی پیداوار کا دس سالہ اوسط غذائی اجناس کے لیے 93، تجارتی اجناس کے لیے 185، اور بہ حیثیت مجموعی زرعی پیداوار کے لیے 110 تھا۔ 1921 کے بعد آبادی کے لحاظ سے صورت حال میں تبدیلی آجانے پر فی کس پیداوار کے اوسط میں کمی آنی شروع ہو گئی تھی۔ اس طرح 1936-46 میں تمام اجناس کا اوسط 80، اور غذائی اجناس کا اوسط 68 رہا تھا۔ بعد میں امیہ باگچی نے حساب لگا کر 1900-05 سے 1935-40 تک کی مدت کے لیے فی ایکڑ پیداواریت کی اس طرح کی وضع کا انکشاف کیا۔ فی ایکڑ تجارتی اجناس کی قدر میں بہت کم اضافہ ہوا، یعنی یہ قدر 36.7 روپے سے بڑھ کر محض 37.9 روپے ہوئی تھی جبکہ غذائی اجناس کی قدر میں کمی آگئی جو کہ 25.4 روپے سے گھٹ کر 22.7 روپے رہ گئی تھی۔ اسی طرح دوسری تمام اجناس کی قدر بھی 27.6 روپے سے گھٹ کر 26.3 روپے رہ گئی۔ (اے۔ کے۔ باگچی، پرائیویٹ انویسٹمنٹ ان انڈیا، صفحہ 95)۔

Blyn کے "بنگال عظمیٰ" کے علاقے میں قدر میں تیزی سے واقع ہونے والی کمی کے مقابلے میں مدراس اور پنجاب میں کسی قدر بڑھوتری بھی بہت اہمیت رکھتی ہے۔ مشرقی ہندوستان کی علاقائی پس ماندگی برطانوی حکمرانی کی آخری دہائیوں میں ایک تسلیم شدہ حقیقت تھی۔

غیر ملکی سرمایہ

اس دعوے کا کہ، برطانوی حکمرانی ملک کی جدید کاری کا وسیلہ ثابت ہوئی، سارا انحصار در اصل برطانوی سرمائے کے ذریعے ریلوے کی تعمیر، چائے باغات (چائے باگان) کی ترقی، کان کنی، فیکٹریوں کے قیام نیز گوروں کے ذریعے سرمایہ جاتی پیداواری روابط، بنکاری کے جدید طریقوں

اور صنعتی انتظام کے تعارف جیسے خانق پر ہے۔ یہ درست ہے کہ انگریزوں نے ہندوستان میں ریلوں کا بہت بڑا جال بچھایا، جس نے 1900ء میں دنیا میں پانچویں بڑے ریل نظام کی حیثیت حاصل کر لی تھی، مگر اس کے مجموعی اثر کا تجزیہ کرتے ہوئے 1881 کے ایک مکتوب میں مارکس کے اس تبصرے کو کہ ”ریل ہندوؤں کے لیے بیکار کی چیز تھی“ ان کی 1853 کی مشہور پیش گوئی سے زیادہ یاد رکھنے کی ضرورت ہے۔ جب ریل کی لائنیں پہلی بار بچھائی جارہی تھی تو انھوں نے ریل نظام کو ”جدید صنعت کا نقیب“ بتایا تھا۔ اگرچہ ریلوے ہی وہ واحد میدان ہے جس میں انگریزوں نے اتنے بڑے پیمانے پر سرمایہ لگایا مگر گارنٹی شدہ انٹریسٹ کا طریقہ اپنا کر اس کا بہت بڑا بوجھ ہندوستانی ٹیکس دہندگان کی طرف منتقل کر دیا گیا تھا۔ گارنٹی شدہ انٹریسٹ کے طریقے میں منافع نہ ہونے کی صورت میں بھی حکومت کم سے کم طے شدہ منافع ادا کرنے کی پابند تھی۔ اس سلسلے میں 1900 تک پانچ کروڑ پونڈ سے بھی زیادہ رقم کی ادائیگی کی گئی تھی۔ ”عوامی جوکھم پر مبنی نجی سرمایہ کاری“ کے اس نادر طریقے کی تحت بہت سے بے فائدہ کام بھی کیے گئے جو کہ بعد میں قوم پرستوں کی حق بجانب شکایت کا سبب بنے تھے۔

ریل کا یہ سارا جال انگریزوں کی تجارتی اور جنگی ضرورتوں کے لیے تیار کیا گیا تھا۔ ہندوستانی تاجروں کو بھاڑے کے معاملے میں اکثر امتیازی سلوک کی شکایت رہتی تھی۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ نوآبادیاتی ہندوستان میں ریل میں کی گئی سرمایہ کاری کے افزودنی اثرات (Multiplier Effcets) تقریباً ناپید ہی رہے۔ زیادہ تر ریلوے آلات برطانیہ سے ہی درآمد کیے گئے اور متعلقہ انجینئرنگ صنعتوں کو بھی نہیں کے برابر ترقی دی گئی، مثال کے طور پر آزادی سے قبل کی پوری مدت میں ہندوستان میں محض تقریباً 700 ہی انجن تیار کیے گئے تھے یہاں تک کہ 1921 میں بھی ہندوستانی محض دس فی صد اونچے عہدوں پر فائز تھے۔ اسی طرح ہنر مندی (Skills) کا پھیلاؤ بھی محدود رہا جبکہ ریل سرمایہ کاری کے ذریعے حاصل ہونے والی آمدنی کا ایک قابل لحاظ حصہ بیرون ملک بھی پہونچادیا جاتا تھا۔

چائے باغات، کان کنی، ملوں کارخانوں، بنک کاری، بیمے، جہاز رانی اور درآمد کاری، غرضیکہ سبھی میدانوں میں اختراع اور جدت سے کام لیا گیا، مگر ان شعبوں نے ہندوستان کی ترقی میں کیا رول ادا کیا، یہ بالکل دوسرا سوال ہے، کیونکہ اصل رُجحان تو غیر ملکی نگرانی میں اپنے لیے سرمایہ جاتی مواقع پیدا کرنے کا تھا جس کی وجہ سے معیشت کے باقی شعبوں کی ترقی کا راستہ مسدود ہو گیا تھا۔ ہندوستان جیسے حالات کے تناظر میں ”سرمایہ کی برآمد کاری“ کو اس وقت صد فیصد معنی حاصل ہو جاتے ہیں جب مثال کے طور پر ہمیں یہ بات یاد آجاتی ہے کہ 1870 کی دہائی میں بیرون ملک منافع کی ادائیگیاں سالانہ وصولی سے بھی بڑھ جاتی تھیں۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ علاقائی انحرافات کے

سلسلے میں چند حالیہ تجزیوں سے انکشاف ہوا ہے کہ اہم اور فیصلہ کن نوعیت کے عوامل پر انگریزوں کا ہی مکمل کنٹرول ہونے کی وجہ سے پورے نوآبادیاتی دور میں اندرون ملک سرمایہ کی نمو کی راہیں کس طرح مسدود ہو گئی تھیں۔

ہندوستان کی سرمایہ جاتی ترقی

بمبئی اور گجرات میں سرمایہ جاتی ترقی کے مقابلے میں بنگال میں اس کے فقدان کی توجیہ تجارت اور صنعت کے تئیں بنگالی عوام کی مبینہ عدم دلچسپی کی شکل میں کی جاتی رہی ہے۔ اس کے علاوہ دوامی بندوبست کے نتیجے میں زمین کی طرف سرمائے کے کھچاؤ کو بھی اس کی ایک وجہ بتایا جاتا رہا ہے۔ لیکن 1840 کی دہائی تک بھی اونچی ذات کے بنگالی قابل لحاظ تناسب میں تجارت اور دوسرے کاروبار میں لگے ہوئے تھے، جبکہ انیسویں صدی کے پورے عرصے میں بنگالی اخبارات اور رسالے اپنے اپنے قاریوں کو مسلسل آزاد تجارت اور دوسرے کاروبار کی خوبیوں اور فوائد سے آگاہ کرتے رہے تھے۔ پارسیوں کی کاروباری کامیابیوں کی وجہ ان کے اندر موجود احتیاط پسندی، جیسی کسی چیز کو بتایا جاتا تھا جبکہ نسبتاً زیادہ کامیاب گجراتی "ونیاؤں" (Vanyas) اور مارواڑیوں میں جدت پسندانہ ثقافتی قدروں کا ایک طرح سے فقدان تھا۔ اس طرح بنگالی براہمو (Brahmos) کو بھی جدت پسندی سے کوئی مدد نہیں ملی۔

جہاں تک زمینی روابط کا سوال ہے، تو ہم یہ پہلے ہی دیکھ چکے ہیں کہ زمینداری اور رعیت واڑی نظاموں کا اثر اتنا مختلف بھی نہیں تھا، جبکہ ایک حالیہ تحقیق میں اس روایتی نظریے کے بارے میں تشکیک ظاہر کی گئی ہے کہ استمراری بندوبست کی وجہ سے سرمایہ زمین کی طرف کھینچ گیا تھا۔ جیسا کہ امیہ باگچی کا بھی کہنا ہے، اس کی بحیثیت مجموعی آسان تر توضیح معیشت پر بیرونی سامراجی غلبے کے مختلف مدراج کے لحاظ سے کی جاتی ہے۔

انگریزوں کی موجودگی محض بمبئی کی صنعت کے خلاف محصولات اور آب کاری کی امتیازی پالیسیوں کے ذریعے ہی نہیں بلکہ ڈھانچہ جاتی دباؤں کی وجہ سے بھی دیسی سرمایہ کی تشکیل میں سد راہ ثابت ہوئی۔ گورے تاجروں اور گورے افسروں کے نسلی تعلق اور سماجی روابط کا پہلے بھی ذکر کیا جا چکا ہے۔ گوروں کو بے مہار چھوڑ دینے کی سرکاری پالیسی یوروپی کاروبار کے فروغ کا باعث ہوئی۔ (مثلاً گارنٹی شدہ انٹریسٹ نظام کے تحت ریل کی تعمیر اور آسام میں چائے باغات کے مالکوں کو برائے نام شرحوں پر زمین کے بڑے بڑے قطعات کا الاٹ منٹ وغیرہ)، جبکہ اس سلسلے میں ہندوستانیوں کے ساتھ امتیاز برتا گیا۔ ریل کا جال پھیل جانے اور محصولات کی امتیازی شرحوں کی وجہ سے اندرون ملک نقل و حمل کی سہولت میں بہتری آنے کی بجائے گودیوں میں سرگرمیاں

بڑھ گئیں تھیں۔ منظم سرمایہ بازار زیادہ تر انگریزوں کے ہی کنٹرول میں تھا اور 1914 سے پہلے محض پنجاب نیشنل بنک اور بنک آف انڈیا ہی دو بڑے ہندوستانی بنک تھے۔ ان میں سب سے اہم بات یہ تھی کہ انیسویں صدی میں ہندوستانی معیشت کی نمو کو بر آمداتی ضرورتوں کے تابع کر دیا گیا تھا اور یہ کہ ملک کی غیر ملکی تجارت کو انگریزوں نے اپنے بنکوں اور جہاز رانی کی کمپنیوں نیز تجارتی فرموں کے ذریعے اپنے کنٹرول میں لے رکھا تھا۔

گوروں کی اجتماعی اجارہ داری سب سے پہلے مشرقی ہندوستان میں قائم ہی نہیں ہوئی بلکہ سب سے زیادہ مدت تک وہاں بر قرار بھی رہی۔ اس کے مقابلے میں مغربی ہندوستان کے ہندوستانی (اور بالخصوص پارسی) تاجروں اور سوداگروں کا کچھ دوسرے ملکوں کے ساتھ بہت معمولی سا کاروبار تھا۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ مغربی ہندوستان میں انگریزوں کی سیاسی آمد کافی بعد میں ہوئی جس کی وجہ سے ہندوستانی تاجروں کے ساتھ اشتراک ضروری ہو گیا تھا۔ مغربی ہندوستان میں مقامی لوگوں کا سیاسی اقتدار 1818 میں مراٹھوں کے انحطاط تک بر قرار رہا تھا۔ اور اس انحطاط کے بعد باقی ماندہ دیسی ریاستوں نے جس طرح مفاہمت کا راستہ اپنا لیا تھا وہ بنگال کے سیاسی نقشے سے ٹکراتا ہے۔ ریل کی تعمیر سے پہلے بمبئی کے سمندر کے عقب کے علاقوں تک رسائی بہت مشکل تھی، پھر ان علاقوں میں نیل، چائے اور کوئلہ بھی نہیں تھا جو کہ ابتداء میں انگریزوں کی دلچسپی کا اصل سبب رہے تھے۔

بہر حال ہندوستان کی روایتی قسم کی کاروباری برادریاں بر قرار رہیں، اور کچھ تو پھلتی پھولتی بھی رہیں۔ لیکن ان کا کاروبار زیادہ تر مہاجنی تک ہی محدود رہا۔ انیسویں صدی کے نصف آخر میں مارواڑی اثرات کے دائرے میں شمالی، مشرقی اور وسطی ہندوستان کے زیادہ تر علاقوں تک توسیع ہو گئی۔ اس زمانے میں جنوبی ہندوستان کے Chettiar تاجروں اور مہاجنوں کی نقل و حرکت برما اور دوسرے جنوبی ایشائی ملکوں تک پھیلی ہوئی تھی۔

Timberg کے ایک حالیہ تجزیے میں پہلی عالمی جنگ کے زمانے تک مارواڑیوں کی خانگی فرموں کے انحصاری رول کو دستاویز بند کیا گیا ہے۔ اسی طرح تاراچند گھنشیام داس کی "بڑی فرم" نے، جس کا کہ اس مطالعے میں تفصیل سے جائزہ لیا گیا ہے، Shaw Wallace کے لیے بنیوں کی خدمت انجام دی تھی۔ اسی طرح کے تعلقات گوئینکا اور بالی برادرز کے درمیان، جھنجھوں والا اور گراہمس کے درمیان برجاتیا اور آندریو Yule کے درمیان بھی قائم رہے تھے۔

صرف مغربی ہندوستان میں، شروع شروع میں بمبئی میں اور بعد میں احمد آباد میں منیمی (نیابتی) تجارت (بمبئی میں چین کے ساتھ تجارت) کے ذریعے اکٹھا کیے گئے سرمائے کو گھریلو کپڑا صنعت میں لگا کر اس کا صحیح استعمال کیا گیا۔ ریل کی وجہ سے دکن کی خام کپاس اس کپڑا صنعت کے لیے پہلے

سے ہی دستیاب تھی۔ یہ ریل نظام 1960 کے دوران کپاس کی مختصر گرم بازاری کے دنوں میں قائم کیا گیا تھا۔ حالانکہ انگریزوں نے ایک ایسی ٹیکسٹائل صنعت میں، جو آگے چل کر مانچسٹر کا مقابلہ کر سکتی تھی سرمایہ کاری میں بہت کم دلچسپی لی۔

1870 کی دہائی کے وسط میں بمبئی کی ترقی پر لنکاشائر میں بے چینی پیدا ہونے لگی تھی۔ داخلی دباؤ کے تحت اختیار کی گئی غیر منصفانہ محصولاتی پالیسی بھی ہندوستانی دانشوروں میں قومی شعور کے نشوونما کا ایک اہم سبب بن چکی تھی۔ بہرحال بمبئی اور لنکاشائر کے درمیان نہ تو ایک بالکل عام سا تعلق تھا اور نہ ہی ٹکراؤ اور مقابلے کی ہی صورت تھی۔ تجارت مالیات اور صنعت کے باہمی انحصار کا جو کہ انتظامی ایجنسی نظام کی اہم خصوصیات میں شامل ہے، مطلب یہ تھا کہ بہت سے کپڑا ملوں کا درآمد شدہ سوت کی تجارت سے تعلق تھا، بمبئی کے کپڑا ملوں کا بہت زیادہ انحصار یوروپی تکنیکی مہارت پر، اور سارا انحصار درآمدہ شدہ مشینوں پر تھا، بیسویں صدی کی ابتدائی دہائیوں سے پہلے بمبئی اور مانچسٹر کے کپڑا ملوں کے درمیان کوئی عام ٹکراؤ نہیں تھا۔ اس کے بہت سی تکنیکی اسباب تھے۔1890 کی دہائی تک بمبئی کے ملوں نے کپڑے کی تیاری کی بجائے اصل توجہ روئی کی کتائی اور سوت کی تیاری پر مرکوز رکھی تھی اور اس طرح تیار کیا گیا سوت زیادہ تر مشرق بعید کو برآمد کر دیا جاتا تھا یا پھر ہندوستانی ہتھ کرگھے کے لیے استعمال ہوتا تھا۔

صدی کے خاتمے پر چین میں جنگ اور بمبئی میں طاعون کی وجہ سے مشرق بعید کے ملکوں کے لیے سوت اور دھاگوں کی برآمدکاری میں پہلی بار تیزی سے گراوٹ آگئی اور پھر اس کے بعد جاپان کی طرف سے کڑے مقابلے کی وجہ سے بھی کافی کمی آئی۔ کتائی کی بجائے بنائی شروع ہو جانے کی بات احمد آباد میں نمایاں طور پر سامنے آئی۔ احمد آباد، گھریلو مارکیٹ کی ضرورتوں کو بمبئی کے مقابلے میں کہیں زیادہ پورا کرتا رہا تھا، اس کے علاوہ احمد آباد کی ملوں میں عمدہ روئی کا سوت استعمال ہوتا تھا جس کی وجہ سے لنکاشائر کے ساتھ اس کا راست مقابلہ تھا۔ احمد آباد کا قومی تحریک سے بھی زیادہ تعلق تھا۔ اور ایک دفعہ کو تو ایسا معلوم ہونے لگا تھا کہ گاندھی کے عروج کے ساتھ تحریک اپنے مقاصد کو پالے گی۔ اس سے تحریک کی معاشی جڑوں کی وضاحت ہوتی ہے۔

متوسط صنعتی طبقے کے ساتھ ساتھ کامگار طبقہ بھی انیسویں صدی کے اواخر کے ہندوستان میں ایک دوسرے نئے عنصر کی حیثیت رکھتا تھا۔ اس طبقے کی نشوونما بہت سست رہی تھی۔ چنانچہ 1911 میں منظم صنعتی شعبے میں ملازم کامگار طبقے کی کل ہند تعداد کا تخمینہ 21 لاکھ لگایا گیا تھا (جن میں چائے باغات کے آٹھ لاکھ مزدور بھی شامل تھے) جبکہ اس وقت ملک کی کل آبادی 30 کروڑ 30 لاکھ تھی لیکن دوسرے بہت سے ملکوں کی طرح ہی ہندوستان میں بھی بمبئی اور کلکتہ جیسے بڑے شہروں میں کامگاروں کے ارتکاز کے نتیجے میں پرولتاری طبقے کو (1920 کی دہائی اور اس کے بعد)

اپنے تناسب سے کہیں زیادہ طاقت حاصل تھی۔ ابتدائی سرمایہ جاتی صنعت کاری سے مخصوص خطرات انگریزوں اور ہندوستانیوں دونوں کے ہی کاروبار میں اور بھی بڑھ گئے تھے، کیونکہ سرمایہ جاتی صنعت کاری سے پہلے کی کچھ صنعتیں باقی رہ گئی تھیں۔ آسام کے چائے باغات کے لیے قلیوں کی اور فجی، ماریشس نٹال اور ویسٹ انڈیز کے لیے مزدوروں کی بھرتی ایک قرارنامے کے تحت ہوتی تھی۔ یہ قلی اور مزدور عملاً اجیر کم اور غلام زیادہ ہوتے تھے، دوسرے ملکوں کی طرح ہی یہاں بھی سامراجی نظام ماقبل سرمایہ جاتی شکلوں کو بڑھاوا دینے کی کوشش کر رہا تھا۔ کانوں ریلوں اور کارخانوں میں بھرتی تکنیکی اعتبار سے تو بالکل آزادانہ طریقے پر ہوتی تھی لیکن اس میں بچولیوں اور ملازمت دلانے والے ٹھیکیداروں کا ہی سارا عمل دخل ہوتا تھا۔ جن کی بالائی آمدنی کا بار بھی کامگاروں کو ہی برداشت کرنا پڑتا تھا۔ مشرقی ہند کے چائے باغات، کانوں اور فیکٹریوں وغیرہ کے لیے کامگاروں کی بھرتی مشرقی یوپی، بہار اور مدراس ریزیڈنسی کے علاقوں سے کی جاتی تھی۔ جبکہ کلکتہ کے صنعتی علاقوں کے کامگار طبقے میں غالب اکثریت غیر بنگالیوں کی ہوتی تھی۔ اس کے برخلاف بمبئی اور احمد آباد کے لیے کامگاروں کی سپلائی آس پاس کے علاقوں سے ہوتی تھی؛ یعنی احمد آباد کے لیے گجرات کے دیہات سے اور بمبئی کے لیے ساحل سمندر کیعقبی علاقوں (خصوصاً کون کن کے رتناگیری ضلع) سے کامگار بھرتی کیے جاتے تھے۔

"جدید سیکٹر" میں نشو و نما کی ان علامات کے باوجود بھی نو آبادیاتی ہندوستان کی معیشت میں عام غربت کو ہی غالب عنصر کی حیثیت حاصل رہی۔ فی کس سالانہ قومی آمدنی سے متعلق سارے تخمینے بالعموم قیاسات پر مبنی ہونے کے ساتھ ساتھ قوم پرستوں اور برطانوی مدافعت کاروں کے درمیان سیاسی بحث کا موضوع ہوتے تھے۔ ان تخمینوں میں کافی فرق ہوتا تھا۔ چنانچہ جہاں Indophile Digby کے مطابق 1899 میں فی کس سالانہ قومی آمدنی کا اوسط 18 تھا Atkinson نے 1895 کے لیے اس کا تخمینہ 39.5 کا لگایا تھا۔ تاہم Atkinson کا تخمینہ محض دو پونڈ 13 شلنگ کے بقدر تھا جبکہ 1901 کے لیے برطانیہ کا یہ اوسط 52 پونڈ تھا۔ عوامی سطح پر پھیلی ہوئی غربت جدید ہندوستان کی زندگی میں تمام سیاسی، سماجی، اور ثقافتی رویوں کے لیے دوامی محرک بنی رہے گی۔

باب تین

سماجی اور سیاسی تحریکیں

1885-1905

نو آبادیاتی نظام کے سیاسی اور معاشی غلبے والے ڈھانچے کے اب تک کے جائزے سے متعدد تصادموں کی جڑوں کی نشان دہی ہو چکی ہے۔ یہ تصادم سامراجی نظام اور ہندوستانی عوام کے بیشتر طبقوں کے درمیان بھی تھا اور خود ہندوستان کے اپنے مخصوص طبقوں اور گروہوں کے درمیان بھی تھا۔ اب ہمیں یہ معلوم کرنا ہوگا کہ ہمارے عوام کی زندگی، ان کے افکار و خیالات اور سرگرمیوں میں یہ سارے تصادم کس طرح ظہور پذیر ہوئے مگر اس مقام پر سماجی تاریخ نویسی کا فقدان بہت بڑی مشکل کھڑی کر دیتا ہے۔ مغربی تعلیم یافتہ دانشور طبقے کے بارے میں بہت کچھ لکھا گیا ہے یہ طبقہ خواہ بہت اہم ہی کیوں نہ رہا ہو، مگر تعداد کے لحاظ سے بہت چھوٹا تھا۔ اسی طرح مخصوص قبائل، ذاتوں یا گاؤں کے بارے میں بھی قابل لحاظ ساجیاتی اور بشریاتی لٹریچر دستیاب ہے مگر ہندوستانی سماج کے بڑے بڑے گروہوں کے بارے میں، بلکہ علاقائی سطح کے بھی بہت کم تجزیے سامنے آئے ہیں۔ چنانچہ زمینداروں اور کاشت کاروں، زرعی مزدوروں، دست کاروں، صنعتی کامگاروں کی، یا بورژوائی طبقوں کی کوئی ایسی حقیقی تاریخ نہیں ملتی جس میں ان لوگوں کی زندگی کے حالات کا اور ان کے شعور واحساس میں رونما ہونے والی تبدیلیوں کا تجزیہ کیا گیا ہو! اس اہم خلاء کی وجہ سے سیاسی تحریکات کی تاریخ میں اور خاص طور پر قوم پرستی کی تاریخ میں خلاء رہ جاتا ہے جس کے نتیجے میں تاریخ طبقۂ اولی سے طبقۂ اولیٰ کی طرف، کا مطالعہ بن کر رہ جاتی ہے۔ طبقۂ اولیٰ سے شروع ہونے والی تاریخ، جس میں اعتدال پسندوں اور انتہا پسندوں کی آویزشوں سے بہت پہلے Birsa Munda کی قبائلی بغاوت کا ذکر ہونا چاہیے تھا، فی الحال بہت ہی غیر واضح اور وقتی نوعیت کی ہی کیوں نہ ہو، اس سلسلے میں کوئی وقتی کوشش بھی بے محل نہیں ہوگی۔

پچھلے 20 برسوں میں نام نہاد "سول شورشوں" سے متعلق تحقیق میں انکشاف کیا گیا ہے کہ پلاسی کے کم سے کم ایک صدی بعد بھی امن برطانوی (Pax Britania) محض ایک فسانہ بنا رہا تھا کیونکہ ملک کے بیشتر حصوں میں بغاوتوں اور شورشوں کے ذریعے امن عام کے اس معاہدے کی مسلسل خلاف ورزی ہوتی رہی۔ ان بغاوتوں کو روایت پرست عناصر (بے دخل کیے گئے زمیندار، سردار، مذہبی شخصیات وغیرہ) کی قیادت حاصل ہوتی تھی۔ ماہر بشریات Kethleen Gough نے حال ہی میں ایسی 77 کسان شورشوں کی فہرست مرتب کی ہے جن کی وجہ سے پورے برطانوی

دور میں تشدد کا سلسلہ جاری رہا تھا۔ ان شورشوں کو نوعیت کے لحاظ سے پانچ زمروں میں رکھا گیا ہے، بحالی سے متعلق شورش، مذہبی شورش، سماجی قزاقی، دہشت گردانہ انتقام، اور مسلح سرکشی۔ 1857 کو انگریزوں کے خلاف ان پرانی مزاحمتوں کا نقطہ عروج قرار دیا جاسکتا ہے جن کی قیادت بے دخل کیے گئے سردار اپنے اپنے منصب کی بحالی کے مقصد سے کرتے رہے تھے۔ صدی کے خاتمے پر اس طرح کی شورشوں میں نسبتاً کمی کا تاثر ملتا ہے۔ شورشوں میں یہ کمی در اصل غدر کے بعد کے زمانے میں ریاستی حکمرانوں اور زمینداروں کے ساتھ انگریزوں کے روابط میں از سر نو اُستواری، مواصلاتی ذرائع کی ترقی اور غالباً 1870 اور 1890 کی دہائیوں کے قحط کے نتیجے میں پیدا ہونے والی بددلی کا نتیجہ تھی۔ مگر اس کا مطلب یہ بھی نہیں کہ اشتعال اور تشدد کا اظہار بالکل ہی ختم ہوگیا تھا۔ یہ ہیجانی اُبال نہ صرف یہ کہ جاری رہا تھا بلکہ اس کی شکلیں دلچسپ طریقے پر تبدیل بھی ہوتی رہی تھیں۔

قبائلی تحریکیں

سب سے پر تشدد شورش قبائلیوں کی ہوتی تھی جو کہ ایک حال کے اسکالر کے الفاظ میں "مسلمانوں کے بشمول کسی بھی دوسری برادری کے مقابلے میں بہت زیادہ اور بہت ہی پر تشدد طریقے پر شورش برپا کرتے تھے" (کے سریش سنگھ)۔ قبیلے کی اصطلاح دراصل سماجی طور پر منظم لوگوں کو 'ذات' (Caste) سے ممیز کرنے کے لیے استعمال کی جاتی ہے۔ اس لیے اس کا مطلب زندگی کے عام دھارے سے مکمل علاحدگی ہرگز نہیں لیا جانا چاہیے۔ کسی حد تک عام دھارے سے الگ ہو جانے اور روزی کی تلاش قدیم طریقے پر ہی جاری رکھنے کے باوجود بھی قبائلی دیسی آبادی کے سب سے نچلے حصے کے طور پر اور کھیتی باڑی کے ذریعے، یا زرعی مزدور کی حیثیت میں یا چائے باغات اور فیکٹریوں میں قلیوں کی حیثیت میں ہندوستان کی عام زندگی کا حصہ پہلے بھی تھے اور اب بھی ہیں۔ قبائلی علاقوں میں بیرونی علاقوں کے باہری لوگوں کی گھس پیٹھ کے پہلے سے موجود رجحان کو انگریزی حکومت اور اس کے ساتھ ہندوستان آنے والی تجارت کاری سے مزید تقویت ملی۔ قبائلی علاقوں میں دراندازی کرنے والوں میں مہاجن، تاجر، زمینوں پر جبراً قبضہ کرنے والے اور ٹھیکیدار لوگ تھے جن سے سنتھالی بہت نفرت کرتے تھے۔ مطلق نجی جائیداد سے متعلق برطانوی تصورات نے مشترک ملکیت کی روایت کو نقصان پہونچایا اور قبائلی سماج میں پہلے سے موجود کشیدگی میں اور شدت بھی پیدا کردی۔ مسیحی تبلیغی ادارے قبائلی (بہار اور آسام کے پہاڑی) علاقوں میں سرگرم تھے اور قبائلیوں کو تعلیم کے ساتھ ساتھ سماجی طور طریق بھی سکھا رہے تھے مگر یہ مسیحی مبلغ کبھی کبھی دلچسپ قسم کے متنوع ردعمل کو بھی دعوت دے بیٹھتے تھے۔ اس طرح

کے رد عمل میں دشمنی بھی شامل ہوتی تھی۔ بعض اوقات مسیحی عقائد کو ولایتی طریق کے بر خلاف بروئے کار لانے کی بھی کوشش کی جاتی تھی۔ 1870 اور 1880 کی دہائی سے ایک نیا اور بہت ہی اہم عامل یہ تھا کہ مالیہ میں اضافے کے مقصد سے نو آبادیاتی حکومت نے جنگلاتی علاقوں پر اپنا کنٹرول اور بھی سخت کر دیا تھا۔ 1867 اور اس کے بعد بھی "محفوظ جنگلات" کے علاقوں میں انتقالی زراعت (Shifting Cultivation جس میں جتائی جانوروں کی ضرورت نہیں ہوتی اور اس بنیاد پر دیہی سماج کے نادار ترین گروہوں کی بقاء کے لیے ناگزیر ہوتی تھی)، عمارتی لکڑی کے استعمال اور چراگاہ کی سہولت پر پابندی لگا کر بھی جنگلاتی دولت پر اجارہ قائم کرنے کی کوشش کی گئی۔ اس سلسلے میں قبائلیوں کا رد عمل بسا اوقات پر تشدد شورشوں کی شکل میں سامنے آیا مگر اس کے ساتھ ہی داخلی طور پر سماجی، مذہبی اور معاشی اصلاح کی تحریکیں بھی اٹھتی رہیں۔ مسیحیت اور ہندو دھرم سے کچھ تصورات اُدھار لے کر اور قبائلیوں کو چشم زدن میں زرین عہد سے ہم کنار کردینے کے دعوؤں کے ساتھ جو تحریکیں چلائی گئی تھیں وہ 1860 اور 1920 کی درمیانی مدت میں ایک منفرد شکل اختیار کرتی گئی تھیں۔ یہ تحریکیں عام طور پر روایتی سرداروں کی ناکام شورشوں کے بعد شروع کی گئی تھیں۔ چنانچہ سنتھال بغاوت (1855) کے بعد 1870 کی دہائی میں کھیرواڑ (Kherwar) یا Saphahar کی تحریک شروع ہوئی جس میں پہلے تو وحدانیت اور داخلی اصلاح کی تبلیغ کی گئی مگر جلد ہی یہ تحریک سرکوبی سے ذرا ہی پہلے مالیاتی بندوبست کے خلاف مہم میں تبدیل ہو گئی تھی۔ مسیحی حکومت کا ہزار سالہ عقیدہ (یا عہد زریں کی جلد ظہور پذیری کا عقیدہ) بھی بسا اوقات تشدد آمیز شکل اختیار کر جاتا تھا۔ چنانچہ 1868 میں گجرات کے نائکاڈا (Naikada) جنگلات کے قبائلیوں نے دھرم راج قائم کرنے کی کوشش میں پولس تھانوں پر ہلہ بول دیا تھا، یا پھر 1882 میں کچھار کے Kacha ناگاؤں نے سمبھودان نام کے ایک شعبدہ باز کے اثر میں آکر گوروں پر حملے کیے تھے۔ سمبھودان کا دعوا تھا کہ اس کے جادو کی وجہ سے اس کے پیروکاروں پر بندوق کی گولی اثر نہیں کرے گی۔ قدیم ضلعی گزٹوں اور بشریاتی جائزوں میں اس طرح کی باتوں کا بار بار حوالہ آیا ہے۔ مثال کے طور پر وشاکھا پٹنم ایجنسی میں 1900 میں Korra Mallaya نام کے ایک کونڈا ڈورا نے "یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی تھی کہ اسے غیب سے القا ہوا ہے........ اس کے ارد گرد چار پانچ ہزار لوگوں کی بھیڑ اکٹھا ہو گئی تھی۔ اس نے خود کے بارے میں پانچوں پانڈو بھائیوں میں سے کسی ایک کا اوتار ہونے کا اعلان کیا تھا........ "اس کا شیر خوار بچہ کرشن ہے" "وہ انگریزوں کو بھگا سکتا ہے۔ اور ملک پر خود حکومت کر سکتا ہے" "اس کا یہ بھی دعوا تھا کہ وہ "اپنے لوگوں کو بانس کی ایسی لاٹھیوں سے مسلح کر دے گا جو جادو کے زور سے بندوقوں میں تبدیل ہو جائیں گی" "اس کا جو نتیجہ ہونا تھا وہ ظاہر ہے۔ پولس نے "بلوائیوں" کو مار گرایا تھا اور 60 پر مقدمہ چلایا تھا، جن میں دو کو پھانسی ہو گئی تھی (

تھرسٹن اینڈ رنگاچاری، کاسٹس اینڈ ٹرائبس آف ساؤتھ انڈیا، جلد سوم صفحہ 353)۔

پڑوس کی گوداوری ایجنسی کی پہاڑیاں بھی 80-1879 کے دوران خوفناک بغاوتوں کی شاہد رہی ہیں۔ ان بغاوتوں کا مرکز چوداورم (Chodawaram) کا Rampa علاقہ تھا۔ اس علاقے کے Koya اور Konda Dora پہاڑی سرداروں (مناداروں) نے اپنے حاکم (وہ منصب دار گھرانہ جس نے 1813 میں انگریزوں سے معاملہ کر لیا تھا) کے خلاف 1840، 1845، 1858، 1861 اور 1862 میں بغاوتیں کی تھیں۔ مارچ 1879 کی بڑی بغاوت کی وجہ یہ تھی کہ منصب دار نے عمارتی لکڑی اور چارہ کا محصول بڑھانے کی کوشش کی تھی، جبکہ پولس کے ذریعے زائد وصولی، تاڑی کی گھریلو تیاری پر پابندی سے متعلق نئے ضابطوں کے نفاذ، نچلے اور میدانی علاقوں کے تاجروں اور مہاجنوں کے ذریعے استحصال اور پوڈو (انتقالی زراعت) پر پابندی جیسے اقدامات بھی اس بغاوت کا سبب تھے۔ جب یہ سرکشی اپنے عروج پر تھی تو اس کا دائرہ اثر 500 مربع میل سے کم نہیں تھا۔ اور اسے نومبر 1880 میں کچلا جا سکا تھا جس کے لیے مدراس انفنٹری کی چھ رجمنٹوں کی ضرورت پڑی تھی۔ اسی علاقے میں 1886 کی ایک دوسری بغاوت میں باغی خود کو رام ڈونڈو (رام سینا) کہتے تھے اور ان کے ایک لیڈر Anantayya (انتیا) نے جے پور کے مہاراجہ سے حقیقی قسم کی قوم پرستانہ اپیل اس طرح کی تھی "کیا یہ اچھی بات ہے کہ انگریز ہمارے ملک میں رہیں...... ہمیں...... انگریزوں کے خلاف جنگ چھیڑ دینی چاہیے...... روسی بھی تو انگریزوں کے لیے مشکلیں پیدا کر رہے ہیں...... اگر روپے پیسے اور ہتھیار سے میری مدد کی جائے تو میں رام کا کردار ادا کروں گا" (ڈیوڈ آرنلڈ، ڈکوئٹی اینڈ رورل کرائم ان مدراس 1940-1660 حوالہ جرنل آف پیزنٹ اسٹڈیز جنوری 1979)۔ یہ بھی اگرچہ رامائن کا ہی ایک استعمال تھا مگر بعد میں گاندھی جی کے رام راجیہ، کے تصور سے کافی مختلف تھا۔

بہر حال اس دور کی قبائلی بغاوتوں میں سب سے مشہور 1900-1899 میں رانچی کے جنوب میں برسا منڈا کی Ulgulan (عظیم) شورش تھی جس کے سلسلے میں مورخ اور ماہر بشریات کے سریش سنگھ نے بہت ہی اہم تحقیقی کام کیا ہے۔ منڈا قبائل انیسویں صدی کے پورے عرصے میں اپنے روایتی کھن کٹی زمینی نظام (کھنٹوں یا قبائلی خاندانوں کا مشترکہ جوت داری نظام) کو شمال کے میدانی علاقوں کے جاگیرداروں اور زمینداروں کے ذریعے پامال ہوتے دیکھتے آئے تھے۔ اس کے علاوہ یہ علاقہ ان ٹھیکیداروں کے لیے ایک شکار گاہ بھی بن کر رہ گیا تھا۔ جو کہ قرار نامے (غلامی) کی بنیاد پر مزدور بھرتی کرنے کے لیے آتے تھے۔ اس دوران متعدد اینگلی کن، لوتھرن اور کیتھولک عیسائی مشن بھی آ چکے تھے جنھوں نے قبائلیوں کی مدد کرنے کا وعدہ تو کیا مگر زمین سے متعلق بنیادی مسائل کے سلسلے میں کچھ نہیں کیا۔ 1890 کی دہائی کے اوائل میں قبائلی سرداروں نے کلکتہ

کے ایک اینگلو انڈین وکیل کے ذریعے باہر کے زمینداروں اور بیٹھ بیگاری (جبریہ بیگار) کے نفاذ کا عدالت میں مقابلہ کرنے کی کوشش کی تھی، غالباً اس وکیل نے ان لوگوں کو دھوکہ دیدیا تھا۔ ایک مشینری نے قبائلی سرداروں کی شکایت کا ذکر اس طرح کیا تھا" ہم نے سرکار سے تلافی کی اپیل کی مگر ہمیں کچھ نہیں ملا۔ ہم نے مشنوں کا بھی دامن پکڑا مگر انھوں نے بھی ہمیں ڈاکوؤں سے بچانے کے لیے کچھ نہیں کیا۔ اب ہمارے لیے کوئی دوسرا راستہ نہیں رہ گیا ہے، سوائے اس کے اب ہم اپنے میں سے ہی کسی ایک کی طرف دیکھیں"۔

برسا (1870-1900) منڈا قبائل کے لیے ایک نجات دہندہ کی شکل میں سامنے آیا۔ برسا ایک بٹائی دار کسان کا بیٹا تھا۔ جس نے عیسائی مبلغین سے تھوڑی بہت تعلیم حاصل کی تھی۔ بعد میں اس کا رجحان وشنومت کی طرف ہو گیا تھا۔ اس نے 94-1893 میں فاضل زمینوں کو محکمہ جنگلات کی تحویل میں لیے جانے کے خلاف تحریک میں بھی حصہ لیا تھا...... روایت ہے کہ نوعمر برسا کو پرماتما کا دیدار بھی ہوا تھا جس کے بعد اس نے شفا بخشنے کی غیبی قوت کے ساتھ اپنے پیغمبر ہونے کا دعوا بھی کیا تھا۔ لوگ برسا کی کوئی نئی بات سننے کے لیے جوق در جوق چالکیڈ (Chalked) آنے لگے تھے۔ زمینداروں نے برسا کی خالصتاً مذہبی نوعیت کی تحریک کو زرعی اور سیاسی رخ دینے کی کوشش کی۔ انگریزوں نے 1895 میں برسا کو دو سال کے لیے جیل میں ڈال دیا کیونکہ انھیں اس کی طرف سے کسی سازش کا خدشہ تھا، بہر حال وہ جب باہر آیا تو ایک گرم مزاج اور شعلہ بیان مقرر بن چکا تھا۔

99-1898 میں جنگلوں میں رات میں متعدد جلسے ہوئے جن میں برسا نے مبینہ طور پر "ٹھیکیداروں، جاگیرداروں، راجاؤں، حاکموں اور عیسائیوں کو تہ تیغ کر دینے کے لیے اکسایا اور لوگوں کو یہ یقین دلانے کی کوشش کی کہ...... بندوقیں اور گولیاں پانی میں تبدیل ہو جائیں گی۔ برٹش راج کے پتلے جلائے گئے منڈا قبائل پر درج ذیل نفرت انگیزی کا پورا اثر ہوا۔

کاٹونگ باباکاٹونگ
صاحب کاٹونگ کاٹونگ، راڑی کاٹونگ کاٹونگ
(اے بابا یورپیوں کو کاٹ ڈال،
دوسری جاتیوں کو کاٹ ڈال
کاٹ ڈال باباکاٹ ڈال)۔

1899 میں کرسمس کے موقع پر برسا کے پیروکاروں (جن میں بڑی تعداد میں وہ عیسائی منڈا قبائل بھی شامل تھے جنھوں نے ایک خدا اور اس کے اوتار برسا بھگوان کا مذہب اختیار کر لیا تھا۔) نے تیر چلائے اور رانچی نیز سنگھ بھوم اضلاع کے تقریباً چھ تھانوں کے علاقوں میں چرچوں کو

نذر آتش کر دینے کی کوشش کی، جنوری 1900 میں پولس کو بھی نشانہ بنایا گیا جس پر پورے رانچی میں خوف وہراس پھیل گیا تھا۔ 9 جنوری کو سیل رکاب پہاڑی علاقے میں باغیوں کو شکست ہو گئی اور تین ہفتے بعد برسا کو بھی گرفتار کر لیا گیا۔ اور جیل میں ہی اس کی موت ہو گئی۔ تقریباً 350 منڈا قبائلیوں پر مقدمہ چلایا گیا جن میں تین کو پھانسی کی اور 44 کو کالے پانی کی سزا ہو گئی۔ بہر حال 10-1902 کے سروے نیز 1908 کے چھوٹا ناگ پور لگان ایکٹ میں قبائلیوں کے کھن کٹی (مشترکہ جوت داری) حقوق کو کسی حد تک تسلیم کر لیا گیا اور بیٹھ بیگاری (جبریہ بیگار) پر پابندی لگا دی گئی۔ اس طرح چھوٹا ناگپور کے قبائلیوں کو اپنے زمینی حقوق کے سلسلے میں کسی حد تک قانونی تحفظ حاصل ہو گیا۔ انھیں یہ حق بہار کے دوسرے کسان طبقوں سے کافی پہلے حاصل ہوا تھا۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ پر تشدد تحریکیں سدا ناکام ثابت نہیں ہوتیں۔ اس کے علاوہ برسا منڈا کی یاد لوگوں کے دلوں میں ابھی تک باقی ہے۔ ایک چھوٹے سے مذہبی پیشوا کے طور پر، اور ایک تحریک کے لیڈر کے طور پر، یہاں تک کہ اس کا ذکر ان لوک گیتوں میں موجود ہے جنھیں کے۔ سریش سنگھ نے اپنے تجزیہ میں رکارڈ کیا ہے۔ بہر حال یہ حقیقت ہے کہ لوگوں کے دلوں میں برسا کا بہت احترام ہے، اگرچہ اس احترام کے اسباب ایک دوسرے سے مختلف ہیں، اسے ایک عظیم قوم پرست سمجھا جاتا ہے، اسے جھارکھنڈ تحریک کا بانی مانا جاتا ہے، کچھ لوگ اسے بائیں بازو کے انتہا پسند گروپ کا ہیرو بھی مانتے ہیں۔ بہر حال برسا کو ایک کل ہند سطح کا قوم پرست لیڈر ثابت کرنا غلط ہوگا کیونکہ برسا کی تمام تر جدو جہد قبائلیوں کی سرزمین کو باہری لوگوں کی دست برد سے محفوظ کرنے تک محدود تھی مگر اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ برسا بنیادی طور پر سامراج کا مخالف نہیں تھا۔

پھڑکے

مہاراشٹر میں واسودیو بلونت سنگھ پھڑکے کی سرکشی (1879) کی شکل میں باشعوری دانش ورانہ قوم پرستی اور تشدد پسندی کے درمیان، خواہ مختصر مدت کے لیے ہی، ایک نادر اتفاق رائے سامنے آیا۔ پھڑکے ایک چت پون براہمن اور ناظر کے دفتر میں کلرک تھے۔ انھیں تھوڑی بہت انگریزی کی تعلیم بھی حاصل تھی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پھڑکے نے دولت کے بہاؤ، 77-1976 کے دکن کے قحط نیز پونا کے براہمن دانشوروں میں احیاء پسندی کے موضوع پر راناڈے کے خطبات کا اثر قبول کیا تھا۔ پولس سے بچنے کی خاطر ایک مندر میں روپوشی کے دوران لکھی گئی سوانح میں یہ ذکر کیا ہے کہ ایک خفیہ جماعت کی تشکیل کر کے، قزاقی کے ذریعے دولت حاصل کر کے اور مواصلات کے نظام میں گڑبڑ پیدا کر کے مسلح بغاوت کے ذریعے ملک میں ہندو راج پھر سے قائم کرنے کا سودا ان کے سر میں کس طرح سمایا تھا" اس وقت لوگوں میں کافی بدگمانی ہے۔ اب اگر چھ

لوگ قدم اٹھائیں تو وہ دوسرے سب لوگ بھی شامل ہو جائیں گے جو کہ فاقہ کشی کا شکار ہیں" اس کے بعد کی انقلابی دہشت پسندی کا بہ آسانی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ بہر حال اہم بات یہ ہے کہ پھڑکے کے 'چالیس کے گروہ' میں محض چند براہمن نوجوان، اور بیشتر نچلی ذات کے راموشی اور دھنگر (Dhangars) شامل تھے۔ اس کا نتیجہ سماجی لوٹ پاٹ کی شکل میں سامنے آیا جس میں کسان ڈاکوؤں کو پناہ دیا کرتے تھے۔ پھڑکے کے پکڑے جانے اور عمر قید کی سزا سنائے جانے کے بعد دولتانہ راموشی کی سرکردگی میں راموشی ڈاکو گروہ 1883 تک سرگرم رہا تھا۔ جبکہ ہمیں ایک ایسے قبائلی کوئی گروہ کے بارے میں بھی بتایا جاتا ہے جس نے سات ماہ میں 28 ڈاکے ڈالے تھے۔ ملک کے دوسرے حصوں کی طرح اس علاقے میں بھی کوئی قبائل کو ان کی بور ژوائی زمینوں سے بے دخل کیا جا رہا تھا۔

موپلا

مالابار کے موپلاؤں کی پر آشوب تاریخ سے اس وقت کے ہندوستان کے پیچیدہ حالات کے ایک اور رخ کی نشان دہی ہوتی ہے، یعنی ایک ایسی پیچیدہ صورت حال جس میں مذہبی جنون نے زمیندار مخالف اور ولایت مخالف پیرایہ اختیار کر لیا تھا۔ مالابار کے مسلمانوں میں گوروں کے خلاف نفرت کے جذبات 1498 میں ہی پیدا ہو گئے تھے جب گرم مصالحوں کی تجارت پر قبضہ کرنے نیز تلواروں اور بندوقوں کے زور پر عیسائیت کی تبلیغ کے لیے پرتگالیوں کے قدم پڑے تھے جس کا ذکر ہمیں زین الدین کی 1580 کی دہائی کی تصنیف تحفۃ المجاہدین نیز کوتھوپلی مالا (Kothupali Mala) جیسی رزمیہ نظموں (مرثیوں) میں بھی ملتا ہے۔ ان نظموں میں شہیدوں کے اوصاف کا ذکر ہوتا تھا۔ یہ نظمیں اب بھی موجود ہیں۔ برطانوی حکومت قائم ہو جانے پر زمینداروں کے حقوق کو برقرار رکھا گیا تھا جس کے نتیجے میں اونچی ذات کے نمبودری اور نائر ہندوؤں (جن میں بہت سے ایسے تھے جنہیں ٹیپو سلطان نے مار بھگایا تھا) کی پوزیشن اور بھی مستحکم اور مسلم پٹہ داروں (کانم داروں) اور کاشت کاروں (ویرم پٹم داروں) کی حالت اور بھی خستہ ہو گئی تھی۔ مقامی طور پر یہ لوگ موپلا کہلاتے تھے۔ اس صورت حال کا ایک فوری نتیجہ فرقہ واریت کے استحکام کی شکل میں سامنے آیا۔ مالابار علاقوں میں مسجدوں کی تعداد 1831 میں 637 سے بڑھ کر 1851 میں 1058 ہو گئی اور ترورانگڈی (Tiru rangadi) کے قریب واقع Mambram کے منگل (سید علوی اور اس کے بعد اس کے بیٹے سید فضل جسے انگریزوں نے 1852 میں جلاوطن کر دیا تھا) بڑی تیزی سے موپلا سماج کے سیاسی اور مذہبی قائد کی حیثیت میں اہمیت حاصل کرتے جا رہے تھے۔ اس کے علاوہ چیرومار اچھوتوں نے بھی بڑی تعداد میں اسلام قبول کر لیا تھا۔ ان کے لیے یہ ایک ایسا مذہب

تھا جس میں سماجی برابری اور عزت کی یقین دہانی کرائی گئی ہے۔ جنوبی مالا بار کے ارناڈ اور دلوو ناڈ تعلقوں میں موپلاؤں کی سرکشی جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی تھی۔ 1836 اور 1854 کے درمیان سرکشی کے 22 واقعات رکارڈ کیے گئے تھے۔ اس کے علاوہ 85-1882 کے دوران اور پھر 1896 میں بھی سرکشی کے متعدد واقعات رکارڈ کیے گئے۔ ان شورشوں میں موپلاؤں کی ٹولیاں نائروں اور نمبودریوں کی جائدادوں کو نشانہ بناتی تھیں اور مندروں کی بے حرمتی کرتی تھیں اور پھر پولس کی گولیوں سے مجبور ہو کر اجتماعی طور پر خودکشی کر لیتی تھیں۔ یہ لوگ اس اعتقاد میں موت کو گلے لگا لیتے تھے کہ شہید ہونے پر سیدھے جنت میں جائیں گے۔ ان لوگوں کی تعداد بہت کم، یعنی تقریباً 349 تھی جو کہ 28 ٹولیوں میں تقسیم تھے۔ مواصلات کا نظام ناقص ہونے اور بعض دوسری وجوہ سے جنوبی مالابار علاقے میں اجتماعی مزاحمت بہت مشکل تھی۔ اس طرح موپلاؤں کی شورش "مخصوص نوعیت کی ایک دیہی دہشت گردی تھی جو کہ شاید نمبودریوں اور نائروں (جنمی) کے اختیارات کو لگام دینے کا ایک موثر طریقہ ہونے کے علاوہ ان موپلاؤں کے لیے فائدے کا سبب بنی تھی جو بذات خود ان شورشوں میں شامل نہیں تھے۔ 1919 تک موپلاؤں کے حملوں کا نشانہ بننے والے 82 لوگوں میں 62 اونچی ذاتوں (22 نمبودری اور 34 نائر) کے ہندو تھے۔ جن 70 لوگوں کے طبقاتی پس منظر کا پتہ لگایا جا سکا ہے ان میں 58 جنمی یا مہاجن تھے۔

(Conard Wood- Peasant Revolt: An Interpretation of Moplah Violence in 19th and 20th Centuries)

بیشتر موپلا شہید یا تو غریب کسان یا بے زمین مزدور تھے مگر انھیں متمول کانم داروں اور چھوٹے موٹے تاجروں کی ہمدردی حاصل ہوتی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ ان موپلاؤں کا اعتقاد تھا کہ ان کے لیے ہتھیاروں سے بھرا ایک جہاز آرہا ہے۔ یہ محض ایک وہم تھا۔ بلاشبہ موپلاؤں میں بے چینی کے اسباب خالصۃً زرعی نوعیت کے تھے۔ 1862 اور 1880 کے درمیان لگان داری کے مقدمات میں 244 فی صد اور بے دخلی کی ڈگریوں میں 441 فی صد اضافہ ہوا۔

جنوبی مالابار کے تعلقوں میں ہندو کسانوں کو بھی دشواریوں کا سامنا تھا۔ مگر ان کی مزاحمت کی شکل مختلف تھی۔ کہا جاتا ہے کہ 1860 اور 1870 کی دہائیوں میں مالابار کے دیہی علاقوں میں ہندو ڈاکوؤں کے گروہ سرگرم رہے تھے، ہندومت میں اسلام کی طرح کا ہزاری سال کا تصور نہ ہونے کی وجہ سے ہندو کسانوں کی بے چینی سماجی لوٹ مار کی حد سے آگے نہیں بڑھ پائی تھی۔

دکن کے بلوے

ہم نے اب تک ان شورشوں کا ذکر کیا ہے جن کا مقصد مکمل تبدیلی ہوتا تھا، اور جن کے پس

پشت کسی قدر مذہبی عنصر یا الفی (ہزاری سال) تصور بھی کار فرما رہا تھا (جو کہ سیکولر تصور جیسے کسی جدید نظریے کی عدم موجودگی میں فطری عمل تھا) اور جن کی جڑیں ہندوستانی سماج کی نچلی سطحوں، قبائلیوں اور نادار کسانوں تک پھیلی ہوئی تھیں۔ مگر اس دوران ایسے دیہی احتجاج کی روایتیں بھی ملتی ہیں جو کسی مخصوص شکایت یا بے چینی کا نتیجہ ہوتے تھے۔ ان کے مقاصد بھی بہت ہی مخصوص اور متعین ہوتے تھے اور ان احتجاجوں کو زیادہ تر خوش حال کسانوں کی قیادت اور تائید حاصل ہوتی تھی۔ مثلاً مہاراشٹر دکن کے علاقے میں متمول کسانوں کو 1860 کی دہائی کی کپاس کی گرم بازاری کے دور میں جو خوش حالی حاصل ہوئی تھی وہ اگلی دہائی میں قیمتوں میں اچانک بھاری کمی کی وجہ سے کالعدم ہو کر رہ گئی تھی۔ کپاس کی قیمتوں میں اچانک بھاری کمی کے ساتھ ساتھ 1867 سے مال گزاری میں بھاری اضافہ بھی ہو گیا تھا جس کا نتیجہ بڑے پیمانے پر بھاری قرضداری کی شکل میں سامنے آیا اور باہر کے مارواڑی مہاجن لوگوں کی برہمی کا نشانہ بن گئے۔ مئی۔ ستمبر 1875 میں سوکار (ساہوکار) مخالف بلوؤں سے پونا اور احمد نگر کے چھ تعلقے متاثر ہوئے تھے۔ گاؤں والے اپنے مکھیوں (پٹیلوں) کی سرکردگی میں مہاجنوں اور ساہوکاروں کے ٹھکانوں پر حملے کر کے قرض نامے اور بہی کھاتے وغیرہ اپنے قبضے میں لے لیتے تھے۔ اس طرح کے بلوے ان علاقوں میں بہت کم ہوئے جہاں مہاجن باہر کے نہیں تھے بلکہ چھوٹے چھوٹے مقامی مہاجنوں اور متمول زمینداروں نے سودی کاروبار اور تجارت کا پیشہ اپنا لیا تھا۔ اس شورش کے چار سال بعد دکن زرعی ریلیف ایکٹ بابت 1879 کے ذریعے خوش حال کسانوں کو عدالتی طریقہ کار میں تبدیلی اور تدارکی اقدامات کے ذریعے کسی قدر تحفظ فراہم کرنے کی کوشش کی گئی۔

پبنا(Pabna)

مہاجن مخالف بلوئے بنگال (قبائلی علاقوں کے ماسوا) میں بھی بہت کم ہوئے۔ اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ بنگال میں بھی مہاجنی کا کام مقامی کسان یا جوت دار ہی کرتے تھے۔ یہ قرض پیداکاری کے لیے ناگزیر ہوتا تھا۔ اس کے مقابلے میں زمیندار کا پیداکاری میں کوئی رول نہیں ہوتا تھا۔ اور "اعلاء زمیندارہ" کے دعوؤں کا 1870 اور 1880 کی دہائیوں میں مشرقی بنگال کی رعیتوں کی طرف سے بڑے پیمانے پر مقابلہ کیا گیا۔ اس مزاحمت کا مرکز پبنا (Pabna) تھا جو کہ اس وقت نسبتاً ایک زیادہ خوش حال ضلع تھا جہاں دوہری فصل کے ساتھ ساتھ جوٹ کا کاروبار بھی بہت اچھا تھا اور پچاس فیصد سے زائد کاشت کاروں کو 1858 کے ایکٹ کے تحت پٹہ داری (Occupancy) کے حقوق حاصل تھے، جس کی رو سے انھیں بے دخلی یا لگان میں اضافے کے خلاف تحفظ حاصل تھا۔ اس کے باوجود بھی 1793 سے 1872 تک زمینداری لگان میں سات گنا اضافہ ہو گیا تھا۔ اور

زمینداروں نے 1860 کی دہائی میں اور پھر 1870 کی دہائی کے اوائل میں مختلف قسم کے ابواب (Cesses، محصولات)، کے ذریعے نیز زمین کی پیائش کے لیے چھوٹے پیمانوں کے استعمال کے ذریعے جس سے زمین کی پیائش کئی گناہ بڑھ جاتی تھی اور مار پیٹ کے ذریعے لگان میں اضافے کی مہم چھیڑ رکھی تھی۔ یہ ایسی باتیں تھیں جو پٹہ دار رعیتوں (Occupancy Rayats) کو حاصل نئے تحفظات پر حملے کی حیثیت رکھتی تھیں۔ 1873 میں پبنا کے یوسف شاہی پرگنہ کے کسانوں نے ایک زرعی جماعت بنائی جو قانونی کارروائی کے لیے رقم اکٹھا کرتی تھی، بڑے بڑے جلسے کرتی تھی جس میں شرکت کے لیے سینگ اور شنکھ بجاکر، ڈھول پیٹ کر اور قریہ بہ قریہ آواز لگا کر لوگوں کو مدعو کیا جاتا تھا۔ بعض اوقات لگان بھی روک لیا جاتا تھا۔ اگلی دہائی سے پڑوس کے مشرقی بنگال کے ڈھاکہ، میمن سنگھ، تری پورہ، بکر گنج، فرید پور، بوگرہ، اور راج شاہی اضلاع میں بھی اسی طرح کی تحریکیں شروع ہو گئی تھیں۔ باوجودیکہ کلکتہ کے زمیندار حلقوں میں کسانوں کے تشدد اور بغاوت کو لے کر خاصی بے چینی پیدا ہو گئی تھی مگر رعیت کی یہ مزاحمت تمام تر قانونی کارروائی تک ہی محدود رہی تھی، البتہ پبنا میں تشدد کے اکادکا واقعات بھی ہوئے۔ اس تحریک کے مقاصد بھی کافی محدود تھے، کیونکہ لگان روک لینے کا قدم بھی محض کچھ مخصوص مطالبات کو پورا کرانے کے لیے یعنی پیمانے میں تبدیلی، خلاف قانون محصولات کے خاتمے اور لگان میں کسی قدر تخفیف کے لیے ہی اٹھایا گیا تھا۔ پبنا کا احتجاج شعوری طور پر انگریزوں کے خلاف بھی نہیں تھا۔ سب سے شدید مطالبہ یہ تھا کہ رعیت صرف ملکہ عالیہ کی ہی رعایا بن کر رہنا چاہتی ہے۔ دیسی جابروں کے خلاف غیر ملکی آقاؤں سے اس طرح کی اپلیں کسان تحریکوں کے لیے اتنی انوکھی یا غیر عام نہیں تھیں اور پبنا کی رعیتوں کو دراصل بعض افسروں کے بظاہر کسان نواز اقدامات سے بھی حوصلہ ملا تھا۔ اس طرح کے اقدامات میں لفٹنٹ گورنر Combell کا جولائی 1873 کا وہ اعلان بھی شامل ہے جس کے ذریعے تشدد کی مذمت کرتے ہوئے کسانوں کی تنظیموں کو قانونی قرار دیا گیا تھا۔

پبنا لیگ نیز دوسرے اضلاع میں بھی اس طرح کی تحریکوں سے بنگال کے دانشور حلقوں میں ایک دوسرے سے مختلف رد عمل ہوا۔ زمینداروں کے اثر اور غلبے والی برٹش انڈین ایسوسی ایشن کا رد عمل کافی مخالفانہ تھا اور اس کے ترجمان "ہندو پیٹریاٹ" نے پبنا کی تحریک کو ہندو زمینداروں کے خلاف مسلم کسانوں کے فرقہ وارانہ احتجاج کی شکل میں پیش کرنے کی کوشش کی۔ دراصل پبنا کے بیشتر کسان مسلمان اور ان کے بیشتر زمیندار ہندو ہی تھے مگر تحریک میں فرقہ وارانہ عنصر جیسی کوئی بات نہیں تھی۔ (بیسویں صدی میں جو کچھ ہوا وہ اس کے قطعی برعکس تھا)۔ پبنا کی زرعی لیگ کے تین بڑے لیڈر، ایک چھوٹے زمیندار ایش چندر رائے، گاؤں کے کھیا شمبھو پال (دونوں ہی اونچی ذات کے ہندو تھے) اور ایک مسلم جوت دار خودی مولاہ تھے۔ اتفاق سے اس تحریک سے جو زمیندار

سب سے زیادہ متاثر ہوا وہ رابندر ناتھ ٹیگور کے بڑے بھائی دوجیندر ناتھ ٹیگور تھے جنھوں نے جولائی 1873 میں حکومت سے "امن اور سکون کی بحالی" کے لیے سخت کارروائی کی درخواست کی تھی۔ جن پیشہ ور گروپوں کا زمینداروں سے بہت کم تعلق تھا ان کا رویہ بھی ہمدردانہ رہا جس کا ثبوت ہمیں آر۔ سی۔ دت کی تصنیف Peasantry of Bengal(1874) میں اور پھر ذرا عرصہ بعد ہی 1885 میں لگان داری ایکٹ کے موقع پر لگان داروں کے حق میں انڈین ایسوسی ایشن کی طرف سے چلائی گئی مہم سے بھی ملتا ہے۔ پٹہ داری حقوق (Occupancy Rights) کو تحفظ فراہم کر دیا گیا تھا۔ اور بعد کے ایک دوسرے قانون کے ذریعے اس میں توسیع بھی کر دی گئی تھی مگر اس سلسلے کی سب سے اہم بات یہ تھی کہ خواہ پبنا تحریک رہی ہو یا بعد کا انڈین ایسوسی ایشن کا احتجاج رہا ہو، یا حکومت کے ذریعے قانون سازی کا معاملہ رہا ہو، سبھی موقعوں پر پٹہ داری کا دعوانہ رکھنے والے کسانوں، بٹائی دار کاشت کاروں یا زرعی مزدوروں کے مسائل کو یک لخت نظر انداز کر دیا گیا تھا۔ پٹہ دار زمیندار اپنی زمین Korfa رعیتوں کو پہلے ہی سے ذیلی لگان داری میں دیتے آرہے تھے۔ کورفا رعیتوں کو کسی طرح کا تحفظ فراہم نہیں کیا گیا تھا اور پٹہ داری کو حقیقی کاشت کاری سے مشروط کرنے کی بھی کوشش نہیں کی گئی تھی۔ بنگال میں اس پورے عرصے کی زرعی بے چینی اور لگان داری سے متعلق قانون سازی کا حتمی نتیجہ جوت دار گروپوں کے مزید استحکام کی شکل میں سامنے آیا۔ ان گروپوں کو زمینداروں کے مقابلے پر آگے لایا گیا تھا۔ مگر یہ بھی زمینداروں جیسے ہی استحصالی ثابت ہوئے۔

لگان میں اضافے کے خلاف تحریکیں

عارضی بندوبست والے رعیت واڑی علاقوں میں انگریزوں کے ذریعے مال گزاری میں اضافے کی کوشش کی وجہ سے بھی بعض دیہی علاقوں میں احتجاج کی لہر پیدا ہو جایا کرتی تھی، مگر اس کی نوعیت اس لحاظ سے مختلف ہوتی تھی کہ اس میں بہت زیادہ اتفاق رائے ہوتا تھا، قیادت عام طور پر مقامی زعماء کے ہاتھوں میں ہوتی تھی اور دانش ور طبقے کی بھی مکمل تائید حاصل ہوتی تھی۔ مثال کے طور پر آسام کے کامروپ اور دارانگ اضلاع میں 94-1893 میں مال گزاری کے جس نئے بندوبست کے ذریعے شرحیں پچاس فی صد سے بڑھا کر 70 فی صد کر دی گئی تھیں، اس کا مقابلہ گاؤں والوں کے بڑے بڑے جلسوں (Raj Melas) کی شکل میں کیا گیا۔ ان جلسوں کی قیادت دیہی علاقوں کے اعلا طبقے (براہمن، گوسائیں، اور ڈولائی) کرتے تھے۔ ان لوگوں نے حکومت کو مال گزاری ادا نہ کرنے کے فیصلے کو لاگو کرانے کی کوشش کی۔ اس کے لیے عام اتفاق رائے کے خلاف جانے والوں یا حکومت کا دباؤ قبول کرنے والوں کا سماجی بائیکاٹ کرنے یا ان کے سر منڈوا

دینے کے طریقے بھی اپنائے گئے، گویا کہ حکمرانوں کے خلاف اونچی ذات والوں کے روایتی اثرات کو بھی بروئے کار لایا گیا۔ یہ وہ راستہ تھا جسے متوسط طبقے کے قوم پرست 1905 کے بعد ہی اختیار کر سکے تھے۔ بازاروں کو لوٹ لیے۔ کے بھی کچھ واقعات ہوئے اور جنوری 1894 میں رنگیا (Rangiya) اور پتھار و گھاٹ (Patharughat) میں دو واقعات پولس فائرنگ کے بھی ہوئے تھے۔ مال گزاری میں تخفیف کے مطالبے کی تائید جورہاٹ سارو جنک سبھا نے بھی کی تھی۔ اور یہ معاملہ بنگال کے اعتدال پسند لیڈر راس بہاری گھوش نے امپریل کاؤنسل میں بھی اٹھایا تھا۔ بہر حال کچھ رعایتیں حاصل کر لی گئی تھیں۔ مگر سماجی پیانے کے دوسرے سرے پر عوامی سطح کے چند تشدد پسند لیڈروں کے نام بھی عوام کی یادداشت میں ابھی تک محفوظ ہیں، جن میں Sarukhetri کے مشہور دست کار پسپا رام کانہر (Pusparam Kanhar) کا نام سرفہرست ہے۔

1896-97 میں دکن مہاراشٹر میں خشک سالی کے حالات کی وجہ سے اجناس کی دکانوں کو لوٹ لینے کے واقعات کے علاوہ قحط سالی ضابطے (Femine code) کے تحت مال گزاری لوٹا دینے کا مطالبہ پیش کیا گیا۔ اس مطالبے کو حکومت نے مسترد کر دیا۔ پونا سارو جنک سبھا نے جس پر کہ ذرا پہلے ہی تلک کا قبضہ ہو چکا تھا، لوگوں کو قحط سالی کے حالات میں قانونی حقوق سے واقف کرانے کے لیے اکتوبر 1896 اور اپریل 1897 کے درمیان اپنے ایجنٹ اندرونی علاقوں میں بھیجے۔ حکومت کو خطرے کی گھنٹی محسوس ہوئی، اور اس نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ اب ہندوستان کے قوم پرست بھی آئرشی مظاہرین کے ہتھکنڈے اپنانے لگے ہیں۔ حالانکہ تلک کی تحریک محض جلسے کرنے، کتابچے تقسیم کرنے تک ہی محدود تھی۔ یہ دوسری بات ہے کہ تھانے، کولابے، اور رتناگیری جیسے اضلاع میں مال گزاری ادا نہ کرنے کے سلسلے میں کچھ تنظیمیں بھی قائم کی گئی تھیں۔ اس موقع پر متوسط طبقے کے بعض اقدامات کے ساتھ ساتھ عوامی دباؤ بھی تھا جو آگے چل کر گاندھی کی قیادت میں ایک معیاری قوم پرستانہ تکنیک کا روپ اختیار کرنے والا تھا۔ پھڑکے کی تحریک کی طرح ہی اس موقع پر بھی عوامی مزاحمت کا سلسلہ قوم پرستوں کے منظر سے ہٹ جانے کے بعد بھی جاری رہا تھا۔ بمبئی ریزیڈینسی کے وسطی ڈویزن (پونا کے اردگرد کے مراٹھا علاقے) میں مال گزاری کی عدم ادائیگی کے سلسلے میں منقولہ جائدادوں کی قرقی کا جو سالانہ اوسط 1892-97 کے دوران 26 تھا، وہ 1897-98 میں بڑھ کر 194 اور 1898-99 میں 2269 ہو گیا تھا۔ 1899-1900 کی قحط سالی کے بعد مال گزاری کی عدم ادائیگی کے لیے جو تنظیمیں قائم کی گئی تھیں اور جن کی قیادت مبینہ طور پر مہاجنوں اور متمول کسانوں نے کی تھی وہ زیادہ تر سورت، ناسک، کھیڑا اور احمد آباد اضلاع میں قائم کی گئی تھیں اور پونا کی سارو جنک سبھا اس وقت تک پوری طرح

غیر سرگرم ہو چکی تھی۔

اب تک ہم نے جن اہم تضادموں کا ذکر کیا ہے، اگر ان کی نوعیت واقعی یہی رہی ہوتی تو جدید ہندوستان کی تاریخ کہیں زیادہ آسان ہوتی۔ ان تضادموں میں ڈاکوؤں، مہاجنوں، زمینداروں یا نو آبادیاتی مملکت کے ذریعے کیے جانے والے استحصال کے خلاف تحریکیں بھی شامل ہیں مگر واقعہ یہ ہے کہ ہندوستان کی بہت بڑی اکثریت مذہب یا ذات پات کے نقطۂ نظر سے سوچنے کی عادی تھی اور مذہب یا ذات کی یہ تفریق اکثر طبقاتی تفریق کی حدود کو بھی پار کر جاتی تھی، باوجودیکہ اس طرح کے رویے کو جدید کار قوت کے طور پر پیش کیا جاتا ہے مگر نو آبادیاتی نظام حکومت اس طرح کی روایتی وابستگیوں کے مزید استحکام کا ہی باعث ہوا۔

ذات پات کا شعور

ذات پات کے سلسلے میں حال کے ساجیاتی مطالعوں میں اس بات پر زیادہ زور دیا گیا ہے کہ ہندوستان میں بامعنی سماجی اکائیوں کی حیثیت ورنوں (سنسکرت کی مذہبی کتابوں کے مطابق کل ہند سطح کا نظام مراتب) کو نہیں بلکہ ان بڑی مقامی جاتیوں (ذاتوں) کو حاصل ہے جو کہ مختلف درجے کی پیشہ جاتی شناخت، مشترک رسم ورواج اور برادری سے باہر بیاہ شادی اور کھانے پینے پر پابندی جیسے اصولوں کے ذریعے باہم متحد ہوتی ہیں۔ اس پرانے تصور کو مسترد کر دیا گیا ہے کہ ذاتوں کی زمرہ بندی مکمل طور پر جامد اور غیر تغیر پذیر ہوتی ہے۔ ایم این سری نواس کے الفاظ میں "سنسکرتیانے کے رجحانات" جیسی بہت سی مثالوں کا پتہ لگایا جارہا ہے، یعنی یہ کہ اب جاتیاں اپنے سے اونچے گروہوں کے رسم ورواج اور طور طریق اپنا کر خود کو اونچی ذات والوں کا درجہ دلانے کی تگ ودو کر رہی ہیں۔ برطانوی ہند کے ماقبل کے دور میں ذاتوں کے درجے اور مراتب میں تبدیلی آسان تھی کیونکہ سیاسی نظام بھی لوچ دار ہوتا تھا اور لوگ فاضل زمینوں والے علاقوں کے لیے آسانی سے نقل وطن کر سکتے تھے۔ مثال کے طور پر عہد وسطیٰ میں بنگال کے لوگوں نے تاجروں اور کسانوں کے طور پر عروج حاصل کیا جب کہ وہ اصلاً گوپ چرواہا برادری کے تھے اور بنگال اور بہار کی سرحد سے متصل اس علاقے میں نقل وطن کر گئے تھے جہاں زمینوں پر پہلے کبھی کھیتی نہیں ہوئی تھی۔ بعض اوقات لوگ مقامی ریاستوں کے حصے بھی اپنے قبضے میں لے لیتے تھے۔ نو آبادیاتی دور میں اس طرح کے مواقع کم یا بالکل ہی ختم ہو گئے تھے۔ مگر دوسرے مواقع پیدا بھی ہوئے۔ اب نئی ریاستوں کی تشکیل کا تو کوئی سوال ہی نہیں تھا اور غیر کاشت زمین بھی کم سے کم تر ہوتی جارہی تھی، مگر بہتر مواصلاتی سہولیات سے وسیع ترجمعیت (Combination) ممکن ہوئی۔ انگریزی تعلیم چھوٹی مگر نمو پذیر برادریوں کی ساجی ترقی کے لیے ایک نیا زینہ ثابت ہوئی۔ لیکن نو آبادیاتی

استحصال کے لیے باہمی نفاق کا عمل اپنایا گیا جس سے کچھ گروہوں کو فائدہ ہوا اور کچھ دوسرے گروہوں کو نقصان! 1901 کی اور پھر اس کے بعد کی مردم شماری سے انگریزوں نے ہر دس سال بعد ذاتوں کی درجہ بندی "مقامی رائے عامہ کے ذریعے تسلیم شدہ سماجی حیثیت" کی بنیاد پر کرنے کی کوشش کی۔ یہ ایسی کوشش تھی جس کے نتیجے میں دعوؤں اور جوابی دعوؤں کا ایک سیلاب سا آگیا، کیونکہ جاتیوں کے لیڈر، ذات پات کی بنیاد پر قائم کی گئی انجمنوں اور اپنی فوقیت کے لیے ایک دوسرے سے گتھم گتھا ہو گئے تھے اور اپنی ذاتوں کے سلسلے میں دیومالائی قصے بھی گڑھنے لگے تھے۔
یہ کہا جاسکتا ہے کہ ذات پر مبنی اتحاد کی نئی صورت حال میں دو طرح حوصلہ افزائی ہوئی۔ اول تو یہ کہ کسی بھی جاتی کے کامیاب اور سرکردہ افراد اپنی ذاتی اور خود غرضانہ قسم کی جدوجہد میں اپنی ذات کے لوگوں کو بھی ملوث کر لیتے تھے۔ یہ ذات پات کی تفریق بہت سود مند ثابت ہوئی۔ چنانچہ انھوں نے اسے اپنی سماجی شناخت، عہدے اور سیاسی مراعات کے لیے خوب استعمال کیا۔ اس عمل کو 1880 کی دہائی سے انتخابی سیاست کے تعارف سے مزید تقویت ملتی گئی تھی۔ جہاں تک کسی جاتی کے نادار افراد کا تعلق تھا، تو برادری کے زیادہ کامیاب افراد کے ساتھ محض سرپرستانہ تعلق ہی اس اجنبی اور مشکلات سے پر دنیا میں ان کے لیے بقاء کا واحد وسیلہ رہ گیا تھا۔

اس طرح کی باتوں کا نتیجہ اکثر ذات اتحاد، ذات رقابت اور "سنسکرتیانے" کی تحریکوں سے متعلق غلط احساس کے ذریعے سماجی و معاشی کشیدگیوں کی شکل میں سامنے آتا رہا ہے۔ مثال کے طور پر Bernard Cohn کے ذریعے جون پور (مشرقی اتر پردیش) کے ایک گاؤں کے مطالعے میں دکھایا گیا ہے کہ کس طرح چماروں نے (جو کہ بیشتر چھوٹے کسان یا بے زمین زرعی مزدور تھے اور راجپوت ٹھاکرز میندراروں کے زیر حکم تھے) سیوانارائین مت کے فلسفے میں اپنے لیے اطمینان کا سامان تلاش کر لیا تھا۔ اور براہمنی طور طریقوں کی نقالی (جیسے کہ گائے بھینس کے گوشت کی ممانعت وغیرہ) کر کے اپنی سماجی حیثیت کو بڑھانے کی کوشش کر رہے تھے جبکہ ملک کے دوسرے سرے پر کرالہ کے Ezhava اچھوتوں نے براہمن ریاستوں پر حملے، مندروں میں داخلے کے مطالبے اور اپنے بعض رسم ورواج کو سنسکرتیانے کے سلسلے میں بیسویں صدی کے اوائل سے ہی Nanu Asan (سری نرائینا گرو 1928-1854) سے تحریک حاصل کی تھی۔ بعد میں یہ Ezhava اچھوت کرالہ میں کمیونسٹوں کے سب سے بڑے حامی ثابت ہوئے۔ ای۔ ایم۔ ایس نمبودری پاد کا تو یہ بھی کہنا ہے کہ بعض اوقات ذات پات کی وابستگیاں جاگیردارانہ نظام کے خلاف کسانوں کے اٹھ کھڑے ہونے کی پہلی شکل تھی۔ مگر اس کے ساتھ ہی نمبوداری پاد کا یہ بھی کہنا ہے کہ اگر کسانوں کو ایک طبقے کے طور پر تسلیم کرنا ہے تو ان پر ذات پات کی گرفت کو توڑنا ہوگا (National Question in Kerala 1952 P. 102)۔

جنوبی تامل ناڈو میں ناڈاروں کے عروج کے سلسلے میں Hardgrave کے تفصیلی تجزیے سے پتہ چلتا ہے کہ تاڑی نکالنے والوں اور زرعی مزدوروں پر مشتمل اچھوت ذات، جس کا اصل نام Shanan (شانن) تھا، کس طرح سوداگروں کی اونچی ذات میں تبدیل ہو گئی تھی۔ اور 1901 کی مردم شماری میں ان لوگوں نے اپنا اندراج چھتری کے طور پر کرانے کا دعوا کیا تھا، اور خود کو ناڈار کہنا شروع کر دیا تھا۔ ناڈار کی اصطلاح اس سے پہلے زمین اور پالمیر اور ختیوں کے Shanan مالکوں کے لیے استعمال ہوتی تھی۔ مندروں میں داخلے کے حق کے مطالبے نے 1899 میں ترونل ویلی میں بھیانک قسم کے بلوے کی شکل اختیار کر لی تھی۔ اسی طرح شمالی تامل ناڈو کے پلیوں نے بھی 1871 سے خود کو چھتری ذات سے منسوب کرنا شروع کر دیا تھا۔ اور بیواؤں کی شادی پر پابندی جیسے براہمنی طور طریقوں کی نقل شروع کر دی تھی۔ مہاراشٹر کے مہار بھی، جو آگے چل کر امبیڈکر تحریک کے لیے ریڑھ کی ہڈی ثابت ہوئے۔ انیسویں صدی کے آخر میں ایک سابق فوجی گوپال والنگکر کی قیادت میں خود کو منظم کرنے لگے تھے۔ 1894 میں والنگکر کے ذریعے تیار کیے گئے ایک مقدمے کے مسودے میں اصلاً چھتری ہونے اور اس بنیاد پر گاؤں کے نچلے درجے کے ملازموں (چوکیداروں، ہرکاروں، مقامی پنچوں، جاروب کشوں وغیرہ) پر مشتمل اس اچھوت ذات کے لیے آرمی اور دوسری خدمات میں نوکری کا دعوا پیش کیا گیا تھا۔ ان میں سے کچھ کے روایتی پیشے برطانوی حکومت میں خطرے میں پڑ گئے تھے۔ مگر جنھیں فوج کی خدمت کے ذریعے کچھ دوسرے مواقع بھی حاصل ہو گئے تھے۔ آرمی میں بھرتی کے سلسلے میں شمالی ہند کی "عسکری نسلوں" کے نئے تصور نے مہار تنظیموں کی تشکیل کے لیے فوری تحریک کا کام کیا۔

بہ حیثیت مجموعی ہمارے اس موجودہ دور میں ذات پات سے متعلق سب سے موثر تحریکوں کے رابطے، درمیانی درجے کی ذات والوں کے ساتھ ہی قائم رہے تھے۔ ان میں عام طور پر زمین کے مالک یا متمول کسان شامل تھے۔ جو کہ شہری تعلیم یافتہ گروپوں کو تیار کرنے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ مہاراشٹر اور مدراس میں سروسوں اور عام ثقافتی زندگی پر براہمنوں کے واضح غلبے کے نتیجے میں صدی کے آخر تک براہمن مخالف تحریکیں شروع ہو گئی تھیں۔ مہاراشٹر میں براہمنوں کے خلاف خطرے کی گھنٹی سب سے پہلے 1870 کی دہائی میں جیوتی با پھولے نے بجائی تھی۔ انھوں نے اس خطرے کی اطلاع اپنی کتاب غلام گیری، (1813) اور اپنی تنظیم ستیہ شودھک سماج کے ذریعے دی تھی جو "نچلی ذاتوں کو پاکھنڈی براہمنوں اور ان کی موقع پرستانہ مذہبی کتابوں" سے محفوظ رکھنے پر زور دیتی تھی۔ اس تحریک کی ابتداء نچلی مالی ذات کے ایک فرد نے کی تھی۔ بعد میں اس کی جڑیں ذاتیلے مراٹھا کسان طبقے تک بھی پھیل گئی تھیں۔ Gail Omvedt کی ایک حالیہ قابل قدر کتاب Cultural revolt in a colonial Society; the Non Brahman

Movements in western India 1873-1930 میں ستیہ شودھک تحریک کے دو طبقاتی ہونے پر زور دیا گیا ہے، یعنی اس میں ایک طرف تو طبقہ اولی والا قدامت پرستانہ رجحان بھی تھا اور دوسری طرف عوامی انقلاب پسندی بھی تھی۔ اول الذکر رجحان کا ارتقاء اعتدال پسندانہ 'سنسکرت یانے' کے خطوط پر ہوا جس کے تحت مراٹھوں کے چھتری الاصل ہونے کا دعوا بھی کیا جاتا رہا اور اسے 1890 کی دہائی سے کولہاپور کے مہاراجہ کی سرپرستی بھی حاصل رہی تھی۔ یہ ایک نفاق انگیز بات ہونے کے ساتھ ساتھ حکومت کی وفاداری بھی تھی، انگریز کولہاپور کے مہاراجہ کو تلک کے خلاف بھڑکاتے آرہے تھے۔ اور بھاسکر راؤ جادو کی غیر براہمن پارٹی 1919 کے بعد ایک کانگریس مخالف تنظیم بن چکی تھی مگر اس کے ساتھ ہی ایک دوسرا رجحان بھی تھا۔ یہ شہروں کی جگہ پر گاؤں میں کام کرنے کا رجحان تھا اور اس کے لیے انگریزی کی جگہ پر مراٹھی بولیوں سے کام لیا جارہا تھا۔ اور اس میں ذات پات کے نظام کے اندر نسبتاً زیادہ باعزت مقام دینے کی بات کرنے کی بجائے ذات پات کے نظام کو ہی نشانہ بنایا جانے لگا تھا۔ اس کے علاوہ شیٹ جی اور بھٹ جی (مہاجنوں اور براہمنوں) کے خلاف بہوجن سماج کی ترجمانی کا دعویدار بھی تھا۔ اس رجحان نے 1919-21 میں ستارا میں شورشوں کو اکسایا اور بعد میں مہاراشٹر کے دیہی علاقوں میں گاندھیائی کانگریس میں نئی جان بھی پھونکی۔ تھوڑے عرصے بعد اس طرح کا رویہ مدراس میں بھی دیکھنے میں آیا۔ کیونکہ تعلیم اور خدمات کے میدانوں میں براہمنوں کے ازحد غلبے (پریزیڈنسی میں براہمنوں کا تناسب 2.3 فی صد تھا۔ لیکن 1870 اور 1918 کے درمیان مدراس یونیورسٹی کے براہمن گریجویٹوں کا تناسب 70 فی صد تک پہونچ گیا تھا) کو تعلیم یافتہ تیلگو ریڈیوں، تمل ویلالوں اور کموں اور ملایالی نائروں نے چیلنج کرنا شروع کر دیا تھا۔ براہمنوں کے خلاف اس چیلنج کی نوعیت ایک حد تک اعلا طبقاتی ہی تھی جس کا اشارہ دسمبر 1918 کے غیر براہمن منشور میں بار بار اس حوالے سے بھی ملتا ہے کہ ٹیکس دہندگان کی بھاری اکثریت غیر براہمنوں پر ہی مشتمل تھی جن میں زمیندار، جوت دار اور کسان وغیرہ شامل تھے۔ Irshchik کے تجزیے میں اس امر کے وافر شواہد فراہم کیے گئے ہیں کہ انگریزوں نے دروڑیا تامل آبادی میں علاحدگی پسندانہ رجحانات کی باقاعدہ حوصلہ افزائی کی تھی۔ یہ بات 1920 اور 1930 کی دہائیوں کی جسٹس پارٹی کی شکل میں اور بھی نمایاں ہو گئی تھی۔ تاہم اس سے بھی کافی پہلے 1886 میں ایک کانوو کیشن سے گورنر مدراس کے خطاب میں کئی دلچسپ باتیں ملتی ہیں مثلاً "آپ ایک بالکل خالص دروڑ نسل سے تعلق رکھتے ہیں...... میں یہ چاہوں گا کہ ما قبل سنسکرت عناصر آپ کے اندر بھی واضح طور پر ابھر کر سامنے آئیں...... سنسکرت سے آپ کا واسطہ اس سے بھی کہیں کم ہے جتنا کہ ہم انگریزوں کا ہے...... بد قماش قسم کے یورپیوں نے بعض اوقات ہندوستان کے مقامی لوگوں کو کالا آدمی کہہ کر بھی پکارا ہے مگر ان یوروپیوں نے سنسکرت

مصنفوں کی طرح جنوبی ہند کے لوگوں کو بندروں کا ریوڑ کبھی نہیں کہا"۔ دوسری بہت سی کشید گیوں (خصوصاً ذات، مذہب علاقہ اور طبقے سے متعلق کشید گیوں) کے ساتھ ساتھ سامراجی قوتوں نے گروہ بندیوں کو بڑھاوا دینے کے لیے باہمی رنجشوں کو بھی پوری عیاری کے ساتھ استعمال کیا۔ اس کے ساتھ ہی مہاراشٹر کی طرح ہی، تامل ناڈو میں بھی سماجی اعتبار سے انقلابی امکانات بالکل ہی ناپید نہیں تھے۔ اس بات کی شہادت ہمیں 1920 کی دہائی کی تشدد پسندانہ اور کسی حد تک ملحدانہ قسم کی عزت نفس تحریک (Self Respect Movement) سے بھی ملتی ہے۔ اس لیے کہا جاسکتا ہے کہ ذات پات سے متعلق ہر تحریک پر سنسکرت پانے، کا لیبل لگانا درست نہیں ہوگا۔ ان میں کچھ تحریکیں ایسی بھی رہی ہیں جن میں ذات پات کی بنیاد کو ہی نشانہ بنایا گیا تھا۔

براہمن غلبہ شمالی ہند اور مشرقی ہند میں بالکل واضح شکل میں تھا جہاں دوسری اونچی (اتر پردیش، بہار میں راجپوت، چھتری، نیز بنگال میں کائستھ اور ویدیہ) ذاتیں حد فاصل کا کام کرتی تھیں۔ شمالی ہند میں ذات پات پر مبنی صف بندی کا سلسلہ کافی بعد شروع ہوا۔ یہ دوسری بات ہے کہ اسے اب ان علاقوں میں بہت زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ کائستھ برادری کے لوگوں نے پیشہ جاتی بین صوبائی روابط کی وجہ سے 1900 سے ہی کل ہند سطح کی تنظیم قائم کرنا اور اخبار (کائستھ سماچار) نکالنا شروع کر دیا تھا۔ بنگال میں نچلی ذات والوں کی تنظیمیں بیسویں صدی کی پہلی دہائی سے اہمیت حاصل کرنے لگی تھیں۔ مدنا پور کے کائیورتوں (Kaivartas) نے چند مقامی زمینداروں اور کلکتہ کے چند تاجروں اور وکیلوں کی رہنمائی میں خود کو مہیشہ (Mahishya) کہلانا شروع کر دیا تھا اور 1897 میں جاتی نردھارن سبھا کے نام سے ایک تنظیم بھی شروع کی تھی اور 1901 کی مردم شماری کے دوران سینٹرل مہیشیہ کمیٹی بھی قائم کی تھی۔ مدنا پور کے مہیشیوں نے بعد میں قومی تحریک میں بہت نمایاں حصہ لیا۔ بہر حال انگریزوں کے پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو کے حربے فرید پور کے نام سودروں میں بہت کامیاب ثابت ہوئے جنھوں نے مٹھی بھر تعلیم یافتہ اعلا طبقے اور عیسائی مبلغین کی ترغیب پر 1901 کے بعد اپنی تنظیمیں قائم کرنا شروع کر دی تھیں۔ مہیشیوں اور نام سودروں کے اس باہم متضاد رویوں کی توجیہ اس بات سے کی جاسکتی ہے کہ اول الذکر مقامی طور پر ایک غالب، ذات تھی جس میں چھوٹے چھوٹے زمینداروں اور کسانوں کے ساتھ ساتھ نادار قسم کے لوگ بھی شامل تھے، جبکہ آخر الذکر اچھوت اور غریب کسان تھے جو کہ سمندر پار کے آقاؤں کے مقابلے میں، استحصال کرنے والے اونچی ذات والوں کو زیادہ قریبی دشمن سمجھتے تھے۔

فرقہ واریت

نو آبادیاتی نظام حکومت شعور نے جن دوسرے گروہی احساسات یا تعصبات کو پروان چڑھایا

وہ مذہب پر مبنی نفاق تھا۔ جسے ہندو مسلم فرقہ واریت کا نام دیا جاتا ہے۔ اس پیچیدہ اور نازک موضوع پر پوری دیانت داری اور صفائی کے ساتھ غور کرنا بیسویں صدی میں دو مختلف انداز فکر کے پروان چڑھنے کی وجہ سے کافی مشکل ہو گیا ہے۔ ایک طرف تو فرقہ پرستوں کی یہ سوچ ہے کہ ہندو اور مسلمان دو ایسے ہم جنس ہیں جو باہم دشمن پیدا کیے گئے ہیں اور عہد وسطیٰ سے ہی دو الگ الگ قوموں کی طرح رہتے آئے ہیں؛ جبکہ دوسری طرف قوم پرست ایک ایسے زریں عہد کی بات کرتے ہیں جس میں مکمل فرقہ وارانہ ہم آہنگی تھی جسے انگریزوں کی پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو کی پالیسی نے تباہ کر دیا۔ ان دونوں انداز فکر میں جس ملک گیر یک جہتی اور یکسانیت کا تصور پیش کیا گیا ہے وہ 19ویں صدی کے نصف آخر کے دوران مواصلاتی نظام اور معاشی روابط کی توسیع و ترقی سے پہلے ممکن ہی نہیں تھی۔ ہندوستانی قوم پرستی اور ہندو مسلم فرقہ واریت دونوں ہی دراصل عہد جدید کا ہی مظہر ہیں۔ پچھلی صدیوں کے دوران بھی ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان مقامی نوعیت کے تصادموں کی مثالیں ملتی ہی، بالکل اسی طرح جس طرح کہ سنیوں اور شیعوں کے درمیان یا مختلف ذات والوں کے درمیان تصادم ہوتے رہے تھے۔ مگر فرقہ وارانہ فسادات 1850 کی دہائی تک بہت شاذ و نادر ہی ہوتے تھے۔ چنانچہ 1944 میں ایک سامراجی اسکالر Coupland نے، جس کے لیے اس معاملے کی اہمیت کی گھٹا کر پیش کرنے کی کوئی وجہ نہیں تھی (بلکہ جس نے بالوضاحت یہ بھی کہا تھا کہ ہندو مسلم مسئلہ انگریزی حکومت کو برقرار رکھنے کا سبب ہے) 1809 میں بنارس میں اس طرح کے ایک بڑے واقعے کا ذکر کیا ہے (کہا جاتا ہے کہ ہندوؤں نے پچاس مسجدوں کو منہدم کر دیا تھا) اور پھر دوسرا بڑا واقعہ 72-1871 میں ہوا تھا اور 1885 سے تو فرقہ وارانہ فسادات کا سیلاب سا آ گیا تھا۔ (R. Coupland: Constitutional Problem page -29)۔

یہ ایک پرانی مسلمہ حقیقت ہے کہ ملازمتوں یا سیاسی مراعات کے لیے اعلیٰ طبقات کے درمیان ٹکراؤ کے نتیجے میں فرقہ واریت بڑے پیمانے پر پھیلتی چلی گئی۔ اسکالروں نے بھی زیادہ زور صرف اسی پہلو پر دیا ہے۔ چنانچہ یوپی کے مسلمانوں کے سلسلے میں فرانسس رابن سن کے تفصیلی کام میں اعلا طبقات کی سیاست کاری کو مرکزی اہمیت دیتے ہوئے بڑے بڑے فسادات کو شامل نہیں کیا گیا ہے (Separatism Among Indian Muslims)۔

طبقہ اولیٰ کی فرقہ واریت کی جڑوں کا تجزیہ اگلے حصے میں تاریخی اعتبار سے ہم عصر دانشور اور متوسط طبقے کی فرقہ واریت کے ساتھ کیا جائے گا۔ بہر حال اس الم ناک حقیقت کو تسلیم کرنا بھی ضروری ہے کہ فرقہ واریت شروع سے ہی عوامی سطح پر موجود رہی ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ عوامی سطح کی فرقہ واریت بھی دراصل طبقہ اولیٰ کی فرقہ پرستی کا ہی شاخسانہ رہی ہے۔

جہاں چنا فسادات، یا فرقہ وارانہ عنصر کی حامل موپلا بغاوت جیسی کوئی بات ہمارے اپنے عہد میں نہیں ہوئی ہے اور اس کی وجہ شاید بنگال یا مالا بار علاقے میں علاحدگی پسند دانشور طبقے کا فقدان رہا ہوگا، وہیں صوبہ جات متحدہ اور پنجاب میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان ایک طرح کا توازن تھا اور یہی وہ علاقہ ہے جہاں 1880 کی دہائی کے بعد فرقہ وارانہ فسادات معمول بن گئے تھے۔ سماجی اور معاشی تناؤ بھی اس کی ایک وجہ رہا ہوگا۔ چنانچہ اودھ، نیز علی گڑھ، بلند شہر جیسے علاقوں میں ہندو کسانوں کا سابقہ مسلم تعلقہ داروں اور زمینداروں سے رہا ہوگا۔ یوپی کے شہروں اور قصبوں میں مسلم آبادی کا بیشتر حصہ دست کاروں، چھوٹے موٹے تاجروں، دکانداروں پر مشتمل تھا جبکہ بیشتر بڑے سوداگر اور بنک کار ہندو تھے۔ دوسری طرف پنجاب میں ہندو تاجر اور مہاجن مسلم کسانوں میں غیر مقبول تھے۔

بہر حال ان فسادات کی بنیاد اکثر غیر معاشی ہوا کرتی تھی۔ جیسے ہی کوئی تحریک شروع ہونے کو ہوتی، گاؤکشی جیسے معاملے پر پورے شمالی ہند میں فسادات پھوٹ پڑتے تھے۔ Gerald Barrier نے پنجاب میں 1883 اور 1891 کے درمیان اس طرح کے 15 بڑے فسادات کا ذکر کیا ہے۔ 1888 اور 1893 کے درمیان مشرقی یوپی اور بہار میں اس طرح کے فسادات نقطہ عروج پر تھے۔ بلیا، بنارس، اعظم گڑھ، گورکھپور، آرہ، سارن، گیا اور پٹنہ جیسے اضلاع سب سے زیادہ متاثر تھے۔ 1893 اور 1895 کے درمیان بمبئی شہر نیز مہاراشٹر کے دوسرے شہروں میں بھی بھیانک فسادات ہوئے تھے۔ ایک گجراتی مل مالک نے 1893 میں بمبئی گو سرکشا سمیتی' بھی بنائی تھی۔ اس کے علاوہ تلک کے ذریعے گن پتی میلے کو سار واجنک یا فرقے (برادری) کی بنیاد پر نیا روپ دیئے جانے کے نتیجے میں فرقہ وارانہ کشیدگی کو بڑھاوا ملا تھا۔ گن پتی اتسو کے سلسلے میں لکھے گئے گیتوں میں ہندوؤں سے محرم کا بائیکاٹ کرنے کی اپیل کی جاتی تھی۔ ہندو محرم میں پہلے کھل کر حصہ لیا کرتے تھے۔ ایک اصلاح پسند اخبار 'سدھارک' نے تو 1898 میں محرم کو گن پتی سے کہیں بڑا قومی تہوار بتایا تھا۔ کچھ گیت کافی اشتعال انگیز بھی ہوتے تھے۔ ان گیتوں میں کہا جاتا "اللہ نے تمہیں ایسی کون سی نعمت دے دی ہے کہ آج تم مسلمان بن گئے ہو" "ایسے مذہب سے کوئی واسطہ نہ رکھو جو کہ ایک غیر مذہب ہے" "گو ہماری ماتا ہے"، "اسے مت بھول جانا" وغیرہ وغیرہ۔ (R.Cashman: The Myth of Lokmanya: page 78) کلکتہ کے صنعتی مضافات میں پہلا رکارڈ شدہ فساد مئی 1891 میں ہوا تھا۔ اس کے بعد 1896 میں عیدالاضحیٰ کے موقع پر ٹیٹا گڑھ اور گارڈن ریچ علاقوں میں زبردست بلوے ہوئے اور پھر 1897 میں شمالی کلکتہ کے تلا علاقے میں بھیانک فسادات پھوٹ پڑے تھے۔

محنت کش طبقہ

دیپیش چکرورتی نے 1890 کے وسط میں کلکتہ جوٹ مل کے فسادات کو ایسے موضوع کا نقطہ آغاز بنایا جو ہمارے ملک میں ابھی تک اچھوتا رہا تھا۔ یہ موضوع محنت کش طبقے میں ابھرنے والے ابتدائی شعور کا تھا۔ 1890 کی دہائی تک بمبئی کے کپاس مل والے علاقوں میں اور کلکتہ کے جوٹ مل والے علاقوں میں عام سطح کی آبادی کا ارتکاز ہو چکا تھا۔ یہ لوگ ناگفتہ بہ حالات میں رہتے اور کام کرتے تھے۔ نظریاتی طور پر 1881 اور 1891 کے فیکٹری ایکٹوں کے تحت بچوں اور عورتوں کی نوکریوں پر (بمبئی کی کپڑا صنعت سے حسد رکھنے والی لنکا شائر کپڑا صنعت کے دباؤ پر) جو سرسری سی بندش لگائی گئی تھی اس کی نہیں کے برابر پابندی ہوتی تھی اور روزانہ 15، 16 بلکہ 18 گھنٹے کام لیا جاتا تھا اور مرا ٹھا محنت کشوں کے غلبے والی بمبئی میں مزدوروں نے طبقاتی خطوط پر کچھ سماجی نوعیت کے سمجھوتے کر لیے تھے۔ ان کے حالات کو بہتر بنانے کی کوشش مہاتما پھولے کے ساتھی این۔ ایم لوکھنڈے کے ذریعے 1880 میں ایک ہفت روزہ اخبار دین بندھو کے اجراء، 1884 میں کام کے اوقات میں کمی کے لیے جلسوں کے اہتمام اور 1890 میں مل ہینڈز ایسوسی ایشن کے قیام کی شکل میں پہلے ہی شروع ہو چکی تھی۔ اس ایسوسی ایشن کی حیثیت ٹریڈ یونین کی نہیں تھی بلکہ صرف یہ ہوا تھا کہ لوکھنڈے نے مل مزدوروں کو مفت مشورہ دینے کے مقصد سے ایک دفتر کھول لیا تھا۔ اسی طرح کی سرگرمیاں براہمو سماجی مصلح سسی پاڈا بنرجی نے بھی کلکتہ کے ایک مضافاتی علاقے Baranagore کے بنگالی مل ورکروں کے لیے شروع کی تھیں۔ ان سرگرمیوں میں شبینہ اسکول، کلب، معاملات زندگی میں اعتدال پسندی کے لیے انجمنوں کی تشکیل نیز بھارت سرم جیوی کے نام سے ایک جریدے کا اجراء (1874) وغیرہ شامل تھے۔ ان سرگرمیوں کا مقصد مل مزدوروں کے اندر کفایت شعاری، سنجیدگی اور اپنی مدد آپ کے شعور کو فروغ دینا تھا۔ ملوں کے یوروپی منیجروں نے یہ اعلان کر دیا تھا کہ "ان کے ملازمین میں سے جو لوگ سسی بابو کے اسکولوں میں جاتے ہیں وہ بہت ہی جان نثار اور ہر معاملے میں بہت ہی احتیاط پسند پائے جاتے ہیں۔ Baranagore جوٹ مل کا منیجر، اور Borneo جوٹ کمپنی کا ڈبلو ایلکو نڈر بھی دراصل بنرجی کے سرپرستوں میں سے ایک تھا۔ بہر حال کلکتہ میں اس طرح کی متوسط طبقاتی انسانی دردمندی بھی 1890 کی دہائی میں ختم ہو گئی کیونکہ مشرقی یوپی اور بہار کے مزدوروں نے رفتہ رفتہ جوٹ ملوں میں بنگالی مزدوروں کو بے دخل کر کے ان کی جگہ خود لے لی تھی۔ بنگال اور بہار کی کانوں میں اور آسام کے چائے باغات میں کام کرنے والے مزدور بھی باہر کے ہی تھے جو اپنے اپنے گھروں سے سینکڑوں میل دور بہت ہی ناموافق حالات اور بالکل اجنبی ماحول میں زندگی گزار رہے تھے۔ بنگال

کے دوارکاناتھ گنگولی جیسے دانشور لیڈروں نے مزدوروں کے غلامانہ حالات کے خلاف 1880 کی دہائی میں مہم شروع کی تھی مگر چائے باغات اور کانوں میں کام کرنے والے مزدوروں کو منظم کرنے کی کوشش کسی نے نہیں کی۔

مزدوروں نے اوور سیروں پر حملے، بلوے اور ہڑتالوں کے ذریعے حالات کا اپنے طور پر مقابلہ کرنے کی کوشش کی۔ 1882 اور 1890 کے درمیان بمبئی اور مدراس میں 25 بڑی اور اہم ہڑتالوں، 93-1892 اور 1901 کے درمیان بمبئی میں متعدد بڑی ہڑتالوں اور 1890 کی دہائی میں کلکتہ کے جوٹ مزدوروں میں تشدد پسندی کا رکارڈ ملتا ہے۔ اس شدت پسندی کے نتیجے میں ہی انڈین جوٹ ملز ایسوسی ایشن نے اپریل 1895 میں حکومت بنگال سے "مل مزدوروں کی فسادی انجمنوں کو کچلنے کے لیے پولس نگرانی بڑھادینے کے لیے کہا تھا"۔ لیکن چکرورتی نے جس اہم نکتے کی طرف اشارہ کیا ہے یہ ہے کہ کس طرح مزدوروں کا یہ ابتدائی نوعیت کا احتجاج واضح قسم کی طبقاتی ہیئت کی بجائے فرقہ وارانہ احساس کی شکل اختیار کر جاتا تھا۔ مسلم ورکر عید اور محرم کے موقع پر اور ہندو ورکر رتھ یاترا کے موقع پر تعطیل کا مطالبہ کرتے اور کبھی کبھی گوکشی یا کسی متنازعہ جگہ پر عبادت گاہ کی تعمیر جیسے معاملوں پر آپس میں لڑ جاتے تھے۔ 97-1896 کا کلکتہ اور آس پاس کے علاقوں کا فساد ایک واضح مثال ہے۔ یہ رویہ دراصل یوپی اور بہار کے اُن علاقوں کی دین تھا جہاں سے 1880 کی دہائی میں یہ مزدور بھرتی کیے جاتے تھے اور گوکشی سے متعلق فسادات کا مرکز تھے۔ جیسا کہ E.P. Thompson نے بھی واضح کرنے کی کوشش کی ہے برطانیہ میں مزدور طبقے کی تشکیل میں دستکاروں کی انقلاب پسندی کی اس گراں قدر روایت کا بھی ہاتھ رہا تھا جس نے سترہویں صدی عیسوی میں برطانیہ کے بورژوائی انقلاب کے جمہوری پہلوؤں کے تحفظ اور توسیع میں رول ادا کیا تھا۔ ہندوستان میں جو فلاکت زدہ کسان اور بدحال دستکار طبقے فیکٹریوں میں بھرتی ہو رہے تھے وہ علاقے، ذات، رشتہ داری یا مذہب کے بندھن سے جڑ جاتے تھے۔ ان لوگوں کے لیے نیا شہری ماحول اس طرح کے بندھنوں میں مزید استحکام کا باعث ہوا۔ کیونکہ ان لوگوں کا فاضل مزدوروں والی منڈی سے بھی سابقہ تھا جہاں بے ہنر (Unskilled) مزدور نوکری کے لیے ایک دوسرے سے نبرد آزما رہتے تھے۔ یہ نوکریاں بھی اُن سرداروں کے توسط سے ہی حاصل ہو پاتی تھیں جو اپنے ہم مذہب لوگوں یا رشتہ داروں کو ہی فائدہ پہونچاتے تھے اور بعض اوقات تو علاحدگی پسندانہ تصورات کی ترسیل کا کام بھی کرتے تھے۔ چکربرتی کے مقالے میں دکھایا گیا ہے کہ کس طرح ایک مقامی امام مسجد کے توسط سے 1896 میں رشڑا کے مسلم جوٹ مزدوروں کا رابطہ کلکتہ کے ایک سرکردہ مسلم تاجر حاجی نور محمد زکریا کے ساتھ قائم کرایا جارہا تھا۔ ایک اہم بات یہ بھی ہے کہ کلکتہ کے صنعتی علاقوں کے سلسلے میں جس پہلی اور نسبتاً مستحکم مزدور تنظیم کا پتہ چلتا ہے

وہ محمڈن ایسو سی ایشن آف کا تکی ناڑا تھی جو 1895 میں قائم ہوئی تھی اور مسجدوں کی مرمت اور اپنے ممبروں کی مدد کے لیے چندہ اکٹھا کرتی تھی۔

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ باہر سے بڑی تعداد میں مزدوروں کی آمد، قحط سالی جیسے حالات میں غذائی اشیاء کی قیمتوں میں بھاری اضافے اور بجلی کی روشنی شروع کیے جانے (جس کی وجہ سے کام کے اوقات اور بھی بڑھ گئے تھے) کے نتیجے میں 1890 کی دہائی کے وسط میں کلکتہ کی جوٹ ملوں میں جو معاشی تناؤ بڑھ گیا تھا اس کا نتیجہ آجروں (Employers) کے خلاف اشتعال کی شکل میں سامنے آیا۔ اس کے نتیجے میں برادر کش فسادات بھی ہوئے اگرچہ چکر برتی کی اس رائے کا کہ "آجروں کے خلاف اشتعال کم اور برادر کش فسادات زیادہ تھے" بعد میں رنجیت داس گپتا نے تفصیل سے جائزہ لیا ہے۔ بہر حال اس طرح کے غیر مستقل تبصرے کو بیسویں صدی کے ہندوستان کی تاریخ کی ایک ایک خصوصی اہمیت کی حیثیت حاصل رہے گی جس میں فرقہ، برادری، ذات طبقے اور قوم سے متعلق تصورات ایک دوسرے میں پوری طرح گتھم گتھا ہیں۔ چنانچہ اگر زرعی شورشیں اکثر فرقہ وارانہ فسادات کی شکل اختیار کر جاتی تھیں یا گورکشا کے علم بردار یا اسلامی اتحاد کا نعرہ لگانے والے بھی لیبر لیڈر یا کسان لیڈر کا رول ادا کرنے لگتے تھے تو کوئی انوکھی یا نادر بات نہیں تھی۔ اس موقع پر جارج ریوڈ (George Rude) کے یہ تاثرات یاد آجاتے ہیں کہ "صنعتی تنازعات کے سلسلے میں ایک نوعیت کا تشدد دوسری نوعیت بھی اختیار کر جاتا ہے، یا انگلینڈ میں طبقاتی کشمکش سے متعلق John Foster کے اس مطالعے کا ذکر کیا جا سکتا ہے کہ کبھی کبھی فرقہ جاتی شعور، طبقاتی شعور کا بھی باعث ہوتا ہے یا اس کے برعکس بھی ہوتا ہے۔

تاجر گروپ اور اعلا طبقے

اگر ہندوستان کا نیا عام طبقہ کسی بھی قسم کے جدید تصور سے عاری تھا۔ تو یہ بات ہندوستان کے نئے ابھر رہے سرمایہ دار طبقے پر کہیں زیادہ صادق آتی ہے۔ ہندوستان کی بڑی کاروباری برادریوں میں، صرف بمبئی کے پارسیوں کے بارے میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ انھوں نے خود کو بہت پہلے مغرب کے رنگ میں ڈھال لیا تھا۔ یہ دوسری بات ہے کہ اس معاملے میں تقدم کا شرف بڑے کاروباری حلقوں (Shetias) کی بجائے Elphistine کالج کے گریجویٹوں کو حاصل ہے۔ اس کے برخلاف گجرات کے وینیا (Vaniyas) اور مارواڑی سماجی اور مذہبی امور کے سلسلے میں لکیر کے فقیر ہی بنے رہے۔ کلکتہ کے مارواڑیوں میں سماجی اصلاح کی تحریک بیسویں صدی میں ہی شروع ہو سکی تھی۔ جبکہ دوسرے بنگالیوں میں اس طرح کی تحریک کا آغاز دو نسل قبل ہو چکا تھا۔ Timberg جیسے مورخوں کے خیال میں مارواڑیوں کی کاروباری کامیابی میں مشترک کنبے، اور

ذات پات کے قریبی رشتے جیسے عوامل نے بھی اہم رول ادا کیا ہوگا۔ چنانچہ خاندانی فرم کو ہی کاروباری اکائی کی حیثیت حاصل رہی۔ اس کے علاوہ مارواڑی جہاں بھی جاتے، انھیں ہاتھوں ہاتھ لیا جاتا تھا۔ یہ بات بھی اہمیت رکھتی ہے کہ انیسویں صدی میں سماجی اور مذہبی اصلاح کے سلسلے میں جو متعدد تحریکیں چلائی گئی تھیں، ان میں صرف آریہ سماج تحریک ہی کاروباری حلقوں میں بھی تھوڑی بہت رسائی حاصل کر سکی تھی۔ قومی بورژوائی ترقی اور نوآبادیاتی سیاسی و معاشی ڈھانچے کے مقاصد میں طویل مدتی تضادات کی موجودگی کے باوجود بھی ہندوستان کا کاروباری طبقہ 1920 کی دہائی تک انگریزوں کا وفادار رہا تھا اور اس کی اس وفاداری کے زبردست مقامی اسباب تھے۔

راجے مہاراجے اور زمیندار

مقامی راجوں، مہاراجوں اور زمینداروں میں کوئی تعمیری قیادت کے لیے آگے آئے گا، یہ امید اب بھی بہت کم تھی، 1857 کے بعد انگریزوں کی پالیسی ان جاگیردار قسم کے عناصر کے ساتھ اتحاد قائم کرنے کی رہی تھی۔ کیونکہ یہ لوگ آئندہ کے کسی بھی طوفان کے خلاف سد فاصل ثابت ہو سکتے تھے۔ کیونکہ تو غدر کے زمانے میں بھی اس طرح کے متعدد لوگوں کی نشان دہی کر چکا تھا۔ نئی پالیسی یہ تھی کہ پرانی باتوں کو فراموش کر دیا جائے۔ چنانچہ میسور کی عملداری پچاس سال بعد 1881 میں حکمران ہندو خاندان کو واپس کر دی گئی تھی۔ لٹن کے دور میں درباری شان شوکت، ڈفرن کے دور میں امپیریل سروس کور کی تشکیل نیز راجوں اور مہاراجوں کے لڑکوں کے لیے اجمیر کے مایو (میو) کالج میں اور اودھ کے تعلقہ داروں کے لیے لکھنؤ کے کالون کالج (Kolvin College) میں پبلک اسکول کی تعلیم کا بندوبست کیا گیا۔

انگریزی اقتدار کی بالادستی کو حسب ضرورت ریزیڈنٹوں کے ذریعے برقرار رکھا گیا۔ مگر اس اقتدار کی چھتری تلے جاگیردارانہ لوازمات اور استبدادی حکمرانی کو ملک کے ایک تہائی حصے میں پھلنے اور پھولنے بھی دیا گیا۔ کچھ دیسی ریاستوں میں برطانوی ہند کی سطح کے انتظامی اقدامات بھی کیے گئے۔ اسی طرح میسور اور بڑودہ میں سماجی اصلاح کی سرگرمیاں بھی شروع کی گئیں۔ آخرالذکر ریاست تو شادی بیاہ سے متعلق قانون سازی کے معاملے میں برطانوی ہند سے آزادی کے وقت تک آگے رہی تھی۔ ٹراونکور میں خواندہ لوگوں کی شرح میں بھاری اضافہ ہوا اور ریاست بڑودہ نے تو مختلف اوقات میں ناروجی، آر۔ سی۔ دت۔ اور اربندو گھوش جیسے لوگوں کو ملازمت دے کر قوم پرستوں کے ساتھ براہ راست طریقے پر رابطہ قائم کر رکھا تھا۔ رجواڑوں اور زمینداروں کی سرپرستی نے ہندوستان کی روایتی ثقافت کے کچھ گوشوں کے تحفظ میں اہم رول ادا کیا۔ مثال کے طور پر ہندوستان کی گراں قدر کلاسیکی موسیقی کو زندہ رکھنے میں اس سرپرستی کا بڑا ہاتھ رہا ہے۔ مگر

بیشتر رجواڑے سماجی، ثقافتی اور سیاسی دیوار بنے رہے۔ یہ وہ لوگ تھے جنھیں قوانین اور شہری حقوق کا ذرا بھی پاس نہیں ہوتا تھا۔ 1930 کی دہائی سے ریاستوں میں عوامی تحریکوں کے نتیجے میں ہی یہ الگ الگ خانوں میں تقسیم عناصر باہم متحد ہو سکے تھے۔ اس سلسلے میں انگریزوں کا یہ دعوا غلط ہے کہ انھوں نے ہی ہندوستان کو ایک اکائی کی شکل دی ہے۔ جہاں تک زمینداروں کا تعلق ہے تو کلکتہ کی برٹش انڈین ایسوسی ایشن جیسی، زمینداروں کے غلبے والی تنظیموں کو 1850 میں ہی ان مطالبات کی توقع ہو گئی تھی جو بعد میں کانگریس کی قراردادوں کی شکل میں سامنے آئے، مگر 1870 کی دہائی کے بعد متوسط طبقوں کی انجمنوں کے عروج کے نتیجے میں اس طرح کی تنظیمیں انگریزوں کے حد سے زیادہ وفادار اور بیشتر بے عمل گروہوں کی شکل میں تبدیل ہو کر رہ گئی تھیں۔

1886 کے کلکتہ اجلاس کے مندوبین کی سماجی ساخت کا تجزیہ کرتے ہوئے انڈین نیشنل کانگریس کی رپورٹ میں "پرانے حکمرانوں کی مکمل عدم موجودگی" کو نوٹ کیا گیا تھا۔ اس رپورٹ میں یہ بھی تسلیم کیا گیا تھا کہ "کاشت کار طبقوں کی نمائندگی ناکافی تھی" جبکہ چھوٹے مہاجنوں اور دکانداروں کی عدم موجودگی سب پر واضح تھی" اور یہ کہ "تقریباً 130 مندوبین زمین مالکان کے طبقوں سے تعلق رکھتے تھے۔ بہر حال ابتداء میں کانگریسی لیڈروں کے لیے جو گروپ وجہ امتیاز تھے وہ مورخین کے الفاظ میں تعلیم یافتہ متوسط طبقے، انگریزی تعلیم یافتہ اعلا طبقے، یا دانشور طبقے سے تعلق رکھتے تھے، کانگریس کے الہ آباد اجلاس (1888) کے 1200 مندوبین میں سے 455 نے خود کو وکیل بتایا تھا جبکہ 159 اساتذہ اور 73 صحافی تھے۔ اب ہمیں اس دانشور طبقے کی سماجی بنیادوں، اس کے تصورات اور اس کی سرگرمیوں کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔

متوسط طبقوں کا شعور اور سیاست

دانشور طبقے کی سماجی اساس

1880 کی دہائی تک انگریزی تعلیم یافتہ ہندوستانیوں کی تعداد پچاس ہزار کے قریب تھی جن میں میٹریکولیٹ بھی شامل تھے ویسے گریجویٹوں کی تعداد محض 5000 تھی۔ انگریزی پڑھنے والوں کی جو تعداد 1887 میں 29,8000 تھی وہ 1907 میں 505,000 تک پہونچ گئی تھی، جبکہ انگریزی اخبارات کی اشاعت 1885 میں 90,000 سے بڑھ کر 1905 میں 27,6000 ہو گئی تھی۔ (J.R. Mclane, Indian Natinalism and the Early Congress, page-4) انگریزوں کی مسلسل کوشش یہ باور کرانے کی رہتی تھی کہ اس "انتہائی چھوٹی سی اقلیت" (1901 میں خواندگی کی شرح انگریزی کیلیے ایک فی صد اور مقامی زبانوں کے لیے 6 فیصد بتائی گئی تھی) کو، یعنی اس ابھرتے ہوئے سماجی گروپ کو اپنے تناسب سے کہیں زیادہ اہمیت حاصل تھی۔ انگریزی تعلیم کی وجہ سے اس گروپ کو ملک گیر پیمانے پر رابطے قائم کرنے کی اہلیت حاصل ہو گئی تھی۔ انگریزی تعلیم یافتہ سرکاری ملازم، وکلاء، اساتذہ، صحافی، ڈاکٹر اپنے اپنے علاقوں سے باہر زیادہ بہتر طریقے پر کام کرتے تھے۔ مثال کے طور پر 1870 کی دہائی میں شمالی ہند کے بہت سے شہروں میں تعلیم یافتہ بنگالیوں کے پہلے ہی آباد ہو جانے کی نتیجے میں، سریندر ناتھ بنرجی ان شہروں کے متعدد بار سیاسی دورے کر سکے تھے اور انڈین ایسوسی ایشن، بنگال سے باہر بھی اپنی بہت ساری شاخیں قائم کر پائی تھی۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ مغربی تعلیم۔ اس وقت کے عالمی تصورات اور رجحانات کے تئیں بےداری بھی اپنے ساتھ لائی جن کے بغیر قوم پرستی کے سلسلے میں شعوری نظریات کی تشکیل اور بھی مشکل ہو گئی ہوتی۔ اس کے ساتھ ہی غیر ملکی وسیلہ تعلیم کے علاحدگی پسندانہ اور نفاق انگیز اثرات نہ صرف یہ کہ شروع سے ہی نمایاں تھے بلکہ اب بھی برقرار ہیں۔
1883-84 میں بنگال میں محض 9 فی صد طلباء کا تعلق ایسے کنبوں سے تھا جن کی ماہانہ آمدنی دو سو روپے سے بھی کم تھی اور یہ بات توقع کے خلاف بھی نہیں تھی کیونکہ کلکتہ کے ہندو کالج میں ٹیوشن فیس 1820 کی ہی دہائی میں بڑھا کر پانچ روپے ماہانہ کی جا چکی تھی۔ پھر یہ کہ واضح قسم کی علاقائی ناہمواریوں کی وجہ سے بھی ایک مسئلہ پیدا ہو گیا تھا اور وہ یہ کہ اس کے نتیجے میں صوبائی کشیدگیاں پیدا ہو گئی تھیں۔ کیونکہ انگریزی تعلیم کو اچھی ملازمت کے واحد وسیلے کی حیثیت حاصل ہو چکی تھی۔ 87-1886 کی پولس سروس کمیشن رپورٹ میں دیسی تعلیم یافتگاں کی تعداد مدراس میں 18390، بنگال میں 16639 اور بمبئی میں 7196 بتائی گئی تھی جب کہ یوپی میں یہ تعداد محض

3200 ، پنجاب میں 1944، سی پی میں 608 اور آسام میں 274 تھی۔ Anil Seal اور John Broomfield کی ابتدائی تحقیق کے مطابق انگریزی تعلیم یافتہ طبقہ کو چیدہ طبقہ تصور کرنے کا ایک فیشن سا ہو گیا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ یہ لوگ اعلا ذاتوں سے تعلق رکھتے تھے۔ یہ یقیناً ایک صحیح بات ہے کہ روایتی قسم کی اونچی ذاتوں کے لوگ نسبتاً زیادہ آسانی سے نئی تعلیم کی طرف راغب ہو جاتے تھے۔ چنانچہ 84-1883 میں ہندو کالج کے 84.7 فی صد طلباء براہمن، کائستھ اور ویدیہ جیسی بھدر لوک ذاتوں سے تعلق رکھتے تھے۔ مدراس، بمبئی اور پونا میں براہمن طلباء کی غالب اکثریت تھی اور یوپی میں کائستھ طلباء کا غلبہ تھا۔ مگر اب اس انداز فکر کی افادیت کے بارے میں سوالیہ نشان قائم کیا جانے لگا ہے۔ جیسا کہ Seal نے بھی 1973 میں خود انتقادی کے لمحات میں یہ اعتراف کیا ہے کہ "راج کی بدیہی حقیقت مورخین کے لیے عقیدہ کی حیثیت اختیار کر گئی تھی"۔ یعنی سرکاری زمرہ بندی کو کسی چھان پھٹک کے بغیر ہی تسلیم کر لیا گیا تھا۔ تمام بنگالی براہمنوں کو بھدر لوک (مثلاً براہمن رسوئیا، یا خاندانی پروہت) تسلیم نہیں کیا گیا تھا جب کہ 1864 میں بمبئی شہر میں چت پون اور سارسوت براہمن کے "غالب طبقے" میں دس ہزار فقراء اور 1880 گھریلو نوکر بھی شامل تھے۔
اس سلسلے میں چیدہ (Elite) کی اصطلاح کا استعمال کافی مبہم معلوم ہوتا ہے کیونکہ نوآبادیاتی ہندوستان میں صحیح معنوں میں صرف گورے ہی چیدہ کے زمرے میں آتے تھے۔ انگریزی تعلیم یافتہ طبقے کی ساری آئیڈیالوجی اپنی مراعات کے تحفظ تک ہی محدود تھی، یہ مراعات خواہ ذات کی بنیاد پر حاصل ہوئی ہوں یا تعلیم کی بنیاد پر، بہر حال اس چیدہ طبقے میں کچھ ایسے بھی تھے جنھوں نے سماجی اصلاح کی تحریکوں میں کافی ایثار بھی کیا۔ اونچی ذات والوں کی مراعات ہی ان تحریکوں کا نشانہ ہوتی تھیں۔
ان میں سے کچھ نے نجی اسکولوں اور کالجوں کے ذریعے تعلیم کو فروغ دینے کے سلسلے میں اپنا سب کچھ قربان کر دیا۔ Hunter کمیشن کی سفارشات (1882) کے تحت اعلا تعلیم کے لیے سرکاری امداد میں بھاری تخفیف کے بعد، ہندوستان میں تعلیم پھیلانے کا بہترین طریقہ یہی ہو سکتا تھا۔ 82-1881 اور 02-1901 کی درمیانی مدت میں غیر امداد یافتہ پرائیویٹ کالجوں کی تعداد 11 سے بڑھ کر 73 ہو گئی تھی۔ اس سلسلے میں یہ ذہن نشیں رہنا چاہیے کہ پرائمری تعلیم کو لازمی (اور دس روپے ماہانہ سے کم آمدنی والے کنبوں کے لیے مفت) قرار دینے کے لیے پہلا بل 1991 میں امپیریل کاؤنسل میں گوکھلے نے ہی پیش کیا تھا، جسے سرکاری اکثریت نے مسترد کر دیا تھا۔ بمبئی کے گورنر نے وائسرائے کے نام اپنے ایک نجی مراسلے میں اس کی اصل اور قوم پرستانہ وجہ کی طرف اشارہ کیا تھا۔ گورنر نے وائسرائے کو لکھا تھا کہ کاشت کار کے خواندہ ہو جانے کی صورت میں بے چینی پھیلانے کی قوت میں بے پناہ اضافہ ہو جائے گا۔ (B.R.Nanda Gokhle- page 392)۔
روشن خیال اور دانش ور طبقے کا نتیجہ خیز تجزیہ بہتر طریقے پر کرنے کے لیے اس طبقے کے

تصورات اور سماجی و معاشی اساس کا ایک ساتھ جائزہ لینا ضروری ہے۔ اس زمانے میں مغرب میں رونما ہونے والی تبدیلیوں سے واقفیت کے نتیجے میں پیدا ہونے والے بورژوائی تصورات اور ملک میں موجود غیر مستحکم بورژوائی اساس کے درمیان فرق کھل کر سامنے آجاتا ہے۔ یہ فرق بنگال میں سب سے نمایاں تھا۔ بنگال میں انیسویں صدی کے روشن خیال طبقے نے کوشش کر کے خود کو زمیندار طبقے سے نیچے اور جوت دار طبقے سے اوپر متوسط طبقہ (Madhyabitta Sreni) قرار دیدیا تھا۔ اس طبقے نے خود کو یورپ کے متوسط طبقے کے خطوط پر ڈھالنے کی کوشش کی۔ اس طبقے کو مغربی تعلیم کے ذریعے یہ علم ہو چکا تھا کہ یورپ کا متوسط طبقہ نشاۃ ثانیہ، اصلاحات، روشن خیالی اور جمہوری انقلاب جیسی تحریکوں کے ذریعے زبردست تبدیلیاں لایا تھا۔ تاہم اس ہندوستانی طبقے کی اساس صنعت یا تجارت (جن پر کہ سارا کنٹرول انگریزوں کی انتظامی فرموں یا ان کے مارواڑی ماتحتوں کا تھا) کی بجائے، قانون (وکالت)، تعلیم، طب اور صحافت پر قائم تھی۔ اس طبقے کا تھوڑا بہت تعلق ذیلی لگان داری سے بھی تھا جو کہ دوامی بندوبست والے بنگال میں کافی منافع بخش ثابت ہو رہی تھی۔ امرت بازار پتریکا نے 9 دسمبر 1869 کو اس دورخی صورت حال (Dualism) کی عکاسی اس طرح کی تھی۔ "متوسط طبقے (Madhyabitta) والے ہر سماج میں انتہائی سود مند ثابت ہوئے ہیں۔ ہمارے ملک میں بھی بہبود کا سارا دارو مدار اسی طبقے پر ہے۔ اگر اس ملک میں کبھی کوئی سماجی یا کوئی دوسرا انقلاب برپا ہوا تو وہ اسی طبقے کے ذریعے لایا جائیگا۔ آج ہمارے ملک میں جو بھی رفاہی ادارے یا رفاہی سرگرمیاں دیکھنے میں آتی ہیں ان کی بنیاد اسی طبقے نے رکھی ہے۔ متوسط طبقے کے لوگوں کی روزی کا بندوبست زمینی جائیداد یا خدمات کے ذریعے ہوتا ہے۔ متوسط طبقے کے لوگ اکثر گنٹی دار (Gantidars) ہوتے ہیں" (ذیلی لگان داری کی ایک مشکل جو کہ جے سور اور نادیا اضلاع میں بہت عام تھی اور جس کی آمدنی سے امرت بازار م پتریکا بھی شائع ہو رہا تھا)۔

یہاں یہ اضافہ ضروری ہے کہ کاروبار اور تجارت سے بنگال کے روشن خیال طبقے کی کنارہ کشی کی وجہ تجارت سے 'بھدر لوک' کی بےزاری نہیں تھی، کیونکہ اس متوسط طبقے کے اخبار و جرائد نے انیسویں صدی کے پورے عرصے میں اپنے قاریوں کو آزاد صنعت اور تجارت کی طرف راغب کرنے کی کوشش میں کوئی کسر باقی نہیں رکھی تھی۔ نیم جاگیردارانہ زمینی نظام کے ساتھ رابطہ بورژوائی آرزومندیوں کی راہ میں رکاوٹ نہیں بنا بلکہ یہ بات بطور خاص نوٹ کی جانی چاہیے کہ اس رابطے نے زرعی امور کے سلسلے میں انقلابی سوچ اور اقدام کے لیے بندش کا کام کیا۔

اس طرح کی وضعوں (Patterns) کا مشاہدہ دوسرے صوبوں میں بھی کیا جاسکتا ہے جس میں کافی علاقائی انحرافات بھی ملتے ہیں۔ چنانچہ سنتھر النگم (Suntharlingam) کے مطابق مدراس میں کاروباری چیدہ طبقہ کافی پہلے نمایاں حیثیت حاصل کر چکا تھا، جہاں لکشمن اراسو چیتی

(L..kshaman Arasu Chetti) جیسے سوداگر، جنھیں 1850 کی دہائی کی مدراس نیٹو ایسوسی ایشن میں کافی اہمیت حاصل تھی، اعلیٰ اور پیشہ ور چیدہ طبقوں کو بھی جگہ دینے لگے تھے۔ بہر حال سنتھر الکم اس کے اسباب کی کوئی زنان دہی نہیں کر سکا۔ مغربی تعلیم یافتہ گروپ ایک بار پھر چھوٹی چھوٹی زمینداریوں سے جڑ گئے تھے۔ حالانکہ حال ہی میں Washbrook نے 1850 کی دہائی کی مدراس مہاجن سبھا اور اس سبھا کے ذریعے چلائی جانے والی کانگریس کے سلسلے میں مدراس شہر کے چیتی (Chettis)، یا آندھرا ڈیلٹا کے Komati سوداگروں جیسے خوش حال کاروباری گروپوں اور زمینداروں کے پس پردہ رول پر زور دیا ہے۔

مہاراشٹر میں پونا کا روشن خیال طبقہ جس کا تعلق ایک ایسے شہر سے تھا جسے کسی طرح کی صنعتی یا کاروباری حیثیت حاصل نہیں تھی، کاروبار سے بہت کم بلکہ محض "سودیشی" کی حد تک ہی جڑا ہوا تھا۔

تلک کے اخبار Maharatta نے پونا میں ایک سالانہ صنعتی کانفرنس شروع کرنے کی تحریک پر 6 دسمبر 1891 کو بہت دلچسپ انداز میں تبصرہ کیا تھا۔ اخبار نے لکھا تھا کہ "ہمیں اس بات کا بے جھجک اعتراف ہے کہ پونا کسی بھی طرح کا تجارتی یا اشیاء ساز مرکز نہیں ہے۔ یہ شہر بھی مالامال ہے مگر سیاسی روایات کے لحاظ سے، بمبئی تو پونا سے بھی زیادہ مال دار شہر ہے مگر ہماری بمبئی کے کاروباری لوگوں کی ساری توجہ اور سارا وقت ان کی اپنی ہی تگ و دو میں صرف ہوتا ہے اور اس طرح تجارت کے احیاء کے لیے اسکیمیں دوسرے ہی لوگوں کو تیار کرنی ہوں گی"۔ چھوٹی چھوٹی لگان داری (کھوتی حقوق) کی شکل میں زمین کے ساتھ تعلق ضلع رتناگیری میں بطور خاص اب بھی موجود تھا، جہاں کہ مہاراشٹر کے کئی بڑے روشن خیال اور دانش ور لیڈر پیدا ہوئے (تلک اور گوکھلے، دونوں ہی رتناگیری ضلع کے ان کنبوں سے تعلق رکھتے تھے، جنھیں کھوتی حقوق حاصل تھے)۔ بنگال کی طرح ہی یہاں بھی آئیڈیالوجی کی تشکیل میں سماجی اساس کا کوئی دخل نہیں رہا تھا، اتنا ضرور ہے کہ آئیڈیالوجی کے تعین اور اس کی حد بندی میں سماجی اساس کا بھی رول رہا تھا۔ کسانوں کی زمینیں مہاجنوں کو منتقل کر دینے کے سلسلے میں 1861 میں حکومت بمبئی کی کوشش کی تلک اور گوکھلے نے سخت مخالفت کی تھی بلکہ سیاسی انتہاپسندی کے اس سرچشمے نے یہاں تک کہہ دیا تھا کہ "جس طرح حکومت، مہاجن سے اس کی دولت چھین کر غریبوں میں تقسیم کر دینے کا اختیار نہیں رکھتی، اسی طرح حکومت کو یہ اختیار بھی نہیں ہے کہ وہ کسی کھوٹ کو اس کی خاندانی اور موروثی آمدنی سے محروم کر کے رقم کسانوں میں تقسیم کر دے۔ یہ انسانیت کا نہیں، حقوق کا سوال ہے" (حوالہ: بھاگوت اور پردھان۔ لوک مانیہ ص 134)۔

بمبئی میں بورژوائی روابط فطری طور پر بہت نمایاں تھے۔ اگرچہ شیتیا (Shetia) سوداگروں،

رجواڑوں، اور بمبئی کے نو عمر دانشوروں کے درمیان تعلقات زیادہ تر غیر یقینی نوعیت کے تھے جو بسا اوقات ایک دوسرے کے ساتھ مخالفت کی حدوں کو بھی پہونچ جاتے تھے۔ بہر حال 1880 اور 1890 کی دہائیوں کی بمبئی کی نئی روشن خیال قیادت (جس میں تین وکلاء، فیروز شاہ مہتہ، کے۔ ٹی تلنگ، اور بدرالدین طیب سر فہرست تھے) اور مل مالکان کے درمیان دیرپا تعلقات کا سلسلہ لنکا شائر کی کپاس پر آب کاری محصول کے خاتمے اور ہندوستانی بر آمدات پر تلافی محصول کے نفاذ کے خلاف احتجاج سے شروع ہوا۔ یہ تعلقات دین شا واچا کی پوری زندگی سے عبارت تھے۔ وہ بمبئی میں پارسیوں کے سب سے بڑے متوسل، بمبئی پریزیڈنسی ایسوسی ایشن کے سکریٹری (1885-1915)، کانگریس کے جنرل سکریٹری (1886-1913)، بمبئی مل اونرس ایسوسی ایشن کی مجلس عاملہ کے 38 سال تک ممبر، نیز متعدد کپڑا ملوں کے مینیجنگ ایجنٹ رہے تھے۔ تاہم نار وجی کے نام واچا کے خطوط بمبئی کے تاجروں کی از حد کفایت شعاری (بلکہ کنجوسی) کی شکایتوں سے بھرے ہوئے ہیں۔ مثال کے طور پر 1889 میں کانگریس کے لیے جے۔ این۔ ٹاٹا سے پانچ سو روپے وصول کرنا ایک کار دارد ثابت ہوا تھا۔ ہندوستانی سرمایہ داروں نے قوم پرستوں کے لیے اپنے بٹوے کا منھ کھول دینے کا سلسلہ، پوری ایک نسل بعد یعنی، پہلی عالمی جنگ کے خاتمے پر اور گاندھی جی کے عروج کے زمانے میں شروع کیا تھا۔

جہاں تک شمالی ہند کا تعلق ہے، الہ آباد کے سلسلے میں Bayly کے تجزیے سے ایک بار پھر پیشہ ور گروہوں اور زمینداروں کے درمیان تعلق کا پتہ چلتا ہے۔ Bayly نے مدن موہن مالویہ نیز تاجر اور بنک کار کھتری اور اگروال کنبوں (جو کہ خود بھی اکثر زمیندار ہی ہوتے تھے اور Bayly کے مطابق الہ آباد کے 29 میں سے 12 بڑے تاجر کنبے زمیندار ہی تھے) کے درمیان روابط پر بطور خاص زور دیا ہے۔ یہ روابط بنیادی طور پر آریہ سماجیوں اور ہندوؤں کی احیاء پسندانہ ثقافتی اور مذہبی سر گرمیوں کے نتیجے میں قائم ہوئے تھے۔

انیسویں صدی کے ربع آخر کے دوران روشن خیال طبقے کے انداز فکر اور طرز عمل کے بارے میں دو باتیں عام طور پر کہی جاتی ہیں۔ یہ کہا جاتا ہے کہ سماجی اور مذہبی اصلاح کی تحریکیں جو کہ 1870 کی دہائی کے آتے آتے کافی نمایاں شکل اختیار کر چکی تھی، احیاء پسندی کے سیلاب میں دریا برد ہو گئی تھیں اور آخر الذکر تو قوم پرستی کے فروغ کے ساتھ ہی دم توڑ گئی تھی۔ عمومیت پسندی کے ساتھ کہی جانے والی دوسری بہت سے باتوں کی طرح ہی ان دونوں باتوں کی جانچ پرکھ بھی ضروری ہے۔

ہندو اصلاح اور احیاء پسندی

بنگال میں اصلاحی تحریکوں کے کم زور پڑ جانے کا اشارہ 1870 کی دہائی کے فوراً بعد ہی ملنا شروع ہو گیا تھا، کیونکہ براہمو سماج کے لوگ آپسی انتشار کا شکار ہو کر اپنا اثر کھو چکے تھے اور ایشور چندر ودیا ساگر نے گوشہ نشینہ اختیار کر لی تھی۔ مغربی ہندوستان میں، جہاں کے دانش ور اور روشن خیال طبقے پر ایم۔ جی راناڈے کا مکمل اثر 1901 میں ان کی وفات تک قائم رہا تھا، یہ وضع کسی بھی طرح اتنی غیر مبہم نہیں تھی۔ رانا ڈے نے اپنے دوست کے ٹی۔ تلنگ (جو کہ پراتھنا سماج اور اصلاح پسند ہونے کے علاوہ، ابتدائی کانگریس کے ستون بھی رہے تھے) کے ساتھ مل کر "کم سے کم مزاحمت کے خطوط" پر ایک محتاط پالیسی اختیار کی، یعنی ایک ایسی احتیاط پسندی جس پر 1890 کے اواخر میں آر۔ جی بھنڈارکر، اور این۔ سی چندرا ورکر جیسے لوگوں نے سخت نکتہ چینی کی تھی۔ جنوب میں بھی ایک اصلاح پسند گروپ پیدا ہو چکا تھا، جہاں تلگو علاقے کے Virasa Lingam نے 1898 میں راجہ مندری سوشل ریفارم ایسوسی ایشن قائم کی تھی جس کا سب سے بڑا مقصد بیوہ خواتین کی دوبارہ شادی کو فروغ دینا تھا۔ اس کے علاوہ کے۔ این۔ نٹ راجن نے 1890 میں انڈین سوشل ریفارمر، کا آغاز کیا تھا جو بہت موثر ثابت ہوا تھا۔ ینگ مدراس پارٹی نے بھی 1812 میں "ہندو سوشل ریفارم ایسوسی ایشن قائم کی تھی۔ ایک کل ہند قسم کی سماجی اصلاح تحریک رانا ڈے نے 1887 سے ایک سالانہ نیشنل سوشل کانفرنس کے انعقاد سے شروع کی تھی جس کے جلسے کانگریس کے ہی پنڈال میں ہوتے تھے۔ 1895 میں تلک نے پونا میں اسے کانگریس کے پنڈال سے باہر کر دیا تھا۔ کم سنی کی شادی پر پابندی اور جبریہ بیوگی کے موضوع پر 1884 میں بہرام جی مالاباری کے مضامین سے ملک گیر سطح پر دانش ور حلقوں میں ایک بحث شروع ہو گئی تھی اور اُن کی مسلسل مہم (جس کا رُخ برطانیہ کی رائے عامہ اور برطانوی افسروں کی طرف اتنا نہیں تھا جتنا کہ ہندوستانیوں کو ہم خیال بنانے کی طرف تھا) نے حکومت کو 1891 میں سن بلوغ ایکٹ پاس کرنے پر مجبور کر دیا تھا؛ یہ بیوہ عورتوں کی دوبارہ شادی کو قانونی حیثیت دینے سے متعلق 1886 کے ایکٹ کے بعد سماجی اصلاح کا سب سے بڑا قانونی اقدام تھا۔

سن بلوغ کے سلسلے میں طوفان جتنی شدت سے اٹھا تھا اتنی ہی جلد دب بھی گیا۔ مگر اس سے تعلیم یافتہ طبقے کی رائے میں 1860 سے پیدا ہونے والی تبدیلی کا بھی اندازہ ہو گیا تھا۔ دس سال سے کم عمر کی بچی کے ساتھ مباشرت کو 1860 میں زنا بالجبر قرار دیا گیا تھا اور اس پر کسی طرف سے احتجاج بھی نہیں ہوا تھا۔ اس عمر کو دس سال سے بڑھا کر بارہ سال کر دینے کا اصلاحی قدم بھی مالا باری کی ان تجاویز میں شامل تھا جو کہ کم سنی کی شادی کی روک تھام کی غرض سے حکومت کو پیش کی

گئی تھیں۔ بہر حال اس چھوٹے سے اصلاحی قدم کی ملک بھر میں اور خاص طور پر مہاراشٹر اور بنگال میں سخت مخالفت ہوئی۔ اس سلسلے میں قدامت پرستوں اور اصلاح کے مخالفوں کے جذبات، خاص طور پر تلک کی اس دلیل کے ساتھ خلط ملط ہو گئے تھے کہ غیر ملکی حکمرانوں کو ہندوستانیوں کے مذہبی اور سماجی طور طریقوں میں دخل اندازی کا کوئی حق نہیں ہے۔ یہ دلیل بہ ظاہر کسی حد تک صحیح بھی تھی کیونکہ اسی زمانے میں ہندوؤں کے قدامت پسند حلقے گاؤکشی کے خلاف قانون بنانے کا مطالبہ کرنے میں پیش پیش رہتے تھے۔ اگر اس طرح کا کوئی قانون بنایا گیا ہوتا تو وہ بھی ہندوستانی سماج کے ایک بہت بڑے حصے، یعنی مسلمانوں کے مذہبی اور سماجی طور طریقوں میں دخل اندازی ہوتی۔ بنگال کی تحریک والوں کو جن کی اگوائی بنگ باسی اخبار (جس کی اشاعت برہمو سماج کے اخبار سانجی بانی کی 9000 کی اشاعت کے مقابلے میں 20,000 تھی اور جس کے خلاف غداری کا مقدمہ بھی شروع کیا گیا تھا) کر رہا تھا، سودیشی موڈ اور سودیشی طریقہ کار کا پہلے ہی سے اندازہ ہو گیا تھا۔ چنانچہ کلکتہ میدان میں بڑے بڑے جلسے ہوتے تھے، کالی گھاٹ پر بڑے پیمانے پر پوجا ہوتی تھی، بائیکاٹ کا نعرہ دیا جاتا تھا اور دیسی کاروبار شروع کرنے کی کوشش بھی کی جاتی تھی۔

بنگال میں 1870 کی دہائی سے روشن خیال حلقے کے موڈ میں مختلف اسباب کے تحت تبدیلی آ رہی تھی۔ ہندو روایات کے تحفظ کو زیادہ احترام حاصل ہوتا گیا تھا۔ کیونکہ میکس مولر جیسے عالموں نے قدیم آریاؤں کے عہد زریں کی بازیافت کی تھی اور مغربی ملکوں میں "بدیسی مشرق" کا ایک روحانیت پرست فرقہ پیدا ہو چکا تھا جس کا ایک عجیب اور مبہم قسم کا نتیجہ Olcott اور Balavatsky کی تھیوسوفی (Theosophical) تحریک کی شکل میں سامنے آیا۔ 1880 اور 1890 کی دہائیوں میں جوگندر چندر گھوش کی قیادت میں ایک چھوٹے مگر بااثر گروپ نے اگست کومت (Comte) کے فلسفہ ثبوتیت (Positivism) سے کام لیتے ہوئے اس روشن خیال طبقے کے لیے درمیان کی راہ نکالنے کی کوشش کی جو اپنے روایتی عقائد سے تو ہاتھ دھو بیٹھا تھا مگر سماجی ڈھانچے کو جوں کا توں رکھنا چاہتا تھا۔ جدید ترین اور دانش ورانہ احیاء پسندی کا مشاہدہ 1880 کی دہائی کے بنکم چندرا کے یہاں ہوتا ہے جنھوں نے دیگر مذاہب کی اچھی باتوں کو اخذ کرنے کی بجائے شری کرشن کی از سر نو تاویل ایک آئیڈیل انسان، ایک ثقافتی ہیرو اور ایک معمار قوم کے طور پر کی تھی۔ دوسری طرف سسادھر تارک چوڑامنی (Sasadhar tarak Chudamni) اور کرشن پرسنا سین نے احیاء پسندی کی تاویل غیر عالمانہ سطح پر کی۔ ان لوگوں کا یہ کہنا تھا کہ مغرب میں جو بھی نئی سائنسی دریافتیں ہوئی ہیں وہ ہندوستانی شاستروں میں پہلے ہی سے موجود ہیں۔ یہ احیاء پسندی اس وقت بہت زیادہ موثر ثابت ہوئی جب اسے تعقل کی بجائے جذباتیت کے حربے کے طور پر استعمال کیا گیا۔ اس کے لیے امرت بازار پتریکا نے وشنومت کی تاویل نو کا راستہ اپنایا اور

تحریک حاصل کرنے کے لیے مہابھارت کے سری کرشن کی بجائے چیتیہ کا انتخاب کیا جب کہ بنکم چندرا نے بڑی کوشش کی تاویل ایک مثالی انسان کے طور پر کی تھی۔ امرت بازار پتریکا نے اس سلسلے میں رام کرشن پرم ہنس سے بھی خوب استفادہ کیا جنھوں نے اپنی معصوم سادگی اور دیگر مذاہب کی اچھی باتوں کے انتخاب کے ذریعے کلکتہ کے جدید روشن خیال طبقے کو کافی متاثر کر دیا تھا۔ 1890 کی دہائی میں ان کے شاگرد دیویکانند شکاگو کی مذہبی کانگریس سے خطاب کرنے کے بعد بام شہرت پر پہونچ گئے تھے۔ دیویکانند نے نہ تو جدید سائنسی دریافتوں کے رشتے شاستروں کے ساتھ قائم کرنے کی کوشش کی اور نہ ہی وہ اس طرح کے احیاء پسند تھے جیسا کہ اس زمانے میں سمجھا جاتا تھا۔ مگر چونکہ سماجی اصلاح کی نوعیت ان کے نزدیک اعلا طبقاتی (Elitist) تھی اور مغربی ماڈلوں کی بنیاد پر شروع کی گئی تھی اس لے انھوں نے اسے غلط قرار دیا (جو بلاشبہ ایک منصفانہ رائے تھی) جس کے نتیجے میں سماجی اصلاح کا عمل مزید کمزور ہو گیا۔ سوامی دیویکانند نے سماجی اصلاح کا عمل سماجی خدمت کے آئیڈیل کی بنیاد پر استوار کیا۔ ان کے ذریعے 1897 میں قائم کیا گیا رام کرشن مشن ایک ایسی فعال تنظیم ثابت ہوا جس نے سماجی انتہا پسندی کے سلسلے میں کبھی کوئی دعوا نہیں کیا مگر شاندار آریائی روایات اور ہندو ازم کے سلسلے میں (اور خاص طور پر اپنے مغربی سامعین کے سامنے) ان کے جذبات بہت شدید ہوتے تھے اور موجودہ نسل پر جم کر حملے کرتے تھے۔ وہ کہا کرتے تھے "ہمارا دھرم رسوئی تک محدود ہے۔ اور ہم نے کھانا پکانے کے برتن کو ہی اپنا بھگوان سمجھ لیا ہے"۔ سن بلوغ کے سلسلے میں پیدا ہونے والے طوفان کے بارے میں نجی طور پر ان کا یہ کہنا تھا کہ "گویا کہ کسی لڑکی کو بارہ یا تیرہ سال کی عمر میں ماں بنا دینا دھرم میں شامل ہے"۔ گو ہماری ماتا ہے، کا نعرہ لگانے والوں کے بارے میں دیویکانند نے جو یہ کہا تھا کہ "جیسی ماتا ویسا ہی بیٹا"۔ اس کا ذکر بھی مناسب معلوم ہوتا ہے۔ انھوں نے اپنی مدد آپ، اور انسانی قوت کی تعمیر پر زور دیتے ہوئے ایک ایسے مذہب کی تبلیغ کی جو گوشت پوست کی اس دنیا سے تعلق رکھتا ہو۔ ان کا کہنا تھا "اس وقت ہمارے ملک کو آہنی ارادوں اور فولادی اعصاب کی ضرورت ہے" انھوں نے مفلوک الحال اور مظلوم عوام (دردر نارائن) شودروں اور اچھوتوں کی حالت زار کے بارے میں تشویش ظاہر کی اور کسی وقت ہندوستانی سماج میں ان گروپوں کی بالادستی کی پیش گوئی بھی کی۔ سوشلزم انارکیت اور تنکیری فلسفے (Nihillism) اور اسی طرح کے دوسرے تصورات کو آنے والے انقلاب کا نقیب بتایا۔ ان کی یہ اپیل بہت مشہور ہے کہ "یہ مت بھولئے کہ نچلی ذاتوں کے لوگ ناخواندہ، جاہل اور نادار لوگ، موچی، بھنگی، بھی آپ ہی کے جسم کا ایک حصہ ہیں، آپ ہی کے بھائی بند ہیں" مگر اس طرح کی ساری باتیں غیر واضح ہونے کے علاوہ کسی طرح کے سماجی اور معاشی پروگراموں، عوام کے ساتھ رابطہ قائم کرنے کے طریق کار بلکہ سیاسی نصب العین سے بھی عاری تھیں۔ تاہم دیویکا

تند کی ساری خوبی وسیع المشربی (Eclectism) میں مضمر تھی۔ انھوں نے وطن پرستی کو انسانی خصوصیات اور غیر مبہم نعرے بازی کے ساتھ خلط ملط کرنے اور ہندوؤں کی عظمت رفتہ کو یاد دلانے کی جو کوشش کی وہ بعد میں سودیشی تحریک کے زمانے میں بطور خاص نوجوان طبقے کے لیے ایک نشہ ثابت ہوئی۔

مہاراشٹر میں احیاء پسندی کا مرکز پونا تھا۔ یہاں احیاء پسندی بنگال کے مقابلے میں کسی قدر براہمنی نوعیت کی تھی۔ ابتداء میں یہ احیاء پسندی روایتی قسم کے ارباب علم پر مشتمل شاستریوں کی زوال پذیر حالت سے جڑی رہی تھی۔ انگریزوں کی حکمرانی کے زمانے میں ان شاستریوں کے وظائف (دکشنا) کا سلسلہ ختم ہوتا چلا گیا تھا۔ ہندوؤں، براہمنوں اور مراٹھوں کی عظمتِ رفتہ کی قصیدہ خوانی کو انگریزی تعلیم یافتہ طبقے کی تائید حاصل ہونے لگی تھی۔ اس سلسلے میں وشنو کرشن چپلنکر (Chiplunkar) کے مضامین بندھ مالا (81-1874) بہت اثر انگیز ثابت ہوئے تھے۔ سن بلوغ بل کی مخالفت کے سلسلے میں 1890 کی دہائی میں پونا کے احیاء پسندوں کے ساتھ تلک کے اتحاد، گن پتی اتسو اور 1895 میں راناڈے کو کانگریس کے پنڈال سوشل کانفرنس منعقد کرنے کی اجازت نہ دینے جیسی باتوں کو، پہلے سے موجود ایک حقیقت کے سیاسی استعمال کا نام دیا جا سکتا ہے۔ کیونکہ بذات خود تلک کو مشکل سے ہی تحقیق مخالف (Obscurantist) کہا جا سکتا ہے بلکہ 1890 میں تو انہوں نے راناڈے کے ساتھ مل کر ایک ایسا گشتی مراسلہ بھی تحریر کیا تھا جس میں عورتوں کی تعلیم اور شادی کی عمر میں اضافے کی وکالت کی گئی تھی، جنوبی ہند میں جہاں کہ احیاء اور اصلاح کی تحریکیں نسبتاً کمزور رہی تھیں 1882 میں اڈیار میں قائم کی گئی تھیوسوفیکل سوسائیٹی نے بطور خاص 1893 میں اینی بیسنٹ کی آمد کے بعد انگریزی تعلیم یافتہ طبقے کو قابل لحاظ حد تک متاثر کیا تھا۔ 1890 کی دہائی میں اینی بیسنٹ نے سماجی اصلاحات کو بار بار نشانہ بنایا اور روایتی ہندوازم کی خصوصیت کو بڑھا چڑھا کر پیش کیا۔ یہ دوسری بات ہے کہ بعد میں دوسری کئی باتوں کی طرح ہی اس سلسلے میں بھی ان کے انداز فکر میں ڈرامائی طریقے پر تبدیلی آگئی تھی۔

وہ اصلاحی تحریک جو کہ 1880 اور 1890 کی دہائیوں میں نمایاں طریقے پر پھیل رہی تھی، آریہ سماج تحریک تھی جس کی بنیاد کاٹھیاواڑ کے جہاں گرد سنیاسی دیانند سرسوتی (83-1824) نے رکھی تھی مگر اسے اصل فروغ شمالی ہند (پنجاب نیز اتر پردیش کے بیشتر حصوں) میں حاصل ہوا۔ دیانند کے پیغام کی کامیابی کی وجہ دراصل اس کے ابہام میں مضمر تھی کیونکہ ایک طرف تو بہت سے موجودہ ہندو طور طریقوں (بت پرستی، کثرت پرستی، کم سنی کی شادی، بیوہ عورتوں کی شادی پر پابندی، غیر ملکی سفر، براہمنوں کے غلبے اور محض پیدائش پر مبنی ذات پات کی تفریق) پر کڑی نکتہ چینی کی جا رہی تھی اور دوسری طرف دیگر مذاہب خصوصاً مسیحیت، اسلام یا سکھ ازم پر ہندوازم کی برتری

اور ویدک قطعیت پر مبنی ہندو ازم کے تقدیس پر جارحانہ انداز میں زور دیا جارہا تھا۔ اس طرح سماجی اصلاح کے متعینہ مقاصد اس وقت کی ہندو احیاء پسندی کے طوفان میں غتربود ہو گئے۔ آریہ سماج، شمالی ہند کے تعلیم یافتہ اصلاح پسند نوجوانوں کی وفاداریاں حاصل کرنے کے سلسلے میں برہمو سماج کو بہت جلد بہت پیچھے چھوڑ گیا۔ دراصل آریہ سماج نے براہمو سماج کے مقابلے میں ایک ایسا محفوظ اور نسبتاً غیر متنازعہ فلسفہ پیش کیا جو کہ اس مہاجر اور ناپسندیدہ بنگالی برادری سے نہیں جڑا ہوا تھا۔ جس نے انگریزی تعلیم کے معاملے میں سبقت کی وجہ سے انتظامی اور پیشہ جاتی ملازمتوں کے ایک بہت بڑے حصے پر قبضہ جمالیا تھا۔ آریہ سماج نے بیوپاری طبقوں میں بھی اپنا اچھا اثر قائم کیا۔ پنجاب کے شروع کے بڑے رہنما، گرودت، لالہ ہنس راج، لالہ لاجپت رائے اور لالہ منشی رام (سوامی شردھانند) کا تعلق کھتری، اروڑا یا اگروال کنبوں سے تھا۔ **Kenneth Jones** کے مطابق پنجاب میں آریہ سماج کے چار بڑے مرکز (پشاور۔ راولپنڈی، ملتان، روہتک، حصار اور جالندھر دو آبہ) ہونے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اسے مقامی تاجر طبقے کی حمایت اور مدد حاصل تھی۔ آریہ سماج نے 1900 سے روہتا، اوڑھ (Odh) میگھ اور جٹ جیسی نچلی ذاتوں کے لوگوں کی بڑے پیمانے پر شدھی (تبدیلی مذہب) کا بھی سلسلہ شروع کر دیا تھا۔ اس طرح آریہ سماج سنسکرت پانے کا ایک وسیلہ بن گیا تھا۔ اس کے ممبروں کی تعداد میں دن دونا اضافہ ہوتا گیا۔ 1891 میں اس کے ممبروں کی جو تعداد 40,000 اور 1901 میں 92,000 تھی وہ 1921 میں 5.00.000 سے بھی تجاوز کر گئی تھی (اس کے مقابلے میں براہمو سماج کے ممبروں کی تعداد کبھی بھی چند ہزار سے آگے نہیں بڑھ سکی تھی)۔

1883 میں گوشت خوری اور سبزی خوری نیز سنسکرت پر مبنی تعلیم اور انگریزی تعلیم جیسے دو متنازعہ امور کو لے کر آریہ سماج تقسیم ہو گیا۔ اعتدال پسند مکتب فکر نے جس کی قیادت ہنس راج اور لالہ لاجپت رائے کر رہے تھے، اپنی ساری کوششیں اینگلو ویدک کالجوں کے قیام پر مرکوز کر دی۔ اس کے ساتھ ہی وقتاً فوقتاً کانگریس کی پالیسیوں اور سودیشی کاروبار میں بھی دلچسپی کا مظاہرہ کیا۔ گروکل طریقۂ تعلیم پر زور دینے والے اصلاح پسند اور سنسکرت پسند گروپ نے جس کی بنیاد لیکھ رام اور منشی رام نے رکھی تھی، 1902 میں ہردوار گروکل قائم کیا (جو کہ ڈی اے وی کے برخلاف سرکاری تعلیمی نظام سے منسلک نیز برہم چریہ (تجرد) اور ویدک طرز تربیت پر مبنی تھا)۔ یہ لوگ تنخواہ دار پرچارکوں (مبلغوں) اور شدھی کے ذریعے لوگوں کو اپنے مذہب میں داخل کرنے پر زور دیتے تھے۔ بہر حال یہ دونوں گروپ پہلے آریہ دھرم پر زور دیتے تھے اور اب اپنے ہندو ہونے کے احساس پر زور دینے لگے تھے، یہ ہندو ہونے کا احساس واضح طور پر فرقہ پرستانہ اور مسلم مخالف بھی تھا۔ مسلمانوں کے احمدیہ فرقہ کے ساتھ اشتعال انگیز مناظروں کے نتیجے میں لیکھ رام 1897 میں

قتل کر دیئے گئے تھے جبکہ لالہ لاجپت رائے کے ساتھی لالہ لال چند نے کافی بعد، قائم ہونے والی ہندو مہاسبھا اور آر۔ایس۔ایس کی آئیڈیالوجی کا خاکہ فروری 1909 میں 'ہی سیاست میں نفس کشی' کے عنوان سے اپنے ایک پنجابی مضمون میں پیش کر دیا تھا۔ لال چند نے کانگریس پر ہندوؤں کے مسائل اور مطالبات کو نظرانداز کر دینے کا الزام لگاتے ہوئے سخت نکتہ چینی کی تھی۔ "ہر ہندو کے ذہن میں یہ احساس پیدا ہونا بہت ضروری ہے کہ وہ ایک ہندو ہے، محض ہندوستانی ہی نہیں ہے" اور اس لیے "کانگریس کی کمیٹیوں کی جگہ پر ہندو سبھاؤں کا ہونا اور کانگریس پریس کی جگہ پر ہندو پریس کا ہونا بہت ضروری ہے"۔ "معلومات یکجا کرنے اور اپنی مدد آپ کے ذریعے مسائل حل کرنے کی غرض سے ایک ہندو ڈفینس فنڈ ہو جس کا ایک باقاعدہ دفتر اور عملہ ہو۔" اس طرح شروع شروع میں آریہ سماج کسی قدر مخالفت (جس میں دیانند کے قتل جیسی باتیں بھی شامل تھیں) کے باوجود بھی عملاً قدامت پرستانہ ہندوازم کی طرف بڑھ رہا تھا۔ یہ ایک ایسی قدامت پرستی تھی جو انیسویں صدی کے اواخر میں کمبھ میلوں کے موقعوں پر ہری سبھاؤں اور سناتن دھرم سبھاؤں کی شکل میں اور پھر 1900 میں دہلی میں ایک بڑی کانفرنس کی شکل میں از سرِ نو قدم جمانے کی کوشش کر رہی تھی۔ دہلی کانفرنس نے بھارت دھرم مہامنڈل کی بنیاد رکھی تھی جس پر مورخوں نے کوئی خاص توجہ نہیں دی۔

اس طرح احیاء پسندی سے جارحانہ ہندو شناخت پر اصرار کو تقویت پہونچی۔ مگر یہ بھی کہ احیاء پسندی اور اصلاح کی تحریکوں کے درمیان نوعیت کا نہیں، صرف درجے کا فرق تھا، نہ صرف یہ کہ براہمو سماج اور پراتھنا سماج جیسے اعتدال پسندانہ رجحانات یا ینگ بنگال یا ودیا ساگر جیسی سیکولر تحریکیں، غرضیکہ سبھی ہیئت کے لحاظ سے ہندو ہی تھیں اور تھوڑے بہت استثناء کے ساتھ، ان سبھی کی آبیاری "مسلم استبداد" یا تاریک عہد وسطیٰ، کے تصور (جس کی جھلک ہمیں رام موہن اور بنکم چندرا وغیرہ کے یہاں بھی ملتی ہے) سے ہوئی تھی اور جس کے لیے انگریزوں کی حکومت اپنی نشاۃ ثانیہ، یا بیداری کے ذریعے نجات دہندہ ثابت ہوئی تھی۔ یہ ایک ایسا نظریہ تھا جس میں مسلم دانش ور اور روشن خیال طبقے کے لیے کسی طرح کی اپیل ہونے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ جبکہ ہندو مذہب اور سماج کو قدیم روایت کے نام پر جاری توہم پرستیوں سے پاک کرنے کی کوشش میں ہندوؤں اور مسلمانوں کی مشترکہ مذہبی شخصیتوں اور عبادت گاہوں اور مشترکہ طور طریقوں پر حملے بھی شامل ہوتے تھے۔ چونکہ اس دور میں خود ہندوستانی اسلام کے اندر بھی اس طرح کی تحریکیں اٹھ رہی تھیں (مثلاً بدعات کے خاتمہ کے نام پر صوفیانہ وسیع المشربی پر حملے ہو رہے تھے) اس لیے دونوں فرقے اعلا سطح پر ایک دوسرے سے دور ہوتے جا رہے تھے جس کے نتیجے میں شمالی ہند کے اردو ثقافت کے علاقوں میں مشترکہ رشتوں پر دباؤ بڑھتا جا رہا تھا۔ صدی کے خاتمہ کے

وقت نے بنگال کے ضلعی گزٹیئرز اور سوانحی ادب سے درگاپوجا اور محرم میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے مل کر حصہ لینے کا بار بار ذکر ملتا ہے۔

ہندوستانی اسلام کے رجحانات

ہندوستانی اسلام میں احیاء پسندی اور اصلاح پسندی کے درمیان تصادم کا مشاہدہ انیسویں صدی میں ہوتا ہے۔ اصلاحی تحریک انگریز حامی اور وفادار تھی جبکہ احیائی تحریک انگریز مخالف تھی۔ سابق الذکر کی نمائندگی سید احمد خاں کی قیادت میں علی گڈھ تحریک نے اور آخر الذکر کی نمائندگی 1867 میں دیوبند میں قائم دارالعلوم دیوبند نے کی جس کی بنیاد غدر کے سرخیل مولانا محمد قاسم نانوتوی اور رشید احمد گنگوہی نے رکھی تھی۔ سید احمد خان نے سائنٹفک سوسائٹی (1864) اور اردو کے جریدے تہذیب الاخلاق (1870) نیز علی گڈھ اینگلو محمڈن اورینٹل کالج (1875) کے ذریعے مغربی اتر پردیش کے اعلا متوسط طبقے کے مسلمانوں کو انگریزی تعلیم کی خوبیوں اور فوائد سے بہرہ ور کرنے کی کوشش کی۔ انھوں نے اسلام کی از سر نو تاویل کر کے اجتہاد پر اور قرآنی بیانات نیز جدید سائنس دانوں کے دریافت کردہ قوانین فطرت کے درمیان مماثلت پر زور دیا۔ بہر حال خود علی گڈھ کے مذہبی علماء قدامت پرست نوابوں کے ہی اثر میں تھے اور علی گڈھ تحریک کے جدت پسند عناصر کو خاص طور پر محسن الملک کے زمانے میں کافی عرصہ تک احتیاط سے کام لینا پڑا تھا۔ اس سے بھی زیادہ اہم بات یہ ہے کہ سید احمد خاں ہمیشہ اعلا طبقے کے مسلمانوں کے لیے ان کے مسلمان ہونے کی حیثیت میں ہی، مغربی تعلیم در آمد کرنے کی ضرورت پر زور دیتے رہے تھے۔ وہ اس طرح ان کی اندر جماعتی اتحاد کا احساس پیدا کرنا چاہتے تھے۔ ان کا یہ پروگرام انگریزوں کی اس نئی پالیسی کے مقاصد سے پوری مطابقت رکھتا تھا جس کا فارمولا (Hunter) کی تصنیف (Indian Muslims) میں پیش کیا گیا تھا۔ اس فارمولے میں کہا گیا تھا کہ "انگریزوں کو مسلمانوں کی ایک ایسی ابھرتی ہوئی نسل کی تیاری میں مدد کرنی چاہیے جو مغرب کی بابت سنجیدہ اور گہری معلومات کی حامل ہو اور اس کے ساتھ ہی وہ اپنے مذہبی ضابطوں سے بھی روشناس ہو، تاکہ اپنے فرقہ کے لوگوں کا احترام حاصل کر سکے" اس کے نتیجے میں علی گڈھ تحریک کو انگریزوں کی طرف سے غیر معمولی سرپرستی حاصل ہوگئی تھی اور وائسرائے لارڈ نارتھ بروک نے ذاتی طور پر دس ہزار روپے کے بقدر چندہ دیا تھا۔

Francis Robinson کے مطابق سب سے بڑھ کر یہ انگریزوں کی ہی تائید کا نتیجہ تھا کہ "جس شخص کے مذہبی خیالات اس حد تک غیر قدامت پرستانہ تھے کہ اس کے ہم مذہبوں کی اکثریت اُسے کافر اور مرتد سمجھتی تھی وہی اپنے فرقہ کے وکیل اور ترجمان کے منصب پر فائز ہوگیا

تھا۔(Separatism among Indian Muslims P-131)-

سر سید احمد خاں کو سماجی بنیاد اتر پردیش کے مسلم زمینداروں (جو کہ علی گڈھ اور بلند شہر میں بڑی تعداد میں تھے اور اودھ کے علاقے میں 272 تعلقہ داروں میں 76 مسلمان تھے) اور روایتی سرکاری ملازمت والے گھرانوں نے فراہم کی تھی۔ یہ مراعات یافتہ مگر انحطاط پذیر گھرانے تھے۔ 1857 میں صوبے میں 63.9 فی صد ماتحت منصفی اور انتظامی عہدوں پر، 87-1886 میں 45.1 فی صد عہدوں پر اور 1913 میں 34.7 فی صد عہدوں پر یہی گھرانے فائز تھے۔ (اودھ اور سرحد کے صوبوں میں کل آبادی کے لحاظ سے مسلمانوں کا تناسب 87-1886 میں محض 13.4 فی صد تھا) ۔اس طرح کہا جاسکتا ہے کہ بنگال کی خصوصی صورت حال کی بنیاد پر Hunter نے جو نتیجہ اخذ کیا تھا اسے برطانوی افسروں اور مسلم لیڈروں نے تسلیم کر لیا تھا۔ علاحدگی پسندی کے جذبات شروع میں پس ماندگی کی وجہ سے نہیں بلکہ اس وجہ سے پیدا ہوئے تھے کہ مسلمانوں کے روایتی قسم کے اعلا طبقے، ان ہندو بیوپاریوں، مہاجنوں اور پیشہ جاتی گروپوں سے خطرہ محسوس کرنے لگے تھے جو زمین خریدنے لگے تھے یا میونسپلٹیوں پر قبضہ جماتے جارہے تھے اور سرکاری ملازمتیں حاصل کر رہے تھے۔ اس کے بالکل برعکس صورت حال پنجاب میں دیکھنے کو ملتی ہے جہاں Kenneth Jones کے مطابق، آریہ سماجیوں کی احیاء پسندی کی مقبولیت کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اس سے کچھ پہلے ہی کاروبار اور دوسرے پیشوں پر، کھتری اروڑا اور بوڑیا گھرانوں کے غلبے کو مسلمانوں کی طرف سے چیلنج پیدا ہو گیا تھا۔

شروع شروع میں علی گڈھ تحریک کے لیے انگریزوں کی تائید کی محض یہی وجہ نہیں تھی کہ انھیں کانگریسی طرز کی قوم پرستی (جو کہ اس وقت تک کسی خطرے کی شکل اختیار نہیں کر سکی تھی) کے لیے ایک توڑ کی ضرورت تھی بلکہ اصل وجہ یہ تھی کہ ہندوستانی اسلام کے اندر فروغ پانے والے دوسرے مخصوص نوعیت کے رجحانات سے حکومت خطرہ محسوس کرنے لگی تھی۔ ان رجحانات میں بعض شعلہ بیان مذہبی لیڈروں کی شعلہ بیانی کے نتیجے میں پیدا ہونے والا "مذہبی جنون" اور ولایت مخالف ذہنیت بھی شامل تھی جو Peter Hardy کے مطابق "ماقبل صنعتی عہد کے نچلے متوسط زمینداروں، دیہی اور قصباتی ملاؤں، ٹیچروں، کتب فروشوں، چھوٹے دکانداروں، چھوٹے سرکاری ملازموں اور ہنر مند دست کاروں ...... مقامی زبانوں کی سوجھ بوجھ رکھنے والوں .... میں تیزی سے گھر کر جاتی تھی (Muslims of Birtish India. P-55)-

ہندوؤں میں اس طرح کے گروپ انیسویں صدی کے اواخر میں احیاء پسندی اور جارحانہ قوم پرستی کی طرف راغب ہو رہے تھے۔ اس سلسلے میں ایک طرف تو 1857 کے ان واقعات کی یادیں تھیں جن میں مسلمانوں کے رول کو مبالغے کے ساتھ پیش کیا گیا تھا اور دوسری طرف وہابی جنگوں

اور 1860 کی دہائی کی سازشوں کے نتیجے میں پیدا ہونے والا خوف وہراس تھا۔ یہ دونوں باتیں آپس میں خلط ملط ہو گئی تھیں۔ اگلی دہائی کے آتے آتے وہابی (طریقۂ محمدیہ) تحریکوں کو کچل دیا گیا تھا۔ البتہ جو چیز باقی رہ گئی تھی وہ اسلامیانے کی وہ مسلسل مہم تھی جو بطور خاص بنگال کے دیہی علاقوں میں جاری تھی اور جن میں شرک اور بدعات وغیرہ کو نشانہ بنایا جاتا تھا۔ اس طرح کی اصلاحی تحریکیں دو دھاری ثابت ہو رہی تھیں، یعنی بعض اوقات یہ انگریز دشمن ہوتی تھیں اور بعض اوقات داخلی تصادم کا بھی باعث ہوتی تھیں۔ اس کی ایک واضح مثال سکھوں کے کوکا فرقے سے پیش کی جاسکتی ہے۔ چونکہ کوکا فرقے کے لوگ 1872 میں انگریزوں کی بندوقوں کا سامنا کر چکے تھے اس لیے مجاہد آزادی کے طور پر ان کی تعظیم کی جاتی تھی مگر ان کی بیشتر سرگرمیاں گو کشی کے معاملے پر اسلام کے خلاف شدید حملوں پر ہی مشتمل ہوتی تھیں اور 1871 میں امرت سر اور لدھیانہ میں کچھ مسلم قصائی قتل بھی کر دیے گئے تھے۔

نسبتاً کہیں زیادہ خاموش اور برطانیہ مخالف موڑ اس دارالعلوم میں پروان چڑھ رہا تھا جو 1867 میں دیوبند میں قائم کیا گیا تھا۔ وہابیوں کے برخلاف یہ مکتبِ فکر شدید قسم کا قدامت پرست تھا اور سید احمد خان کی مذہبی تاویلات اور اختراع اور سیاسی وفاداریوں کی وجہ سے ان کا سخت مخالف تھا۔ مگر اس دارالعلوم کے طلباء زیادہ تر نادار گھرانوں سے تعلق رکھتے تھے جو انگریزی تعلیم کے متحمل نہیں ہو سکتے تھے۔ مگر اپنے تیار کردہ اساتذہ (فضلاء) کے توسط سے یہ ادارہ ہمیشہ با اثر رہا اور بیسویں صدی میں کانگریسی قوم پرستی کو مسلسل تقویت پہونچاتا رہا۔ البتہ ہمارے عہد میں انگریزوں کو سب سے زیادہ خطرہ کبھی کبھی بلند ہونے والے اتحاد اسلامی کے نعروں سے محسوس ہوا جن کا سرچشمہ دور دراز کے عثمانی خلافت جیسے علاقے ہوتے تھے۔ اتحاد اسلامی کے جذبات بطور خاص 78-1876 کی جنگ بلقان اور 97-1896 کی ترک، یونان جنگ کے دوران زیادہ بھڑکائے گئے تھے۔ جدید اتحاد اسلامی کے بانی مبانی جمال الدین افغانی نے 1879 اور 1882 کے درمیان ہندوستان میں قیام پذیر رہ کر حیدر آباد اور کلکتہ میں متعدد کتابیں تصنیف کیں تھیں اور خطبے دیئے تھے۔ اگرچہ جمال الدین افغانی نے اپنی ایک تصنیف "مادہ پرستوں کے رد میں" (1882) کے ذریعے سید احمد خاں پر سخت حملے کیے تھے مگر حال کی تحقیقات سے یہ ثابت ہو گیا ہے کہ افغانی کی اصل لڑائی سید احمد خان کی انگریزوں کے ساتھ وفاداری سے تھی۔ خود جمال الدین افغانی کے اپنے خیالات غیر مقلدانہ تھے اور انھوں نے کلکتہ میں طلباء سے خطاب کرتے ہوئے ہندو مسلم اتحاد کے لیے زور دار اپیل کی تھی۔ اسی طرح کا ایک خطبہ انھوں نے کالج اسٹریٹ کے البرٹ ہال میں بھی دیا تھا۔ جواب کافی ہاؤس کے نام سے جانا جاتا ہے۔ بظاہر اس اپیل کا فوری اثر معمولی رہا تھا مگر اس طرح ایک بار پھر ایک غیر واضح مگر نیا رجحان ابھر رہا تھا۔ 1890 کی دہائی کے آخر میں کچھ ایسے شواہد ملتے ہیں کہ کلکتہ کے

جوٹ ملوں کے مزدوروں کو بھی یہ باور کرایا جارہا تھا کہ وہ ترکی کے سلطان خلیفہ کو اپنا ایک طاقتور محافظ سمجھیں۔ اتحاد اسلامی کی اس تحریک کا کلکتہ کے 1897 کے فسادات میں بھی رول رہا اور پھر 20 سال بعد خلافت تحریک کی شکل میں اس نے ایک طاقت ور سامراج مخالف قوت کی حیثیت حاصل کرلی تھی۔

جیسا کہ مذکورہ بالا جائزے سے ظاہر ہو جاتا ہے، انیسویں صدی کے اواخر میں ہندوستانی سماج کو جو بہت سارے ٹکراؤ اور تصادم دیکھنے پڑے وہ ہندوازم اور اسلام کے درمیان ٹکراؤ کی بجائے، ہندوستان کے ان دونوں بڑے مذاہب کے اندر پیدا ہونے والے رجحانات اور تنازعات سے عبارت تھے مگر اس کے ساتھ ہی فرقہ پرستی بھی اپنے پیر پھیلا رہی تھی جس کا اولیں مظاہرہ 1880 اور 1890 کی دہائیوں میں ہوا، جو ایک لحاظ سے ملک گیر سطح کا تھا۔ فرقہ پرستی کے اس ملک گیر مظاہرے کے دو بڑے موضوع تھے۔ اردو۔ دیوناگری تنازعہ اور گائے کا تحفظ۔ دیوناگری رسم خط کے استعمال کا مطالبہ (جو کہ پہلی بار 1888 میں بنارس کے چند ہندوؤں کی طرف سے پیش کیا گیا تھا اور لفٹنٹ گورنر میک ڈونل نے 1900 میں منظور کرلیا تھا) یوپی کے نئے اور پرانے طبقہ اعلاء کے درمیان ٹکراؤ سے جڑا ہوا تھا۔ یہ ایک دلچسپ بات ہے کہ سید احمد خان نے مسلمانوں کے جداگانہ وجود کی بات سب سے پہلے 1869 میں شروع کی تھی اور انھوں نے ایسا رسم خط کے تنازعے کے تناظر میں کیا تھا۔ حالانکہ ان کی سائنٹفک سوسائٹی میں مسلمانوں سے زیادہ ہندو ممبر تھے۔ بہر حال گائے کے تحفظ کا معاملہ زیادہ اہم ثابت ہوا کیونکہ اس معاملے نے طبقہ اعلاء اور فرقہ پرستی کے درمیان رابطے کا کام کیا۔ حال ہی میں اس کا تفصیلی جائزہ Mclane نے بھی اپنی کتاب میں پیش کیا ہے۔ گائے کے ہندو محافظین نے اس سلسلے میں قانون سازی کی امید کرتے ہوئے تحریک چلائی اور یوپی کی متعدد میونسپلٹیوں میں صفائی، ستھرائی، اور حفظانِ صحت کے نام پر مذبح خانوں اور کباب کی دکانوں پر بندش لگانے کے ضابطے بھی پاس کیے۔ مسلم سیاست دانوں کو یہ خدشہ تھا کہ الیکشن کا طریقہ شروع ہو جانے کی صورت میں جو ہندو اکثریت سامنے آئے گی وہ ان کے اس مذہبی معاملے پر بندش اور بھی بڑھا دے گی۔ دیانند سرسوتی نے اس موضوع پر "گوکرونا ندھی" کے عنوان سے 1881 میں ایک کتابچہ شائع کیا تھا اور 1880 کی دہائی سے مقامی سطح پر گورکشنی سبھائیں ملک کے کونے کونے میں قائم کی جانے لگی تھیں۔ ان سبھاؤں کو کچھ وکیلوں اور زمینداروں کے ساتھ ساتھ جہاں گرد قسم کے سادھوؤں کی تائید اور حوصلہ افزائی حاصل تھی۔ گائے کو نہ صرف یہ کہ عہد قدیم سے ایک مذہبی علامت کی حیثیت حاصل تھی بلکہ کسانوں کے لیے زمین کے بعد گائے ہی سب سے قیمتی ورثہ تھی، جبکہ اعلا تعلیم یافتہ ہندو اس دلیل سے متاثر تھے کہ گائے کے تحفظ سے ہر ہندوستانی کی صحت بہتر ہو جائے گی اور خوش حالی بڑھ جائے گی۔ 93-1892 کے بعد گورکشنی

سبھاؤں کا رویہ اور زیادہ شدت پسندانہ ہوتا گیا جس کی ایک ہلکی سی جھلک ہمیں قدامت پرست ہندوؤں کے ذریعہ سن بلوغ ایکٹ کی شدید مخالفت کی شکل میں دیکھنے کو ملتی ہے جو کہ ایک سال قبل ہی پاس کیا گیا تھا۔ گائے کی خرید و فروخت اور اس کے ذبح کیے جانے کے معاملے میں جبریہ دخل اندازی کی گئی بلکہ ایسی سبھا عدالتیں بھی شروع کی گئیں جو قصائیوں کے ہاتھ گائے فروخت کرنے والوں کے خلاف جرمانے یا سماجی بائیکاٹ کی سزائیں سناتی تھیں۔ چونکہ اس کے ساتھ ہی اسلامی احیاء پسندی کے رجحانات کے تحت عیدالاضحی کے موقع پر قربانی کی ضرورت پر زور دیا جارہا تھا۔ چنانچہ اس طرح جون۔ جولائی 1893 میں بڑے پیانے پر پھوٹ پڑنے والے فسادات کے لیے ماحول تیار ہو رہا تھا۔ ان فسادات کا سلسلہ اعظم گڈھ میں مئو (مئو ناتھ بھنجن، جو کہ اب خود بھی ضلع بن چکا ہے) سے شروع ہوا جہاں مسلمانوں کی ایک بڑی آبادی پر غازی پور اور بلیا سے آنے والے بڑے بڑے جتھوں نے حملہ کیا تھا۔ یہ فسادات سب سے زیادہ منظم طریقے پر بلیا میں ہوئے جہاں ایک راجپوت زمیندار بہت زیادہ سرگرم رہا تھا۔ اس کے علاوہ سارن، گیا، اور پٹنہ اور مویشیوں کے میلوں میں بڑے پیانے پر (کل 22) فسادات ہوئے۔ سب سے پر تشدد فساد بمبئی شہر میں ہوا تھا جہاں 80 لوگ مارے گئے تھے۔ وہاں فساد کی جڑ یہ سوال تھا کہ مسجدوں کے پاس سے ہندو جلوسوں کے گزرتے وقت باجا بجایا جا سکتا ہے یا نہیں۔ جونا گڈھ اور رنگون میں بھی فسادات کا اثر رہا تھا۔ اس سے پہلے اس طرح کے فساد کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ یہ ایک ملک گیر فساد بھی تھا اور اس جدید قومی تحریک کے لیے ایک برا شگون بھی جو جلد ہی اپنی ساری توانائیوں کے ساتھ ابھرنے والی تھی۔

احیاء پسندی اور انتہا پسندانہ قوم پرستی کے درمیان جس ربط کی بات کہی جاتی ہے وہ اس حقیقت کے مد نظر کافی اہم معلوم ہوتا ہے کہ احیاء پسندی کا نتیجہ فسادات کی شکل میں سامنے آیا جو کہ سکریٹری آف اسٹیٹ Kimberley کے نزدیک اس لیے خوش آیند تھا کہ اس سے متحدہ ہندوستانی عوام کی تشکیل کے لیے کانگریس کے خواب پر زد پڑتی تھی (Kimberley to Landsdoune Aug 25,1893)۔

بہر حال یہ بھی مد نظر رہنا بہت ضروری ہے کہ 1905 سے پہلے قوم پرستی کی تشکیل۔ یعنی دولت کے بہاؤ کے نظریے کے ذریعے انگریزی حکومت کے معاشی پہلوؤں کی باقاعدہ چھان بین کے طریقہ کار کی تشکیل۔ میں سب سے اہم رول دادا بھائی نارو جی، راناڈے، جی۔ وی۔ جوشی اور آر۔ سی۔ دت جیسے لوگوں کا رہا ہے۔ یہ سبھی لوگ جدید اصلاح کاروں سے جڑے رہے تھے۔ پھر یہ بھی کہ سارے جوشیلے اصلاح کاروں کا، سیاست کے معاملے میں اعتدال پسند ہونا ضروری نہیں تھا۔ 1876 میں براہمو لیڈر سیوا ناتھ شاستری نے نوجوانوں کے ایک گروپ کو (جن میں بپن چندر پال بھی شامل تھے) یہ حلف دلایا تھا کہ وہ سرکاری نوکری ترک کریں گے اور یہ اعلان کریں گے کہ

حکومت خود اختیاری ہی وہ واحد طرز حکومت ہے جو خدا نے ہمیں ودیعت کیا ہے" جی۔ جی اگر کر کو، جنھوں نے تلک کے ساتھ مل کر دکن ایجوکیشن سوسائٹی قائم کی تھی اور اور اخبار "کیسری" اور مراٹھا شروع کیا تھا، اور بعد میں تلک سے لڑ بیٹھے تھے، سیاسی اور سماجی دونوں ہی اعتبار سے انقلاب پسند سمجھا جاتا تھا۔ 1895 میں اگر کر کی اچانک موت کے بعد اصلاح پسند جریدے۔ سدھارک کی ایڈیٹری ٹیور دھن نے سنبھالی تھی۔ وہ ایک استاد تھے۔ 1897 میں پونا میں طاعون پھیل جانے کے زمانے میں انھیں ٹیچری سے معطل کر دیا گیا تھا اور غداری کا مقدمہ چلانے کی دھمکی بھی دی گئی تھی۔ قدامت پرستی یا احیاء پسندی کی وکالت کرنے والے سارے ہی لوگ سیاسی لحاظ سے آگ کا پر کالہ نہیں تھے۔ مثال کے طور پر 1892 میں بنارس میں دس ہزار قدامت پرستوں کا ایک اجتماع سناتن دھرم کے ساتھ ساتھ ملکہ وکٹوریہ کے حق میں بھی محض نعرے لگانے کے بعد ہی منتشر ہو گیا تھا۔ اینی بسنٹ بھی مشرف بہ سماجی اصلاح ہونے کے بعد ہی سیاسی طور پر سرگرم ہوئی تھیں اور آریہ سماجیوں کا سب سے زیادہ قدامت پرست گروکل گروپ، لاجپت کے کالج گروپ کے بر خلاف قوم پرستانہ سیاست سے کنارہ کش رہا تھا۔ یہاں تک کہ 1913 میں بھی گروکل گروپ نے لیفٹننٹ گورنر Meston کا شاندار استقبال کر کے انگریزوں کے تئیں اپنی وفاداری کا مظاہرہ کیا تھا۔

1870 کی دہائی سے جو کچھ بھی وقوع پذیر ہو رہا تھا اسے ہم ملک کے روشن خیال طبقے کی فکر و عمل کی دنیا میں بتدریج مگر مکمل اور غیر مسلسل طریقے پر رونما ہونے والی اس تبدیلی کا نام دے سکتے ہیں جس میں وہ قوم پرستی کی مختلف شکلوں کی طرف بڑھ رہے تھے۔ یہ ایک ایسی تبدیلی تھی جس سے اصلاح پسند اور احیاء پسند غرضیکہ سبھی متاثر ہو رہے تھے۔ تعلیم یافتہ طبقے کی بڑھتی ہوئی بے روزگاری کے لحاظ سے اس مظہر کی توجیہ کو اطمینان بخش نہیں کہا جا سکتا۔ یہ درست ہے کہ ہندوستانی اخبارات (اور متعدد سرکاری رپورٹوں) میں بھی گریجویٹوں کے لیے (جو کہ خود بھی نو آبادیاتی نظام کی ہی پیداوار تھے) صنعت کے میدان میں سست رفتار نمو اور Macualy کے ہی زمانے سے انگریزی تعلیم کو قدیم روی اور یونانی علمی بنیاد حاصل ہونے کی وجہ سے سرکاری ملازمتوں اور دوسرے شعبوں پر دباؤ بڑھ جانے کے نتیجے میں) مستقبل کے اِمکانات کم تر ہوتے جانے کی باتیں تکرار کے ساتھ کہی جاری تھیں۔ مگر یہ بھی ذہن نشیں رہنا چاہیے کہ ملازمتوں کے لیے مقابلے کے نتیجے میں علاقائی اور فرقہ وارانہ خطوط پر گروہی احساس پیدا ہونا ہی تھا۔ ہم اس طرح کی مثالوں کا مشاہدہ پہلے بھی یوپی میں ہندو اور مسلم طبقہ اعلا کے درمیان تصادم نیز شمالی ہند میں بنگالیوں کی بڑھتی ہوئی عدم مقبولیت کی شکل میں کر چکے ہیں۔ کانگریس کے ابتدائی لیڈر اور کارکنان بے روزگار نوجوان نہیں تھے بلکہ کامیاب اور خوش حال قسم کے پیشہ ور لوگ تھے۔ اس کے علاوہ نسل پرستی (جس کا مظاہرہ والبرٹ بل کے خلاف طوفان کی شکل میں ہوا تھا) نیز انگریزوں

کی پالیسیوں اور ملک کی غربت (جو کہ 1870 اور 1890 کی دہائیوں کی قحط سالی کی وجہ سے اور بھی نمایاں ہو گئی تھی) کے درمیان گہرے تعلق کا بڑھتا ہوا احساس، بہت اہم عوامل تھے۔ اگر مزید وضاحت کی ضرورت محسوس ہوتی ہے تو اس سلسلے میں اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا جاسکتا ہے کہ ابتدائی کانگریس سے وابستہ کامیاب وکلاء کو اپنی عملی زندگی کے اوائل میں گوروں کی طرف سے کھڑی کی جانے والی رکاوٹوں پر قابو حاصل کرنا پڑا تھا۔ مثال کے طور پر فیروز شاہ مہتہ کو 1873 میں بمبئ میں گوروں کی طرف سے مسابقت کی وجہ سے ہی شہر سے کافی دور وکالت شروع کرنے کا فیصلہ کرنا پڑا تھا، اسی طرح اسٹینڈنگ وکیل کے عہدے پر تقرر کے سلسلے میں ڈبلو۔ سی بنرجی کو نظر انداز کر دیا گیا تھا، مدراس نیز کلکتہ کے وکیلوں کو مقدمات کے سلسلے میں بیرسٹروں کے بغیر ہی ہائی کورٹ میں پیش ہونے کا حق اسی وقت مل سکا تھا جب انھوں نے گورے وکیلوں کے جونیر کے طور پر کام کرنے سے انکار کر دیا۔ سول سروس میں ہندوستانیوں کے ساتھ امتیازی سلوک بھی کبھی کبھی قوم پرستانہ احساسات کا باعث ہو جاتا تھا۔ مثال کے طور پر ترقی کے معاملے میں وجیندر ناتھ ڈے کو کئی بار نظر انداز کر دیا گیا تھا۔ ان کا قصور یہ تھا۔ انھوں نے ہندوستانیوں کے ساتھ رانی گنج کے گورے کان مالکان کے غلط برتاؤ کے معاملے میں بار بار مداخلت کی تھی۔ ان کا ایک قصور یہ بھی تھا کہ بعد میں انھوں نے اپنے افسر اعلا John Beames کی خواہش کے بر خلاف البرٹ بل (Ilbert Bill) کا دفاع کیا تھا۔ ایک دوسرے اور ان سے بھی کم تر بنگالی افسر گیان چندر بنرجی نے جو کہ ایک ضلع منصف تھے، ایک ایسی غیر مطبوعہ ڈائری چھوڑی ہے۔ جو انگریز مخالف جذبات سے بھری ہوئی تھی، ان کے ان جذبات کی وجہ نسلی امتیاز اور عام غربت تھی۔

ادب میں وطن پرستی

مقامی زبانوں اور بولیوں کے ادب نے روشن خیال طبقے کی وطن پرستی کے لیے ابتدائی اور فطری وسیلہ اظہار کا کام کیا۔ مختلف ہندوستانی زبانوں کا ادب تقریباً ملک کے ہر حصہ میں اصلاحی تحریکوں سے جڑا ہوا تھا (بنگالی نثر کے ارتقاء میں رام موہن اور ودیا ساگر کے رول کی مثال پیش کی جاسکتی ہے)۔ اصلاحی تحریکوں کی وجہ سے ادب پر ایک نیا وطن پرستانہ موڑ چھا گیا تھا۔ بنگال میں 1860 اور 1870 کی دہائیوں میں بہت سارے وطن پرستانہ گیت اور نغمے لکھے گئے جن میں ملک کی حالت زار کا شکوہ ہوتا تھا اور کبھی کبھی براہ راست طور پر دست کاریوں کے زوال کا بھی ذکر ہوتا تھا۔ ان میں سے کچھ گیت اس ہندو میلے کے لیے بھی لکھے گئے جن کا اہتمام ٹیگور خاندان کی تائید اور مدد سے بابا گوپال متر 1867 سے متعدد برسوں تک کرتے رہے تھے۔ نو مولود تھیٹر تو انگریزوں کا براہ راست طور پر مخالف تھا جس میں دین بندھو مترا کے ناول، نیل درپن (1860) سے لے کر، جس

میں نیل کی کاشت کرنے والوں کی حالت زار کو نمایاں کیا گیا تھا۔1870 کی دہائی تک کے وہ مخصوص ڈرامے بھی شامل تھے جن کی وجہ سے ہی Litton کو 1876 میں Dramatic Performances Act پاس کرانا پڑا تھا۔ بنکم چندر نے اپنے تاریخی ناولوں کے ذریعے سب سے زیادہ متاثر کیا۔ آنند مٹھ، جس میں بندے ماترم، بھجن شامل ہے، ان کا شاہکار ناول ہے۔ بنکم چندر نے ناولوں اور مضامین کے ذریعے ملک کی تاریخ میں دلچسپی پیدا کرنے کی کوشش کی۔ بہر حال یہ بات دلچسپی سے خالی نہیں ہے کہ جہاں 1880 اور 1890 کی دہائیوں میں بنگال میں احیاء پسندی اپنے عروج پر تھی وہیں اس زمانے میں سیاست کے تئیں عدم دلچسپی بھی ملتی ہے۔ اب تھیٹر کی دنیا میں گریش چندر گھوش کے جذباتی اور گھریلو قسم کے ڈراموں کا بول بالا تھا۔ یہ ڈرامے پورانک کہانیوں پر مبنی ہوتے تھے جن میں کوئی بھی سیاسی بات براہ راست طریقے پر نہیں کہی جاتی تھی۔ 1903 میں بپن چندر پال نے یہ کہا تھا کہ البرٹ بل کے زمانے سے تخیلی مذہب کے حق میں سیاست کو نظر انداز کیا جارہا ہے، اور اس کے نتیجے میں پرانے قومی گیتوں کی جگہ مذہبی گیتوں نے لے لی ہے۔(New India ,19 March,1903)۔

ملک کے دوسرے حصوں میں بھی قوم پرستی اور علاقائی ادب کے درمیان اس طرح کے تعلق کی نشان دہی کی جاسکتی ہے۔ مراٹھا ادب کی نشو ونما کے موضوع پر ایم۔ جی۔ راناڈے کی تصنیف (1898) میں مراٹھی مطبوعات کی تعداد میں تیز رفتار اضافے کے سلسلے میں ایک اشاریہ بھی شامل ہے اور 1840 سے عہد وسطی کے مراٹھی بھکتی گیتوں کے نئے ایڈیشنوں کی اشاعت کی تحریک کا بطور خاص ذکر کیا گیا ہے۔ اس اشاریہ کے مطابق مراٹھی مطبوعات کی جو تعداد 1818-27 میں صرف تین تھی، 1847-1857، بڑھ کر 102، 1865-74 میں 1530، 1885-96 میں 3824، ہوگئی تھی۔ اس کے بعد پرانے مراٹھی روزناموں کی اشاعت کا سلسلہ شروع ہوا۔ خود راناڈے کے تاریخی مضامین سے شیواجی پنتھ کا آغاز ہوا جسے 1895 سے تلک نے بھی اپنالیا تھا۔ بہر حال راناڈے نے سترہویں صدی کے احیاء کو ایک ایسی پروٹسٹنٹ تحریک کی شکل میں پیش کرنے کی کوشش کی جس نے ان بھکتی سنتوں سے تحریک حاصل کی تھی جو ذات پات کے فرق کو ختم کر دینا چاہتے تھے۔ ان کا خیال یہ تھا کہ بعد کے مراٹھا پیشواؤں کی قدامت پرستی بھی مراٹھا زوال کا ایک سبب تھی۔ شیواجی کے سلسلے میں ایک بالکل مختلف نظریہ، جس میں ان کے گرو رام داس کو ہندو تشدد پسندی کا نقیب ثابت کرنے پر زور دیا گیا تھا، 1890 کی دہائی سے تلک، کیلکر (Kelkar) اور راج واڈے (Rajwade) نے پیش کرنا شروع کیا تھا۔ ظاہر ہے کہ اس طرح دونوں ہی طرف سے اس عہد کے آپسی اختلافات کو ماضی کی آڑ میں ظاہر کیا جارہا تھا۔ ایک تیسرا نظریہ بھی تھا جس کی رو سے شیواجی کو ایک شودر راجا کے طور پر پیش کرنے کی کوشش کی جارہی

تھی ،اس طرح کی کوشش جیوتی با بھولے نے اپنی 1869 کی ایک رزمیہ نظم کے ذریعے کی تھی۔ لوک ہت وادی گوپال ہری دیش کھ نے اپنے "ست پتر "سلسلہ مضامین (50-1848) کے ذریعے زیادہ راست طریقے پر مذہبی موضوعات کی تشکیل کی۔ان مضامین کے ذریعے سماجی اصلاح کی اپیل کی گئی،دیسی کاروبار کی وکالت لی گئی مگر موٹے طور پر انگریزوں کی حکمرانی کا خیر مقدم بھی کیا گیا۔ پھر ایک نسل بعد وشنو کرشنا Chiplankart نے بھی اپنے جریدے۔نبندھ مالا (81-1874) کے ذریعے نئے موضوعات پیدا کئے۔ مگر سارا زور احیاء پسندی پر اور انگریزوں کی مخالفت پر ہوتا تھا۔ جیسا کہ بنگالی اور مراٹھی مثالوں سے واضح ہو جاتا ہے،ہندوستان کے مختلف علاقوں کی زبانوں میں وطنی ادب کی نشوونما کئی لحاظ سے غیر واضح بھی رہی۔ یعنی اس میں ایک ہی ساتھ قومی،علاقائی اور فرقہ وارانہ شعور کا رجحان تھا،چنانچہ بنکم چندر کی ساری توجہ بنگال کی تاریخ پر مرکوز رہی،ان کا اصرار اس بات پر تھا کہ بنگال کی آزادی بختیار خلجی سے ختم ہوئی تھی نہ کہ پلاسی سے۔انھوں نے مغل دور میں قائم ہونے والی مرکزیت سے علاقائی زندگی اور سیاست پر مرتب ہونے والے اثرات پر بھی زور دیا۔بنکم چندر نے بطور خاص اپنے بعد کے ناولوں (آنند مٹھ،دیبی چودھرانی ور سیتارام) میں مسلمانوں کے ذریعے جلب منفعت کا ذکر کیا۔ حملہ آور مسلمانوں کے ساتھ راجپوتوں کی نبرد آزمائی کو Tod نے جس طرح دیومالائی رنگ میں پیش کیا تھا اسے بنگال کی شاعری ،ڈراموں،ناولوں بلکہ بچوں کی کتابوں میں بھی جوں کا توں اپنا لیا گیا تھا۔ بنگال میں شیواجی پنتھ کو بھی درآمد کرنے کی کوشش کی گئی ۔یہ دوسری بات ہے کہ مہاراشٹر کے اقتدار کے ساتھ بنگال کے سب سے اہم تاریخی روابط 1740 کی دہائی کے تباہ کن Bargi چھاپوں کی شکل میں قائم ہوئے تھے۔اس طرح بپن چندر کے الفاظ میں "مانگے کی (مستعار) قوم پرستی" کی نشوونما ہوئی جس کے حق میں یہ دلیل پیش کرنے کی کوشش کی جاتی رہی ہے کہ انگریزوں کے خلاف کھلم کھلا لکھنا (اور خاص طور پر بنکم چندر جیسے سرکاری ملازم کے لیے) خطرناک ہوتا۔ مگر اس طرح انگریزوں کی جگہ پر مسلمانوں کو نشانہ بنانے کے عواقب کہیں زیادہ خطرناک ہو سکتے تھے اور خطرناک ثابت بھی ہوئے۔ چنانچہ سودیشی ہندو نوجوانوں نے خاص طور پر 1905 سے بنکم چندر کو بھگوان ماننا شروع کر دیا تھا۔ مگر مسلم اخبارات اور رسائل اور خاص طور پر وہ اخبار جو کہ قوم پرستی کے لیے زبردست ہمدردی رکھتے تھے بنکم چندر کے ناولوں میں یاونوں (Yavanas) کے غلط استعمال پر کڑی نکتہ چینی کرتے رہے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مسلم دانش ور طبقے میں بھی اسی طرح کی مستعار قوم پرستی پنپنے لگی تھی جس کے تحت حکومتوں کے ان ادوار اور (اورنگ زیب جیسی) اُن شخصیات کی تکریم کا سلسلہ شروع ہوا جنھیں ہندو برا سمجھتے آرہے تھے۔اس کے علاوہ عالمی سطح پر بھی اسلام کی عظمت رفتہ کو یاد کیا جانے لگا تھا۔ اس کام کو انیسویں صدی کے اواخر کے مشہور اردو شاعر الطاف حسین حالی،اور شبلی

نعمانی نے بخوبی انجام دیا۔ بنگال میں اس رجحان کی عکاسی مسلم شاعر کیقباد نے کی۔

یہ صورت حال دو علاقوں، تامل ناڈو اور موجودہ ہندی پٹی میں کافی پیچیدہ تھی۔ Robert Caldwell) اور J.H. Nelson جیسے انگریز عالموں کی حوصلہ افزائی پر تامل تاریخ اور کلاسیکی تامل ادب کی جو بازیافت بیسویں صدی کے اوائل میں ایک طاقت ور براہمن مخالف شکل اختیار کر گئی تھی وہ بڑی آسانی سے شمال مخالف شکل بھی اختیار کر گئی۔ جیسا کہ ہم پہلے بھی دیکھ چکے ہیں، یہ بھی دراصل ایک ایسی ہی بات تھی جس کی گورنر Grant - Duff جیسے انگریز افسران 1886 میں حوصلہ افزائی کر چکے تھے۔ پھر یہ کہ ادبی ہندی ایک ایسی مصنوعی چیز تھی جو ہندو احیاء پسندی کی تحریکوں سے جڑ رہی تھی۔ بھارتیندو ہریش چندر (85-1850) جنھیں ان کے ڈراموں، نظموں اور صحافت کی وجہ سے جدید ہندی کا باوا آدم سمجھا جاتا ہے۔ اکثر سودیشی سامان کے استعمال کا، عدالتوں میں اردو کی جگہ ہندی کے استعمال کا اور گوکشی پر پابندی کا مطالبہ کرتے رہے تھے وہ سیاست میں بنیادی طور پر انگریزوں کے وفادار رہے۔ اٹھارہویں صدی میں اور پھر انیسویں صدی کے ایک بڑے حصے میں اردو شمالی ہند کے ایک بڑے علاقے میں مسلمانوں کے ساتھ ساتھ ہندوؤں کی بھی شستہ ثقافتی زبان رہ چکی تھی؛ یہاں تک کہ 90-1881 کی دہائی میں بھی اتر پردیش میں ہندی میں 2793 کتابوں کے مقابلے میں اردو میں 4380 کتابیں شائع ہوئی تھیں۔ اس عرصے میں اردو میں شائع ہونے والے اخبارات کی تعداد 16256 اور ہندی اخبارات کی تعداد محض 1915 رہی تھی۔ منشی پریم چند بھی ہندی ناشروں کی کمیابی کی وجہ سے 1915 تک زیادہ تر اردو میں ہی لکھتے رہے تھے۔ ہندی کے لیے دیوناگری رسم خط کی جو تحریک آریہ سماجیوں اور قدامت پرست ہندوؤں نے شروع کی تھی وہ عوام کے لیے کشش رکھتی تھی، کیونکہ فارسی زدہ اردو اعلا طبقے کی زبان تھی مگر جس سنسکرت زدہ ہندی پر اتنا زور دیا جا رہا تھا اور بعد میں جسے قومی زبان کا درجہ دینے کا بھی مطالبہ کیا گیا، وہ علاقے کی مقامی بولیوں (پنجابی، ہریانوی، پہاڑی، راجستھانی، اودھی، بھوج پوری، میتھلی، ماگدھی وغیرہ) سے دور دور تک لگّا نہیں کھاتی تھی، اس سے بھی زیادہ بدشگونی کی بات یہ تھی کہ رسم خط اور زبان کے سلسلے میں پیدا ہونے والے تنازعات مذہبی اختلافات کی شکل اختیار کرتے جا رہے تھے جس کے نتیجے میں فرقہ پرستی کی جڑیں بھی گہری ہوتی چلی گئیں۔ اس طرح شمال ہند اور جنوبی ہند میں بھی ایسے مسائل پیدا ہو رہے تھے جو آزاد ہندوستان کے لیے ابھی تک پریشان کن بنے ہوئے ہیں۔

قوم پرستانہ معاشی نظریہ

غیر ملکی حکمرانی کی معاشیاتی تنقید قوم پرستی کے لیے دوسرا بڑا وسیلۂ اظہار تھی۔ غیر ملکی حکمرانی کی معاشی تنقید کے لیے وہی دولت کے بہاؤ (Drain of Wealth) کی اصطلاح وضع کی گئی۔ نظریاتی لحاظ سے یہی وہ چیز ہے جو 1870 کے بعد کے ہندوستانی دانشوروں اور ان کے پیش روؤں کے درمیان خط فاصل کا کام کرتی ہے۔ یہ تذکرہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ رام موہن نے 1831 میں دارالعوام کی سیلیکٹ کمیٹی کے سامنے بیان دیتے ہوئے وہ بات کہی تھی جسے بعد کی نسل نے دولت کے بہاؤ کا نام دیا بلکہ اس بہاؤ کا تخمینہ لگانے کی بھی کوشش کی تھی۔ مگر اس وقت اس کا مقصد محض یہ ظاہر کرنا تھا کہ یوروپی آبادکاری ہی مسئلے کا حل ہے تاکہ اس وقت گوروں کے ذریعہ کمایا گیا منافع ملک سے باہر نہ جائے، بہر حال قوم پرست معاشیات کا باقاعدہ آغاز ناروجی نے کیا۔ اس روایت کی نشو و نما 1870 کی دہائی سے شروع ہوئی اور کتابوں، اخباروں کے مضامین، تقریروں وغیرہ میں اس کا ذکر ہونے لگا تھا۔ ان قوم پرست نقادوں نے ہندوستان کی روز افزوں غربت کا رشتہ براہ راست طور پر انگریزوں کی بعض مخصوص پالیسیوں، خصوصاً مصنوعی بر آمدی توفیر (Export Surplus) کے ذریعے دولت کے بہاؤ، دستکاریوں کی بربادی اور پھر جدید ہندستانی صنعت کے فروغ کی راہ میں رکاوٹوں نیز بڑھتی ہوئی مال گزاری کے ساتھ قائم کرنے کی کوشش کی۔ ان تینوں باتوں کو آر۔ سی۔ دت کی تصنیف Economic History of India (1901) میں ایک مسلسل مرکزی خیال کی حیثیت حاصل رہی تھی۔ بہر حال اس سلسلے میں بھی تدارک کی اقدامات کی تجویزیں پیش کی گئیں۔ ان میں ان پالیسیوں کو واپس لینے اور ہندوستان کی صنعتی ترقی کے لیے بھرپور کوشش کرنے کی تجویز بھی شامل تھی۔ دراصل ابتدائی قوم پرستوں نے پوری وضاحت کے ساتھ سرمایہ دارانہ خطوط پر آزاد ترقی کا فارمولہ تیار کیا تھا۔ 1873 میں ہی بھولاناتھ چندر نے (جو کہ ہندوستان کو جدید صنعت سے محروم رکھنے کی انگریزوں کی پالیسی کے ایک ابتدائی بنگالی نقاد تھے اور جنھوں نے اس مسئلے کا حل انگریزی سامان استعمال نہ کرنے کی شکل میں پیش کیا تھا) اپنے اہم خطبات کے ذریعے ہم وطنوں سے یہ اپیل کی کہ "کہ وہ صنعتی کاروبار کو اپنے افکار کی دھاراؤں کے سمندر میں تبدیل کر دیں" اور پھر 20 سال بعد راناڈے یہ امید ظاہر کر رہے تھے کہ " صنعت کاری بہت جلد پوری قوم کے ایمان کا درجہ حاصل کر لے گی اور اس قدیم سر زمین میں جدید فکر و جذبے کو دوام بخشنے کا باعث ہوگی"۔ تلک کے اخبار مراٹھا، کا زور بھی اس بات پر تھا کہ "ہمیں سرمایہ دار اور کاروباری بننا ہوگا...... ہمیں تاجروں، مشین سازوں اور دکانداروں کی قوم بننا ہوگا" (13 فروری 1881)۔

جیسا کہ گذشتہ باب میں مختصراً جائزہ لیا جاچکا ہے، حالیہ اور جدید تحقیقات کی روشنی میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ ان قدامت پرست نقادوں کی بھی کچھ حدود تھیں جن سے وہ باہر نہیں جاسکتے تھے۔ برطانیہ کی سامراجی معیشت کی نشوونما میں ہند کے رول کے بارے میں اتنی زیادہ معلومات حاصل نہیں تھیں اور اس ملک کی مشکلات کو محض بعض مخصوص افراد کی "غیر انگریز" پالیسی کا نتیجہ بتایا جاتا تھا اور ناروجی جیسے لوگوں کا کافی عرصہ تک یہی خیال تھا کہ ان پالیسیوں کو درخواستوں اور گزارشوں کے ذریعے تبدیل کرایا جاسکتا ہے۔ ساری توجہ سرکاری پالیسیوں پر ہی مرکوز کر دینے کے نتیجے میں برطانیہ کے نجی سرمائے کو نظر انداز کر دیا گیا۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ خود ہندوستانی سماج میں کشیدگیاں بڑھ رہی تھیں۔ چنانچہ اگر ناروجی اور آر۔ سی۔ دت کی دلیل صحیح بھی تھی تو یہ بھی حقیقت تھی کہ غذائی اجناس ملک سے باہر بھیجنے کے لیے مصنوعی طریقے پر آمداتی توفیر (Export Surplus) کی حالت پیدا کی جاتی تھی اور اس کے لیے کسانوں سے ان کی پیداوار جبراً فروخت کرائی جاتی تھی اور اس طرح دولت کا بہاؤ جاری رکھا جا رہا تھا۔ کسان، لگان کی زائد وصولی کے علاوہ، زمینداروں اور مہاجنوں کے ذریعے استحصال کی وجہ سے بھی اپنی پیداوار فروخت کرنے کے لیے مجبور ہو جاتے تھے۔ اس صورت حال سے نہ صرف خود ہندوستانیوں کی ایک بڑی تعداد کو بھی ذیلی طور پر فائدہ پہونچ رہا تھا بلکہ وہ نو آبادیاتی استحصال کا آلہ کار بھی بنے ہوئے تھے۔ قوم پرست عام طور پر اس حقیقت کو نظر انداز کر جاتے تھے۔

قوم پرستوں نے غیر ملکیوں کے کاروبار میں کام کرنے والے ہندوستانیوں کی بدحالی پر تو تشویش ظاہر کی اور ان کے (خصوصاً آسام کے چائے باغات کے قلیوں) کے سلسلے میں انسانی دردمندی بھی ظاہر کی مگر خود ہندوستانیوں کی ملکیت والی فیکٹریوں میں کام کرنے والے ہندوستانیوں کے استحصال پر کبھی توجہ نہیں دی بلکہ بیشتر قوم پرست اخباروں نے ان قوانین کی مخالفت بھی کی جو کہ بمبئی کی صنعت کی طرف سے درپیش مقابلے سے پریشان لنکاشائر کے دباؤ پر عورتوں اور بچوں سے کام لینے پر پابندی کے سلسلے میں پاس کیے گئے تھے؛ اور جن پر عمل بھی برائے نام ہی ہوتا تھا۔ ہندوستان کے سوتی کپڑے کی صنعت کے مستقبل کے بارے میں جس طرح انتہائی سرسری طریقے پر تشویش ظاہر کی گئی اس کے پیش نظر امرت بازار پتریکا کے 2 ستمبر 1873 کے سنگ دلانہ تبصرے جیسے بیانات کی وجہ صاف سمجھ میں آجاتی ہے۔ امرت بازار پتریکا کا کہنا تھا کہ "اس عروج پذیر صنعت کے انحطاط کے مقابلے میں اپنے مزدوروں میں زیادہ شرح اموات کو ترجیح دی جاسکتی ہے"۔

بہر حال اس طرح کے تعینات (Limtations) کے باوجود بھی اعتدال پسندانہ معاشی فکر پر اثر رہی۔ یہ اعتدالی معاشیاتی فکر بعد میں قومی تحریک کے انتہاپسندانہ، انقلابی، دہشت گردانہ،

گاندھیائی اور سوشلسٹ مرحلوں میں غیر ملکی حکومت کے خلاف تنقید کی بنیاد بنی رہی۔ دولت کے بہاؤ کے نظریے سے نو آبادیاتی استحصال سے متعلق بنیادی حقائق کی نشان دہی ہوئی۔ اس طرح کہا جا سکتا ہے کہ یہ صورت حال اس بات کا نتیجہ نہیں تھی کہ ملک کے مسائل کو سماجی اصلاح، احیاء پسندی، فرقہ وارانہ وابستگی یا علاقائی وفاداریوں کے ذریعے حل کرنے کی کوشش میں جو تحریکیں شروع کی گئیں یا جو نظریات وضع کیے گئے، ان کے تئیں عام شعور غلط تھا۔ بلکہ اس کی وجہ یہ تھی کہ یہ تحریکیں اور نظریات باہم متصادم ہونے کے علاوہ ان کی بہتات بھی تھی۔ موٹے طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ دولت کے بہاؤ کی دلیل نے اعتدال پسند لیڈروں کی قیادت والی کانگریس کے مطالبات اور سرگرمیوں کے لیے نظریاتی بنیاد کا کام کیا۔

کانگریس کی اساس

کانگریس کی قیادت میں بمبئی اور کلکتہ کے ان لوگوں کو مرکزی حیثیت حاصل تھی جو کہ 1860 کی دہائی کے آخر یا 1870 کی دہائی کے دوران پہلے پہل لندن میں ملے تھے۔ فیروز شاہ مہتہ، بدرالدین طیب جی، ڈبلو۔ سی۔ بنرجی۔ من موہن اور لال موہن گھوش، سریندر ناتھ بنرجی، آنند جی بوس، اور رومیش چندر دت وغیرہ دادا بھائی نارو جی کے اثر میں آگئے تھے جو کہ اس وقت ایک تاجر اور صحافی کی حیثیت میں لندن میں ہی قیام پذیر تھے۔ مذکورہ بالا اشخاص میں سے جن لوگوں نے سول سروس میں شمولیت اختیار نہیں کی (یا سریندر ناتھ کی طرح جن لوگوں کو اس سے نکال باہر کر دیا گیا تھا)، انھوں نے کلکتہ میں دوار کا ناتھ گنگولی کی قیادت والے سادھارن براہمو گروپ سے، پونا میں رناڈے اور جی۔ وی۔ جوشی سے، بمبئی میں کے۔ ٹی۔ تلنگ سے اور کچھ عرصہ بعد مدراس میں جی۔ سبرامینا ایر، ویر ارا گھوچاری اور آنند چارلو کے ساتھ مل کر مقامی سطح کی انجمنیں قائم کرنے کے لیے پہل قدمی کی۔ یہ سب متوسط طبقے کے پیشہ ور لوگ تھے۔ ان تنظیموں میں سب سے اہم، پونا سارواجنک سبھا، (1870)، اور انڈین ایسوسی ایشن (1876) تھیں۔ جنھوں نے ہی سب سے پہلے سول سروس اور پریس ایکٹ کے سلسلے میں 78-1877 میں کل ہند سطح پر احتجاج کا سلسلہ شروع کیا تھا۔ مدراس مہاجن سبھا (1884) اور بمبئی پریزیڈنسی ایسوسی ایشن (1885) کو بھی بہت اہمیت حاصل تھی۔ اس طرح کے گروپوں کو کل ہند سطح پر اکٹھا کرنے کی تجویز اور کوشش 1880 کے اوائل سے ہی شروع ہو گئی تھی اور انڈین ایسوسی ایشن نے اس سلسلے میں 1883 اور 1885 میں کلکتہ میں دو اہم نیشنل کانفرنسوں کا اہتمام بھی کیا۔ البتہ کامیابی صرف اس کوشش کو ہی حاصل ہو سکی جو کہ Allan Octavian Hume کی تجویز پر شروع کی گئی تھی اور جس کے تحت زیادہ تر خود ساختہ قسم کے 72 مندوبین نے دسمبر 1885 میں بمبئی میں انڈین نیشنل کانگریس کے پہلے

اجلاس میں شرکت کی تھی۔

1888 میں ڈبلیو سی۔ بنرجی کے اس بیان سے کہ ہیوم نے یہ سلسلہ دراصل Dufferin کے مشورے پر شروع کیا تھا، ایک غیر ضروری بحث راہ پا گئی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اس طرح کی بات اصل میں کسی قدر اعتبار حاصل کرنے کی غرض سے بھی کہی جاتی تھی۔ کانگریس کی تاسیس سے متعلق اس تاویل کا جائزہ بعد میں افسروں کے نام ہیوم کی ان اپیلوں کی روشنی میں لیا گیا۔ جن میں یہ کہا گیا تھا کہ تشدد سے بچنے کے لیے تعلیم یافتہ ہندوستانیوں کے ساتھ رعایت برتی جائے۔ ہیوم جس تشدد کو ٹالنے کی بات کر رہا تھا وہ اس کی پیش گوئی کے مطابق کسی بھی وقت ہندوستان کو اپنی گرفت میں لے سکتا تھا۔ ان اپیلوں کے نتیجے میں ایک نظریہ وضع کر لیا گیا جو کانگریس کے بعد کے (آر۔ پی۔ دت جیسے) انقلابی نقادوں کے لیے کسی قدر اپیل رکھتا تھا۔ یہ کہا جاتا تھا کہ عوامی بے چینی کے سلسلے میں ایک حفظ ماتقدم (سیفٹی والو) کے طور پر کانگریس کی تشکیل برطانوی وائسرائے نے ایک سابق سول سرونٹ کے توسط سے کرائی۔ بہر حال ڈفرن کی نجی تحریروں کے سامنے آجانے کے بعد کانگریس کی تشکیل سے متعلق اس طرح کے "سازشی نظریے" کی قلعی پوری طرح کھل گئی ہے۔ ڈفرن کی ان نجی تحریروں سے پتہ چلتا ہے کہ کسی متوقع عوامی بے چینی کے سلسلے میں Hume کی وارننگ کو برطانیہ کے حکمراں حلقے میں کسی نے بھی قابل اعتبار نہیں سمجھا تھا۔ یہ درست ہے کہ ہیوم نے مئی 1885 میں شملہ میں ڈفرن سے ملاقات کی تھی مگر وائسرائے کا فوری اور اہم رد عمل یہ تھا کہ اس نے بمبئی کے اس گورنر کو مندوبین کے اس مجوزہ کنونشن سے دور رہنے کا مشورہ دیا تھا۔ (ڈفرن بنام Reay، 17 مئی 1885)۔ صورت حال جو بھی رہی ہو، واقعہ یہ ہے کہ اس سلسلے میں ہیوم کے تعلق سے مبالغہ آرائی سے کام لیا گیا ہے۔ ایک قومی تنظیم جیسی کسی چیز کی تشکیل کے آثار کافی پہلے پیدا ہو چکے تھے۔ ہیوم نے تو محض پہلے سے تیار ماحول سے فائدہ اٹھایا۔ اسے اس بات کا ضرور فائدہ پہونچا ہوگا کہ کسی طرح کی علاقائی وفاداری سے وابستہ نہ ہونے کی وجہ سے وہ ہندوستانیوں کے لیے نسبتاً زیادہ قابل قبول تھا۔ پھر یہ کہ سرکاری افسروں میں ہیوم کے اثر و رسوخ کی نوعیت کے معاملے میں خود ہندوستانی بھی شاید کسی قدر غلط فہمی میں تھے۔ اور خود ہیوم نے بھی اس تاثر کے ازالے کے لیے کچھ نہیں کیا تھا۔

اعتدال پسند کانگریس: مقاصد اور طریقہ کار

کانگریس کی تاریخ کا جائزہ لیتے وقت اس کے ابتدائی 20 برسوں کے اعتدال پسندانہ مرحلے کو ایک ہی طرز فکر، یکساں مقاصد اور یکساں طریقہ کار کا عہد تصور کرنے کی روایت سی ہو گئی ہے۔ ہر سال کے آخر میں کانگریس کا تین روزہ سالانہ اجلاس ہوتا تھا۔ جسے ایک بڑی سماجی تقریب کے

علاوہ ایک اہم سیاسی اجتماع کی حیثیت بھی حاصل ہوتی تھی۔ اجلاس میں صدر کا خطبہ اور دوسری تقریریں انگریزی میں ہوتی تھیں۔ ان کی ستائش کی جاتی اور پھر چند قرار دادیں منظور کرنے کے بعد اجلاس برخواست ہو جاتا تھا۔ ان قرار دادوں میں عام طور پر تین عام نوعیت کی، سیاسی، انتظامی اور معاشی شکایتوں کا تذکرہ ہوتا تھا۔ سب سے اہم مطالبہ سپریم کاؤنسل اور صوبائی قانون ساز کاؤنسلوں میں اصلاح کے ذریعے انھیں اور زیادہ اختیارات (بجٹ پر بحث اور تفصیل چاہنے) دینے اور مقامی عوامی اداروں، تجارتی ایوانوں اور یونیورسٹیوں کے نمائندوں کی شمولیت کے ذریعے انھیں اور زیادہ نمائندہ بنانے سے تعلق رکھتا تھا۔ اس طرح حکومت خود اختیاری یا جمہوریت کا مطالبہ ابھی بہت دور تھا۔ یہاں تک کہ 1905 میں گوکھلے نے اپنے صدارتی خطبے میں اس بات پر زور دیا تھا کہ یہ سیاسی مطالبات "پوری آبادی کے لیے نہیں بلکہ آبادی کے اس حصے کے سلسلے میں پیش کیے جا رہے ہیں جو کہ اس طرح کی تنظیم کی ذمہ داریوں کو ٹھیک ٹھاک نبھانے کے لیے تعلیم سے آراستہ ہو چکا ہے" بہرحال یہ امید بھی تھی کہ برطانیہ کی ہی طرح یہاں بھی آزادی مرحلہ وار طریقے پر آتی جائے گی۔ تا آنکہ ہندوستان کو اس موعودہ اور بعید سرزمین میں داخل ہو جائے جسے 1906 میں ناروجی نے کافی مبہم طریقے پر "برطانیہ یا اس کی نوآبادیوں جیسی حکومت خود اختیاری یا سوراج" کا نام دیا تھا۔ انتظامی اصلاحات کے سلسلے میں سب سے اہم مطالبہ آئی سی ایس کے امتحانات انگلینڈ اور ہندوستان میں بہ یک وقت کرا کر خدمات کا ہندوستانی روپ دینے (Indianisation) سے تعلق رکھتا تھا۔ جیسا کہ عام طور پر سمجھا جاتا ہے یہ مطالبہ اس چھوٹے سے اعلا طبقے کو مطمئن کرنے کی غرض سے نہیں پیش کیا گیا تھا جو آئی سی ایس میں شامل ہونے کا امیدوار تھا بلکہ اس مطالبے کا دائرہ اس سے کہیں زیادہ وسیع تھا۔ دراصل خدمات کو ہندوستانیانے کا مقصد نسلی امتیاز پر وار کرنا تھا۔ اس کے نتیجے میں دولت کے بہاؤ پر بھی روک لگائی جا سکتی تھی کیونکہ گوروں کو تنخواہوں اور پنشن کے طور پر جو بھاری رقم ملتی تھی اس کا بہت بڑا حصہ انگلینڈ بھیج دیا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ اس طرح انتظامیہ کو ہندوستانیوں کی ضرورتوں اور تقاضوں کے تئیں زیادہ جواب دہ بنایا جا سکتا تھا۔ دیگر انتظامی مطالبات میں، عدلیہ کی انتظامیہ سے علاحدگی، جیوری کے ذریعے مقدمات کی سماعت، آرمس ایکٹ کی واپسی، آرمی میں ہندوستانیوں کے لیے اعلا عہدے اور ایک ہندوستانی رضاکار دستے کی تشکیل کے مطالبے شامل تھے۔ ان مطالبات کے ساتھ ساتھ نسلی برابری اور شہری حقوق کے تحفظ کے لیے بھی اپیل کی جاتی تھی۔ جو بھی معاشی معاملات اٹھائے جاتے تھے وہ دولت کے بہاؤ کے نتیجے میں پیدا ہونے والی عام غربت سے تعلق رکھتے تھے۔ ہندوستان میں بڑھتی ہوئی غربت اور قحط سالیوں کے بارے میں تحقیقات کرانے، داخلی اخراجات اور فوجی اخراجات کم کرنے اور ہندوستانی صنعت کے فروغ کے لیے تکنیکی تعلیم کے لیے زیادہ فنڈ فراہم کرنے اور غیر

منصفانہ محصولات کو ختم کرنے پر زور دیا جاتا تھا۔ اور اس کے لیے بار بار قرار دادیں پاس کی جاتی تھیں۔ دوامی بندوبست میں توسیع کا مطالبہ بھی دولت کے بہاؤ سے ہی تعلق رکھتا تھا۔ کیونکہ اجناس کو برآمد کرنے کی غرض سے کسانوں سے ان کی پیداوار جبراً فروخت کرانے کے لیے غلے کی مصنوعی توفیر (Surplus) دکھائی جاتی تھی۔ کانگریس اپنے ابتدائی مرحلے میں صرف انگریزی تعلیم یافتہ پیشہ ور گروہوں، زمینداروں یا صنعت کاروں کے مفادات کی نگرانی تک ہی محدود نہیں تھی۔ اس بات کا اشارہ نمک محصول، بیرون ملک ہندوستانی مزدوروں کے ساتھ برتاؤ اور جنگلاتی بندوبست کی وجہ سے پیدا ہونے والے مصائب کے سلسلے میں اس کی متعدد قرار دادوں سے بھی ملتا ہے۔ جنگلات سے متعلق قوانین کے خلاف قرار دادیں 1891 اور 1895 کے دوران ہر سال پاس کی گئیں۔ مزید یہ کہ انڈین ایسوسی ایشن نے آسام کے چائے باغات میں ہندوستانی قلیوں کی حالت زار کے خلاف 1880 کی دہائی کے آخر میں زبردست مہم چھیڑی تھی اور اس ایسوسی ایشن کے اسسٹنٹ سکریٹری دوارکا ناتھ گنگولی نے آسام کے چائے باغات میں غلاموں جیسی زندگی گزارنے والے قلیوں کی بابت معلومات حاصل کرنے کی غرض سے زبردست خطرہ مول لیتے ہوئے ان علاقوں کا ذاتی طور پر دورہ بھی کیا تھا۔ بہر حال کانگریس نے اسے خالصتاً ایک مقامی نوعیت کا معاملہ قرار دے کر اپنے ایجنڈے میں شامل کرنے سے انکار کر دیا تھا۔

اعتدال پسند کانگریسیوں کے خلاف بڑھتی ہوئی نکتہ چینی یہ نہیں تھی کہ اُن کے مقاصد سے اختلاف تھا بلکہ یہ کہ ان کے طریقہ کار سے اختلاف تھا۔ اس صورت حال کی صحیح عکاسی نارو جی کے فقرے "غیر برطانوی حکومت" سے ہوتی ہے اور ابتدائی کانگریس نے اپنی ساری توجہ عرضیوں، تقریروں اور مضامین کے ذریعے ایک ایسا مدلل اور مکمل مقدمہ تیار کرنے پر مرکوز کر رکھی تھی جس کا مقصد برطانوی ہند کے گنتی کے افسروں کی بجائے Mill ،Cobden Bright اور Gladstone کی سرزمین کی آزاد خیال رائے عامہ کو اپنا ہم نوا بنانا تھا، بلکہ اس سیاست کو، جسے انتہا پسند لیڈر "دریوزہ گری" کے زمرے میں رکھتے تھے، وقفے وقفے سے بروئے کار لایا جاتا تھا۔ اعتدال پسند لیڈروں کے لیے سیاست محض ایک جز وقتی مشغلہ تھی۔ کانگریس سیاسی پارٹی نہیں تھی، بلکہ اس کی ساری سرگرمیاں سال میں تین دن تک محدود رہتی تھیں۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہ اس کے دو یا تین سکریٹری بھی ہوتے تھے اور جو مقامی انجمن تھیں، وہ زیادہ تر کاغذی ہی ہوتی تھیں اور ایسے چھوٹے چھوٹے گروہوں پر مشتمل ہوتی تھیں جن میں زیادہ تر قانون پیشہ لوگ ہوتے تھے۔ یہ لوگ کبھی کبھی جلسہ کر کے کانگریس کے سالانہ اجلاس میں شرکت کے لیے اپنے میں سے ہی مندوب چن لیا کرتے تھے یا کسی فوری نوعیت کی شکایت کے سلسلے میں قرار داد پاس کر لیا کرتے تھے، یا پھر لمبے عرصے کے لیے لاتعلقی کی دنیا میں چلے جاتے تھے۔

ان باتوں سے تو سبھی واقف ہیں، البتہ ان سے بھی زیادہ دلچسپ یہ سوال ہے کہ آخر ایسا کیوں ہوا؟ اس سوال کا جواب ابتدائی کانگریس کے لیڈروں اور دوسرے شرکاء کی ہیئت تشکیلی میں تلاش کیا جاسکتا ہے۔ اعتدال پسند لیڈر اپنی ذاتی زندگی میں انگریزی بود و باش رکھتے تھے اور اپنے اپنے پیشوں میں بہت کامیاب تھے۔ ان میں سے ایک گروپ انگریزوں کے تئیں بین بین رویہ رکھتا تھا، یعنی کچھ مخصوص پالیسیوں پر نکتہ چینی کرتا اور پھر عام ستائش کے ذریعے معاملے کو برابر کرنے کی کوشش بھی کرتا، بلکہ انگریزوں کی حکمرانی کو خداداد بھی سمجھتا تھا جبکہ دوسرے طبقے کے پاس سیاسی سرگرمیوں کے لیے وقت نہیں ہوتا تھا جیسا کہ واچا نے 18 نومبر 1887 کو ناروجی سے شکایت کرتے ہوئے لکھا تھا کہ "فیروز شاہ ان دنوں اپنے پیشہ جاتی کام میں بہت مصروف ہیں...... یہ لوگ پہلے ہی بہت دھن کما چکے ہیں...... مسٹر تلنگ بھی خوب مصروف ہیں...... میں نہیں سمجھ پارہا ہوں کہ اگر سبھی لوگ اس طرح سونا کمانے کی دھن میں لگے رہیں گے تو ملک کی ترقی کو کیسے آگے بڑھایا جاسکے گا"۔ کامیابی یقیناً اپنے ساتھ سہل انگاری بھی لاتی ہے۔ چنانچہ یہ خیال بن گیا تھا کہ صورت حال بتدریج بہتر ہوتی چلی جائے گی، کیونکہ 1892 کے کونسل ایکٹ جیسی کچھ مراعات بہرحال حاصل کی جاچکی تھیں۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ متعدد کانگریسی لیڈر بہت ہی اعلا طبقاتی طرز زندگی اختیار کر چکے تھے۔ (مثلاً مہتہ خصوصی ریلوے سلون میں ہی سفر کرتے تھے اور گاندھی کے بقول 1901 میں کلکتہ اجلاس میں Ghoshal نے اپنی قمیص کے بٹن گاندھی سے لگوائے تھے بلکہ خود راناڈے نے، جو کہ اس حد تک انگریزی طور طریق اختیار نہیں کر سکے تھے، 1886 میں شملہ کا سفر 25 خدام کے ساتھ کیا تھا)۔ اس کے نتیجے میں بسااوقات نچلے درجے کے لوگوں میں خوف آمیز حقارت کا احساس پیدا ہو جاتا تھا اور امن و قانون کے سلسلے میں انگریزوں پر انحصار بڑھ جاتا تھا۔ یہ انحصار 1890 کی دہائی کے احیاء پسندانہ جنون اور فرقہ وارانہ فسادات کی بدولت اور بھی یقیناً بڑھ گیا ہوگا۔ چنانچہ واچا نے اپنی ایک تصنیف Shells from the Sands of Bombay میں ذکر کیا ہے کہ 1857 کے باغیوں کو ذرا سی بھی انسانی دردمندی کے بغیر توپ دم کردیا گیا تھا۔ 1874 میں پارسی، مسلم تصادم کے دوران جس بھیڑ نے مہتہ پر حملہ کیا تھا۔ اسے انھوں نے "مسلم آبادی کے کنگال بدمعاشوں کی ٹولی" کا نام دیا تھا۔ 1887 میں اعتدال پسندی کی مہم کے دوران سریندر ناتھ نے نچلے طبقوں کے لوگوں کو بالکل کٹا ہوا پایا تھا اور 1896 میں ناگ پور میں اجناس لوٹ لینے والے بلوائیوں نے کانگریس کے ایک لیڈر کے مکان کو ہی اصل نشانہ بنایا تھا۔ کیونکہ وہ لیڈر زمیندار اور مہاجن بھی تھا۔ نئی تحقیق سے کانگریس کے ابتدائی دور کے پیشہ جاتی روشن خیال طبقے اور صاحب تمول گروپوں کے درمیان رابطوں کا انکشاف ہو رہا ہے۔ ان صاحب تمول گروپوں میں بمبئی کے چند صنعت کار، الہ آباد کے ٹنڈن گھرانے جیسے بڑے بڑے تاجر، زمیندار

اور پٹہ دار شامل تھے، اس طرح کے گروپ انقلابی نوعیت کے پروگراموں کی یا غیر پابند عوامی تحریکوں کی ہرگز تائید نہیں کر سکتے تھے۔

اعتدال پسندانہ سیاست کے مراحل

اب تک تو ہم مماثلتوں کی بات کرتے رہے ہیں، لیکن جدید تحقیق کے نتیجے میں اب مختلف ادوار میں اور مختلف علاقوں کے مابین کار فرما انحرافات (اختلافات) بھی سامنے آنے لگے ہیں۔ اگرچہ کانگریس کی قراردادوں کے بنیادی خطوط پہلے ہی جیسے برقرار رہے، 1892 اور 1902 کے درمیان کی مدت میں کاؤنسل اصلاحات پر اتنا زیادہ زور نہیں دیا گیا۔ مگر چند مراعات بہر حال حاصل کر لی گئی تھیں اور کانگریسی لیڈر نئی مقامی اور امپریل کاؤنسلوں کے لیے چنے جانے لگے تھے۔ بار بار کی قحط سالی اور کپاس پر عائد آب کاری محصول کے معاملہ کو معاشی امور میں بہر حال اہمیت حاصل رہی۔ 1901 میں بجٹ پر تقریر کرتے ہوئے گوکھلے نے امپریل لے جس لے ٹیو کاؤنسل میں پہلی بار قوم پرستانہ معاشی نظریے پر روشنی ڈالی اور پچندر کے مطابق دولت کے بہاؤ کے نظریے نے انقلابی طاقت کا کام کیا کیونکہ اس اہم سطح پر معاملات میں بہتری آنے کی بجائے خرابی بڑھتی جارہی تھی۔ ناروجی عمر رسیدہ ہو چکے تھے اور عمر کے ساتھساتھ ان کی انتہا پسندی بھی بڑھ رہی تھی بلکہ انھوں نے H.M. Hyndman جیسے چند برطانوی سوشلسٹوں کے ساتھ رابطہ بھی قائم کر لیا تھا۔ کاشت کار قبائل کے انتقال مکانی پر پابندی کے لیے پنجاب لینڈ ایکٹ (1901) جیسے اقدامات کے ذریعے کسانوں کو رجھانے اور (کانگریس کی مبینہ اعلا طبقاتی ذہنیت کے مقابلے پر) پدرانہ حکومت کا تصور پیدا کرنے کی انگریزوں کی کوشش نے بھی کانگریس کو زمینی تعلقات جیسے نازک اور حساس معاملے پر از سر نو غور کرنے کے لیے مجبور کر دیا تھا۔ اگرچہ پنجاب میں کانگریس کا کاروباری ذہنیت رکھنے والا شہری ہندو طبقہ اس ایکٹ کا سخت مخالف تھا مگر لاہور اجلاس (1900) نے اس سلسلے میں قرارداد پاس نہ کر کے اپنی طرف سے ایک اہم رعایت کا مظاہرہ کیا تھا۔ پھر یہ کہ دوامی بندوبست کے حق میں شروع کے تحریک پیش کرنے والوں نے اسے زمینداروں کے ساتھ کیے گئے بندوبست جیسا ہی قرار دینے کی کوشش کی تھی۔ 1890 کی دہائی کے آخر میں آر۔ سی دت۔ نے اس سلسلے میں ایک وسیع تر فارمولا تیار کیا تھا۔ 1899 کے اجلاس میں جس کی صدارت بھی انھوں نے ہی کی تھی، ایک قرارداد پاس کر کے رعیت واڑی علاقوں میں مال گزاری کے دوامی تعین اور زمینداری لگان کی حد طے کرنے کے لیے اپنا مطالبہ پیش کیا۔ اس ضمن میں MClane کے تفصیلی تجزیے سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ انگریزوں کی کسان نوازی محض ایک واہمہ تھی۔ مثال کے طور پر 1885 کے بنگال لگان ایکٹ میں زمینداروں کے حق میں کی جانے والی ترمیمات کی سربندار

ناتھ کی طرف سے مخالفت کے فوراً بعد ہی کاؤنسل کی ایک نشست میونسپلوں کے کوٹے سے زمینداروں کے کوٹے میں منتقل کر دی گئی تھی۔

کانگریس کی تنظیم اور سرگرمیوں کا جائزہ لیتے وقت اس کے اعتدال پسندانہ دور میں سرسری طریقے پر تین مراحل کی نشان دہی کی جاسکتی ہے۔ کانگریس پر 1892 تک، جنرل سکریٹری اور کل وقتی کارکن ہونے کے ناطے ہیوم کا ہی غلبہ رہا تھا۔ ہیوم چونکہ ایک سیمابی، حاکمانہ اور مربیانہ فطرت کے تھے، اس لیے ان کی موجودگی نے کانگریس کو کافی فعّال بنادیا تھا۔ کانگریس کے ابتدائی پانچ سالانہ اجلاسوں کے شرکاء کی تعداد میں تیزی سے اضافہ ہوتا گیا تھا، 1885 کے 72 کے مقابلے میں 1889 میں 2000 مندوبین نے شرکت کی تھی، واش بروک اور Bayly کے تفصیلی تجزیوں سے پتہ چلتا ہے کہ 1887 کے اجلاس (مدراس) اور 1888 کے اجلاس (الہ آباد) نہ صرف یہ کہ 1890 کی دہائی کی کانگریس کے مقابلے میں کہیں زیادہ وسیع پیمانے پر منعقد ہوئے تھے بلکہ ان اجلاسوں کے تئیں کافی دلچسپی بھی پیدا ہو گئی تھی۔ مثال کے طور پر مدراس کے اجلاس کے لیے فنڈ کی فراہمی عوامی چندے کے ذریعے کی گئی تھی جس میں 8000 لوگوں نے ایک آنہ سے ایک روپیہ آٹھ آنے تک چندہ دے کر 5500 روپے جمع کیے تھے جب کہ مزید آٹھ ہزار روپے دو روپے سے 30 روپے تک کے عوامی چندے کے ذریعے جمع ہوئے تھے۔ چونکہ الیکشن کے ذریعے چنی گئی کونسلوں اور خدمات میں امتحانات کے ذریعے بھرتی کے لیے کانگریس کے مطالبوں کی سید احمد خاں کی قیادت والے اتر پردیش کے پرانے طبقہ اعلاء (جن میں شروع شروع میں مہاراجہ بنارس جیسے ہندو اشرافیہ طبقے کے لوگ بھی شامل تھے) کی طرف سے مخالفت ہو رہی تھی۔ اس لیے ہیوم نے مسلمانوں کی تائید حاصل کرنے کے لیے 88-1887 میں اس سلسلے میں زور دار کوشش کی اور بدرالدین طیب جی کے ذاتی روابط سے بھی کام لیا۔ نیز (1887 کے اجلاس میں) ایک ایسا فارمولہ تیار کیا جس کی رو سے کسی بھی فرقے کی اکثریت کی طرف سے مخالفت ہونے پر کسی بھی قرارداد کو مسترد کیا جاسکتا تھا۔ اس سے بھی زیادہ اہم، کسانوں کو ہم نوا بنانے کی وہ کوشش تھی جو Hume کی پہل پر کی گئی تھی اور جس کے سلسلے میں دو مشہور پمفلٹ کم از کم 12 علاقائی زبانوں میں ترجمہ کر کے تقسیم کیے گئے تھے۔ خود ہیوم نے بھی ایک مفروضہ مکالمہ تحریر کیا تھا جس کے ذریعے گاؤں میں من مانے انتظامیہ پر روشنی ڈالی گئی تھی جب کہ ویرا گھوچاری نے تمل زبان میں سوال و جواب پر مبنی ایک تصنیف کے ذریعے موجودہ قانون ساز کونسلوں کو شرمناک قرار دیتے ہوئے ان پر سخت نکتہ چینی کی تھی۔ اس تصنیف کے 30 ہزار نسخے فروخت ہوئے تھے۔ اس طرح کی پھر کوئی کوشش 1905 تک نہیں کی گئی۔ جو کوشش کی گئی وہ نہ صرف بہت مختصر ثابت ہوئی بلکہ کوئی کامیابی بھی حاصل نہیں ہوئی۔ علی گڈھ مسلم اعلا طبقے کا اب بھی یہی خیال تھا کہ کونسلوں کے سلسلے میں

انتخاب کا طریقہ اپنائے جانے کی صورت میں انھیں نقصان ہوگا، کیونکہ اس طرح ان پر ہندوؤں کا غلبہ ہو جائے گا۔ اور یہ کہ انگریزی تعلیم میں سبقت کی وجہ سے ہندو مقابلہ جاتی بھرتی کے معاملے میں بھی فائدے میں رہیں گے، مسلمانوں میں علاحدگی پسندی کے رجحانات کو 1893 کے فسادات سے مزید تقویت ملی اور کانگریس کے اجلاسوں میں مسلم مندوبین کا تناسب 1885 اور 1892 کے درمیان 13.5 فی صد رہا تھا وہ 1893 اور 1905 کے درمیان گھٹ کر 7.1 فی صد رہ گیا تھا۔ واضح رہے کہ لکھنؤ اجلاس (1899) میں مقامی مسلم مندوبین کی بڑی تعداد (313) میں شرکت کی وجہ سے ہی یہ تناسب 7.1 فی صد تک پہونچ سکا تھا، جبکہ 1893 سے 1905 تک مسلم مندوبین کی کل تعداد 761 رہی تھی۔ بہر حال اس سلسلے میں کانگریسی لیڈروں کو کوئی تشویش نہیں تھی۔ کیونکہ اس وقت تک کوئی دوسری حریف مسلم سیاسی تنظیم نمودار نہیں ہوئی تھی۔ Teodore Beck کی محمڈن اینگلو اورینٹل ڈفنس ایسوسی ایشن (1893) زیادہ دنوں تک قائم نہیں رہ سکی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ 88-1887 کے بعد مسلمانوں کی رائے عامہ ہموار کرنے کے لیے کوئی خاص کوشش نہیں کی گئی تھی۔ کسانوں سے متعلق ہیوم کی وضع کردہ حکمت عملی کو سرکاری حلقوں کی ناراضگی سامنے آتے ہی ترک کر دیا گیا تھا، یوپی کے لفٹنٹ گورنر Auckland Colvin نے کانگریس کے الہ آباد اجلاس کے انعقاد میں رکاوٹ ڈالنے کی کوشش کی اور ڈفرن نے نومبر 1888 کی ایک مشہور تقریر میں کانگریس کے خلاف بولتے ہوئے اسے "ایک بہت چھوٹی سی اقلیت" قرار دیا تھا، بلاشبہ اس لیے کہ اس کے اور بھی چھوٹی اقلیت بن جانے کے کئی دوسرے آثار بھی تھے۔ زیادہ خوف زدہ قسم کی کانگریس قیادت نے نجی طور پر ہیوم کو جھڑک دیا تھا اور عوامی رابطے کے پروگرام کو ترک کر دیا گیا تھا۔

ہیوم مایوس ہو کر 1892 میں انگلینڈ روانہ ہو گئے مگر جاتے جاتے ایک گشتی مراسلہ بھی لکھ گئے جس میں جلد ہی کسی سیاسی انقلاب کو پیش گوئی کی گئی تھی (الا یہ کہ کانگریس مزید توانا ہو اور انگریز زیادہ جواب دہی کا مظاہرہ کریں)۔ سرکاری افسروں نے اسے ایک مفسدانہ مراسلہ بتایا اور دوسرے کانگریسی لیڈروں نے اس مراسلے سے لاتعلقی ظاہر کی۔ 1890 کی دہائی میں کانگریس عدم سرگرمی کا شکار رہی۔ تمام فیصلے وہ مٹھی بھر لوگ کرتے تھے جن میں سریندر ناتھ بنرجی۔ آنند چارلو اور فیروز شاہ مہتہ شامل تھے۔ اور راناڈے پس پردہ رہ کر بشیر کی حیثیت میں کام کرتے تھے۔ کانگریس میں اس وقت تک کوئی موثر قیادت نہیں ابھر سکی جب تک کہ 1899 سے مہتہ نے کانگریس کے معاملات میں زیادہ سرگرمی سے حصہ لینے کا فیصلہ نہیں کرلیا۔ انھوں نے کانگریس پر جلد ہی اپنا غلبہ قائم کر لیا۔ ہیوم اپنی غیر موجودگی میں بھی جنرل سکریٹری چنے جاتے رہے تھے کیونکہ ان کا کوئی قابل قبول متبادل نہیں تھا۔ یہ ان برسوں کی بات ہے جب ہندوستان میں حکومت

کی ناکامیوں کے سلسلے میں Wederburn نیز Hume اور ناروجی کی قیادت میں کانگریس کی برطانیہ کمیٹی نے انگلینڈ میں ایک مہم چھیڑ رکھی تھی۔ کانگریس کے حقیر فنڈ کا ایک بہت بڑا حصہ (سالانہ تقریباً 32000 روپے) کانگریس کی اس لندن کمیٹی کو بھیج دیا جاتا تھا۔ اگرچہ دن شاواچا 1895 سے کانگریس کے جوائنٹ سکریٹری بنا دیئے گئے تھے مگر ان کے لیے کم سے کم رقم مخصوص کی جاتی تھی۔ انگلینڈ میں بھی 1892 کے ایکٹ نیز آئی سی ایس کے امتحانات ہندوستان اور انگلینڈ میں ایک ساتھ کرائے جانے کی تجویز کی 1893 میں برطانوی دارالعوام کی طرف سے تائیدی قرارداد کی منظوری کے بعد جو امیدیں پیدا ہو گئی تھیں وہ خاص طور پر 1895 کے انتخابات میں ٹوری پارٹی کے پھر سے برسراقتدار آجانے اور ناروجی کے الیکشن ہار جانے کے بعد پھر ٹوٹ گئیں۔ اس اثناء میں ہندوستان میں کانگریس کے تئیں دلچسپی کم ہوتی جارہی تھی۔ اس کا اشارہ اس بات سے بھی ملتا ہے کہ کانگریس کے سالانہ اجلاس میں مقامی مندوبین کا تناسب بڑھتا جارہا تھا اور بیرونی مندوبین کا تناسب گھٹ رہا تھا۔ مثال کے طور پر 93-1885 کے دوران مقامی مندوبین کا تناسب 43.5 فی صد سے 59.6 فی صد تک رہا تھا۔ جو 1903-1894 کے درمیان بڑھ کر 64.7 سے 88.6 فی صد تک پہونچ گیا تھا۔ 1890 کی دہائی کے آخر میں انڈین ایسوسی ایشن، پونا سارو جنک سبھا، اور مدراس مہاجن سبھا جیسی مقامی یا علاقائی تنظیموں کی سرگرمیوں میں بھی انحطاط آگیا تھا۔ اعتدال پسند لیڈروں میں نئی روح پھونکنے کے لیے اسے شاید کرزن کی اشتعال انگیز پالیسیوں (جن کا مطالعہ اگلے باب میں کیا جائے گا) اور گوکھلے کی شکل میں ایک نئے رہنما کے عروج کا انتظار تھا۔ گوکھلے (فیروز شاہ مہتہ کی سال خوردہ شخصیت کے برخلاف) ایک دلچسپ شخصیت کے مالک تھے۔ ان میں جوانی کی امنگ تھی (وہ عمر میں تلک سے دس سال چھوٹے تھے) اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ کل وقتی عوامی خدمت کے لیے پوریلکن رکھتے تھے۔

انتہاپسندی کی جڑیں

اگرچہ کرزن کا نومبر 1900 کا یہ تجزیہ کہ "کانگریس اپنے زوال کی طرف آمادہ ہے۔" (کرزن بنام سکریٹری آف اسٹیٹ ہملٹن 18 نومبر 1900) بہت جلد غلط ثابت ہو گیا، مگر اس طرح کے تجزیئے کی وجہ بھی تھی اور وہ یہ کہ کانگریس کے اعتدال پسند لیڈر قوم پرستانہ جذبات کے ایک بہت چھوٹے حصے کی ہی ترجمانی کر پا رہے تھے۔ قحط سالیوں، بار بار کے طاعون، ملائی محصول اور کرزن کی جارحانہ پالیسیوں کی وجہ سے حکومت مخالف احساسات بڑھتے جارہے تھے۔ سیاسی سرگرمی کے لیے ماحول تیزی سے تیار ہو رہا تھا۔ مقامی زبانوں کے اخبارات کی اشاعت میں بھاری اضافہ ہو رہا تھا۔ ان اخبارات کی اشاعت 1885 میں 2.99.000 تھی جو 1905 میں 8.17.000 تک پہنچ گئی تھی۔ اہم

بات یہ تھی کہ سب سے زیادہ مقبول اخبارات وہ تھے جو مختلف اسباب کے تحت کانگریس کو اپنی نکتہ چینیوں کا ہدف بناتے تھے۔ ان میں کلکتہ سے شائع ہونے والا بنگ باسی اور کیسری اور پونا سے شائع ہونے والا کل قابل ذکر ہیں۔ گویا کہ اس طرح انتہا پسندی کا خمیر پوری طرح تیار ہو چکا تھا۔

حالیہ برسوں میں کیمبرج مکتب فکر کے مورخین کی کوشش انتہا پسندانہ ناراضگی کو، کانگریس پر کنٹرول کے لیے "اندر" اور "باہر" کے حریف گروپوں کے درمیان چپقلش کی شکل میں پیش کرنے کی رہی ہے۔ بلا شبہ 1890 کی دہائی کے دوران کانگریس میں گروپ بندی کی کوئی کمی بھی نہیں تھی۔ بنگال میں موتی لال گھوش کے امرت بازار پتریکا کے ساتھ سریندر ناتھ اور ان کے اخبار بنگالی کی لڑائی اس وقت سے چل رہی تھی جب سے کہ آخر الذکر کی انڈین ایسو سی ایشن 76-1875 میں انڈین لیگ پر غالب آگئی تھی۔ یہ گروپ بندی پنجاب میں تو اور بھی نمایاں تھی۔ چنانچہ لاہور براہمو سماج میں تین گروپ تھے۔ آریہ سماجیوں میں بھی پھوٹ پڑ چکی تھی اور لالہ ہری کرشن لال اور لالہ لاجپت رائے کے درمیان بھی ٹکراؤ چل رہا تھا۔ واش بروک نے مدراس کی سیاست کا تجزیہ 1880 کی دہائی کے وی بھاشیم آینگر اور ایس سبرامنیم آینگر نیز ان کے بعد وی کرشنا سوامی ایر پر مشتمل "اندر کے میلاپور گروپ، مدراس کے بی سی سنکرن نائر اور کستوری رنگا آینگر پر مشتمل اگمور حریفوں، نیز ساحلی آندھرا کے ٹی۔ پرکاسم اور کرشنا راؤ یا ٹوٹی کورن کے چدمبرم پلائی پر مشتمل 'باہر' کے مفصل گروپ کے مابین سہ فریقی ٹکراؤ کے تناظر میں کرنے کی کوشش کی ہے۔ چدمبرم پلائی گروپ نے 1905 کے بعد مدراس انتہا پسندی کی تشکیل کے لیے ایگمور (Egmore) کے سیاست دانوں کے ساتھ اتحاد قائم کر لیا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ پونا میں بھی 1880 کے آخر میں اگرکر اور گوکھلے کے ساتھ تلک کی لڑائی دکن ایجوکیشن سوسائٹی پر کنٹرول کے معاملے کو لے کر تھی اور شروع شروع میں سیاسی اختلافات یا سماجی اصلاح کے امور سے اس کا بہت کم تعلق تھا۔

قوم پرستوں کے اندر پیدا ہونے والے ٹکراؤ کو غیر مجسم آدرشوں سے متعلق تنازعات کی شکل میں پیش کرنے کے سابقہ رجحان کے تناظر میں گروپ بندی سے متعلق بھی اس طرح کا تجزیہ کافی افادیت رکھتا ہے۔ مگر یہ بھی واقعہ ہے کہ کیمبرج مورخین نے اس پر ضرورت سے زیادہ زور دیا ہے۔ یہ سمجھنا مشکل ہے کہ یہ حریف گروپ کانگریس پر غلبے کے لیے اتنا بے چین کیوں تھے، کیونکہ کانگریس نہ تو اس وقت تک ایک باقاعدہ سیاسی پارٹی تھی اور نہ ہی وہ کسی کی سیاسی سرپرستی کرنے کی پوزیشن میں تھی بلکہ اس کی حیثیت ایک سالانہ پلیٹ فارم سے زیادہ نہیں تھی اور اس کے وسائل بھی ناکافی تھے۔ تاوقتیکہ ان گروپوں کے کچھ مخصوص آدرش رہے ہوں گے یا ان کی کوئی

مخصوص حکمت عملی رہی ہوگی جسے وہ آگے لانا چاہتے ہوں گے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ اس طرح کی تحقیق میں اعتدال پسندانہ سیاست کی سائنٹیفک اور منصفانہ تنقید کو نظر انداز کر جانے کی خامی ہے۔ یعنی وہ اعتدال پسند سیاست جو کہ 1890 کی دہائی میں بعد کی انتہا پسندی کے تین بڑے مرکزوں بنگال، پنجاب اور مہاراشٹر میں ابھر رہی تھی۔

برطانوی رائے عامہ سے کانگریس کی گداگرانہ اپیل کی وجہ سے جو کہ لاحاصل اور ہتک آمیز سمجھی جاتی تھی اور محض انگریزی تعلیم یافتہ چھوٹے سے اعلا طبقے کی ایک ایسی جماعت ہونے کی وجہ سے جس کا عوام سے کوئی تعلق نہ ہو، کانگریس پر جو دو نکاتی تنقید کی جارہی تھی وہ اس نئے اپروچ(Approach) کا نقطۂ آغاز تھی۔ دعاؤں اور عرضیوں کی جگہ خود انحصاری اور تعمیری کام نے لے لی تھی۔ سودیشی کاروبار شروع کرنے، قومی تعلیم کا سلسلہ شروع کرنے اور گاؤں میں پختہ کام کی ضرورت پر زور دیا جانے لگا تھا۔ اپنی مدد آپ، مقامی زبان کے اخباروں کے استعمال، گاؤں کے میلے ٹھیلے جیسے عوامی اور روایتی طریقوں اور اداروں سے کام لینے اور ہندو احیاء پسندی کو ابھارنے جیسے کاموں کو تعلیم یافتہ طبقوں اور عوام کے درمیان خلیج کو پر کرنے کا وسیلہ سمجھا جانے لگا تھا۔

اعتدال پسندانہ احتجاج کے خلاف ردعمل بالآخر ایسی تین شکلوں میں سامنے آیا۔ جن کا باہمی امتیاز 1905 میں سامنے آیا جبکہ ان کا بیج 1890 کی دہائی میں ہی پڑ چکا تھا اور جسے تعمیری کاموں کے ذریعے خود تعمیری کی سمت میں غیر سیاسی رجحان کا نام دیا جا سکتا ہے جس میں غیر ملکی حکومت کو نشانہ بنانے کی بجائے، اُسے نظر انداز کر دینے اور ایسی نئی تکنیکوں کے ذریعے عوام کو سوراج کے لیے متحرک کرنے پر زور دیا گیا جنھیں متحملانہ مزاحمت، اور انقلابی دہشت گردی کا نام دیا گیا جن کا مقصد انفرادی تشدد اور سازشوں کے مختصر راستے سے آزادی کی منزل تک پہونچنا تھا۔

اعتدال پسندانہ سیاست پر پہلی باقاعدہ تنقید 94-1893 میں اربندو گھوش نے اپنے سلسلۂ مضامین New Lamps for Old کے ذریعے کی تھی۔ اس وقت گھوش بڑودا میں قیام پذیر تھے اور انتہائی انگریزی ماحول میں پرورش پانے کے بعد انگلینڈ سے لوٹے تھے۔ جس کے خلاف ان کے اندر سخت ردعمل ہو رہا تھا۔ اربندو گھوش نے ست رفتار آئینی پیش رفت کے اس انگریزی ماڈل کو مسترد کر دیا تھا جس کی کہ اعتدال پسند لیڈر ستائش کر چکے تھے۔ انھوں نے کانگریس کے گداگرانہ رویے کو بھی ہدف بنایا اور اپنے یوروپ کے تجربے کی روشنی میں طبقاتی تصور پر مبنی نوٹ تیار کر کے بورژوائی متوسط طبقے (جن کی کانگریس نمائندگی کرتی تھی) اور پرولتاری طبقات کے درمیان روابط کے لیے اپیل کی۔ مگر گھوش کے نزدیک پرولتاری سے مراد قصبات اور دیہات کے عام لوگ تھے۔ صدی کے خاتمے کے قریب اربندو خفیہ سوسائیٹیاں قائم کرنے اور جیتندر ناتھ بنرجی اور بیرندر کمار گھوش کو اپنے ایلچی کی حیثیت میں بنگال بھیجنے کی کوشش کر رہے تھے۔ جب بنگال کی تقسیم کے

خلاف عوامی ہیجان تھوڑے سے عرصہ کے لیے ایک بڑی تحریک کی شکل اختیار کرتا ہوا محسوس ہونے لگا تھا تو وہ عوامی متحملانہ مزاحمت کا ایک پروگرام تیار کرنے کا ارادہ کر رہے تھے۔

ہم دوسرے انتہاپسند لیڈروں میں بھی اس طرح کے سیمابی رویے کی نشان دہی کر سکتے ہیں۔

بنگال میں کانگریس کا بھرم ٹوٹ جانے کا اظہار اشونی کمار دت نے کیا اور کانگریس کے امراوتی اجلاس (1897) کو ایک تین دن کا تماشا بتایا۔ دت باریسال کے ایک اسکول ٹیچر تھے اور اپنے ضلع میں زندگی بھر خاموشی کے ساتھ خدمت خلق میں مصروف رہے تھے۔ جس کے نتیجے میں ان کے حامیوں کا ایک بہت بڑا حلقہ پیدا ہو گیا تھا۔ 1905 کے زمانے میں انھوں نے اپنے علاقے کو سودیشی تحریک کا ایک بڑا اور مضبوط گڑھ بنا دیا تھا۔ کانگریس کا سراب ختم ہو جانے کا اظہار ہمیں رابندر ناتھ ٹیگور کے یہاں بھی ملتا ہے۔ ٹیگور نہ صرف اسی وقت ہی بنگال کی ایک سرکردہ شخصیت تھے بلکہ بعد کے پچاس برسوں تک بھی ان کی یہ حیثیت برقرار رہی تھی۔ وہ نہ صرف یہ کہ اپنی ساحرانہ نظموں اور کہانیوں میں بنگال کے دیہی علاقوں کے حسن و خوبصورتی اور لوگوں کی زندگی کی عکاسی کے ذریعے بلکہ کانگریس کی گداگرانہ سیاست کی نکتہ چینی کر کے بھی وطن پرستی کے جذبات ابھار رہے تھے۔ انھوں نے سودیشی کاروبار اور قوم پرستانہ تعلیم کے ذریعے آتم سکتی (خودانحصاری) کے لیے بار بار اپیل کی اور میلوں، جاتراؤں (یاتراؤں) کے ذریعے نیز تعلیم اور سیاسی معاملات میں مادری زبان کے استعمال کے ذریعے عوامی رابطوں کے قیام کے لیے ٹھوس تجویزیں بھی پیش کیں۔ بیسویں صدی کے ابتدائی برسوں میں ویکانند کے پیغام کو ان کی آئرش شاگردہ سسٹر نویدتیا (مارگریٹ نوبل) نے آئرلینڈ نیز یورپ کے دوسرے ملکوں کی انقلابی تحریکوں کے سلسلے میں اپنے تجربات کی روشنی میں سیاسی رنگ دینا شروع کر دیا تھا۔ بنگالی بھدرلوک بھی اب سودیشی صنعتی کاروبار کی طرف راغب ہو رہا تھا۔ مثال کے طور پر سائنس داں پرفل چندر رائے نے 1893 میں اپنا کارخانہ بنگال کیمکلو، قائم کر لیا تھا اور ستیش مکھرجی اپنی ڈان سوسائٹی کے وسیلے سے اور رابندر ناتھ ٹیگور اپنے شانتی نکیتن آشرم کے وسیلے سے ملکی کنٹرول میں نئی تعلیم کا تجربہ کر رہے تھے۔ ان تمام باتوں سے سریندر ناتھ اور موتی لال گھوش کی گروپ بندی سے کہیں زیادہ بنگال کی انتہاپسندی کو تقویت ملی۔

پنجاب میں ہری کرشن لال (جنھوں نے پنجاب نیشنل بنک کی بنیاد رکھی تھی) اور کالج گروپ کے آریہ سماجی؛ یعنی دونوں ہی 1890 کی دہائی سے سودیشی کاروبار میں سرگرم تھے۔ کانگریس کے پنجابی لیڈروں نے 1893 سے ہی ایک باقاعدہ دستور پر زور دینا شروع کر دیا تھا تاکہ بنگال اور بمبئی کے لیڈروں کے گٹھ جوڑ کی طاقت کو کم کیا جا سکے جس نے تنظیم پر اپنا غلبہ قائم کر رکھا تھا۔ یہ لوگ 1899 کے اجلاس میں ایک مستقل نوعیت کی انڈین کانگریس کمیٹی کی تشکیل کرانے

میں کامیاب ہو گئے مگر اسے دو سال بعد ہی فیروز شاہ مہتہ گروپ نے بے اثر کر دیا تھا۔ 1901 میں کائستھ سماچار میں اپنے دو مضامین کے ذریعے لالہ لاجپت رائے نے انگریزی تعلیم یافتہ اعلا طبقہ سے ایک "سالانہ جشن" کی جگہ پر تکنیکی تعلیم اور صنعتی امداد باہم کی پرزور وکالت کی۔ ان کا یہ بھی کہنا تھا کہ کانگریس کو کھلم کھلا اور پامردی کے ساتھ صرف ہندوؤں پر ہی انحصار کرنا چاہیے، کیونکہ ان کے خیال میں مسلمانوں کے ساتھ کسی طرح کا اتحاد محض سراب تھا۔ اس طرح انتہاپسندانہ افکار اور ان کی حدود واضح ہو جاتی ہیں۔

جس شخص نے صحیح معنوں میں انتہاپسندی کی روشن لکیر قائم کی وہ مہاراشٹر کے بال گنگادھر تلک تھے۔ تلک کئی معاملوں؛ مذہبی قدامت پرستی کو عوامی رابطے کے وسیلے کے طور پر استعمال کرنے (مثلاً سن بلوغ تنازعہ کے سلسلے میں اصلاح پسندوں کے خلاف صف آرائی اور پھر 1894 سے گن پتی اتسو کا اہتمام)، قوم پرستی کی ایک مرکزی علامت کے طور پر وطن پرستانہ نیز تاریخی فرقے کی تشکیل (مثلاً شیواجی اتسو، جس کا تلک نے 1898 سے اہتمام کیا تھا) اور 97-1896 میں لگان روک لینے کی مہم؛ جیسے تجربات کے نقیب تھے۔ کپاس پر 1896 کے تلافی محصول کے خلاف مغربی ہند میں شدید رد عمل ہوا۔ جس پر تلک نے بائیکاٹ جیسی تحریک کی بنیاد قائم کرنے کی کوشش کی۔ یہ ایک ایسے طریقہ کار کا پہلا تجربہ تھا جو قوم پرستی کی تحریک میں مرکزی طریقہ کار کی حیثیت اختیار کرنے والا تھا۔ تلک کا واضح طور پر یہ کہنا تھا کہ اگر ہم مینڈک کی طرح سال میں صرف ایک بار ہی ٹرٹراتے رہیں گے تو ہم کوئی بھی کامیابی حاصل نہیں کر سکیں گے۔" جس کا مطلب یہ تھا کہ وہ اپنا راستہ عوامی تحملانہ مزاحمت یا سول نافرمانی کی طرف لے جا رہے تھے۔ 1902 کی ایک تقریر میں انھوں نے یہ اعلان کیا کہ "کچلا ہوا اور پس ماندہ ہوتے ہوئے بھی آپ کو اپنی اس طاقت کا احساس ہونا چاہیے کہ آپ جب چاہیں انتظامیہ کو مفلوج کر سکتے ہیں"۔ "یہ آپ ہی لوگ ہیں جو ریل، سڑک اور ٹیلی گراف جیسے محکموں کی دیکھ ریکھ کرتے ہیں۔ یہ آپ ہی لوگ ہیں جو حکومت کے کاموں کا بندوبست کرتے ہیں اور مالیہ وصول کرتے ہیں"۔

1905 میں عوامی اقدام کے امکانات سامنے آنے سے پہلے (اور کسی حد تک بعد میں بھی) اعتدال پسندانہ طریقہ کار پر رد عمل انفرادی تشدد کے نعرے کی شکل میں سامنے آتا تھا۔ آئینی طریقہ احتجاج اور انتہاپسندی میں بعد المشرقین تھا، مگر یہ دونوں طریقہ کار اعلا طبقے کے اقدام کی وجہ سے ہم رشتہ بھی تھے، گویا کہ ایک طریقہ کار سے دوسرے طریقہ کی طرف منتقلی بہت آسان، سماجی لحاظ سے حقیقی اور عوامی اقدام کے مقابلے میں نسبتہً کم خطرناک بھی تھی۔ چنانچہ 1897 میں پونا میں پھوٹ پڑنے والے طاعون کے معاملے میں انگریزوں کے نکمے پن کی وجہ سے جو جذبات برانگیختہ ہو گئے تھے وہ کسی موثر عوامی اقدام پر منتج نہیں ہوئے بلکہ انقلابی دہشت گردی کی

شکل اختیار کر گئے تھے۔ چاپیکر (Chapekar) برادرز کے ہاتھوں Rand اور Ayerst کا قتل اس کی واضح مثال ہے۔ دامودر چاپیکر کی خود نوشت سے وطن پرستی کے جذبہ (انھوں نے بچپن میں ٹرین کے سفر کے دوران مغربی گھاٹ کے علاقوں سے گزرتے ہوئے چھاپہ مار جنگ کا خواب دیکھا تھا)، براہمنی احیاء پسندی اور سماجی اصلاح پسندوں کے تئیں نفرت کے جذبات باہم گڈمڈ ہو جانے کا پتہ چلتا ہے۔ اصلاح سفیدوں سے ان کی نفرت کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ سابق الذکر بہت کامیاب اشخاص تھے جبکہ وہ خود نچلے متوسط طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ انگریزوں نے تلک پر غداری کا الزام لگایا جس کی بڑی وجہ کیسری کا وہ مضمون تھا جس میں شیواجی کے ذریعے بیجاپور کے جنرل افضل خاں کے قتل کو حق بجانب قرار دیا گیا تھا۔ انھیں دو سال قید رکھا گیا جس پر کانگریس سے وابستہ سبھی لوگوں نے احتجاج کیا، انھوں نے بھی جو تلک کو پسند نہیں کرتے تھے، کیونکہ سبھی کے خیال میں اصل معاملہ شہری حقوق اور اخبارات کی آزادی کا تھا۔

مہاراشٹر کی سیاست میں جس تیزی سے ابال آیا تھا اسی تیزی سے اس میں اتار بھی آگیا تھا۔ اس میں دوبارہ جان 1905 میں بنگال کی تقسیم کی شکل میں کرزن کی حماقت کے بعد پڑی۔ مگر اس طرح کہ اس مرتبہ ہندوستان کا ایک بہت بڑا حصہ متاثر ہوا۔

باب چار

سیاسی اور سماجی تحریکیں: 1905-1917

کرزن کی وائسرائیت

کرزن کا دور حکومت مشہور بھی رہا ہے اور بدنام بھی، کیونکہ یہ شدید سرگرمیوں اور کارکردگی کے متنوع طریقوں کا دور ثابت ہوا۔ وائسرائے نے 1904 کی بجٹ تقریر میں یہ کہا تھا کہ "میرے خیال میں حکومت کی کارکردگی کا مطلب رعایا کو قابو میں رکھنا ہے"۔ اس پالیسی کا نتیجہ ہندوستان کی قوم پرستی کی تاریخ میں بنگال کی تقسیم کے خلاف جدو جہد کی شکل میں ایک نئے مرحلے کے آغاز کے طور پر سامنے آیا۔

بپن چندر پال کے جریدے New India میں کرزن کی پالیسیوں کے سلسلے میں اس عہد کا تجزیہ اس طرح ملتا ہے "Ripon کا آئیڈیل ہندوستانی عوام کے لیے خود مختاری کو تدریجی اور مرحلہ وار طریقے پر یقینی بنانا تھا جبکہ لارڈ کرزن کا آئیڈیل ہندوستانی حکومت کے لیے خود مختاری یقینی بنانے کا ہے"۔ (20 اگست 1903)۔ دو سال بعد اسی جریدے میں عوام کی خیرسگالی حاصل کرنے نیز عوام الناس اور تعلیم یافتہ متوسط طبقے کے درمیان کسی طاقت ور اتحاد کی روک تھام کے لیے کرزن کی کوششوں کا ذکر بھی ملتا ہے (15 جولائی 1905)۔ یہاں ہمارے سامنے پدرانہ استبداد کی وہ حقیقی شکل سامنے آتی ہے جس سے Ripon کی بابت اختیار کی گئی مبالغہ آرائی کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ یہ پدرانہ استبداد نہ صرف یہ کہ ٹوری روایت کا ایک حصہ تھا بلکہ اب کہیں زیادہ جارحانہ شکل اختیار کر چکا تھا۔ اس سے سکریٹری آف اسٹیٹ بلکہ پوری کابینہ کو وائسرائے کے اشاروں پر نچانے کی نسبتاً کم کوشش کا پتہ چلتا ہے۔

خارجہ پالیسی

کرزن نے ہندوستان میں رہتے ہوئے برطانیہ کی پالیسیوں پر اثر انداز ہونے کی کوشش کی جس کا نمایاں اظہار غیر ملکی تعلقات کے میدان میں ہوتا ہے۔ کرزن کی حد سے زیادہ روس ترسی نے حکومت برطانیہ کو پریشان کر دیا تھا جو کہ پہلے سے ہی کچھ ایسے مبہم قسم کے قدم اٹھاتی آرہی تھی جن کے نتیجے میں 1857 میں انگلینڈ، فرانس اور روس کے درمیان ایک صلح نامہ عمل میں آیا تھا۔ وائس رائے کی طرف سے بار بار یہ خواہش ظاہر کی جارہی تھی کہ خلیج فارس اور سیستان میں بھی انگریزوں کو اپنے مفادات قایم کرنے چاہئیں۔ برطانوی حکومت کافی پس و پیش کے بعد

مونرو نظریہ (Monroe Doctorine) کی طرز پر خلیج فارس کے سلسلے میں ایک ایسا اعلان جاری کرنے کے لیے تیار ہو گئی تھی جس میں دوسری طاقتوں کو خبردار کیا گیا تھا (مئی 1903) اور علاقے میں خود کرزن کے ذریعے جھنڈا لہرانے کی اجازت بھی دیدی گئی تھی۔ کویت اور بحرین تک برطانوی اثرات کی توسیع بیسویں صدی میں تیل کی سیاست کے لحاظ سے بہت اہم ثابت ہوئی۔ جب افغانستان کے نئے امیر حبیب اللہ نے وائسرائے کی خواہش کے برخلاف ڈیورنڈ سرحد کو تسلیم نہ کرتے ہوئے ہتھیاروں کے سلسلے میں برطانوی امدادی رقم کی ادائیگی پر اصرار کیا تو کرزن نے قندھار کے سلسلے میں ایک تجویز پیش کردی۔ اس پر خطرے کی بو محسوس کرتے ہوئے جوزف چیمبرلین نے یہ درخواست کی کہ 'خدا کے لیے کرزن کو وہاں ہمارے لیے کوئی نئی مصیبت پیدا نہ کرنے دیجئے۔' چیمبرلین کا یہ بھی کہنا تھا "ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ اسی بات نے ڈیزرائیلی (Disraeli) کی حکومت کو ختم کردیا تھا۔ 1904 میں جو لوئیس ڈین مشن کابل گیا تھا وہ بالآخر پرانے معاہدوں کے توثیق کے بعد لوٹا تھا۔ کرزن کو اس سے زیادہ کامیابی تبت میں حاصل ہوئی جہاں اس نے زار کے ساتھ تبتی سیلانی ڈورجیف کی ملاقات کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنا مقصد حاصل کرنے کی کوشش کی۔ کابینہ کی طرف سے بار بار کی وارننگ کو نظر انداز کرتے ہوئے ینگ ہسبنڈ (Young Rusband) مہم (1903-04) ہمالہ تک جاپہونچی۔ اگرچہ لہاسہ میں روسیوں کی موجودگی کے سلسلے میں اس مہم کو جو واحد شہادت مل پائی تھی وہ محض ڈورا گفلیں تھیں مگر اس نے اس کے لیے بھاری تاوان اور چمبی وادی (Chumbi) پر 75 سال کے لیے تسلط پر اصرار کیا۔ بندوق کے زور پر ایک تجارتی معاہدے پر دستخط کرائے گئے۔ بہرحال کابینہ نے تاوان کی رقم اور وادی چمبی پر تسلط کی مدت کم کردی تھی۔

انتظامی اصلاحات

انتظامی لال فیتہ شاہی کے اخراجات میں تخفیف کے ذریعے کارکردگی میں بہتری لانے کی کوشش بڑے بڑے دعووں کے ساتھ شروع کی گئی تاہم تقریباً اسی عہد میں لکھی گئی L. Fraser کی انتہائی خوشامدانہ سوانح حیات میں یہ اعتراف ملتا ہے کہ کرزن کے زمانے میں دفتری اسٹیشنری کے اخراجات میں ہی دوگناہ اضافہ ہو گیا تھا۔ کرزن نے سرکاری روئدادوں اور نجی نوعیت کے مکتوبات میں ماتحت سرکاری عملے کے بارے میں جابجا جو سخت رائے ظاہر کی ہے، انھیں پڑھ کر آج کے مورخین کو بہت لطف ملتا ہے (مثال کے طور پر وہ "دفتری ذہنیت" کے خلاف ایک بار اس طرح پھٹ پڑا تھا۔ "چکر پہ چکر، یعنی زمین کی روز کی گردش کی طرح یہ فائل بھی برابر گردش میں ہی رہتی ہے۔" اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں کہ ہند میں قیام کے دوران کرزن کے ارد گرد

(افریقہ میں (Milner) کے بر خلاف) فرض شناس افسروں کا کوئی حلقہ پروان نہیں چڑھ سکا تھا۔ اور یہ کہ اس نے وائسرائے کی مجلس عاملہ (Executive) میں ملٹری سپلائی ممبر کی حیثیت اور انتخاب کے سلسلے میں Kitchner کے ساتھ ایک معمولی سے تنازعے پر ہی اگست 1905 میں استعفیٰ دیدیا تھا۔ کرزن معمولی معمولی بات پر جھگڑ بیٹھتا تھا۔ اس بات کی تصدیق اس کے اس اصرار سے بھی ہوتی ہے کہ ہندوستان کے دیسی حکمرانوں کو اپنے غیر ملکی سفر کی پیشگی اجازت لینی چاہیے۔ بڑودہ کے گائیکواڑ مہاراجہ نے آر۔ سی۔ دت کو اپنے یہاں ملازمت دے کر وائسرائے کو پہلے ہی سے ناراض کر رکھا تھا۔ وہ اس طرح کی پیشگی اجازت کے بغیر ہی ولایت چلے گئے جس کا خمیازہ کلکتہ کو بھگتنا پڑا تھا۔

کرزن انتظامیہ کی خوش نصیبی یہ تھی کہ اس کی ابتداء ایسے وقت میں ہوئی تھی جب بار بار کی قحط سالی کا سلسلہ ختم ہونے جارہا تھا؛ آخری قحط 1900-1899 میں پڑا تھا (حالانکہ طاعون کا سلسلہ جاری رہا تھا۔ جس میں سالانہ شرح اموات 1904 میں دس لاکھ تک پہونچ گئی تھی) نیز یہ کہ اس وقت بجٹ خسارے کی بجائے توفیر (Surplus) کی حالت میں تھا۔ نجی طور پر سکے کی ڈھلائی کا سلسلہ بند ہو جانے کے بعد چاندی کے سکے (روپے) کی قدر میں کمی کا سلسلہ رک گیا تھا اور 1890 کی دہائی کے آخر میں سونے کو زر مبادلہ کی حیثیت حاصل ہو گئی تھی۔ روپے کی قدر میں کمی کی وجہ سے ہوم اخراجات کا جو بار اب تک بڑھتا جارہا تھا۔ اس میں بڑھوتری کا سلسلہ بھی رک گیا تھا۔ جس کے نتیجے میں چند ٹیکس مراعات ممکن ہو گئی تھیں۔ مال گزاری کی ادائیگی 1900-1899 کے قحط کے بعد کرائی گئی (اگرچہ کرزن دوامی بندوبست کے لیے کانگریس کی اپیلوں کو بار بار مسترد کرتا رہا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ قحط کے لیے موسم ذمہ دار ہے نہ کہ زیادہ محصولات) نمک محصول میں کمی کر دی گئی اور انکم ٹیکس کی حد 04-1903 میں سالانہ 500 روپے سے بڑھا کر 1000 کر دی گئی۔ حکومت نے ریلوے کے کام کو بھی آگے بڑھایا۔ ریلوے بورڈ تشکیل دیا گیا اور 6100 میل لمبی نئی ریلوے لائن بچھائی گئی (جو کہ کسی بھی وائسرائے کے دور کا سب سے بڑا توسیعی کام تھا) اور 03-1901 کے آب پاشی کمیشن کی تشکیل کے ذریعے آب پاشی سہولیات پر زیادہ سے زیادہ توجہ دی گئی۔ معاشی امور میں کرزن کی دلچسپی کا اندازہ اس بات سے بھی ہوتا ہے کہ اُس نے 1905 میں کامرس اینڈ انڈسٹری کا محکمہ اور زرعی تحقیق کے لیے پوسا میں انسٹی ٹیوٹ قائم کیا۔ یہ درست ہے کہ اس طرح کے اقدامات کا زیادہ فائدہ گوروں کو ہی یا پھر ہندوستانیوں کے ایک چیدہ طبقے کو ہی پہونچا۔ کیونکہ ریل کے کام کو آگے بڑھانے کا مطلب تھا انگلینڈ اور ہندوستان کی برطانوی فرموں کے لیے انجیرنگ کے کام کا زیادہ سے زیادہ ٹھیکہ! ہندوستان میں ٹیکس دہندگان کی بھی بیشتر تعداد گوروں پر ہی مشتمل تھی جبکہ ۱۸۹۹ میں یورپ کی چقندر کی چینی پر ٹیکس لگا کر آزاد تجارت کی پالیسی سے جوا

نحراف کیا گیا تھا، اس سے بھی ماریشس کے چقندر کی کاشت کرنے والوں اور کان پور کی Begg Sutherland and company چینی فیکٹریوں کو ہی فائدہ پہونچا۔ کرزن کی "سرپرستانہ ذہنیت" کا اندازہ 1901 کے پنجاب لینڈ ایکٹ سے بھی ہوتا ہے جس کی رو سے کسانوں کی جائیداد کو شہری مہاجنوں کے نام منتقل کرنے پر بندش لگادی گئی تھی۔ اسی طرح زرعی طبقوں کے لیے کوآپریٹو کریڈٹ سوسائٹیوں کو فروغ دینے کے لیے 1904 میں قانون بنایا گیا تھا۔ 1901 کے پنجاب لینڈ ایکٹ سے قوم پرستوں کو پریشانی محسوس ہوئی کیونکہ پنجاب کانگریس میں اکثریت ایسے لوگوں کی تھی جن کے رابطے شہری ہندو تاجر برادری سے تھے جبکہ زیادہ تر کسان یا تو مسلمان یا سکھ تھے۔ بہر حال ان دونوں اقدامات سے متمول کسانوں کو فائدہ پہونچا جو بالآخر خود بھی مہاجنی کرنے لگے تھے اور بیشتر کوآپریٹو سوسائٹیوں پر بھی ان کا قبضہ ہو گیا تھا۔

کرزن نے ہندوستان کے آثار قدیمہ میں بھی پوری دلچسپی لی اور ان کے تحفظ کے مقصد سے ایک بہت ہی اہم ایکٹ پاس کرادیا۔ البتہ کلکتہ میں وکٹوریہ میموریل سے متعلق اس کے عظیم الشان منصوبے کو اتنا قابل ستائش قرار نہیں دیا جاسکتا، جبکہ ایڈورڈ ہفتم کے دربار پر 20 لاکھ روپے سے زائد کے خرچ کو محض دولت کے اصراف کے زمرے میں رکھا جائے گا۔ اس نے اپنی وائسرائی کے ابتدائی برسوں میں بعض کارروائیوں کے ذریعے ہندوستانیوں میں خاصی مقبولیت حاصل کرلی تھی۔ مثلاً رنگون (1899) میں اجتماعی آبروریزی کے ایک واقعہ میں ملوث گورے سپاہیوں کو سزا دی، سیال کوٹ (1902) میں ایک ہندوستانی خانساماں کو پیٹ پیٹ کر مار ڈالنے پر لوین بٹالین کے افسروں کے خلاف کارروائی کی، اور ایک قلی کو قتل کردینے (بائین Bain مقدمہ 1904) پر ماتحت عدالت کے ذریعے آسام کے چائے باغات کے ایک منیجر کو محض چھ ماہ کی سزا پر کلکتہ ہائی کورٹ سے نظر ثانی کرانے کی بھی کوشش کی۔ اس طرح کی باتوں سے ہندوستان کی اینگلو انڈین آبادی میں تھوڑے سے عرصے کے لیے بھاری اشتعال پیدا ہو گیا تھا مگر چونکہ کرزن البرٹ بل احتجاج جیسا کوئی دوسرا خطرہ مول لینے کے لیے ہرگز تیار نہیں تھا اس لیے اس نے اصل تدارکی اقدام یعنی کثیر نسلی مقدمات کی صرف گوروں پر مشتمل جیوری کے ذریعے سماعت کے طریقہ کار کے خاتمے کی بھی کوشش نہیں کی۔ بنیادی نوعیت کے امور کے سلسلے میں وہ بھی پورا نسل پرست تھا، یہاں تک کہ وہ اپنے قریب ترین ہندوستانیوں کے ساتھ بھی ویسے ہی لہجے میں بات کرتا تھا جس طرح کے لہجے میں لوگ پالتو جانوروں سے بات کرتے ہیں (ایس گوپال، برٹش پالیسی ان انڈیا، صفحہ 227)۔ کرزن نے 23 اپریل 1900 کو سکریٹری آف اسٹیٹ ہملٹن کے نام اپنے مکتوب میں ان اونچی آسامیوں کی بڑھتی ہوئی تعداد کے بارے میں تشویش ظاہر کی تھی "جو کہ مکمل طور پر یورپیوں کے لیے ہی تھیں یا انھیں کے لیے مخصوص ہونی چاہیے تھیں" اور جن پر اب برتر صلاحیت والے مقامی لوگ قبضہ کرتے جارہے

تھے "وہ اپنی عوامی تقریروں میں بھی کبھی کبھی غیر ضروری طریقے پر اہانت آمیز رویے پر اتر آتا تھا۔ "میں جب یہ کہتا ہوں کہ صرف کوئی مغربی تصور ہی صداقت کا سب سے بلند آدرش ہوتا ہے، تو میرے خیال میں غلط نہیں ہوتا۔ (کلکتہ یونیورسٹی کانووکیشن سے خطاب 1905)۔

کرزن انتظامیہ کی اہمیت کی وجہ یہ ہے کہ وہ تعلیم یافتہ ہندوستانیوں کی اس آرزومندی کا مخالف تھا جس کی نمائندگی کانگریس کر رہی تھی۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی کہ وہ راج کو مستحکم کرنے، حکومت کے معاملات کو درست کرنے اور اقتدار اعلانافذ کرنے کے لیے مسلسل کوشاں رہا۔ یہ معاملات ایک دوسرے کے ساتھ جڑے ہوئے تھے۔ وہ کافی پہلے یعنی اس وقت جبکہ قوم پرست لیڈر اس کے خلاف صف آراء نہیں ہوئے تھے کانگریس کے ساتھ "ناصاف چیز" جیسا برتاؤ کرنے کا فیصلہ کر چکا تھا...... وہ کبھی بھی کانگریس کا نوٹس نہ لیتا...... اس کا کہنا تھا کہ وہ (کانگریس) جب تک بے قصور ہے، ایک فضول چیز ہے، اور اگر وہ حکومت کی دشمن یا غدار ہے تو ایک فطری خطرہ ہے "(کرزن بنام Ampthick 15 جون 1903)۔ اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں کہ پولس اصلاحات کو اس کے منصوبے میں بہت اہم مقام حاصل تھا۔ اس کے علاوہ اس نے سرکاری رازداری ایکٹ (1904) کے ذریعے حفاظتی اقدامات کو سخت تر کردینے کی بھی کوشش کی تھی۔ آندریو فریزر (Andrew Fraser) کی سرکردگی میں قائم پولس کمیشن (1902-03) کی سفارشات کے نتیجے میں پولس فورس کی تعداد، تربیت اور تنخواہوں میں کافی سدھار آیا۔ جس پر سالانہ ڈیڑھ کروڑ روپے کا اضافی خرچ ہوا۔ سیاسی جرائم سے نمٹنے کے لیے بدنام زمانہ "ٹھگی ڈکیتی محکمے" کی جگہ پر ایک آزاد کریمنل انٹلی جنس کا محکمہ قائم کیا گیا۔

کرزن اور قوم پرست رہنما

کرزن اور قوم پرست طبقے کے درمیان اصل ٹکراؤ یکے بعد دیگرے تین اقدامات: 1899 میں کلکتہ کارپوریشن میں تبدیلیوں، یونیورسٹیوں سے متعلق ایکٹ بابت 1904 اور بنگال کی تقسیم (1905) کے نتیجے میں شروع ہوا۔ پہلے اقدام کے نتیجے میں چنے ہوئے ہندوستانی ممبروں کی تعداد کم ہو گئی تھی؛ یہ اقدام کلکتہ کی یوروپی کاروبار برادری سے ہی تعلق رکھتا تھا جو کہ لائسنس کی منظوری اور دوسری مراعات میں تاخیر کی برابر شکایت کرتی آرہی تھی۔ یہ ایک دلچسپ بات ہے کہ اس وقت کے بنگال کے لفٹنٹ گورنر الیکزنڈر میکینزی، جو کہ کرزن کے علاوہ خود بھی اس تبدیلی کے محرک تھے، Burn Company کے اس شراکت دار کے بھائی تھے جو کہ لیجس لے ٹیو کاؤنسل میں بنگال کے ایوان تجارت کا نمائندہ بھی تھا۔ جہاں تک یونیورسٹیوں میں اصلاح کا تعلق تھا تو اس کا فارمولہ ستمبر 1901 میں شملہ میں صرف گورنروں کی کانفرنس میں رازدارانہ طریقے پر

تیار کیا گیا تھا جسے بعد میں باقاعدہ شکل یونیورسٹیز کمیشن نے دی تھی۔ اس کمیشن کے واحد ہندوستانی ممبر گرود اس بنرجی تھے جنھوں نے اس کی سفارشات سے سخت اختلاف کیا تھا۔ اس ایکٹ کے ذریعے، جسے کرزن نے ہمہ جہات تعلیم کا معیار بلند کرنے کا اقدام بتایا تھا، سینیٹ کے چنے ہوئے ممبروں کی تعداد گھٹا دی گئی، کالجوں کے الحاق اور اسکولوں کو تسلیم کرنے سے متعلق اختیارات سرکاری افسروں کو منتقل کر دیئے گئے اور کم سے کم کالج فیس طے کرنے کی کوشش کی گئی۔ ہندوستانیوں کی طرف سے اس ایکٹ کی غیر جمہوری اور انتہائی بنیاد پر کی گئی مخالفت کو مشکل سے ہی غیر فطری کہا جا سکتا ہے۔ یہ دعوا کہ ایکٹ کا مقصد تعلیم کے معیار کو بلند کرنا تھا۔ اس حقیقت کے مد نظر غلط ثابت ہو گیا تھا کہ کل تعلیمی اخراجات 04-1903 میں محض 20.26 ملین روپے کے بقدر اور 06-1905 میں 24.49 ملین روپے کے بقدر تھے گویا کہ تعلیمی مد میں محض چند لاکھ روپے کا اضافہ ہوا تھا جبکہ اس مدت میں پولس اخراجات میں بھاری اضافہ کیا گیا تھا جو کہ کل بجٹ کے 2.5 فی صد کے بقدر تھا۔

یونیورسٹیوں کی حیثیت امتحانات کرانے والے ادارے سے بڑھا کر پوسٹ گریجویٹ تعلیم کا ادارہ بنانے پر جو زور دیا گیا تھا اس کے کچھ نتائج سامنے آئے، خاص طور پر کلکتہ میں جہاں وائس چانسلر نے اسے کافی سوجھ بوجھ کے ساتھ نافذ کیا تھا مگر زیادہ اہم بات یہ تھی کہ کالجوں کے الحاق اور مالی امداد پر سرکاری کنٹرول قائم کر دیا گیا تھا۔ سرکاری افسروں کے ان اختیارات کو 1905 کے بعد طلباء کی تشدد پسندی کو کنٹرول کرنے کے لیے کافی من مانے ڈھنگ سے استعمال کیا گیا۔ اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ قوم پرستی کی بڑھتی ہوئی لہر کے خلاف حکومت کے تدارکی اقدامات میں پولس کمیشن کے ساتھ ساتھ یونیورسٹی ایکٹ کو بھی شامل رکھنا چاہیے۔

تقسیم بنگال

کرزن کا سب سے غیر پسندیدہ اقدام، تقسیم بنگال، بھی مورخین کے مابین زبردست اختلاف رائے کا باعث رہا ہے۔ جہاں حکومت کا حمایتی حلقہ انتظامی سہولت کی بنیاد پر اس تقسیم کو حق بجانب ٹھہرا رہا تھا، وہیں قوم پرست حلقہ اسے 'لڑاؤ اور حکومت کرو' کی پالیسی کا ہی ایک حصہ سمجھتا تھا۔ 1903 تک سرکاری حلقوں میں تقسیم کے انتظامی پہلوؤں پر ہی زور دیا گیا تھا۔ بنگال پریزیڈنسی کا ایک بہت بڑا رقبہ مختلف اوقات میں مشکلات کا باعث سمجھا جاتا رہا تھا (چنانچہ اس علاقے کو چھوٹا کر دینے کی تجویز 1860 کی دہائی میں بھی پیش کی گئی تھی۔ 1874 میں آسام اور سلہٹ کو الگ کیا جا چکا تھا اور 97-1896 میں آسام کے چیف کمشنر ولیم وارڈ نے چٹاگانگ ڈویژن، ڈھاکہ اور میمنسنگھ کو اپنے صوبے میں شامل کر لینے کی تجویز رکھی تھی) اور آسام کو ایک نسبتاً زیادہ نمو پذیر صوبے کی

حیثیت میں ترقی دینے کی تجویز میں دلچسپی بڑھتی جارہی تھی۔ بنگال کے نئے لفٹنٹ گورنر آندریو فریزر نے 28 مارچ 1903 کے ایک نوٹ کے ذریعے وارڈ کی مذکورہ تجویز کو پھر اٹھایا جسے کرزن نے تسلیم کر لیا تھا اور جس کا پہلی بار اعلان ہوم سکریٹری Risley کے 3 دسمبر 1903 کے مکتوب میں کیا گیا تھا۔ منتقلی کے منصوبے کے سلسلے میں Risley نے جو دو وجوہ بیان کی تھیں ان میں ایک یہ تھی کہ اس سے بنگال کو راحت ملے گی اور دوسرے یہ کہ اس سے آسام کی ترقی ہوگی۔ بہر حال اس موقع پر یہ نشان دہی ضروری معلوم ہوتی ہے کہ انتظامی سہولت، کوئی مجرد اور خیالی یا نا جانبدارانہ چیز نہیں تھی بلکہ انگریز افسروں اور انگریز تاجروں کے مفاد سے جڑی ہوئی چیز تھی۔ اس طرح Risley کی دلیل کے مطابق "آسام کی توسیع افسروں کو ایک زیادہ وسیع اور سود مند دائرہ عمل مہیا کرانے اور چائے، کوئلے، نیل کی صنعتوں کو فروغ دینے کے لیے آبی نکاس فراہم کرنے کے لیے ضروری ہے"۔ (واضح رہے کہ ان ساری صنعتوں پر گوروں کا ہی قبضہ تھا)۔ دسمبر 1903 نیز 19 جولائی 1905 کو باقاعدہ اعلان کی درمیانی مدت میں رزلے فریزر (Risley Fraser) اور کرزن نے منتقلی کے منصوبے کو مکمل تقسیم کے منصوبے میں تبدیل کر دیا؛ اس طرح کہ چٹاگانگ، ڈھاکہ اور راج شاہی ڈویژنوں پر مشتمل مشرقی بنگال و آسام کے نام سے ایک نیا صوبہ بنادیا گیا اور ہل ٹپیرا (Tippera) اور مالدہ کو آسام سے الگ کر دیا گیا۔ خفیہ سرکاری رودادوں، نجی نوعیت کے کاغذات اور تبصروں کی روشنی میں اور خاص طور پر اس دوسرے مرحلے کے دوران؛ حکومت کے اس اعلان کو تسلیم کرنا مشکل تھا کہ بنگال کی اس تقسیم کے پس پشت کوئی سیاسی مقصد نہیں تھا۔ اس زمانے میں اور بعد میں بھی قوم پرست لیڈروں کے اس الزام کو تقویت ملتی رہی تھی کہ بنگال کو دراصل ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان کشیدگی بڑھانے کے مقصد سے تقسیم کیا گیا تھا۔ اس الزام کی توثیق فروری 1904 میں ڈھاکہ میں کرزن کی اس تقریر سے بھی ہوتی ہے جس میں اس نے مشرقی بنگال کے مسلمانوں کو باہمی اتحاد کے امکان کی پیش کش کی تھی۔ اس باہمی اتحاد سے وہ مسلم نوابوں اور حکمرانوں کے دور کے بعد سے محروم چلے آرہے تھے۔ دراصل اس اقدام کا اصل سیاسی مقصد اس وقت کے مشرقی بنگال اور مغربی بنگال کے ہندو سیاست دانوں کے درمیان دراڑ پیدا کرنا تھا جو کہ غالب پوزیشن میں تھے۔ ہوم سکریٹری H.H. Risley نے 7 فروری اور 6 دسمبر 1904 کی دو تحریروں میں تقسیم بنگال کی مخالفت کرنے والوں کی دلیلوں کا تجزیہ کرتے ہوئے اس معاملے کو بالکل صاف کر دیا تھا۔ Risley کے بقول "متحدہ بنگال ایک طاقت ہے، تقسیم شدہ بنگال مختلف سمتوں میں بکھر جائے گا۔ یہ بالکل صحیح ہے اور اس اسکیم کی ایک مضبوط بنیاد بھی ہے۔ کسی ایسے سرکاری مراسلے میں جس کے افشاء ہو جانے کا پورا پورا امکان ہوتا ہے، اس طرح کی بات نہیں کہی جا سکتی کہ سی پی میں برار کے انضمام کی طرح ہی اس معاملے میں بھی ہمارا مقصد

حکومت کے مضبوط مخالفوں کو تقسیم کر کے انھیں کمزور کر دینا ہے" مراٹھی زبان کے علاقے برار کو جو کہ 1902 میں نظام سے پٹے پر حاصل کیا گیا تھا۔ کرزن کے بقول اس لیے بمبئی میں شامل نہیں کیا گیا تھا کہ "ہمیں شیواجی کے بارے میں بہت ساری باتیں سننے کو ملتی ہیں"۔ بنگال انتظامیہ کے بار کو ہلکا کرنے کی غرض سے جو دوسرے منصوبے۔ ایک ایگزیکٹیو کاؤنسل قائم کرنے، یا غیر بنگالی علاقوں بہار اور اڑیسہ کو الگ کر دینے (جس پر آخر کار 1911 میں عمل کیا گیا) کی شکل میں پیش کیے گئے تھے، انھیں کرزن سیاسی بنیادوں پر مسترد کر تا رہا تھا۔ کرزن نے سکریٹری آف اسٹیٹ کے نام ایک ٹلی گرام کے ذریعے یہ دلیل پیش کی تھی کہ دوسری تجویزوں پر عمل کرنے کے نتیجے میں بنگالی باہر کی دنیا سے منقطع ہو جانے پر اور مضبوط ہو جائیں گے اور اس طرح مسئلہ حل ہونے کی بجائے اور شدت اختیار کر جائے گا۔ ہماری تجویز کے سیاسی اعتبار سے سودمند ثابت ہونے کی بہترین ضمانت یہ ہے کہ کانگریس پارٹی اس کی مخالفت کر رہی ہے۔"

Risley جیسے افسروں کو یہ امید تھی کہ اس عہد کے کیمبرج مورخین اپنے روایتی رجحان کے تحت بنگال کی تقسیم کی مخالفت کی تاویل اعلا طبقاتی مفاد گروپ کے تناظر میں کریں گے۔ وکرم پور کے بابوؤں کو محرری کی ملازمتوں کے بارے میں تشویش تھی، جبکہ جن زمینداروں کی زمینداری دونوں بنگال میں تھی۔ وہ دونوں جگہ الگ الگ کارندے رکھنے کے حق میں نہیں تھے۔ بھاگیہ کل رائے گھرانے کو، جو کہ کلکتہ کے قریب خام جوٹ اور چائے کی تجارت کرتا تھا۔ چٹاگانگ کا عروج ایک آنکھ نہیں بھاتا تھا۔ کلکتہ کے وکلاء کو یہ خدشہ تھا کہ ایک نئے صوبے کی تشکیل کا مطلب ایک نئی ہائی کورٹ کی تشکیل ہے جس سے ان کی اپنی پریکٹس بری طرح متاثر ہو گی۔ اسی طرح مشرقی بنگال کا اعلا سیاسی طبقہ یہ سمجھتا تھا کہ اس طرح لے جس لے ٹیو کاؤنسل میں ان کے پہونچنے کا موقع ختم ہو جائے گا۔ (یہ اس ابتدائی مرحلے کی بات ہے جب بنگال کے کچھ علاقوں کو چیف کمشنر کے صوبہ اسام میں منتقل کر دینے کی بات چل رہی تھی، جس کی اپنی کوئی منتخبہ کاؤنسل نہیں تھی)، کلکتہ کے سیاست دانوں کا خیال یہ تھا کہ اس طرح ان کے اثر و رسوخ کا دائرہ بہت گھٹ جائے گا۔ Risley کے 7 فروری 1904 کے نوٹ میں جن عوامل کی نشان دہی کی گئی تھی وہ اس نے اپنے اختراع کردہ نہیں تھے، بلکہ ان سارے عوامل کا ذکر اس سلسلے میں شائع ہونے والے An the Open letter to Lord Curzon (April.1904) The Case against All about partition (Calcutta-1905) اور Break-up of Bengal) جیسے کتابچوں میں پہلے ہی ہوتا آرہا تھا۔ بعد میں بنگال اور کچھ دوسرے علاقوں کے واقعات نے افسروں کی اس توقع کو غلط ثابت کر دیا کہ تقسیم کے سلسلے میں پیدا ہونے والا ہیجان جلد ہی فرو ہو جائے گا اور جلسوں جلوسوں اور پٹیشنوں کا سلسلہ زیادہ دیر تک جاری نہیں رہ سکے گا، چنانچہ جولائی 1905 کے

بعد اس تحریک میں غیر معمولی طریقے پر شدت آتی گئی اور روایتی داد و فریاد کی جگہ متعدد نئے تشدد پسندانہ طریقوں نے لے لی۔ اب زیادہ سے زیادہ لوگ سامنے آنے لگے تھے اور تحریک کا دائرہ بڑھتے بڑھتے سوراج کے مطالبے تک پہونچ گیا تھا۔

ظاہر ہے کہ انگریزوں سے بنگالیوں کے اس باہمی اتحاد کا اندازہ لگانے میں غلطی ہوئی تھی جس کی جڑیں علاقائی خود مختاری کی طویل تاریخ میں پیوست تھیں۔ پھر یہ کہ انیسویں صدی کے تہذیبی اور ثقافتی واقعات سے بھی بنگال کے تعلیم یافتہ طبقے میں اتحاد کے جذبے کو اور بھی فروغ حاصل ہوا تھا۔

کلکتہ، بنگال کے تعلیم یافتہ بھدر لوک (اشرافیہ) کے لیے ایک حقیقی عروس البلاد کی حیثیت حاصل کر چکا تھا۔ تمام اضلاع کے طالب علم حصول تعلیم کے لیے کلکتہ ہی آتے تھے اور پورے صوبے میں بلکہ صوبے سے باہر بھی اساتذہ، وکلاء، ڈاکٹر اور کلرک وغیرہ یہیں سے بھیجے جاتے تھے۔ بڑی تعداد میں اخبار ورسائل کی اشاعت اور جدید ادب کی تخلیق کے ذریعے کلکتہ ایک معیاری زبان کی نشو ونما اور معیاری علاقائی ادب کی تخلیق میں نمایاں رول ادا کر رہا تھا۔ اس وقت رابندر ناتھ ٹیگور عالمی شہرت کی دہلیز پر تھے۔ ان باتوں نیز ان کے علاوہ مختلف پیشوں، سرکاری نوکریوں ،سیاست نیز انگریزی تعلیم کے میدان میں بنگالیوں کی سبقت جیسی کچھ دوسری باتوں (جو کہ بتدریج کم ہوتی جارہی تھیں) کی وجہ سے بنگالیوں میں ایک نئی خود اعتمادی پیدا ہو گئی تھی جسے دیوکا نند کی تاویل کردہ ہندو احیاء پسندی کے ماحول میں اور بھی تقویت مل گئی تھی۔

اس سلسلے میں کچھ بین الاقوامی واقعات بھی اثر انداز ہوئے جن میں Beor کی جنگ میں انگریزوں کی ہزیمت، اور 05-1904 میں روس پر جاپان کی فتح بھی شامل ہے جس سے پورے ایشیا میں فخر کی لہر دوڑ گئی تھی اور جس کا بنگال کے اخبارات نے شاندار طریقے پر خیر مقدم کیا تھا (یہاں تک کہ جاپان کے لیڈروں Nogi اور Togo کے ناموں پر بچوں کو عرفی ناموں سے پکارا جانے لگا تھا۔ امیگریشن قوانین کے خلاف احتجاج کے طور پر چین کے ذریعے امریکی سامان کے بائیکاٹ کی خبر نیز روس میں مطلق العنانیت کے خلاف عوامی انقلاب جیسے واقعات بھی قابل ذکر ہیں۔

مضبوط علاقائی اتحاد نیز خود اعتمادی اور فخر کے روز افزوں احساس کے اس ماحول میں کرزن کے اشتعال انگیز اقدامات کا نتیجہ تقسیم کے پس پردہ فیصلے (کرزن نے اس سلسلے میں فروری 1904 اور جولائی 1905 کی درمیانی مدت میں کوئی بھی بات اعلانیہ طور پر بہت کم کہی تھی) کی شکل میں سامنے آیا۔ اسے قومی اہانت قرار دیا گیا۔ یہ معاملہ نہ صرف یہ کہ 20 سال کے اعتدال پسندانہ احتجاج کے نتیجے میں حاصل ہونے والی محدود اور جزوی کامیابیوں سے متعلق مایوسیوں سے جڑ گیا تھا بلکہ نسلی

امتیازی سلوک اور گوروں کی خود سری سے متعلق عام شکایات کو بھی اپنی لیسٹ میں لے لیا تھا۔ گیان چندر بنرجی کی ڈائری میں اس کی واضح جھلک ملتی ہے۔ "ایک گورے ڈسٹرکٹ جج کی 2000روپے کی تنخواہ کے مقابلے میں ایک ہندوستانی منصف کو محض 200روپے ملتے ہیں...... دور سے آنے والی سیٹی کی آواز اسٹیمر پر اور ٹرینوں میں برتے جانے والے نسلی امتیاز کی یاد تازہ کردیتی ہے۔ اسے اب قومی بیداری کی علامتوں، سائنس داں جگدیش چندر بوس کی کامیابیوں اور ایک عالمی طاقت کی شکل میں جاپان کے عروج سے بڑی تسکین ملتی ہے"

بنرجی نے اپنے رسالے کی ابتداء (اکتوبر 1904) ہندوستان میں بڑھتی ہوئی غربت کے حوالے سے کی تھی۔ اگرچہ بنگالی بھدرلوک (اشرافیہ) باربار کے قحط اور طاعون سے براہ راست طور پر بہت کم متاثر ہوتا تھا لیکن 1890 کی دہائی میں ان دونوں کے نتیجے میں ہونے والے زبردست جانی نقصان نے انھیں یقیناً ہلا کر رکھ دیا ہوگا۔ دولت کے بہاؤ کو ہندوستان کی معاشی مشکلات کی واحد وجہ قرار دیتے رہنا مشکل تھا۔ ان معاشی مشکلات کی کچھ دوسری اور راست وجوہ بھی تھیں۔ آزاد اور نجی نوعیت کے پیشوں میں بھیڑ بڑھتی جارہی تھی (1905 کے ایک سودیشی کتابچے میں شکایت کی گئی تھی کہ بنگال کی صرف مداری پور تحصیل میں 80 وکیل تھے) جس کی وجہ سے بھدرلوک (اشرافیہ) کا انحصار چھوٹی زمینداروں اور پٹہ داریوں پر بڑھتا جارہا تھا اور اس طرح وراثت میں ملنے والی زمین تقسیم در تقسیم کی وجہ سے کم منافع بخش ہوتی جارہی تھی۔ قیمتوں میں اچانک تیزی سے اضافہ شروع ہوگیا تھا۔ کے۔ ایل دت کا تیار کردہ آل انڈیا عدد اشاریہ (1890-94=100) 1904 کے لیے 106، 1905 کے لیے 116، 1906 کے لیے 129 اور 1908 کے لیے 143 تھا۔ سب سے زیادہ فرق 1905 اور 1908 کی درمیانی مدت میں دیکھنے میں آتا ہے۔ یہی بہت زیادہ سیاسی بے چینی کا بھی زمانہ تھا۔

مشرقی بنگال میں باقر گنج، مداری پور، ہوکرم پور، کشور گنج وغیرہ سودیشی تحریک کے گڑھ تھے۔ ان علاقوں میں ہندو بھدرلوک کا ارتکاز تھا جو کہ درمیانی نوعیت کی پٹہ داریوں اور انگریزی تعلیم کا علاقہ تھے (جس کے نتیجے میں مختلف پیشوں میں بھیڑ ہوگئی تھی اور ساتھ میں قوم پرستی میں بھی توسیع ہوئی تھی)۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قیمتوں میں بھاری اضافہ ان علاقوں اور اس طرح کے گروہوں میں قوم پرستی کے جذبات پیدا کرنے کا باعث ہوا۔ اس کے علاوہ افراط زر نے صنعتی مزدوروں کو ہڑتال کا راستہ اپنانے پر مجبور کردیا تھا۔ 1905 کے واقعات کے اس اہم پہلو کو نظرانداز کیا جاتا رہا ہے۔ بہر حال مغربی بنگال میں معاشی بے چینی کبھی کبھی سب سے قریبی استحصال کنندگان (جو کہ عام طور ہندو تھے) مثلاً کھیت مالکوں، مہاجنوں اور بیوپاریوں کے خلاف برہمی کی شکل اختیار کرجاتی تھی اور اس طرح فرقہ وارانہ فسادات کا بھی باعث ہوتی تھی۔ بنگال کے سودیشی تعلیم یافتہ

طبقے نے احیاء پسندانہ رویے کا مظاہرہ کر کے ان مسائل میں اور اضافہ کر دیا بلکہ وہ انقلابی زرعی لائحہ عمل جیسی کوئی چیز تیار کرنے میں بھی ناکام رہا۔ گیان چندر بنرجی کی وکرم پور میں تھوڑی سی زمینیں تھیں پھر بھی ان کی ڈائری میں 1885 کے لگان ایکٹ کی بہت برائی ملتی ہے کیونکہ اس ایکٹ کی وجہ سے زمینی تعلقات بہت خراب ہو گئے تھے۔ 1904 میں بنگال میں زمینی تعلقات کے موضوع پر مقامی زبان میں جو ایک دلچسپ کتابچہ تیار کیا گیا تھا اس میں ذیلی لگان داری کی جڑیں آریائی عہد میں تلاش کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ کتابچے میں کہا گیا تھا کہ ایک طرف تو بڑے زمیندار (خصوصاً انگریزوں اور مسلمانوں کے پیدا کردہ سود خور) اور دوسری طرف لگان سے متعلق نئے قوانین سے حوصلہ پا کر گستاخ رعیت ان ذیلی لگان داروں کا خون چوس رہی ہے۔ (امرت لال پال، بنجر بھوی، راجیہ و پراچین آریہ گرامیہ سمتی، کلکتہ، 1904)۔

Open Letter to Curzon (1904) کے عنوان سے ایک دوسرے کتابچے میں یہ حوالہ دیا گیا تھا کہ رائے عامہ دراصل ان لوگوں کے خیالات سے عبارت ہوتی ہے جو عوام سے برتر ہوتے ہیں۔ اس کتابچے میں اس بات پر بھی زور دیا گیا تھا کہ تعلیم یافتہ طبقہ ہی عوام الناس کا فطری رہنما ہوتا ہے۔ اس طرح یہ واضح ہو جاتا ہے کہ کسان طبقے سے بھدر لوک (اشرافیہ) کی اس دوری کی جڑیں محنت کشوں سے الگاؤ سے کہیں زیادہ طبقاتی شعور میں پیوست تھیں۔

بنگال میں بلکہ دوسرے صوبوں میں بھی جہاں انتہاپسند روشن خیال طبقہ قوم پرستانہ نعروں کو ان کسان طبقوں کی فوری معاشی مشکلات کے ساتھ ہم آہنگ کرنے میں ناکام رہا، وہیں نچلے طبقات کے دباؤ میں بھی ڈھیل آگئی تھی۔ روشن خیال طبقے کی اس ناکامی کی وجہ شاید یہ تھی کہ اس نے مذہبی اپیلوں کے ذریعے عوام سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش کی جس کا نتیجہ خاص طور پر مسلمانوں کے تعلق سے بہت خطرناک ثابت ہوا۔ یہ درست ہے کہ بار بار کے قحط اور طاعون نے ملک کے بہت بڑے حصے میں لوگوں کی کمر توڑ دی تھی مگر دوسری طرف بھاری شرح اموات کے نتیجے میں آبادی میں قابل لحاظ کمی بھی واقع ہوئی ہوگی اور نتیجتاً زمین پر دباؤ اور زرعی تناؤ میں بھی کمی آئی ہوگی۔ لیکن 1870 کی دہائیوں کے دوران دیہی علاقوں میں سورش جیسے حالات کے بعد انگریزوں نے تدارک کی غرض سے قوانین بنا کر بنگال میں قبضہ جاتی حقوق کو مضبوط کرنے، بمبئی اور پنجاب میں باہر کے مہاجنوں کو زمین کی منتقلی پر پابندی لگانے کے علاوہ کچھ عرصہ کے لیے بڑے کسانوں کی بھی دل جوئی کی کوشش کی تھی۔ یہ وہ طبقہ تھا جو مہاجنوں یا زمینداروں کے ساتھ پیدا ہونے والے تنازعات میں بہت سرگرم رہتا تھا۔ قیمتوں میں بھاری اضافہ زرعی خام مال کی بہت زیادہ برآمد کاری سے تعلق رکھتا تھا بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قیمتوں میں اضافہ اس برآمد کاری کا ہی نتیجہ تھا۔ کرنسی کا بہت زیادہ پھیلاؤ بھی دراصل برآمداتی توفیر (Export Surplus) کے نتیجے

میں باہر سے سونے اور چاندی کی اندرون ملک آمد کا ہی ایک نتیجہ تھا۔ گرچہ زرعی خام مال کی برآمد کاری سے بڑا فائدہ برطانیہ کی برآمد کار ایجنسیوں اور ان کے ہندوستانی ایجنٹوں کو ہی پہونچا ہوگا، مگر غالباً کسان طبقوں کے کچھ مخصوص گروپوں (مثلاً مشرقی بنگال میں جوٹ کی کاشت کرنے والے متمول کسانوں) نے بھی اس سے فائدہ اٹھایا ہوگا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بیسویں صدی کی پہلی دہائی میں فی کس سالانہ قومی آمدنی میں قابل لحاظ اضافہ ہوا۔ 1938-39 کی قیمتوں کی بنیاد پر یہ اضافہ 1900-01 میں 49.4 روپے کے مقابلے میں 1916-17 میں 60.4 روپے تک پہونچ گیا تھا۔ (نیشنل انکم آف انڈیا، 1900-01 تا 1946-47) دہلی یونیورسٹی مونوگراف 1965)۔

ان تمام باتوں کے نتیجے میں قومی اور سماجی بے چینی کے دھارے قومی تحریک کے انتہاپسندانہ مرحلے میں ایک دوسرے سے الگ الگ رہے تھے۔

بنگال میں سودیشی تحریک: 1905-08

جولائی 1905 تک اخباروں، تحریکوں، جلسے جلوسوں اور گزارشوں (بطور خاص ڈھاکہ اور میمن سنگھ اضلاع میں) جیسے اعتدال پسندانہ طریقوں سے تقسیم بنگال کے منصوبے کی مخالفت جاری رہی۔ کلکتہ کے ٹاؤن ہال میں مارچ 1904 اور جنوری 1905 میں بڑی کانفرنسیں ہوئیں جن میں بہت سے اضلاع کے مندوبین نے شرکت کی۔ مذکورہ بالا طریقوں کے واضح طور پر ناکام ثابت ہو جانے پر نئے طریقوں کی تلاش شروع ہو گئی۔ چنانچہ 13 جولائی 1905 کو کرشنا کمار مترا کے ہفت روزہ اخبار سنجیونی نے انگریزی اشیاء کے بائکاٹ کی تجویز پیش کی۔ جسے سریندر ناتھ بنرجی جیسے تجربہ کار اور مضبوط لیڈروں نے کافی پس و پیش کے بعد ٹاؤن ہال کی 7 اگست کی میٹنگ میں قبول کر لیا۔ اِسی طرح رابندر ناتھ اور رامندر ترویدی نے راکھی بندھن اور ارادھنا کی اپیلیں جاری کیں۔ چنانچہ تقسیم بنگال کے دن (16 اکتوبر) بھائی چارے اور یگانگت کی علامت کے طور پر رنگین دھاگوں کی راکھیوں کا تبادلہ کیا گیا اور سوگ کے طور پر چولہے ٹھنڈے رکھے گئے۔ برطانوی حکومت نے طلباء کے خلاف جو کارروائیاں کیں ان میں کارلائل کا وہ گشتی اعلان (مطبوعہ 22 نومبر) بھی شامل تھا جس کے ذریعے تعلیمی اداروں کی مالی امداد، اسکالر شپ، قوم پرستوں کے غلبے والے اداروں کے الحاق کو کالعدم کرنے کی دھمکی دی گئی تھی۔ حکومت کی ان کارروائیوں کے رد عمل میں سرکاری تعلیمی اداروں اور قومی اسکولوں کی اس تنظیم کے بائیکاٹ کی تحریک شروع ہو گئی جسے سبودھ ملک کے ایک لاکھ روپے کے عطیے میں سے تھوڑی سی خیرات ملی تھی۔ حکومت کی جابرانہ کارروائیوں (باریسال میں گورکھا فوج کی تعیناتی، اپریل 1906 میں اسی شہر میں صوبائی سطح کی کانفرنس کو منتشر کرنے کے لیے پولس کے لاٹھی چارج اور مظاہرین کے خلاف متعدد سودیشی

مقدمے) کی وجہ سے کشیدگی میں تیزی سے اضافہ ہو گیا تھا۔ مگر جلد ہی بنگال میں تحریک کے اندر اختلافات بھی پیدا ہو گئے۔ کچھ لوگوں کے نزدیک بائکاٹ کی تحریک دراصل احتجاج کے نئے طریقوں کا محض ایک نقطہ آغاز تھی اور تقسیم کے فیصلے کی تنسیخ کو "ایک بہت ہی حقیر اور ادنیٰ سیاسی مقصد" (اربندو گھوش، اپریل 1907) سے زیادہ نہیں سمجھا جاتا تھا جو کہ سوراج یا مکمل آزادی کی سمت میں محض ایک ابتداء تھی، جبکہ سریندر ناتھ جیسے کچھ دوسرے لیڈروں کے نزدیک بائکاٹ کا طریقہ دراصل مانچسٹر کی کمائی پر روک لگا کر تقسیم کے فیصلے کو منسوخ کرانے کی ایک آخری کوشش کی حیثیت رکھتا تھا۔ مضبوط قسم کے اعتدال پسند لیڈر تعلیمی بائیکاٹ کی تحریک کو ترک کرا دینے کی کوشش میں 16 نومبر 1905 کو کامیاب ہو گئے اور جلد ہی سکریٹری آف اسٹیٹ کے عہدے پر Marley کے تقرر کا جو کہ اپنی آزد خیالی کے لیے مشہور تھے، فائدہ اٹھا کر ایک بار پھر "گداگرانہ پالیسی" کی پناہ گاہ میں چلے گئے۔

اس طرح کے اندرونی اختلافات کا واضح طور پر ایک گروہی پہلو بھی تھا اور وہ اس طرح کہ جو افراد اور گروپ (مثلاً امرت بازار پتریکا کے موتی لال گھوش یا بپن چندر پال یا اربندو گھوش) اب تک قوم پرست قیادت سے دور رہے تھے وہ وکلاء کے اس گٹھ جوڑ کو توڑنے کی کوشش کر رہے تھے جس نے پال کے مطابق اس وقت سارے ضلع صدر مقامات کی سیاست پر اپنی اجارہ داری قائم کر رکھی تھی۔ تاہم اس پوری کہانی کو محض "اندر کے" اور "باہر کے" گروپوں کے درمیان ٹکراؤ کی شکل میں پیش کرنا اتنا آسان بھی نہیں ہے، کیونکہ ایسا کرنے کا مطلب بنگال میں سودیشی تحریک کے مرحلے کو اس کی حقیقی اہمیت اور افادیت سے محروم کر دینا ہو گا۔

رجحانات

نظریاتی سطح پر 1905 اور 1908 کی درمیانی مدت میں بنگال کی سیاسی زندگی میں انتہائی مستحکم اعتدال پسندانہ روایت کے علاوہ تین نمایاں رجحانات کی نشان دہی کی جا سکتی ہے پہلا تو تعمیری سودیشی رجحان تھا۔ جس کا مطلب خود تحقیری گداگرانہ سیاست کی جگہ پر سودیشی صنعتی اور قومی اسکولوں کے ذریعے نیز گاؤں میں بہتری اور تنظیم کے ذریعے اپنی مدد آپ کا راستہ اپنانا تھا۔ اس رجحان کی ترجمانی پرفل چندر رائے یا نیل رتن سرکار کے کاروباری جوکھموں، ستیش چندر مکھرجی کے اخبار، "ڈان" اور ڈان سوسائٹی (جس نے قومی تعلیم کی تحریک میں تخم کارانہ رول ادا کیا تھا) اور سب سے بڑھ کر رابندر ناتھ ٹیگور نے کی، جس کے لیے وہ اپنے سودیشی خطاب (1904) میں ہندو سماج کے احیاء کے ذریعے دیہاتوں میں کام کرنے کے لیے ایک واضح پروگرام کا خاکہ پہلے ہی پیش کر چکے تھے۔ اشونی کمار دت کی "سودیشی بندھو سمتی" باریسال (باقرگنج) نے اپنی پہلی سالانہ

رپورٹ (ستمبر 1906) میں یہ دعویٰ کیا تھا کہ اس نے 89 مصالحتی کمیٹیوں کے ذریعے 523 دیہی تنازعات کا فیصلہ کرلیا تھا۔ اسی طرح اپریل 1907 کے ایک کتابچے میں یہ کہا گیا تھا کہ اس وقت بنگال بھر میں تقریباً ایک ہزار دیہی کمیٹیاں کام کررہی تھیں۔ ان سرگرمیوں میں وہ تمام باتیں شامل نہیں ہیں جو بعد میں سودیشی، قومی اسکولوں اور دیہات میں تعمیری کاموں سے متعلق گاندھیائی پروگرام کا حصہ بن گئی تھیں۔

رابندرناتھ کی اصطلاح میں آتم شکتی (خود طاقتی) جیسی کسی چیز کی تعمیر کا ایسا سست رفتار اور خود تحقیری طریقہ کار بنگال کے ان بے چین تعلیم یافتہ نوجوانوں کے لیے بہت کم کشش رکھتا تھا جو خود کو نسبتاً زیادہ شدید سیاسی انتہاپسندی کی طرف راغب محسوس کرنے لگے تھے۔ بپن پال کے نیو انڈیا، اربندو گھوش کے بندے ماترم، اور برہمو بندواپادھیائے کے سندھیا جیسے اخبارات نیز بریندر کمار گھوش سے وابستہ گروپ کے اخبار 'یوگانتر' وغیرہ 1906 سے سوراج کے لیے جدوجہد کی اپیل کرتے آرہے تھے، جیسا کہ بعد کے واقعات سے بھی ظاہر ہوگیا، انتہاپسند اس سے کم پر بھی راضی ہونے کے لیے تیار تھے۔ مثلاً جنوری 1907 میں تلک نے آدھی روٹی بھی قبول کرلینے کی رضامندی ظاہر کی تھی، اگرچہ ان کا عندیہ یہی تھا کہ مناسب وقت آنے پر وہ پوری روٹی بھی حاصل کرلیں گے، چنانچہ بنیادی اختلاف رائے طریقہ کار کو لے کر تھا اور اس سلسلے میں بہت ہی کلاسیکی بیان اربندو گھوش کا ہے جو کہ ان کے جریدے بندے ماترم میں اپریل 1907 کے سلسلہ وار مضامین میں پیش کیا گیا تھا؛ اور جسے بعد میں متحملانہ مزاحمت کا فلسفہ (Doctorine of Passive Resistance) کے عنوان سے الگ سے بھی شائع کیا گیا تھا۔ انھوں نے ان مضامین میں "پرامن آشرموں، سودیشی اور خود امدادی جیسے آدرشوں کو "ناکافی" بتاتے ہوئے برطانوی اشیاء، سرکاری تعلیم، عدلیہ اور انتظامیہ کے مسلسل اور منظم بائیکاٹ کا ایک واضح پروگرام پیش کیا تھا جس میں سودیشی صنعتوں، قومی اسکولوں اور مصالحتی عدالتوں کا قیام بھی شامل تھا۔ اس کے علاوہ نامنصفانہ قوانین کی سول نافرمانی، حکومت کے وفاداروں کے سماجی بائیکاٹ نیز انگریزوں کی زیادتیوں کے برداشت سے باہر ہوجانے کی صورت میں مسلح جدوجہد کا راستہ اپنانے کی بات بھی شامل تھی۔ 21 نومبر 1906 کے 'سندھیا' میں بھی اسی طرح کی بات کہی گئی تھی۔ "اگر چوکیدار، کانسٹبل، ڈپٹی، منصف اور کلرک...... اور سپاہی کا تو خیر ذکر ہی کیا، یہ سب اپنے اپنے فرائض انجام دینا بند کردیں تو اس ملک میں فرنگی حکمرانی ایک لمحے میں ختم ہوجائے گی۔" اس طرح ہمیں عدم تشدد کے ماسوا ان تمام سیاسی پروگراموں کی جھلک ملتی ہے جو بعد میں گاندھیائی مرحلے میں اختیار کیے گئے؛ یعنی ٹیکس اور لگان نہ دینے کی اپیلیں بھی ملتی ہیں جنھیں اربندو گھوش نے اپنے اپریل 1907 کے مضامین میں خارج از سوال قرار دیدیا تھا کیونکہ اس طرح کی اپیلیں بنگال کے ایک ایسے

زمیندار فرقے کے خلاف جاتی تھیں جسے بنیادی طور پر دیش بھکت سمجھا جاتا تھا۔

عملی اعتبار سے بنگال کے انتہا پسندوں نے اپنی ساری توانائی لفظی یا ادبی تشدد میں اور کانگریس کی تنظیم کے معاملے پر لڑائی میں ضائع کردی، یہ دوسری بات ہے انھوں نے بھی ضلع کی سطح پر تنظیموں اور کمیٹیوں کے قیام میں اور محنت کش طبقوں کو ان کے مسائل کے حل کے سلسلے میں موثر قیادت فراہم کرنے میں اہم رول ادا کیا۔ بہر حال 1907 سے ہی عوامی تحریک کے تناظر کو اندر سے ہی چیلنج بھی کیا جانے لگا تھا۔ یہ چیلنج ہر ضلع میں انگریز افسروں کی تعداد کے بارے میں سوال اٹھا کر کیا جارہا تھا۔ یہ کہا جارہا تھا کہ عزم مصمم کے ذریعے انگریزی حکومت کو ایک دن میں ہی چلتا کیا جاسکتا ہے......

''اگر ہم اس وقت اسی طرح ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھے رہے اور پس و پیش کا شکار رہے اور پوری قوم مایوسی کا شکار ہوتی رہی، تو ہم کبھی بھی کچھ نہیں کر سکیں گے......اے دیش بھکتو! کیا خون کے بغیر یہ ملک کبھی خواب غفلت سے بیدار ہو سکے گا''۔ (یوگانتر 26 اگست 1907)۔

سیاسی طریقہ کار یا سیاسی نصب العین سے متعلق اختلاف رائے کے ساتھ ساتھ تہذیبی قدروں کے سوال پر جدت پسندی اور ہندو احیاء پسندی کو لے کر بھی ایک تنازعہ چل رہا تھا۔ سودیشی موڈ بالعموم سیاست کو احیاء پسندی سے جوڑنے کی کوشش سے وابستہ تھا جس سے سرگرم کارکنوں کا حوصلہ بڑھانے اور عوام کے ساتھ رابطہ قایم کرنے کے ایک موثر وسیلے کا کام لیا جارہا تھا۔ چنانچہ سریندر ناتھ کا یہ کہنا تھا کہ سودیشی طریقہ کار کو سب سے پہلے وہی مندروں میں بروئے کار لائے تھے۔ قومی تعلیم کے منصوبوں میں اکثر احیاء پسندی کا عنصر بھی شامل ہوتا تھا اور بائیکاٹ کے نفاذ میں ذات پات کے اثرات کو بھی کام میں لایا جاتا تھا۔ انتہا پسند لیڈروں نے مئی 1906 میں شیواجی اتسو پر اصرار کیا جو مکمل طور پر مورتی پوجا پر مبنی تھا جبکہ انقلابی سیاست اور جارحانہ ہندو ازم کو امرت بازار پتریکا، سندھیا یا 'یوگانتر' کے صفحات میں برابر کی جگہ دی جاتی تھی۔ لیکن ہر گروپ میں کچھ مخالف لوگ بھی تھے۔ 'سنجیونی' یا 'پربھاسی' جیسے براہمو سماجی اخبارات ہندو احیاء پسندی پر کڑی نکتہ چینی کر رہے تھے۔ ان اخبارات کا یہ کہنا تھا کہ ''جس طرح کی دیش بھکتی میں ماضی کی شان میں قصیدے پڑھے جاتے ہوں اور اسے ایک ایسا آئیڈیل مانا جاتا ہو جس میں مزید بہتری کی گنجائش نہ ہو، اور جو مزید ترقی کی ضرورت کی نفی کرتی ہو، وہ دیش بھکتی ایک طرح کی بیماری ہے۔'' (شیوناتھ شاستری، پربھاسی، جیٹھ، 1313) کرشن کمار مترا کی اینٹی سرکلر سوسائٹی نے اپنے ہندو مسلم ورکروں اور ہمدردوں کے مد نظر ہی شیواجی اتسو کا بائیکاٹ کیا تھا اور یہاں تک کہ برہم بندھو اپادھیائے جیسے کچھ انقلابی دہشت پسندوں نے بھی بعد میں اس وقت کی کٹر مذہبیت پر کڑی نکتہ چینی کی تھی۔ تاہم ان ساری باتوں میں دلچسپ ترین رابندر ناتھ کا ظہور ہے۔ رابندر ناتھ پر شروع کے چند برسوں میں احیاء پسندی حاوی رہی تھی مگر فرقہ وارانہ فسادات کے اثر کے تحت وہ

1907 کے وسط میں اس سے بہت جلد کنارہ کش بھی ہو گئے تھے۔ اور اپنے دو شاہکار ناولوں گورا(09-1907)اور گھرے بائرے (1914) کے ذریعے اپنے عہد کی کشیدگیوں اور ابہامات کی موثر عکاسی کر چکے تھے۔

تعمیراتی کام اور عوامی ستیہ گرہ کا پروگرام بہت کم عمر ثابت ہوا اور 1908 کے آخر تک بنگال کی سیاست ایک بار پھر اعتدال پسندانہ گداگری اور انفرادی دہشت پسندی جیسے ان دو خانوں میں تقسیم ہو گئی جو ایک دوسرے کے نقیض ہونے کے ساتھ ساتھ ایک دوسرے سے جڑے ہوئے بھی تھے۔ اس دور کے سلسلے میں تاریخ کا مرکزی سوال یہ ہے کہ آخر ایسا کیوں ہوا؟ کیونکہ اس سلسلے میں انگریزوں کے ظلم و جبر جیسے کسی ایک عامل کا نام لے دینے سے حقیقت پوری طرح واضح نہیں ہوتی۔ قوم پرست حلقوں میں پولس کی زیادتیوں اور سودیشی شہیدوں کا بہت زیادہ چرچا ہوتے رہنے کے باوجود بھی 1909 تک عوامی تحریک کے سلسلے میں بنگال میں محض دس لوگوں کے خلاف اور نئے صوبے میں 105 لوگوں کے خلاف قانونی کارروائی کی گئی تھی اور اس میں بھی لوگوں کو صرف دو ہفتے سے ایک سال تک کی قید کی سزا سنائی گئی تھی۔ اس زمانے میں پولس فائرنگ کے جو دو واقعات ہوئے تھے وہ بھی جمال پور میں ریل ملازمین کی ہڑتال (اگست 1906) اور شیر پور میں مسلم فسادیوں (ستمبر 1907) سے تعلق رکھتے تھے۔ پولس فائرنگ کے ان واقعات کا سودیشی تحریک سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ اس لیے 08-1905 کی تحریک ــــــ بائیکاٹ اور سودیشی، قومی تعلیم، لیبر یونین سمیتوں اور عوامی رابطوں کے طریقہ کار ــــــ کے اہم اجزاء، ان کی داخلیجد ودلور توانائی کا گہرائی سے جائزہ لینے کی ضرورت ہے۔

بائیکاٹ اور سودیشی تحریک

بنگال میں بائیکاٹ اور سودیشی کی تاریخ سے روشن خیال طبقے کی اس تحریک کی حدود کی واضح نشان دہی ہوتی ہے جو سرسری طور پر اس اعلا طبقے کی آرزوؤں پر مشتمل تو تھی مگر جسے حقیقی معنوں میں بورژوائی طبقوں کی کوئی تائید حاصل نہیں تھی۔ بائیکاٹ کی تحریک کو ابتداء میں تھوڑی بہت کامیابی ملی۔ چنانچہ کلکتہ کے کسٹم کلکٹر نے ستمبر 1906 میں درآمد شدہ کپاس کی مقدار میں 22 فی صد، سوتی دھاگوں کی مقدار میں 44 فی صد اور جوتوں و بوٹوں کی مقدار میں 68 فیصد کمی، نمک کی مقدار میں 11 فیصد اور سگریٹ کی مقدار میں 55 فیصد کمی نوٹ کی تھی۔ مانچسٹر کے کپڑے کی بکری میں جو بھاری کمی واقع ہوئی تھی وہ کافی حد تک تجارتی شرطوں کے سلسلے میں مارواڑی تاجروں اور برطانیہ کے پیداکاروں کے درمیان تنازعہ کھڑا ہو جانے کا نتیجہ تھی۔ اس تنازعے کی وجہ سے ہی اگلے سال اکتوبر 1905 میں Lucky Day کے ٹھیکے 32.000 سے گھٹ کر محض 2500 رہ گئے

تھے۔ اس تنازعے کے حل ہو جانے پر مارواڑیوں نے منیمی کا کام پھر سے شروع کر دیا تھا جبکہ اضلاع میں شاہا برادری کے بیوپاری سماجی بائیکاٹ کا اہم نشانہ بنے کیونکہ یہ لوگ کاروباری فائدے پر دیش بھگتی کو ترجیح دینے کے لیے تیار نہیں تھے۔ دوسری طرف بمبئی کے مل مالکان نے بنگال کی متعدد اپیلوں کے باوجود موقع سے فائدہ اٹھا کر قیمتیں بڑھا دی تھیں۔ بہر حال اس کے باوجود بھی بمبئی کے مل بڑھیا سوت تیار نہیں کر سکتے تھے اور کپڑا مانچسٹر سے ہی در آمد کیا جا رہا تھا۔ اس طرح بمبئی نے بائیکاٹ کی تحریک میں سرگرم حصہ نہیں لیا۔ یہ بات بھی بہت اہمیت رکھتی ہے کہ در آمداتی مقدار میں سب سے زیادہ کمی جوتے اور سگریٹ جیسی چیزوں میں واقع ہوئی اور کسٹم کلکٹر کے بیان کے مطابق ان چیزوں کی زیادہ تر مانگ کلرکوں اور وکیلوں جیسے اعلا متوسط طبقوں میں تھی (گورنمنٹ آف انڈیا، ہوم پبلک، بی، اکتوبر 1906، نوٹ نمبر 13)۔

اس میں شک نہیں کہ سودیشی ماحول کی وجہ سے کھادی، ریشمی کام، اور بعض دوسری روایتی دست کاریوں کو نئی زندگی ملی۔ یہ ایک ایسی بات ہے جس کا ذکر 1908 کے دوسرکاری جائزوں میں بھی کیا گیا تھا۔ اس کے علاوہ اسی سے جڑا ہوا اور گاندھیائی فلسفے سے قریب ایک دوسرا رجحان یہ تھا کہ دانش ور طبقہ دست کاریوں کو بھاری صنعت کے مضر اثرات سے بچانے کے ایک ہندوستانی یا مشرقی طریقہ کار کے طور پر بھی پیش کر رہا تھا۔ مثال کے طور پر 1900 میں ستیش چندر مکھرجی نے صنعتی انقلاب کی تباہ کاریوں کا ذکر کرتے ہوئے Engles کا حوالہ دیا تھا اور صرف ناگزیر میدانوں میں ہی بڑی صنعتوں کی تائید کی تھی۔ وہ حتی الامکان چھوٹی چھوٹی اور ایک ہی گھرانے تک محدود رہنے والے صنعتوں کے حق میں تھے۔ اعتدال پسندانہ معاشیات سے اس طرح کا نظریاتی انحراف (جو کہ زیادہ تر احیاء پسندی سے ہی تعلق رکھتا تھا) بھی جدید صنعتوں کے فروغ میں حائل نہیں ہو سکا۔ جوگیندر چندر گھوش نے طالب علموں کو تکنیکی تعلیم کے حصول کے لیے دوسرے ملکوں (خصوصاً جاپان) بھیجنے کے لیے مارچ 1904 میں ایک ایسوسی ایشن بھی قائم کی تھی۔ اگست 1906 میں کافی اہتمام کے ساتھ بنگا لکشمی کاٹن، ملز کی شروعات کی گئی جس کے لیے مشینیں سہرام پور کارخانے سے حاصل کی گئی تھیں اور چینی مٹی کے برتن (کلکتہ پوٹری ورکس 1906)، چمڑے کی تیاری، صابن سازی، ماچس سازی، اور سگریٹ سازی کے متعدد بڑے اور کامیاب کاروبار شروع کیے گئے۔ اس طرح کے کاروبار کے سرپرستوں اور تاجروں میں قاسم بازار کے مندر آنندی جیسے چند بڑے زمیندار اور زیادہ تر پیشہ جاتی لوگ شامل تھے۔ اصل سرمائے کی کمی اس طرح کے کاروبار کے پھیلاؤ میں مانع ہوئی کیونکہ ایک سرکاری رپورٹ میں کلکتہ کے ایک سرکردہ تاجر کے بیان کے مطابق، ملک میں پہلے سے موجود مضبوط کاروباری برادری کا خیال یہ تھا کہ ''صنعتی کاروبار میں سرمایہ کاری کے مقابلے میں در آمدی اشیاء کی تجارت کے ذریعے روپیہ کمانا زیادہ آسان تھا'' کالی

شنکر سکل نے سودیشی کے موضوع پر اپنے ایک کتابچے میں یہ لکھا تھا کہ ایک یا دو ملیں اور کارخانے شروع کرنے سے پہلے تقسیم کے نظام میں بہتری لانے، تجارت کے ذریعے اپنی حالت کو مستحکم بنانے اور ایک نیا بیوپاری طبقہ تیار کرنے کی کوشش کرنی چاہیے، کیونکہ پرانا بیوپاری طبقہ یقیناً دیش بھگتی کے جذبات سے عاری ہے۔ بہر حال سکل کے ان خیالات پر بہت کم لوگوں نے توجہ دی۔ اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ سودیشی تحریک بنگال کی معشیت پر انگریزوں کی مضبوط گرفت کے لیے کبھی بھی خطرہ ثابت نہیں ہو سکی۔

قومی تعلیم

سودیشی بنگال میں دوسرے معاملات کی طرح ہی قومی تعلیم کے معاملے میں بھی کافی تنوع ملتا ہے، یعنی تکنیکی تعلیم کے لیے اپلیں بھی جاری کی جارہی تھیں اور مقامی زبانوں کو ذریعہ تعلیم کی حیثیت دینے کا مطالبہ بھی کیا جارہا تھا۔ (اور اس میں رابندر ناتھ پیش پیش تھے)۔ اسی طرح ایک طرف تو ٹیگور تعلیم کے سنکرتیانے پر زور دے رہے تھے اور دوسری طرف ستیش مکھرجی کی ڈان سوسائٹی چیدہ نوجوانوں کے لیے ایک "اعلا اور برتر ثقافت" کی اسکیم کے تحت روایتی تعلیم اور جدید تعلیم کو ہم آہنگ کرنے کے منصوبے تیار کر رہی تھی۔ روزگار کے کم امکانات کی وجہ سے قومی تعلیم نوجوانوں کی اکثریت کو متاثر کرنے میں ناکام رہی۔ البتہ دو سال بعد جو چیزیں باقی رہ گئی تھیں ان میں ایک تو بنگال نیشنل کالج تھا (ابتداء میں جس کا منصوبہ مارچ 1906 میں قائم کی گئی نیشنل کاؤنسل آف ایجوکیشن کے تحت ایک متوازن یونیورسٹی کے طور پر تیار کیا گیا تھا اور جس کے ساتھ ایک کالج نے بھی الحاق نہیں کیا تھا) اور دوسرا بنگال ٹیکنیکل انسٹی ٹیوٹ تھا جسے اعتدال پسند گروپ سے تعلق رکھنے والے اس حلقے نے قائم کیا تھا جو تنظیم سے الگ ہو گیا تھا۔ ان کے علاوہ اور ان سب سے اہم وہ قومی اسکول تھے جن کی تعداد مغربی بنگال اور بہار میں تقریباً ایک درجن اور مشرقی بنگال کے اضلاع میں بہت زیادہ تھی۔ وہ تو بعد کے حالات (خصوصاً قومی اسکولوں کا جال دیہات تک پھیلا کر پرائمری تعلیم پر کنٹرول قائم کرنے کی کوشش) تھے جن کی وجہ سے تھوڑے سے عرصے کے لیے حکام چوکنا ہو گئے تھے۔

-(Home Political A, March .1909, Page 10-11)

اس طرح کے اسکول میمن سنگھ، فرید پور، اور باقر گنج اضلاع سے تعلق رکھتے تھے جن میں بڑی اکثریت مسلمان اور نچلی ذات کے نام سودر طالب علموں کی تھی۔ کلکتہ کی نیشنل کاؤنسل نے اس طرح کے ضلع اسکولوں یا گرام اسکولوں کو عام طور پر نظر انداز کر رکھا تھا (کاؤنسل نے ان اسکولوں پر 1908 میں 125,000 روپے کے بجٹ میں سے محض 12,000 روپے خرچ کیے تھے)۔ مشرقی بنگال

میں وہ مخصوص اسکول باقی رہ گئے جنھیں انقلابیوں کی بھرتی کی وجہ سے مرکزی حیثیت حاصل ہو گئی تھی۔ ان میں سب سے مشہور ڈھاکہ کے قریب "سونارنگ نیشنل اسکول" تھا۔

محنت کش طبقے میں بے چینی

آندریو فریزر کے عہد (8-1903) میں بنگال انتظامیہ، کے عنوان سے ایک سرکاری سروے میں "صنعتی بے چینی" کو اس پانچ سالہ مدت کی ایک واضح خصوصیت کا نام دیا گیا تھا اور "پیشہ ور احتجاج کاروں کے رول کو ایک بہت ہی نادر مظہر بتایا گیا تھا۔ قیمتوں میں بھاری اضافے اور نسلی اہانت کے واقعات کے نتیجے میں، گوروں کے کنٹرول والے کاروباری اداروں میں جو کہ زیادہ تر بنگال میں ہی تھے، جو ہڑتالیں ہوتی تھیں انھیں اب قوم پرست حلقوں اور اخباروں کی ہمدردی بھی حاصل ہونے لگی تھی اور مالی امداد بھی ملنے لگی تھی۔ بلکہ ٹریڈ یونینوں کے قیام میں بھی تعاون حاصل ہونے لگا تھا۔ اس سلسلے میں بیرسٹر اشونی کمار بنرجی، بیرسٹر پربھات کسم رائے چودھری اور بیرسٹر اپورب کمار گھوش نیز شمالی کلکتہ میں ایک چھوٹے سے پریس کے مالک پریم توش بوس کو بجا طور پر مزدور طبقے کا ابتدائی رہنما قرار دیا جا سکتا ہے۔ ستمبر 1905 میں ہوڑہ کی برن کمپنی سے 247 بنگالی کلرکوں کے اجتماعی واک آوٹ کی پورے سودیشی حلقے نے ستائش کی تھی۔ یہ واک آوٹ ایک اہانت آمیز ضابطۂ عمل کے خلاف احتجاج کے طور پر کیا گیا تھا۔ اگلے ماہ کلکتہ کی ٹرام میں بھی اسٹرائک ہوئی تھی جسے بعد میں بنرجی اور گھوش کی کوششوں کی وجہ سے حل کر لیا گیا تھا۔ 16 اکتوبر کی اخباری رپورٹوں سے ایک ایسی عام ہڑتال (بندھ) کا بھی پتہ چلتا ہے جس میں بیشتر دفاتر بند رہے تھے، سڑکیں سنسان ہو گئی تھیں اور کچھ جوٹ ملوں اور ریل ورکشاپوں میں بھی ہڑتال رہی تھی۔ اس کے فوراً ہی بعد حقیقی لیبر یونین وجود میں آئی۔ سرکاری پریسوں میں زبردست ہڑتال کے دوران 21 اکتوبر کو پرنٹرس یونین قائم کی گئی۔ جولائی 1906 میں ایسٹ انڈین ریلوے میں کلرکوں کی ہڑتال کے نتیجے میں ریلوے مینیونین قائم ہوئی۔ قلیوں کو بھی ساتھ ملانے کے لیے آسنسول رانی گنج، اور جمال پور اسٹیشنوں پر بڑے بڑے جلسے ہوئے جن سے اے۔ سی۔ بنرجی۔ اے کے گھوش اور پریم توش بوس کے علاوہ بپن پال، شیام سندر، چکرورتی اور لیاقت حسین جیسے سودیشی لیڈروں نے بھی خطاب کیا تھا۔ 27 اگست کو جمال پور ریلوے ورکشاپ میں ہڑتال میں بڑے پیمانے پر پرتشدد دنگا بھی کود پڑے تھے جن پر فائرنگ کی نوبت بھی آ گئی تھی۔ بہرحال یہ ہڑتال ناکام رہی تھی اور اس کے ساتھ ہی یونین بھی ٹوٹ گئی تھی۔ 1905 اور 1908 کے دوران جوٹ ورکروں نے بھی بار بار ہڑتال کی جس سے مختلف اوقات میں 37 میں سے 18 جوٹ ملیں متاثر ہوئیں۔ اے۔ سی۔ بنرجی کی نجی تحریروں سے پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے اگست 1906 میں بج بج (Budge Budge) میں "انڈین

مل ہینڈس یونین منظم کرنے کی کوشش کی تھی، ان تحریروں سے اس وقت کی مزدور تحریک کے مسائل کی بھی نشان دہی ہوتی ہے۔ مثلاً یہ کہ مزدوروں کے ساتھ قرار نامے دلالوں (خصوصاً کلرکوں) اور سرداروں کے وسیلے سے ہوتے تھے۔ بج بج جوٹ مل کے 28 مزدوروں کے دستخط سے تیار کی گئی ایک یادداشت میں اس طرح کے لوگوں کو استحصال کار بتایا گیا ہے جو کہ رشوت کے علاوہ پوجا کے نام پر بھی رقمیں وصول کرتے تھے۔

مزدور تحریک اپنے عروج کے زمانے میں اتنی خطرناک معلوم ہونے لگی تھی کہ ایک اینگلو انڈین جریدے Pioneer نے 27 اگست 1906 کو کانی گھن گرج کے ساتھ یہ لکھا تھا کہ "کوئی بھی سیاست داں اپنے دل کی آواز پر تقسیم کے خلاف احتجاج کر سکتا ہے لیکن "جب وہ نادان مزدوروں کے اندر بے چینی پیدا کر کے پورے صوبے کی امیدوں کو داؤ پر لگا دینے کی کوشش کرتا ہے تو یہی وہ وقت ہوتا ہے جب قانون اور نظم وضبط میں یقین رکھنے والی حکومت کو آگے آنا پڑتا ہے"۔ انتہاپسند انہ رجحانات رکھنے والے بعض اخبارات کو سیاسی نوعیت کی عام ہڑتال میں روسی طریقہ کار اختیار کیے جانے کے امکانات نظر آرہے تھے۔ پال کو جیل میں ڈال دیئے جانے کے بعد "نباشکتی" نے 14 ستمبر 1907 کو لکھا تھا کہ "آج کے روسی مزدور پوری دنیا کو یہ بتارہے ہیں کہ ظلم وزیادتی کے دور میں احتجاج کے کون سے طریقے اختیار کرنے چاہئیں۔ کیا ہندوستانی مزدور ان سے کچھ نہیں سیکھیں گے"۔ بہر حال اس طرح کی ساری باتیں محض توقعات ہی ثابت ہوئیں۔ 1908 میں تلک کے خلاف مقدمے کے موقع پر بمبئی کی عام ہڑتال کے ماسوا بعض معنوں میں کوئی سیاسی ہڑتال ہی نہیں ہوئی۔ چائے باغات اور کالوں میں کام کرنے والے مزدور ہڑتال سے غیر متاثر رہے۔ سودیشی حلقے نے صرف کلرکوں سے یا محض بنگالی جوٹ مزدوروں سے ہی رابطے قائم کیے تھے (اسی وجہ سے فورٹ گلاسٹر یا بج بج جیسے ملوں کو اہمیت حاصل ہے جہاں اندرون ملکی عنصر کسی دوسری جگہ کے مقابلے میں بہت کم اہمیت رکھتا تھا) اور 1908 کے موسم گرما کے بعد مزدوروں کی تحریک میں قوم پرستوں کی دلچسپی اچانک اور بالکل ہی ختم ہو گئی جس کی کہ 22-1919 سے پہلے تجدید نہیں ہو سکی تھی۔

سمیتیاں (Samitis)

سودیشی دور کی ایک بہت اہم کامیابی یہ تھی کہ سمیتیوں، یا دوسرے لفظوں میں قومی رضاکار تحریک کا جال سا پھیلتا چلا گیا تھا۔ اس طرح کی تنظیموں کو بعض اوقات دہشت پسند سوسائٹیوں کے زمرے میں رکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ درحقیقت 1908 کے موسم گرما تک ان سمیتیوں کی حیثیت ایسی کھلی تنظیموں کی تھی جو مختلف قسم کی سرگرمیوں میں ملوث تھیں، اپنے ممبروں کو جسمانی اور

اخلاقی تربیت دیتی تھی، وبا پھیلنے یا مذہبی تہواروں کے موقعوں پر خدمت خلق (سوشل ورک) انجام دیا کرتی تھیں، مختلف طریقوں سے سودیشی کی تبلیغ کرتی تھیں، دست کاریوں، اسکولوں، مصالحتی عدالتوں اور دیہی سوسائٹیوں کی تنظیم کرتی تھیں اور تحملانہ مزاحمت کے طریقوں کو روبہ عمل لاتی تھیں۔ کلکتہ کے علاوہ، جہاں پولس کی ایک رپورٹ کے مطابق 1907 میں اس طرح کی 19 سمیتیاں سرگرم تھیں، اس تحریک کا زیادہ زور مشرقی بنگال میں تھا۔ اس طرح باقرگنج، فرید پور، ڈھاکہ اور میمن سنگھ اضلاع پر مشتمل ایک وسطی بلاک سا بن گیا تھا (جہاں پانچ بڑی سمیتیاں وجود میں آئی تھیں جنھیں جنوری 1909 میں ممنوع قرار دیدیا گیا تھا)۔ رنگ پور، تیپرا، سلہٹ، نیز دریائے ہگلی کے مشرق میں واقع پرانے صوبے کے ایک حصے میں مضبوط تنظیمیں قائم تھیں۔ سب ساگر، گوالپاڑہ، اور گاروہلز کے ماسوا باقی اضلاع میں کچھ سوسائٹیاں کام کر رہی تھیں۔ جون 1907 کی پولس کی ایک رپورٹ میں مشرقی بنگال میں رضاکاروں کی تعداد 8485 بتائی گئی تھی، سب سے زیادہ یعنی تقریباً 2600 رضاکار ڈھاکہ اور باقرگنج میں تھے۔ دوسرے معاملات کی طرح ہی 'سمتی تحریک' کے اندر بھی کافی تنوع تھا۔ چنانچہ کلکتہ کی سرکلر مخالف سوسائٹی اپنے سیکولر انداز فکر پر ڈٹی رہی تھی (یہ وہ واحد سمتی تھی جس میں لیاقت حسین، ابوالحسنین، دیدار بخش اور عبدالغفور جیسے اہم مسلم ممبر شامل تھے)۔ باریسال کی سودیشی بندھو سمتی کو ایک مضبوط عوامی بنیاد حاصل تھی۔ 1909 میں اس کی 175 دیہی شاخیں تھیں اور مسلسل خدمت خلق (خصوصاً 1906 میں قحط سالی کے دوران) کی وجہ سے اس کے لیڈر اشونی کمار دت کو اپنے ضلع کے کسانوں، ہندوؤں اور مسلمانوں میں زبردست مقبولیت حاصل تھی۔ اس کے برخلاف ڈھاکہ کی انوشیلن سمتی کی ساری توجہ شروع سے ہی خفیہ تربیت پر مرکوز تھی۔ اس سمتی کی بنیاد پولن داس نے قائم کی تھی۔ بہر حال 1908 تک عوام سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش ہی ان سمیتیوں کا اصل منتہا تھی۔ یہ کوشش بھی متنوع بلکہ ایک دوسرے کے مخالف طریقوں سے کی جارہی تھی۔ اس کے لیے صرف اخبار ورسائل، کتابچوں اور تقریروں ہی سے کام نہیں لیا جارہا تھا بلکہ وطنی گیتوں، ڈراموں، کا بھی سیلاب سا آگیا تھا اور جاترا جیسے عوامی ماس میڈیا کو بھی بروئے کار لایا جارہا تھا۔ بہر حال عوام کے درمیان رابطے کے لیے ہندوازم کو وسیلہ بنایا گیا۔

تاہم 09-1908 کے دوران، جوکہ حکومت کے ظلم وزیادتی کا پہلا مرحلہ تھا، یہ کھلی ہوئی سمیتیاں یا تو غائب ہو گئیں (سودیشی بندھو سمتی) یا خفیہ دہشت گرد تنظیم کی شکل اختیار کر گئیں۔ اشونی کمار دت کی تنظیم بھی کسانوں کو اپنا ممبر بنانے میں کامیاب نہیں ہو سکی تھی (اس کے جلسوں میں لوگ بہت کم تعداد میں شریک ہوتے تھے) اور گرام سمیتیوں میں بھی اکثریت دیہی بھدرلوک (اشرافیہ) کی ہی ہوتی تھی۔ یہ بات کافی اہمیت رکھتی ہے کہ سروپ کھاتی (باقرگنج) جیسی گرام سمتی

کے تقریباً نصف رضاکار وہ لوگ تھے جن کے مفادات پٹہ داری سے وابستہ تھے (ہوم، پولیٹکل، ڈپوزٹ، اکتوبر 1907، این 19)۔ بیشتر سودیشی مقدمے زمین داری اہل کاروں اور مسلم فروخت کنندگان سے ہی متعلق ہوتے تھے۔ چنانچہ بائیکاٹ کی تحریک سے فائدہ اٹھا کر زمیندار گاؤں کا ہاٹ بند کرادیا کرتے تھے۔ اسی طرح زمیندار یا پٹہ دار اپنے لگان داروں یا بٹائی داروں کے خلاف دباؤ کے لیے بائیکاٹ کے طریقہ کار کو بھی کام میں لاتے تھے۔ بعد میں رابندر ناتھ ٹیگور نے اپنے ناول "گھرے بائرے" میں بہت موثر انداز میں اس بات کی عکاسی کی ہے کہ کس طرح ایک ظالم زمیندار ہرلش کنڈو ایک سودیشی ہیرو بن جاتا ہے۔ یہ بات رابندر ناتھ کے ذہن کی اختراع نہیں تھی۔ اس کی گوہجانگل (ضلع میمن سنگھ) کے نومبر 1907 کے ایک مقدمے سے بھی ملتی ہے جس میں ایک مسلم بٹائی دار نے اپنے ہندو زمیندار پر الزام لگایا تھا کہ اس نے اپنی بٹائی زمین دار کی جوت سے نکال لینے کی غرض سے اسے دہشت زدہ کرنے کے لیے اس کے مانچسٹر کے کپڑے جلا دیے تھے۔

ہندو مسلم روابط

اس طرح یہ صورت حال انگریزوں کی 'لڑاؤ اور حکومت کرو' کی پالیسی کے لیے بہت سازگار ثابت ہوئی۔ اکتوبر 1907 میں شمالی کلکتہ میں پولس نے سودیشی تحریک سے ہمدردی رکھنے والوں کی پٹائی کی تھی۔ اس معاملے میں پولس کو، نجی تحقیقاتی رپورٹوں کے مطابق، ھنگروں، مہتروں اور بھنگیوں وغیرہ پر مشتمل بدمعاش گروپوں کی تائید حاصل تھی۔ مگر اس سے بھی زیادہ خطرناک بات یہ تھی کہ مسلمانوں میں علاحدگی پسندی تیزی سے بڑھتی جارہی تھی۔ فرقہ وارانہ اتحاد کے لیے بار بار اپیلوں اور ہندو مسلم بھائی چارے کے اثرانگیز واقعات (مثلاً 23 ستمبر 1905 کو کلکتہ میں دس ہزار طلباء کا ایک مخلوط جلوس نکالا گیا تھا) اور غزنوی، رسول، دین محمد، دیدار بخش، منیر الزماں، اسماعیل حسین سراجی، عبدالغفور اور لیاقت حسین جیسے انتہائی سرگرم اور سنجیدہ مسلم سودیشی مظاہرین کی موجودگی کے باوجود بھی انگریزوں کا یہ پروپیگنڈہ کسی حد تک کامیاب رہا کہ نئے صوبے کی تشکیل سے مسلمانوں کے لیے روزگار کے مواقع بڑھ جائیں گے۔ اس پروپیگنڈے کے نتیجے میں اعلا اور متوسط طبقے کے مسلمان سودیشی تحریک سے کنارہ کش ہونے لگے تھے۔ سلیم اللہ گروپ اور (اکتوبر 1906 میں ڈھاکہ میں قائم کی گئی) مسلم لیگ کی اعلا طبقاتی سیاست کا جائزہ بعد میں لیا جائے گا۔ بہر حال موجودہ سیاق و سباق میں اس سے کہیں زیادہ قابل ذکر وہ فسادات ہیں جو بڑی تیزی سے مشرقی بنگال کو اپنی لپیٹ میں لے چکے تھے۔ ضلع میمن سنگھ کے ایشور گنج میں مئی 1906 میں، کومیلا میں مارچ 1907 میں، میمن سنگھ ضلع کے ہی جمال پور، دیوان گنج اور بخشی گنج میں اپریل / مئی 1907 میں بھیانک فسادات ہوئے تھے۔ (ہوم، پبلک، A، مئی 1907، این 163)۔ کومیلا قصبے کے

فساد میں "بازار میں نچلی ذاتوں کے عام مسلمان پیش پیش تھے" جبکہ میمن سنگھ کے بلوؤں میں زرعی مسائل کا بھی ہاتھ تھا۔ ان فسادات میں ہندو زمیندار اور مہاجن نشانہ تھے۔ ان میں سے کچھ نے ذرا ہی پہلے ہندو مورتیوں کی دیکھ بھال کے نام پر ایشور برتی (Britti) کے نام سے اضافی لگان وصولی کرنا شروع کیا تھا۔ متعدد مقامات پر قرض نامے پھاڑ ڈالے گئے۔ یہ فسادات کبھی کبھی نادار گروہوں کے ہاتھوں متمول گروہوں کی لوٹ مار، کی شکل بھی اختیار کر جاتے تھے؛ یہاں تک کہ ہندو زمینداروں کے خلاف لوٹ مار میں ہندو مزارع بھی شامل ہوتے تھے (ہوم، پولیٹکل، اے، جولائی 1907۔ این16)۔ کہا جاتا ہے کہ مولویوں نے اس طرح کی افواہیں پھیلادی تھیں کہ انگریز نواب سلیم اللہ کو ڈھاکہ کا گورنر بنانے جا رہے ہیں جنھیں "نواب صاحب مسیحا" کے عنوان سے شائع کیے گئے ایک فرقہ وارانہ پمفلٹ میں ایک مسیحا کے طور پر پیش کیا گیا تھا۔ اس طرح ان عروج پذیر کسانوں کے ساتھ مذہبی رہنماؤں کے روابط تھے جو جوٹ صنعت کی وجہ سے تازہ تازہ خوش حال ہوئے تھے اور مسلمانوں کے پروپیگنڈہ لٹریچر (1907 کے ریڈ پمفلٹ یا بعد میں 1910 کے کرشک بندھو پمفلٹ) میں کسانوں کے کھلک یا سرمایہ دار کی حیثیت اختیار کرتے جانے کے ساتھ ساتھ استحصال کو ہندو زمینداروں اور مہاجنوں کے ساتھ منسوب کیا جا رہا تھا۔

رابندر ناتھ ٹیگور نے 08-1907 کے ایک اہم سلسلہ مضامین نیز پبنا صوبائی کانفرنس (فروری 1908) کے صدارتی خطبے میں یہ نشان دہی کی کہ ان فسادات کے لیے صرف انگریزوں کو موردِ الزام ٹھہرانا کافی نہیں ہوگا کیونکہ "شیطان کسی کمزوری کے بغیر انسان میں حلول نہیں کر سکتا" اور سب سے اہم مشکل یہ تھی کہ "ہمارے ملک میں ہم جیسے چند تعلیم یافتہ افراد اور لاکھوں دوسرے لوگوں کے درمیان ایک وسیع خلیج حائل ہے۔ جب تک اس خلیج کو پر نہیں کیا جائے گا زبانی انتہا پسندی یا دہشت پسندانہ کارروائیوں جیسے مختصر راستوں سے منزل تک پہونچنا ممکن نہیں ہے" ۔ بہر حال ٹیگور نے دیہات میں تعمیری کام کی شکل میں جو متبادل پیش کیا تھا اور جس کی بابت انھیں یہ توقع تھی کہ زمیندار طبقہ اس میں سرپرستانہ اور قائدانہ رول ادا کرے گا (جیسا کہ وہ خود اپنی عملداری میں کر رہے تھے)، ان تشدد پسند نوجوانوں کے لیے بہت کم کشش رکھتا تھا جو انگریزوں کی بڑھتی ہوئی زیادتیوں سے پوری طرح مشتعل ہو چکے تھے۔ پھر یہ کہ ٹیگور کے پاس عوام کو حرکت میں لانے کے لیے کوئی ٹھوس معاشی یا سماجی پروگرام بھی نہیں تھا۔ چنانچہ ان کی آواز صدا بصحرا ثابت ہوئی جس کا اعتراف ان کے ناول "گھرے بائرے" میں بھی ملتا ہے جس کے شریف مگر بے اثر اور الگ تھلگ کر دیے گئے ہیرو نکھل سنیش کو ان کے ایک سابقہ ناول 'گورا' کے رجائیت پسند ہیرو کے برعکس پیش کیا گیا ہے۔

قوم پرستوں کی بھاری اکثریت کے نزدیک مسلمان فسادی حکومت کے زر خرید ایجنٹ تھے۔

اس میں شک نہیں کہ 1907 کے ہندو مسلم فسادات ہی رضاکار تنظیم کی وجہ بنے تھے اور انتہا پسندانہ پروپیگنڈے نے جارحانہ ہندو رنگ اختیار کر لیا تھا، جو بالآخر دہشت پسندی پر منتج ہوا تھا۔ یہ دہشت پسندی ایک اعتبار سے ناگزیر ہو گئی تھی کیونکہ حکومت سے برگشتہ عوام الناس کے نزدیک انقلاب محض ایک چیدہ حلقے کے اقدام سے عبارت ہو کر رہ گیا تھا۔

دہشت پسندی کی طرف جھکاؤ

اولیں انقلابی گروپوں کی داغ بیل مدنا پور میں (جیتندر ناتھ باسو کے ذریعے) اور کلکتہ میں (پرمو تھامتر نیز بڑودہ سے اربندو گھوش کے ایلچیوں جتندر ناتھ بنرجی اور بیرندر کمار گھوش کے ذریعے قائم کی گئی انوشیلن سمتی کی شکل میں) تقریباً 1902 میں ہی پڑ گئی تھی مگر ان گروپوں کی سرگرمیاں جسمانی اور اخلاقی تربیت تک ہی محدود تھیں۔ اس وجہ سے ان گروپوں کو 1907 اور 1908 تک کوئی زیادہ اہمیت حاصل نہیں ہوئی تھی۔ بریندر کمار گھوش اور بھوپیندر ناتھ دتا کی نگرانی میں چلنے والی انوشیلن سمتی نے جسے کہ پس پردہ اربندو کا صلاح مشورہ حاصل تھا، اپریل 1906 میں یوگانتر کے نام سے ایک ہفت روزہ اخبار نکالنا شروع کر دیا تھا۔ اور اسی سال اس سمتی نے موسم گرما میں ایک دو اقدامات کی کوشش بھی کی تھی۔ (مثلاً اس سمتی نے مشرقی بنگال کے ناپسندیدہ لفٹنٹ گورنر فلر (Fuller) کو قتل کر دینے کی ناکام کوشش کی تھی) اس پہلی انقلابی نسل کے سرخیل ہیم چندر قانون گو فوجی (اور کسی قدر سیاسی) تربیت حاصل کرنے کی غرض سے ولایت گئے تھے اور پیرس میں ایک مہاجر روسی سے یہ تربیت حاصل بھی کی تھی۔ جنوری 1908 میں قانون گو کی واپسی پر کلکتہ کی ایک مضافاتی بستی مانک تالہ میں ایک ایسا ادارہ قائم کیا گیا جو مذہبی تعلیم کا اسکول بھی تھا اور بم بنانے کی فیکٹری بھی۔ لیڈروں کی اور بطور خاص بیرندر کمار گھوش کی بے احتیاطی کی وجہ سے کینڈی واقعہ قتل (30 اپریل 1908) کے چند گھنٹوں کے اندر اندر اربندو کے بشمول پورے انقلابی گروپ کو اکشوری رام باسو، پرفلا چاکی اور ایک مخصوص اذیت پسند گورے مجسٹریٹ Kingsford نے گرفتار کر لیا تھا۔ اس اثناء میں مشرقی بنگال میں دہشت پسندی نسبتاً زیادہ شدید شکل میں پروان چڑھ رہی تھی۔ اس کی پشت پر پولن داس کی ڈھاکہ انوشیلن سمتی جیسی ایک مضبوط تنظیم تھی۔ اس تنظیم کا پہلا بڑا کارنامہ بارہ (Barrah) کی ڈکیتی (20 جون 1908) تھی۔

وطنی شاعری اور دوسری بیش قیمت ثقافتی پیش رفتوں (جن میں مقامی اور علاقائی تاریخ نیز لوک روایات میں نئی دلچسپی، جے، سی بوس اور پی سی رائے کے سائنسی کارنامے اور رابندر ناتھ ٹیگور کا قائم کردہ کلکتہ کا پینٹنگ اسکول قابل ذکر ہے) سے قطع نظر انقلابی دہشت پسندی انقلابی فکر کے حامل نوجوانوں کے ذہنوں پر اثر انداز ہو کر سودیشی بنگال کی شکل میں ایک انتہائی ٹھوس ورثہ

قائم کرنے جا رہی تھی۔ یہ انقلابی تحریک کبھی ظالم افسروں اور غداروں کے قتل کے واقعات کی شکل میں نمودار ہوتی تو کبھی سرمائے کی فراہمی کے لیے ڈکیتی کی شکل بھی اختیار کر لیتی تھی اور برطانیہ کے غیر ملکی دشمنوں کی طرف سے مدد کی امید میں فوجی سازشیں بھی تیار کی جاتی تھیں۔ بہر حال یہ دہشت پسندی کبھی بھی شہری عوامی شورش کی شکل اختیار نہیں کر سکی۔

اس میں شک نہیں کہ اس اعلا طبقاتی انقلاب نے قومی تحریک کو آگے بڑھانے میں اہم رول ادا کیا۔ تحریک کے دوران انگریز ہمیشہ خوف زدہ رہے۔ مکمل آزادی کے حصول (جسے کانگریس 1930 میں اپنا نصب العین قرار دے سکی تھی) کی کوشش میں شجاعت اور بہادری کی رونگٹے کھڑے کر دینے والی نادر مثالیں قائم کی گئیں۔ ہتھیاروں اور پناہ گاہ کی تلاش میں عالم گیر سطح پر رابطے قایم کیے گئے جس کے ایسے متعدد نظریاتی عواقب سامنے آئے جن کا ہم بعد میں جائزہ لیں گے۔ مثلاً جب ہیم چندر قانون گو پیرس سے لوٹے تو وہ نہ صرف ملحد بلکہ مارکسی تصورات سے بھی متاثر ہو چکے تھے۔ بیشتر تعلیم یافتہ ہندوستانیوں بلکہ دوسرے لوگوں نے بھی دہشت پسندانہ کارناموں کی خوب ستائش کی۔ خودی رام کی شان میں لکھے گئے گیت ان کی سزائے موت کے دہائیوں بعد بھی گائے جاتے رہے تھے۔ بہر حال انگریزی حکومت کے لیے کبھی کوئی اہم خطرہ لاحق نہیں ہوا۔ دہشت پسندانہ کارناموں کے لیے یہ شاباشی دراصل دوسروں کی قربانی پر اپنی پیٹھ ٹھونکنے کے مترادف تھی۔ ابتدائی بیشتر خفیہ سوسائٹیوں کا مذہبی رنگ اتنا زیادہ گہرا تھا کہ مسلمان یا تو ان سے کنارہ کش رہے یا ان کے مخالف تھے۔ یہ دوسری بات ہے کہ بعد میں یہ مذہبی رنگ رفتہ رفتہ ہلکا پڑتا چلا گیا تھا۔ مذہب پر اتنا زیادہ زور دینے کے دوسرے منفی مضمرات بھی تھے۔ ان منفی پہلوؤں کی نشان دہی بعد میں خود ہیم چندر نے بھی کی تھی۔ نش کام کرم (بے غرض عمل) کے سلسلے میں گیتا کے فلسفے پر اتنا زیادہ زور دینے کا نتیجہ یہ ہوا کہ کسی باقاعدہ پروگرام اور مقصد کے لیے جان دینے کی جگہ شہادت برائے شہادت کا جذبہ فروغ پاتا چلا گیا۔ "مانا ہم سے کسی اسکیم کسی منصوبہ یا کسی لائحہ عمل کا تقاضہ نہیں کر رہی ہے۔ وہ ہمیں خود یہ اسکیم، یہ منصوبہ اور یہ لائحہ عمل دے دے گی" (اربندو اپریل 1908)۔ پھر یہ کہ یہ مذہب باعزت واپسی کی ایک راہ بھی ثابت ہو سکتا تھا، اس کا مشاہدہ اس وقت ہوا جب اربندو پانڈیچری نے نئے روانہ ہو گئے تھے یا پھر اس وقت جب جیتندر ناتھ اپادھیائے نے رادھا کرشن مشن کے "سوامی جی" کی حیثیت کو ترک کر دیا تھا۔

سب سے بڑھ کر یہ کہ طبقہ اعلا کے اس اقدام کا ایک نتیجہ یہ بھی ہوا کہ سیاسی جدوجہد میں عوام الناس کو شامل کرنے کی کوششوں کو ملتوی کر دیا گیا۔ اگر قومی جدوجہد میں عوام الناس کو بھی شامل کر لیا گیا ہوتا تو ایسی صورت میں نسبتاً زیادہ انقلابی پروگراموں کے ذریعے قومی معاملے کو سماجی و معاشی امور کے ساتھ مربوط کیا جا سکتا تھا۔ بنگال کی انقلابی دہشت پسندی کی سماجی حدود ظاہر

ہی تھیں: مارے جانے والے یا پھانسی پانے والے جن 186 افراد کی سرکاری فہرست 1918 میں تیار کی گئی تھی ان میں سے 165 کا تعلق تین اعلیٰ ذاتوں، براہمن، کائستھ اور ویدیہ سے تھا۔

دوسرے صوبوں میں انتہا پسندی: 1905-1908

اب تک ہماری ساری توجہ صرف بنگال پر ہی مرکوز رہی ہے۔ اب دائرہ کار کو وسیع کرنے اور اس بات پر غور کرنے کا وقت ہے کہ دوسرے صوبوں میں اس طرح کے رجحانات کس حد تک سر ابھار رہے تھے اور یہ کہ انتہاپسندوں نے کل ہند سطح پر اعتدال پسندوں کا کس طرح سامنا کیا۔

اگرچہ کرزن کے اقدامات، خاص طور پر بنگال کی تقسیم کے نتیجے میں ملک بھر میں تعلیم یافتہ حلقوں میں بڑے پیانے پر اشتعال پیدا ہو گیا تھا، مگر مقامی اور علاقائی عوامل کے تحت اس اشتعال کی نوعیت ایک دوسرے سے مختلف تھی۔ مثال کے طور پر اڑیسہ، بہار اور آسام میں مختلف پیشوں اور سرکاری ملازمتوں میں غلبے کی وجہ سے تعلیم یافتہ بنگالیوں کی عدم مقبولیت روز بروز بڑھتی جارہی تھی۔ ان صوبوں میں تعلیم کے فروغ کے ساتھ اعلا طبقے کے خلاف تحریکیں بھی شروع ہوئیں اور آخر کار بہار اور آسام کے لیے الگ الگ صوبوں کا مطالبہ شروع ہو گیا۔ فطری طور پر اس طرح کے رجحانات اور بنگال سے منسوب انقلاب پسندی کے درمیان فاصلہ قائم رہا۔ اور یہ کہ ان صوبوں تک یہ انقلاب پسندی تعلیم یافتہ بنگالی تارکین وطن کے ذریعے ہی پہونچی تھی، یہ دوسری بات ہے کہ غیر سیاسی نوعیت کے سودیشی کاروبار کے لیے تائید اور ہمدردی ظاہر کی جارہی تھی (مثال کے طور پر مدھو سدن داس کی اتکل کانفرنس نے غیر سیاسی سودیشی کاروبار کے حق میں زبردست تائید ظاہر کی تھی)۔

یہ انتہاپسندی صوبہ متحدہ میں بھی کوئی خاص اثر قائم نہیں کر سکی جہاں 1880 کی دہائی کے آخر میں کافی ہم ہے کے بعد کانگریس کی سرگرمیاں دم توڑ گئی تھیں۔ الہ آباد سے متعلق Bayly کے تجزیے میں کہا گیا ہے کہ مدن موہن مالویہ اور موتی لال نہرو جیسے لیڈر اب بھی اس خیال میں تھے کہ صوبائی حکومت کے ساتھ تعاون کی پالیسی کے ذریعے مقامی طور پر کچھ فوائد حاصل کیے جاسکتے ہیں اور اس خیال کی وجہ یہ تھی کہ Mac Donnell کی حکومت کا جھکاؤ اب کسی قدر ہندوؤں کی طرف شروع ہو گیا تھا۔ عدالتوں میں ہندی کو اردو کے مساوی درجہ دیئے جانے سے متعلق ناگری قرارداد (1900) یا ناگری پرچاری سبھا کے لیے سرکاری مالی امداد اور بنارس میں ہندو یونیورسٹی کے قیام کی تجویز کے تئیں حکومت کے مددگار رویے سے مدن موہن مالویہ مطمئن ہو کر بیٹھ گئے تھے۔ اس کے علاوہ انگریز غیر سیاسی سودیشی سے اور خاص طور پر یوپی کی چینی کے تحفظ کے مطالبوں کے تئیں بھی ہمدردی ظاہر کر رہے تھے۔ اور مالویہ نیز چنتامنی کو 1907 میں تلک نینی تال میں سرکاری اہتمام میں منعقد ہونے والی انڈسٹریل کانفرنس میں شرکت کے لیے مدعو کیا گیا

تھا۔ جنوری 1907 میں تلک کے دورۂ یوپی کے نتیجے میں طلباء میں کسی قدر ہلچل پیدا ہو گئی تھی مگر بیشتر بااثر سیاسی لیڈران سے دور ہی رہے تھے۔ مالویہ اپنی چھاپ والی سیاست میں ہندی اور ہندو احیاء پسند قوتوں کو پہلے ہی ضم کر چکے تھے، ورنہ بصورت دیگر یہ قوتیں انقلاب پسندوں کے کام آتیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی بھی روشن خیال گروپ نے کسان طبقے سے رابطہ قائم کرنے کی سنجیدہ کوشش نہیں کی تھی۔ بنارس میں ہندو احیاء پسندی کو ایک نمایاں طاقت کی حیثیت حاصل ہو چکی تھی مگر وہ بھی بنگالی اور مراٹھی برادری تک ہی محدود تھی۔ یہاں ایک انقلابی گروپ بڑی تیزی سے نمودار ہوا تھا جس نے مکھوداچرن ساڈھیائے (جو کہ دسمبر 1907 میں براہمو بندھب کے انتقال کے بعد سندھیا کے ایڈیٹر بنائے گئے تھے) کے وسیلے سے کلکتہ سے رابطہ قائم کر رکھا تھا اور سچندر ناتھ سانیال کی شکل میں ایک غیر معمولی لیڈر پیدا کیا تھا۔ یوپی کی انتہا پسندی میں بھرتی کیے گئے سندر لال جیسے طلباؤ بھی بہت جلد دہشت پسندی کے راستے پر چل پڑے۔ یہ درست ہے کہ سیاسی سرگرمیوں میں عام الناس کی شمولیت کے آثار بہت کم تھے اور صوبے (بطور خاص بنارس) کو اپنی جغرافیائی نوعیت کی وجہ سے، یعنی پنجاب اور بنگال کے درمیان واقع ہونے اور دونوں صوبوں کے دہشت پسند لیڈروں کا نقطہ اتصال ہونے کی وجہ سے بہت اہم حیثیت حاصل ہو گئی تھی۔

یہ انتہا پسندی بمبئی پریزیڈنسی کے گجراتی زبان والے اضلاع میں بھی فروغ نہیں پا سکی۔ 1907 میں فیروز شاہ مہتہ کانگریس کا اجلاس ناگ پور کی بجائے اعتدال پسندوں کے ایک محفوظ ٹھکانے، سورت میں منعقد کرانے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ صورت حال کی بعض پیچیدگیوں کا شارہ کنور جی اور کلیان جی مہتہ برادرز کے دلچسپ معاملے سے بھی ملتا ہے۔ ان دونوں بھائیوں نے کانگریس کے سورت اجلاس میں شرکت کی تھی اور تینوں بڑے رہنماؤں (لال۔ پال، بال کی تکڑی) کی تقریروں سے ان میں زبردست جوش امنڈ آیا تھا۔ اور انھوں نے پٹی دار یووک منڈل کے وسیلے سے تنظیمی کام کرنا شروع کر دیا تھا۔ ان کے تعمیری کاموں کے نتیجے میں ہی انھیں 1920 کی دہائی میں گاندھی جی کی عظیم باردولی پیش رفت کا جنم داتا قرار دیا گیا تھا۔

پنجاب

پنجاب میں، جہاں کہ روایتی بیوپاری برادریاں (جو کہ بیشتر کھتری، اگروال اور اروڑا ذاتوں سے تعلق رکھتی تھیں) کافی مضبوط پوزیشن میں تھیں، بنک کاری، بیمہ اور تعلیم جیسی تعمیری سودیشی تحریک کی جڑیں 1890 کی دہائی میں ہی پڑ چکی تھیں اور (ہندوستانی کپڑوں پر) 1895 کے تلافی محصول کے بعد ولایتی کاٹن کے بائیکاٹ کی تحریک بھی شروع ہو گئی تھی۔ کالج گروپ سے تعلق رکھنے والے آریہ سماجی اس طرح کی خود امدادی کوششوں میں لالہ ہرکشن لال کی قیادت میں

براہمو نقطہ نظر کی طرف جھکاؤ رکھنے والے حریف گروپ کے دوش بدوش نمایاں طور پر حصہ لے رہے تھے۔ لالہ ہرکشن لال گروپ اخبار ٹریبون چلا رہا تھا، ان آریہ سماجیوں (بلکہ ایک حد تک پنجابی براہمو سماجیوں) میں تعمیری سودیشی تحریک کبھی کبھی تشدد پسند ہندو شعور سے بھی خلط ملط ہو جاتی تھی۔ لالہ لاجپت رائے کی خود نوشت سے بھی صاف پتہ چلتا ہے کہ 1880 کی دہائی کے ہندی۔ اردو تنازعے کی وجہ سے بھی وہ ہندو قوم پرستی کے زبردست علم بردار بن گئے تھے۔ ان پر بچپن میں اسلام پسند باپ کا جو اثر قائم ہوا تھا سے سرکاری اسکولوں کی نصابی کتابوں نے یکسر مٹا دیا تھا جو مسلم حکمرانوں کے جور و ظلم کی کہانیوں سے بھری ہوتی تھیں۔ اس طرح لالہ لاجپت رائے نے دیوناگری رسم خط سیکھنے سے پہلے ہی ہندی کی تائید میں تقریریں شروع کر دی تھیں (جبکہ شمالی ہند کے دوسرے ہندو دانشوروں کی طرح ہی لاجپت رائے کے نزدیک بھی اردو ہی نسبتاً زیادہ فطری وسیلہ اظہار تھی)۔ کانگریس کے ساتھ اس پنجابی گروپ کے روابط۔ جو کہ اکثر دریوزہ گر، بہت زیادہ مغرب زدہ یا سیکولر سمجھے جاتے تھے وقتی نوعیت کے ہوتے تھے۔

1904 اور 1907 کے درمیان انتہاپسندی کی طرف پنجاب کا مختصر مدت کا جھکاؤ جزوی طور پر گروپ بندی کا ہی نتیجہ تھا۔ پنجاب نیشنل بنک اور بھارت انشورنش کے بندوبست کے معاملے پر لالہ ہرکشن لال کے ساتھ لالہ لاجپت رائے اور ہنس راج کے آریہ سماجی گروپ کی سخت لڑائی رہی تھی، اور آریہ سماجی گروپ نے پنجابی کے نام سے اکتوبر 1904 میں ایک اخبار بھی نکالنا شروع کر دیا تھا جس کا نعرہ تھا "ہر قیمت پر اپنی مدد آپ"۔ یہ اخبار دراصل ٹریبون کے لیے ایک چیلنج تھا ۔ بہر حال 1906 کے آتے آتے بنگال کے مقابلے میں پنجاب میں انتہاپسندی کافی کمزور پڑنے لگی تھی۔ اس کی توجہ بائیکاٹ کی بجائے تعمیری کاموں پر مرکوز رہی تھی اور اعتدال پسند کانگریسیوں بلکہ محمد شفیع اور فضل حسین کے پیروکار مسلمانوں کے ساتھ مشترکہ پلیٹ فارم کی تلاش میں بھی رہتی تھی۔

1907 میں پنجاب میں چند ماہ کے لیے حالات میں جو اتھل پتھل پیدا ہو گئی تھی وہ دراصل انگریزوں کے یکے بعد دیگرے اشتعال انگیز اقدامات کا نتیجہ تھی۔ اخبار پنجابی، کے خلاف کارروائی سے پنجاب کے تعلیم یافتہ طبقے میں برہمی کی لہر دوڑ گئی تھی۔ پنجابی کا جرم یہ تھا کہ اس نے ایک ایسے وقت میں نسلی بنیاد پر کی جانے والی توہین کا معاملہ اٹھایا تھا جبکہ سول اینڈ ملٹری گزٹ کے صفحات میں ہندوستانیوں کے خلاف سب وشتم کو افسروں نے یوں ہی نظر انداز کر دیا تھا۔ پنجابی کے مدیر کے خلاف مقدمے کے رد عمل میں پہلے فروری 1907 میں اور پھر مئی میں لاہور میں مظاہرے اور گوروں پر حملوں کے واقعات ہوئے۔ انتقال زمین ایکٹ میں مزید سختی لانے کی تجویز سے شہری علاقوں کے ہندو بیوپاری اور دیگر پیشہ جاتی گروپوں میں احتجاج کی لہر پیدا ہو گئی۔ انگریزوں کو زیادہ

خطرہ دراصل اس بات سے تھا کہ بعض علاقوں کے کسانوں، خصوصاً سکھوں، ہندوؤں اور مسلمانوں میں بے چینی کے آثار نمایاں ہونے لگے تھے۔ یہ بات انگریزوں کے لیے ایک براشگون تھی کیونکہ برطانیہ کی ہندوستانی آرمی کے لیے پنجاب ہی ایک تہائی نفری فراہم کرتا تھا۔ چناب کینال کالونی میں جو کہ لائل پور کے ارد گرد پھیلی ہوئی تھی اور آب پاشی کی سہولیات کے سلسلے میں انگریزوں کے اقدامات کے نتیجے میں کافی زرخیز ہو گئی تھی، زمین کے بڑے بڑے قطعات کسان تارکین وطن، سابق فوجیوں اور کچھ شہری سرمایہ کاروں (جن میں بعض تو 2500 ایکٹر سے بھی زیادہ زمین کے مالک تھے) کو الاٹ کیے گئے تھے۔ اس سارے علاقے پر انگریز نو آبادی افسروں کا بہت سخت بندوبست تھا۔ یہ گورے نو آبادی افسر حکم عدولی پر بھاری بھاری جرمانے عائد کرتے تھے۔ مزید یہ کہ اکتوبر 1906 میں پیش کیے گئے چناب کالونیز بل کے ذریعے اس انتظامیہ کو اور بھی سخت بنانے کی کوشش کی گئی تھی۔ سراج الدین احمد نے اپنے اخبار زمیندار، کے ذریعے اس کے خلاف احتجاجی تحریک شروع کی تھی (پنجاب کے حالات میں زمیندار کی اصطلاح مالک زمین کی بجائے صاحب زمین کے مفہوم میں استعمال ہوتی تھی) اور 1907 کے آتے آتے چناب کے نو آبادکار (جن میں ہندو مسلمان اور سکھ شامل تھے اور اس وقت ان کا فرقہ وارانہ بھائی چارہ بہت نمایاں تھا) اس وقت کسی وسیع مشرب سیاسی قیادت کے انتظار میں تھے۔ اس اثناء میں انگریزوں نے نومبر 1906 میں دوآبہ کے علاقے (امرت سر، گرداس پور اور لاہور اضلاع میں جہاں زیادہ تر سکھ کاشت کار ہی آباد تھے) میں کنیال کے پانی کی شرح میں 25 فی صد اور کبھی کبھی 50 فی صد تک اضافہ کر کے اپنی پریشانیوں میں مزید اضافہ کر لیا تھا۔ اس کے علاوہ ضلع راول پنڈی میں بھی مال گزاری میں اضافہ کر دیا گیا تھا۔ طاعون کے بھیانک اثرات اور اشیاء صرف کی قیمتوں میں اضافے کی وجہ سے بھی بے اطمینانی بڑھ رہی تھی اور مزدور طبقات بھی بے چینی محسوس کرنے لگے تھے۔ اس اثناء میں محکمہ مالیہ کے محرر بھی بار بار ہڑتال کرتے آرہے تھے اور 1907 کے اوائل میں نارتھ ویسٹرن اسٹیٹ ریلوے (این ڈبلو ایس آر لائین چناب کالونی سے گزرتی تھی) کی اسٹرائک کی وجہ سے بھی جو عام ہمدردی کا ماحول پیدا ہو گیا تھا۔ اس نے بھی پنجاب کے لفٹنٹ گورنر Denzil Ibbetson کو بری طرح چوکنا کر دیا تھا۔

اگرچہ کسانوں کو بھڑکانے کے الزام میں لاجپت رائے کو مئی 1907 میں پنجاب بدر کیا جاتا تھا، مگر جیسا کہ خود انھوں نے خود نوشت میں بھی ذکر کیا ہے، اس سلسلے میں ان کا ذاتی رول کافی محدود معلوم ہوتا ہے۔ وہ چناب کے نو آبادکاروں کے جلسوں سے خطاب کرنے کے لیے مویشیوں کے بڑے میلے کے دوران پہلی بار فروری 1907 میں اور پھر مارچ میں لائل پور گئے تھے مگر انھوں نے یہ قدم بھی کافی پس و پیش کے بعد اٹھایا تھا" میں اسے بار بار ملتوی کرتا آرہا تھا" اور

وہاں بھی انھوں نے خود کو زود کو تمام کرنے تک ہی محدود رکھا تھا۔ اجیت سنگھ (جو کہ اتفاق سے بھگت سنگھ کے چچا تھے) کی سرگرمیاں کہیں زیادہ اہم تھیں۔ انھوں نے انجمن محبان وطن، اور اس کے ترجمان بھارت ماتا (جو کہ مسلم اور ہندو ناموں سے مرکب تھا) کے ذریعے ایک انتہاپسند تنظیم قائم کرنے کی کوشش کی تھی جس سے Ibbetson کے کان کھڑے ہو گئے تھے۔ بنگال کی متعدد سمیتیوں کی طرح ہی اجیت سنگھ کے گروپ کا رجحان بھی بعد میں دہشت پسندی کی طرف ہو گیا لیکن 1907 میں اس نے اپنی ساری سرگرمیاں چناب کے نو آبادکاروں اور باڑی دوآبہ کے کاشت کاروں پر مرکوز کر کے انھیں پانی کے محصول اور مال گزاری ادا نہ کرنے کے لیے اکسانے تک محدود کر دی تھیں۔ Ibbetson نے اپنی 30/اپریل 1907 کی روئیداد میں سخت کارروائی کی بات کرتے ہوئے سرکاری مال گزاری، آب پاشی محصول اور دوسرے محصول ادا نہ کرنے جیسے اقدامات کو "ناقابل تصور حد تک خطرناک" قرار دیا تھا۔ فیروز پور میں حکومت باغی جلسوں میں بعض سپاہیوں کے بھی شرکت کرنے کی رپورٹیں تھیں اور حکومت نے راول پنڈی کے ان پانچ سرکردہ وکیلوں کی پریکٹس پر پابندی لگا دینے کی کوشش کی بھی کی تھی جنھوں نے اجیت سنگھ کے لیے ایک جلسے کا اہتمام کیا تھا۔ حکومت کی اس کوشش کے خلاف دوسرے شہروں میں بھی مظاہرے ہوئے (اس سلسلے میں اسلحہ خانہ کے مسلم اور سکھ ملازمین نیز ریلوے انجینیئرنگ کے ملازمین نے ہڑتالیں بھی کی تھیں اور گوروں کے بنگلوں پر حملوں کے واقعات بھی ہوئے تھے)۔

پنجاب میں انتہاپسندی کا غبار جتنی تیزی سے اٹھا تھا، اتنی ہی تیزی سے بیٹھ بھی گیا۔ تاہم مئی 1907 میں سیاسی جلسوں پر پابندی اور لالہ لاجپت رائے اور اجیت سنگھ کے پنجاب بدر کر دیے جانے کے بعد حکومت نے بڑی چالاکی سے بعض رعایتوں کے ذریعے ان سخت اقدامات میں توازن پیدا کرنے کی کوشش کی۔ مثلاً وائسرائے نے چناب کالونیز بل کو ویٹو کر دیا۔ پانی کی شرحوں میں کٹوتی کی گئی اور پنجاب بدر لوگوں کو ستمبر 1907 میں رہا کر دیا گیا۔ جیسے ہی انقلابی تحریک سرد پڑ گئی اور اس نے کچھ حد تک فرقہ وارانہ سیاست کا رنگ بھی اختیار کر لیا، آریہ سماجی لیڈروں نے اپنی وفاداری ظاہر کرنے میں ذرا بھی تاخیر نہیں کی۔ چنانچہ بیشتر اضلاع میں 1908-09 میں کانگریس کی ناکارہ تنظیموں کی جگہ ہندو سبھاؤں نے لے لی۔ اس کے قطعی برخلاف اجیت سنگھ اور ان کے کچھ قریبی ساتھی (مثلاً مراد آباد، یوپی کے صوفی امبا پرساد اور انقلابی اردو شاعر لال چند فلک) مکمل طور پر انقلابی دہشت پسند بن گئے۔ بھائی پرمانند جیسے کچھ آریہ سماجی اور دہلی کے ایک ہونہار طالب علم ہر دیال جیسے کچھ لوگ بھی ساتھ میں تھے۔

مدراس

مدراس پریزیڈنسی کے دو بالکل الگ الگ علاقوں، یعنی آندھرا کے ڈیلٹا اور انتہائی جنوب میں واقع Trunelveli ضلع میں انتہاپسندانہ تصورات کا بہت زیادہ اثر رہا۔

واش بروک کے مطابق ایادر اصل گروپ بندی کی بناء پر ہوا۔ کرشنا سوامی ایر کے غالب اثرات والے Mylapore گروپ کو Egmore کے سیاست دانوں اور مفصل کے باہری گروپوں کے اتحاد کے چیلنج کا سامنا تھا۔ اس اتحاد کی باگ ڈور جی۔ سبرامینم سوامی ایر کے ہاتھ میں تھی جنھیں 1880 کی دہائی میں بہت نمایاں حیثیت حاصل رہ چکی تھی مگر جلد ہی وہ پیچھے کردیے گئے تھے جب کہ باہر کے مفصل گروپوں میں راج مندری کے ٹی۔ پرکاسم، سولی پٹنم کے ایم کرشنا راؤ نیز ٹوٹی کورن (ضلع تروتل ویلی) کے وی او چدمبرم پلائی شامل تھے۔ اب مدراس کے بااثر انگریزی اخبار ہندو پر Egmore گروپ کا کنٹرول تھا نیز پرکاسم اور کرشنا راؤ نے 1904 میں سولی پٹنم سے ایک انقلابی اخبار "کرشنا پتریکا" نکالنا شروع کیا تھا۔ اس میں شک نہیں کہ یہ گروہی ٹکراؤ بالکل حقیقی تھا مگر 1907 میں آندھرا کے چند دیہات میں نیز مارچ 1908 میں ٹوٹی کورن اور تروتل ویلی میں " طلباء اور ورکروں کے پراژدہام کارناموں" کو جس طرح ایک محض دو سطری بیان کے ذریعے القط کردیا گیا تھا، اسے کافی قرار نہیں دیا جاسکتا۔

بنگال کے ساتھ ہمدردی ظاہر کرنے کے لیے آندھرا کے ڈیلٹا میں واقع راجامندری، کاکی ناڑا اور سولی پٹنم جیسے شہروں میں 1908 سے ہی جلسے شروع ہو گئے تھے اور ایم۔ کرشنا راؤ کی دعوت پر اپریل 1907 میں بپن پال کے دورے سے وندے ماترم تحریک کو زبردست تقویت ملی تھی۔ وندے ماترم بیج لگانے اور پال کے جلسوں میں شرکت کرنے کے جرم میں راجامندری کے طالب علموں کے خلاف کی گئی سخت کارروائیوں کے رد عمل میں طلباء کی اسٹرائک ہوئی جس کے بعد آندھرا میں قومی اسکول قائم کرنے کی تحریک بھی شروع ہو گئی اور وندے ماترم کا نعرہ بلند کرنے پر ایک گورے صاحب کے ذریعے ایک طالب علم کے کان پر گھونسہ مارنے کے رد عمل میں 31 مئی 1907 کو کاکی ناڑا کے یورپین کلب پر ایک بھیڑ نے بلہ بول دیا تھا۔ سودیشی ماحول پیدا ہو جانے کے نتیجے میں تلگو زبان و ادب اور تاریخ میں بھی نئی دلچسپی پیدا ہوئی (آندھرا عوام کی ایک زبردست تاریخ "آندھرا چرتراسو" 1910 میں شائع ہوئی تھی) نیز انتہاپسندانہ تحریک کے انحطاط پذیر ہو جانے کے بعد پرکاسم، کونڈا وینکٹ پیا اور پٹا بھی ستیا رمیہ جیسے لیڈروں نے جو کہ آگے چل کر گاندھیائی تحریک کے سرخیل بننے والے تھے) تلگو زبان بولنے والی آبادی کے لیے آندھرا مہا سبھا کی تنظیم شروع کردی تھی۔

حکومت کے نقطہ نظر سے فوری طور پر زیادہ خطرے کی بات ضلع تر و تل و یلی میں توٹی کورن بندرگاہ کے ارد گرد رونما ہونے والے واقعات تھے۔ دسمبر 1906 کی ایک سرکاری رپورٹ میں تر و تل ویلی کی نشان دہی مدراس کے ایک ایسے واحد ضلع کے طور پر کی گئی تھی جہاں انگریز مخالف احساسات بڑی تیزی سے پروان چڑھ رہے تھے۔ جی سبرامنیا ایر نے 1906 اور 1097 میں متعدد بار ضلع کا دورہ کیا، توٹی کورن کے وکیل وی۔ او۔ چدمبرم پلائی اس وقت تک ایک بڑے انتہا پسند لیڈر بن چکے تھے اور کولمبو تک اسٹیمر چلانے کے لیے اکتوبر 1906 میں توٹی کورن میں ایک سودیشی اسٹیم نیوی گیشن کمپنی (Steam Navigation Co.) شروع کی گئی تھی۔ اس سودیشی کاروبار (جس کی پشت پر چھ لاکھ روپے کا اصل سرمایہ تھا اور جس کا مطلب یہ تھا کہ مقامی تاجر گروپوں نے اس میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ہوگا) کے تئیں برٹش انڈیا اسٹیم نیوی گیشن کمپنی نے شدید مخالفت کا مظاہرہ کیا جس کے رد عمل میں توٹی کورن میں غیر ملکی لوگوں کے خلاف جذبات میں اور بھی شدت آگئی تھی۔ سبرامنیا شیوا کی آمد پر جنوری 1908 سے انقلاب پسندی کی طرف رجحان ظاہر ہونے لگا تھا۔ سبرامنیا شیوا مدورا کے ایک عامی لیڈر تھے جنھوں نے مدورا سے آتے ہی چدمبرام پلائی کے ساتھ توٹی کورن بیچ پر مزدور جلسوں سے خطاب کرنا شروع کر دیا تھا۔ ان تقریروں میں سوراج کا پیغام دیا جاتا اور بائیکاٹ کے حق میں اپیل کی جاتی تھی اور (اگر پولس رپورٹ پر اعتبار کیا جا سکتا ہے تو) وہ بعض اوقات اور زیادہ پر تشدد طریقے اختیار کرنے کی بات کرتے تھے۔ فروری میں ان لوگوں نے ورکروں سے براہ راست اپیل شروع کر دی تھی۔ "اگر حمال (Coolies) اضافی اجرت کے لیے کمر بستہ ہو جائیں تو ہندوستان میں یوروپی کارخانوں کا وجود ہی ختم ہو جائے" (شیوا 26 فروری)۔ شیوا کا یہ بھی کہنا تھا کہ "روسی انقلاب سے وہاں کے لوگوں کو فائدہ ہوا ہے اور یہ کہ انقلاب ہمیشہ ہی دنیا کے لیے بہتری کا باعث ہوتا ہے"۔ سینہ طور پر اس طرح کی براہ راست تقریروں کا یہ نتیجہ ہوا کہ غیر ملکیوں کی ملکیت والے کورل کاٹن ملز، میں ہڑتال ہو گئی اور مارچ کے پہلے ہفتے میں اجرتوں میں پچاس فیصد کے بقدر اضافہ حاصل کر لیا گیا۔ انگریزوں نے اس طرح کے جلسوں کی روک تھام اور شیوا نیز پلائی کے خلاف کارروائی کی کوشش کی جس کے رد عمل میں توٹی کورن میں دکانیں بند ہو گئی تھیں۔ میونسپلٹی میں ملازم نیز نجی جاروب کشوں نے ہڑتال کر دی تھی؛ نیز تر و تل ویلی میونسپلٹی کے دفتروں، عدالتوں اور پولس تھانوں پر حملے کے واقعات ہوئے اور دونوں ہی شہروں میں 11 اور 13 مارچ کو فائرنگ بھی ہوئی۔ کلکتہ کے 'بندے ماترم' نے 13 مارچ کو توٹی کورن کے واقعات کی ستائش کرتے ہوئے انھیں "تعلیم یافتہ طبقے اور عوام کے درمیان ایک مضبوط رشتے" کا نام دیا تھا، جو کہ سوراج کی منزل کی طرف پہلا بڑا قدم تھا...... ہندوستانی مزدور کی ہر فتح در اصل پورے ملک و قوم کی فتح ہے"۔ بہر حال بنگال کی طرح ہی یہاں بھی یہ "پہلا بڑا"

قدم" انتہا پسندی کی پہونچ سے دور رہا۔ اور شیوا نیر پلائی کو منظر نامے سے ہٹا دیئے جانے کے بعد ترونل ویلی کے انقلاب پسند یا تو غیر سرگرم ہو گئے یا انھوں نے ایک چھوٹا سا دہشت پسند گروپ بنا لیا تھا۔ جو کہ جون 1911 میں ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ Ashe کے قتل کا ذمہ دار تھا۔ اس چھوٹے سے تمل انقلابی گروپ میں اتفاق سے عظیم شاعر سبرامنیا بھارتی بھی شامل تھے جو ترونل ویلی کے ایک براہمن خاندان سے تعلق رکھتے ہوئے بھی ذات پات کے مخالف تھے۔ انھوں نے تمل قوم پرستی کے فروغ میں اہم رول ادا کیا۔ انھوں نے 1910 سے پانڈیچری میں سیاسی جلاوطنی اختیار کر لی اور اپنے جلاوطن ساتھی وی۔ وی ایس ایر سے مختلف راستہ اختیار کیا۔ ایر دراصل ہندو احیاء پسند ساورکر کے پیروکار ہو گئے تھے۔ بھارتی نے 1921 میں اپنے بے وقت انتقال سے پہلے ایسی نظمیں کہنی شروع کی تھیں جن میں روس کے 1917 کے انقلاب کا خیر مقدم کیا جاتا تھا۔

مہاراشٹر

تلک کے سلسلے میں، جنھیں کہ سب سے بڑا انتہا پسند لیڈر مانا جاتا ہے، سوانحی ادب کافی مقدار میں موجود ہونے کے باوجود بھی مہاراشٹر میں 1905 اور 1908 کی درمیانی مدت میں تحریک کے سلسلے میں ان کی سرگرمیوں کے بارے میں تفصیل (کم سے کم انگریزی میں) دستیاب نہیں ہے۔ سودیشی موڈ فطری طور پر انقلابی صحافت کا موجب ہوا اور کیسری کی اشاعت 1907 میں 20,000 تک پہنچ گئی تھی۔ تلک اور ان کے دوسرے ساتھی (مثلاً کھپارڈے اور منجے وغیرہ) مہاراشٹر اور دوسرے صوبوں میں سوراج اور توسیعی بائیکاٹ یا تحمّلانہ مزاحمت کا پرچار کر رہے تھے۔ تلک کی Tenets of the New Party (کلکتہ جنوری 1907) جیسی تقریروں نیز پال کی مدراس کی تقریروں اور اربندو کے "بندے ماترم" مضامین کو آج بھی انتہا پسندانہ ادب میں کلاسیکی حیثیت حاصل ہے۔ مذہبی اور سماجی تقریبات کا بھی احیاء ہوا، جس کی بنیاد 1890 کی دہائی میں تلک (گن پتی، شیواجی، رام داس) کی شکل میں رکھ چکے تھے۔ غیر ملکی کپڑوں کی ہولی جلائی گئی۔ (پونا۔ 8 اکتوبر 1905) اور پیغام کو دور دور تک پہونچانے کے مقصد سے بمبئی شہر میں سودیشی واستو پرچارنی سبھا قائم کی گئی۔ بمبئی کے صنعت کار (جو کہ زیادہ تر پارسی یا گجراتی تھے، 1908 میں محض ایک ہی مہاراشٹری کسی مل کا مالک تھا) سودیشی سے محض زبانی ہمدردی رکھتے تھے۔ ستمبر 1906 میں تلک کے سلسلے میں پولس کا ایک رکارڈ ہمیں یہ بتاتا ہے کہ اس انتہا پسند لیڈر نے دن شاواچا کے توسط سے مل مالکان کو دھوتیاں واجبی قیمتوں پر فروخت کرنے کے لیے رضامند کرنے کی کوشش کی تھی جس کا انھیں بالکل صاف صاف جواب یہ ملا تھا کہ یہ دھوتیاں محض مارکیٹ قیمت پر ہی سپلائی کی جاسکتی ہیں۔ دیسی کپڑوں کے لیے سودیشی جوش و خروش سے بہر حال اتنا تو ہوا کہ 1905-06 کے دوران بمبئی اور احمد آباد کی صنعت کو بھاری فائدہ ہوا (اس عہد کے ایک تخمینے کے مطابق بمبئی کے مل مالکان کو 1906 میں 3.25 کروڑ کا منافع ہوا تھا جبکہ تنخواہوں کا خرچ 1.68 کروڑ کے بقدر تھا) اور دوسرے یہ کہ 1906-07 میں جبکہ جاپان کے مقابلے پر آجانے کے نتیجے میں چینی سوت کی مارکیٹ گرتی جارہی تھی، گرتی قیمتوں کو سہارا دینے میں بھی مدد ملی۔ اگست 1907 میں ٹاٹا آئرن اینڈ اسٹیل پروجکٹ کی شکل میں (پروجکٹ کے لیے 2.5 کروڑ کا حصص سرمایہ صرف تین ہفتے میں اور زیادہ تر بمبئی میں ہی حاصل کر لیا گیا تھا) جو بڑی پیش رفت ہوئی تھی وہ بھی شاید خود امدادی موڈ اور سیاسی حالات کے نتیجے میں پیدا ہونے والی وطن پرستی کا ہی نتیجہ تھی۔

1907 کے اواخر اور 1908 کے اوائل میں مہاراشٹر نیز بمبئی شہر میں دو بہت اہم اقدامات: شراب کی دکانوں کے خلاف مظاہرے اور مراٹھا اکثریت والے مزدور طبقات سے رابطہ قائم

کرنے کی کوشش، تلک سے منسوب کیے جاتے ہیں۔ پہلے اقدام میں وہی طریقہ اختیار کیا گیا جسے آگے چل کر گاندھی جی نے بھی اپنایا۔ اس طریقہ کار کے دو فوائد تھے۔ ایک تو یہ کہ اس طرح حکومت کے آب کاری مالیہ کو کم کیا جا سکتا تھا اور دوسرے یہ کہ اس طرح نچلی ذاتوں کے لوگوں سے یہ اپیل بھی جا سکتی تھی کہ وہ براہمنی طور طریقوں کی نقالی سنسکرت کاری کی شکل میں کریں۔ دوسرا کام کلکتہ کی بہ نسبت بمبئی میں زیادہ آسان تھا کیونکہ کلکتہ کے فیکٹری ورکروں کا غالب حصہ غیر بنگالیوں پر مشتمل تھا، جبکہ بمبئی میں 1911 میں 49.6 فی صد مل ملازمین تلک کے آبائی ضلع رتناگری سے تعلق رکھتے تھے۔ بمبئی کے مل ورکروں میں بہبود کا کام کافی پہلے 1880 کی دہائی میں ہی شروع ہو چکا تھا۔ یہ دوسری بات ہے کہ اس کی پہل براہمنوں کی غالب اکثریت والے قوم پرستوں کی بجائے این۔ ایم منڈے جیسے لوگوں نے کی تھی جو کہ پھولے کی براہمن مخالف ستیہ شودھک سماج تحریک سے وابستہ تھے۔ مگر شاید اس سے بھی زیادہ اہم بات یہ تھی کہ اس وقت تشدد پسندی کی روایت بھی ابھر رہی تھی۔ کیونکہ اگر بمبئی کے مل ورکر بعض اوقات برادر کش قسم کے فرقہ وارانہ جھگڑوں (93-1892) میں ملوث ہو جاتے تھے تو وہ کبھی کبھی اچانک ہی اور زبردست قسم کی ہڑتالیں بھی کر جاتے تھے۔ 93-1892 اور 1901 میں اجرت میں کٹوتی کے خلاف ہڑتالیں ہوئی تھیں اور پھر ستمبر / اکتوبر 1905 میں کام کے اوقات بڑھا کر 15-16 گھنٹے کر دینے کی تجویز کے خلاف بھی ہڑتال ہوئی تھی۔ واضح رہے کہ بمبئی کے مل مالکان نے بجلی کی روشنی شروع ہو جانے پر ہی اوقات کار بڑھا کر 15، 16 گھنٹے کر دینے کی کوشش کی تھی۔

قومی تحریک کے لیڈروں نے ہندوستانیوں کی ملکیت والے کارخانوں میں کام کرنے والے ہندوستانیوں کی حالت پر کبھی توجہ نہیں دی۔ جبکہ غیر ملکی ملکیت والے کارخانوں کا معاملہ اس کے قطعی برعکس تھا اور 1881 میں پہلے فیکٹری ایکٹ کو (جو کہ بمبئی کی کپڑا صنعت کی حریف، لنکا شائر کی کپڑا صنعت کے دباؤ پر پاس کیا گیا تھا) کراناڈے کا سہ ماہی جریدہ اور تلک کا اخبار بڑی شدت کے ساتھ نشانہ بنا رہے تھے۔ 08-1907 میں تلک کی سرگرمیوں میں عام تصور کے برخلاف، کوئی نئی بات نہیں تھی۔ دسمبر 1907 اور جون 1908 میں بمبئی کے چنچ پوگلی (Chinch Poogly) صنعتی علاقے میں مزدوروں کے جلسوں سے تلک کا خطاب "طبقاتی جنگ" جیسی باتوں سے بالکل عاری ہوتا تھا۔ ان کی تقریروں میں سارا زور ولایتی سامان اور شراب کے بائیکاٹ پر ہوتا تھا۔ سودیشی کے حق میں ان کی دلیل یہ ہوتی تھی کہ "اس سے (ہندوستانی) کارخانوں میں کام بڑھے گا اور ملازمین کو فائدہ ہوگا"۔ ان کا یہ بھی کہنا تھا کہ ورکروں کی بدحالی کی وجہ دیسی صنعتوں کا ختم ہو جانا ہے جس کی وجہ سے لوگ دیہی زندگی کو ترک کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ تلک نے مل میں کام کرنے والوں خصوصاً جوبروں (Jobbers) اور ہیڈ جوبروں کو مل ملازمین کی کمیٹیاں بنانے کا بھی

مشورہ دیا تھا۔ ان جوبروں کا واقعی بڑا اثر تھا کیونکہ مزدوروں کو ملوں میں کام دلانے کے سلسلے میں یہی لوگ اہم ایجنٹ کا کام کرتے تھے۔ اور کام پر لگائے جانے والوں کے ہم مذہب اور ہم وطن بھی ہوتے تھے۔ مراٹھی جوبر دراصل خود بھی ایک طرح کے استحصال کار تھے اور بھاری غلبہ رکھنے والے پارسیوں، گورے منیجروں اور سنیئر فورمینوں سے کد رکھتے تھے۔ پولس کی رپورٹوں سے پتہ چلتا ہے کہ "ومل کے اپنے براہمن کلرک ہوتے ہیں جو جوبروں پر تھوڑا بہت اثر رکھتے ہیں" اور یہ کہ اس طرح کے کلرک گروپ کافی حد تک انتہاپسندی کے زیر اثر تھے۔ درحقیقت ان جوبروں نے بعد میں بمبئی کے مزدوروں کو منظم کرنے میں بہت اہم رول ادا کیا تا آنکہ، 1928 میں کمیونسٹ قیادت والے گرنی کامگار نے زبردست پیش رفت کی کوشش کی۔

تاہم اگرچہ ایک طرف انتہاپسند لیڈروں کی اپنی طے شدہ حدود تھیں، لیکن جولائی 1908 میں تلک کے خلاف مقدمے اور چھ سال کے لیے بمبئی بدر کیے جانے کے فیصلے کے موقع پر بمبئی کے عوام الناس میں برہمی کی جو شدید لہر پیدا ہو گئی تھی وہ ہماری تاریخ کا ایک اہم باب ہے۔ تلک کو یہ سزا دراصل بنگال میں دہشت پسندی کے سلسلے میں کیسری کے بعض مضامین پر سنائی گئی تھی۔ قوم پرستانہ تقریروں، کتابچوں، نیز کارخانوں کے کلرکوں اور جوبروں کے جوڑ توڑ سے قطع نظر، مل ورکروں کو خود اپنے تجربات سے بھی یہ احساس ہو گیا ہوگا کہ افسران اور پولس والے ان کے فطری دشمن ہیں، کیونکہ ناقابل برداشت طرز معاشرت اور کام کے ناگفتہ بہ حالات کے بطن سے پیدا ہونے والی اور خالصۃً معاشی نوعیت کی ہڑتالوں کو پولس کے ذریعے کچل دیا جاتا تھا۔ مثال کے طور پر اکتوبر 1905 میں فونکس (Phoenix) مل کی ہڑتال کو کچل دینے کے مقصد سے بھیجے گئے دستے کی قیادت بذات خود پولس کمشنر نے کی تھی۔

13 جون کو تلک کے خلاف مقدمہ شروع ہوتے ہی ہڑتالوں، خشت باری اور پولس کے ساتھ جھڑپ کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا اور پھر جلد ہی فوج بھی بلائی گئی تھی۔ پھر جب 22 جولائی کو تلک کے خلاف سزا سنائی گئی تو مل جی جیتہ مارکیٹ کی کپڑا دکان کے ملازمین نے چھ روز کی ہڑتال کا اعلان کیا تھا (کیونکہ تلک کو سزا چھ سال کی سنائی گئی تھی)۔ اس اعلان کو عمل میں لایا گیا اور 28 جولائی تک واک آؤٹ کا سلسلہ اس طرح جاری رہا کہ اس کے نقطہ عروج پر 85 میں سے 76 کپڑا مل بری طرح متاثر ہوئے تھے۔ اس کے علاوہ پریل (Parel) کی ریل ورکشاپ میں بھی ہڑتال رہی (جہاں کہ پہلے ہی مئی 1907 اور جنوری 1908 میں بڑی معاشی ہڑتالیں ہو چکی تھیں)۔ پولس اور آرمی نے بار بار فائرنگ کی جس میں خود سرکاری رپورٹ کے مطابق 16 لوگ ہلاک اور 43 لوگ زخمی ہوئے تھے۔

تلک کی سزائے قید کے فوراً بعد ہی مفصل علاقے میں بھیانک فساد ہوا۔ یہ فساد 29 جولائی کو پندھر (ضلع شولاپور) کے جاترا مرکز کے ارد گرد ہوا تھا۔ سرکاری رپورٹوں کے مطابق تجلی: اتوں

کے لوگوں نے ہی اس جاترا کا اہتمام بھی کیا تھا اور اس میں شرکت بھی کی تھی۔ یہ حقیقت بھی دراصل بمبئی کی ہڑتال کی طرح ہی، اس نظریے سے ہم آہنگ ہے کہ مہاراشٹر میں انتہا پسندی چت پاون سازش کے سوا کچھ اور نہیں تھی، لیکن دوسرے صوبوں کی طرح ہی مہاراشٹر میں بھی عوام الناس کے ساتھ رابطہ اور ان کی شمولیت بہت کم ثابت ہوئی۔ تلک کو منظر سے ہٹا دیے جانے کے بعد مہاراشٹر میں بچی کھچی انتہا پسندی نے انفرادی دہشت پسندی کی شکل اختیار کر لی جس میں ناسک کے ابھینہ بھارت گروپ کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل تھی۔ اس گروپ نے ساور کر برادرز کے ذریعے 1899 میں قائم کیے گئے "متر امیلہ" سے جنم لیا تھا۔ لندن سے وی۔ ڈی ساور کر کے ذریعے خفیہ طریقے پر بھیجے گئے پستول دسمبر 1909 میں ناسک کے ضلع مجسٹریٹ کے قتل میں استعمال کیے گئے تھے۔ اسی طرح کا ایک دوسرا گروپ نوابھارت کے نام سے گوالیار میں بھی سرگرم تھا، جہاں سندھیا کی شخصی عملداری میں کام کرنے کے تجربے نے اس حسن ظن کو چکنا چور کر دیا تھا جسے کہ دوسرے انقلاب پسند اور قوم پرست اب بھی پروان چڑھا رہے تھے۔ نوابھارت سوسائٹی نے عوامی جمہوریہ (Republic) کو اپنا نصب العین قرار دیا تھا" اس لیے کہ سارے راجے مہاراجے محض انگریزوں کی کٹھ پتلی تھے"۔ مہاراشٹر میں دہشت پسندی اتنی نمایاں شکل میں کبھی نہیں ابھر سکی جتنی کہ بنگال میں رہی تھی، اور اس کا کسی قدر زیادہ چرچا دراصل 10-1909 کے گوالیار و ناسک سازش مقدموں کے بعد ہی شروع ہوا تھا۔

کانگریس کی تقسیم

1905 سے 1907 تک قومی تحریک کے اندر مختلف رجحانات کے درمیان ٹکراؤ کانگریس کے سالانہ اجلاسوں میں بھی جاری رہتا تھا، جو بالآخر دسمبر 1907 میں سورت میں کانگریس کی تقسیم پر منتج ہوا۔ اس تقسیم کو "انتہا پسندی کی انتہائی نمایاں شکل" قرار دینے اور کانگریس کو ایسے مختلف الرائے لوگوں کا ایک کل ہند گٹھ جوڑ کا نام دینے میں کوئی وزن نہیں تھا جو کہ مقامی شکستوں کا بدلہ اعلا ترین سطح پر لینے کی کوشش میں تھے (انل سیل صفحہ 348)۔ ہمیں یہ ذہن نشیں رکھنا چاہیے کہ کانگریس اس وقت تک ایک ایسی باقاعدہ تنظیم کی شکل اختیار نہیں کر پائی تھی جس پر قبضے کی کوشش کی جاتی، بلکہ اس کی حیثیت محض ایک سالانہ پلیٹ فارم کی تھی جس کی روئیدادوں کو اہمیت دینے کے سلسلے میں غالباً کچھ زیادہ ہی مبالغے سے کام لیا گیا ہے۔ انتہا پسندوں کو ان کے علاقائی مرکزوں، یعنی بنگال، پنجاب میں نیز مدراس کے کچھ حصوں میں اور مہاراشٹر میں 08-1907 تک یقیناً شکست نہیں دی جا سکی تھی۔ اس عرصے میں کانگریس کو ایک ٹھوس شکل دینے کی سمت میں کئی بار کوشش کی گئی اور اس سلسلے میں کلکتہ اجلاس (1906) کی اس قرارداد کو بہت زیادہ اہمیت حاصل

ہے جس کے ذریعے ضلعی سطح پر انجمنیں (Associations) قائم کرنے کی سفارش کی گئی تھی تاکہ "سیاسی کام کو مسلسل اور مستقل طریقے پر جاری رکھا جاسکے"۔ کئی صوبوں میں اور مکمل طور پر انتہاپسندوں کی اپیل پر 1907 اور پھر 1908 کے اوائل میں ضلع کی سطح پر متعدد کانفرنسیں ہوئیں۔ بعض انتہاپسند لیڈروں نے خود کو نئے ماحول سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش بھی کی۔ غیر شدت پسندانہ سودیشی کو فروغ دینے کے مقصد سے دسمبر 1905 سے کانگریس کے سالانہ اجلاس کے ساتھ ساتھ صنعتی کانفرنسوں کا سلسلہ بھی شروع ہوگیا تھا۔

جون 1905 میں گوکھلے نے سرونٹس آف انڈیا سوسائٹی شروع کی تھی جس نے اعتدال پسندی کو اپنا نصب العین قرار دیا تھا۔ اس سوسائٹی میں زیادہ زور ایثار و قربانی، اخلاقی پاکیزگی اور زیادہ سے زیادہ 65 روپے کے مشاہرے پر کل وقتی قومی خدمت پر تھا۔ یہ سوسائٹی 1908 تک 20 سے زیادہ ممبر نہیں بنا سکی تھی۔ بقیہ لوگوں کے لیے کانگریس پہلے ہی جیسی رہی۔ وہ کانگریس سے انتہا پسندانہ قسم کی قراردادیں منظور کرانے کی کوشش کرتے رہے جس کا اصل مدعا تشہیر کے ساتھ ساتھ ساکھ میں اضافے کے سوا کچھ اور نہیں تھا۔

دسمبر 1905 میں بنارس میں انتہاپسندوں کا چیلنج نسبتاً کافی کمزور تھا، گھوکھلے کے صدارتی خطبے، اور ایک علاحدہ قرارداد کے ذریعے تقسیم کی اور بنگال میں جابرانہ کارروائیوں کی مذمت کی گئی جبکہ بائیکاٹ کا بہت ہی مختصر ذکر اور کافی بددلی کے ساتھ "(عوام کی توجہ مبذول کرانے کا واحد آئینی اور موثر طریقہ کار" قرارداد نمبر 13 پیش کردہ سریندرناتھ نیز مالویہ) کیا گیا تھا۔ تلک، لاجپت اور موتی لال گھوش نے سبجیکٹس کمیٹی میں اس قرارداد کی مخالفت کی تھی جس کے ذریعے "بہت ہی مودبانہ اور عاجزانہ طریقے پر" پرنس آف ویلز کے دورۂ ہند کا خیر مقدم کیا گیا تھا۔ بہرحال پس پردہ مفاہمت پر ان رہنماؤں کے پیروکاروں نے اس کھلے اجلاس میں شرکت نہیں کی جس نے اس قرارداد کو "اتفاق رائے" سے منظور کرلیا تھا۔

دسمبر 1906 تک انتہاپسندی میں قابل لحاظ پیش رفت ہو چکی تھی اور کسی حد تک بین صوبائی رابطے (مثال کے طور پر تلک کا دورۂ کلکتہ جون 1906) قائم ہو چکے تھے۔ بمبئی کے غالب ٹولے (فیروز شاہ مہتہ، واچا، اور گوکھلے) نے سب کے لیے باعث احترام اور بزرگ رہنما دادابھائی ناروجی کو آگے لاکر کانگریس کے اگلے اجلاس (کلکتہ) کے لیے تلک یا لاجپت کو صدر بنانے کی تجویزوں پر روک لگادی تھی۔ بائیکاٹ، سودیشی، قومی تعلیم اور حکومت خود اختیاری سے متعلق قراردادیں، کانگریس پر کلکتہ کے انتہاپسندوں کے اثر کے نقطہ عروج پر دلالت کرتی ہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ اس طرح کی قراردادوں میں ابہام یا ذومعنویت زیادہ ہوتی تھی۔ دادا بھائی ناروجی نے کانگریس کے نصب العین کا از سر نو تعین دانستہ طور پر مبہم الفاظ ("برطانیہ یا اس کی نوآبادیات کی طرز کی

حکومت خود اختیاری یا سوراج") میں کیا تھا، حالانکہ برطانیہ اور اس کی نو آبادیات (ممالک محروسہ) کے سیاسی نظاموں کا باہمی فرق کم از کم 1926 کے ویسٹ منسٹر ایکٹ تک برقرار رہا تھا۔ بپن پال نے بائیکاٹ سے متعلق قرارداد کے دائرے میں دوسرے صوبوں کو بھی شامل کرنے کی جو کوشش کی تھی اسے، نیز اعزازی عہدوں کے ساتھ ساتھ ولایتی سامان کے بھی بائیکاٹ کی تجویزوں کو بھی مالویہ اور گوکھلے نے مسترد کر دیا تھا اور اس طرح چاروں اہم قراردادوں کی تاویل 1907 تک ایک دوسرے سے مختلف طریقے پر کی جاتی رہی تھی۔

مہتہ کانگریس کے اگلے سالانہ اجلاس کی جگہ ناگ پور سے سورت منتقل کرانے میں کامیاب ہو گئے تھے اور چونکہ حسب روایت مقامی استقبالیہ کمیٹی ہی صدر کا انتخاب کرتی تھی اس لیے اعتدال پسند لیڈر راس بہاری بوس کا انتخاب یقینی ہو گیا تھا۔ دونوں ہی گروپ ٹکراؤ کے لیے تیار ہو کر آئے تھے۔ افتتاحی اجلاس کے ہی دن کافی ہنگامہ ہوا، کیونکہ یہ افواہ پھیل گئی تھی کہ کلکتہ میں پاس کی گئی چاروں قراردادوں کو موقوف کر دیا جائے گا۔ 27 دسمبر کو تلک نے اجلاس ملتوی کرانے کی ناکام کوشش کی (ان کی تجویز کو استقبالیہ کمیٹی کے چیرمین مالویہ نے مسترد کر دیا تھا) جس پر مشہور مراٹھا چپل بازی شروع ہو گئی تھی اور انتہائی افراتفری کے عالم میں اجلاس برخواست کر دیا گیا تھا۔ اصل ٹکراؤ کے لیے مختلف لوگوں کو ذمہ دار ٹھہرایا جاتا رہا ہے (اس میں شبہ نہیں کہ بہت سے انتہا پسند لاٹھی بند ہو کر آئے تھے)، مگر موٹے طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ اصل اشتعال انگیزی اعتدال پسندوں کی طرف سے ہی ہوئی تھی۔ یقیناً نہ صرف لاجپت (جنھیں اس وقت انتہا پسندوں میں سب سے نرم سمجھا جاتا تھا) بلکہ تلک اور ان کے سنیئر بنگالی ساتھیوں نے سورت اجلاس کے بعد تمام کانگریسیوں کو متحد کرنے کی مہموں اور بار بار کوشش کی مگر بمبئی کے اعتدال پسند گروپ میں ذرا بھی لچک پیدا نہیں ہوئی اور الہ آباد کے کنونشن (اپریل 1908) میں دستور کی تیاری کے ساتھ ہی کانگریس کی تقسیم یقینی ہو گئی تھی کیونکہ اس دستور کے تحت کانگریس کے طریقہ کار کو "مکمل طور پر آئینی" اور "موجودہ حکومتی نظام میں بتدریج اصلاح لانے" تک ہی محدود کر دیا گیا تھا۔ سب سے اہم بات یہ کہ حکومت کے تسلیم شدہ اداروں کے لیے مندوب کے انتخاب کے سلسلے میں تین سال کی اسٹینڈنگ کی شرط لگادی گئی تھی۔ گویا اس طرح انتہا پسندوں پر آئندہ کے اجلاس کے دروازے بند کر دینے کی ہر ممکن کوشش کی گئی تھی۔

چونکہ اس وقت انگلینڈ میں لبرل پارٹی کی حکومت تھی اور مشہور لبرل سیاسی مفکر Marley سکریٹری آف اسٹیٹ تھے، اس لیے اصلاحات کی امید میں اعتدال پسند لیڈروں کے رویے میں اچانک سختی آگئی تھی ؛اس لیے اب ہمیں انگریزوں کی پالیسیوں کی نشوونما کی طرف آجانا چاہیے۔

جبر و تشدد، مصالحت۔ لڑاؤاور حکومت کرو:1909-14

مارلے اور منٹو(Marley and Minto)

انگریزوں کی 'حکومت ہند پالیسی' سے متعلق اظہار خیال اکثر اس طرح کے سوالوں کی شکل اختیار کر جاتا ہے کہ کسی مخصوص اقدام کو کس نے شروع کیا تھا، وائسرائے نے، یا سکریٹری آف اسٹیٹ نے! سابق سکریٹری آف اسٹیٹ اور وائسرائے کی اہلیہ کے ذریعے مارلے اور منٹو کی خط و کتابت کے اقتباسات کی بہت جلد ہی اشاعت کی وجہ سے ان دونوں کے تعلق سے اس طرح کے سوالات زیادہ قائم کیے جاتے ہیں۔ اس سلسلے میں وافر لٹریچر (مواد) دستیاب ہے مگر چونکہ لبرل عالم مارلے اور وائسرائے (جس کا تقرر الیکشن ہار جانے والی ٹوری پارٹی نے کیا تھا اور جو سیاست پر گھوڑوں کو ترجیح دیتا تھا) کے درمیان بنیادی نوعیت کے امور کے سلسلے میں بہت کم اختلاف رائے ہوتا تھا، اس لیے اس طرح کا سوال پیدا ہونا ایک فطری بات ہے۔ درحقیقت سب سے اہم وہ طریقہ کار ہے جسے کے سیاسی بے چینی پر قابو پانے کے لیے تیار کی گئی پالیسیوں کے سلسلے میں دوسرے بہت سے افسروں کے ساتھ ساتھ ان دونوں نے بھی اختیار کیا تھا اور جو کم و بیش حالت میں ہندوستان میں انگریزوں کی عملداری کے آخری وقت تک برقرار رہا تھا۔ اس طریقہ کار کو تین بڑے حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ بے مہار جبر و تشدد، اعتدال پسندوں کو ایک جٹ کرنے کے لیے مراعات (نیز اس دوسرے حصے سے جڑی ہوئی حکمت عملی) اور لڑاؤ اور حکومت کرو کی پالیسی! جداگانہ انتخاب (انتخابیہ) جس کی واضح ترین شکل تھی۔

1906 کے بعد جبر و تشدد کا سلسلہ کافی پس پیش کے بعد شروع ہوا، کیونکہ ان جابرانہ اقدامات کا نشانہ ان تعلیم یافتہ ہندوستانیوں کو کو بنایا جاتا تھا جن کے لیے (قبائلیوں یا کسان باغیوں یا ہڑتالی مزدوروں کے برخلاف) شہری حقوق اور قانون کی عملداری ایک حقیقت بھی تھی اور ایک ایسا نظریاتی وسیلہ بھی جس کے ذریعے انھیں قابو میں رکھا جاسکتا تھا۔ اس طریقہ کار کو سب سے پہلے مشرقی بنگال اور آسام کے نئے صوبوں کا لفٹنٹ گورنر Bamfyld Fuller آزما چکا تھا۔ Fuller نے باریسال میں گورکھا سپاہیوں سے ظلم کرایا تھا 'بندے ماترم' کہنے پر پابندی لگادی تھی اور سیاسی سرگرمیوں میں حصہ لینے کے جرم میں اسکولوں کا الحاق ختم کردینے کو کوشش کی تھی۔ منٹو، اور کافی حد تک مارلے، یعنی دونوں ہی اس صورت حال سے پریشان تھے اور اسکولوں کا الحاق ختم کردینے کے سوال پر ٹکراؤ ہوجانے پر فلر نے اگست 1906 میں استعفیٰ دے دیا تھا جسے فوراً ہی منظور کرلیا گیا تھا۔ بہر حال پنجاب کے واقعات اور خاص طور پر بنگال میں بم واقعات کے بعد

منظم طریقے پر جبر و تشدد کا سلسلہ 1907 میں شروع ہوا۔ اس جبر و تشدد کے دوران نئے اقدامات کے تحت مخصوص علاقوں میں باغیانہ جلسے جلوس پر پابندی (مئی، نومبر 1907) نیوز پیپرس قوانین کا نفاذ، جن کے ذریعے حکومت کو مطبع خانے (پریس) ضبط کرلینے کا اختیار حاصل ہو گیا تھا (جون 1908 اور فروری 1910)، دسمبر 1908 میں تعزیراتی ایکٹ میں ترمیم، جس کے ذریعے بنگال میں اہم سمتوں پر پابندی لگانے اور لیڈروں کو جلاوطن کرنے (مئی 1907 میں لاجپت اور اجیت سنگھ کی جلاوطنی نیز دسمبر 1908 میں 9 بنگالی لیڈروں کی جلاوطنی) کے اقدامات شامل ہیں۔ اس اثناء میں مارلے وقفے وقفے سے لبرل خیالات کا اظہار بھی کرتا رہا اور یہ بھی کہتا رہا کہ اسے بھی "کوسیک (Cossack) حکمرانی کا شریک کار بنالیا گیا ہے"۔ (مکتوب بنام منٹو 7 مئی 1908)۔ مگر در حقیقت اس نے شہر بدری قانون میں تھوڑی بہت نرمی لانے کے علاوہ کچھ اور نہیں کیا یا کر ہی نہیں سکتا تھا۔ 1910 کے بعد سختی کا یہ طریقہ کار ہارڈنگ کے دور میں بھی جاری رہا جو کہ جنگ کے زمانے کے ڈیفنس آف انڈیا ایکٹ بابت 1915 کے دوران نقطۂ عروج کو پہونچ گیا تھا۔

گوکھلے کے ساتھ متعدد نتیجہ خیز ملاقاتوں کے بعد مارلے نے شروع میں منٹو کو بعض اصلاحات کے ذریعے بنگال کی تقسیم کے معاملے میں توازن پیدا کرنے کے لیے راضی کر لیا تھا۔ (حالانکہ سکریٹری آف اسٹیٹ مارچ 1906 میں تقسیم بنگال کو ایک تصفیہ شدہ معاملہ قرار دے چکا تھا جس پر ہندوستان میں اس کے مداحوں کو شدید مایوسی ہوئی تھی)۔ اس کا کہنا تھا کہ "لوہا پلائی ہوئی افسر شاہی بھی ہمیشہ کام نہیں آسکتی" اس لیے قانون ساز کونسلوں میں بلکہ ایکزیکیٹو کونسل میں بھی مزید ہندوستانیوں کو آنے دیا جائے، بجٹ پر بحث کے لیے اور زیادہ وقت دیا جائے اور دیگر ترمیمات کی جائیں۔ بہر حال اکثریت افسروں کو ہی حاصل رہنی چاہیے"۔ اور یہ کہ "ہندوستان میں انگریزی سیاسی ادارے شروع کرنے کا تو کوئی سوال ہی نہیں تھا۔ کم از کم میرے اور آپ کے وقت میں ہرگز نہیں"۔ (مکتوب بنام منٹو یکم جون و 15 جون 1906) منٹو نیز ہندوستان میں مامور دوسرے افسران یہ تاثر دینے کا تہیہ کیے ہوئے تھے کہ اصلاح کی یہ تجویزیں کلکتہ (وائسرائے) کی طرف سے پیش کی جارہی ہیں اس لیے انھوں نے مارلے کی ان تجویزوں کو پارلیمنٹ کے تحقیقاتی کمیشن کے حوالے کر کے پہلے تو سرد خانے میں ڈلوا دیا تھا اور پھر اصلاحی اسکیم کی تیاری میں کافی وقت لگا دیا تھا۔ اس طرح حکومت ہند کی طرف سے یہ اصلاحی اسکیم یکم اگست 1908 کو روانہ کی جاسکی تھی۔ مارلے اور منٹو میں اس بابت بھی اختلاف رائے تھا کہ اعتدال پسندوں پر بھروسہ کرنے کا طریقہ کیا ہونا چاہیے۔ مارلے جہاں گوکھلے جیسے اعتدال پسند کانگریسی لیڈروں کے ساتھ تال میل پسند کر سکتا تھا، وہیں منٹو کے نزدیک "وفادار" کے زمرے میں صرف کانگریس سے باہر کے لوگ ہی شامل ہو سکتے تھے۔ پہلے تو اس نے کاؤنسل آف پرنسز (Council of Princes) (جو کہ آگے چل کر 1920 اور

1930 کی دہائیوں میں انگریزوں کے لیے بہت کار آمد ثابت ہوئی) جیسی کسی چیز کی تجویز رکھی اور پھر اعلا طبقاتی مسلمانوں کو توازن قائم کرنے کے ایک وسیلے کی حیثیت دینے سے متعلق تجویز کو بڑی بے تابی سے قبول کر لیا تھا۔

وائسرائے نے 1909 میں ادے پور کی تقریر میں "دیسی ریاستوں (رجواڑوں) کے اندرونی معاملات میں دخل نہ دینے کی پالیسی پر زور دے کر، رجواڑوں کے تئیں انگریزوں کی پالیسی میں زبردست تبدیلی کی ابتدا کر دی تھی، جبکہ منٹو نے تاج برطانیہ کے تئیں رجواڑوں کی وفاداری کے مزید ثبوت کے لیے غداروں کے خلاف کارروائی میں ان کی شمولیت پر زور دیا تھا۔ غدر کے بعد جاگیرداروں اور زمینداروں کے ساتھ اتحاد کی جو پالیسی اپنائی گئی تھی اسے اب قوم پرستوں کی تحریک سے لاحق خطرات کے پیش نظر آگے بڑھایا جا رہا تھا اور کارکردگی میں اضافے کی غرض سے کرزن کے ذریعے اختیار کردہ، مداخلت کی پالیسی سے صرف نظر کیا جانے لگا تھا۔

1909 کے انڈین کونسل ایکٹ کے تحت قانون ساز کونسل کے ممبروں کو بجٹ پر بحث کرنے، سوالات اٹھانے اور تجویزیں پیش کرنے کے سلسلے میں مزید اختیارات دے دیے گئے تھے اور پہلی بار الیکشن کے اصول کو بھی روشناس کرایا گیا تھا۔ سیٹوں کے تعین اور انتخابی اہلیت سے متعلق تفصیلات طے کرنے کا کام مقامی حکومتوں کی سفارشوں پر چھوڑ دیا گیا تھا، جس کے نتیجے میں افسر شاہی کو اصلاحات میں کتر بیونت کرنے کا پورا موقع مل گیا تھا۔ اس کے علاوہ پیشہ ور طبقوں، زمینداروں، مسلمانوں، یوروپی کامرس اور ہندوستانی کامرس کی نمائندگی کے لیے بھی خصوصی دفعات شامل کی جاتی تھیں۔ امپیریل قانون ساز کونسل میں افسروں کی اکثریت کو برقرار رکھا گیا (بہ ایں طور کہ 60 میں سے محض 27 ممبران ہی چنے جانے تھے)۔ اسی طرح صوبائی کونسلوں میں "غیر سرکاری اکثریت" محض ایک فریب تھی کیونکہ ان میں کچھ نامزد ممبر بھی شامل تھے۔ بنگال میں جو کہ واحد ایسا صوبہ تھا جہاں چنے گئے ممبران واقعی اکثریت میں تھے، چار ممبر ایسے تھے جو انگریزوں کے تجارتی حلقوں کے مفادات کی نگرانی کے لیے چنے گئے تھے۔ حکومت ہند کو سیاسی اعتبار سے خطرناک امیدواروں کو الیکشن میں حصہ لینے کی اجازت نہ دینے کا اختیار دیدیا گیا تھا۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ امپیریل کاونسل میں منتخب ممبروں کی 27 میں سے 8 نشستیں مسلم جداگانہ انتخابیہ (Electorate) کے لیے محفوظ تھیں (جب کہ 1910 کے الیکشن میں مسلمانوں نے 3 غیر محفوظ نشستوں پر بھی قبضہ کر لیا تھا)۔ خاص بات یہ کہ انتخابی قواعد و ضوابط بھی غیر منصفانہ طریقے پر بنائے گئے تھے۔ مثال کے طور پر ہندو امیدواروں کے مقابلے میں مسلم امیدواروں کے لیے کہیں کم آمدنی کی شرط رکھی گئی۔ مزید یہ کہ اگرچہ مسلم لیڈران اور افسران پورے فرقے کے حوالے سے بات کرتے تھے مگر عملاً انگریزوں کی پالیسی مسلمانوں کے محض ایک مخصوص اعلا طبقے کو ہی

ترجیح دینے کی رہتی تھی۔ چنانچہ جب 1916 میں جداگانہ انتخابیہ (Electarate) کا اطلاق یوپی کے مقامی انتخابی اداروں پر بھی کیا گیا تو مسلم رائے دہی میں سرکاری ملازم، پنشن یافتہ، اور زمیندار گروپ دوسرے پیشہ ور، تاجر اور علماء جیسے گروپوں پر حاوی ہو گئے تھے۔

شملہ وفد اور مسلم لیگ

اس طرح یوپی کے اور خاص طور پر علی گڈھ کے اس اعلا طبقے کی کوششیں زبردست طریقے پر کامیاب ہو گئی تھیں جس نے جداگانہ انتخابیہ (Electarte) کا نظام شروع کرنے اور "مملکت کے دفاع میں مسلمانوں کے تعاون کی قدر قیمت" کی بنیاد پر عددی تناسب سے زیادہ نمائندگی دینے کی درخواست پیش کرنے کے لیے یکم اکتوبر 1906 کو منٹو سے ملاقات کے لیے ایک وفد ترتیب دیا تھا۔ اس گروپ نے بہت جلد مسلم لیگ پر بھی قبضہ جمالیا۔ مسلم لیگ کی بنیاد شروع میں سلیم اللہ نے دسمبر 1906 میں ڈھاکہ میں رکھی تھی۔ مسلم لیگ کے تئیں نرم گوشہ رکھنے والے، قوم پرستوں (بلکہ ہندو فرقہ پرستوں) کے اس الزام کی تردید کرنے کی کوشش کرتے رہے ہیں کہ مسلم لیگ دراصل تمام تر انگریزوں کی ہی پیدا کردہ تھی اور (جیسا کہ کانگریس کے کاکی ناڑا اجلاس (1923) کے موقع پر محمد علی نے شملہ وفد کا ذکر بار بار کیا تھا) مسلم لیگ کی حیثیت Command Performance (کٹھ پتلی کے ناچ) سے زیادہ نہیں تھی۔ سید احمد گروپ مسلمانوں کو نامزدگی کے ذریعے خصوصی نمائندگی دینے کی اپیل 1880 کی دہائی سے ہی کر تا رہا تھا۔ اور جیسے ہی انتخابات ناگزیر ہو گئے جداگانہ انتخابیہ کا مطالبہ پیش کیا جانا ہی تھا۔ اس کے علاوہ سیاسی اعتبار سے باشعور مسلمانوں کے اندر بھی اختلاف رائے تھا جو بہت اہم تھا۔ سید احمد کے سیاسی جانشیں محسن الملک نے 4 اگست 1906 کو پرنسپل Archbold کو بتایا تھا کہ اب اور زیادہ سرگرم لائحہ عمل اختیار کرنا ضروری ہے کیونکہ "نوعمر تعلیم یافتہ مسلمان کانگریس کے تئیں ہمدرد معلوم ہوتے ہیں"۔ نوعمر تعلیم یافتہ مسلمانوں" سے ان کا اشارہ غالباً حسرت موہانی، یا محمد علی یا زمیندار اخبار کے ایڈیٹر، لاہور کے ظفر علی خاں جیسے علی گڈھ کے Young Gentlemen کی طرف رہا ہوگا۔

درحقیقت علی گڈھ اسٹوڈنٹس یونین نے ہندو مسلم سیاسی تعاون کے حق میں مئی 1906 میں ایک قرارداد پاس کی تھی۔ محسن الملک نے Arhbold کے ایک ابتدائی مسودے سے اس جملے کو حذف کر دینے پر اصرار کیا تھا جس کے ذریعے "سیاسی احتجاج سے کنارہ کش رہنے" کی اپیل کی گئی تھی کیونکہ وہ جن انقلاب پسندوں کو لگام دینا چاہتے تھے وہ پہلے ہی سے یہ کہتے آرہے تھے کہ "سرسید کی پالیسی سے اور خود میری (محسن الملک کی) پالیسی سے مسلمانوں کا کوئی بھلا نہیں ہوا ہے"۔ صفحہ 141)۔

بہر حال انگریزوں کے ذریعے فرقہ وارانہ علاحدگی پسندی کی حوصلہ افزائی ایک ناقابل تردید حقیقت ہے۔ خود منٹو نے مارلے کے نام اپنے 15 اگست 1906 کے مکتوب میں اعتراف کیا ہے کہ فلر (Fuller) "اس نئے صوبے میں آبادی کے ان دونوں گروپوں کو ایک دوسرے کے خلاف صف آراء" کر رہا تھا اور اس کا جانشین نئے تقررات کے معاملے میں مسلمانوں کی جانب داری کی پالیسی پر گامزن رہا تھا۔ اس نے "ایک انتہائی اہم نوعیت کے سیاسی معاملے کے طور پر ڈھاکہ کے نواب سلیم اللہ کو 14 لاکھ روپے کا قرض منظور کرنے کے لیے بھی منٹو پر دباؤ ڈالا تھا"۔ اس بات کے بھی واضح شواہد ہیں کہ اگرچہ پرنسپل Archbold، محسن الملک اور دوسرے مسلم لیڈروں نے وائسرائے کے سکریٹری ڈنلپ اسمتھ (Dunlop Smith) کے ساتھ ساتھ لکھنؤ کے کمشنر ہر کورٹ بٹلر (جس کے نجی کاغذات سے سور خین کو شملہ میمورنڈم کا پہلا مسودہ ملا ہے) جیسے افسروں سے بھی رابطے قائم کر رکھے تھے۔ آغا خاں نے مسلم لیگ کی تنظیم کرتے وقت 29 اکتوبر 1906 کو ڈنلپ اسمتھ کو یہ یقین دلایا تھا کہ انھوں نے محسن الملک کو ہدایت کر دی ہے کہ وہ کسی بھی معاملے میں کوئی قدم اٹھانے سے پہلے ذاتی طور پر یہ ضرور معلوم کرلیں کہ اس اقدام کو حکومت کی طرف سے مکمل تائید حاصل ہوگی۔

براہ راست ترغیب سے بھی زیادہ اہم یہ کہ دونوں کے مفادات میں معروضی یکسانیت تھی۔ آنے والی دہائیوں میں افسر شاہی نیز اعلا طبقے سے تعلق رکھنے والے ہندو اور مسلم فرقہ پرستوں کے درمیان یہ یکسانیت بار بار ابھر کر سامنے آئی۔ جملہ معترضہ کے طور پر یہ ذکر بھی کیا جاسکتا ہے کہ دسمبر 1906 میں بھارت دھرم مہامنڈل کی ایک میٹنگ میں دربھنگہ کے مہاراجہ نے یہ اعلان کیا تھا کہ "ہندوؤں کے لیے حکومت کی وفاداری یا راج بھکتی دھرم کا ایک حصہ ہوتی ہے"۔ اس بات کی کوئی اور بہتر توجیہ نہیں کی جاسکتی کہ مسلم لیگ جیسی ایک نوزائیدہ اور کمزور تنظیم (دسمبر 1907 میں اس کے کل ممبروں کی تعداد محض 400 تھی، سالانہ فیس ممبری 25 روپے سے کم نہیں تھی۔ اور 500 روپے سالانہ آمدنی، ممبر شپ کے لیے کم سے کم اہلیت تھی) جو کہ کانگریس کے ابتدائی گداگرانہ جیسے طریقے اختیار کر رہی تھی جو کہ محض تین سال کے اندر اندر اتنے بڑے پیمانے پر برگ وبار لے آئی کہ 1909 کے اوائل میں امیر علی کی قیادت میں ایک وفد مارلے کی اس تحریک پر روک لگانے میں کامیاب ہوگیا تھا جس کا مقصد جداگانہ انتخابیہ کی جگہ پر مخلوط انتخابیہ کا طریقہ اپنانا تھا۔ وفد کی اس کامیابی کی وجہ یہ تھی کہ ٹوری لیڈروں کے ساتھ اس کے روابط کو لبرل حکومت خطرے کی گھنٹی سمجھتی تھی جو کہ اس وقت داخلی اصلاحات کے معاملے میں محاذ آرائی سے گزر رہی تھی" میں یہ سمجھ نہیں سکتا کہ وہ (مسلمان) اتنی نشستوں کے واقعی حقدار بھی ہیں جتنی کہ انھیں الاٹ کی جانی چاہیں" یہ اعتراف منٹو نے 11 نومبر 1909 کو نجی طور پر مارلے سے کیا تھا۔ مگر ان

میں سے کسی نے بھی اس سلسلے میں کچھ کرنے کیلیے اپنی ذمہ داری کو محسوس نہیں کیا۔ مسلم لیگ کی بنیادی کمزوری بہت جلد اس وقت کھل کر سامنے آگئی جب اس کے زوردار احتجاج کو نظرانداز کرتے ہوئے مشرقی بنگال اور آسام کے نئے صوبے کو، جس سے کہ بلاشبہ مسلم اعلا طبقے کو تقویت ملی تھی، اچانک ہی دسمبر 1911 میں توڑ دیا گیا تھا۔

1909 کا انڈین کونسلز ایکٹ ہندوستان میں انگریزوں کے "آئینی" تجربات میں سب سے کم عمر ثابت ہوا کیونکہ محض 9 سال کے اندر اندر مونٹیگو۔ چمسفورڈ رپورٹ کے ذریعے اس پر مکمل طور پر نظر ثانی کی گئی۔ یہ ایکٹ پوری طرح ناکام ثابت ہوا۔ کیونکہ اس سے نہ تو اعتدال پسندوں کو ایک جٹ کیا جا سکا تھا اور نہ ہو سیاسی طور پر سرگرم ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک دوسرے سے الگ رکھا جا سکا تھا۔ اعتدال پسند لیڈروں نے اپنے مدراس اجلاس (1909) میں مجوزہ اصلاحات کا خیر مقدم کیا تھا۔ بہر حال 1909 میں تنقیدی جائزہ لینے پر مالویہ جیسے لوگ مسلمانوں کے لیے اتنی زیادہ مراعات کے خلاف ہو گئے جیسا کہ Bayly نے بھی الہ آباد سے متعلق اپنے تفصیلی تجزیے میں اشارہ کیا ہے، انقلابیوں کو کچل دینے کے سلسلے میں شہری حقوق کی پامالی کی نتیجے میں پیدا ہو جانے والی بے چینی، نیز جداگانہ انتخابیہ کا دائرہ مقامی انتخابی اداروں تک بھی وسیع کر دینے جیسے واقعات نے 1915 اور 1916 کے آتے آتے اور زیادہ شدت پسندانہ طریقوں کے بارے میں سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔ بہر حال کچھ عرصے کے لیے کانگریس کی سیاست (جیسا کہ جواہر لال نے بھی اپنی خودنوشت میں ذکر کیا ہے) پہلی عالمی جنگ سے ذرا پہلے کے برسوں میں بری طرح انحطاط کا شکار رہی تھی، سالانہ اجلاسوں کے شرکاء کی تعداد بڑی تیزی سے کم ہوتی چلی گئی تھی اور کچھ کے لگانے والے انتہا پسندوں کی عدم موجودگی کی وجہ سے اعتدال پسندوں کی بھی ساری صلاحیتیں محض خوش بیانیوں تک ہی محدود ہو کر رہ گئی تھیں۔ گوکھلے نے اصلاح شدہ امپریل کونسل کے جلسے میں اپنی اثرانگیز خوش بیانی کو کام میں لاتے ہوئے ہمہ گیر پرائمری تعلیم کی پرزور وکالت کی، حکومت کی جابرانہ پالیسیوں کی کڑی نکتہ چینی کی نیز مزدوروں اور جنوبی افریقہ میں آباد ہندوستانیوں کی حالتِ زار کی طرف عوام کی توجہ مبذول کرائی۔

مسلم اعلا سیاسی طبقے کو اس وقت زبردست دھکا پہونچا جب جارج پنجم نے دہلی دربار میں تقسیم بنگال کے فیصلے کو واپس لے لینے کا اعلان کر دیا تھا۔ چونکہ بادشاہ، 06-1905 میں پرنس آف ویلز کی حیثیت میں بھی ہندوستان کا دورہ کرتے وقت بنگال ایجی ٹیشن کو اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا تھا، اس لیے اس نے یہ اعلان قطعی ذاتی احساس کی بنیاد پر کیا تھا۔ کسی قدر ابتدائی پس و پیش کے بعد وائسرائے ہارڈنگ اور سکریٹری آف اسٹیٹ کریوے (Crewe) کو بھی یہ خیال کافی پسند آگیا کیونکہ اس پر کسی طرح کے اضافی اخراجات کی کوئی بات نہیں تھی۔ بادشاہ کی اس تجویز کی ہوم

ممبر Jenkins نے بھی توثیق کی۔ Jenkins بنگال میں دہشت پسندانہ سرگرمیوں کے جاری رہنے پر بہت فکر مند تھا۔ اس کا خیال تھا کہ "جب تک ہمیں تقسیم کے پھوڑے سے نجات نہیں مل پائے گی امن ہم سے کوسوں دور رہے گا"۔ حکومت ہند کے 25 اگست 1911 کے مراسلے میں بنگال کے دوبارہ اتحاد کو ایک "گورنران کونسل" کے تحت لانے اور راجدھانی کو دہلی منتقل کردینے کے ساتھ نتھی کر دیا گیا تھا۔ یہ دونوں باتیں مسلمانوں کی دل جوئی کے مد نظر، بلکہ اس سے بھی اہم اس دور اندیشانہ دلیل کے مد نظر کی گئی تھیں کہ وائسرائے کے اقتدار کو ہر طرح کے صوبائی دباؤ سے بالکل ماوراء اور آزاد ہونا چاہیے۔

دہلی کی مغلیہ شان و شوکت کی "بازیافت" کی اس کوشش سے مسلمانوں کی ذرا بھی تشفی نہیں ہوئی۔ بلکہ اٹلی اور بلقان کی جنگوں (12-1911) میں ترکی کی مدد سے انگریزوں کے انکار، علی گڈھ مسلم یونیورسٹی کے قیام کی تجویزوں کو اگست 1912 میں ہارڈنگ کے ذریعے مسترد کر دیئے جانے اور اگست 1913 میں کان پور میں ایک مسجد سے متصل چبوترے کے انہدام کے واقعات نے مسلمانوں کو اور بھی مشتعل کر دیا تھا۔ نام نہاد Young Party نے 1912 میں مسلم لیگ پر قبضہ جمالیا تھا اور اسے اور زیادہ تشدد پسندی، قوم پرست ہندوؤں کے ساتھ مفاہمت اور روز افزوں اتحاد اسلامی (Pan Islamism) کی طرف لے جانا شروع کر دیا تھا۔ اس کے رہنماؤں میں وزیر حسن، ٹی۔ اے۔ کے۔ شیروانی، یوپی کے انقلاب پسند علی برادران (محمد و شوکت)، حسرت موہانی، پنجاب کے انتہا پسند لیڈر ظفر علی خاں اور بنگال کے فضل الحق شامل تھے۔ Old Party کے بنگال کے سلیم اللہ، نواب علی چودھری، شمس الہدیٰ یا یوپی کے محسن الملک جیسے بزرگ لیڈروں کے بر خلاف Young Party کے ان رہنماؤں میں بہت کم ایسے تھے جو 'زمیندار' کا خطاب رکھتے تھے (حالانکہ یوپی میں انھیں کچھ عرصے کے لیے راجہ محمود آباد کی تائید حاصل رہی تھی)۔ Francis Robinson نے دکھایا ہے کہ یوپی میں Young Party کا زیادہ تر جھکاؤ اس طبقے کی طرف رہتا تھا جسے زمین کے لگان کی شکل میں معمولی سی آمدنی حاصل تھی...... گزر اوقات کے لیے اُسے ملازمت کا یا کسی پیشے کا سہارا لینا پڑتا تھا (صفحہ 177)۔ سماجی بناوٹ کے لحاظ سے یہ طبقہ بالکل انقلاب پسند ہندو قوم پرستوں جیسا تھا۔ محمد علی کے کامریڈ (کلکتہ)، ابوالکلام آزاد کے الہلال (کلکتہ) یا ظفر علی خاں کے زمیندار (لاہور) جیسے اخبارات و جرائد نے اپنے اتحاد اسلامی اور انگریز مخالف لب و لہجے کی وجہ سے بہت جلد پولس کی توجہ اپنی طرف مبذول کرائی تھی۔ علی برادران نے مقامات مقدسہ کے تحفظ کی غرض سے رقم اکٹھا کرنے کے لیے لکھنؤ کے عبدالباری فرنگی محلی کی تائید اور مدد سے 1913 میں انجمن خدام کعبہ بنائی تھی اور 13-1912 میں انصاری اور ظفر علی خاں جنگ بلقان میں ترکی کی مدد کی غرض سے اپنی سرکردگی میں ایک طبی مشن لے گئے تھے، وزیر حسن نے مسلم لیگ کے نئے

سکریٹری کی حیثیت میں مارچ 1913 میں ایک ایسی قرارداد پاس کرائی تھی جس میں آئینی طریقوں سے نوآبادیاتی حکومت خوداختیاری، نو مسلم لیگ کا نصب العین قرار دیا گیا تھا۔ یہ بات کانگریس سے ہم آہنگ تھی۔ گویا اس طرح خلافت تحریک کے لیے اور بحیثیت مجموعی ہندو مسلم سیاسی تعاون کے لیے فضا تیار ہو رہی تھی۔

انقلابی دہشت پسندی

اس اثناء میں بنگال میں انقلابی دہشت پسندی میں کمی کے کوئی آثار پیدا نہیں ہوئے، بلکہ دسمبر 1911 میں تقسیم کے فیصلے کو واپس لے کر جس "شاہی دربار دلی" کا مظاہرہ کیا گیا تھا، اس کا بھی کوئی اثر نہیں ہوا۔ ڈھاکہ کی انتہائی منظم انوشیلن سمتی نے، جس کی اب تک صوبے بھر میں، بلکہ صوبے سے باہر بھی شاخیں قائم ہو چکی تھیں، اپنی ساری توجہ فنڈ اکٹھا کرنے کی غرض سے سودیشی ڈاکوں، نیز افسروں اور غداروں کے قتل پر مرکوز کر دی تھی، جیتندر ناتھ مکھرجی کی قیادت والی 'یوگانتر پارٹی' دراصل مختلف گروپوں کا ایک ڈھیلا ڈھالا وفاق تھی جس کی ساری کوشش مناسب وقت پر فوجی سازش تیار کرنے کی غرض سے اپنے وسائل کو محفوظ رکھنے اور بین الاقوامی رابطے قائم کرنے پر مرکوز تھی۔ راس بہاری بوس اور سچندر ناتھ سانیال نے مل کر ایک ایسی بڑی خفیہ تنظیم بنائی تھی جس کے مراکز پنجاب، دہلی اور یوپی تک پھیلے ہوئے تھے اور ہارڈنگ پر اس وقت بم سے حملہ بھی کیا گیا تھا جب وہ 23 دسمبر 1912 کو نئی راجدھانی میں سرکاری طور پر پہلی بار داخل ہو رہا تھا۔

بہر حال کسی محفوظ پناہ گاہ کی تلاش، پریس قوانین کی زد سے بچتے ہوئے انقلابی لٹریچر کی تیاری اور اشاعت اور ہتھیاروں کی ضرورت ہندوستانی انقلابیوں کو وطن سے باہر لے گئی۔ لندن میں شیام جی کرشنا ورما نے 1905 میں ہندوستانی طالب علموں کے لیے ایک مرکز (انڈیا ہاؤس) ایک جریدہ (انڈین سوشولوجسٹ)، ہندوستانی ہوم رول سوسائٹی اور تھوڑے ہی عرصے بعد ہندوستان کے انقلاب پسند نوجوانوں کو راغب کرنے کے لیے ایک اسکالر شپ اسکیم شروع کی تھی مگر کرشنا ورما کی اپنی تشدد پسندی نظریاتی حدود سے کبھی آگے نہیں گئی اور متحملانہ مزاحمت تک ہی محدود رہی۔ لیکن 1907 میں ان کے انڈیا ہاؤس پر اس انقلابی گروپ نے قبضہ کر لیا تھا جس کی قیادت ناسک کے وی ڈی ساورکر کر رہے تھے۔ اس حلقے سے تعلق رکھنے والے مدن لال دھینگرا نے انڈیا آفس کے ایک بیوروکریٹ Carzon Myllie کو جولائی 1909 میں قتل کر دیا تھا اور یہ کہتے ہوئے پھانسی کے پھندے کو چوم لیا تھا کہ "نہ تو امیر نہ ہی معزز بلکہ مجھ سا ایک نادار شخص ہی مادرِ وطن کو اپنے خون کی قربانی پیش کر سکتا ہے۔ کاش کہ مادرِ وطن مجھے ایک بار پھر جنم دے اور

کاش کہ میں ایک بار پھر اسی کاز کے لیے سوت کو گلے لگا سکوں" اور "یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہے جب تک کہ مادرِ وطن آزاد نہ ہو جائے"۔ اب لندن مزید انقلابیوں کو برداشت کرنے کے لیے ہرگز تیار نہیں تھا۔ اور بطور خاص ناسک سازش مقدمے میں ویر ساورکر کی 1910 میں ملک بدری اور زندگی بھر کی جلاوطنی کے بعد تو انقلابیوں کا لندن میں رہنا انتہائی دشوار ہو گیا تھا۔ چنانچہ ان کی سرگرمیوں کے مرکز تبدیل ہو گئے۔ اب پیرس اور جینوا ان کی سرگرمیوں کا مرکز بن گئے جہاں ایک پارسی انقلاب پسند مادام Cama نے، جنھوں نے Jean Longuet جیسے فرانسیسی سوشلسٹوں کے ساتھ رابطے قائم کر رکھے تھے۔ بندے ماترم نکالنا شروع کر دیا تھا اور اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ جیسے ہی برطانیہ اور جرمنی کے آپسی تعلقات خراب ہو گئے، ویرندرناتھ چٹوپادھیائے نے 1909 سے برلن کو اپنا مستقر بنا لیا تھا۔

برطانیہ میں بلکہ پورے یورپ میں ہندوستانیوں کی حیثیت محض الگ تھلگ مہاجرت کی زندگی گزارنے والے گروپوں جیسی تھی۔ بہر حال برٹش کولمبیا، بحرالکاہل کے ساحلی ملکوں اور امریکہ میں انقلابی تحریک کو پہلی بار عوامی بنیاد جیسی چیز حاصل ہو گئی۔ یہاں 1914 تک 15 ہزار ہندوستانیوں کی، جن میں زیادہ تر سکھ تھے، ایک نو آبادی وجود میں آچکی تھی۔ ان میں خوش حال تاجر، اور ورکر بھی شامل تھے، تاہم یہ سب لوگ کسی نہ کسی طرح کے نسلی امتیاز کا بھی شکار تھے، جس کے سلسلے میں برطانوی ہند کی حکومت نے کچھ نہیں کیا۔

1913 سے سان فرانسسکو میں مشہور غدر تحریک شروع ہوئی۔ اس تحریک کی بنیاد سوہن سنگھ بھاکیہ (Bhakia) نے رکھی تھی اور اس کے اوّلیں لیڈروں میں دہلی کے سینٹ اسٹیفن کالج کے ہردیال جیسے ہونہار دانشور بھی شامل تھے۔ تحریک کا نام 'غدر تحریک' دراصل 'غدر' نام کے اس حکومت مخالف اخبار کی وجہ سے پڑا تھا جو نومبر 1913 سے اردو اور گورمکھی میں اور بعد میں دوسری ہندوستانی زبانوں میں نکالا جا رہا تھا۔ 'غدر' کا پہلا شمارہ اس پیغام سے شروع ہوا تھا۔ "ہمارا نام کیا ہے؟ غدر! ہمارا کام کیا ہے؟ شورش برپا کرنا!...... یہ شورش کہاں برپا ہو گی! ہندوستان میں! یہ کب برپا ہو گی! چند برسوں میں!"...... دوسرے ملکوں میں آباد ہندوستانیوں نے غدر تحریک کے ذریعے ہندوستان کی تحریک آزادی میں بہت اہم رول ادا کیا۔ دوسرے یہ کہ اس عرصے میں جنوبی افریقہ میں ستیہ گرہ کا تجربہ کیا گیا۔ جس کا جائزہ بعد میں گاندھی جی کے ورود کے ذکر کے ضمن میں کیا جائے گا۔

دوسرے ملکوں میں ہندوستانی انقلاب پسندوں کی نقل و حرکت کے نتیجے میں پہلی عالمی جنگ کے دوران ہندوستان میں انگریزی حکومت کے لیے کچھ عرصے کے لیے حقیقی خطرات تو پیدا ہو گئے تھے ہی، ساتھ میں اس کے نتیجے میں ہندو ذہنیت، مقامیت اور علاقہ پرستی، نیز ابتدائی دور کی

تشدد پسندانہ قوم پرستی کے محدود سماجی تناظر کو ختم کرنے میں بھی کافی مدد ملی۔ اربندو گھوش نے 'ہندو بھوانی مندر' کے عنوان سے اپنے 1905 کے ایک انتہائی جارحانہ کتابچے میں "پوری دنیا کو آریائی بنادینے کی ضرورت" پر زور دیا تھا اور تمام طبقات کو ایک مذہب اور زندہ مذہبی جذبے کے رشتے سے منسلک کردینے کی بات بھی کہی تھی بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر زمینداروں اور کاشت کاروں کے درمیان کدورت کو دور کرنے کی بھی خواہش ظاہر کی تھی"۔ بہرحال لندن گروپ کے کتابچے Oh Martyres(1907) کی اشاعت سے 1857 کے ہندو مسلم اتحاد کی یاد ایک بار پھر تازہ ہوگئی تھی۔ اس پمفلٹ میں کہا گیا تھا کہ 'دنیا نے یہ بھی دیکھا تھا کہ کس طرح فرنگی حکومت ٹکرے ٹکرے ہوکر بکھر گئی تھی اور ہندوؤں اور مسلمانوں کے اتحاد سے سودیشی حکومتیں قائم کی گئی تھیں......دھینگرہ کے پستول کی گولی کی آواز نے آئرش مزارع کے جھونپڑے میں بھی دھمک پیدا کردی تھی۔ اس آواز نے مصری دہقان کو بھی چونکادیا تھا اور افریقہ کی تاریک کانوں میں خون پسینہ ایک کرنے والے زولو مزدوروں کو بھی ہلادیا تھا...... "(بندے ماترے، لندن 1909)۔ بطور خاص آئرش انقلاب پسندوں کے ساتھ قریبی روابط تھے۔ چنانچہ ہندوستانی کسٹم حکام انڈین سوشولوجسٹ 'بندے ماترم، چٹوپادھیائے کے اخبار تلوار (برلن) تارک ناتھ داس کے اخبار فری ہندوستان (ونکوور) اور غدر جیسے اخبارات کے ساتھ ساتھ G.F. Freeman کے جریدے New York Gaelic American کو بھی ضبط کرلیا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ بین الاقوامی سوشلسٹ تحریک کے ساتھ بھی رابطے قائم کیے جارہے تھے۔ چنانچہ برٹش مارکسٹ سوشل ڈیمو کریٹک فیڈریشن کے Hyndman کرشنا درم کے انڈیا ہاؤس کے جلسوں سے خطاب کرتے تھے۔ مادام کاما(Cama) نے اگست 1907 میں سکنڈ انٹرنیشنل Stuttgart کانگریس کے موقع پر آزاد ہندوستان کا جھنڈا لہرایا تھا اور ہردیال نے عالمی صنعتی مزدوروں کی تنظیم کی سان فرانسسکو شاخ کے سکریٹری کے طور پر کام کیا تھا۔ اس کے علاوہ انھوں نے ماڈرن ریویو (کلکتہ) کے مارچ 1912 کے شمارے میں کارل مارکس کے بارے میں بھی لکھا تھا جو کہ مارکس کے بارے میں کسی ہندوستانی کا پہلا مضمون تھا۔ اسے ہرگز محض اتفاق کا نام نہیں دیا جاسکتا کہ روس کے انقلاب اکتوبر کے بعد یوگانتر کے رہنما نارین بھٹا چارجی (ایم این رائے)، ویندرناتھ چٹوپادھیائے، اباتی چکرورتی نیز غدر تحریک سے وابستہ، ابتدائی کیمونسٹ جیسے چندر رہنما اسی ماحول کی پیداوار تھے۔

جنگ اور ہندوستانی سیاست

پہلی عالمی جنگ (18-1914) کے نتیجے میں ہندوستان کی سیاسی زندگی اور سماجی حالات میں اہم تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ اس سلسلے کے زیادہ اہم مضمرات سے قطع نظر کرتے ہوئے (خاص طور پر جنگ کے فوراً بعد ملک گیر سطح پر شروع ہونے والی قوم پرست تحریک سے صرف نظر کرتے ہوئے) سب سے پہلے ہم جنگ کے سلسلے میں ہندوستان میں سرگرم سیاسی گروپوں کے باہم مختلف رد عمل کا ذکر کرنا چاہیں گے۔

انقلابی سرگرمیاں

فوراً مکمل آزادی کے لیے جدوجہد کرنے والے انقلاب پسندوں کے لیے یہ جنگ غیبی مدد کی حیثیت رکھتی تھی۔ ہندوستان کی فوجی نفری میں بھاری کمی آگئی تھی (ایک مرحلے میں تو گورے سپاہیوں کی تعداد محض 15,000 رہ گئی تھی) اور برطانیہ کے ترکی اور جرمنی جیسے دشمنوں کی طرف سے مالی اور فوجی مدد کا امکان بھی پیدا ہو گیا تھا۔ ایک مرحلہ ایسا بھی آگیا تھا جب ایک کامیاب اور مکمل انقلاب ناممکن معلوم نہیں ہوتا تھا۔ خلافت کا مرکز ہونے کے ناطے مسلمانانِ عالم کی رہنمائی کے دعویدار ترکی کے ساتھ برطانیہ کی جنگ ہندو قوم پرستوں نیز اتحادِ اسلامی کا نعرہ بلند کرنے والے شدت پسند مسلمانوں کے درمیان تعاون کا باعث ثابت ہوئی اور غدر تحریک کے برکت اللہ نیز دیوبندی مکتب سے تعلق رکھنے والے محمود حسن اور عبید اللہ سندھی جیسے انقلاب پسند لیڈر ابھر کر سامنے آئے۔

بنگال میں انقلاب پسندوں کو اگست 1914 میں اس وقت بھاری کامیابی ملی جب انھیں کلکتہ کی Rodda فرم کے توسط سے پچاس ماؤزر پستول اور 46,000 گولیاں حاصل ہوئی تھیں۔ اس کے نتیجے میں قتل اور ڈاکہ زنی کے واقعات میں اچانک شدت آگئی تھی۔ 15-1914 میں قتل کے 12 اور ڈکیتی کے 7 واقعات ہوئے تھے جبکہ 16-1915 میں یہ تعداد بالترتیب 23 اور 7 رہی تھی۔ بنگال کے بیشتر انقلابی گروپ جتن مکھرجی (عرف باگھا جتن) کے جھنڈے تلے متحد ہو گئے تھے اور ریل نظام میں خلل پیدا کرنے، کلکتہ کے فورٹ ولیم پر قبضہ کر لینے (اس سلسلے میں 16ویں راجپوت رائفلز کے ساتھ رابطہ بھی قائم کر لیا گیا تھا) اور جرمنی سے ہتھیار منگانے کے منصوبے بنائے گئے تھے۔ مگر بہتر تال میل نہ ہونے کی وجہ سے یہ سارے منصوبے ناکام ہو گئے اور باگھا جتن نے اڑیسہ کے ساحل پر بالاسور کے قریب ایک ہیرو کی طرح موت کو گلے لگالیا۔ پولس نے مقامی گاؤں والوں کی مدد سے ان کا پتہ لگالیا تھا۔ پولس والوں کے ساتھ گاؤں والوں کے اس تعاون سے صاف

پتہ چلتا ہے کہ بنگال کے انقلاب پسند سماجی اعتبار سے الگ تھلگ پڑ گئے تھے۔

بنگال کے انقلاب پسندوں کے یہ منصوبے دراصل اس وسیع تر سازش کا حصہ تھے جو راس بہاری بوس اور سچن ساتیال نے پنجاب واپس لوٹ آنے والے غدر لیڈروں کے ساتھ مل کر تیار کی تھی، واضح رہے کہ غدر تحریک سے وابستہ یہ لوگ جنگ چھڑ جانے کے بعد، ملک کی آزادی کے لیے جدوجہد کرنے کی غرض سے ہزاروں کی تعداد میں بیرون ملک سے لوٹنا شروع ہو گئے تھے۔ 'کوما گتامارو' واقعے کے بعد جذبات میں اور بھی شدت آ گئی تھی۔ ہوا یہ تھا کہ 29 ستمبر 1914 کو کناڈا کے مائی گریشن افسران نے جن سکھ اور پنجابی مسلم تارکین وطن کو ایک جہاز میں بھر کر واپس لوٹا دیا تھا ان کا کلکتہ کے قریب بج بج میں پولس کے ساتھ ٹکراؤ ہو گیا تھا جس میں 22 لوگ مارے گئے تھے۔ 1914 کے بعد جو بہت سے پنجابی واپس لوٹ آئے تھے انھیں انگریزوں نے دبوچ لیا تھا۔ (1916 میں اس طرح کے 8000 میں سے 2500 لوگ نظر بند اور 400 لوگ قید کر دیے گئے تھے۔ فیروز پور، لاہور نیز راول پنڈی کے محافظ فوجی دستوں (Garison) کی بغاوت کے ذریعے 21 فروری 1913 کو انقلاب برپا کرنے کا جو منصوبہ بنایا گیا تھا وہ عین موقع پر چند لوگوں کی غداری کی بھینٹ چڑھ گیا تھا۔ راس بہاری بوس کو جاپان میں پناہ لینی پڑی تھی اور سچین سانیال کو بنارس نیز داناپور کے محافظ دستوں میں تخریب کاری کے الزام میں زندگی بھر کے لیے ملک بدر کر دیا گیا تھا۔ اگرچہ ملک گیر انقلاب کا منصوبہ بری طرح ناکام ہو گیا تھا مگر اس منصوبے کو تیار کرنے والے، خاص طور پر غدر تحریک سے تعلق رکھنے والے افراد انقلابی نظریات کو اب بھی فوج اور کسانوں تک پہونچانے کا کام انجام دے رہے تھے۔ مقامی نوعیت کی بغاوت کے بھی واقعات ہوئے، جن میں 15 فروری 1915 کی سنگاپور کی بغاوت، جمعدار چشتی خاں، جمعدار عبدالغنی اور صوبیدار داؤد خاں کی ماتحتی میں پنجابی مسلم پانچویں لائٹ انفنٹری اور 36 ویں سکھ بٹالین کی بغاوت قابل ذکر ہے۔ اس بغاوت کے کچلے جانے کے بعد 37 کو سزائے موت سنائی گئی اور 41 لوگوں کو زندگی بھر کے لیے ملک بدر کر دیا گیا۔ پنجاب میں جنوری، فروری 1915 کی سیاسی ڈکیتیوں کا ایک سماجی پہلو بھی تھا۔ اس طرح کی پانچ بڑی سیاسی ڈکیتیوں میں سے تین میں گاؤں کے مہاجنوں کو نشانہ بنایا گیا تھا اور حملہ آوروں نے نقدی اور زیورات وغیرہ لوٹ لینے سے پہلے قرض نامے اور رہن نامے وغیرہ جلا ڈالے تھے۔ واقعہ یہ ہے کہ غدر تحریک سے تعلق رکھنے والے نچلے طبقے کے لوگوں اور عام سپاہیوں کو تاریخ میں اتنی اہمیت نہیں دی گئی جتنی کہ بنگال کے بھدرلوک دہشت پسندوں کو دی گئی ہے۔ بنگال کے بھدرلوک دہشت پسندوں کے نام کم سے کم اپنے صوبے میں گھر گھر میں آج بھی جانے جاتے ہیں۔ بہر حال غدر تحریک کے ہیروؤں کے ساتھ کی گئی اس زیادتی کا ازالہ بہت ضروری ہے۔ ان میں کرتار سنگھ سارتھ بھی شامل تھا۔ اس 19 سالہ نوجوان نے پنجاب کے محافظ

دستوں میں بغاوت برپا کرنے کی کوشش کی تھی اور ان الفاظ کے ساتھ دم توڑا تھا..... ''اگر مجھے ایک سے زائد جیون ملتا تو میں اپنے ہر جیون کو اسی طرح ملک پر نثار کر دیتا'' اسی طرح عبداللہ کے الفاظ بھی آج بھی کانوں میں گونج رہے ہیں۔ عبداللہ اُن باغی سپاہیوں میں واحد مسلمان تھا جنھیں ابنالہ میں پھانسی دیدی گئی تھی۔ اس نے اپنے 'کافر' ساتھیوں کے ساتھ غداری کی ہر ترغیب کو ٹھکرادیا تھا۔ عبداللہ کا کہنا تھا کہ ''یہی تو وہ لوگ ہیں جن کا ساتھ دے کر ہی وہ جنت میں قدم رکھ سکے گا''۔

جنگ کے دوران باغیوں کو بیرون ملک سے مدد بھیجنے کا مرکز برلن تھا جہاں 1915 میں وریندر ناتھ چٹوپادھیائے، بھوپن دتا، ہر دیال اور کچھ دوسرے لوگوں نے جرمنی کے دفتر خارجہ کے ساتھ تال میل قائم کر کے ایک کمیٹی برائے آزادی قائم کر رکھی تھی۔ ایک انڈو۔ جرمن ترکش مشن نے ہند۔ ایران سرحد کے قریب قبائلیوں کو انگریزوں کے خلاف بھڑکانے کی کوشش کی تھی اور دسمبر 1915 میں راجہ مہندر پرتاپ، برکت اللہ اور عبیداللہ سندھی نے کابل میں آزاد ہند کی ایک عبوری حکومت قائم کرلی تھی۔ جسے ولی عہد امان اللہ کی طرف سے کسی قدر تائید حاصل تھی مگر امیر حبیب اللہ نے کوئی مدد نہیں کی تھی۔ ایک تیسرا مرکز امریکہ تھا جہاں رام چندر جیسے باقی ماندہ غدر لیڈروں نیز نیویارک میں برلن کمیٹی کے نمائندوں کو جرمنی سے قابل لحاظ مقدار میں مالی مدد تو ملی مگر یہ لوگ آپس ہی میں لڑ بیٹھے تھے۔ جنگ میں امریکہ کے کود پڑنے کے بعد 'ہندو سازش مقدمہ' (1918) سے اس طرح کی سرگرمیاں ختم ہو گئیں۔ جرمنی سے رقوم مشرق بعید کے سفارت خانوں کے توسط سے بھی بھیجی گئیں اور راس بہاری بوس نیز امبانی مکھرجی نے 1915 سے جاپان سے ہتھیار بھیجنے کی متعدد بار کوشش کی جو ناکام رہی اور اگر کبھی چند بندوقیں ہندوستان پہونچ بھی جاتی تھیں تو کافی تاخیر سے، کیونکہ ہندوستان میں کسی امکانی مسلح انقلاب کا نقطہ عروج 1915 کے اوائل میں ہی شروع ہو کر ختم بھی ہو گیا تھا۔

انگریزوں نے جنگ کے دوران کی دھمکیوں کے جواب میں سخت استبدادی اقدامات کیے تھے۔ ان اقدامات نے 1857 کے سخت ترین اقدامات کی یاد تازہ کر دی تھی۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ بطور خاص غدر تحریک کو کچل دینے کے لیے مارچ 1915 میں ڈیفنس آف انڈیا ایکٹ بھی پاس کیا گیا ۔ پنجاب اور بنگال میں مشتبہ لوگوں کو بڑی تعداد میں گرفتار کیا گیا اور مقدمہ چلائے بغیر برسوں جیلوں میں بند رکھا گیا۔ خصوصی عدالتوں نے سخت ترین سزائیں سنائیں۔ ایک اندازے کے مطابق غدر تحریک کے سلسلے میں 46 لوگوں کو سزائے موت اور 64 لوگوں کو عمر قید کی سزا سنائی گئی۔ متعدد فوجیوں کا کورٹ مارشل بھی ہوا۔ بنگال کے دہشت پسندوں اور پنجاب کے غدر پسندوں کے علاوہ، اتحاد اسلامی کے علم برداروں کی وجہ سے بھی انگریز چوکنا ہو چکے تھے اور علی برادران،

آزاد اور حسرت موہانی وغیرہ کو جنگ کے دوران جیل میں ڈال دیا گیا تھا اور بعض کو تو جنگ کے بعد بھی بند رکھا گیا تھا۔

اتحاد لکھنؤ

جو ہندوستانی سیاست داں انقلاب پسند نہیں تھے، وہ جنگ کی کوششوں کی تائید کر رہے تھے۔ 1918 میں تلک اور گاندھی نے تو انگریزوں کے لیے نفری اور فنڈ اکٹھا کرنے کی غرض سے گاؤں گاؤں کا دورہ تک کیا تھا۔ انھیں اپنی اس وفاداری کے بدلے میں انگریزوں کی طرف سے نمایاں سیاسی اصلاحات کی امید تھی۔ چنانچہ 1918 میں تلک کا کہنا تھا کہ "جنگی ہنڈی خریدئے اور انھیں ہوم رول کا فرمان سمجھیے"۔ اس طرح جنگ کے دوران ایک طرح کی معروضی بنیاد ابھر کر سامنے آئی اور اعتدال پسندوں، انتہا پسندوں اور 'ینگ پارٹی' کے کنٹرول والی مسلم لیگ کا ایک مشترک پلیٹ فارم تیار ہو گیا جہاں سے جنگی تعاون کے بدلے میں انگریزوں پر سخت آئینی دباؤ ڈالا جا سکتا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ تلک 1914 میں منڈالے میں جلاوطنی سے واپسی پر اپنے پرانے کانگریسی مخالفوں کے ساتھ صلح صفائی کے لیے بے تاب تھے۔ بہر حال فیروز شاہ مہتہ تو 1915 میں اپنے انتقال تک ٹس سے مس نہیں ہوئے۔ کلکتہ کے بھوپندر ناتھ بوس جیسے اعتدال پسند لیڈر "کانگریس کو موجودہ دلدل سے باہر نکالنے کے لیے کوئی بھی راستہ اپنانے کے لیے تیار تھے" (مکتوب بنام گوکھلے، 26 نومبر 1914)۔ جس نئی بات نے کانگریس کو پھر سے متحد کرنے میں اہم رول ادا کیا وہ یہ تھی کہ 1914 سے مس اینی بیسنٹ بڑی تیزی سے سیاسی سطح پر ابھر آئی تھیں۔ جیسا کہ بعد کے واقعات سے بھی ظاہر ہو گیا، وہ سامراج کی مخالفت سے کوسوں دور تھیں۔ مگر انھوں نے یہ ضرور محسوس کر لیا تھا کہ ہند۔ برطانیہ دوستی کے لیے حکومت خود مختاری کی سمت میں ٹھوس اقدامات ضروری ہو گئے تھے اور یہ کہ یہ مقصد موثر اور ملک گیر احتجاج کے ذریعے ہی حاصل کیا جا سکتا تھا۔

دسمبر 1915 میں تلک گروپ کو کانگریس میں پھر سے شامل ہونے کی اجازت دیدی گئی اور بمبئی میں کانگریس نیز مسلم لیگ کے بہ یک وقت اجلاسوں میں کم سے کم آئینی مطالبات کے لیے آپسی صلاح مشورے کی ذریعے ایک مشترک پلیٹ فارم کے مسودے کی تیاری کی غرض سے کمیٹیاں تشکیل دی گئیں۔ امپیریل کاونسل کے 19 غیر سرکاری ممبروں نے اکتوبر 1916 میں وائسرائے سے ایک نمائندہ حکومت کی تشکیل اور ہندوستان کو ایک Dominion کی حیثیت دینے کے لیے مشترکہ طور پر اپیل کی۔ دسمبر 1916 میں لکھنؤ میں کونسلوں میں منتخبہ ممبروں کی اکثریت قائم کرنے کا مطالبہ مشترک طور پر پیش کیا گیا، اور ہندو مسلم سیاسی اختلافات کو مشہور

لکھنؤ معاہدے کے ذریعے دور کرنے کی کوشش کی گئی جس میں کانگریس نے جداگانہ انتخابیہ کو تسلیم کر لیا تھا اور سیٹوں کے بٹوارے کے بارے میں بھی تصفیہ ہو گیا تھا۔ مسلم لیڈروں نے بمبئی اور یوپی میں تناسب سے زیادہ نمائندگی کے بدلے میں مسلم اکثریت والے علاقوں میں تناسب سے کم نمائندگی کو قبول کر لیا تھا۔ اس معاہدے میں یوپی کی 'ینگ پارٹی' کے مفادات صاف جھلک رہے تھے۔ اس ینگ پارٹی کی قیادت وزیر حسن اور راجہ محمود آباد کر رہے تھے۔ چنانچہ بنگال میں اس معاہدے کو فضل حق کی تائید حاصل ہونے کے باوجود بھی ناراضگی ظاہر کی گئی تھی۔

ہوم رول ایجی ٹیشن

بہر حال کانگریس کی ساری سرگرمیاں جلسے کرنے اور قرار دادیں پاس کرنے تک ہی محدود رہیں، جس کی وجہ سے وہ کسی بھی ایجی ٹیشن کو برقرار رکھنے کی پوزیشن میں نہیں تھی۔ تلک نے کانگریس کو ایک حقیقی سیاسی پارٹی کی حیثیت دینے کے مقصد سے ایک جامع ورکنگ کمیٹی کی تشکیل کی جو تجویز لکھنؤ میں پیش کی تھی اسے صدر نے بے ضابطہ قرار دے کر یک لخت مسترد کر دیا تھا۔ چنانچہ ایسی صورت میں ایجی ٹیشن کا سارا کام اب تلک اور اینی بیسنٹ کی قائم کردہ ہوم رول لیگوں کے ذریعے منظم کیا جاتا تھا۔ بیسنٹ نے اپنی لیگ کے منصوبے کا اعلان ستمبر 1915 میں کیا تھا اور اس سلسلے میں مدراس سے شائع ہونے والے اپنے جریدوں 'نیو انڈیا' اور کامن ویل (Common Weal) کے ذریعے اور پھر بعد میں اپریل 1916 سے بمبئی سے شروع کیے گئے اخبار 'ینگ انڈیا' کے ذریعے کام کرنا شروع کر دیا تھا۔ بہر حال تلک نے مہاراشٹر میں اپنی پرانی بنیاد قائم رکھنے کے لیے اپریل 1916 میں اپنی ہوم رول لیگ شروع کر کے اینی بیسنٹ کی پیش رفت پر روک لگا دی تھی۔ یہ ہوم رول لیگ محض مہاراشٹر اور کرناٹک تک ہی محدود رہی مگر اس کے اپنے دعوے کے مطابق اس کے ممبروں کی تعداد اپریل 1917 میں 14,000 تھی جو بڑھ کر 1918 کے اوائل میں 32,000 ہو گئی تھی۔ اگرچہ اینی بیسنٹ کی لیگ کل ہند حیثیت کی تھی مگر اس کا زیادہ تر دارومدار اس کی بانی کے تھیوسوفیکل روابط پر تھا۔ یہ لیگ اپریل 1916 میں قائم کی گئی تھی۔ جہاں تلک اور کیلکر نے واقعی ایک مرکزی نوعیت کی تنظیم پونا سے چلانے کی کوشش کی، اینی بیسنٹ کا صدر دفتر اڈیار (مدراس) میں تھا مگر وہ اپنی دو سو مقامی شاخوں پر کنٹرول قائم نہیں رکھ سکا تھا۔ واضح رہے کہ اس لیگ کی 135 شاخیں مدراس پریزیڈنسی علاقے میں تھیں۔ 1917 کے وسط میں اپنی سرگرمیوں کے عروج کے زمانے میں اینی بسنٹ کی لیگ کے ممبروں کی تعداد 27,000 تک پہنچ گئی تھی۔

ان دونوں ہوم رول لیگوں کی سرگرمیاں زیادہ تر مذاکراتی گروپوں کو منظم کرنے، شہروں میں ریڈنگ روم کھولنے، بڑے پیمانے پر کتابچے شائع کرنے اور گھوم گھوم کر تقریریں کرنے (لکچر

دینے) پر ہی مبنی ہوتی تھیں، جو کہ اعتدال پسندوں کی سرگرمیوں سے زیادہ مختلف نہیں تھیں۔ البتہ اپنی شدت کے لحاظ سے یہ بالکل ایک نئی تنظیم تھی۔ تلک کی لیگ نے اپنے پہلے سال میں 6 مراٹھی اور دو انگریزی کتابچوں کی تقریباً 47 ہزار کاپیاں فروخت کی تھیں جبکہ بیسنٹ کی تنظیم ستمبر 1916 تک اپنے انگریزی کتابچوں کی 30 ہزار کاپیاں شائع کر چکی تھی۔ متحملانہ مزاحمت کی بات بھی ہوتی تھی، خاص طور پر اس وقت جب بیسنٹ اور ان کے دو بڑے تھیوسوفیکل ساتھی ارن ڈالے اور واڈیا جون 1917 میں بند کر دیے گئے تھے۔ اگرچہ سارا پروپیگنڈا ہوم رول کے محض نظریاتی اور مجرد تصور پر ہی مرکوز ہوتا تھا؛ البتہ تلک کی بعض دستیاب تقریروں سے بعض دلچسپ کوششوں کا بھی پتہ چلتا ہے۔ وہ کوششیں، جو بعد میں گاندھی کے زمانے میں بھی بار بار اپنائی گئی تھیں۔ تلک نے یکم مئی 1916 کو بلگام میں تقریر کرتے ہوئے صاف صاف کہا تھا "محکمہ جنگلات ہمارے ساتھ ظلم کر رہا ہے اور آب کاری کے محکمے کی وجہ سے شراب کو اور بھی بڑھاوا ملا ہے"۔ اس تقریر میں مالیہ پر پڑنے والے بھاری دباؤ اور نمک ٹیکس کا بھی ذکر کیا گیا تھا۔ پھر یہ کہ تلک کی تحریک کو خالصتاً ایک چت پون براہمن معاملہ قرار دینا بھی درست نہیں ہے۔ ان کی ہوم رول لیگ کے ممبروں کی فہرستوں سے پتہ چلتا ہے کہ پونا میں بڑی تعداد غیر براہمن تاجروں کی تھی اور خاندیش جیسے اضلاع میں مراٹھوں کی تعداد براہموں سے کہیں زیادہ تھی۔ ہوم لیگ کے بی۔ پی واڈیا جیسے لیڈروں نے مدراس کے کامگار طبقوں کے درمیان کہیں کہیں ٹریڈ یونین کی سرگرمیاں بھی شروع کر دی تھیں۔

ہوم رول ایجی ٹیشن، بالخصوص اینی بیسنٹ کی ہوم رول لیگ کی اصل اہمیت اس بات میں ہے کہ اس طرح تحریک کا دائرہ نئے علاقوں، نئے گروپوں بلکہ پوری نئی نسل تک پھیل گیا۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس کی نشان دہی ایچ۔ ایف Owen نے بھی کی ہے۔ مہاراشٹر کے علاوہ دو دوسرے پرانے انتہا پسند مرکزوں میں خاموشی چھا گئی تھی۔ جنگ کے زمانے میں انگریزوں کی استبدادی کارروائیوں کا نشانہ پنجاب اور بنگال کو بنایا گیا تھا جس کی وجہ سے ان دونوں علاقوں میں کھلم کھلا تشدد پسند ایجی ٹیشن چلانا مشکل ہو گیا تھا۔ بہر حال بنگال میں بھوانی پور کی صوبائی کانفرنس (اپریل 1917) کے ذریعے ایک اہم نئے لیڈر چترنجن داس نے سرگرم سیاست میں قدم رکھا تھا۔ بیسنٹ کی لیگ کو زیادہ تر مدراس شہر، نیز مضافاتی علاقوں کے براہمنوں، یوپی میں شہری پیشہ جاتی گروپوں (کائستھوں، شہری براہموں اور کسی حد تک مسلمانوں)، سندھ میں ہندو عامل اقلیت نیز بمبئی شہر اور گجرات میں نو عمر گجراتی صنعت کاروں، تاجروں اور وکیلوں کی تائید حاصل تھی۔ کسی حد تک سماجی اصلاح، قدیم ہندو دانش وری کی روایات نیز مغرب کی عام سائنسی ترقیات کو ہند کے رشیوں منیوں کا مرہون منت قرار دینے کی کوشش کی باہم آمیزش سے اینی بیسنٹ کے تھیوسوفی نظریے کو کافی مقبولیت حاصل ہو گئی تھی۔ اس مقبولیت کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ براہمو سماج یا

آریہ سماج جیسی دوسری اصلاحی یا احیاء پسندانہ تحریکیں اس طرح ان گروپوں تک نہیں پہونچ سکی تھیں۔ پھر یہ کہ بمبئی اور مدراس شہروں کے علاوہ باقی مقامات پر ایک طرح کا سیاسی خلاء بھی پیدا ہو چکا تھا۔ کیونکہ ان دونوں شہروں کے علاوہ دوسرے علاقوں میں مضبوط سیاسی روایات قائم نہیں ہو پائی تھیں۔ خود اینی بیسنٹ بھی مدراس میں اپنے قریبی ساتھیوں (واڈیا، ارن ڈالے اور سی پی راما سوامی ایر وغیرہ) کے ساتھ بہت جلد انقلابی سیاست سے کنارہ کش ہو گئی تھیں اور خود ایر تو بعد میں ریاست ٹراونکور کے ایک اقتدار پرست اور قدامت پرست دیوان بن گئے تھے۔ البتہ جو نوجوان ہوم رول تحریک کے ذریعے کافی متحرک ہو چکے تھے ان میں چند تو ایسے تھے جو آگے چل کر 1920 سے ہندوستانی سیاست کے اہم کردار بنے۔ ان میں مدراس کے ستیہ مورتی، کلکتہ کے جتندر لال بنرجی، الہ آباد اور لکھنؤ میں جواہر لال نہرو اور خلیق الزماں اور بمبئی نیز گجرات میں ڈائی (Dye) کے در آمد کار جمنا داس دوار کا داس، صنعت کار عمر سبحانی، دولت مند بیٹے شنکر لال دنکر اور اندر لال یاجنک جیسے لوگ شامل تھے۔ بمبئی شہر میں بیسنٹ کی لیگ کے 2600 ممبر تھے اور شانتارام ہال میں اس کے جلسے میں دس بارہ ہزار لوگوں نے شرکت کی تھی۔ اس علاقے میں زیادہ تر سرکاری ملازم اور فیکٹری کے ورکر آباد تھے۔ گجرات نیز اتر پردیش کے متعدد علاقوں میں پہلی بار سیاسی سرگرمیوں کا آغاز ہوا۔ یہ وہ علاقے تھے جنھوں نے آگے چل کر اہم رول ادا کیا بلکہ گاندھیائی قومی تحریک کے لیے بنیاد ثابت ہوئے۔

اینی بیسنٹ نے 1917 کے اواخر میں اس وقت قلابازی کھائی جب مونٹیگو کے 'ایک ذمہ دار حکومت' کے وعدے نے انھیں آناً فاناً حکومت کا وفادار بنادیا تھا۔ اس دوران تلک بھی Velentile کے خلاف ہتک کے ایک مقدمے میں بہت زیادہ ملوث ہو گئے تھے اور مقدمہ لڑنے کے لیے ستمبر 1918 میں انگلینڈ کے لیے روانہ ہو گئے تھے۔ اس اثنا میں گاندھی ہندوستانی سیاست میں اپنے قدم جمانے کی کوشش کر رہے تھے اور 18-1917 کے دوران چمپارن، کھیڑا اور احمد آباد میں اپنی سرگرمیاں شروع کر چکے تھے۔ بہر حال باہم متعلق آئینی اصلاحات کا سلسلہ شروع ہونے، گاندھیائی فلسفے کا آغاز ہونے اور ہندوستانیوں کی زندگی پر جنگ کے اثرات واضح طور پر مرتب ہونے جیسے امور کا جائزہ لینے سے پہلے 1905 اور 1917 کے دوران کل ہند سیاست کے زیر سطح رونما ہونے والے واقعات کا ذکر مناسب ہے جنھوں نے 1919 کے بعد ہندوستانی سیاست کو نیا رخ دینے میں اہم رول ادا کیا۔ ان میں قبائلی اور زراعتی بے چینی، نچلے طبقات کی فرقہ واریت اور ذات پات کی بنیاد پر تنظیموں اور علاقائیت کی تشکیل وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

نچلے طبقوں کی تحریکیں:1905-1917

قبائلی بغاوتیں

19ویں صدی کی طرح ہی اس عرصے میں بھی قبائلی شورشیں ہند کے متعدد علاقوں میں برابر برپا ہوتی رہیں۔ کڈپا اور نیلور (جنوبی آندھرا) کے نلامالی (Nallamali) پہاڑی علاقوں میں آباد قدیم Chencha قبائل کو یہ لگا تھا کہ حکومت 1898 سے جنگلاتی پیداوار سے متعلق ان کے روایتی حقوق کو مسلسل سلب کرتی آرہی ہے جبکہ حکومت کو یہ خطرہ تھا کہ زیادہ سخت کارروائی کے رد عمل میں نلامالی جنگلات کو آگ لگا کر برباد بھی کیا جاسکتا ہے۔ (حوالہ۔ تھرسٹن اینڈر نگاچاری۔ کاسٹس اینڈ ٹرائبس آف سادرن انڈیا۔ جلد دوم صفحہ 32.35)۔ 1913 میں فاریسٹ کمیٹی کے ذریعے جنگلات کے تحفظ اور مالیہ کی وصولی کے سلسلے میں کیے گئے سخت اقدامات کے رد عمل میں ترک موالات تحریک کے دوران کڈپا میں جنگلاتی ستیہ گرہ کو زبردست تحریک ملی۔ اس کے علاوہ گوداوری ہلز کے Rampa علاقوں میں بھی بے چینی بڑھ رہی تھی اور 1916 میں بغاوت جیسے حالات پیدا ہو گئے تھے جو کہ 24-1922 کے دوران الوری سیتارام راجو کی قیادت میں برپا ہونے والی بڑی بغاوت کا پیش خیمہ تھے۔ اس بڑی بغاوت کا جائزہ اگلے باب میں لیا جائے گا۔ 1910 میں انگریزوں نے جگدل پور میں بستر کے راجا کے خلاف شورش کو کچل دیا تھا۔ اس شورش کی ایک وجہ اگرچہ جانشینی کا تنازعہ بھی تھا۔ مگر اصل سبب وہ نئے جنگلاتی قواعد و ضوابط تھے جن کے ذریعے شفٹنگ (انتقالی) کھیتی اور جنگلاتی پیداوار کے مفت استعمال پر پابندی لگادی گئی تھی۔ شورشیوں نے مواصلاتی نظام میں توڑ پھوڑ کی۔ پولس تھانوں اور محکمہ جنگلات کی چوکیوں کو اپنے حملے کا نشانہ بنایا۔ اسکولوں کو نذر آتش کر دیا (یہ اسکول جبریہ بیگار اور قبائلیوں کے خلاف لگائے گئے جرمانے کے ذریعے تعمیر کرائے جا رہے تھے)۔ باغیوں نے جگدل پور شہر پر قبضہ کرنے کی بھی کوشش کی۔ اڑیسہ میں اکتوبر 1914 میں داس پلا (Daspalla) کی جاگیری ریاست میں کھونڈ بغاوت نے سر ابھارا تھا۔ یہ بغاوت بھی دراصل جانشینی کے تنازعے کا ہی شاخسانہ تھی مگر جلد ہی دوسرا رنگ اختیار کر گئی تھی۔ یہ افواہ بڑی تیزی سے پھیل گئی تھی کہ جنگ چھڑ گئی ہے اور یہ کہ اب "ملک میں ایک بھی صاحب نہیں بچے گا۔ کھونڈ اب خود ہی اپنے حکمراں ہوں گے" انگریزوں کو ایک ایسی کھونڈ شورش کا خدشہ تھا جو پوربی گھاٹ میں کالاہانڈی اور بستر تک پھیلے ہوئے پورے دشوار گزار پہاڑی خطے میں آگ لگا سکتی ہے۔" چنانچہ کھونڈ بستیوں کو بڑے پیمانے پر نذر آتش کیا جانے لگا تھا (ہوم، پولس B، مارچ 1915 صفحہ 153)۔ جنگ کی خبر سے چھوٹا ناگ پور کے منڈا قبائل کے ہی پڑوس میں آباد اراؤں

(Uraun) قبائل میں بھی اسی طرح کے حالات پیدا ہو گئے تھے۔ اس خطے میں جاترا بھگت نے وحدانیت (ایک بھگوان)، گوشت اور شراب نیز قبائلی ناچ گانے وغیرہ سے اجتناب نیز شفٹنگ (انتقالی) کھیتی کے حق میں جو تحریک شروع کر رکھی تھی اس نے جلد ہی مسیحی تصور الفی (Millenarian) رنگ اختیار کر لیا تھا کیونکہ برسا، یا کسی جرمن یا کیسر (قیصر) کی شکل میں کسی نجات دہندہ کے جلد ہی ورود کی افواہ بھی پھیلا دی گئی تھی۔ بہر حال حکومت نے بڑی سرعت کے ساتھ سخت کارروائی کر کے اس شورش کا قلع قمع کر دیا تھا۔ البتہ اوراؤں قبائل میں خاموشی کے ساتھ تانا بھگت تحریک جاری رہی جس نے 1920 کے بعد گاندھیائی قوم پرستی کے ساتھ روابط قائم کر لیے تھے۔ انگریزوں نے مغربی محاذ پر چاکری کے لیے قبائلیوں کو بھرتی کرنے کی کوشش کی جس پر 1917 میں میور بھانج علاقے میں شورش جیسے حالات اور منی پور کے کوکی قبائلیوں میں بغاوت پیدا ہو گئی تھی۔ اس علاقے میں دو سال تک چھاپہ مار جنگ جاری رہی۔ اس چھاپہ مار جنگ کے کچھ دوسرے عوامل بھی تھے۔ مثلاً یو تھانگ قبائل سے بلا اجرت قلی گری کرائی جاتی تھی اور حکومت نے شفٹنگ کھیتی (Jhum) پر پابندی لگادی گئی تھی۔ اس اثناء میں ایک ہزار میل سے بھی زیادہ فاصلے پر واقع جنوبی راجستھان میں میوات سے متصل بانسواڑہ، سونٹھ، اور ڈونگر پور کے بھیل قبائل میں بھی گووند گرو کی قیادت میں اصلاحی تحریک کی وجہ سے ہل چل پیدا ہو چکی تھی۔ یہ تحریک کفایت شعاری اور تزکیہ نفس کے مقصد کو لے کر شروع ہوئی جو 1913 کے اواخر میں بھیل حکومت قائم کرنے کی جدوجہد میں تبدیل ہو گئی تھی۔ Mungadاہل پر چار ہزار بھیل جمع ہو گئے تھے جنھیں منتشر کرنے سے پہلے انگریزوں کو زبردست مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ اس میں 12 قبائلی مارے گئے تھے اور 900 قید کر لیے گئے تھے (ہوم، پولس، بی، دسمبر 1913، این 11-108)۔

کسان تحریکیں

میواڑ کے علاقے نے بھی کئی اہم کسان تحریکیں دیکھیں۔ یہ عجیب اتفاق تھا کہ یہ تحریکیں 1905 میں اس وقت شروع ہوئیں جبکہ سینکڑوں میل دور، بنگال میں آر۔ سی۔ دت، ڈی۔ ایل رائے، ابنندر ناتھ ٹیگور اور رابندر ناتھ جیسے وطن پرست دانشور، عہد وسطی کے چتوڑ کے راناؤں کی شجاعت کو موضوع بنا کر ناول، ڈرامے، کہانیاں اور نظمیں لکھ رہے تھے۔ خاص بات تو یہ ہے کہ ان بہادر راناؤں کی موجودہ نسلیں نہ صرف یہ کہ انگریزوں کی مکمل تابعداری کر رہی تھیں بلکہ اپنے علاقوں کے کسانوں کا بدترین استحصال بھی کر رہی تھیں۔ ایک پرمار راجپوت کی عملداری والی میواڑ کی ایک بڑی جاگیر بجولیا میں کسانوں پر مختلف قسم کے تقریباً 86 محصول عائد تھے۔ 1905 میں اور پھر 1913 میں کسانوں نے زمینوں پر کاشت کرنے سے اجتماعی طور پر انکار کر دیا اور آس پاس

کے علاقوں میں نقل وطن کرنے کی بھی کوشش کی۔ 1913 کی احتجاجی تحریک کی کمان ایک سادھو، سیتارام داس کے ہاتھ میں تھی جبکہ سچین سانیال کے گروپ سے وابستہ ایک سابق انقلابی بھوپ سنگھ عرف وجے سنگھ پاتھک کی موجودگی سے جو کہ اس علاقے میں جلاوطن کر دیے گئے تھے، کسان تحریک میں 1915 میں ایک نیا عنصر شامل ہو گیا تھا۔ پاتھک نے اپنی اس جلاوطنی کی زندگی میں ایک اہم کسان لیڈر کی حیثیت حاصل کر لی تھی اور ریاست کے ایک افسر مانک ورما کو 1916 میں اودے پور کے مہارانا کو محصول ادانہ کرنے کی تحریک کی مشترکہ رہنمائی کے لیے ہموار کر لیا تھا۔ پھر یہ کہ بجولیا کے کسانوں نے جنگی قرضوں میں بھی تعاون کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ جس کے سلسلے میں گاندھی کے ساتھ بھی رابطے قائم ہو گئے تھے جو کہ 1920 کی دہائی میں بھی برقرار رہے تھے۔ بعد میں پاتھک اور ورما دونوں ہی راجستھان کے بڑے کانگریسی رہنما کی حیثیت حاصل کر گئے تھے۔

دو علاقوں، شمال مغربی بہار کے چمپارن، اور گجرات کے کھیڑا میں گاندھیائی قوم پرستی کو جنم دینے میں کسان تحریکوں نے براہ راست اور ٹھوس طریقے پر رول ادا کیا۔ جہاں مقامی نوعیت کے معاملات کو ملک گیر سطح پر اٹھانے کے سلسلے میں گاندھی کی مداخلت ناگزیر ہو گئی تھی، وہیں اس کے بھی وافر شواہد ہیں کہ مہاتما کے ورود سے پہلے بھی ان دونوں علاقوں میں بے چینی اور ناراضگی کی لہر کے ساتھ Jacques Pouchepadass کے الفاظ میں "دیہاتی عوام کی طرف سے اعلا طبقات کے خلاف زبردست دباؤ" بھی تھا۔ چمپارن میں 1860 کی ہی دہائی سے 'تن کٹھیا' نظام کی مزاحمت کا سلسلہ جاری تھا۔ اس نظام کے تحت رام نگر، بیتیا، اور مدھوبن کے بڑے زمینداروں سے پٹے پر زمینیں حاصل کرنے والے یوروپی کاشت کار (Palanters) کسانوں سے جبراً ان زمینوں پر غیر منافع بخش نیل کی کاشت کراتے تھے۔ چونکہ بازار میں مصنوعی رنگوں کے آجانے کے نتیجے میں نیل کی کاشت 1900 سے ہی انحطاط پذیر ہو چکی تھی یورپیوں نے اس نقصان کو بھی کسانوں پر ہی تھوپنے کی کوشش کی اور انھیں نیل کی کاشت سے چھٹکارا دینے کے بدلے میں فاضل لگان (شرح بیشی) یا تاوان (یک مشت معاوضہ) وصول کرنا شروع کر دیا تھا۔ اس کے خلاف 1805-08 میں موتیاہاری، بیتیا علاقے میں بڑے پیمانے پر مزاحمت شروع ہو گئی اور تقریباً 400 مربع میل علاقہ اس کی لپیٹ میں آ گیا۔ تشدد کے واقعات بھی ہوئے۔ ایک فیکٹری کے منیجر Bloomfield کو قتل کر دیا گیا۔ 57 فوجداری مقدمات قائم ہوئے اور 277 سزائیں سنائی گئیں۔ کسانوں کے کسی قدر خوش حال طبقے نے عذرداریوں، مقدمات اور بہار کانگریس کے کچھ لیڈروں اور صحافیوں کے ساتھ رابطوں کے ذریعے اس تحریک کو اگلی دہائی تک جاری رکھا۔ اس سلسلے میں ایک خوش حال کسان اور مہاجن راج کمار شکلا نے 1916 میں کانگریس کے لکھنؤ اجلاس کے موقع

پر گاندھی سے رابطہ قائم کیا تھا۔ کھیڑا میں بھی محصولات کی اجتماعی عدم ادائیگی گاندھی کی آمد سے پہلے ہی ایک عام بات بن چکی تھی۔ کسانوں کا وہ طبقہ جو کہ 19ویں صدی کے اواخر میں منڈیوں میں تمباکو اور دودھ کی مصنوعات کے پھیلاؤ کی وجہ سے کافی متمول ہو چکا تھا اور خود کو کانبی (Kanbi) کی بجائے پٹہ دار کہلانے لگا تھا، 1898 اور 1906 کی درمیانی مدت میں وہ بدترین قحط سالی اور طاعون کا شکار رہا تھا اور سرکاری مال گزاری میں اضافے کی وجہ سے اس کی کمر اور بھی ٹوٹ گئی تھی۔ ضلع سورت کے باردولی میں جو کہ گجرات میں گاندھی کی سرگرمیوں کا دوسرا اہم مرکز تھا، 1908 سے شروع شروع میں ذات پات کے خطوط پر "پٹی دار یووک منڈل" نام کی ایک تنظیم ابھرنا شروع ہو گئی تھی جس کی بنیاد کنور جی مہتہ نے رکھی تھی۔

فرقہ واریت

جیسا کہ سابقہ ابواب میں بھی ذکر کیا جا چکا ہے، نچلے طبقات میں پیدا ہونے والی بے چینی اکثر گروہی یا فرقہ وارانہ اختلافات کی بھی شکل اختیار کر جاتی تھی۔ مثال کے طور پر میمن سنگھ کی جمال پور تحصیل کے کماریا چار علاقے میں ایک پرجا کانفرنس منعقد ہوئی تھی جس نے 1914 میں لگان میں تخفیف، اضافی محصولات کے خاتمے، قرض داری کے سلسلے میں راحت، درخت لگانے اور زمیندار کو نذرانے کی ادائیگی کے بغیر تالاب کھودنے کے حق اور ہندو زمینداروں کی کچہریوں میں مسلم لگان داروں کے ساتھ باعزت سلوک کے لیے مطالبات کا ایک محضر تیار کیا تھا۔ اس کانفرنس کا اہتمام ایک بااثر مسلمان رعیت چودھری خوش محمد سرکار نے کیا تھا۔ ان مطالبات میں بٹائی داروں کی امکانی مشکلات کے بارے میں کچھ نہیں کہا گیا تھا۔ اس کانفرنس میں فضل الحق، اکرم خاں اور ابوالقاسم کے بشمول بنگال کے متعدد مسلم لیڈروں نے شرکت کی تھی۔ یہ دراصل بنگال میں اس پرجا تحریک کا نقطۂ آغاز تھا جس نے 1920 اور 1930 کی دہائیوں کے دوران بنگال کی سیاست میں نمایاں رول ادا کیا۔ اس تحریک نے جہاں ایک طرف بطور خاص متمول کسانوں اور جوت داروں کے مطالبات کی ترجمانی کی وہیں اس نے بالآخر مسلم علاحدگی پسندی کو بھی بڑھایا۔ یہ دوسری بات ہے کہ یہ علاحدگی پسندی ہندو بنگال کانگریس کی غلطیوں اور مجبوریوں کا ہی نتیجہ تھی۔

بہر حال یہ واقعہ ہے کہ اس طرح کی اعلا طبقاتی ہندو یا مسلم فرقہ واریت کے اسباب کا اب تک گہرائی سے جائزہ نہیں لیا گیا ہے۔ اکتوبر 1917 میں بہار میں بڑے پیانے پر پھوٹ پڑنے والے فسادات کے سماجی پہلوؤں کے بارے میں واقفیت ضروری ہے۔ ان فسادات کے دوران پچاس ہزار ہندوؤں کے ہجوم نے شاہ آباد میں 124، گیا میں 28، اور پٹنہ میں دو مسلم گاؤں پر ایک ساتھ بلہ بول دیا تھا۔ اگرچہ ان فسادات کا فوری اور ظاہری سبب گاؤکشی کو بتایا جاتا ہے مگر اس سلسلے میں

اس طرح کی افواہیں بڑے پیمانے پر پھیلائی گئی تھیں کہ "اب انگریزی راج ڈگمگا رہا ہے" فسادی بھیڑ کا ایک نعرہ یہ بھی تھا کہ "انگریزی راج اٹھ گیا" اور 'جرمن کی جے'۔ شاہ آباد کے جو علاقے زیادہ متاثر ہوئے تھے، اتفاق سے وہ وہی تھے جو 1857 میں کنور سنگھ کی سرگرمیوں کا مرکز رہے تھے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اونچی ذاتوں سے تعلق رکھنے والے زمین مالکان نے اپنی اس سرداری کو پھر سے حاصل کر لینے کے لیے بھی ان فسادات کو ہوا دی تھی جو کہ ذات پات کے تناؤ کی وجہ سے ان سے چھن چکی تھی۔ اس میں شک نہیں کہ گاؤ کشی کے سلسلے میں سناتن دھرم سبھا اور آریہ سماجیوں کے پروپیگنڈوں نے بھی ان فسادات کو ہوا دینے میں اہم رول ادا کیا۔ پھر یہ کہ کسانوں کی شروع کی سرگرمیوں کی تغیر پذیر نوعیت کا ایک دلچسپ اشارہ یہ بھی ہے کہ یوپی کے الہ آباد منطقے میں سناتن دھرم کے ایک سرگرم کارکن اور مالویہ کے نائب مناب (Protege)، اندر نراین دویدی ہوم رول سیاست کے ساتھ ساتھ مذہبی خطبات بھی ترتیب دیا کرتے تھے اور ہندی کے حق میں بھی پروپیگنڈا کرتے تھے۔ اس کے ساتھ ہی (1917) کسان سبھاؤں کا بھی آغاز کیا تھا۔ ستمبر 1918 کے کلکتہ کے فسادات میں، جن کا جے۔ ایچ۔ بلوم فیلڈ نے کافی تفصیل سے جائزہ لیا ہے۔ بڑا بازار (Burrah Bazar) کے مارواڑی تاجروں پر ان کے مسلمان پڑوسیوں مچلے کیے تھے۔ یہ مسلمان چند غیر بنگالی مسلمان احتجاج کاروں (حبیب شاہ، فضل الرحمٰن، کلامی وغیرہ) اور علماء کے اتحاد اسلامی (Pan Islamism) کے پروپیگنڈے کے نتیجے میں مشتعل ہو گئے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ ہندو احیاء پسندی اور اتحاد اسلامی تحریک، یعنی دونوں ہی اس طرح نچلے طبقات کے اظہار ناراضگی، فرقہ وارانہ جنون اور سامراج دشمن سیاست کے مرحلے سے گزر رہی تھیں۔

ذات پات

بیسویں صدی کی ابتدائی دہائیوں کی ایک اہم خصوصیت یہ بھی رہی کہ اس عرصے میں ذات پات پر مبنی کانفرنسوں، انجمنوں اور تحریکوں کا جیسے سیلاب سا آگیا تھا۔ اس طرح کی انجمنیں عام طور پر درمیانی طبقے اور زیادہ تر نچلے طبقے کے تعلیم یافتہ مگر ایک چھوٹے گروپ کے ذریعے قائم کی گئی تھیں۔ پیشہ جاتی میدانوں اور سرکاری نوکریوں کے لیے دوڑ میں کافی بعد میں شامل ہونے والوں کو اس طرح براہمنوں اور اونچی ذات کے ان لوگوں کو نشانہ بنانے کا بہانہ مل گیا تھا جو انگریزی تعلیم کی وجہ سے ان میدانوں میں سبقت حاصل کر چکے تھے۔ جہاں کیمبرج مکتب فکر کے مورخین اس گروہی پہلو پر حسب توقع زیادہ زور دیتے ہیں، وہیں سماجیاتی مورخین کا رجحان ذات پات پر مبنی تحریکوں کو دراصل مخصوص جاتیوں (ذاتوں) کے ذریعے سنسکرتیانے کے عمل کے وسیلے سے خود کو اعلا طبقاتی صف میں کھڑا کر لینے کی کوشش کے تناظر میں دیکھنے کا رہا ہے۔ ان مورخین نے تو ان

تحریکوں کو روایت اور جدیدیت کے درمیان کی کڑی کی حیثیت دے کر ان کو سراہا بھی ہے۔ اس سلسلے میں ایک تیسرا زاویہ نگاہ بھی ہے جسے آگے بڑھانے کا سہرا Gail Omvedit کے سر ہے۔ جنھوں نے "مہاراشٹر میں غیر براہمن تحریک" کے تجزیے میں اس کا تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ اس نظریے کے تحت ذات پات کے تناؤ اور تصادموں کو سماجی و معاشی نیز طبقاتی کشیدگیوں کے ایک مسخ شدہ مگر اہم اظہار کے طور پر پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور سنسکرتیانے کے تصور کو بہت ہی محدود بتایا گیا ہے کیونکہ اس سے مہاراشٹر میں ستیہ شودھک سماج یا تامل ناڈو میں عزت نفس (Self Respect) ایجی ٹیشن جیسی چند انقلابی اور ذات پات مخالف تحریکوں کی توجیہ نہیں ہوتی۔

جہاں ذات پات پر مبنی انجمنیں بنگال میں اتنی غیر عام نہیں تھیں (بلکہ 1908 کے بعد قومی تحریک میں انحطاط آجانے کے ساتھ ہی اس طرح کی تنظیمیں نمایاں طور پر نمودار ہونے لگی تھیں) مگر انھیں نسبتاً زیادہ سماجی اور سیاسی اہمیت جنوبی ہند اور مہاراشٹر میں حاصل ہوئی جہاں براہمن غلبہ بہت نمایاں اور ذات پات کا کٹرپن بہت زیادہ تھا۔ مثلاً کیرالہ میں اچھوتوں کے بارے میں یہ خیال تھا کہ ان کی محض نظر پڑ جانے سے بھی اونچی ذات کے لوگ نجس ہو جاتے ہیں۔ Ramnad ضلع کے قصبات میں 19 صدی کے اواخر میں جنوبی تامل ناڈو کے اچھوت ناڈاروں میں تاجروں کا ایک خوش حال گروپ پیدا ہو گیا تھا جس نے اپنی برادری کی تعلیمی اور سماجی بہبود کے لیے فنڈ اکٹھا کیا تھا؛ اپنی برادری کے لیے چھتری کے درجے کا دعوا کیا تھا؛ اونچی ذات والوں کے طور طریق کی نقالی شروع کر دی تھی اور 1910 میں ناڈار مہاجن سنگم، کی تشکیل کی تھی۔ یہاں پر سنسکرتیانے کا ماڈل درست معلوم ہوتا ہے، بشرطیکہ ہم یہ ذہن نشیں رکھیں کہ اس طرح اونچی ذات کا لیبل لگانے کی تگ و دو نے ترونل ویلی میں تاڑی نکالنے کا کام کرنے والی برادری پر بہت خراب اثر مرتب کیا تھا۔ ان لوگوں کو ان کے پرانے نام Shanar سے ہی پکارا جاتا رہا جبکہ اس وقت Ramnad میں ان کے کامیاب بھائی برادر 'ناڈار' جیسا موقر درجہ ہتھیا چکے تھے۔ سیاسی لحاظ سے اس سے بھی زیادہ اہم وہ تحریک انصاف (Justice Movmen) تھی جسے 16-1915 میں مدراس میں سی۔ این مدلیار، ٹی۔ ایم نائر اور پی تھیاگارا جا چیٹی نے درمیانی درجے کی ذاتوں (تامل ناڈو کی Mudalyar اور Vella، تلگو کی کاما یا بلجا نائیڈو، نیز ملایالی نائر) کے لیے شروع کی تھی۔ ان میں متعدد خوش حال زمیندار اور تاجر بھی شامل تھے جو کہ تعلیم، نوکریوں اور سیاست کے میدانوں میں برہمنوں کے غلبے کو حسد کی نظر سے دیکھتے تھے۔ اگرچہ مدراس پریزیڈنسی میں آبادی کے لحاظ سے براہمنوں کا تناسب محض 3.2 فی صد تھا مگر 1912 میں ڈپٹی کلکٹر کی 55 فیصد آسامیوں اور ضلع منصف کی 72.6 فی صد آسامیوں پر براہمنوں کا ہی قبضہ تھا۔ اس کے علاوہ کہیں کہیں اور خاص طور پر تنجاور میں بڑے بڑے زمیندار بھی تھے۔ اونچی ذات والے ایک تو زراعتی کاموں

سے دور رہتے تھے اور دوسری طرف قصبات میں دوسری مختلف پیشہ جاتی سرگرمیوں میں بھی ملوث ہوتے تھے جس کے نتیجے میں براہمن عام طور پر غیر حاضر باش (Absentee) زمیندار ہو گئے تھے۔ اینی بیسنٹ کی براہمنوں کے غلبے والی ہوم رول لیگ ایجی ٹیشن سے کچھ ایسے خدشات سر ابھارنے لگے تھے جن کا مدراس کے انگریز افسروں، صحافیوں اور تاجروں نے پورا فائدہ اٹھایا۔ مدراس میل کے ایڈیٹر T. Earle Welby اور مدراس شہر میں برطانوی تجارتی مفادات کے ترجمان نے ایک ذمہ دار حکومت سے متعلق مونٹیگو کے وعدے پر جارحانہ نکتہ چینی کی تھی (نکتہ چینی کے الفاظ یہ تھے۔

(And England's Voice, no more the Lion's they knew

Becomes the whisper of this wandering Jew , Madras Mail 19. Sept,1917) اور اس طرح جسٹس پارٹی کی آبیاری کی تھی۔ آخرالذکر نے حکومت کے ساتھ وفاداری کا یہ مظاہرہ دراصل زیادہ سرکاری نوکریوں اور قانون ساز اداروں میں نسبتاً زیادہ نمائندگی کی امید میں کیا تھا اور 20 ستمبر 1916 کے غیر براہمن مینو فیسٹو میں "برطانوی حکمرانوں کے اقتدار اور اثر کو کم کرنے کے سلسلے میں کسی بھی تحریک" کی مخالفت کی گئی تھی کیونکہ "صرف یہ برطانوی حکمران ہی ذاتوں اور نسلوں کے درمیان توازن برقرار رکھ سکتے ہیں"۔ اس اتحاد کو اس بات سے بھی تقویت ملی تھی کہ جسٹس پارٹی کے لیڈر اس چیدہ طبقے سے تعلق رکھتے تھے جس کا سارا انحصار زمینداری کی آمدنی پر تھا، مگر غیر براہمن طبقات کی شکایتوں کو ہرگز غیر حقیقی نہیں کہا جا سکتا۔ چنانچہ قوم پرستوں کی حامی مدراس پریزیڈنسی ایسوسی ایشن نے ستمبر 1917 میں اس حقیقت کی نشان دہی کی تھی اور جداگانہ انتخابیہ کا مطالبہ کیا تھا۔ اور 1920 کی دہائی کے اواخر میں تامل ناڈو میں وی۔ وی راماسوامی نائیکر (Naicker) کی قیادت میں ذات پات کے نظام اور براہمنوں کے خلاف ایک عوامی انقلابی تحریک شروع ہو گئی تھی۔

ریاست میسور میں زیادہ تر شہری براہمن برادری (جو کہ کل آبادی کا محض 3.8 فی صد تھی) 1918 میں 65 فی صد گزیٹیڈ آسامیوں پر قابض تھی جبکہ غالب دیہی آبادی وکالیگا اور لنگائت (Langayait) برادریوں پر مشتمل تھی۔ 06-1905 میں ایک تنظیم لنگائت ایجوکیشن فنڈ ایسوسی ایشن کے نام سے اور دوسری تنظیم وکالیگا سنگھ کے نام سے ابھری اور 1917 میں سی۔ آر۔ ریڈی نے، جو کہ مدراس کے ایک غیر براہمن سیاست داں تھے، اور میسور کے مہاراجہ کالج میں مدرس تھے، ریاست میں پہلی سیاسی تنظیم، پرجا مترا منڈل کی بنیاد رکھی جو کہ ایک غیر براہمن پلیٹ فارم تھا۔ ان تنظیموں کو محض شہری پیشہ جاتی حلقوں کی ہی حیثیت حاصل رہی۔ تاہم انھوں نے ذاتی روابط کے سہارے دربار کی سیاست پر اثرانداز ہونے کی کوشش جاری رکھی تھی۔

ٹراونکور کی ریاست میں نام دھاری براہمن (جو کہ کل آبادی کا محض ایک فی صد تھے، اور ہر طرح کے لگان اور محصول سے آزاد بڑی بڑی جیمنی (Jemni) املاک کے مالک تھے) تعلیم اور نوکریوں کی دوڑ سے دور ہی رہے تھے۔ تاہم غیر ملالیالی براہمنوں کو (جو کہ مراٹھی دیستھایا اصلاً تمل تھے) ریاست کے انتظامیہ میں ترجیحی حیثیت حاصل تھی۔ چنانچہ 1891 میں ان غیر ملایالی براہمنوں کو اتنی ہی آسامیاں حاصل تھیں جتنی کہ غالب آبادی والے مقامی نائروں کو حاصل تھیں۔ جبکہ نائروں کی تقریباً پانچ لاکھ کی آبادی کے مقابلے میں ان غیر ملالیالی براہمنوں کی تعداد محض 28,000 تھی۔ ٹراونکور کے حالات کا ایک نمایاں اور غیر معمولی وصف اعلا شرح خواندگی تھی جو کہ Ezhawa نیز دوسری نچلی ذاتوں کے درمیان مشنیری سرگرمیوں کا نتیجہ تھی۔ اس سلسلے میں دیوان مادھو راؤ (72-1860) کے ذریعے اونچی ذت والوں میں تعلیم کے فروغ کی کوششوں کا بھی دخل تھا۔

1901 میں ٹراونکور میں شہری شرح خواندگی 36 فی صد تھی جو کہ کلکتہ سے بھی زیادہ تھی۔ نائروں کو غیر ملالیالی براہمنوں کے ذریعے درکنار کردیئے جانے کا احساس تھا اور اس کے ساتھ ہی انھیں شامی عیسائیوں سے بھی خطرہ تھا۔ ان شامی عیسائیوں میں شمالی ٹراونکور کے متعدد زمیندار اور خوش حال تاجر بھی شامل تھے۔ اور جدید صحافت کے نقیب ثابت ہوئے تھے۔ اس طرح ایزاوا (Ezhawa) برادری میں آگے بڑھنے کا جذبہ پیدا ہوا۔ ان لوگوں کے کچھ داخلی مسائل بھی تھے۔ نائروں کا روایتی اور ناقابل انگیز تاڑوڑ (Tarwad)، یعنی مشترکہ کنبے کی مادری سربراہی کا نظام، نئے حالات سے بہت زیادہ غیر آہنگ ہو چکا تھا۔ اور بیشتر تاروڑوں کے پاس چھوٹے چھوٹے ہی کھیت تھے۔ اس کے علاوہ وہ بڑھتی ہوئی قیمتوں سے بھی بری طرح متاثر تھے۔ مغربی تعلیم کی وجہ سے بھی نائروں کی بہت سی سماجی رسوم اور طور طریقے پریشان کن معلوم ہونے لگے تھے۔ مثال کے طور پر دستور کے تحت نائر عورتوں کو نمبودری وارد ین کے سامنے برہنہ پستان ہو کر جانا پڑتا تھا اور ان کے ساتھ عارضی آشنائی (سمبند ھم) قائم کرنی پڑتی تھی۔

ان تمام باتوں کا بدیہی نتیجہ سماجی اصلاحات کے رجحان، براہمن مخالف جذبات، دیش بھگتی بلکہ کافی حد تک انقلاب پسندی کی شکل میں سامنے آیا۔ چنانچہ کیرالہ کے پہلے جدید ناول 'اندولیکھا' (چندر مینن 1889) میں نمبودریوں کے سماجی غلبے اور رومانوی محبت پر تاروڑ بندشوں کو سخت نشانہ بنایا گیا تھا جبکہ سی۔ وی رمن پلائی کے تاریخی ناول مرتنڈورما (1891) میں اس کے ہیرو آنند پدمانا بھن کے کردار کے ذریعے نائروں کی گم شدہ فوجی عظمت کی بازیافت کی کوشش کی گئی تھی۔ رمن پلائی 1891 سے اس ملایالی میموریل کے سرکردہ آرگنائزر تھے جس میں ریاست کے اندر نوکریوں میں براہمنوں کے غلبے کو نشانہ بنایا گیا تھا۔ اس میموریل کے پس پشت نائر بھی تھے حالانکہ اس

میموریل پر دستخط کرنے والوں میں چند عیسائی اور Ezhawa ذات کے لوگ بھی شامل تھے۔ جہاں رمن کے گروپ کو 1890 کی دہائی کے اواخر میں اعلا سرکاری نوکریوں میں آسانی سے شامل کر لیا گیا مگر ابتدائی طور پر کوئی سرگرم نائر بغاوت راما کرشنا پلائی اور منتھ پدمانابھا پلائی کے جھنڈ کے تلے 1900 میں ہی ابھر سکی تھی۔ آخرالذکر نے اپنی ذات کے لوگوں کے مفادات کو آگے بڑھانے اور چند سماجی اصلاحات کے مقصد سے 1916 میں نائر سروس سوسائٹی قائم کی جو اب بھی موجود ہے۔ دربار کے خلاف حملے اور سیاسی حقوق کے مطالبے کے رد عمل میں جب راما کرشنا پلائی کو ٹراونکور بدر کر دیا گیا تھا تو اول الذکر نے 1906 سے 1910 تک سودیشی بھی مانم کی ادارت کی۔ راما کرشنا پلائی نے تھوڑا بہت رابطہ ٹی ایم نائر کی تحریک انصاف سے بھی قائم کیا ہوا تھا۔ مگر 1916 میں انتقال سے دو سال قبل انھوں نے ملایالم زبان میں کارل مارکس کی پہلی سوانح عمری بھی شائع کی تھی۔

اس طرح کی متنوع سرگرمیاں صرف نائروں تک ہی محدود نہیں رہی تھیں۔ تاڑی نکالنے کا کام کرنے والی نچلی ذات کی Ezhawa برادری میں بھی بیداری پیدا ہو رہی تھی بلکہ ناریل کی مصنوعات کی منڈیوں میں وسعت آنے کے ساتھ ساتھ وہ اپنے علاقے کو خوش حالی کی طرف بڑھا رہے تھے۔ مذہبی رہنما نارائن گرو (1928-1855) اور ان کا اروی پورم (Arvipuram) کا مندر اس بیداری کا مرکز تھے۔ 03-1902 میں شری نارائن گرو، پہلے Ezhawa گریجویٹ ڈاکٹر پالپو (Palpu) اور عظیم ملایالی شاعر این۔ کمارن نے "شری نارائنا دھرما پری پالن یوگم" کی بنیاد رکھی تھی۔ اس یوگم نے جنوری 1905 میں کیولون (Quilon) میں ایک کامیاب صنعتی نمائش کا اہتمام کیا تھا جس کے بعد نائر ایزہاوا فسادات کا ایک طویل سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ ٹی۔ کے۔ مادھون کی قیادت میں اس یوگم نے آگے چل کر 1920 کی دہائی میں گاندھیائی تحریک کے ساتھ اہم رابطے قائم کیے تھے، جبکہ ایزدھاوا کی دوسری نسل کمیونسٹ طور پر کمیونسٹ خیمے میں چلی گئی تھی۔ اگر دیکھا جائے تو سماجی اصلاح کی جو تحریک ذات پر مبنی انجمنوں کے ذریعے شروع ہوئی تھی، اس کا بتدریج انقلاب پسندی کی شکل اختیار کر جانا کیرالہ کی زندگی کی ایک مستقل خصوصیت ہے۔ ای۔ ایم۔ ایس نمبودری پاد نے بھی 1920 کی دہائی میں اپنی سیاسی زندگی کا آغاز نمبودری ویلفیر ایسوسی ایشن کے ایک کارکن کے طور پر کیا تھا۔

بہر حال ذات پات سے متعلق تحریکوں میں سب سے دلچسپ مہاراشٹر کی ستیہ شودھک سماج تحریک تھی۔ Gail Omvedt کی تحقیق کے مطابق اس تحریک کے دو ممتاز سلسلے تھے۔ پہلا رجحان، جو کہ مدراس کی تحریک انصاف سے کافی مماثل تھا، کولہاپور کے حکمراں ساہو (جس کی خود اپنے براہمن درباریوں کے ساتھ چلتی رہتی تھی) کا سرپرستی میں تھا۔ اس کی ساری توجہ ایک

چھوٹے۔ ، نتیجے کے لیے زیادہ سے زیادہ نوکریاں اور سیاسی مراعات حاصل کرنے پر ہی مرکوز رہتی تھیں۔ بہر حال ایک دوسرا اور نسبتاً زیادہ عوامی اور انقلابی رجحان بھی تھا جو سیٹھ صاحبان اور بھٹ صاحبان (براہمن پجاریوں، بلکہ کافی حد تک تاجروں اور دوسرے متمول لوگوں) کے مقابلے پر بہوجن سماج کی دہائی دیتا تھا۔ مکند راؤ پاٹل جیسے لیڈروں کی قیادت میں 'سماج' کو مہاراشٹر دکن اور دودربھ، ناگ پور کے دیہی علاقوں میں ٹھوس حمایت حاصل ہو گئی تھی۔ مکند راؤ پاٹل اپنے آبائی گاؤں (Taravdi) سے 1910 سے ہی سب سے اہم ستیہ شودھک اخبار 'دین مترا' نکالتے آرہے تھے۔ اس 'سماج' کی عوامی بنیاد کی نشان دہی اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ عملی طور پر ستیہ شودھک سماج کا سارا لٹریچر انگریزی کی بجائے صرف مراٹھی میں ہے۔ 1919 کی سالانہ کانفرنس میں سماج کو چودہ اضلاع میں پھیلی ہوئی 49 شاخوں سے رپورٹیں موصول ہوئی تھیں اور اس طرح کی کم سے کم 30 شاخیں ایسے گاؤں میں تھیں جن کی آبادی 2000 سے کم تھی۔ اس سطح پر سب سے غالب بات یہ تھی کہ ذات پات پر مبنی سماجی نظام اور ظلم وزیادتی کو مسترد کیا جارہا تھا نہ کہ موجودہ ڈھانچے کے اندر اندر سنسکرتیانے کے مطالبے کو! بلاشبہ اس کی سماجی بنیاد متمول کسانوں پر مشتمل تھی مگر اس زمانے کی ایک حقیقت یہ بھی تھی کہ زیادہ تر اونچی ذات کے مہاجنوں اور زمینداروں کے مقابلے میں پورے کسان طبقے کے کچھ مخصوص مشترک مفادات بھی تھے۔ ستیہ شودھک پیغام کو دیہی علاقوں تک روایتی لوک ڈرامے (تماشا) کے ذریعے پہونچایا گیا۔ یہ وہ طریقہ کار تھا جسے بعد میں 1940 کی دہائی میں انڈین پیوپلز تھیٹر کے وسیلے سے کمیونسٹوں نے بھی اپنایا تھا۔ ستارا، میں جہاں اس طرح کے تماشا گروپ زیادہ سرگرم تھے، مقامی ستیہ شودھک لیڈروں کی قیادت میں 1919 میں کسان شورش بھڑک اٹھی تھی۔

علاقائی جذبات اور زبانیں

اس زمانے کی ایک حتمی اور اہم خصوصیت یہ بھی تھی کہ لسانی خطوط پر علاقائی جذبات بھی فروغ پارہے تھے۔ اگرچہ بیشتر حالات میں اس طرح کے احساسات تعلیم یافتہ مگر نسبتاً کمزور طبقوں کے نوجوانوں کے لیے زیادہ سے زیادہ ملازمتوں کے مطالبے سے جڑے ہوئے تھے، مگر ان کی جڑیں اکثر بہت زیادہ گہرائی تک پہونچی ہوئی تھیں جس کے نتیجے میں مختلف علاقائی زبانوں میں طاقت ور ادبی اور مقامی رجحانات کا پیدا ہونا لازمی تھا۔

مدراس کے آندھرا اضلاع میں تقریباً 1911 سے ایک علاحدہ صوبے کے لیے تحریک شروع ہو چکی تھی۔ گنٹور سے شائع ہونے والے دیشابھیمانی جیسے اخباروں نے تو نوکریوں میں تلگو آبادی کی بہت کم نمائندگی کے خلاف آواز بلند کرنا شروع کر دیا تھا، جس نے اس تحریک کے لیے جلتی پر تیل کا کام کیا تھا۔ اس کے علاوہ آندھر دلاچر ترامو، جیسی تخلیقات سے بھی ترغیب ملی تھی۔

سالانہ آندھرا کانفرنسیں (جنھیں بعد میں آندھرا مہا سبھا کہا جانے لگا تھا) 1913 سے بدستور جاری تھیں۔ ان کانفرنسوں کی قراردادوں میں مادری زبان کو ذریعہ تعلیم بنانے کا مطالبہ بھی شامل ہوتا تھا۔ اسے زیادہ تر تائید کرشنا۔ گوداوری ڈیلٹا کے علاقے میں حاصل ہوئی۔ جہاں خوش حال شہری عناصر کے متوسط درجے کے بڑے کسان طبقات کے ساتھ بھی قریبی روابط تھے، جس کے نتیجے میں سیاسی ایجی ٹیشن کے لیے نسبتاً زیادہ وسیع بنیاد فراہم ہو گئی تھی۔ کونڈا ونکٹ سپیا اور پٹا ابھی سیتا رمیا جیسے قوم پرست لیڈر آندھرا تحریک کے سلسلے میں سرگرم تھے اور 1918 میں کانگریس نے اپنی تنظیم کے اندر ایک علاحدہ آندھرا سرکل کے مطالبے کو تسلیم کر لیا تھا۔

اگرچہ لسانی ریاست کا مطالبہ واضح طور پر صرف آندھرا میں ہی کیا گیا تھا مگر متعدد علاقوں میں علاقائی زبانوں کی ترقی کے نتیجے میں کہیں کہیں باہم متضاد سیاسی رجحانات کو بھی تقویت ملی۔ جیسا کہ ہم پہلے ہی دیکھ چکے ہیں ملایالم درحقیقت سماجی اصلاح اور قوم پرستی کا ایک طاقت ور وسیلہ بن چکی تھی۔ ایزہاوا شاعر کمارن آسن نے 1908 میں لکھا تھا "اے مادرِ وطن! تیری غلامی تیرے مقدر میں تھی۔ تیسرے سپوت ذات پات۔ آپسی جھگڑے میں اندھے ہو چکے ہیں! ایک دوسرے کے ہاتھوں مارے جا رہے ہیں! پھر یہ آزادی کس لیے!" اور 1920 کی دہائی میں ولاتھول (Vallathol) کی شاعری کیرالہ میں گاندھیائی افکار کی تبلیغ کا ایک کارگر وسیلہ بن گئی تھی۔ تامل ناڈو میں براہمن مخالف تحریک دراصل مدورا، مدراس اور دوسرے شہروں میں قائم ہونے والے تمل سنگموں سے جڑی ہوئی تھی۔ ان تحریکوں نے تامل کے کلاسیکی ادب میں دلچسپی پیدا کی بلکہ جنوب کے ماقبل سنسکرت اور غیر آریائی دراوڑ ورثے پر زور دینا شروع کر دیا تھا۔ رامائن سے بالکل برعکس طریقے پر رام کے مقابلے میں راون کی تعظیم اور توقیر کا کام لیا گیا۔ یہ بات بھی دلچسپی سے خالی نہیں کہ مہاراشٹر میں بھی ستیہ شودھک پروپگنڈے میں بعض اوقات ایسے گیت بھی شامل ہوتے تھے جن میں رام کے ہاتھوں ایک اچھوت لڑکے شمبوک کے قتل پر ماتم کیا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ ایک قدیم مراٹھا کسان مسلک کو پھر سے زندہ کیا جا رہا تھا۔ یہ بالی راج مسلک تھا۔ یہ وہی بالی ہے جسے رام اور سگریو نے مار ڈالا تھا۔ پھولے کے بعد، جنھوں نے 1869 میں شیواجی کی شان میں لکھے گئے اپنے قصیدے میں شیواجی کو ایک شودر مہاراجہ بتایا تھا۔ دوسرے غیر براہمنوں نے بھی شیواجی کا ایک ایسا تصور پیش کرنے کی کوشش کی تھی جو کہ تلک اور راناڈے کے تصور سے قطعی مختلف تھا۔ اس تصور کے مطابق وہ نہ تو ایک ایسے قدامت پرست اور مسلم دشمن ہیرو تھے جسے گائے اور براہمنوں کے تحفظ کے لیے رام داس سے کوئی ترغیب ملی تھی اور نہ ہی وہ بھگتی کے ذریعے نچلی اور اونچی ذات والوں کو متحد کرنے والے روشن خیال شخص تھے بلکہ وہ محض ذات پات کے استبداد کے باغی تھے جن کی خدمات کو بعد کے براہمن پیشواؤں نے ملیامیٹ کر دیا تھا۔

بنگال میں علاقائی احساسات کی داغ بیل واضح طور پر 1905 میں ہی پڑ گئی تھی اور سی۔ آر۔ داس نے اپنے 1917 کے بھگوان پور خطبے میں اس تار کو چھیڑنے کی کوشش کی تھی۔ ان کے الفاظ میں "ایک بنگالی ہندو، مسلمان یا عیسائی ہو سکتا ہے مگر وہ ہر حال میں بنگالی ہی رہے گا۔" تعلیم یافتہ بنگالی کی ثقافتی دنیا پر ٹیگور، خاص طور پر 1913 میں نوبل انعام پانے کے بعد، اس طرح چھائے رہے جس کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ یہ دوسری بات ہے کہ انھوں نے ادب کے ایک عامیانہ اسلوب کا اختراع کیا جس کے لیے سانج پتر ادبی گروپ نے 1915 میں نقیب کا کام کیا۔ بہر حال رابندر سیاسی اعتبار سے 1908 کے بعد کنارہ کش ہو گئے تھے۔ انھوں نے قوم پرستی کو ایک محدود اور احیاء پسندانہ نظریہ سمجھتے ہوئے اس سے اپنا تعلق منقطع کر لیا تھا اور ایک عالم گیر انسان دوستی کی تبلیغ کرنے لگے تھے۔ سی۔ آر۔ داس جیسے ان کے نکتہ چینیوں کے نزدیک یہ ایک قطعی غیر حقیقت پسندانہ بات تھی۔

تعلیم یافتہ بنگالی، جو کہ ملازمتوں اور دیگر پیشوں میں کافی سبقت حاصل کر چکا تھا، اپنے پڑوسیوں میں بہت زیادہ ناپسندیدہ ہو گیا تھا۔ سچیدانند سنہا کی قیادت میں ایک یونیورسٹی اور علاحدہ ہائی کورٹ کے ساتھ بہار کو ایک علاحدہ صوبے کی حیثیت دینے کے لیے کائستھ پیشہ ور گروپوں نے بہار ایجی ٹیشن چلایا اور حکومت نے 1911 میں اڑیسہ و بہار کے نام سے ایک الگ صوبے کی تشکیل کر دی۔ باقی شمالی ہند کے بیشتر حصوں میں اپنی شاندار ادبی روایات کے ساتھ، جن کی شاندار ترجمانی محمد اقبال جیسے عظیم شاعر کے عہد میں ہوئی، اردو پورے خطے کی پہلی ادبی زبان کی حیثیت میں اپنا سکہ قائم کیے ہوئے تھی۔ بہر حال اردو کے مقابلے میں ہندی کے لیے ہندو احیاء پسندوں کا دباؤ برابر بڑھتا جا رہا تھا جو کہ فرقہ وارانہ اتحاد کے لیے سم قاتل ثابت ہوا۔ چنانچہ جن پریم چند نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز اردو سے کیا تھا۔ بالآخر 1915 کے بعد وہ بھی ہندی کی طرف پلٹ گئے تھے؛ کیونکہ انھیں اپنی اردو تخلیقات کو چھپوانے میں مشکل پیش آنے لگی تھی۔ ان کی ابتدائی تحریروں میں سیاسی عنصر کی صاف جھلک تھی۔ ان کی کہانیوں کے ایک مجموعے سوز وطن (1908) کے پیش لفظ میں کہا گیا تھا کہ 'تقسیم بنگال نے لوگوں کے دلوں میں بغاوت کے جذبات بیدار کر دیے ہیں" ان کے ایک ناول جلوہ ایثار (1912) کے ہیرو کو ویکانند کے کردار کی چھاپ میں پیش کیا گیا ہے۔

اس طرح ہندوستانی سماج، اور سیاست، دونوں ہی پیچیدگیوں اور تضادات سے پر تھے۔ 1919 کے بعد کل ہند پیمانے پر قومی تحریک گاندھی کی قیادت میں شروع ہوئی جو قدم قدم پر اتار چڑھاؤ سے گزرتی رہی۔

باب پانچ

عوامی قوم پرستی: ظہور اور مسائل 1927-1917

جنگ، اصلاحات اور سماج

مونٹفورڈ اصلاحات (Montford Reforms)

جنگ کے دوران، نیز جنگ کے فوراً بعد کے برسوں میں ہندوستان کی زندگی میں تین ڈرامائی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ سنگ میل کی حیثیت رکھنے والی یہ تینوں تبدیلیاں، یعنی آئینی اصلاحات (سکریٹری آف اسٹیٹ مونٹیگو کا 20 اگست 1917 کا اعلان، اس کے بعد 1918 کی مونٹیگو چیمسفورڈ رپورٹ اور 1919 کا گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ)، ایک کل ہند قوم پرستی کی عوامی تحریک کے ایک نئے لیڈر کی حیثیت میں گاندھی کا ظہور اور ہندوستان کی نوآبادیاتی معیشت میں اہم اتھل پتھل۔ اس دور سے تعلق رکھتی ہیں۔ تاہم اس سلسلے میں اہم اصلاحات بھی سامنے آئیں۔

لبرل۔ سامراجی مورخین مونٹیگو اصلاحات کو انگریزوں کے صالح ارادوں کے ثبوت کے طور پر پیش کرتے ہوئے ان پر اپنا سر دھنتے رہے۔ 20 اگست کو دارالعوام میں مونٹیگو کا یہ اعلان کہ اب ہندوستان کے سلسلے میں برطانیہ کی پالیسی "سیلف گورنمنٹ کے اداروں کی بتدریج ترقی" کے مقصد کے تابع رہے گی تاکہ ہندوستان میں مملکت برطانیہ کے ایک اٹوٹ حصے کے طور پر ایک ذمہ دار حکومت تشکیل دی جا سکے"، برطانیہ کے اب تک کے اس موقف سے یقیناً بالکل ہٹ کر تھا جس کے مطابق ہندوستان میں (منتخبہ قانون سازوں بلکہ منتخبہ اکثریتوں پر مبنی مگر عاملہ پر کسی طرح کے کنٹرول کے بغیر) ایک "نمائندہ" حکومت کے فروغ پر زور دیا جا رہا تھا۔ ترقی پذیر طریقے پر "ایک ذمہ دار حکومت کی تشکیل" کے مسئلے کو 1919 میں "صوبائی خود مختاری" کے ذریعے حل کرنے کی کوشش کی گئی جس کے تحت صوبائی حکومتوں کے بعض اہم معاملات (تعلیم، صحت، زراعت اور مقامی منتخبہ ادارے وغیرہ) تو قانون ساز اسمبلیوں کو جواب دہ وزراء کو منتقل کر دیئے گئے جبکہ دوسرے امور کو "محفوظ" کے ضمن میں رکھا گیا۔ مارلے منٹو اصلاحات کی طرح ہی ان اصلاحات کے سلسلے میں بھی حکومت برطانیہ، ہندوستانی حکومت، سکریٹری آف اسٹیٹ اور وائسرائے کے رول کے بارے میں بھی اختلاف رائے رہا۔ بحیثیت مجموعی مونٹیگو کو اخبارات کی طرف سے زیادہ بہتر تائید حاصل رہی جس کی وجہ اس کی اپنی "انڈین ڈائری" (1930) ہے جس میں اس نے خود کو اصلاحات کا نقیب بتایا ہے۔

اصلاحی عمل کا باریکی سے جائزہ لینے پر پتہ چلتا ہے کہ اس میں نہ تو اتنی جدت ہی تھی اور نہ ہی وہ زیادہ دوررس نتائج کا ہی حامل تھا کیونکہ مالیاتی مقاصد کے تحت "اختیار میں تخفیف" یا مقامی نوعیت کے اخراجات کو مقامی طور پر حاصل ہونے والے مالیہ سے پورا کرنے کا طریقہ کار مایو (Mayo) اور رپن (Ripon) کے زمانے سے ہی اختیار کی جارہا تھا اور سارے معاملات کا جائزہ لینے کی غرض سے 1907 میں ایک کمیشن بھی قائم کیا گیا تھا۔ ہارڈنگ کے 25 اگست 1911 کے مکتوب میں یہ بات کھل کر کہی گئی تھی کہ اگلی سیاسی مراعات صوبوں کو کسی قدر اندرونی خود مختاری اور سیلف گورنمنٹ کی شکل میں ہونی چاہیں کیونکہ ایسا کرنے سے مرکز میں برطانیہ کا اقتدار اور مضبوط ہو جائے گا۔ اگرچہ سکریٹری آف اسٹیٹ Crewe نے اس وقت ہندوستان میں سیلف گورنمنٹ سے متعلق تجویز کو یک لخت مسترد کر دیا تھا، مگر جنگ کے دباؤ اور دوسری کمزوریوں کی وجہ سے انگریز اس معاملے پر از سر نو غور کرنے کے لیے مجبور ہو گئے تھے۔ چیمسفورڈ کی حکومت نے بعض ایسی مراعات کا سلسلہ شروع کیا جنھیں بعد میں مونٹیگو نے 'Lubricant' (سہل کار) کا نام دیا تھا۔ جنگی اخراجات کا دباؤ کپاس کے درآمدی محصول میں اضافے کا تقاضہ کر رہا تھا اور ہندوستانی کپڑوں پر تلافی محصول میں اضافہ کیے بغیر کپاس کا درآمدی محصول مارچ 1917 میں 3.5 فی صد سے بڑھا کر 7.5 فی صد کر دیا گیا تھا۔ ہندوستانی رائے عامہ قرار ناموں کے تحت ہندوستانی مزدور کو بیرون ملک لے جانے کی شروع سے ہی مخالفت کرتی آرہی تھی۔ اور آرمی بھی فوج میں بھرتی بڑھانے کے لیے مزدوروں کے ترک وطن پر پابندی چاہتی تھی۔ چمسفورڈ نے اس مطالبے کو 1917 میں بڑی آسانی سے منظور کر لیا۔ سکریٹری آف اسٹیٹ آسٹن چیمبرلن کے تمام پس و پیش کے باوجود وائسرائے نے س سلسلے میں باقاعدہ بیان کے ذریعے اغراض و مقاصد کی وضاحت کرنے کی درخواست کی۔ 18 مئی 1917 کے ٹیلی گرام میں نہ صرف ہوم رول ایجی ٹیشن کا حوالہ دلچسپ انداز میں دیا گیا تھا جو کہ ان دنوں اپنے عروج پر تھا، بلکہ مارچ 1917 میں روس میں زار شاہی کے خاتمے سے ہندوستان پر مرتب ہونے والے ممکنہ اثرات پر بھی روشنی ڈالی گئی تھی۔ جولائی 1917 میں چیمبرلن کی جگہ مونٹیگو کے تقرر سے پہلے سے جاری پیش رفت کو اور بھی تحریک ملی۔

مخصوص نوعیت کی اصلاحات کی سطح پر حکومت ہند کے مکتوب میں صوبائی اسمبلیوں میں منتخبہ اکثریتوں کی بات تو کہی گئی تھی مگر عملی ذمہ داری کا کوئی ذکر نہیں کیا گیا تھا۔ بہر حال یہ احساس برابر بڑھتا جارہا تھا کہ مارلے۔ منٹو کے نشان زد خطوط پر اس طرح کی تبدیلی کونسلوں میں ایک مستقل نوعیت کی مضبوط اپوزیشن (حزب اختلاف) کی تشکیل کا باعث تو ہوگی مگر ہندوستانی شرکا، کی تعداد میں اضافہ بھی نہیں ہوگا۔ اس سلسلے میں لندن سے شائع ہونے والے

ایک جریدے "Round Table" کے ایک بااثر حلقے (لیونل کرٹس، فلپ کیئر، ولیم ڈیوک وغیرہ) نے اہم رول ادا کیا۔ اس حلقے کا خیال تھا کہ منتخبہ غیر سرکاری ممبروں کو کوئی عملی ذمہ داری تفویض کیے بغیر زیادہ اختیارات دینے کا نتیجہ تباہ کن ثابت ہو گا۔ اس حلقے نے اس مسئلے کا حل صوبوں کے لیے دوہرے نظام حکومت کی شکل میں پیش کیا تھا۔

گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ 1919 کی رو سے مرکز میں بھی دوایوانی (کونسل آف اسٹیٹ اور قانون ساز اسمبلی) نظام شروع کیا گیا، اس طرح کہ وزراء پر کسی طرح کے کنٹرول کے بغیر منتخبہ ممبروں کی اکثریت رکھی گئی، وائسرائے کو اختیار تنسیخ دیا گیا اور ایوان کے ذریعے مسترد شدہ بلوں کو تصدیق نامہ کا طریقہ کار کے ذریعے پاس کرنے کا طریقہ اپنایا گیا۔ اس کے علاوہ صوبائی کونسل کے انتخابیہ کا دائرہ بڑھا کر 55 لاکھ اور امپیریل کاؤنسل کے لیے 15 لاکھ کر دیا گیا۔ دوہرے نظام حکومت کے تحت سیاسی اعتبار سے نسبتاً کم اہم محکمے ان وزراء کو دیے گئے جو صوبائی اسمبلی کو جواب دہ تھے۔ اس کے لیے ہندوستانی سیاست دانوں کی لائن لگ گئی جب کہ اس طرح ان کی ساکھ خراب بھی ہو سکتی تھی کیونکہ تعلیم، صحت، زراعت اور مقامی جمہوری اداروں کی حالت سدھارنے کے لیے اس سے کہیں زیادہ فنڈ درکار تھا جو کہ انگریز فراہم کر سکتے تھے۔ امن و قانون اور مالیات جیسے اہم محکمے افسران کے ہی کنٹرول میں رکھے گئے۔ صوبوں میں گورنروں کو بھی تصدیق نامہ جاری کر کے بل کو پاس کر دینے اور کسی بھی فیصلے کو مسترد کر دینے کا اختیار دیدیا گیا۔ مالیاتی وسائل کو مرکز اور صوبوں کے درمیان تقسیم کر دیا گیا، اس طرح کہ مال گزاری (لگان) صوبوں کو دیدی گئی جبکہ مرکز نے انکم ٹیکس اپنے پاس رکھا۔ مونٹیگو۔ چیمسفورڈ رپورٹ میں مذکور جداگانہ انتخابیہ کی تجویز پر کسی قدر نظریاتی تنقید کی گئی لیکن فرقہ وارانہ بنیاد پر نمائندگی اور تحفظ کی پالیسی کو نہ صرف قائم رکھا گیا، بلکہ ان میں مزید توسیع کی گئی۔ برطانیہ نے مدراس میں غیر براہمنوں کے لیے تحفظ سے متعلق جسٹس پارٹی کے مطالبے کو تسلیم کر لیا تھا۔

کیمبرج مکتب فکر کے مورخین کی حالیہ تاریخ نویسی سے 1919 کی اصلاحات کے اس کم روشن پہلو پر قابل لحاظ طریقے پر روشنی پڑتی ہے ور ان اصلاحات کو دراصل مالیاتی اختیارات میں تخفیف نیز ہندوستانی معاونینکے حلقے میں توسیع کی ضرورت کا نتیجہ بتایا گیا ہے۔ بہر حال ان دونوں اقدامات کے ربط باہم کی نوعیت کے سلسلے میں کافی اختلاف رائے ہے۔ بیشتر لوگوں کی یہ رائے ہے کہ یہ اصلاحات کافی حد تک اس بات کا بھی نتیجہ تھیں کہ ملک میں سیاست کو بڑے پیمانے پر عوامی بنیاد حاصل ہوتی جارہی تھی۔ 1919 کے ایکٹ کے نتیجے میں انتخابیہ کا حلقہ کافی وسیع ہو گیا تھا اور اس کے نتیجے میں سیاست داں اور زیادہ جمہوری طریقہ کار اختیار کرنے پر مجبور ہو گئے تھے۔ اس سلسلے میں کیمبرج مکتب فکر کی یہ تاویل غلط نہیں ہے مگر انتہائی حد تک ۔ س ضرور ہے۔ اس

سے مخصوص قسم کی سیاست اور سیاست دانوں کی توجیہ تو کی جاسکتی ہے مگر جنگ کے بعد عوام میں پیدا ہونے والی بیداری کی وضاحت نہیں ہوتی۔ مدراس میں جسٹس پارٹی یا مہاراشٹر میں غیر براہمن (اور کچھ بعد) مظلوم طبقات کی تحریکیں بلاشبہ خصوصی تحفظات کے امکان یا صلاحیت کا نتیجہ تھیں، یہاں تک کہ قوم پرست لیڈروں میں بھی مالویہ کے دست راست اندر نرائن دویدی نے الہ آباد ہوم رول لیگ کے فنڈ سے فروری 1918 میں یوپی کسان سبھا شروع کی تھی۔ یہ کسان سبھا خالصتاً انتخابی مقاصد کے تحت شروع کی گئی تھی اور کسانوں کے درمیان جواہر لال نہرو کی بڑھتی ہوئی آمدورفت کا ان کے والد نے جون 1920 میں خیر مقدم کیا تھا، کیونکہ اس طرح ان کی انتخابی کامیابی کے امکانات اور بھی بہتر ہو سکتے تھے۔ مگر یوپی سے ہی ہمیں اس کے قطعی برعکس مثال بھی 1920 میں بابا رام چندر کی قیادت میں پرتاب گڑھ اور رائے بریلی میں شروع شروع میں ایک بالکل خود مختار قسم کی ایسی کسان سبھا کے ظہور کی شکل میں ملتی ہے جس کی بنیاد عوام میں تھی۔ ہندوستانی سیاست دانوں کے سب سے اہم حلقے نے گاندھی کی قیادت میں کچھ عرصے کے لیے انتخابات کا بائیکاٹ کیا اور 22-1919 کے دوران عوامی وبال اتنا اہم واقعہ ہے جس کی توجیہ محض ایک تا تین فیصد بالغ آبادی کے رائے دہی حقوق میں توسیع کی شکل میں نہیں کی جاسکتی!

جنگ کے اثرات

بہرحال اس سے بھی کہیں اہم پہلی جنگ کے معاشی و سماجی اثرات تھے جن کے نتیجے میں ہندوستان اور برطانیہ کے آپسی مفادات کے تضادات نہ صرف کھل کر سامنے آگئے تھے بلکہ ان میں شدت بھی آگئی تھی۔ یہ تضادات، جن کا ذکر سابقہ باب میں کیا جاچکا ہے، دولت کے بہاؤ، دیسی دست کاریوں کے زوال، مالیہ پر دباؤ اور دیسی سرمایہ جاتی نشوونما سے عبارت تھے۔ زیادہ واضح لفظوں میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ بڑے پیمانے پر بھرتی، بھاری ٹیکس، جنگی قرضہ جات اور قیمتوں میں بھاری اضافے کی شکل میں جنگ نے ہندوستانیوں کی زندگی کو بری طرح متاثر کیا تھا۔ اس طرح یہ جنگ قومی تحریک کے پھیلاؤ کا بھی باعث ہوئی۔ یعنی اب اس کے ساتھ کسان طبقوں کے ساتھ ساتھ کاروباری طبقہ بھی جڑتا جارہا تھا۔ یہ حقیقت گاندھی کی قیادت ابھرنے کے بعد تو پوری طرح واضح ہو گئی۔ بااثر کسان طبقوں اور کاروباری طبقوں کے ساتھ ساتھ، مزدور طبقے بھی جنگ کے فوراً بعد قومی تحریک کی دھارا میں شامل ہو گئے۔ یہ بات بار بار مشاہدے میں آئی کہ شکایتوں میں اضافہ ہوتا جارہا تھا۔ یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ جنگ نے ہندوستانی معاشرے کے مختلف حصوں کو مختلف ڈھنگ سے متاثر کیا۔ اس کے علاوہ جنگ کے مضمرات ہندوستانی معاشرے میں مختلف نوعیت کی کشیدگیوں میں اضافے کے بھی باعث ہوئے۔

جنگ کے دوران دولت کا بہاؤ، ہندوستان کے مادی اور انسانی وسائل کی لوٹ مار کی شکل اختیار کر گیا تھا۔ ہندوستانی آرمی کی نفری بڑھا کر 12 لاکھ کر دی گئی تھی اور ہزاروں ہندوستانیوں کو دور دراز کے قطعی اجنبی اور ہلاکت خیز خطوں میں ایسی مہموں میں جان گنوانے کے لیے بھیجا جا رہا تھا جو انتشار کا شکار ہو چکی تھیں (مغربی محاذ اور میسوپوٹامیہ میں جارحانہ کارروائیاں یا 1916 کا زبردست اسکینڈل اس انتشار کی مثالیں ہیں۔ اس اسکینڈل نے آسٹن چیمبرلن کو مستعفی ہونے پر مجبور کر دیا تھا)۔ کہنے کو تو یہ فوج بھرتی "رضاکارانہ" ہوتی تھی مگر عملاً "جبریہ" شکل اختیار کر جاتی تھی، خاص طور پر لفٹننٹ گورنر میکائل ڈائر کے دور میں تو پنجاب میں ساری بھرتی جبریہ طریقے پر ہی ہوئی تھی جہاں 1919 کے واقعات کے بعد کانگریس کی تحقیقاتی کمیٹی کی رپورٹ میں نمبرداروں کے ذریعے اس معاملے میں زور زبردستی کے متعدد واقعات کی نشان دہی کی گئی تھی۔ پنجاب میں کم سے کم 3,55,000 لوگ بھرتی کیے گئے تھے۔ ڈائر نے اگست 1918 میں ڈینگ مارتے ہوئے یہ کہا تھا کہ صرف ایک ضلع گجرانوالہ میں محض ایک سال میں مردوں کی کل آبادی کے لحاظ سے ایک فوجی کا تناسب 1:150 کی جگہ پر 1:47 ہو گیا تھا۔ واضح رہے کہ گجرانوالہ میں رولٹ ایکٹ کے خلاف احتجاج کے دوران کافی شدت پسندی کا مظاہرہ ہوا تھا۔ جہاں تک آرمی کی ضرورتوں کے تحت غذائی اجناس اور خام مال بیرون ملک لے جانے کا سوال ہے تو اس کا اندازہ 10 جنوری 1919 کو مونٹیگو کے ساتھ بمبئی کے گورنر لائیڈ کی اس نجی گفتگو سے کیا جا سکتا ہے جس میں اس نے یہ کہا تھا کہ "آرمی یہاں سے بہت بڑی مقدار میں چارہ میسوپوٹامیہ کو برآمد کر رہی ہے۔ خوش قسمتی سے ہورنیمن پریس (بی۔ جی۔ Horniman کی ادارت میں بمبئی سے شائع ہونے والے قوم پرست اخبار بمبئی کرانیکل کی طرف اشارہ) کو ابھی تک اس بات کی بھنک نہیں پڑی ہے۔ دراصل چارے کی یہ برآمد کاری ایک ایسے وقت میں کی جا رہی ہے جبکہ خود دکن میں اکال پڑا ہوا ہے"
(حوالہ: ڈی ڈی گورڈون، بزنس مین اینڈ پولیٹکس، رائزنگ نیشنلزم اینڈ اے موڈرنائزنگ اکونومی ان بمبئی، 1918,1933، دہلی 1978)۔

جنگی اخراجات میں 300 فیصد کے بقدر اضافے کا مطلب تھا جنگی قرضوں کی وصولی (جو کہ بسا اوقات جبریہ شکل اختیار کر جاتی تھی) کے ساتھ ساتھ ٹیکسوں میں بھاری اضافہ، جس کے لیے ملک کے مالیاتی ڈھانچے میں اتھل پتھل ہونا ناگزیر تھا۔ مال گزاری کو ہی سب سے بھاری مالی بوجھ کی حیثیت حاصل رہی تھی، جس نے گاندھی کو ہندوستان میں ایک دوسری مہم کی ترغیب دی تھی، جو 1918 کا کھیڑا ستیہ گرہ کے نام سے جانی جاتی ہے۔ اس وقت مال گزاری ان ضابطوں کے تابع تھی جن کے ذریعے غیر دوامی بندوبست کے علاقوں میں صرف 30 سال کے وقفے پر ہی اضافہ کیا جا سکتا تھا اور انگریز آبادی کے اس طبقے کو اور زیادہ ناخوش کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھے، کیونکہ فوج

میں زیادہ سے زیادہ بھرتی اسی حلقے سے ہوتی تھی۔ چنانچہ ٹیکس کی بھاری مار تجارتی اور صنعتی حلقوں پر پڑی۔ 14-1913 اور 21-1920 کی درمیانی مدت میں حکومتِ ہند کے کل مالیہ میں کسٹم محصولات کا حصہ 8.9 فی صد سے بڑھ کر 14.8 فی صد ہو گیا۔ اس سلسلے میں 1917 میں لنکا شائر کپڑا ملوں کے احتجاج کو نظر انداز کر دیا گیا تھا جبکہ سوتی کپڑوں پر 7.5 فیصد کے بقدر در آمدی محصول لگا دیا گیا تھا۔ اس سے بھی اہم بات یہ کہ انکم ٹیکس کی اہمیت اچانک بڑھ گئی تھی۔ چنانچہ انکم ٹیکس کا جو حصہ 12-1911 کے مالیہ میں محض دو فیصد تھا وہ بڑھ کر 18-1917 میں 11.75 فی صد تک پہونچ گیا تھا۔ 18-1917 سے پہلی بار انفرادی انکم ٹیکس گوشوارے داخل کرنے کے لیے کہا گیا جس کے نتیجے میں وہ ہندوستانی تاجر بھی ٹیکس دہندگان کے زمرے میں شامل کر لیے گئے جو اب تک روایتی طریقے پر کاروبار کرتے آئے تھے۔ اسی سال کمپنیوں اور غیر منقسم ہندو کاروباری گھرانوں پر بھی انکم ٹیکس لگایا گیا اور 1919 میں زیادہ منافع محصول بھی لگایا گیا۔

جنگ کے اخراجات اور رسل و رسائل کی راہ میں حائل مشکلات (مثلاً غیر جنگی مال جہازوں کے ذریعے بھیجنے کی گنجائش بہت کم رہ گئی تھی جس کی وجہ سے در آمدات میں بھاری کمی آگئی تھی) کے نتیجے میں قیمتوں میں بھاری اضافہ ہو گیا تھا۔ قیمتوں سے متعلق ایک سرکاری گوشوارے میں اس وقت کا ایک کل ہند عدد اشاریہ اس طرح ملتا ہے: 100=1873

1923	1922	1921	1920	1919	1918	1917	1916	1915	1914	1913
215	232	2 36	281	226	225	196	184	152	147	143

(حوالہ: جوڈتھ براؤن: گاندھیز رائز ٹو پاور 1922,1915، صفحہ 25)

بہر حال قیمتوں میں بھاری اضافے سے بھی زیادہ اہم بات یہ تھی کہ یہ اضافہ متنوع مشکل میں ہوا۔ مثلاً جنگ کی وجہ سے صنعتی اشیاء کی قیمتوں میں بھاری اضافہ ہوا کیونکہ رسل و رسائل کی مشکلات کی وجہ سے ان اشیاء کی سپلائی میں کمی واقع ہو گئی تھی اور یوروپی کارخانوں میں دیگر سامان کی جگہ پر صرف فوجی ضرورت کا ہی سامان تیار کیا جا رہا تھا۔ ہندوستان کی زرعی اشیاء (مثلاً خام جوٹ) کی بر آمد کاری قیمتوں میں اضافہ نہیں ہوا۔ کیونکہ جنگ کی وجہ سے عالمی معاشی روابط بھی اتھل پتھل ہو گئے تھے۔ مثلاً 1910 میں چمپارن کے ایک کسان کو کپڑے، نمک اور مٹی کے تیل کی زیادہ قیمت ادا کرنی پڑتی تھی، کیونکہ اس کے اپنے ضلع کی نیل جیسی زرعی بر آمدات کی قیمتوں میں کوئی اضافہ نہیں ہوا تھا۔ چنانچہ اب لوگ زراعت سے ہٹ کر تجارت کی طرف راغب ہونے لگے تھے جس سے وہ خوش حال قسم کے کسان زیادہ متاثر ہوئے جو منڈی کے لیے فصل پیدا کرتے تھے۔ جو غریب کسان یا بے زمین مزدور اپنا پیٹ بازار سے غلہ خرید کر بھرتے تھے وہ ایک دوسری بات سے بھی متاثر ہوئے اور وہ یہ کہ موٹے اناج کی قیمتوں میں چاول اور گندم کی قیمتوں کے مقابلے میں

کہیں زیادہ اضافہ ہوا۔ یہ دراصل زراعت کی تجارت کاری کے رجحان کا نتیجہ تھا کیونکہ اب زیادہ پیداوار والی فصل کی جگہ پر زیادہ قیمت دینے والی فصل پیدا کی جانے لگی تھی۔ گاندھیائی تحریک کے ایک دوسرے مرکز احمد آباد میں بھی اس کی واضح مثال اس طرح ملتی ہے کہ 100=1873 عدد اشاریہ کے لحاظ سے 1914 اور 1918 میں گندم کی قیمت 166 اور 259، باجرا کی قیمت 220 اور 410 تھی۔ عدد اشاریہ سے یوپی میں بھی اسی صورت حال کا پتہ چلتا ہے۔ چنانچہ گیہوں کی قیمت میں 65-1861 اور 21-1917 کی درمیانی مدت میں 250 فی صد اضافہ ہوا تھا جبکہ جوار اور ارہر کی قیمتوں میں 400 فی صد اضافہ ہوا تھا۔ جہاں جنگ ہندوستانیوں کی اکثریت کے لیے مصائب اور معیار زندگی میں بھاری گراوٹ سے عبارت تھی، وہیں یہ جنگ تجارتی اور کاروباری گروپوں کے لیے دھن بٹورنے کا باعث بھی ثابت ہوئی۔ دوسری طرف غیر ملکی مقابلے میں کمی واقع ہوئی، زرعی خام مال (خام جوٹ، خام کپاس وغیرہ) اور صنعتی اشیاء کی قیمتوں میں بھاری فرق واقع ہوا جبکہ اجرتوں میں یا تو ٹھہراؤ رہا یا کمی واقع ہوئی۔ مشرقی ہندوستان میں سارا صنعتی منافعہ جوٹ ملوں کے انگریز مالکان کی ہی جیب میں گیا، وہ اس طرح کہ جنگ کے زمانے میں خام جوٹ کی قیمتوں میں بھاری گراوٹ آئی کیونکہ یوروپی ممالک میں مانگ گھٹ گئی تھی جبکہ جنگی ضرورتوں کے تحت جوٹ مصنوعات کی قیمتوں میں بھاری اضافہ ہو تا گیا تھا۔

کلکتہ میں مارواڑی تاجروں کے ایک گروپ نے بھی ان برسوں کے دوران جوٹ کے کاروبار میں دلالی کے ذریعے کافی دولت بٹوری تھی اور جنگ کے فوراً ہی بعد جی۔ ڈی برلا اور حکم چند نے کلکتہ کے مضافات میں ہندوستانیوں کی ملکیت والی پہلی جوٹ مل قائم کی تھی۔ لیکن اصل اور فیصلہ کن تبدیلی احمد آباد اور بمبئی کی کپاس اور کپڑا صنعت میں واقع ہوئی جہاں لنکاشائر کی کپڑا صنعت کے مقابلے نے ہندوستانی سرمایہ کاری کو پیش رفت کا موقع فراہم کر دیا تھا۔ حکومت کی مالیاتی ضرورت کے تحت یہ جنگ ایک طرح مالیاتی تحفظ کا بھی باعث ہوئی (1917 میں 7.5 فی صد کی شرح سے درآمداتی محصول عائد کیا گیا جبکہ ہندوستانی کپڑوں پر آب کاری محصول 3.5 فی صد کی شرح پر ہی برقرار رکھا گیا)۔ اس طرح کپڑے کے تھانوں اور دھاگوں کی درآمد کاری میں کمی آئی جبکہ ہندوستان کے کپڑا ملوں کی مصنوعات میں اضافہ ہوا۔

درآمد کیے جانے والے سوت کی بھاری لاگت اور ہندوستانی کمپنیوں کے ذریعے مقابلہ آرائی کی وجہ سے ہتھ کرگھا کی مصنوعات میں بھی کمی آئی اور ہندوستانی منڈیوں میں جاپان کی سوتی مصنوعات کی بھرمار ہو گئی تھی۔ امیہ باگچی نے ان رجحانات کی عکاسی درج ذیل جدول کے ذریعے کرنے کی کوشش کی ہے:

	برطانیہ سے سوتی تھانوں کی برآمد کاری	جاپان سے سوتی تھانوں کی برآمد کاری	ہندوستانی ہتھ کرگھا سے سوتی تھانوں کی پیداوار	ہندوستانی ملوں میں سوتی تھانوں کی پیداوار
1913-14	3104	9	1018.8	1171.1
1914-15	2378	16	1136.0	1175.9
1915-16	2049	39	943.2	1496.1
1916-17	1786	100	645.6	1606.1
1917-18	1430	95	741.2	1615.6
1918-19	867	238	890.0	1481.8
1919-20	976	76	506.0	1630.0
1920-21	1292	170	731.2	1563.1
1921-22	955	90	938.0	1716.0
1922-23	1453	108	184.0	1720.8

ہندوستانی ملوں میں لنکاشائر کی درآمدات سے کہیں زیادہ کپڑا تیار ہونے لگا تھا۔ یہ ایک ایسی فیصلہ کن تبدیلی تھی جو دوامی حیثیت اختیار کر گئی۔

اس کے علاوہ جنگ کے برسوں میں ہندوستان میں صنعتی ترقی سے متعلق انگریزوں کی پالیسی میں مخصوص تبدیلی آئی۔ یہ تبدیلی مالیاتی ضرورتوں اور اس احساس کا نتیجہ تھی کہ کم سے کم مالیاتی خود مختاری بھی جنگی حکمت عملی کی ایک ضرورت ہے۔ 1916 میں تھامس ہالینڈ کی قیادت میں ایک انڈسٹریل کمیشن قائم کیا گیا تھا اور سونسفورڈ رپورٹ کے ساتھ ساتھ مالیاتی خود مختاری کنونشن بھی سامنے لایا گیا تھا جو کہ ایک جوائنٹ پارلیمنٹری کمیٹی کی اس سفارش پر مبنی تھا کہ جن فیصلوں کے بارے میں حکومت ہند اور نئی قانون ساز کونسل میں اتفاق رائے ہو جائے انھیں حکومت برطانیہ کو کسی بھی حال میں مسترد نہیں کرنا چاہیے۔ یہ سب باتیں انگریزوں کی سابقہ پالیسیوں میں کسی قدر الٹ پھیر کی نشان دہی کرتی ہیں۔ 1910 میں مارلے نے الفریڈ چیٹرٹن کی ان کوششوں کو تارپیڈو کر دیا تھا جن کا مقصد حکومت برطانیہ کو ہندوستانی معاملات میں عدم مداخلت کی پالیسی اپنانے کے لیے تیار کرنا تھا۔ الفریڈ چیٹرٹن مدراس کا باشندہ تھا اور اس نے ریاست کی پہل پر المونیم اور کرومن کی صنعتیں لگانے کی کوشش کی تھی۔ بہر حال انگریزوں کی پالیسی میں اس تبدیلی پر ضرورت سے زیادہ زور دینا درست نہیں ہوگا، Chatterton روغن صندل، اور صابن جیسی چھوٹی چھوٹی صنعتوں کو فروغ دینا چاہتا تھا، تاکہ ریاست کی خود مختاری پر آنچ نہ آسکے۔ یہ بات بعد میں اس وقت منکشف ہوئی جب وہ ریاست میسور میں صنعتوں کے محکمے کا انچارج تھا۔ بہر حال اس کے قطعی بر

خلاف میسور کے قابل ذکر دیوان وشوسریہ (1918-1911) نے مکمل تبدیلی لانے کی کوشش کی۔ یہ دوسری بات ہے کہ کرشنا ساگر ڈیم اور بھدراوتی آئرن ورکس جیسے ان کے بڑے منصوبے ان کے استعفیٰ کا باعث ہوئے تھے بلکہ 1918 میں انگریزوں نے بھی اس میں اہم رول ادا کیا۔ جہاں تک اس مالیاتی خود مختاری کنونشن کا سوال ہے جس کے بارے میں بڑے بڑے دعوے کیے گئے تھے، اس کے ساتھ وائسرائے اور اسمبلی کے درمیان اتفاق رائے کی جو شرط رکھ دی گئی تھی، اس کی وجہ سے اس کی کوئی اہمیت ہی نہیں رہ گئی تھی، کیونکہ وائسرائے بہرحال ایک انگریز کارندہ تھا۔

ایک طرف تو ہندوستانی سرمایہ کاری کو نئی توانائی حاصل ہو رہی تھی اور دوسری طرف ملک کے تمام حصوں کے درمیان رسل ورسائل کے رابطے بھی قائم ہوتے جارہے تھے۔ خاص طور پر مارواڑی طبقہ ایک دوسرے کے ساتھ مربوط ہو رہا تھا، جنگی محصول اور جنگ کے بعد روپے اور اسٹرلنگ کی شرح، تبادلہ کی تغیر پذیر صورت حال سے پیدا ہونے والی مشکلات بھی برقرار چلی آرہی تھیں۔ بمبئی کے ایک قوم پرست اور ابھرتے وکیل بھولا بھائی ڈیسائی نے انکم ٹیکس کا گوشوارہ داخل کرنے کو لازمی قرار دیئے جانے کے خلاف ستمبر 1918 میں عذر داری دائر کرنے کا منصوبہ بنایا۔ انکم ٹیکس ریٹرن لازمی قرار دیئے جانے سے روایتی طریقے پر کاروبار کرنے والے چھوٹے چھوٹے تاجروں کو کافی مشکلات پیش آرہی تھیں۔ روپے اور اسٹرلنگ کی شرح تبادلہ میں بھاری اتار چڑھاؤ تھا۔ انگریزوں نے روپے کے مقابلے میں اسٹرلنگ کی زیادہ شرح تبادلہ کو برقرار رکھنے کی کوشش کی، کیونکہ اس طرح ہوم اخراجات کے سلسلے میں حکومت کے اسٹرلنگ کے خرچ کو کم سے کم کیا جاسکتا تھا۔ تجارتی منافع اور پنشن وغیرہ کی رقم برطانیہ بھیجنے والے انگریز فائدے میں رہتے تھے۔ اس کے علاوہ قیمتوں میں کمی کے ذریعے لنکاشائر کی مصنوعات کی درآمد کاری میں اضافہ کیا جاسکتا تھا۔ اس کے برخلاف ہندوستانی تاجر درآمدات کو زیادہ مہنگا بنانے اور ہندوستان کی سوتی مصنوعات کی برآمد کاری کو فروغ دینے کی غرض سے 1920 اور 1930 کی دہائیوں کے دوران زر تبادلہ کی شرح کم کرنے پر برابر زور دیتے رہے تھے۔ 21-1919 کی ایک چھوٹی سی مدت کے لحاظ سے تو لنکاشائر کی مصنوعات کے ہندوستانی درآمد کاروں نے بھی روپے اور اسٹرلنگ کی شرح تبادلہ میں مسلسل اتار چڑھاؤ پر ناراضگی ظاہر کی تھی، کیونکہ اس کی وجہ سے برطانیہ کی برآمد کار فرموں کے ساتھ معاہدوں کو نبھانا بہت مشکل ہو رہا تھا۔ یہ ایک ایسا معاملہ تھا جس کے سلسلے میں کانگریس کو 1920 کے ناگ پور اجلاس میں ایک خصوصی قرارداد پاس کرنی پڑی تھی۔

اس طرح زیادہ سے زیادہ کاروباری مفادات اور قومی تحریک میں شمولیت ایک دوسرے کے لیے وجہ جواز بنتے جارہے تھے۔ جیسا کہ ہم آگے چل کر جائزہ لیں گے اسے گاندھیائی تحریکوں میں شروع سے ہی ایک خصوصیت حاصل رہی تھی۔ چنانچہ سابرمتی آشرم (1915) کو احمد آباد

کے ایک مل مالک امبالال سارابھائی سے قابل لحاظ رقم حاصل ہوئی تھی۔ اس طرح گاندھی کے مارچ 1919 کے ستیہ گرہ عہد نامے پر بمبئی کے 686 دستخط کنندگان میں 74% فیصد سوداگر تھے۔ 1921 میں تلک سوراج فنڈ کے لیے ایک کروڑ روپے کے عطیے میں صرف بمبئی سے ہی 37.5 لاکھ روپے اکٹھا ہوئے تھے اور برطانیہ کی مصنوعات نہ منگانے کے لیے ہندوستانی تاجروں کا اجتماعی عہد، بائیکاٹ کی اصولی شکل اختیار کر چکا تھا جو کہ بنگال کی سودیشی تحریک کے قطعی برعکس تھا۔ تاہم یہ بھی واقعہ ہے کہ تاجر برادری کی طرف سے حاصل یہ تائید ہمیشہ یکساں نہیں رہی۔ فی الوقت یہ نوٹ کرنے کی ضرورت ہے کہ چھوٹے اور متوسط درجے کے تاجر (22-1919 کی درمیانی مدت میں بھی اور بعد میں تحریک عدم تعاون کے دوران بھی) بڑے بڑے صنعت کاروں کے مقابلے میں قوم پرستوں کے زیادہ قریب تھے۔ چنانچہ 1918 اور 1935 کی درمیانی مدت کے دوران بمبئی کی کاروباری دنیا کے سلسلے میں اے۔ ڈی Gordon نے جو تجزیہ کیا ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ جنگ کے فوراً بعد خام (غیر تیار) کپاس کی قیمتوں میں کمی کے لیے کپاس کے برآمد کار اور مل مالکان اپنے سرکاری روابط کو طرح طرح سے بروئے کار لانے کی کوشش کر رہے تھے۔ جو ساہوکار اور چھوٹے قسم کے تاجر خام کپاس بمبئی لاتے تھے وہ اس سلسلے میں اپنی ناراضگی کا جزوی اظہار قومی تحریک کی تائید کی شکل میں کرتے تھے۔ یہ وہ وقت تھا جب اس وقت کے بہت بڑے تاجر اور ساہوکار پرشوتم داس ٹھاکرداس، جن کے مفادات کپاس کی برآمد کاری سے بھی وابستہ تھے، ایک ترک موالات مخالف تنظیم (Anti- Non- Cooperation Association) قائم کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔

بڑے بڑے صنعت کاروں (تاجروں) کی وفاداری کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ انھیں مزدور طبقے کی بے چینی کے مقابلے پر حکومت کی تائید کی ضرورت تھی۔ محنت کش طبقے کی تعداد میں قابل لحاظ اضافہ ہو چکا تھا۔ باقاعدہ صنعتوں، کارخانوں نیز باگان میں کام کرنے والوں کی جو تعداد 1911ء میں 2,105,824 تھی وہ بڑھ کر 1921 میں 2,681,125 ہو گئی تھی۔ اشیاء صرف کی قیمتوں میں بھاری اضافے اور آجرین (Employers) کو بھاری منافع کے زمانے میں بھی مزدور طبقے کی اجرت پہلے ہی کی طرح کم رہی۔ اور جنگ کے فوراً بعد کے زمانے میں (جبکہ ایک طرف صنعتی سرگرمیوں میں تیزی آگئی تھی مگر طاعون کی وجہ سے لوگوں نے شہروں کی طرف آنا بند کر دیا تھا) بھی تھوڑے عرصے کے لیے محنت کش طبقے کی تھوڑی سی کمی محسوس ہوئی تھی۔ گویا اس طرح محنت کش طبقوں کے لیے ایسے حالات پیدا ہو گئے تھے جن میں وہ آسانی سے سودے بازی کر سکتے تھے۔ چنانچہ اس صورت حال کا نتیجہ اس شکل میں سامنے آیا جس کا ذکر دسمبر 1920 میں چیمسفورڈ نے "طاعون کی طرح پھیل جانے والی ہڑتال" کے طور پر کیا تھا۔ جہاں واقعی ہڑتالوں کی ایک بڑی

لہر 1919 کے اواخر میں پھیلتی چلی گئی جن کا جائزہ بعد میں لیا جائے گا، مگر ان کی بنیاد مارچ 1918 میں گاندھی کی قیادت میں احمد آباد کی ہڑتال اور جنوری 1919 میں بمبئی عظمیٰ کی ہڑتال کی شکل میں پڑ چکی تھی۔ بمبئی کی ہڑتال کے موضوع پر اروند کمار کے تفصیلی مطالعے میں اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ اس ہڑتال کے چند بہت اہم مگر وقتی نوعیت کے اسباب تھے۔ مگر نوکری دلانے والے دلال (Jobbers) اس سلسلے میں 1908 میں ہی اہم رول ادا کر چکے تھے سی۔ این۔ واڈیا کی سینچری ملز کے ورکروں نے اجرتوں میں 25 فیصد اضافے اور ایک ماہ کی تنخواہ کے بقدر بونس کا مطالبہ کرتے ہوئے 3 دسمبر سے ہڑتال شروع کر دی تھی۔ غذائی اجناس کی قیمتوں میں 80 تا 100 فی صد اضافے کے مقابلے میں بمبئی شہر کے ورکروں کی اجرتوں میں 18-1914 کی درمیانی مدت میں محض 15 فیصد اضافہ کیا گیا تھا، جبکہ واڈیا کاروبار کو 20 لاکھ روپے کی سرمایہ کاری پر 1918 میں 22.5 لاکھ روپے کا منافع ہوا تھا۔ سینچری ملز کے ورکروں نے پریل صنعتی علاقے کے دوسرے ورکروں کو 9 جنوری سے اپنے ساتھ ہڑتال میں شامل کر لیا۔ جلد ہی ایک لاکھ سے زاید مل ورکر ہڑتال کرتے ہوئے سڑکوں پر آ گئے اور تمام 83 ملیں بند ہو گئیں۔ تجارتی گھرانوں (اداروں) کے کلرک، رائل انڈین میرین کے گودی ملازمین اور پریل کے ریل انجینئر بھی ہڑتال میں شامل ہو گئے۔ کوشش یہ تھی کہ اس تحریک کی قیادت کچھ انقلابی قسم کے وکلاء اور ہوم رول لیگ سے وابستہ سیاست داں ایچ۔ بی۔ منڈوالے، کانجی دوراکاداس، عمر سبحانی کریں جو کہ ورکروں کے جلسوں سے خطاب کرتے رہے تھے۔ اس کے علاوہ ایس۔ کے بولے (Bole) کی تنظیم کامگار ہت وردھک سبھا بھی میدان میں تھی۔ یہ سبھا 1909 سے ورکروں کو غیر براہمن خطوط پر متحرک کرنے کی کوشش کرتی آ رہی تھی۔ بہر حال یہ بھی ایک دلچسپ بات ہے کہ ان لیڈروں کی طرف سے اعتدال پسندی کی جو بھی صلاح پیش کی جاتی تھی اسے ورکروں کے جلسوں میں مسترد کر دیا جاتا تھا اور پولس کمشنر سی۔ اے Vincent کی طرف سے ثالثی کی پیش کش بھی تب ہی (21 جنوری) کامیاب ہو سکی تھی جب وہ مل مالکان کی ایسوسی ایشن کو اجرتوں میں 20 فی صد اضافے اور ایک مخصوص بونس کے لیے آمادہ کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔

جنگ، نیز جنگ کے فوراً بعد کے برسوں کو انڈین ٹریڈ یونین تحریک کا حقیقی نقطہ آغاز قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس سلسلے کی پہلی تنظیم جس کے ارکان اور چندہ دہندگان کا باقاعدہ رکارڈ تھا، اپریل 1918 کی مدراس لیبر یونین تھی جسے اینی بیسنٹ کی تنظیم، نیو انڈیا سے وابستہ دو نوجوانوں جی۔ راما سندر نائیڈو اور جی۔ چیلاپتی چیتی نے شروع کیا تھا اور جس کی صدارت بسنٹ کے ہی ایک رفیق کار بی۔ پی واڈیا نے کی تھی۔ اس سلسلے میں ٹی۔ وی کلیان مدلیار (عرف تھیرو۔ وی۔ کا) نے بھی اہم رول ادا کیا تھا جو کہ مدراس سٹی کانگریس کے ایک سرکردہ غیر براہمن قوم پرست لیڈر اور تمل کی

ادبی شخصیت تھے۔ ان کے علاوہ ہوم رول لیگ کے ترجمان Baptista اور بی جے ہورنی مین کے بمبئی کرانیکل نے بھی بمبئی میں ٹریڈ یونین کی داغ بیل ڈالنے میں نمایاں رول ادا کیا۔ 1920 میں ٹریڈ یونینوں کا سیلاب آگیا۔ یہاں تک کہ اسی سال بمبئی میں آل انڈیا ٹریڈ یونین کانگریس کے پہلے اجلاس میں اس طرح کی 125 ٹریڈ یونینوں کو رکارڈ کیا گیا تھا۔ بالعموم جیسا کہ جنوری 1919 میں بمبئی میں بھی دیکھنے میں آیا تھا، شدت پسندی (Militancy) کے لیے دباؤ، ان ابتدائی ٹریڈیونینوں کی بجائے نچلی سطح کے ورکروں کی طرف سے ڈالا گیا۔ بلکہ یہ ابتدائی ٹریڈ یونین تو عام طور پر ضبط و تحمل سے ہی کام لینے کا اپدیش دیا کرتی تھیں۔ ٹریڈ یونینیں کے ابتدائی دور کے متوسط درجے کے لیڈر قوم پرستانہ جذبات سے سرشار تھے لیکن اپنی سیاسی سرگرمیوں میں حکومت کے تئیں وفاداری کا بھی مظاہرہ کرتے تھے۔ ان میں بمبئی کے این۔ ایم۔ جوشی اور کلکتہ کے کے۔ بی رائے چودھری جیسے لوگ قابل ذکر ہیں۔

روز افزوں مہنگائی، غذائی اجناس کی پیداوار میں کمی، 1918 اور 1919 کے دوران ملک بھر میں قلت جیسے حالات نیز 19-1918 میں انفلوئنزا کی وبا جیسے عوامل کے تحت جو عام بے چینی پیدا ہوگئی تھی، اس کا اظہار محض ہڑتالوں کے ذریعے ہی ہو سکتا تھا۔ بے روزگاری بھی بڑھتی جارہی تھی (صفحہ 194 پر دکھائے گئے جدول کے مطابق 20-1919 میں ہینڈلوم سوتی کپڑے کی پیداوار سب سے کم تھی)۔ سب سے سنگین بات یہ تھی کہ غذائی اجناس کی لوٹ پاٹ شروع ہوگئی تھی قصبوں اور شہروں کی اناج منڈیوں کو لوٹا جانے لگا تھا۔ اور قرض ناموں اور رہن ناموں کو چھین کر ضائع کیا جارہا تھا۔ بمبئی کے مل ایریا میں 1918 کے اوائل میں اجناس کی 115 دکانیں لوٹی گئی تھیں جب کہ ریلوے ملازمین نے مارواڑیوں کے بھی کھاتے چھین لیے تھے۔ مئی 1918 میں کرشنا۔ گوداواری ڈیلٹا میں بھی غذائی اجناس کی لوٹ پاٹ کے واقعات ہوئے۔ اس کے بعد ستمبر میں مدراس شہر میں زبردست بلوہ پھوٹ پڑا جس میں کپڑا ملوں اور ریلوے کے ملازمین نے حصہ لیا تھا۔ بنگال میں ہاٹ لوٹ لینے کے 38 واقعات ہوئے جب کہ نوا کھالی۔ چٹاگانگ، رنگ پور، دیناج پور، کھلنا، چوبیس پرگنہ اور جیسور اضلاع میں لوٹ پاٹ کے سلسلے میں 859 مقدمے چلے تھے۔ ان واقعات کی شدت مختلف مقامات پر مختلف رہی تھی جس کا انحصار مقامی سیاسی حالات پر ہوتا تھا۔ مثلاً ستمبر 1918 میں کلکتہ میں مارواڑی مخالف بلوے میں مسلمانوں کا رول رہا تھا مگر ساتھ ہی میں اس مسلم عنصر نے اپریل 1919 میں رولٹ ایکٹ کے خلاف تحریک میں بھی اہم رول ادا کیا تھا۔

بہر حال جنگ کے فوراً بعد کے برسوں میں ہندوستانی عوام میں کروٹ لینے والی اس بیداری کے لیے محض مقامی حالات کو ہی ذمہ دار ٹھہرانا درست نہیں ہے۔ اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ اس وقت ہندوستان میں جو کچھ ہو رہا تھا وہ دراصل اس وقت کے عالمی حالات و

واقعات کا ہی ایک حصہ تھا، ترقی یافتہ ملکوں میں سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف اور نو آبادیاتی ملکوں میں سامراج کے خلاف آوازیں بلند ہو رہی تھیں۔ اگرچہ اس کا کوئی دستاویزی ثبوت تو نہیں ہے مگر یہ یقینی ہے کہ جنگی مہموں کے بعد دور دراز خطوں سے وطن واپس لوٹنے والے ہندوستانی فوجی اپنے ساتھ وہ انقلابی موڈ بھی لائے ہوں گے جو اس وقت پوری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لیتا جا رہا تھا۔ اس میں شک نہیں کہ فوج کی نوکری نے بنگال کے قاضی نذرالاسلام کو سوشلسٹ انداز فکر کا شاعر بنا دینے میں اہم رول ادا کیا تھا؛ جب کہ مارچ 1921 میں یوپی کے ضلع پرتاپ گڑھ اور ضلع رائے بریلی کی سرحد پر واقع کڑھیا کے زرعی بلوے کے سلسلے میں پولس کی رپورٹ میں مقامی لیڈر برجپال سنگھ کا ذکر ایک ایسے سابق فوجی کے طور پر کیا گیا تھا جس کا بھیڑ پر بہت کنٹرول تھا اور یہ کنٹرول فوجی نظم و ضبط سے یقیناً عاری نہیں رہا ہوگا۔

بہر حال اس میں شک نہیں کہ نومبر 1917 کا بالشوک انقلاب سب سے زیادہ دور رس اثرات کا حامل ثابت ہوا۔ اس سلسلے میں انگریزوں کے خدشات مبالغے کی حد تک بڑھے ہوئے تھے۔ دراصل فرانسیسی انقلاب کی دہشت ابھی تک ان کے دلوں میں بیٹھی ہوئی تھی۔ چنانچہ 1919-20 اور اس کے بعد کی تقریباً تمام سرکاری رپورٹوں سے پتہ چلتا ہے کہ انگریزوں کو ہر جگہ بالشوک تصورات اور روسی ایجنٹ ہی نظر آتے تھے۔ اور اس سلسلے میں تو بعض اوقات گاندھی اور سی۔ آر۔ داس جیسے لوگ بھی شک و شبہے کے گھیرے میں آجاتے تھے (بمبئی کے گورنر ولنگڈن نے 5 مئی 1918 کو گاندھی کا تذکرہ "ایماندار مگر بالشوک بھی اور اس لحاظ سے انتہائی خطرناک" کے طور پر کیا تھا)۔ اس سلسلے میں دو مثالیں کافی ہوں گی۔ فروری 1921 میں یوپی میں کسان ایجی ٹیشن کے سلسلے میں سی آئی ڈی کی رپورٹ میں ایسی باتوں کا بھی ذکر کیا گیا تھا جن سے "بالشوک نظریات کی بو آتی ہے"۔ جب کہ اسی سال میواڑ کے ایک دور دراز علاقے میں کسان تحریک کا تذکرہ کرتے ہوئے Wilkinson نے یہ بھی لکھا ہے کہ "مہارانا کو یہ دھمکی دی گئی تھی کہ اس کا بھی زار جیسا ہی حشر کر دیا جائے"۔ اگرچہ بالشوک انقلاب اور ہندوستان کے حالات میں کوئی تعلق نہ ہونے کی وجہ سے اس طرح کی باتوں کا کوئی تک نہیں تھا۔ مگر اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ سامراجی حلقوں میں موجود اس دہشت کی جڑیں دراصل 1917 کے انقلاب روس سے متعلق مختلف افواہوں میں پیوست تھیں اور یہ افواہیں ہندوستانیوں کے بھی ایک بڑے حلقے تک پہونچ چکی تھیں۔ انقلابی قسم کے قوم پرستوں کے نزدیک بالشوک روس شکست خوردہ جرمنی کی جگہ لے رہا تھا اور انقلاب کے فوراً بعد روس کا سفر کرنے والوں میں مہیندر پرتاپ، ایم۔ این۔ رائے، ابانی مکھرجی، وریندر ناتھ چٹوپادھیائے اور بھوپن دت جیسے لوگ شامل تھے۔ انقلابی روس سے انگریز حکمرانوں کی اس خوف زدگی اور نفرت نے قوم پرستانہ انداز فکر رکھنے والے تعلیم یافتہ ہندوستانیوں

کے دلوں میں روسیوں کے تئیں ہمدردی اور دلچسپی پیدا کر دی تھی۔ لینن اور ٹراٹسکی کے زمانے میں روس کی خارجہ پالیسی خاص طور پر بین الاقوامی تصور اور فلسفہ عینیت پر اصرار کافی اثر انداز ثابت ہوا۔ دوسرے علاقوں کے انضمام کے بغیر قیام امن کی اپیل کی گئی، قوموں کو حق خود اختیاری (جس کا فن لینڈ پر فوراً اطلاق کیا گیا) دینے کا اعلان کیا گیا اور ان خفیہ معاہدوں کو شائع کر دیا گیا جن کے ذریعے روس کو قابل لحاظ مفتوحہ علاقے اور مراعات دینے کا وعدہ کیا گیا تھا اور روس کے بالشوک انقلاب کے فوراً بعد ہی جن کی دھجیاں بکھیر دی گئی تھیں۔ جہاں ایک طرف روس کے اندر کے حالات اور واقعات کے سلسلے میں حقیقی معلومات کا حصول کافی مشکل ہو گیا تھا وہیں دوسری طرف مکمل اتھل پتھل کے سلسلے میں مبہم قسم کی افواہیں پھیل رہی تھیں۔ یہ ہے وہ مجموعی سیاق جس میں ہمیں گاندھی کے عروج کا جائزہ لینا ہے۔ گاندھی جب 1915 میں جنوبی افریقہ سے واپس لوٹے تھے تو ہندوستانی سیاست کے لیے بالکل اجنبی تھے مگر 1920 میں ملک کے سب سے بڑے سیاسی قائد کی حیثیت حاصل کر چکے تھے۔

مہاتما گاندھی

گاندھی کی کشش (Appeal)

جنوبی افریقہ کے تجربے (1914-1893) نے گاندھی کے نظریہ اور طریقہ کار کی اساس کی تشکیل اور نشو ونما کے ساتھ ساتھ بعد میں ملک میں ان کی سیاسی کامیابیوں میں بھی اہم رول ادا کیا۔ گاندھی 1906 تک ایک ابھرتے ہوئے وکیل۔ سیاست داں کے طور پر ناٹال میں ہندوستانیوں کے خلاف نسلی امتیاز کے سلوک (انھیں ووٹ دینے، جوت داری رکھنے اور تجارت کا حق نہیں تھا) کے خلاف درخواستوں اور عرضداشتوں جیسے اعتدال پسندانہ طریقے ہی اختیار کرتے آئے تھے۔ اس طرح ان کی ساری تگ و دو سوداگروں اور وکیلوں تک ہی محدود رہی تھی۔ 08-1907، 11-1908 اور 14-1913 کی پر امن مزاحمت کی تحریکوں (جنھیں 1907 میں ہی ستیہ گرہ کا نام دیدیا گیا تھا) سے ان میں زبردست تبدیلی پیدا ہوئی۔ ان میں سے ایک معاملہ ہندوستانیوں کے رجسٹریشن کرانے اور پاس جاری کرنے کی لازمی شرط سے متعلق 1906 کے ٹرانسوال آرڈی ننس سے؛ دوسرا معاملہ 1913 میں نقل وطن پر پابندی لگا دینے نیز نو واردوں کے معاملے کا تصفیہ کرتے وقت غیر عیسائی ہندوستانیوں کی شادیوں کو تسلیم نہ کرنے سے، اور تیسرا معاملہ سابقہ قرار ناموں کے ذریعے لائے گئے ہر ہندوستانی مزدور پر سات پونڈ کے بقدر ٹیکس کے نفاذ سے تعلق رکھتا تھا۔ جنوبی افریقہ کے خصوصی حالات کی وجہ سے مختلف مذہبوں، طبقوں اور فرقوں کے لوگوں کی تحریک

کامیابی کے ساتھ آگے بڑھنے لگی تھی۔ ہندو، مسلمان، عیسائی، پارسی، گجراتی، جنوبی ہند کے اونچے طبقے کے تاجر، وکلاء، نیو کیسل کے کان مزدور، غرضیکہ ہر طرح کے لوگ ساتھ ساتھ تھے، اکتوبر 1913 میں گاندھی نے نیو کیسل کے کان مزدوروں کی یادگار ہڑتال اور ملک گیر مارچ کی قیادت بھی کی تھی۔ اس بات پر توجہ دینے کی ضرورت ہے کہ ان تجربات نے شروع سے ہی گاندھی کو ایک کل ہند شخصیت بنادیا تھا جبکہ تلک، لاجپت، بپال جیسے دوسرے رہنما محض علاقائی سطح کے ہی لیڈر تھے۔ گاندھی اپنی ساری زندگی جس ہندو مسلم اتحاد کی ضرورت کو سمجھتے اور اس کے امکان پر زور دیتے رہے اس کا سلسلہ در حقیقت جنوبی افریقہ میں ان تحریکوں سے ہی شروع ہوا تھا۔ ان تحریکوں میں مسلم تاجر اور سوداگر کافی سرگرم رہے تھے۔ جنوبی افریقہ میں قیام کی وجہ سے انھیں ایک طرح کی عالمی برگزیدگی حاصل ہو گئی تھی اور جنوبی افریقہ کے ان ہندوستانیوں کے توسط سے، جن کے اصل گھر اور رابطے ہندوستان میں تھے، گاندھی کا نام پورے ہندوستان میں پھیل گیا تھا۔ سابرمتی آشرم کے اولیں 25 مکینوں میں سے 13 کا تعلق تامل ناڈو سے تھا۔ یہ ایک ایسی بات تھی جس کا کسی دوسرے ہندوستانی رہنما کے تعلق سے تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا۔

گاندھیائی طریقہ کار کا بنیادی خاکہ جنوبی افریقہ میں 1906 کے بعد تیار ہوا تھا۔ اس طریقہ کار میں منضبط کادر (Cadre) کی محتاط تربیت (Pheonix کا تصفیہ اور ٹالسٹائی فارم معاملہ)؛ غیر تشدد پسندانہ ستیہ گرہ، یعنی مخصوص قوانین کی پرامن خلاف ورزی (لازمی رجسٹریشن، داخلے کے لیے پرمٹ اور تجارتی لائی سنس کا معاہدہ)؛ اجتماعی طور پر گرفتاری دینا، وقتاً فوقتاً ہڑتال اور مارچ وغیرہ۔ اس میں خیالی منصوبہ بندی کے ساتھ ساتھ تنظیمی اور مالی تفصیلات پر بہت باریکی کے ساتھ توجہ دینا بھی شامل تھا؛ گویا ایک طرف تو خود کو گفت وشنید اور مصالحت کے لیے تیار بھی رکھا جاتا تھا جس کے نتیجے میں بعض اوقات اچانک اور یک طرفہ طور پر اور لوگوں کو ناراض کر کے بھی، تحریک کو واپس لے لیا جاتا تھا (جیسا کہ جنوری 1908 میں پہلے ستیہ گرہ کو Smuts کے زبانی وعدے پر ہی واپس لے لیا گیا تھا اور اس طرح کے وعدوں کا کبھی پاس نہیں رکھا جاتا تھا۔ چنانچہ ستیہ گرہ کو اس طرح واپس لے لیے جانے پر ایک شدت پسند پٹھان نے گاندھی کے ساتھ مار پیٹ بھی کی تھی)؛ نیز سبزی خوری، قدرتی طریقۂ علاج اور جنسی ضبط نفس سے متعلق تجربات جیسی باتوں کا سلسلہ شروع کر دیا گیا تھا جنھیں غیر گاندھیائی لوگ "گاندھیائی خبط" کا نام دیا کرتے تھے۔ اس کا نتیجہ دوہرے اثرات کی شکل میں سامنے آیا؛ جہاں ایک طرف جمعیت گاندھی کی طرف راغب ہو رہی تھی، وہیں دوسری طرف اس رہنما اور اُس کے عدم تشدد کے طریقۂ کار نے عوام کی سرگرمی پر بندش قائم رکھی۔

گاندھی کے نزدیک "اہنسا، یعنی عدم تشدد اور ستیہ گرہ ایک ایسا سوچا سمجھا فلسفہ تھا جس کے

ڈانڈے ایمرسن، تھارو (Thoreau) اور ٹالسٹائی کے افکار سے ملتے تھے، لیکن اس کے ساتھ ہی اس فلسفے کی اصل اساس گاندھی نے ہی تیار کی تھی۔ سچائی (حق) کی تلاش انسانی زندگی کا اصل نصب العین ہے اور چونکہ کوئی بھی شخص حقیقت مطلق (حق) تک رسائی کا یقین کے ساتھ دعوا نہیں کر سکتا، اس لیے جزوی عرفانِ حق دوسروں پر تھوپنے کے لیے تشدد کا استعمال پاپ (گناہ) ہے"۔ بہر حال سنت گاندھی کی بجائے سیاست داں گاندھی بعض اوقات مکمل عدم تشدد سے کم جیسی باتوں پر بھی راضی ہو جایا کرتے تھے (مثلاً جنگ کے بعد کچھ مراعات کی امید میں انھوں نے 1918 میں فوج میں بھرتی کے حق میں تحریک چلائی تھی)۔ وہ اسی طرح ظلم کے آگے بزدلی سے سر جھکا دینے کے مقابلے میں تشدد پر زور دیتے تھے۔ ان کی ان باتوں کی وجہ سے بعض اوقات ان کے نظریات کی تاویل اور تشریح میں بڑی پیچیدگی پیدا ہو جاتی تھی۔ مگر ان کے ذاتی فلسفے (جسے ان کے پیروکاروں کے ایک بہت چھوٹے سے ہی حلقے نے تسلیم کیا تھا) سے کہیں زیادہ اہم وہ طریقہ کار تھا جس میں عوام کی شمولیت کا تناظر؛ ہندستانی عوام کے سماجی اعتبار سے فیصلہ کن حیثیت کے حامل طبقوں کے مفادات اور جذبات سے ہم آہنگ تھا۔ جیسا کہ ہم پہلے دیکھ چکے ہیں، گاندھی سے قبل کے ہندوستانی سیاست داں ایک طرح سے اعتدال پسندانہ گداگری اور انفرادی دہشت پسندی کے مابین معلق ہو کر رہ گئے تھے جس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ یہ سیاست داں بے مہار عوامی تحریکوں کے سلسلے میں سماجی جھجک کا شکار تھے۔ گاندھیائی فلسفہ ملک کے تاجر، خوش حال اور مقامی طور پر بااثر کسان حلقوں کے لیے قابل قبول تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ سیاسی جدوجہد کے پر تشدد سماجی انقلاب کی شکل اختیار کر جانے کی صورت میں ان طبقوں کے مفادات پر ضرب پڑ سکتی تھی۔ زیادہ عمومیت کے ساتھ یہ کہا جا سکتا ہے کہ گاندھی اور ان کی قیادت والی کانگریس نے جو اتحاد کارانہ (Unifying) رول ادا کیا اس کی بنیاد عدم تشدد کے ہی فلسفے پر قائم تھی یہی وہ فلسفہ تھا جس نے داخلی سماجی تنازعات کے حل میں ثالثی، غیر ملکی حکمرانی کے خلاف مشترکہ جدوجہد کو آگے بڑھانے بلکہ وقتاً فوقتاً اپنا قدم پیچھے ہٹا لینے میں بھی اہم رول ادا کیا۔

گاندھیائی کشش کا ایک تیسرا اہم پہلو ان کے سماجی تصورات سے تعلق رکھتا ہے جس کی بہت ہی واضح تشریح "ہند سوراج" (1909) میں کی گئی تھی۔ اس کتابچے میں جس بنیادی نکتہ پر زور دیا گیا تھا وہ یہ تھا کہ ہمارا اصل دشمن برطانوی سیاسی اقتدار کی بجائے جدید صنعتی تمدن ہے۔ 19ویں صدی کے وسط کے کارلائل اور رسکن جیسے انگریزی مصنفوں کے ذریعے صنعتیت (Industrialism) کے خلاف کی گئی رومانوی تنقید کو آگے بڑھاتے ہوئے گاندھی کا یہ کہنا تھا کہ محض سیاسی سوراج کا مطلب ہوگا: انگریزوں کے بغیر انگریزی راج!" یہ سمجھنا حماقت ہے کہ ہندوستانی Rockefeller امریکی Rockefeller سے بہتر ثابت ہوگا؛ ریلوں، وکیلوں اور

ڈاکٹروں نے ملک کو نادار بنادیا ہے۔ ریلوں کے ذریعے غذائی اجناس کی برآمد کاری کے نتیجے میں طاعون اور قحط کے واقعات میں اضافہ ہوا ہے۔ وکیلوں نے لالچ کی وجہ سے مقدمات کو طول دیا ہے اور عدالتوں پر اپنا اثر ورسوخ قائم کر کے انگریزی حکمرانی کو مضبوط کیا ہے، اسی طرح مغربی ملکوں کی دوائیں بہت مہنگی ہوتی ہیں اور صحت مندی کے قدرتی طریقوں کو نقصان پہونچاتی ہیں۔ اس کتابچے کے مرکزی حصے میں کہا گیا ہے کہ "ہندوستان کی نجات اس میں ہے کہ کم وبیش پچاس برسوں میں جو کچھ بھی سیکھا گیا ہے اسے ذہن سے مٹادیا جائے۔ ریل، ٹیلی گراف (تار)، اسپتالوں، وکیلوں، ڈاکٹروں اور ان جیسے دوسرے پیشہ ور لوگوں کو چلتا کرنا ہوگا" اور "نام نہاد اعلا طبقات کو پورے شعور اور ایمانداری کے ساتھ کسانوں جیسی سادہ زندگی گزارنے کا طریقہ سیکھنا ہوگا۔"

'ہند سوراج' میں جس گاندھیائی سماجی نظریے کا خاکہ پیش کیا گیا وہ بلاشبہ نہ صرف یہ کہ ایک غیر حقیقت پسندانہ تصور ہے بلکہ ہندوستان یا پوری دنیا کے مسائل کے حتمی تدارک کے لحاظ سے بھی ایک تحقیق مخالف رویہ تھا۔ یہ تصور شہری علاقوں کے ان اعلا تعلیم یافتہ طبقات کے لیے بھی بھی پرکشش نہیں رہا جو کہ آگے جاکر 1930 اور 1940 کی دہائیوں میں صنعت کاری پر مبنی سرمایہ دارانہ یا اشتراکی (Socialist) حل کی طرف راغب ہونے والے تھے۔ البتہ اس نظریے نے بطور خاص نو آبادیاتی حالات میں چل رہی جدید کاری کے دور رس انحرافی اثرات کی مزاحمت کی یقیناً کوشش کی۔ کارخانہ جاتی صنعتوں کی وجہ سے تباہ حال دست کاروں کے لیے اور ان کسانوں کے لیے جن کے لیے عدالتیں ٹھگے جانے کے سازشی اڈوں کی حیثیت حاصل کر گئی تھیں، اور جن کے لیے علاج کی غرض سے اسپتال جانا سزائے موت کو دعوت دینے کے مترادف تھا، بلکہ یہاں تک کہ چھوٹے شہروں اور دیہی علاقوں کے ان پڑھے لکھے لوگوں کے لیے بھی، جنھیں تعلیم کی وجہ سے چند فوائد حاصل ہو چکے تھے، یہ صنعت مخالف نظریہ کم از کم تھوڑے ہی عرصہ کے لیے کشش کا باعث ثابت ہوا تھا۔ گاندھی نے ہندوستان لوٹنے پر کھادی، گاؤں کی تعمیر نو، اور کچھ عرصہ بعد ہریجن بہبود، کے پروگراموں کے ذریعے اپنے پیغام کو مرکزی شکل دینے کی کوشش کی۔ بہر حال ایک بار پھر ان میں سے کوئی بھی طریقۂ کار سماجی یا معاشی تعلقات میں تبدیلی کے نقطۂ نظر سے مسائل کے حل میں کامیاب ثابت نہیں ہوا۔ لیکن جب گاندھی کے سچے پیروکاروں نے پوری سنجیدگی اور لگن کے ساتھ ان طریقوں کو بروئے کار لانے کی کوشش کی تو انھیں دیہی عوام کی حالت میں بہتری لانے میں کسی حد تک کامیابی حاصل ہوئی۔ اس طرح سودیشی تحریک کے زمانے میں 'خود انحصاری' اور "اپنی مدد آپ" کا پیغام وسیع تر ابعاد حاصل کر گیا۔ تیسرے درجے میں سفر، آسان ہندوستانی زبان میں گفتگو، 1912 کے بعد صرف لنگوٹی کا استعمال اور تلسی داس کی رامائین سے اقتباس کا حوالہ اور ان جیسے دوسرے سیاسی انداز کی وجہ سے کسانوں کے اندر گاندھی کے تئیں

کشش میں کافی مدد ملی۔ جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے تو اس طریقۂ کار کے نتیجے میں کچھ مشکلات بھی پیدا ہوئیں جو بعد میں کافی اہم نوعیت اختیار کر گئیں۔

افواہوں کی کار فرمائی

تاہم حقیقت یہ ہے کہ گاندھیائی تحریک کے طول و عرض کی وضاحت محض گاندھی کے ذاتی تصورات، اقوال و افعال کی ہی روشنی میں نہیں کی جا سکتی۔ اس سلسلے میں ہمیں ایک ایسے معاشرے میں جو زیادہ تر ناخواندہ افراد پر مشتمل تھا اور سنگین قسم کے دباؤ اور کشیدگیوں سے گزر رہا تھا، افواہوں کے رول کو بھی سمجھنا ہوگا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستانی عوام کے مختلف حصوں نے گاندھی کے بارے میں اپنے تصورات اپنے اپنے مصائب اور اپنی اپنی امیدوں کے لحاظ سے قائم کئے تھے؛ ایسا خاص طور پر شروع کے ان دنوں میں ہوا جب گاندھی عوام سے بہت دور تھے اور ان کی بابت لوگوں کا تصور کافی مبہم تھا۔ ان کی بابت جس طرح کی باتیں پھیل رہی تھیں اُن سے ایک ایسی متبرک اور برگزیدہ شخصیت کا تصور ابھرتا تھا جو غیبی طاقتوں اور کرشموں کی حامل تھی۔ چنانچہ ان کی بابت کسانوں کا یہ تصور تھا کہ گاندھی زمینداروں کے ذریعے استحصال کو ختم کر دیں گے، یوپی کے زرعی مزدوروں کو یہ یقین تھا کہ وہ انھیں زمین کے مالکانہ حقوق دلا دیں گے (سکریٹری آف اسٹیٹ کے نام وائسرائے کا مکتوب 13 اکتوبر 1921) اور آسام کے چائے مزدوروں نے یہ کہتے ہوئے کہ وہ گاندھی کے حکم پر عمل کر رہے ہیں، چائے باغات کو اجتماعی طور پر چھوڑ دیا تھا۔ الہ آباد ضلع میں جنوری 1921 میں کسان تحریک کی بابت سی آئی ڈی رپورٹ میں بھی یہی بات کافی تفصیل کے ساتھ کہی گئی تھی "دور دراز علاقوں میں بھی گاندھی کا نام جس طرح پھیلتا جا رہا ہے وہ ایک حیرت ناک بات ہے، اگرچہ کوئی بھی واضح طور پر یہ نہیں جانتا کہ وہ کون ہیں اور کیا ہیں، پھر بھی یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ وہ جو بھی کہتے ہیں وہی ہوتا ہے، وہ جو بھی حکم دیتے ہیں اس پر ہر حال میں عمل ہوتا ہے"۔ وہ مہاتما ہوں یا سادھو، یا پنڈت ہوں یا براہمن، جو بھی ہوں، الہ آباد میں بلکہ دیوتا (Deota) میں رہتے ہیں، ان کے نام کی طاقت کے سلسلے شاید اس خیال تک پہونچتے ہیں کہ یہی وہ شخص ہے جس نے پرتاپ گڈھ میں بے دخلی (خلاف قانون انخلاء) پر روک لگوائی تھی..... ایک عام اصول کی رو سے گاندھی حکومت کے مخالف نہیں سمجھے جاتے تھے بلکہ وہ صرف زمینداروں کے خلاف تھے..... ہم گاندھی جی اور سرکار کے ساتھ ہیں" (ہوم پولٹیکل ڈپوزٹ۔ فروری 1921 نمبر 13) مذہب کی طرف جھکاؤ رکھنے والی گاندھی جیسی سیاسی قیادت اس وقت کی ایک تاریخی ضرورت تھی، اس بات کا اشارہ 1920 کی دہائی میں اس طرح کے مختلف علاقائی لیڈروں کے ابھرنے کی شکل میں بھی ملتا ہے۔ بنگال اور بہار کے کان مزدوروں کے درمیان سوامی وشوانند

اور سوامی درشانند، شمالی بہار میں سوامی ودیانند، پرتاب گڈھ میں بابارام چندر، راجستھان میں سوامی کمار انند، مہاراشٹر میں آنند سوامی اور آندھرا کے رامپا قبائلوں میں الوری سیتارام راجو قابلِ ذکر ہیں۔ شخصیت سازی کے عمل کی اس دوہری نوعیت پر زور دینے کی ضرورت ہے۔ جیسا کہ الہ آباد سی آئی ڈی کی رپورٹ سے بھی اشارہ ملتا ہے، کسان، گاندھی کے ایک انقلابی لیڈر اور زمیندار مخالف ہونے کی افواہ پھیلا رہے تھے اور اس کے ساتھ ہی وہ اپنے طور پر حاصل کردہ کامیابیوں کو بھی گاندھی سے ہی منسوب کر رہے تھے، کیونکہ اگر پرتاب گڈھ میں بے دخلی پر روک لگادی گئی تھی تو وہ دراصل بابارام چند جیسے مقامی لیڈروں کی قیادت میں کسان تحریک کا ہی نتیجہ تھی۔ جیسا کہ ہم آگے چل کر جائزہ لیں گے اس معاملے سے گاندھی کا یا کانگریس قیادت کا کوئی واسطہ نہیں تھا ۔ جیسا کہ 1923 میں اور اس کے بعد بھی بار بار دیکھنے میں آیا، مہاتما تحریک واپس لے لینے کا اعلان کر دیتے تھے اور عوام کی اکثریت ان کے اعلان کی پابندی کرتی تھی۔ کسان طبقے کو اب بھی اوپر سے ایک نجات دہندہ کے ذریعے اپنی نمائندگی کی ضرورت تھی۔ یہ ایک ایسی نازک حد بندی تھی جسے حال کے بعض وہ مورخین صحیح طور پر نہیں سمجھ سکے ہیں جو دیہی عوام میں وقتی طور پر پیدا ہونے والی انقلابی سرگرمی کے امکان کو اعلا طبقے کے مورخین کی تاریخ نویسی کے رد عمل میں رومانوی انداز میں پیش کرتے ہیں۔

وقت کے گزرنے کے ساتھ ساتھ Millenarian Vision بھی دھندہ پڑتا گیا بلکہ گاندھیائی کانگریس کے ڈسپلن اور تنظیم کے بوجھ تلے دبتا چلا گیا۔

چمپارن، کھیڑا، احمد آباد

گاندھی جنوبی افریقہ میں جزوی کامیابی حاصل کرنے کے بعد 1915 میں واپس لوٹ آئے۔ Smuts کے انڈین ریلیف ایکٹ جون 1914 کی رو سے 3 پونڈ ٹیکس کا خاتمہ ہو گیا تھا اور ہندوستانی شادیوں کو تسلیم کرنے کا فیصلہ کر لیا گیا تھا مگر امتیازی سلوک یقیناً کم نہیں ہوا تھا اور نسل پرستوں کے ذریعے ہندوستانیوں اور افریقیوں کے استحصال کے معاملے کو ابھی ہاتھ بھی نہیں لگایا گیا تھا۔ اگلے تین برسوں میں گاندھی ایک ایسے شخص کے طور پر مشہور ہو گئے جو مقامی نوعیت کے غلط کاموں (چمپارن کے نیل کاشت کاروں، احمد آباد کے کپڑا مل کے ورکروں اور کھیڑا کے کسانوں کے معاملوں) کو اپنے ہاتھ میں لیتے ہیں اور ان کے سلسلے میں کوئی نہ کوئی ٹھوس کامیابی حاصل کر لیتے ہیں یعنی ایک ایسا سیاسی انداز کار، جو کہ کانگریس (اور ہوم رول لیگ) کے متعینہ طریقہ کار کے بالکل برعکس تھا، کیونکہ کانگریس اور ہوم رول لیگ عام طور پر مجرد نوعیت کے کل ہند معاملے یا پروگرام اپناتے تھے اور تحریک کا سلسلہ اعلا طبقے سے ادنیٰ طبقے کی طرف پیش رفت کرتا تھا۔ جو تجربہ

براؤن کا کہنا ہے کہ ان ابتدائی تحریکوں کی اہمیت ان "شکمی ٹھیکیداروں" کی بھرتی میں مضمر تھی جو زندگی بھر گاندھی کے مددگار کے طور پر کام کرتے رہے۔ ان میں راجندر پرساد، انوگرہ نارائن سنہا اور جے بی کرپلانی (چمپارن میں)، یا گجرات کی دو تحریکوں میں ولبھ بھائی پٹیل، مہادیو ڈیسائی، اندر لال یاجنک اور شنکر لال بینکر قابل ذکر ہیں لیکن خود ان کی اپنی اور دوسروں کی تحریروں سے دونوں اہم ابعاد کا بھی پتہ چلتا ہے۔ ہر معاملے میں نچلے طبقات کا دباؤ بھی ہوتا تھا بعض اوقات Millenarain Appeal بھی ہوتی تھی اور متحملانہ رول کے اولیں اشارے بھی ہوتے تھے۔

جیسا کہ پہلے ذکر کیا جاچکا ہے چمپارن میں نیل کی کاشت کرنے والوں کے خلاف جذبات اور ایجی ٹیشن کی ایک طویل تاریخ رہی تھی۔ جیکوئی Pouchepadass نے اپنے تفصیلی تجزیے میں یہ واضح کیا ہے کہ کسانوں کو متحرک کرنے میں علاقے کے گاندھیائی مددگاروں (راجندر پرساد اور اے۔ این سنہا جیسے وکیلوں یا برج کشور پرساد یا مظفر پور کالج کے لیکچرر جے۔ بی کرپلانی۔ جو دراصل براؤن کے شکمی ٹھیکیداروں) کی بجائے متمول اور متوسط درجے کے کسانوں (راج کمار شکلا جو کہ گاندھی کو مدعو کرنے کے لیے لکھنؤ گئے تھے، اور سنت راوت اور کھیندر رائے)، مقامی مہاجنوں اور بیوپاریوں نے (جنھوں نے مہاجنی (Moneylendring) اور بیوپار میں پلانٹروں کی مقابلہ بازی کے خلاف آواز بلند کی تھی)، گاؤں کے مختاروں اور اسکول کے ٹیچروں (پیر محمد، ہربنس سہائے) نے اہم رول ادا کیا تھا۔ بادی النظر میں خود گاندھی کا اپنا رول، ستیہ گرہ کی دھمکی پر علاقے میں داخلے پر عائد پابندی اٹھالیے جانے کے بعد، جنوری 1917 میں ایک انکوائری کمیٹی قائم کرانے اور چمپارن کے نیل کاشت کاروں کے مصائب کی کل ہند پیمانے پر تشہیر کرانے تک ہی محدود رہا تھا۔ اس انکوائری اور پبلسٹی کے نتیجے میں تن کٹھیا کا خاتمہ ہو گیا تھا۔ تاہم اس کا نفسیاتی اثر ٹھوس سرگرمیوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ تھا۔ چنانچہ 29 اپریل 1917 کو بیتیا کے ایس۔ ڈی او نے رپورٹ دی تھی کہ "رعیت گاندھی کا موازنہ رام چندر سے کرنے لگی تھی اور انکوائری کمیٹی کے سامنے یہ اعلان کیا تھا کہ لگان دار (Tenents) راکھشسوں (پلانٹروں) سے نہیں ڈریں گے، کیونکہ گاندھی ان کے بیچ موجود ہیں۔ اس طرح کی افواہیں تھیں کہ گاندھی کو وائسرائے یا تاج برطانیہ نے افسروں اور پلانٹروں کے فیصلوں کو مسترد کرنے کے لیے بھیجا ہے۔ یہ بھی افواہ تھی کہ انگریز چند ماہ کے اندر اندر چمپارن سے چلے جائیں گے...... بہر حال گاندھیائی حد بندی سے باہر کچھ تشدد پسند عناصر بھی تھے۔ مثلاً نیل کی فیکٹریوں پر حملوں اور آتش زنی کے واقعات بھی ہوئے تھے۔ 1917 کے اواخر تک تو کسان اس تخفیف شدہ شرح بیشی کو بھی ادا کرنے سے انکار کرنے لگے تھے جسے گاندھی کے ساتھ کئے گئے سمجھوتے میں تسلیم کیا جاچکا تھا۔ گاندھی اپنے پیچھے 15 رضاکاروں کا ایک ایسا گروپ چھوڑ گئے جس نے گاؤں میں تعمیری کام شروع کرنے کی کوشش کی اور راجندر پرساد سے کہا کہ مسائل

کا حقیقی حل یہ ہے کہ رعیت کو تعلیم یافتہ بنایا جائے اور رعیت نیز پلانٹروں کے درمیان مصالحت کا عمل مسلسل جاری رکھا جائے۔ مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس طرح کی کوئی کوشش خصوصاً چمپارن میں کامیاب نہیں ہوئی جہاں گاؤں کی سطح کے صرف 3 ورکر ہی مئی 1918 تک سرگرم رہے تھے۔

گجرات کے ضلع کھیڑا میں گاندھی کی مداخلت نسبتاً زیادہ دوامی شکل میں کامیاب رہی۔ یہ ایک نسبتاً زیادہ خوش حال علاقہ تھا جہاں کے کا بنی پٹی دار کسان قریب کے احمد آباد کے لیے غذائی اجناس، کپاس اور تمباکو پیدا کرتے تھے...... بہت سے پٹی دار تاجروں کی شکل میں جنوبی افریقہ چلے گئے تھے اور ان میں پرائمری تعلیم کی حالت بہت اچھی تھی۔ جیسا کہ ڈیوڈ ہارڈی مین نے بھی کھیڑا سے متعلق اپنے تفصیلی مطالعے میں ذکر کیا ہے، اس علاقے میں 19ویں صدی کے اواخر کے "عہد زریں" کے بعد علاقے کے لوگوں کو بار بار قحط سالی اور طاعون (1899) کا عذاب جھیلنا پڑا تھا۔ اور لگان (جس میں کبھی مشکل سے ہی تخفیف ہوتی تھی) کی ادائیگی بہت مشکل ہو گئی تھی، سب سے زیادہ متاثرہ چھوٹے پٹی دار تھے جو گاؤں میں اپنی ذات کے اندر بھی شادی بیاہ کے معاملے میں سب سے نچلی سطح پر تھے جب کہ بڑے پٹی دار جہیز وغیرہ کی شکل میں اضافی دولت اکٹھا کر لیتے تھے اور قریب کی بڑودہ ریاست میں غیر فوجی ملازمت بھی حاصل کر لیتے تھے۔ یہ وہ سابق الذکر ہی گروپ تھا جس نے آگے چل کر گاندھیائی قوم پرستی کی مستقل تائید اور حمایت کی۔ 18-1917 میں ایک طرف تو بہت خراب فصل ہوئی اور دوسری طرف مٹی کے تیل، لوہے کے برتن، اور سامان، کپڑے اور نمک وغیرہ کے دام بہت بڑھ گئے تھے اور نچلی ذات کے وہ بریا جن سے کھیڑا کے پٹی دار زرعی مزدور کا کام لیتے تھے، اپنی اجرت بڑھوانے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ اپریل 1918 میں ایک پٹی دار کا یہ کہنا تھا کہ "اب ہمیں فی مزدور چھ آنے ادا کرنے پڑتے ہیں جب کہ پہلے صرف تین آنے ہی دینے پڑتے تھے"۔ فصل خراب ہونے کے تعلق سے لگان میں کمی کے معاملے پر زور دینے کے لیے، لگان ادا نہ کرنے کی پہل گاندھی یا احمد آباد کے سیاست دانوں کی بجائے نومبر 1917 میں کھیڑا کے Kapadvang تعلقہ کے موہن لال پانڈیا جیسے مقامی گاؤں لیڈر کی طرف سے ہوئی تھی۔ گاندھی نے تو یہ معاملہ کافی پس و پیش کے بعد 22 مارچ 1918 کو اپنے ہاتھ میں لیا تھا۔ گاندھی کی طرف سے اس سلسلے میں برتی گئی تاخیر غیر دانشمندانہ ثابت ہوئی کیونکہ تب تک زیادہ غریب کسانوں کو لگان کی ادائیگی کے لیے مجبور کیا جا چکا تھا۔ ربیع کی فصل اچھی ہونے کی وجہ سے لگان کی معافی کا مطالبہ بھی کافی کمزور پڑ چکا تھا۔ گاندھی کی پہلی حقیقی دیہی تحریک کھیڑا میں ہی شروع ہوئی جو کہ آخرکار ایک بہت ہی غیر مربوط معاملہ ثابت ہوئی تھی، کیونکہ اس سے ضلع کے کل 559 میں سے محض 70 گاؤں ہی متاثر ہوئے تھے۔ یہ تحریک محض ایک علامتی رعایت کے بعد بالآخر جون میں واپس لے لی گئی تھی۔ بہرحال آنے والے برسوں میں گاؤں میں کام مسلسل جاری

رہنے کے نتیجے میں گجرات میں ایک مضبوط گاندھیائی بنیاد کی تشکیل جاری رہی، خاص طور پر تمباکو اور ڈیری فارمنگ کے لحاظ سے کافی متمول آنند اور بورساڑ تعلقوں، نیز سورت کے باردولی تعلقے میں (جہاں کنورجی مہتہ کے پٹی دار یووک منڈل، کے ذریعے پہلے ہی شروع کیے گئے تعمیراتی کاموں میں گاندھیائی بھی شامل ہو گئے تھے) اس بنیاد کو کافی استحکام حاصل ہوا۔ گاندھی کے فلسفہ عدم تشدد میں پٹی داروں کے ایقان کی وجہ محض یہی نہیں تھی کہ ان لوگوں پر پر رواجی طور پر دشنو بھکتی کا اثر تھا، بلکہ اس کی اصل وجہ یہ حقیقت تھی کہ جائدادوں کے مالک ہونے کی وجہ سے یہ لوگ کسی بھی طرح کے تشدد پسندانہ انقلاب کے حق میں نہیں تھے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ کھیڑا ستیہ گرہ کے فوراً بعد ہی، پٹی داروں کے گھروں میں اُن برتوں کی ڈکیتیوں کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا جو یہ ظاہر یہ سمجھنے لگے تھے کہ انگریزوں کا امن و قانون کا نظام درہم برہم ہو چکا ہے۔ جیسا کہ جوڈتھ براؤن نے باور کرانے کی کوشش کی ہے، کسان خود اپنی سوچ رکھتے تھے اور محض گاندھی کی کٹھ پتلی کے طور پر کام نہیں کر رہے تھے۔ اس کا ثبوت اس بات سے بھی ملتا ہے کہ 1918 کے موسم گرما میں گاندھی اور ان کے پیروکاروں نے فوج میں بھرتی کے حق میں جو تحریک چلائی تھی اس کا ردعمل کھیڑا میں بہت ہی مایوس کن رہا تھا"۔ جن کسانوں نے پہلے ان لوگوں کا استقبال پھولوں کے ہاروں سے کیا تھا، بھرتی کے حق میں تحریک کے موقع پر انھیں کھانا پانی دینے سے بھی انکار کر دیا تھا" (حوالہ کے لیے ملاحظہ ہو:

Peasant Agitations in Khera District, Gujrat 1917-34

By Hardiman 1975, pp, 113,158, 151.)

چمپارن اور کھیڑا میں گورے پلانٹروں اور مالیہ افسروں کے خلاف تحریکوں کے برعکس فروری اور مارچ 1918 میں احمد آباد میں گاندھی کی مداخلت دراصل گجرات کے مل مالکان اور ان کے ورکروں کے درمیان تنازعے جیسے ایک خالصۃً داخلی نوعیت کے معاملے سے تعلق رکھتی تھی۔ کپڑا صنعت کے بے تاج بادشاہ امبالال سارابھائی نے ہی سب سے پہلے سابرمتی آشرم کے لیے مالی عطیہ دیا تھا جبکہ ان کی ہمشیرہ انوسویہ بہن گاندھی کی چیلی بن گئی تھیں اور ستیہ گرہ کے دوران کھیڑا کا دورہ کرتی رہی تھیں اور مل مزدوروں کے لیے شبینہ اسکولوں کا سلسلہ شروع کر رہی تھیں۔ اشیاء کی قیمتوں میں بڑھوتری کے زمانے میں مل مزدوروں نے 1917 کے 'طاعون بونس' کو ختم کرانے کی کوشش کی تھی جس پر گاندھی کی مداخلت کے باوجود بھی ٹکراؤ پیدا ہو گیا تھا۔ مزدوروں کا مطالبہ تھا کہ 'طاعون بونس' کی جگہ پر ان کی اجرتوں میں پچاس فیصد اضافہ کیا جائے جبکہ مل مالکان 20 فیصد اضافے کی پیش کش کر رہے تھے۔ گاندھی کی لیڈری میں مارچ 1918 کی ہڑتال اس لیے قابل ذکر ہے کہ اس میں گاندھی نے پہلی بار بھوک ہڑتال (15 مارچ سے) کا حربہ

استعمال کیا تھا۔ روایتی طور پر اس بھوک ہڑتال کا تذکرہ ورکروں کے حوصلے کو قائم رکھنے کی کوشش یا پرتشدد مظاہرے کے متبادل کے طور پر کیا جاتا ہے، کیونکہ اس وقت تک گاندھی پرتشدد مظاہرے کے طریقے سے تائب ہو چکے تھے :جب کہ جوڈتھ براؤن کی روایت کے مطابق اس سلسلے میں ضلع مجسٹریٹ کی رپورٹ سے بالکل ہی دوسری بات کا پتہ چلتا ہے۔ رپورٹ کے مطابق ورکروں نے ان کی (گاندھی کی) بے عزتی کی تھی کیونکہ مل مالکان کے ساتھ ان کی دوستی تھی۔ وہ مل مالکان کی کاروں میں سفر کرتے تھے اور ان کے ساتھ کافی اہتمام کے ساتھ کھاتے پیتے تھے جب کہ بنکر طبقہ فاقہ کشی کی حالت سے گزر رہا تھا...... اور یہ کہ گاندھی نے اس طرح کے طعنوں کی تاب نہ لا کر ہی بھوک ہڑتال شروع کی تھی"۔ بہر حال بھوک ہڑتال کا جو بھی مقصد رہا ہو، مگر اس کی وجہ سے مزدوروں کی اجرتوں میں 35 فی صد کے بقدر اضافہ کر دیا گیا تھا۔ 1920 کی ٹیکسٹائل لیبر ایسوسی ایشن کے وسیلے سے احمد آباد کے ورکروں پر گاندھی کی گرفت اور بھی مضبوط ہو گئی۔ یہ ایسوسی ایشن تنازعے کے پرامن تصفیے، محنت اور سرمائے کے باہمی انحصار کے فلسفے نیز اس تصور کی بنیاد پر قائم کی گئی تھی کہ مل مالکان کی حیثیت مالک کی نہیں بلکہ ورکروں کے ٹرسٹی کی ہو گی۔ احمد آباد کے مل مالکان کے ساتھ گاندھی کے بہت اچھے ذاتی تعلقات کی بدولت اس طرح کے طریقہ کار یہاں کامیاب ثابت ہوئے۔ بہر حال یہ بات بہت اہمیت رکھتی ہے کہ یہ گاندھیائی ماڈل، جس نے نہ صرف طبقاتی ٹکراؤ کے خطوط پر سیاست کاری کو، بلکہ تشدد پسندانہ معاشی جد و جہد کو بھی مسترد کر دیا تھا، اپنا دائرہ اثر احمد آباد سے ماوراء کبھی بھی وسیع نہیں کر سکا۔ گاندھی نے دوسرے قوم پرست لیڈروں کے برخلاف خود کو شروع سے ہی، جبکہ کمیونسٹ بھی اس سے دور ہی تھے، آل انڈیا ٹریڈ یونین کانگریس سے ہمیشہ الگ ہی رکھا۔ طبقاتی امن اور باہمی ہم آہنگی کا پیغام پرولتاری طبقوں کے مقابلے میں کسان طبقے میں زیادہ کامیاب ثابت ہوا، کیونکہ دیہی علاقوں میں استحصال کبھی کبھی پدرانہ زیادتی کا رنگ بھی اختیار کر لیتا تھا اور لگان یا نمک ٹیکس جیسے معاملات بھی ان میں اتحاد کا باعث ثابت ہوتے تھے۔

1919 کے اوائل تک کل ہند نوعیت کے امور میں گاندھی کی مداخلت نسبتاً بہت کم اور زیادہ تر اینی بیسنٹ کی گرفتاری کے خلاف احتجاج نیز علی برادران کی رہائی کے لیے اپیلوں تک ہی محدود رہی تھی۔ ان اپیلوں کے وسیلے سے انھوں نے لکھنؤ کے عبد الباری جیسے مسلم رہنماؤں کے ساتھ اہم رابطے قائم کرنے شروع کر دیے تھے۔ گاندھی نے اصلاحات کی تجویزوں میں بہت کم دلچسپی دکھائی جب کہ باقی دوسرے تمام لیڈر ان میں کافی دلچسپی لینے لگے تھے۔ فروری 1919 میں اشتعال انگیز طریقے پر رولٹ ایکٹ کے نفاذ نے انھیں پہلی بار کل ہند سطح پر ستیہ گرہ کی تحریک کی طرف راجع کر دیا تھا۔

رہنے کے نتیجے میں گجرات میں ایک مضبوط گاندھیائی بنیاد کی تشکیل جاری رہی، خاص طور پر تمباکو اور ڈیری فارمنگ کے لحاظ سے کافی متمول آنند اور بورساڑ تعلقوں، نیز سورت کے باردولی تعلقے میں (جہاں کنورجی مہتہ کے پٹی دار یووک منڈل، کے ذریعے پہلے ہی شروع کیے گئے تعمیراتی کاموں میں گاندھیائی بھی شامل ہو گئے تھے) اس بنیاد کو کافی استحکام حاصل ہوا۔ گاندھی کے فلسفہ عدم تشدد میں پٹی داروں کے ایقان کی وجہ محض یہی نہیں تھی کہ ان لوگوں پر پر روایتی طور پر دشنو بھکتی کا اثر تھا، بلکہ اس کی اصل وجہ یہ حقیقت تھی کہ جائدادوں کے مالک ہونے کی وجہ سے یہ لوگ کسی بھی طرح کے تشدد پسندانہ انقلاب کے حق میں نہیں تھے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ کھیڑا ستیہ گرہ کے فوراً بعد ہی، پٹی داروں کے گھروں میں اُن برتوں کی ڈکیتیوں کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا جو بہ ظاہر یہ سمجھنے لگے تھے کہ انگریزوں کا امن و قانون کا نظام درہم برہم ہو چکا ہے۔ جیسا کہ جوڈتھ براؤن نے باور کرانے کی کوشش کی ہے، کسان خود اپنی سوچ رکھتے تھے اور محض گاندھی کی کٹھ پتلی کے طور پر کام نہیں کر رہے تھے۔ اس کا ثبوت اس بات سے بھی ملتا ہے کہ 1918 کے موسم گرما میں گاندھی اور ان کے پیروکاروں نے فوج میں بھرتی کے حق میں جو تحریک چلائی تھی اس کا ردِ عمل کھیڑا میں بہت ہی مایوس کن رہا تھا"۔ جن کسانوں نے پہلے ان لوگوں کا استقبال پھولوں کے ہاروں سے کیا تھا، بھرتی کے حق میں تحریک کے موقع پر انھیں کھانا پانی دینے سے بھی انکار کر دیا تھا" (حوالہ کے لیے ملاحظہ ہو:

Peasant Agitations in Khera District, Gujrat 1917-34

By Hardiman 1975, pp, 113,158, 151.)

چمپارن اور کھیڑا میں گورے پلانٹروں اور مالیہ افسروں کے خلاف تحریکوں کے برعکس فروری اور مارچ 1918 میں احمد آباد میں گاندھی کی مداخلت دراصل گجرات کے مل مالکان اور ان کے ورکروں کے درمیان تنازعے جیسے ایک خالصۃً داخلی نوعیت کے معاملے سے تعلق رکھتی تھی۔ کپڑا صنعت کے بے تاج بادشاہ امبالال سارابھائی نے ہی سب سے پہلے سابرمتی آشرم کے لیے مالی عطیہ دیا تھا جبکہ ان کی ہمشیرہ انوسویہ بہن گاندھی کی چیلی بن گئی تھیں اور ستیہ گرہ کے دوران کھیڑا کا دورہ کرتی رہی تھیں اور مل مزدوروں کے لیے شبینہ اسکولوں کا سلسلہ شروع کر رہی تھیں۔ اشیاء کی قیمتوں میں بڑھوتری کے زمانے میں مل مزدوروں نے 1917 کے 'طاعون بونس' کو ختم کرانے کی کوشش کی تھی جس پر گاندھی کی مداخلت کے باوجود بھی ٹکراؤ پیدا ہو گیا تھا۔ مزدوروں کا مطالبہ تھا کہ 'طاعون بونس' کی جگہ پر ان کی اجرتوں میں پچاس فیصد اضافہ کیا جائے جبکہ مل مالکان 20 فیصد اضافے کی پیش کش کر رہے تھے۔ گاندھی کی لیڈری میں مارچ 1918 کی ہڑتال اس لیے قابلِ ذکر ہے کہ اس میں گاندھی نے پہلی بار بھوک ہڑتال (15 مارچ سے) کا حربہ

استعمال کیا تھا۔ روایتی طور پر اس بھوک ہڑتال کا تذکرہ ورکروں کے حوصلے کو قائم رکھنے کی کوشش یا پر تشدد مظاہرے کے متبادل کے طور پر کیا جاتا ہے، کیونکہ اس وقت تک گاندھی پر تشدد مظاہرے کے طریقے سے تائب ہو چکے تھے؛ جب کہ جوڈتھ براؤن کی روایت کے مطابق اس سلسلے میں ضلع مجسٹریٹ کی رپورٹ سے بالکل ہی دوسری بات کا پتہ چلتا ہے۔ "رپورٹ کے مطابق ورکروں نے ان کی (گاندھی کی) بے عزتی کی تھی کیونکہ مل مالکان کے ساتھ ان کی دوستی تھی۔ وہ مل مالکان کی کاروں میں سفر کرتے تھے اور ان کے ساتھ کافی اہتمام کے ساتھ کھاتے پیتے تھے جب کہ بنکر طبقہ فاقہ کشی کی حالت سے گزر رہا تھا......اور یہ کہ گاندھی نے اس طرح کے طعنوں کی تاب نہ لا کر ہی بھوک ہڑتال شروع کی تھی"۔ بہر حال بھوک ہڑتال کا جو بھی مقصد رہا ہو، مگر اس کی وجہ سے مزدوروں کی اجرتوں میں 35 فی صد کے بقدر اضافہ کر دیا گیا تھا۔ 1920 کی ٹیکسٹائل لیبر ایسوسی ایشن کے وسیلے سے احمد آباد کے ورکروں پر گاندھی کی گرفت اور بھی مضبوط ہو گئی۔ یہ ایسوسی ایشن تنازعے کے پرامن تصفیے، محنت اور سرمائے کے باہمی انحصار کے فلسفے نیز اس تصور کی بنیاد پر قائم کی گئی تھی کہ مل مالکان کی حیثیت مالک کی نہیں بلکہ ورکروں کے ٹرسٹی کی ہوگی۔ احمد آباد کے مل مالکان کے ساتھ گاندھی کے بہت اچھے ذاتی تعلقات کی بدولت اس طرح کے طریقہ کار یہاں کامیاب ثابت ہوئے۔ بہر حال یہ بات بہت اہمیت رکھتی ہے کہ یہ گاندھیائی ماڈل، جس نے نہ صرف طبقاتی ٹکراؤ کے خطوط پر سیاست کاری کو، بلکہ تشدد پسندانہ معاشی جدوجہد کو بھی مسترد کر دیا تھا، اپنا دائرہ اثر احمد آباد سے ماوراء کبھی بھی وسیع نہیں کر سکا۔ گاندھی نے دوسرے قوم پرست لیڈروں کے برخلاف خود کو شروع سے ہی، جبکہ کیمونسٹ بھی اس سے دور ہی تھے، آل انڈیا ٹریڈ یونین کانگریس سے ہمیشہ الگ ہی رکھا۔ طبقاتی امن اور باہمی ہم آہنگی کا پیغام پرولتاری طبقوں کے مقابلے میں کسان طبقے میں زیادہ کامیاب ثابت ہوا، کیونکہ دیہی علاقوں میں استحصال کبھی کبھی پدرانہ زیادتی کا رنگ بھی اختیار کر لیتا تھا اور لگان یا نمک ٹیکس جیسے معاملات بھی ان میں اتحاد کا باعث ثابت ہوتے تھے۔

1919 کے اوائل تک کل ہند نوعیت کے امور میں گاندھی کی مداخلت نسبتاً بہت کم اور زیادہ تر اینی بیسنٹ کی گرفتاری کے خلاف احتجاج نیز علی برادران کی رہائی کے لیے اپیلوں تک ہی محدود رہی تھی۔ ان اپیلوں کے وسیلے سے انھوں نے لکھنؤ کے عبد الباری جیسے مسلم رہنماؤں کے ساتھ اہم رابطے قائم کرنے شروع کر دیئے تھے۔ گاندھی نے اصلاحات کی تجویزوں میں بہت کم دلچسپی دکھائی جب کہ باقی دوسرے تمام لیڈران میں کافی دلچسپی لینے لگے تھے۔ فروری 1919 میں اشتعال انگیز طریقے پر رولٹ ایکٹ کے نفاذ نے انھیں پہلی بار کل ہند سطح پر ستیہ گرہ کی تحریک کی طرف راجع کر دیا تھا۔

رولٹ ستیہ گرہ

نام نہاد رولٹ ایکٹ (جو کہ جسٹس رولٹ کی سربراہی میں قائم کی گئی 1918 کی سیڈیشن کمیٹی کی بعض سفارشات پر مبنی تھا) پر امپیریل قانون ساز کونسل نے 6 فروری اور 18 مارچ کو بڑی جلد بازی کے ساتھ غور کر کے اور تمام غیر سرکاری ہندوستانی ممبروں کی متفقہ مخالفت کو مسترد کرتے ہوئے پاس کر دیا تھا۔ مقدمہ چلائے بغیر دو برس تک نظر بند رکھنے کے بندوبست کے ذریعے جنگ کے زمانے کی پابندی کو مستقل طور پر لاگو کرنے اور شہری حقوق کو دبانے کی کوشش کی گئی۔ اس طرح ایکٹ کے ذریعے ان سرکاری اور غیر سرکاری گوروں کی رائے کا لحاظ رکھنے کی کوشش بھی کی گئی تھی جو مونٹگو کے لبرل وعدوں اور دوہری حکومت (Diarchy) کے مخالف تھے۔ اس ایکٹ کے ساتھ ہی وائسرائے کی طرف سے یہ یقین دہانیاں بھی کرائی گئی تھیں کہ مجوزہ اصلاحات سے سول سروس اور برطانیہ کے تجارتی مفادات کو کوئی نقصان نہیں پہونچنے دیا جائے گا۔ ہندوستانی نقطہ نگاہ سے رولٹ ایکٹ براہ راست طور پر صرف سرگرم سیاست دانوں پر ہی اثر انداز ہو رہا تھا، لیکن پولس کو مزید اختیارات دیے جانے کے نتیجے میں بڑے پیمانے پر خدشات کا پیدا ہو جانا لازمی تھا، کیونکہ پولس پہلے ہی سے ظلم و زیادتی کے لیے کافی بدنام تھی۔

جہاں ہندوستان کے تمام سیاسی حلقوں نے رولٹ ایکٹ کی شدت سے مخالفت کی، وہیں اس سلسلے میں ایک ملک گیر اور قابل عمل احتجاج کے طریقۂ کار کے تعین کا کام گاندھی پر چھوڑ دیا گیا، یعنی ایک ایسا احتجاج جو محض عرضداشت تک ہی محدود بھی نہ رہے اور بے قابو یا تشدد پسندانہ رخ بھی اختیار نہ کرنے پائے۔ شروع میں یہ منصوبہ کافی اعتدال پسندانہ رہا جس کے تحت ممنوعہ تخلیقات کی عوامی سطح پر فروخت کاری کے ذریعے رضاکارانہ طور پر گرفتاری دی جاتی تھی۔ گاندھی نے 23 مارچ کو اس منصوبے میں توسیع کر کے اس میں ایک بہت ہی نادر اور انقلابی عنصر بھی شامل کر دیا اور اس طرح 30 مارچ کو کل ہند ہڑتال کا اعلان کر دیا گیا (جسے بعد میں 6 اپریل کے لیے ملتوی کر دیا گیا تھا)۔ بہرحال احتجاج کے اس پروگرام میں شروع سے ہی رکاوٹیں پیدا ہوتی رہی تھیں: مثلاً یہ ہڑتال دانستہ طور پر اتوار کے دن کے لیے طے کی گئی تھی اور گاندھی نے واضح طور پر یہ اعلان کیا تھا کہ "جن ملازمین کو اتوار کے دن بھی کام کرنا ہوتا ہے وہ اپنے آجرین سے پیشگی رخصت لے لینے کے بعد ہی اپنا کام معطل کر سکتے ہیں"۔ انھوں نے آریہ سماجی لیڈر سوامی شردھانند کی طرف سے پیش کی گئی لگان نہ دینے کی تجویز کو بھی مسترد کر دیا تھا (بھائی صاحب! آپ یہ مانیں گے کہ میں ستیہ گرہ کے بزنس کا ماہر ہوں")؛ اور بزرگ اعتدال پسند لیڈر دین شاہ واچا سے اپیل کی تھی کہ وہ ان کے پروگرام کو قبول کر لیں اور دلیل یہ دی تھی کہ "ابھرتی ہوئی نسل

عرضداشت وغیرہ سے مطمئن نہیں ہوگی...... ستیہ گرہ ہی...... میرے خیال میں...... دہشت پسندی کو روکنے کا واحد راستہ ہے" (مکتوب بنام واچا 25 فروری 1919)۔

گاندھی نے اپنے ستیہ گرہ کو منظم کرنے کے سلسلے میں تین قسم کے سیاسی نیٹ ورک۔ ہوم رول لیگ، محض اصلاح پسند گروپ اور ستیہ گرہ سبھا، جسے کہ خود انھوں نے ہی 29 فروری کو بمبئی میں شروع کیا تھا، کو بروئے کار لانے کی کوشش کی۔ دونوں ہوم رول لیگوں کے نوعمر اور انقلابی قسم کے ممبروں کو ایک نئے لیڈر کی تلاش تھی، کیونکہ اینی بیسنٹ اچانک ہی اعتدال پسندی کے راستے پر چل پڑی تھیں (کانگریس کے دہلی اجلاس 1918 میں مونٹفورڈ اصلاحات کی تائید کرنے پر حاضرین نے ہنگامہ کر کے انھیں بولنے سے روک دیا تھا) جب کہ تلک ستمبر 1918 میں انگلینڈ چلے گئے تھے۔ بمبئی میں اینی بیسنٹ کی ہوم رول لیگ کے جمنا داس دوار کا داس، شنکر لال بینکر، عمر سبحانی، اور بی جی ہورنی مین جیسے جوشیلے لیڈر ہی ستیہ گرہ سبھا کے لیے زیادہ تر ارکان اور مالیات فراہم کرتے تھے۔ تلک کے کچھ نوعمر پیروکار بھی گاندھی کے ساتھ آ ملے تھے، حالانکہ تلک کے، این سی کیلکر اور جی، ایس کھپارڈے جیسے اہم ترین مددگار الگ تھلک ہی رہے تھے۔ گاندھی نے چند مسلم لیڈروں کے ساتھ بھی بہت استوار رابطے قائم کر رکھے تھے، اور خاص طور پر لکھنؤ میں علماء کے فرنگی محلی گروپ کے مولانا عبدالباری کے ساتھ ان کے پختہ مراسم قائم ہو چکے تھے، جو کہ علی برادران کے پیر و مرشد تھے اور علی برادران ابھی تک جیل میں نظر بند تھے۔ عثمانیہ ترکی کو شکست ہو چکی تھی اور اتحادی ممالک معاہدہ امن کے بارے میں انتہائی سخت شرطوں کی افواہیں پھیلا رہے تھے جن کے نتیجے میں ترکی کے سلطان خلیفہ کے مستقبل کے سلسلے میں ہندوستانی مسلمانوں میں بے چینی بڑھ رہی تھی۔ مسلم لیگ کے دہلی اجلاس (دسمبر 1918) میں قیادت میں ایک اہم تبدیلی دیکھنے میں آئی۔ کیونکہ ینگ پارٹی کے ایک نسبتاً زیادہ اعتدال پسند حلقے (وزیر حسن آف محمود آباد)، کو، جو کہ مونٹفورڈ اصلاحات کو تسلیم کر لینے کے حق میں تھا، انصاری جیسے نسبتاً زیادہ انقلابی لیڈروں اور عبدالباری کے ذریعے داخل کیے گئے علماء گروپ نے بے دخل کر دیا تھا۔ اس اجلاس میں انصاری نے گاندھی کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے انھیں "ہندوستان کا ایک ایسا جری لیڈر بتایا تھا...... جو کہ...... ہندوؤں اور مسلمانوں، دونوں میں مقبول تھا" اور مولانا عبدالباری نے مارچ 1917 کے وسط میں گاندھی سے ملاقات کے بعد رولٹ ایکٹ کے خلاف ستیہ گرہ کی حمایت کا فیصلہ کیا تھا۔

تحریک کے لیے خصوصی طور پر شروع کی گئی تنظیم، ستیہ گرہ سبھا، نے اپنی ساری توجہ پروپیگنڈہ لٹریچر کے نشر و اشاعت اور ستیہ گرہ کے عہد نامے پر لوگوں کے دستخط کرانے پر مرکوز رکھی جبکہ گاندھی نے مارچ کے آخر اور اپریل کے اوائل کے دوران ایک ملک گیر دورہ شروع کرتے ہوئے

بمبئی ، دہلی ، الہ آباد، لکھنؤ نیز جنوبی ہند کے متعدد شہروں کا سفر کیا۔ کانگریس تصویر میں کہیں نہیں تھی۔ پھر یہ کہ احتجاجی سیاست کے لیے ملک کے بیشتر حصوں میں کانگریس کی اپنی کوئی مشینری بھی نہیں تھی۔ اور جہاں اس طرح کی کوئی مشینری تھی بھی وہاں بنگال اور مہاراشٹر کے ماہرین اقتصادیات کے قدیم نیٹ ورک جیسے عوامل کی وجہ سے گاندھی کی مزاحمت بہت زیادہ ہوئی۔

ان تمام باتوں سے جو حقیقت ابھر کر سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ اس سلسلے میں تنظیمی تیاریاں بہت ہی محدود اور کافی حد تک غیر مربوط بھی تھیں اور اُس طوفان کے لحاظ سے قطعی ناکافی تھیں جو اپریل 1919 میں اٹھا تھا اور 1857 کے بعد برطانوی ہند میں انگریزوں کے خلاف سب سے بڑی شورش کی شکل اختیار کر گیا تھا۔ ستیہ گرہ عہد نامے پر دستخط کرنے والوں کی تعداد مارچ کے وسط میں محض 982 تھی جن میں 397 بمبئی شہر میں 400 گجرات میں 101، سندھ میں اور بمبئی پریزیڈنسی کے علاقے سے باہر محض 84 تھے۔ جو صوبہ آگے چل کر سب سے زیادہ متاثر ہوا، یعنی پنجاب میں ہوم رول لیگ کا نیٹ ورک سب سے کمزور تھا جس کی وجہ جنگ کے زمانے کی پابندیاں تھیں اور حالات کے زیادہ بگڑ جانے سے پہلے گاندھی بھی ان علاقوں کا دورہ نہیں کر سکے تھے۔

ہنٹر کمیشن کی رپورٹ نیز کانگریس کی پنجاب انکوائری کمیٹی کی رپورٹوں (1920) اور حال ہی میں اروند کمار کے ذریعے مرتب کئے گئے انتہائی اہم مقالات (Essays on Gandhian Politics) سے ہمارے سامنے ایک اتھل پتھل کی تصویر ابھرتی ہے جو کہ جنگ کے بعد کی معاشی مشکلات، گاندھی سے متعلق افواہوں، سرکاری اشتعال انگیزی اور خاص طور پر پنجاب میں ظلم و تعدی کا نتیجہ تھی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ تحریک مکمل طور پر شہروں تک ہی محدود رہی تھی اور صنعتی مزدوروں سے کہیں زیادہ نچلے متوسط طبقوں کے لوگ اور دست کار اہمیت حاصل کر گئے تھے۔ 30 مارچ اور 6 اپریل کو ہندوستان کے بیشتر شہروں میں ہڑتال رہی تھی اور جن مقامات پر لازمی طور پر گڑبڑ بھی ہوئی ان میں پنجاب میں امرت سر، گجرانوالہ، اور دوسرے متعدد شہر، گجرات میں احمد آباد، ویرمنگم، اور نادیاڈ، بمبئی، دہلی اور کسی حد تک کلکتہ قابل ذکر ہیں۔ فوج میں جبریہ بھرتی، جنگ کے نام پر زائد وصولی نیز 1915 کے غدر کے بعد توڑے گئے ظلم و ستم، اور تعلیم یافتہ گروپوں کے ساتھ بھونڈے برتاؤ (جس پر کانگریس کی تحقیقاتی رپورٹ میں مبالغے کے ساتھ زور دیا گیا تھا) جیسے واقعات کی وجہ سے پنجاب میں لفٹنٹ گورنر او۔ ڈائر کا انتظامیہ 1919 سے کافی پہلے ہی نامقبول ہو چکا تھا۔ لاہور کے سلسلے میں اروند کمار کے دقیق تجزیے سے مزید خصوصی عوامل کی نشان دہی ہوتی ہے۔ 1917 اور 1919 کی درمیانی مدت میں غذائی اجناس کی قیمتوں میں 100 فی صد تک اضافہ ہوا تھا، جب کہ دست کاروں کی اجرت میں محض 20،25 فی صد بڑھوتری ہوئی تھی۔ 1913 میں پنجاب کے سب سے اونچے سودیشی ہر کشن لال کے پیوپلز بنک کے زوال میں او۔ ڈائر نے

سرگرم رول ادا کیا تھا جس کی وجہ سے لاہور کی غالب ہندو بیوپاری برادری کی معاشی امنگوں کو بھاری دھکا پہونچا تھا۔ آریہ سماج پیر منڈوں کے ذریعے انگریز مخالف سیاسی تصورات کو فروغ حاصل ہو رہا تھا اور صحافی ظفر علی خاں، بلکہ سب سے بڑھ کر اقبال کی ابتدائی دور کی قوم پرستانہ شاعری سے تحریک پاکر مسلمانوں میں بھی بیداری پیدا ہو رہی تھی۔

جس بات سے او۔ ڈائر اور دوسرے انگریز سب سے زیادہ خوف زدہ ہو گئے تھے وہ 1919 کا ہندو مسلم، سکھ اتحاد تھا۔ یہ اتحاد ایک ایسے صوبے میں نمایاں ہو رہا تھا، جو اس سے پہلے بھی اور بعد میں بھی فرقہ وارانہ نفاق کے لیے بدنام تھا۔ امرت سر میں 30 مارچ اور 6 اپریل کی ہڑتالیں پرامن رہنے کے ساتھ ساتھ کافی کامیاب رہی تھیں جن میں لوگوں نے بڑی تعداد میں حصہ لیا تھا۔ 9 اپریل کا رام نوی کا جلوس، جس کے بارے میں بعد میں ہنٹر کمیشن نے یہ کہا تھا کہ اس میں بہت بڑی تعداد میں مسلمانوں نے بھی حصہ لیا تھا، ہندو مسلم اتحاد کو فروغ دینے کا ایک نمایاں مظاہرہ تھا۔ مختلف فرقوں کے لوگ ایک ہی گلاس یا پیالے سے پانی پیتے تھے۔ امرت سر کے مقامی رہنماؤں کچلو اور ستیہ پال کو اسی شام شہر بدر کر دیا گیا تھا اور دہلی نیز پنجاب میں گاندھی کے داخلے پر پابندی کے احکام جاری کر دیے گئے تھے۔ 10 اپریل کو امرت سر میں ہال برج کے پرامن مظاہرین پر فائرنگ کی گئی جس کے بعد برطانوی اقتدار کی علامتوں، بنکوں، ڈاک خانوں، ریل اسٹیشنوں اور ٹاؤن ہال پر حملے ہوئے۔ 11 اپریل کو شہر میں مارشل لا لگا دیا گیا اور جنرل ڈائر نے کمان اپنے ہاتھ میں لے لی۔ 13 اپریل کو بڑی تعداد میں گاؤں کے لوگوں پر مشتمل ایک پرامن اور غیر مسلح بھیڑ پر جو کہ ایک میلے میں شرکت کی غرض سے شہر میں آئی تھی اور جسے ہر طرح کے اجتماع یا جلسے جلوس پر پابندی کے بارے میں کچھ بتایا نہیں گیا تھا، ایک محصور میدان - جلیاں والا باغ میں، جنرل ڈائر نے کسی وارننگ کے بغیر ہلہ بول دیا تھا۔ بعد میں ہلاک شدگان کی تعداد سرکاری طور پر 379 بتائی گئی تھی جبکہ غیر سرکاری اندازے کے مطابق اس سے کہیں زیادہ لوگ مارے گئے تھے۔ ڈائر نے ہنٹر کمیشن کے سامنے بس یہی معذرت کی تھی کہ "اس کے سپاہیوں کے پاس گولیاں کم پڑ گئیں تھیں اور راستے تنگ ہونے کی وجہ سے مسلح گاڑی اندر نہیں لے جائی جا سکی تھی؛ سوال بھیڑ کو منتشر کرنے کا نہیں بلکہ اخلاقی اثر پیدا کرنے کا تھا"۔ جنرل ڈائر نے بعد میں بھی ہفتوں لفٹنٹ گورنر کی مکمل تائید اور مدد سے اندھا دھند گرفتاریوں، اذیت رسانی، خصوصی عدالتوں کے ذریعے سرعام سزا دہی، مار پیٹ کا کام لینے کے لیے وکیلوں کی بطور اسپیشل کانسٹبل بھرتی، تمام صاحبوں (گوروں) کو مقامی لوگوں سے سلام کرانے اور کوچہ کوچان والا میں (جہاں ایک گوری عورت کی بے عزتی کی گئی تھی) ہندوستانیوں سے ناک رگڑوانے کا سلسلہ جاری رکھا تھا تاکہ اخلاقی اثر قائم کیا جا سکے۔

6 اور 9 اپریل کو لاہور میں بھی پرامن ہڑتالوں اور مظاہروں کے ذریعے ایک بار پھر فرقہ

وارانہ اتحاد کا ثبوت دیا گیا۔ گاندھی کی گرفتاری کی افواہ اور امرت سر کے واقعات کی خبر پہونچنے پر 10 اپریل کو پولس کے ساتھ پر تشدد ٹکراؤ کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ مسلم دست کاروں اور ورکروں نے بطور خاص تشدد کا مظاہرہ کیا جبکہ رام بھج جیسے جے جمائے لیڈروں نے بھیڑ کو قابو میں رکھنے کی پوری کوشش کی۔ 11 اپریل کو مغل پورہ ریلوے ورکشاپ (جس میں 12,000 لوگ ملازم تھے) میں ہڑتال کر دی گئی اور صورت حال اس حد تک سنگین ہو گئی کہ انگریز شہر چھوڑ کر چھاونی کے علاقے میں چلے گئے۔ بادشاہی مسجد کے ایک عظیم الشان اجتماع میں ایک پیوپلز کمیٹی کی تشکیل کی توثیق کی گئی جس کا 11 سے 14 اپریل تک شہر پر مکمل کنٹرول رہا تھا۔ بہر حال اس کمیٹی میں زیادہ تر دوسرے درجے کے ہی سیاست داں شامل تھے جو یہ نہیں جانتے تھے کہ اچانک ہاتھ آجانے والے اقتدار کا وہ کیا کریں! یہ لوگ دباؤ کی سیاست کے عادی تھے، اور اس طرح کے انقلاب کے لیے یقیناً تیار نہیں تھے۔ اس لیے ہڑتال کے دوران لوگوں کو کھانا فراہم کرنے کی غرض سے چند مطبخ کا انتظام کرنے سے زیادہ کچھ نہیں کر سکے تھے۔ جب 13 اپریل کو ٹاؤن ہال کی میٹنگ میں ان لوگوں نے ہڑتال واپس لینے کی کوشش کی تو عوام نے اس کی زبردست مخالفت کر کے ناکام کر دیا۔ تھوڑے سے وقت کے لیے ایک متبادل اور شدت پسند قیادت کے کچھ آثار پیدا ہو گئے تھے۔ چمن دین کی کمان میں 140 افراد پر مشتمل ایک "ڈنڈا فوج" نے لاٹھیوں اور بچوں کے کھیلنے کے طمنچوں کے ساتھ سڑکوں پر مارچ کیا اور شہر میں اشتعال انگیز پوسٹر لگائے۔ "اے ہندو، مسلمان اور سکھ بھائیو! فوراً ڈنڈا فوج میں بھرتی ہو جایئے اور انگریز بندروں کا بہادری سے مقابلہ کیجیے، دفاتر اور ورکشاپ بند کر دو اور لڑتے رہو، یہ مہاتما گاندھی کا حکم ہے"۔ انگریز 14 اپریل کو بھاری طاقت کے ساتھ پلٹے۔ پیوپلز کمیٹی کے لیڈروں کو شہر بدر کر دیا گیا اور مارشل لا کے ذریعے عوامی تحریک کو کچل دیا گیا۔ پنجاب کے پانچ اضلاع، امرت سر، لاہور، گجرانوالہ، گجرات اور لائل پور رولٹ ایکٹ کے ہنگاموں سے بری طرح متاثر ہوئے تھے۔ گجرات، گجرانوالہ، لاہور اور امرت سر کو دہلی سے جوڑنے والی نارتھ ویسٹرن ریلوے لائن پر عام ہڑتال کی دھمکی سے انگریز کافی فکر مند تھے۔ اگرچہ یہ ہڑتال نہیں ہوئی مگر پھر بھی ہنٹر کمیشن نے شہر کے نچلے طبقات کے ساتھ ساتھ ریلوے اسٹاف کو بھی "خاص طور پر متاثر" پایا تھا۔ ہنٹر کمیشن نے کانگریس کمیٹی کی اس رپورٹ سے اتفاق کیا کہ "کسانوں کا بہت بڑا طبقہ غیر متاثر رہا تھا۔ صورت یہ رہی تھی کہ سرکاری عمارتوں، مواصلاتی نظام (10 اور 20 اپریل کے درمیان تار لائنوں کو نقصان پہونچانے کے 54 واقعات ہوئے تھے) اور اکا دکا طریقے پر گوروں کو غیر منظم ڈھنگ سے نشانہ بنایا جاتا تھا۔ اس کا رد عمل وحشیانہ ظلم و ستم کی شکل میں سامنے آیا۔ حد تو یہ کہ 16 اپریل کو گجرانوالہ اور آس پاس کے دیہات پر بم باری بھی کی گئی تھی، مارشل لا عدالتوں نے 258 لوگوں کے خلاف تازیانہ کاری کی سزائیں سنائیں، زمین پر ناک

رگڑوانے والے اور پوری آبادی کو دن بھر تپتی دھوپ میں کھڑا رکھنے (یکم مئی، قصور کے ایک 11 سالہ بچے پر تاج برطانیہ کے خلاف بغاوت (جنگ) کا الزام لگایا گیا تھا) جیسی سزائیں بھی دی گئی تھیں۔ عوام کے تشدد کے مقابلے میں سرکاری تشدد کتنا زیادہ اور بھیانک تھا۔ اس کا ہلکا سا اندازہ کانگریس کمیٹی کی اس رپورٹ سے لگایا جا سکتا ہے جس میں یہ کہا گیا تھا کہ "پورے پنجاب میں محض چار گوروں کے مارے جانے کے انتقام میں کم سے کم 1200 ہندوستانی مارے گئے تھے اور تقریباً 3600 زخمی ہوئے تھے۔

1912 میں دہلی میں راجدھانی کی منتقلی کے بعد سیاسی بیداری جیسی کوئی چیز سامنے آنے لگی تھی۔ ہوم رول لیگ کی ایک شاخ انصاری کی رہنمائی میں فروری 1917 سے ہی سرگرم تھی۔ شہر پان اسلام ازم کا مرکز بن گیا تھا۔ نچلے متوسط ہندو طبقوں پر سوامی شردھانند کا اثر تھا۔ نومبر 1918 سے فروری 1919 کی مختصر سی درمیانی مدت مین چار مقامی نوعیت کے اخبارات شائع ہونا شروع ہوئے تھے جن کے مدیران (وجے، کے اندرا، کانگریس اور انقلاب کے ایڈیٹر آصف حسین ہنسوی ،اور 'قوم' کے قاضی عباس حسین) نے اپریل 1919 میں انصاری یا حکیم اجمل خاں جیسے جمے جمائے لیڈروں کے مقابلے میں کہیں زیادہ نمایاں اور انقلابی رول ادا کیا۔ ڈی ڈبلو فیرل نے اس سلسلے میں معاشی عوامل کی اہمیت کا بھی ذکر کیا ہے۔ انفلوئنزا کی وبا سے شہر میں 7000 سے زائد لوگ لقمہ اجل ہو گئے تھے، نمک کی قیمت 1916 کے مقابلے میں چار گنا بڑھ گئی تھی جب کہ مٹی کا تیل قطعی دستیاب نہیں رہا تھا، اور (غالب اکثریت والے) ہندو بیوپاری جنگی محصول کی وجہ سے ناراض تھے اور مسلم اکثریت کا دست کار طبقہ دست کاریوں کے زوال کی وجہ سے بری طرح متاثر تھا۔ لیس (Lace) اور کڑھائی کے کام میں جہاں 1911 اور 1921 کی درمیانی مدت میں 18.000 لوگ لگے ہوئے تھے، اُن کی تعداد گھٹ کر صرف 4000 رہ گئی تھی۔ دہلی شہر میں رولٹ ایکٹ تحریک چار مرحلوں سے گزری۔ 30 مارچ کی ہڑتال کے دوران دو مقامات (ریلوے اسٹیشن اور چاندنی چوک) پر پولس فائرنگ ہوئی، اس کے بعد خاموشی رہی۔ اس خاموشی کے دوران 4 اپریل کو جامع مسجد پر ایک یادگار اجتماع ہوا جس میں ہندوؤں اور مسلمانوں، دونوں نے ہی سوامی شردھانند کے پاؤں چھوئے۔ گاندھی کو شہر بدر کر دینے کی خبر پر 10 اپریل کو ہڑتال شروع ہوئی اور 18 اپریل تک مسلسل جاری رہی۔ اس کے بعد بنک کے کلرکوں نے بھی ہڑتال کر دی۔ 13 اپریل کو ریل ہڑتال کی بھی کوشش کی گئی۔ لاہور کی ہی طرح یہاں بھی سیاسی لیڈر بلکہ انقلابی قسم کے صحافی بھی نچلے طبقوں کی شدت پسندی سے خائف تھے۔ فیرل کے الفاظ میں "متوسط طبقوں اور نچلے طبقوں کے درمیان غیر رسمی اتحاد اسی طرح بلا روک ختم ہو تا گیا جس طرح کہ شروع ہوا تھا"۔ 17 اپریل کو چاندنی چوک میں دوبارہ فائرنگ کے بعد حالات فوراً ہی معمول پر آ گئے۔

بمبئی، دہلی، الہ آباد، لکھنؤ نیز جنوبی ہند کے متعدد شہروں کا سفر کیا۔ کانگریس تصویر میں کہیں نہیں تھی۔ پھر یہ کہ احتجاجی سیاست کے لیے ملک کے بیشتر حصوں میں کانگریس کی اپنی کوئی مشینری بھی نہیں تھی۔ اور جہاں اس طرح کی کوئی مشینری تھی بھی وہاں بنگال اور مہاراشٹر کے ماہرین اقتصادیات کے قدیم نیٹ ورک جیسے عوامل کی وجہ سے گاندھی کی مزاحمت بہت زیادہ ہوئی۔

ان تمام باتوں سے جو حقیقت ابھر کر سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ اس سلسلے میں تنظیمی تیاریاں بہت ہی محدود اور کافی حد تک غیر مربوط بھی تھیں اور اُس طوفان کے لحاظ سے قطعی ناکافی تھیں جو اپریل 1919 میں اٹھا تھا اور 1857 کے بعد برطانوی ہند میں انگریزوں کے خلاف سب سے بڑی شورش کی شکل اختیار کر گیا تھا۔ ستیہ گرہ عہد نامے پر دستخط کرنے والوں کی تعداد مارچ کے وسط میں محض 982 تھی جن میں 397 بمبئی شہر میں 400 گجرات میں 101، سندھ میں اور بمبئی پریزیڈنسی کے علاقے سے باہر محض 84 تھے۔ جو صوبہ آگے چل کر سب سے زیادہ متاثر ہوا، یعنی پنجاب میں ہوم رول لیگ کا نیٹ ورک سب سے کمزور تھا جس کی وجہ جنگ کے زمانے کی پابندیاں تھیں اور حالات کے زیادہ بگڑ جانے سے پہلے گاندھی بھی ان علاقوں کا دورہ نہیں کر سکے تھے۔

ہنٹر کمیشن کی رپورٹ نیز کانگریس کی پنجاب انکوائری کمیٹی کی رپورٹوں (1920) اور حال ہی میں اروند کمار کے ذریعے مرتب کیے گئے انتہائی اہم مقالات (Essays on Gandhian Politics) سے ہمارے سامنے ایک اتھل پتھل کی تصویر ابھرتی ہے جو کہ جنگ کے بعد کی معاشی مشکلات، گاندھی سے متعلق افواہوں، سرکاری اشتعال انگیزی اور خاص طور پر پنجاب میں ظلم و تعدی کا نتیجہ تھی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ تحریک مکمل طور پر شہروں تک ہی محدود رہی تھی اور صنعتی مزدوروں سے کہیں زیادہ نچلے متوسط طبقوں کے لوگ اور دست کار اہمیت حاصل کر گئے تھے۔ 30 مارچ اور 6 اپریل کو ہندوستان کے بیشتر شہروں میں ہڑتال رہی تھی اور جن مقامات پر لازمی طور پر گڑبڑ بھی ہوئی ان میں پنجاب میں امرت سر، گجرانوالہ، اور دوسرے متعدد شہر، گجرات میں احمد آباد، ویرمنگم، اور ناڈیاڈ، بمبئی، دہلی اور کسی حد تک کلکتہ قابل ذکر ہیں۔ فوج میں جبریہ بھرتی، جنگ کے نام پر زائد وصولی نیز 1915 کے غدر کے بعد توڑے گئے ظلم وستم، اور تعلیم یافتہ گروپوں کے ساتھ بھونڈے برتاؤ (جس پر کانگریس کی تحقیقاتی رپورٹ میں مبالغے کے ساتھ زور دیا گیا تھا) جیسے واقعات کی وجہ سے پنجاب میں لفٹنٹ گورنر او۔ ڈائر کا انتظامیہ 1919 سے کافی پہلے ہی نامقبول ہو چکا تھا۔ لاہور کے سلسلے میں اروند کمار کے دقیق تجزیے سے مزید خصوصی عوامل کی نشان دہی ہوتی ہے۔ 1917 اور 1919 کی درمیانی مدت میں غذائی اجناس کی قیمتوں میں 100 فی صد تک اضافہ ہوا تھا، جب کہ دست کاروں کی اجرت میں محض 20،25 فی صد بڑھوتری ہوئی تھی۔ 1913 میں پنجاب کے سب سے اونچے سودیشی ہرکشن لال کے پیوپلز بنک کے زوال میں او۔ ڈائر نے

سرگرم رول ادا کیا تھا جس کی وجہ سے لاہور کی غالب ہندو بیوپاری برادری کی معاشی امنگوں کو بھاری دھکا پہونچا تھا۔ آریہ سماج پیر منڈروں کے ذریعے انگریز مخالف سیاسی تصورات کو فروغ حاصل ہو رہا تھا اور صحافی ظفر علی خاں، بلکہ سب سے بڑھ کر اقبال کی ابتدائی دور کی قوم پرستانہ شاعری سے تحریک پاکر مسلمانوں میں بھی بیداری پیدا ہو رہی تھی۔

جس بات سے او۔ ڈائر اور دوسرے انگریز سب سے زیادہ خوف زدہ ہو گئے تھے وہ 1919 کا ہندو مسلم، سکھ اتحاد تھا۔ یہ اتحاد ایک ایسے صوبے میں نمایاں ہو رہا تھا، جو اس سے پہلے بھی اور بعد میں بھی فرقہ وارانہ نفاق کے لیے بدنام تھا۔ امرت سر میں 30 مارچ اور 6 اپریل کی ہڑتالیں پرامن رہنے کے ساتھ ساتھ کافی کامیاب رہی تھیں جن میں لوگوں نے بڑی تعداد میں حصہ لیا تھا۔ 9 اپریل کا رام نوی کا جلوس، جس کے بارے میں بعد میں ہنٹر کمیشن نے یہ کہا تھا کہ اس میں بہت بڑی تعداد میں مسلمانوں نے بھی حصہ لیا تھا، ہندو مسلم اتحاد کو فروغ دینے کا ایک نمایاں مظاہرہ تھا۔ مختلف فرقوں کے لوگ ایک ہی گلاس یا پیالے سے پانی پیتے تھے۔ امرت سر کے مقامی رہنماؤں کچلو اور ستیہ پال کو اسی شام شہر بدر کر دیا گیا تھا اور دہلی نیز پنجاب میں گاندھی کے داخلے پر پابندی کے احکام جاری کر دیے گئے تھے۔ 10 اپریل کو امرت سر میں ہال برج کے پرامن مظاہرین پر فائرنگ کی گئی جس کے بعد برطانوی اقتدار کی علامتوں، بنکوں، ڈاک خانوں، ریل اسٹیشنوں اور ٹاؤن ہال پر حملے ہوئے۔ 11 اپریل کو شہر میں مارشل لا لگا دیا گیا اور جنرل ڈائر نے کمان اپنے ہاتھ میں لے لی۔ 13 اپریل کو بڑی تعداد میں گاؤں کے لوگوں پر مشتمل ایک پرامن اور غیر مسلح بھیڑ پر جو کہ ایک میلے میں شرکت کی غرض سے شہر میں آئی تھی اور جسے ہر طرح کے اجتماع یا جلسے جلوس پر پابندی کے بارے میں کچھ بتایا نہیں گیا تھا، ایک محصور میدان - جلیاں والا باغ میں، جنرل ڈائر نے کسی وارننگ کے بغیر ہلہ بول دیا تھا۔ بعد میں ہلاک شدگان کی تعداد سرکاری طور پر 379 بتائی گئی تھی جبکہ غیر سرکاری اندازے کے مطابق اس سے کہیں زیادہ لوگ مارے گئے تھے۔ ڈائر نے ہنٹر کمیشن کے سامنے بس یہی معذرت کی تھی کہ "اس کے سپاہیوں کے پاس گولیاں کم پڑ گئیں تھیں اور راستے تنگ ہونے کی وجہ سے مسلح گاڑی اندر نہیں لے جائی جا سکی تھی؛ سوال بھیڑ کو منتشر کرنے کا نہیں بلکہ اخلاقی اثر پیدا کرنے کا تھا"۔ جنرل ڈائر نے بعد میں بھی ہفتوں لفٹنٹ گورنر کی مکمل تائید اور مدد سے اندھادھند گرفتاریوں، اذیت رسانی، خصوصی عدالتوں کے ذریعے سرعام سزا دہی، مار پیٹ کا کام لینے کے لیے وکیلوں کی بطور اسپیشل کانسٹبل بھرتی، تمام صاحبوں (گوروں) کو مقامی لوگوں سے سلام کرانے اور کوچہ کوچوان والا میں (جہاں ایک گوری عورت کی بے عزتی کی گئی تھی) ہندوستانیوں سے ناک رگڑوانے کا سلسلہ جاری رکھا تھا تاکہ اخلاقی اثر قائم کیا جا سکے۔

6 اور 9 اپریل کو لاہور میں بھی پرامن ہڑتالوں اور مظاہروں کے ذریعے ایک بار پھر فرقہ

وارانہ اتحاد کا ثبوت دیا گیا۔ گاندھی کی گرفتاری کی افواہ اور امرت سر کے واقعات کی خبر پہونچنے پر 10 اپریل کو پولس کے ساتھ پر تشدد ٹکراؤ کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ مسلم دست کاروں اور دور کردوں نے بطور خاص تشدد کا مظاہرہ کیا جبکہ رام بھج جیسے جے جمائے لیڈروں نے بھیڑ کو قابو میں رکھنے کی پوری کوشش کی۔ 11 اپریل کو مغل پورہ ریلوے ورکشاپ (جس میں 12,000 لوگ ملازم تھے) میں ہڑتال کر دی گئی اور صورت حال اس حد تک سنگین ہو گئی کہ انگریز شہر چھوڑ کر چھاونی کے علاقے میں چلے گئے۔ بادشاہی مسجد کے ایک عظیم الشان اجتماع میں ایک پیوپلز کمیٹی کی تشکیل کی توثیق کی گئی جس کا 11 سے 14 اپریل تک شہر پر مکمل کنٹرول رہا تھا۔ بہر حال اس کمیٹی میں زیادہ تر دوسرے درجے کے ہی سیاست داں شامل تھے جو یہ نہیں جانتے تھے کہ اچانک ہاتھ آجانے والے اقتدار کا وہ کیا کریں! یہ لوگ دباؤ کی سیاست کے عادی تھے، اور اس طرح کے انقلاب کے لیے یقیناً تیار نہیں تھے۔ اس لیے ہڑتال کے دوران لوگوں کو کھانا فراہم کرنے کی غرض سے چند مطبخ کا انتظام کرنے سے زیادہ کچھ نہیں کر سکے تھے۔ جب 13 اپریل کو ٹاؤن ہال کی میٹنگ میں ان لوگوں نے ہڑتال واپس لینے کی کوشش کی تو عوام نے اس کی زبردست مخالفت کر کے ناکام کر دیا۔ تھوڑے سے وقت کے لیے ایک متبادل اور شدت پسند قیادت کے کچھ آثار پیدا ہو گئے تھے۔ چمن دین کی کمان میں 140 افراد پر مشتمل ایک "ڈنڈا فوج" نے لاٹھیوں اور بچوں کے کھیلنے کے طمنچوں کے ساتھ سڑکوں پر مارچ کیا اور شہر میں اشتعال انگیز پوسٹر لگائے۔ "اے ہندو، مسلمان اور سکھ بھائیو! فوراً ڈنڈا فوج میں بھرتی ہو جایئے اور انگریز بندروں کا بہادری سے مقابلہ کیجیے، دفاتر اور ورکشاپ بند کر دو اور لڑتے رہو، یہ مہاتما گاندھی کا حکم ہے"۔ انگریز 14 اپریل کو بھاری طاقت کے ساتھ پلٹے۔ پیوپلز کمیٹی کے لیڈروں کو شہر بدر کر دیا گیا اور مارشل لا کے ذریعے عوامی تحریک کو کچل دیا گیا۔ پنجاب کے پانچ اضلاع، امرت سر، لاہور، گجرانوالہ، گجرات اور لائل پور رولٹ ایکٹ کے ہنگاموں سے بری طرح متاثر ہوئے تھے۔ گجرات، گجرانوالہ، لاہور اور امرت سر کو دہلی سے جوڑنے والی نارتھ ویسٹرن ریلوے لائن پر عام ہڑتال کی دھمکی سے انگریز کافی فکر مند تھے۔ اگرچہ یہ ہڑتال نہیں ہوئی مگر پھر بھی ہنٹر کمیشن نے شہر کے نچلے طبقات کے ساتھ ساتھ ریلوے اسٹاف کو بھی "خاص طور پر متاثر" پایا تھا۔ ہنٹر کمیشن نے کانگریس کمیٹی کی اس رپورٹ سے اتفاق کیا کہ "کسانوں کا بہت بڑا طبقہ غیر متاثر رہا تھا۔ صورت یہ رہی تھی کہ سرکاری عمارتوں، مواصلاتی نظام (10 اور 20 اپریل کے درمیان تار لائنوں کو نقصان پہونچانے کے 54 واقعات ہوئے تھے) اور اکا دکا طریقے پر گوروں کو غیر منظم ڈھنگ سے نشانہ بنایا جاتا تھا۔ اس کا رد عمل وحشیانہ ظلم و ستم کی شکل میں سامنے آیا۔ حد تو یہ کہ 16 اپریل کو گجرانوالہ اور آس پاس کے دیہات پر بم باری بھی کی گئی تھی، مارشل لا عدالتوں نے 258 لوگوں کے خلاف تازیانہ کاری کی سزائیں سنائیں، زمین پر ناک

رگڑوانے والے اور پوری آبادی کو دن بھر تپتی دھوپ میں کھڑا رکھنے (یکم مئی، قصور کے ایک 11 سالہ بچے پر تاج برطانیہ کے خلاف بغاوت (جنگ) کاالزام لگایا گیا تھا) جیسی سزائیں بھی دی گئی تھیں۔ عوام کے تشدد کے مقابلے میں سرکاری تشدد کتنا زیادہ اور بھیانک تھا۔ اس کا ہلکا سا اندازہ کانگریس کمیٹی کی اس رپورٹ سے لگایا جاسکتا ہے جس میں یہ کہا گیا تھا کہ "پورے پنجاب میں محض چار گوروں کے مارے جانے کے انتقام میں کم سے کم 1200 ہندوستانی مارے گئے تھے اور تقریباً 3600 زخمی ہوئے تھے۔

1912 میں دہلی میں راجدھانی کی منتقلی کے بعد سیاسی بیداری جیسی کوئی چیز سامنے آنے لگی تھی۔ ہوم رول لیگ کی ایک شاخ انصاری کی رہنمائی میں فروری 1917 سے ہی سرگرم تھی۔ شہر پان اسلام ازم کا مرکز بن گیا تھا۔ نچلے متوسط ہندو طبقوں پر سوامی شردھانند کا اثر تھا۔ نومبر 1918 سے فروری 1919 کی مختصر سی درمیانی مدت میں چار مقامی نوعیت کے اخبارات شائع ہونا شروع ہوئے تھے جن کے مدیران (وجے، کے اندرا، کانگریس اور انقلاب کے ایڈیٹر آصف حسین ہنسوی ،اور 'قوم' کے قاضی عباس حسین) نے اپریل 1919 میں انصاری یا حکیم اجمل خاں جیسے جمے جمائے لیڈروں کے مقابلے میں کہیں زیادہ نمایاں اور انقلابی رول ادا کیا۔ ڈی ڈبلو فیرل نے اس سلسلے میں معاشی عوامل کی اہمیت کا بھی ذکر کیا ہے۔ انفلوئنزا کی وبا سے شہر میں 7000 سے زائد لوگ لقمہ اجل ہو گئے تھے، نمک کی قیمت 1916 کے مقابلے میں چار گنا بڑھ گئی تھی جب کہ مٹی کا تیل قطعی دستیاب نہیں رہا تھا، اور (غالب اکثریت والے) ہندو بیوپاری جنگی محصول کی وجہ سے ناراض تھے اور مسلم اکثریت کا دست کار طبقہ دست کاریوں کے زوال کی وجہ سے بری طرح متاثر تھا۔ لیس (Lace) اور کڑھائی کے کام میں جہاں 1911 اور 1921 کی درمیانی مدت میں 18.000 لوگ لگے ہوئے تھے، اُن کی تعداد گھٹ کر صرف 4000 رہ گئی تھی۔ دہلی شہر میں رولٹ ایکٹ تحریک چار مرحلوں سے گزری۔ 30 مارچ کی ہڑتال کے دوران دو مقامات (ریلوے اسٹیشن اور چاندنی چوک) پر پولس فائرنگ ہوئی، اس کے بعد خاموشی رہی۔ اس خاموشی کے دوران 4 اپریل کو جامع مسجد پر ایک یادگار اجتماع ہوا جس میں ہندوؤں اور مسلمانوں، دونوں نے ہی سوامی شردھانند کے پاؤں چھوئے۔ گاندھی کو شہر بدر کردینے کی خبر پر 10 اپریل کو ہڑتال شروع ہوئی اور 18 اپریل تک مسلسل جاری رہی۔ اس کے بعد بنک کے کلرکوں نے بھی ہڑتال کردی۔ 13 اپریل کو ریل ہڑتال کی بھی کوشش کی گئی۔ لاہور کی ہی طرح یہاں بھی سیاسی لیڈر بلکہ انقلابی قسم کے صحافی بھی نچلے طبقوں کی شدت پسندی سے خائف تھے۔ فیرل کے الفاظ میں "متوسط طبقوں اور نچلے طبقوں کے درمیان غیر رسمی اتحاد اسی طرح بلا روک ختم ہوتا گیا جس طرح کہ شروع ہوا تھا"۔ 17 اپریل کو چاندنی چوک میں دوبارہ فائرنگ کے بعد حالات فوراً ہی معمول پر آگئے۔

گاندھی کے خلاف کارروائی کی خبر سے احمد آباد میں 11 اپریل کو عوامی تشدد آمیز ہنگامے شروع ہو گئے اور بلوائیوں نے 51 سرکاری عمارتیں نذر آتش کر دیں۔ ان بلوائیوں میں زیادہ تر کپڑا مل ورکر تھے۔ بعد میں مارشل لا کے تحت کی گئی کارروائی میں سرکاری اندازے کے مطابق 28 لوگ مارے گئے تھے اور 123 زخمی ہوئے تھے۔ 12 اپریل کو مزدوروں کی ایک بھیڑ نے قریب کے ہی ویرام گم میں بھی لوٹ مار کی۔ حالانکہ 10 اور 11 اپریل کو بمبئی میں ہڑتال رہی مگر حالات کم و بیش پر امن ہی رہے اور صنعتی ورکروں کے مقابلے میں گجراتی سوداگروں اور دوسرے پیشہ ور گروپوں نے زیادہ نمایاں طور پر حصہ لیا اور پرولتاری پریل کی بجائے وسطی بمبئی کا علاقہ (وارڈ سی اور ڈی) مظاہروں کا مرکز رہا۔ اس میں شک نہیں کہ یہاں گاندھی کی موجودگی تشدد پر روک کا باعث ہوئی۔ ضلع کھیڑا کے نادیاڈ میں تشدد کو اس لیے روکا جا سکا تھا کہ گاندھی کے ایک پیروکار نے 11 اپریل کو احمد آباد سے وہاں پہونچ کر لوگوں کو پر سکون رہنے کی تلقین کی تھی۔ (ہنٹر رپورٹ)۔ حکومت پنجاب کے برعکس، بمبئی کی حکومت نے بھی کارروائی کرنے کے معاملے میں تحمل سے کام لیا؛ حالانکہ پنجاب ایک سرحدی صوبہ تھا اور ہندوستانی آرمی کے لیے سب سے زیادہ نفری فراہم کرتا تھا۔

کلکتہ میں 6 اور 11 اپریل کو ہڑتال ہوئی۔ 11 اپریل کو ناخدا مسجد پر ہندوؤں اور مسلمانوں کی ایک مشترکہ ریلی ہوئی اور ہیری سن روڈ پر پولس اور آرمی کے ساتھ جھڑپیں ہوئیں۔ 12 اپریل کو چیت پور، بڑا بازار علاقے میں بھی جھڑپ ہوئی اور پولس نے مشین گن سے فائرنگ کر کے 9 لوگوں کو ہلاک کر دیا۔ کلکتہ کے مظاہروں کی ایک نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ ان میں مقامی ہندوؤں، مسلمانوں اور مارواڑیوں کے ساتھ ساتھ، نسبتاً کم اہم بنگالی طالب علموں نے بھی حصہ لیا، جبکہ سودیشی تحریک کے موقع پر ایسا نہیں ہوا تھا۔

مدراس شہر کا احتجاج پر امن رہا البتہ بیچ (ساحلی) علاقے میں ورکروں کے بڑے بڑے جلسے ہوئے جن سے کانگریس کے ایک رکن نیز 1918 کی مدراس لیبر یونین کے ایک چیف آرگنائزر ٹی۔ وی کلیان سندرم مدلیار اور 1908 کی ٹوٹی کورن کی ہڑتال کے ایک بزرگ انتہا پسند لیڈر سبرامنیم سیوا نے بھی خطاب کیا۔ بہر حال ملک کے دوسرے حصوں میں قابل لحاظ رد عمل نہیں ہوا۔ مثال کے طور پر سی پی میں صرف چھندواڑہ، اکولہ، اور امراوتی میں جزوی یا مکمل ہڑتال ہوئی۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انگریزوں کے حد سے بڑھے ہوئے جبر واستبداد نے کچھ عرصہ کے لیے بیشتر ہندوستانی سیاست دانوں کو بری طرح خوف زدہ کر دیا تھا۔ مثال کے طور پر کلکتہ میں عام احتجاجی جلسہ کرنا تقریباً ناممکن ہو گیا تھا۔ اور قوم کے غم وغصے کی ترجمانی رابندر ناتھ ٹیگور کو اپنے اس مشہور مکتوب کے ذریعے کرنی پڑی تھی جس میں انھوں نے شاہی خطاب (سر) کو لوٹا دینے کا اعلان کیا

تھا(30 مئی 1919)۔ پنجاب کے ہولناک واقعات کے سلسلے میں کانگریس کا باضابطہ رد عمل 1919 کے دوران اس کے روایتی طریقہ کار، یعنی غیر سرکاری سطح پر تحقیقاتی کمیٹی کی تشکیل کرنے تک ہی محدود رہا۔ جہاں تک گاندھی کے اپنی ذات کا تعلق تھا، وسیع پیمانے پر اور خاص طور پر خود ان کے اپنے وطن، احمد آباد میں تشدد کے واقعات کے نتیجے میں انھیں اپنی "ہمالیائی غلطی" کا اعتراف کرنا پڑا تھا اور انھوں نے ستیہ گرہ فوراً واپس لے لیا تھا۔ اس کے بعد گاندھی خاطر خواہ تنظیمی اور نظریاتی تیاری کے بغیر کسی بھی قسم کی تحریک شروع کرنے کے ہمیشہ خلاف رہے۔

ایسے قیدیوں کو جو کہ تشدد میں ملوث نہیں رہے تھے تاج برطانیہ کی طرف سے عام معافی دیدی گئی تھی اور دسمبر 1919 میں اصلاحات کے حق میں بھی فیصلہ کر لیا گیا تھا۔ ان دونوں باتوں کے نتیجے میں لوگوں میں تھوڑے عرصہ کے لیے امیدیں پیدا ہو گئی تھیں جس کے پیش نظر اسی ماہ کانگریس کے امرت سر اجلاس میں نئی صف بندی دیکھنے میں آئی۔ کانگریس پچھلے سال ہی دہلی اجلاس میں اصلاحات کے خلاف موقف اختیار کر چکی تھی، جس پر باقی ماندہ پرانے اعتدال پسند لیڈر بھی الگ ہو گئے تھے اور سپرو، جیاکار اور چنتامنی کی قیادت میں نیشنل لبرل ایسوسی ایشن بنائی گئی تھی۔ بہر حال امرت سر اجلاس میں گاندھی نے اس قرارداد کی بھرپور تائید کی جس کے ذریعے مونٹیگو کے تئیں اظہار تشکر کرتے ہوئے نئی کونسلوں کی تشکیل میں تعاون کی یقین دہانی کرائی گئی تھی۔ سی آر داس، تلک، رام بھج دت چودھری، اور حسرت موہانی کے اصرار پر قرارداد میں وہ شق بھی شامل کر لی گئی تھی جس میں ایکٹ کو مایوس کن بتایا گیا تھا۔ بہر حال گاندھی نے اس شق کی مخالفت کی تھی۔ بہر حال یہ صف بندی ستمبر 1920 میں بالکل الٹ پلٹ ہو گئی، کیونکہ اب گاندھی کاؤنسل کے بائیکاٹ اور ترک موالات پر زور دے رہے تھے جبکہ داس اور تلک کے پیروکار اس کی مخالفت کر رہے تھے۔ مگر تب تک گاندھی خلافت تحریک کے پلیٹ فارم سے بہت زیادہ مقبولیت حاصل کر کے کانگریس اور پوری ملکی سیاست پر پوری طرح حاوی ہو چکے تھے۔

1919-1920: رہنما اور عوام

گاندھی، خلافت اور کانگریس

1919-20 میں گاندھی کے سیاسی عروج، یا قومی قیادت پر ان کے چھا جانے کے عمل کے سلسلے میں رچرڈ، گارڈون، اور جوڈتھ براؤن کی حالیہ تصنیفات میں تفصیل کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے، اور اس سلسلے میں اعلا ترین سطح پر سیاسی بازی گری کی بات اتفاق رائے سے کہی گئی ہے۔

چونکہ یہ افواہ تیزی کے ساتھ یقین کی شکل اختیار کرتی جا رہی تھی کہ شکست خوردہ عثمانی

خلافت پر ایک سخت قسم کا معاہدہ امن جبراً تھوپا جانے والا ہے۔ 20-1919 کے دوران ہندوستان میں خلافت تحریک بھی زور پکڑ رہی تھی۔ اس تحریک کے تین مطالبے جو کہ محمد علی نے مارچ 1920 میں پیرس میں سفارت کاروں کو پیش کیے تھے، یہ تھے کہ مسلمانوں کے مقامات مقدسہ پر ترک سلطان (خلیفہ) کے کنٹرول کو برقرار رہنے دیا جائے، کم از کم اتنا علاقہ سلطان کی عملداری میں رہنے دیا جائے کہ وہ اسلام کا دفاع کر سکے اور جزیرۃ العرب (عربیہ، شام، عراق، فلسطین) کو مسلم عملداری والا خود مختار اور آزاد خطہ قرار دیا جائے۔ جیسا کہ توقع کی جا سکتی تھی، یہ تحریک اعتدال پسندی اور انقلاب پسندی کے دو الگ الگ رخ اختیار کر گئی۔ اعتدال پسندوں کی ساری توجہ مرکزی خلافت کمیٹی پر مرکوز رہی جس کی تنظیم میں بمبئی کے چھوٹانی جیسے خوش حال سوداگروں کا ہاتھ رہا تھا، جبکہ تحریک کے انقلابی قسم کے لیڈروں میں نچلے متوسط طبقے کے صحافی، علماء شامل تھے جو کہ بطور خاص صوبہ متحدہ، بنگال، سندھ اور مالابار کے چھوٹے شہروں اور دیہی علاقوں کے لوگوں پر خاصا اثر رکھتے تھے۔ بمبئی سے تعلق رکھنے والے رہنما (جو کہ تحریک کے پھیلنے اور عوامی چندہ کے ذریعے رقم کی فراہمی سے پہلے تحریک کی ساری کفالت خود ہی کرتے رہے تھے) تحریک کی سرگرمیوں کو صرف سنجیدہ قسم کے جلسوں، عرضداشتوں اور لندن و پیرس وفود بھیجنے تک ہی محدود رکھنے کے حق میں تھے جبکہ انقلابی لیڈروں نے 1920 میں علی برادران کی نظربندی کے خاتمے کے بعد ان کی قیادت میں (17 اکتوبر 1919 اور 19 مارچ 1920 جیسی) ملک گیر ہڑتال پر زور دیا۔ سب سے پہلے اسی گروپ نے 22 اور 23 نومبر 1919 کو دہلی میں آل انڈیا خلافت کانفرنس میں تحریک ترک موالات کا نعرہ بلند کیا تھا۔

جوڈتھ براؤن کی روایت کے مطابق گاندھی نے شروع شروع میں ثالثی کا رول ادا کرتے ہوئے ان دونوں گروپوں میں اہمیت حاصل کر لی تھی۔ پھر یہ کہ دوسرے ہندو رہنماؤں کے ساتھ رابطے کے لیے بھی گاندھی خلافت والوں کے لیے ناگزیر حیثیت حاصل کر چکے تھے۔ خلافت کے رہنما ہندو مسلم اتحاد کے زبردست خواہش مند تھے، کیونکہ اس اتحاد کے بغیر ترک موالات، جس میں خدمات اور کونسلوں کا بائیکاٹ بھی شامل تھا، کامیاب نہیں ہو سکتی تھی۔ اس اتحاد کے لیے مسلم رہنماؤں کی اس زبردست کوشش کی ترجمانی مسلم لیگ کی دسمبر 1919 کی اس قرارداد سے بھی ہوتی ہے جس کے ذریعے مسلمانوں سے بقر عید میں گائے ذبح نہ کرنے کی اپیل کی گئی تھی۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ ہندو لیڈروں نے نہ تو اس وقت اور نہ ہی کبھی بعد میں، یہ پیش کش کی کہ وہ مسجدوں کے پاس سے گزرتے ہوئے باجا نہیں بجائیں گے، جبکہ ہندو مذہب میں باجا اتنا ناگزیر نہیں ہے جتنا کہ بقر عید مسلمانوں کا ایک اہم اور مرکزی تہوار ہے۔ مئی 1920 تک گاندھی مجموعی طور پر بمبئی گروپ کے ساتھ رہے بلکہ نومبر 1919 میں خلافت کانفرنس کے جلسے میں حسرت موہانی

نے انگریزی سامان کے بائیکاٹ کا جو نعرہ دیا، گاندھی نے اس کی مخالفت بھی کی۔ واضح رہے کہ گاندھی خلافت تحریک کے جس بمبئی گروپ کے طرفدار تھے اس میں زیادہ تر وہ لوگ شامل تھے جو انگریزی سامان کے برآمد کار اور خوردہ فروش تھے۔ نیا موڑ اس وقت سامنے آیا جب 14 مئی 1920 کو ترکی کے ساتھ معاہدہ سیورے (Sevres ایک فرانسیسی شہر) کی سخت شرائط شائع کر دی گئیں اور پھر 28 مئی کو پنجاب کی شورش کے سلسلے میں ہنٹر کمیشن کی رپورٹ بھی سامنے آگئی جس کی بابت گاندھی نے بڑے تلخ لہجے میں یہ کہا تھا کہ اس رپورٹ کا ہر صفحہ انگریزوں کی لیپا پوتی سے بھرا ہوا ہے۔ حکومتِ ہندوستان تاوانِ جنگ ایکٹ کے ذریعے اپنے افسروں کے لئے پہلے ہی تحفظ فراہم کر چکی تھی اور او۔ ڈائر کو بھی الزام سے بری کر دیا گیا تھا، ڈائر کی ملامت کی قرارداد کو دارالامراء (House of Lords) نے مسترد کر دیا تھا اور مارننگ پوسٹ نے جلیان والا باغ کے جلاد کے لیے 26,000 پونڈ کی ایک خطیر رقم اکٹھا کی تھی۔

مرکزی خلافت کمیٹی کے الہ آباد جلسے (1-3 جون 1920) میں جس میں کہ قوم پرست ہندو لیڈروں نے بھی خاصی تعداد میں شرکت کی تھی، خلافت تحریک کے انقلابی لیڈر غالب آگئے۔ انھیں اب گاندھی کی بھی تائید حاصل ہو چکی تھی۔ خطابات، خدمات، پولس، آرمی کے بائکاٹ اور آخر میں محصولات کی عدم ادائیگی پر مشتمل ترک موالات کے ایک چار مرحلاتی پروگرام کا اعلان کیا گیا اور گاندھی نے پنجاب میں حکومت کی غلطی، خلافت کے معاملے میں حکومت کی غلطی نیز سوراج کے سوال پر کانگریس کی طرف سے بھی اس طرح کی مہم کے لیے زور دینا شروع کر دیا۔ یہ دوسری بات ہے کہ کہ "سوراج" کی کوئی واضح تعریف نہیں کی گئی تھی۔ صرف گجرات اور بہار میں ہی مکمل تائید کی گئی۔ موتی لال نہرو (اپنے بیٹے کے برخلاف) شروع میں کونسل کے الیکشن کے بائیکاٹ جیسے اہم معاملے میں تذبذب کا شکار رہے۔ (یہ الیکشن نومبر 1920 میں ہونے والے تھے)، اور سی۔ آر۔ داس کے علاوہ تلک کے پیروکاروں نے بھی اس کی مخالفت کی۔ لیکن ستمبر اور دسمبر 1920 کی درمیانی مدت میں دوسرے تمام بڑے لیڈر جس ڈرامائی طریقے پر اس معاملے میں گاندھی کے ساتھ آگئے، اس کی توجیہ گارڈون اور براؤن نے انتخابی امکانات کی سیاسی پیش قیاسی کے طور پر کی ہے۔ چنانچہ لاجپت رائے نے 25 جون کو الیکشن کے بائیکاٹ کی تائید کی۔ قابل ذکر ہے کہ حکومت نے پنجاب کے لیے جون کے وسط میں جن انتخابی قواعد و ضوابط کا اعلان کیا تھا ان کی رو سے صوبے میں کانگریس کے انتخابی امکانات نہیں کے برابر ہو گئے تھے کیونکہ وہ محض شہری علاقوں اور ہندوؤں تک ہی محدود تھی۔ کونسلوں کے بائیکاٹ کی مخالفت مہاراشٹر اور بنگال میں نسبتاً زیادہ شدید تھی۔ یہ دونوں پرانے انتہا پسندوں کے گڑھ تھے جس کی وجہ سے کانگریس کے انتخابی امکانات نسبتاً زیادہ روشن تھے۔ موتی لال کو مبینہ طور پر یہ احساس ہو گیا تھا کہ یوپی کانگریس

انتخابات کے لیے تنظیمی طور پر تیار نہیں ہے اور کلکتہ میں کانگریس کے خصوصی اجلاس (4 تا 9 ستمبر 1920) میں ان کی تائید فیصلہ کن ثابت ہوئی اور خطابات کو لوٹا دینے، اسکولوں، عدالتوں اور کونسلوں کے بائیکاٹ، غیر ملکی سامان کے بائیکاٹ، قوم پرست اسکولوں کی حوصلہ افزائی، عدالتوں سے باہر ہی تنازعات کے تصفیے اور کھادی کے استعمال کی تجویز سبجیکٹ کمیٹی میں 132 کے مقابلے میں 144 ووٹوں سے اور کھلے اجلاس میں اور بھی زیادہ اکثریت، یعنی 873 کے مقابلے میں 1885 ووٹوں سے منظور کر لی گئی۔ اس قرار داد میں نوکریوں سے مستعفی ہو جانے، آرمی اور پولس کی ملازمت ترک کر دینے اور ٹیکسوں کی عدم ادائگی کی بابت کچھ نہیں کہا گیا تھا۔ کانگریس کے ناگ پور اجلاس (دسمبر 1920) میں سی۔ آر۔ داس نے بھی ڈرامائی طریقے پر پلٹا کھایا۔ انھوں نے اگرچہ بنگال سے مخالفت میں ایک بہت بڑا وفد لانے کے سلسلے میں 36,000 ہزار روپے خرچ کیے تھے مگر آخر کار وہ مرکزی تجویز بھی انھوں نے ہی پیش کی تھی جس کے ذریعے، غیر تشدد پسندانہ عدم تعاون کی اسکیم یا اس کے کسی حصے کو قبول کرنے، حکومت کے ساتھ کسی بھی قسم کی رضاکارانہ وابستگی کو ترک کرنے اور انڈین نیشنل کانگریس یا آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے ذریعے وقت کے تعین پر، ٹیکس ادانہ کرنے کی بات کہی گئی تھی۔ اس وقت تک کونسلوں کے لیے انتخابات منعقد کرائے جا چکے تھے اور ایک سال کے اندر اندر سوراج دلانے کا گاندھی کا وعدہ (جو کہ پہلی بار 2 ستمبر کو ینگ انڈیا کے ایک مضمون میں سامنے آیا تھا۔) شاید اس حکمتی مفاہمت پر مبنی تھا کہ اگر تحریک عدم تعاون کے ذریعے سوراج، مقررہ میعاد کے اندر حاصل نہ کیا جا سکا تو سارے معاملات از سر نو اٹھائے جائیں گے۔ چنانچہ خواہ تھوڑے ہی عرصے کے لیے کانگریس پوری طرح گاندھی کے قدموں میں آگئی تھی۔ اب کانگریس کا نصب العین "تمام جائز اور پرامن طریقوں سے سوراج کا حصول" قرار پایا تھا اور سوراج کی اب بھی کوئی توضیح نہیں کی گئی تھی۔ گاندھی کے اصرار پر کانگریس کی تنظیم میں اہم تبدیلیاں کی گئیں تاکہ اسے ایک حقیقی عوامی سیاسی پارٹی کی شکل دی جا سکے۔ اس کے لیے چار آنے کی باقاعدہ رکنیت، گاؤں، تعلقہ، ضلع اور شہر کی سطح پر تنظیمی ڈھانچے کی تشکیل، لسانی بنیاد پر صوبائی کمیٹیوں کی تنظیم نو، آبادی کے تناسب سے مندوبین کی تعداد کے تعین اور اعلا اختیاراتی 15 رکنی مجلس عاملہ کے ساتھ کانگریس کی تنظیم نو کی گئی۔

ہو سکتا ہے کہ عدم تعاون کی طرف لیڈروں کے راغب ہوتے جانے کے پس پشت انتخابی امکانات کا بھی کسی حد تک دخل رہا ہو، لیکن پنجاب کے واقعات اور خلافت کے معاملے نے لوگوں کے اندر غم و غصے کی جو شدید لہر پیدا کر دی تھی اس کی اہمیت کو بھی گھٹا کر پیش نہیں کیا جانا چاہیے۔ موتی لال نے 27 جون 1920 کو جواہر لال نہرو کو لکھا تھا "میں نے جب سے تمہاری بھیجی ہوئی ہنٹر کمیٹی رپورٹ کے حصے پڑھے ہیں، میرا خون کھول رہا ہے۔ ہمیں اب کانگریس کا خصوصی اجلاس

بلا کر ان بد ذاتوں (انگریزوں) کی زندگی جہنم بنا دینی چاہیے"۔ خود جوڈتھ براؤن نے اس تہ آب عوامی طوفان کا ذکر کیا ہے جس نے کانگریس اور خلافت تحریک کے لیڈروں کو زیادہ انقلابی راستہ اپنانے پر مجبور کر دیا تھا؛ مثلاً اگست 1920 میں بھاگل پور کی صوبائی کانفرنس اجلاس میں عدم تعاون کے پروگرام کی توثیق میں 180 کسان مندوبین نے اہم رول ادا کیا تھا۔ اس سلسلے کی قرارداد کلکتہ میں سبجیکٹ کمیٹی میں کم فرق سے اور عام اجلاس میں بہت زیادہ ووٹوں کے فرق سے پاس کی گئی تھی اور سب سے زیادہ، 14582 مندوبین نے ناگ پور اجلاس میں شرکت کی تھی (جو کہ کانگریس کی تاریخ میں ایک رکارڈ ہے) وغیرہ وغیرہ۔ کلکتہ اور ناگ پور کے اجلاسوں میں کانگریس کی اہم تائید کرنے والوں میں مارواڑی بیوپاری اور تاجر، خلافت تحریک چلانے والے مسلمان اور آندھرا کے علاقوں کے وہ مندوبین شامل تھے جن کے علاقائی زبانوں کو تسلیم کرنے سے متعلق مطالبات کو گاندھی نے اپریل 1920 سے ہی اپنے پروگرام میں شامل کر لیا تھا اور ناگ پور میں کانگریس کی تنظیم نو کرتے ہوئے انھیں بھی جگہ دی تھی۔ مقامی سطح پر خلافت کی الگ الگ تشریح و تاویل کے نتیجے میں خلافت تحریک، نیا رخ اختیار کرتی جا رہی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ یوپی میں نچلے طبقے کے مسلمان خلافت کو اردو کے ایک دوسرے لفظ 'خلاف' کی ہی ایک شکل سمجھتے تھے اور اسے حکام کے خلاف عام بغاوت کی ایک علامت کے طور پر استعمال کرنے لگے تھے، جبکہ مالا بار علاقے کے پر سکون موپلاؤں نے اسے زمینداروں کے خلاف بغاوت کا نام دے دیا تھا۔

افغانستان کے نئے امیر امان اللہ کا انگریز مخالف رویہ بھی مسلمانوں کے جذبات میں اتھل پتھل اور امید کی کرن پیدا کرنے کا باعث ہوا۔ امیر امان اللہ خاں اور انگریزوں کے درمیان مئی۔ جون 1919 میں ایک مختصر سی جنگ ہوئی تھی اور امیر نے بالشوک روس کے ساتھ رابطے قائم کر لئے تھے۔ جون 1920 میں سندھ اور صوبۂ سرحد کے تقریباً 20.000 مسلمان ہجرت کر کے افغانستان چلے گئے تھے کیونکہ انگریزی حکومت نے خلیفہ (سلطان ترکی) کی بے عزتی کی تھی۔ اگست 1920 میں اخبار زمیندار کے ایڈیٹر ظفر علی خان کو پانچ سال کے لیے ملک بدر کرنے کی سزا سنائی گئی کیونکہ انھوں نے ایک تقریر میں کہا تھا کہ مہدی علیہ السلام کے ظہور کا وقت آ گیا ہے۔ ایک سال کے اندر سوراج دلا دینے کا گاندھی کا وعدہ مبہم اور غیر حقیقت پسندانہ ہونے کی وجہ سے بھی لوگوں کی امیدیں کافی بڑھ گئی تھیں۔ بہر حال 1919 اور 1920 کے دوران محنت کش طبقوں میں زبردست بے چینی رہی، اور ساتھ ہی کسان طبقوں میں بھی بیداری پیدا ہوئی۔ یہ وہ پہلو ہیں جنھیں کیمبرج مورخین نے نظر انداز کر دیا ہے۔

نچلی سطحوں کا دباؤ

تقریباً اسی زمانے کے ایک مطالعے میں 1919 کے اواخر اور 1920 کے اوائل میں ہونے والی ہڑتالوں کی حسب ذیل تفصیل دی گئی ہے۔ 4 نومبر تا 2 دسمبر 1919، وولن مل، کان پور، (17,000 لوگ باہر آگئے تھے)؛ 7 دسمبر 1919 تا 9 جنوری 1920، ریلوے ملازمین، جمال پور، 16,000 لوگ باہر آگئے تھے؛ 9 تا 18 جنوری 1920، جوٹ ملز، کلکتہ، 35,000 لوگ باہر آگئے تھے: 2 جنوری تا 3 فروری 1920 عام ہڑتال، بمبئی، 200,000 لوگ باہر آگئے تھے؛ 20 تا 31 جنوری، مل ورکروں کی ہڑتال، رنگون، 20,000 لوگ باہر آگئے؛ 31 جنوری برٹش انڈیا نیوی گیشن کمپنی، بمبئی، 10,000 لوگ باہر، 26/ جنوری تا 16/ فروری مل ورکرز، شولاپور، 16,000 لوگ باہر؛ 24 فروری تا 29 مارچ، ٹاٹا آئرن اینڈ اسٹیل ورکرز کی ہڑتال، 40,000 لوگ باہر؛ 9 مارچ، مل ورکروں کی ہڑتال، بمبئی، 60,000 لوگ باہر؛ 20/ مارچ، مل ورکروں کی ہڑتال، مدراس، 17,000 لوگ باہر؛ مئی 1920، مل ورکروں کی ہڑتال، احمد آباد، 25,000 لوگ باہر؛ (حوالہ: فیکٹری لیبر ان انڈیا، آر۔ کے۔ داس۔ 1923)۔ 1920 کے نصف آخر کے عرصے میں بنگال میں 110 ہڑتالیں ہوئیں۔ ٹریڈ یونینیں ہڑتالوں کے معاملے میں پہل کی بجائے پیروی کیا کرتی تھیں۔ اور جہاں تہاں ہڑتال کمیٹیاں بنائی بھی جاتی تھیں وہ زیادہ عرصہ تک برقرار نہیں رہتی تھیں۔ البتہ ان یونینوں کی تعداد محنت کش طبقے کو منظم کرنے کی سمت میں سنگ میل ثابت ہو رہی تھی۔ حکومت بنگال کی ایک خفیہ رپورٹ میں لیبر یونینوں اور انجمنوں کی تعداد 1920 میں 40، 1921 میں 55، اور 1922 میں 75 دکھائی گئی تھی۔ اس رپورٹ میں ان یونینوں اور انجمنوں کی باقاعدہ فہرست شامل کی گئی تھی۔ اسی طرح بمبئی میں 1926 میں جو 53 ٹریڈ یونینیں سرگرم تھیں ان میں صرف 7 ایسی تھیں جو 1920 میں یا ذرا پہلے قائم کی گئی تھیں اور 1920 نیز 1923 کی درمیانی مدت میں کم سے کم 29 یونینیں قائم کی گئی تھیں۔

ٹریڈ یونینوں کی قیادت، جو کہ بلاشبہ عام متوسط طبقے کے ہاتھ میں تھی، متنوع سیاسی رجحانات کے زیر اثر تھی۔ اس پر بمبئی کے این۔ ایم جوشی جیسے اعتدال پسند نیم وفاداروں سے لے کر مدراس کے واڈیا اور بمبئی کے Baptista جیسے اینی بیسنٹ کے پیروکاروں، بی جی ہورنی مین کے بمبئی کرانیکل گروپ، تلک کے چند نوجوان پیروکاروں، مدراس کانگریس کے لیڈر تھیرو وی کا، خلافت تحریک کے لیڈروں کے ساتھ ساتھ، بنگال میں (پربھات کسم رائے چودھری، بوم کیشچکرورتی، ایس این ہلدر، آئی۔ بی سین، جیسے) انتہا پسندوں سے پرانے تعلقات رکھنے والے قوم پرست لیڈروں، اور نئی نسل کے ان انقلابی لیڈروں کا اثر تھا جو آگے چل کر 1920 کی دہائی میں بہت اہمیت

حاصل کرنے والے تھے۔ ان میں جیتندر لال بنرجی، ہیمنت کمار سرکار، مرنیل کانتی بسو قابلِ ذکر ہیں۔ ان کے علاوہ رانی گنج کے سوامی درشانند، اور جھریا کان مزدوروں کے لیڈر سوامی دسوانانند جیسے کچھ سیاسی سنیاسی بھی شامل تھے۔ متوسط طبقے کی قوم پرست قیادت ورکروں کی تشدد پسندی کے لیے بریک کا کام کرتی تھی وہ اپنے اس رول کو ہندوستانیوں کی ملکیت والے کاروبار کے سلسلے میں بطور خاص بروئے کار لاتی تھی۔ چنانچہ جو جمشید پور لیبر ایسوسی ایشن، فروری 1920 کی ہڑتال کے دوران ایس۔ این۔ ہلدر اور بوم کیش سرکار نے قائم کی تھی۔ وہ ٹاٹا ورکروں کی بھرِدسے مند طریقے پر رہنمائی نہیں کر سکی۔ Baptista نے 31 اکتوبر 1920 کو بمبئی میں Aituc کے افتتاحی اجلاس (جس میں وہ AITUC کے وائس چیرمین اور دیوان چمن لال سکریٹری بنائے گئے تھے) سے خطاب کرتے ہوئے زیادہ تران ابتدائی لیڈروں کے بارے میں بات کی، انھوں نے ورکروں کے Via Dolorosa کی مذمت کی مگر ساتھ میں انھوں نے ورکروں کو "شراکت" کے تصور سے بھی ہمکنار کیا۔ خود ان کے اپنے الفاظ میں "یہ (ملازمین اور آجرین) محنت فروخت کرنے اور محنت خریدنے والے نہیں بلکہ شراکت دار اور رفیقِ کار ہیں"۔ بہر حال لیبر تحریک سے وابستہ کچھ لیڈروں اور گروپوں کا جھکاؤ مارکسزم کی طرف شروع ہو گیا تھا۔ چنانچہ بمبئی کے نوعمر انقلابی طالب علم ایس۔ اے۔ ڈانگے، جن کا یہ کہنا ہے کہ وہ 21-1920 میں تلک کی شاگردی چھوڑ کر لینن کی شاگردی میں آگئے تھے یا مدراس کے بزرگ وکیل ایس۔ چیٹیار کا نام اس سلسلے میں قابلِ ذکر ہے۔ یہ خاصی دلچسپ بات ہے کہ AITUC کے افتتاحی اجلاس کی صدارت لاجپت رائے نے کی اور موتی لال نہرو، وٹھل بھائی پٹیل، اینی بیسنٹ یہاں تک کہ جناح جیسے کئی سرکردہ لیڈروں نے شرکت کی تھی، مگر گاندھی اس سے دور رہے تھے، یہاں تک کہ انھوں نے اپنی طرف سے کوئی پیغام بھی نہیں بھیجا تھا اور ان کی اپنی تنظیم۔ احمد آباد مجور مہاجن نے AITUC کے ساتھ کبھی الحاق بھی نہیں چاہا۔ سیاسی عام ہڑتال جیسے ایک کارگر پرامن اور دوررس مضمرات کے حامل حربے کو عدم تعاون کے اسلحہ خانہ میں داخل ہونے کی اجازت دی بھی کیسے جا سکتی تھی!

دوسری طرف راجستھان کے کسانوں میں جو جاگیر دار مخالف بے چینی صدی کے اوائل میں شروع ہوئی تھی وہ 1920 کی دہائی میں اپنی بلندی پر پہونچ گئی تھی۔ Wilkinson نے 1921 کی راجپوتانہ ایجنسی رپورٹ میں کہا تھا کہ "میواڑ کا خطہ لاقانونیت کا مرکز بنتا جا رہا ہے، غداروں اور باغیوں کے گماشتے لوگوں کو یہ سکھا رہے ہیں کہ سارے انسان برابر ہیں۔ زمین کسانوں کی ہے، ریاست یا زمیندار اس کا مالک نہیں ہے۔ خاص بات یہ ہے کہ لوگوں سے 'کامریڈ' کا کوئی مقامی متبادل استعمال کرنے کے لیے کہا جا رہا ہے۔ یہ تحریک زیادہ تر مہارانا کے خلاف ہے مگر کسی وقت برطانیہ مخالف رخ بھی اختیار کر سکتی ہے اور برطانوی ہند کے دوسرے علاقوں تک پھیل سکتی ہے"

۔ہو سکتا ہے کہ اس رپورٹ میں کسی قدر مبالغے سے کام لیا گیا ہو، مگر اس میں شک نہیں کہ دے جے سنگھ پاٹھک اور مانک لال ورما نے بجولیا کے قدیم مرکز کے اردگرد کے علاقوں میں ایک زوردار کسان تحریک پیدا کردی تھی اور 1922 میں چنگی اور بیگار میں تخفیف کی شکل میں جاگیردار سے کچھ مراعات حاصل کرلی گئی تھیں۔ اس اثناء میں اودے پور کے مصالحہ جات کے ایک بیوپاری موتی لال تیجاوت نے جنھوں نے قبائلی لباس اختیار کرلیا تھا اور خود کو گاندھی کا فرستادہ بتاتے تھے، میواڑ کے بھیل قبائلیوں کو منظم کرنا شروع کردیا تھا۔ جبکہ دوسری طرف مارواڑ میں جے نارائن دیاس کی قیادت میں لگان کی عدم ادائیگی کی تحریک شروع ہو چکی تھی۔ پاٹھک نے یوپی کے کانگریسی لیڈر گنیش شنکر ودیارتھی کے ساتھ قریبی رابطے قائم کرلیے تھے۔ جنھوں نے کان پور میں بجولیا تحریک کی خاصی تشہیر کی تھی۔ کانگریس کے 1921 کے اجلاس میں، حکومت میواڑ کی ملامت کی تجویز پاس نہیں ہو سکی۔ مدن مالویہ نے اس تجویز کی مخالفت اس بنیاد پر کی تھی کہ اودے پور کے مہارانا ان کے دوست ہیں اور وہ کسانوں کو کچھ مراعات دینے کے لیے مہارانا کو راضی کرلیں گے۔

Stephen Henningham نے ایک مضمون میں 20-1919 میں ابھرنے والی اس طاقت ور کسان تحریک کا تجزیہ کیا ہے جو شمالی بہار کے دربھنگہ، مظفر پور، بھاگل پور، پورنیہ اور مونگیر اضلاع پر مشتمل دربھنگہ راج کے پورے علاقے کو اپنی لپیٹ میں لے چکی تھی۔ بڑھی ہوئی قیمتوں سے وہ تمام لوگ بری طرح متاثر تھے جنھیں غذائی اجناس خریدنی پڑتی تھیں (ان میں چھوٹے کسان۔ بٹائی دار، زرعی مزدور وغیرہ شامل تھے)، جبکہ آبادی میں اضافے کا دباؤ زمین سے متعلق تنازعات میں روز بروز اضافے کا باعث ہو رہا تھا۔ جہاں چراگاہیں گھٹ رہی تھیں، ریاست دربھنگہ نے پرانی چراگاہوں کو لگان پر دینا شروع کردیا تھا اور درختوں پر اپنی ملکیت کا دعوا شروع کر دیا تھا۔ ریاست کے عمال (ایجنٹ) عام طور پر چھوٹے موٹے زمیندار ہوتے تھے جو مالی دباؤ کا حربہ استعمال کر کے بہت ظلم وزیادتی کرتے تھے۔ شکایتوں کے اظہار کے لیے کسانوں کے جلسوں کا سلسلہ 1919 کے موسم گرما سے شروع ہو گیا۔ اس کا آغاز شمالی دربھنگہ ضلع کی مدھوبنی تحصیل کے ایک گاؤں نارار میں 26 سے 30 جون تک ایک ریلی کی شکل میں ہوا۔ اس ریلی کی ترغیب بشو بھارن پرشاد نے دلائی تھی جو کہ ایک ایسے خوش حال دخل دار کاشت کار کے بیٹے تھے جس کی ضلع سارن میں 30 بیگہ زمین تھی، اور انھوں نے سوامی ودیانند کا نام اختیار کرلیا تھا اور گاندھی کی چمپارن تحریک سے ترغیب حاصل کی تھی اور خود کو اکثر گاندھی کا چیلا بتاتے تھے۔ زیادہ تر مطالبات ان شکایتوں سے تعلق رکھتے تھے جو کہ ریاست کے ایجنٹوں اور کارندوں کی لوٹ کھسوٹ، ظلم وزیادتی اور لگان داروں کے روایتی حقوق کو لاحق خطرات کا نتیجہ تھیں۔ تاہم یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ودیانند جنوب مشرقی دربھنگہ کے بٹائی دار کسانوں کو نقد لگان کے مطالبے کے لیے اکسا رہے تھے (بڑھتی

ہوئی قیمتوں کے زمانے میں نقد لگان ان لوگوں کے لیے قابل ترجیح بات تھی)۔ نچلی ذات کے یادؤوں اور تیلیوں سے جبراً گھی اور تیل وصول کرنے کی بھی شکایت تھی۔ مجموعی طور پر یہ تحریک پرامن رہی، ماسوااس کے کہ کچھ مقامات پر زبردستی درخت کاٹنے کے واقعات کے ساتھ ساتھ 20 جون 1920 کو کوٹھیاڈومائی میں تصادم بھی ہوا جس میں قریب کی بھوارا نیل فیکٹری (جوکہ در بھنگہ سے پٹے پر حاصل کی گئی تھی) کے لٹھ بندوں نے ودیانند کے ایک جلسے کو درہم برہم کردیا تھا۔ در بھنگہ راج کے فعال افسروں نے جلد ہی حالات کو کنٹرول کر لیا اور جنوری 1920 میں لگان داروں کو کسی قدر مراعات دیدی گئیں (مثلاً زمین کی منتقلی کی فیس میں کمی اور عمارتی لکڑی کے سلسلے میں بعض حقوق سے دست برداری وغیرہ)۔ خود ودیانند کا جھکاؤ 1920 کے آخر میں انتخابی سیاست کی طرف ہوگیا (شمالی در بھنگہ اور شمالی بھاگل پور میں زمیندار کے امیدواروں کے مقابلے میں پانچ کسان امیدوار جیتے تھے) اور سال کے آخر تک تحریک بھی دم توڑ گئی۔ در بھنگہ راج کو بہار کانگریس کی قیادت کے رویے سے بہت مدد ملی کیونکہ مدد کے لیے ودیانند کی درخواستوں پر بھی توجہ نہیں دی گئی۔ اپریل 1920 میں ڈاکٹر راجندر پرساد کے اصرار پر بہار کانگریس نے در بھنگہ کے لگان داروں کی شکایات کے بارے میں انکوائری کے مطالبے کو ترک کردیا؛ اور بھوارا کے واقعے کے بعد کانگریس کے لیڈروں، خصوصاً حسن امام، مظہر الحق اور راجندر پرساد کو اس بات کو لیے آسانی سے راضی کرلیا گیا کہ وہ ودیانند کے جلسے میں شرکت نہیں کریں گے۔ حکومتِ بہار کی ایک خفیہ رپورٹ کے مطابق "ترہت ڈویژن کے زمینداروں میں زبردست خوف وہراس پھیلا ہوا تھا...... یہ زمیندار اس معاملے میں، جسے کہ وہ زمینداروں پر ایک بڑا حملہ تصور کرتے تھے، نیل کے کاشت مالکان کے ساتھ سانٹھ گانٹھ کے لیے بھی تیار تھے۔ زمینداروں کا وفد حسن امام سے ملاقات کے لیے پٹنہ بھی آیا...... (مکتوب مورخہ 17 اگست 1920، گورنمنٹ آف انڈیا، ہوم، پولیٹکل ڈپوز، ستمبر (1920، نمبر 50)۔

ماجد صدیقی اور کپل کمار نے حال ہی میں جن مشہور کسان تحریکوں کا تفصیل سے جائزہ لیا ہے، ان میں سب سے اہم وہ تحریک ہے جو کہ یوپی کے اودھ ریجن کے پرتاب گڈھ، رائے بریلی سلطان پور اور فیض آباد اضلاع میں 20-1919 میں ابھری تھی۔ انگریزوں نے اودھ کے تعلقہ داروں کی وفاداری حاصل کرنے کی بھرپور کوشش کی تھی۔ اس کوشش کو ہرکورٹ بٹلر نے (جوکہ 1920 کی دہائی میں یوپی کا لفٹنٹ گورنر رہا تھا) "ہمدردی کی پالیسی" کا نام دیا تھا۔ اس کا مطلب لگان داروں کے سلسلے میں تعلقہ داروں کو پوری چھوٹ دیدینا تھا (صوبہ آگرہ کے برخلاف اودھ میں کسانوں کو حق دخل حاصل نہیں تھا) تاکہ لگان کو روز افزوں سرکاری مال گزاری سے بڑھا کر رکھا جا سکے۔ (اودھ میں 22-1921 کے دوران فی کس مال گزاری استمراری بندوبست والے بنگال

کے مقابلے میں چار گنا زیادہ تھی)۔ 1886 کے اودھ لگان ایکٹ میں اس سلسلے میں کوئی تحفظ فراہم نہیں کیا گیا تھا، کیونکہ قانونی لگان داروں کو لگان کو سات سال تک ایک سطح پر قائم رکھنے اور اضافے کی حد 6½ فی صد تک رکھنے کے سلسلے میں جو حقوق دیئے گئے تھے زمینداروں نے ان کی خلاف ورزی کی اور اضافی رقم (سات سال بعد لگان داری کی تجدید کے سلسلے میں) نذرانے کی شکل میں وصول کرنے لگے تھے اور یہ نذرانہ بسا اوقات اصل لگان سے بھی زیادہ ہوتا تھا۔ زمیندار یہ نذرانہ زمین سے بے دخل کر دینے کی دھمکی کے ذریعے وصولتے تھے۔ کسانوں کو دیگر قسم کے محصولات اور بیگار کا بھی نشانہ بنایا جاتا تھا۔ مثال کے طور پر زمیندار اپنی زیر کاشت زمینوں کی مفت جوتائی کراتے تھے اور ذات پات پر مبنی جمانی نظام بھی استحصال کا ایک کارگر وسیلہ بن گیا تھا، چنانچہ نچلی ذات والے اونچی ذت والے زمینداروں یا خوش حال کسانوں کو گھی، کپڑا اور کھال وغیرہ بلا قیمت یا بازار بھاؤ سے کافی کم قیمت پر سپلائی کرتے تھے۔ قیمتوں میں روز افزوں اضافے کی وجہ سے اس طرح کے محصولات اور بھی ظالمانہ شکل اختیار کر گئے تھے۔ زمینداروں کے ذریعے فوج میں جبریہ بھرتی اور لڑائی چندہ کی وصولی کے نتیجے میں جنگ کے برسوں کے دوران کسانوں میں بے چینی بہت بڑھ گئی تھی۔

مالویہ کے ایک متوسل (Protege) اندر نارائن دویدی فروری 1918 میں 'یوپی کسان سبھا' کی داغ بیل ڈال چکے تھے اور الہ آباد کی ہوم رول لیگ نیز کانگریسی لیڈروں کی ترغیب پر اس کی 450 شاخیں بھی قائم ہو چکی تھیں جو کہ زیادہ تر صوبہ آگرہ میں تھیں۔ یہ تحریک 1920 کے اواخر میں تقسیم ہو گئی۔ اس تقسیم کی وجہ کونسل کے بائیکاٹ کا معاملہ تھا۔ ہوا یہ تھا کہ دویدی کسان ووٹ لبرل امیدواروں کو دلانا چاہتے تھے جبکہ ان کے رفیق گوری شنکر مشرا نے تحریک عدم تعاون میں شامل ہو کر عوامی سطح کی کسان تحریک سے رابطہ قائم کر لیا تھا۔ یہ کسان تحریک اس وقت تک پرتاپ گڑھ۔ رائے بریلی خطے میں کافی زور پکڑ چکی تھی۔ اس تحریک کی بنیاد پرتاپ گڑھ کے ایک لگان دار جھنگری سنگھ اور بابا رام چندر نے رکھی تھی جو کہ ایک سنیاسی تھے اور فجی میں کئی سال تک اقراری مزدور کی زندگی گزارنے کے بعد پرتاپ گڑھ آ گئے تھے۔ بابا رام چندر اپنی تحریک میں سارا زور کسانوں کے اتحاد پر زور دیتے تھے اور اس کے لیے رامائن کی چوپائیوں اور ذات پات کے نعروں کا خوب استعمال کرتے تھے۔ چنانچہ پہلی کسان سبھا کے لیے پرتاپ گڑھ کے ایک گاؤں Roor کا انتخاب کیا گیا جس کی بہ ظاہر وجہ یہ تھی کہ اس نام کے گاؤں کا ذکر تلسی داس کے یہاں ملتا ہے۔ حال ہی میں بابا رام چندر کے جو کچھ بھی کاغذات سامنے آئے ہیں ان سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے بعد میں "کری کا نیتھ سبھا' بھی قائم کی تھی۔ اس تحریک کے مطالبات اور طریقہ کار، دونوں ہی اعتدال پسندانہ تھے۔ اضافی وصولیوں اور بیگار کا خاتمہ (یا کم از کم تخفیف)، بے

دخل زمینوں پر کاشت سے انکار، ظالم زمینداروں کا سماجی بائیکاٹ (نائی۔دھوبی بندھ)۔ یہ تحریک گاؤں پنچایتوں کے ذریعے منظم کی گئی تھی۔ بہر حال اس کسان تحریک کی اصل طاقت ستمبر 1920 میں اس وقت سامنے آئی جب کسانوں نے پرتاپ گڈھ میں ایک بڑے مگر پرامن مظاہرے کے ذریعے بابارام چندر کو رہا کرالیا تھا جنھیں چوری کے ایک جھوٹے الزام میں چندروز قبل گرفتار کیا گیا تھا۔ اس اثناء میں بابارام چندر جون 1920 میں سینکڑوں کسانوں کے ساتھ الہ آباد کا سفر کرنے کے بعد گوری شنکر مشرا اور جواہر لال نہرو کے ساتھ رابطے قائم کر چکے تھے اور جواہر لال نہرو نے کسانوں کے اندر گھلنا ملنا شروع کر چکا تھا۔ بعد میں جس کا ذکر انھوں نے اپنی خود نوشت میں کافی تفصیل سے کیا ہے۔ اکتوبر 1920 تک اودھ کسان سبھا اس طرح قائم ہو چکی تھی کہ پرتاپ گڈھ، رائے بریلی، سلطان پور اور فیض آباد میں اس کی 330 شاخیں تھیں۔ گاندھیائی کانگریس بھی یوپی کسان تحریک پر بالادستی حاصل کرنے کی کوشش کر رہی تھی، جیسا کہ ہم آگے چل کر جائزہ لیں گے، ان کوششوں کے نتائج کسانوں کے نقطہ نظر سے کافی اچھے ثابت ہوئے۔

1921-22: عدم تعاون اور خلافت

1921-22 کے دوران تحریک عدم تعاون میں شدت کو بہتر طور پر سمجھنے کے لیے اس کا تجزیہ تین سطحوں پر کرنا ضروری ہے۔ کل ہند تحریک کے مراحل، جس پر گاندھیائی کانگریس کی قیادت کافی زور دیتی ہے؛ ممتاز سماجی اور طبقاتی گروپوں کا رول، اور سب سے دلچسپ اور اہم، یعنی علاقائی اور مقامی انحرافات (فرق)۔

کل ہند تحریک

ورکنگ کمیٹی یا آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے مسلسل مطالبات کے رد عمل میں شروع کی گئی "سرکاری تحریک" کو چار مرحلوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ جنوری تا مارچ 1921، سارا زور اس پر رہا کہ طلباء سرکاری کنٹرول والے اسکولوں اور کالجوں سے باہر آجائیں، اور وکلاء عدالتوں کا بائیکاٹ کریں۔ یہاں تک کہ شروع شروع میں چرخہ پروگرام کو علمی حلقے میں بھی سراہا گیا اور طلباء نیز شہری علاقوں کے عام تعلیم یافتہ لوگوں سے کتائی کرنے کے لیے کہا گیا تاکہ اس طرح دیہی عوام کے ساتھ یکجہتی کا اظہار کیا جاسکے اور سودیشی کی منزل کو جلد از جلد حاصل کیا جاسکے۔ شروعات کافی زوردار رہی، کلکتہ، اور لاہور میں طلباء کی زوردار اسٹرائکیں ہوئیں اور سی۔ آر۔ داس اور موتی لال نہرو جیسے سرکردہ وکیلوں نے وکالت چھوڑ دی۔ لیکن جلد ہی یہ تحریک، جس میں زیادہ تر علمی حلقے شامل تھے، کم زور پڑنے لگی۔ اپریل میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے وجے واڑہ اجلاس میں یہ

طے پایا کہ ملک سول نافرمانی کے لیے ابھی تیار نہیں ہے اور فی الحال تلک سوراج فنڈ کے ایک کروڑ روپے اکٹھا کرنے پر ہی توجہ مرکوز رکھی جائے۔ اس کے لیے 30 جون تک ایک کروڑ لوگوں کو کانگریس کا ممبر بنانے اور 20 لاکھ چرخہ لگانے کا نشانہ بھی مقرر کیا گیا۔ پارٹی کی نچلی سطحوں کا دباؤ بڑھ جانے پر 28 تا 30 جولائی بمبئی میں منعقد AICC کے اجلاس میں نسبتاً زیادہ شدت پسندانہ رخ اپنایا گیا اور غیر ملکی کپڑوں کا بائیکاٹ (یہاں تک کہ غیر ملکی کپڑوں کی ہولی بھی جلائی گئی)، اور نومبر میں پرنس آف ویلز کے دورے کے بائیکاٹ پر زور دیا گیا مگر محصولات کی عدم ادائیگی کے سول نافرمانی جیسے معاملوں کو ایک بار پھر ملتوی کر دیا گیا۔ گاندھی نے جیلوں کو رضاکاروں سے بھر دینے کا نعرہ بھی دیا۔ "ہماری کامیابی اس میں ہے کہ جیلوں کو لوگوں سے اس طرح بھر دیا جائے جس طرح کہ بھیڑیں مذبح خانے کی طرف ہنکائی جاتی ہیں۔" چنانچہ اب اصل ترجیح رضاکار دستوں کی تیاری کو دی گئی۔ وائسرائے Reading بڑے پیمانے پر رضاکاروں کی بھرتی، تشدد آمیز مظاہرے، اور ہزاروں کی تعداد میں گرفتاریاں دینے کی شکل میں اپنائی گئی حکمت عملی کی اہمیت کو فوراً تاڑ گیا تھا۔ "گاندھی نے اب دانشور اور تعلیم یافتہ طبقے کو مخاطب کرنے کی بجائے عوام کو مخاطب کرنا شروع کر دیا ہے جس کی وجہ سے صورت حال بالکل ہی بدل گئی ہے۔ مگر اس کا ایک فائدہ بھی ہے اور وہ یہ ہے کہ اب تعلیم یافتہ دانشور اور متمول طبقے کو اور زیادہ قریب کیا جا سکے گا" (سکریٹری آف اسٹیٹ کے نام ٹیلی گرام 15 اکتوبر 1921)۔ پرنس آف ویلز کا استقبال 17 نومبر کو ایک انتہائی کامیاب ملک گیر ہڑتال کے ساتھ کیا گیا اور بمبئی میں تشدد کے واقعات بھی ہوئے جس پر گاندھی کو یہ اعلان کرنا پڑا کہ "سوراج...... کی مہک انھوں نے محسوس کر لی ہے" اور صرف ایک ہی علاقے یعنی باردولی تعلقے میں سول نافرمانی کے منصوبے کو ایک بار پھر واپس لے لیا گیا۔

بہر حال مختلف نوعیت کی رکاوٹوں کے باوجود بھی چوتھے مرحلے، یعنی نومبر 1921 اور فروری 1922 کے دوران حکومت گھٹنوں کے بل آ گئی تھی۔ نومبر میں علی برادران کی گرفتاری پر خلافت تحریک کے حسرت موہانی جیسے رہنما سخت برہم تھے۔ علی برادران نے جولائی میں کراچی خلافت کانفرنس میں تقریر کرتے ہوئے مسلمانوں سے اپیل کی تھی کہ وہ آرمی سے باہر آ جائیں۔ خلافت کے رہنما مکمل آزادی کا نعرہ بھی بلند کر رہے تھے۔ (جسے بعد میں دسمبر میں کانگریس نے بھی احمد آباد اجلاس میں اپنایا تھا)۔ خلافت رہنماؤں کا یہ بھی کہنا تھا کہ مکمل آزادی کے حصول کے لیے اب عدم تشدد کی بندش بھی توڑ دینی چاہیے۔ حکومت نے بڑے پیمانے پر گرفتاری کرنے اور جلسے جلوسوں پر پابندی لگا دینے کی جو نئی پالیسی اپنائی تھی اس کے نتیجے میں لبرل لیڈروں کے الگ تھلگ پڑ جانے کا خطرہ پیدا ہو گیا تھا۔ جیسا کہ ہم آگے چل کر جائزہ لیں گے، اگرچہ ملک کے بڑے حصے میں انتشار تھا مگر بغاوت کی آگ بھی بھڑکی ہوئی تھی۔ دسمبر 1921 میں ریڈنگ نے

مونٹیگو کے نام ایک خفیہ ٹلی گرام میں نہ صرف یہ کہ تمام قیدیوں کو رہا کر دینے کی تجویز رکھی تھی بلکہ ایک گول میز کانفرنس بلانے اور حال ہی میں نافذ کی گئی اصلاحی اسکیم پر جلد از جلد نظر ثانی کے لیے بھی مشورہ دیا تھا۔ گویا کہ اس طرح اس نے 1930 کی دہائی کے واقعات کو کافی پہلے بھانپ لیا تھا جبکہ گاندھی نے اس مرحلے پر کسی بھی طرح کی سودے بازی کو مسترد کر دیا تھا اور حکومت برطانیہ بھی کچھ کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھی۔ گاندھی نے اظہار رائے کی آزادی، اخبارات کی آزادی اور انجمن بنانے کی آزادی پر لگائی گئی پابندی کے خلاف باردولی سے ایک مالیاتی مہم شروع کرنے کا فیصلہ کیا۔ یہ تحریک فروری 1922 کے دوسرے ہفتے سے شروع ہونی تھی۔ جیسا کہ سبھی جانتے ہیں، اس منصوبے کے ساتھ ساتھ پوری تحریک کو ہی 11 فروری کو اچانک واپس لے لیا گیا۔ 5 فروری 1922 کو یوپی کے ضلع گورکھپور کے چوری چورا مقام پر 22 پولس مینوں کو زندہ جلا دینے کی خبر کے بعد گاندھی تحریک کو جاری رکھنے کے لیے کسی بھی طرح تیار نہیں تھے۔

سماجی بناوٹ

عدم تعاون سے متعلق دستیاب اعداد و شمار سے یہ پتہ چلتا ہے کہ اس تحریک کے سلسلے میں مختلف گروہوں کا ردعمل مختلف رہا تھا۔ اعلا اور متوسط طبقے سے ایثار و قربانی کی جو اپیل کی گئی تھی وہ کامیاب نہیں رہی۔ 5186 میں سے محض 24 خطابات لوٹائے گئے تھے۔ اور جن وکیلوں نے وکالت چھوڑ دی تھی ان کی تعداد مارچ 1921 میں 180 سے آگے نہیں بڑھ سکی تھی۔ نومبر 1920 کے انتخابات میں بہت کم لوگوں نے پولنگ میں حصہ لیا، یہ تناسب بمبئی میں تو محض 8 فیصد اور لاہور میں محض 5 فیصد تک رہا۔ بہر حال 637 میں سے 631 حلقوں کے لیے امیدواروں نے از خود پیش کش کی جس کے نتیجے میں کونسل کی کارروائی جاری رہی۔ تعلیمی حلقے کا بائیکاٹ زیادہ موثر ثابت ہوا۔ یہ بائیکاٹ تعلیم کے میدان میں زیادہ کامیاب رہا۔ جہاں اپریل 1921 تک روزانہ 20 ہیڈ ماسٹر اور ماسٹر استعفیٰ دیتے رہے تھے اور سرکاری کنٹرول والے اسکولوں اور کالجوں کے کل 103,107 طلباء میں سے 11,157 طلباء باہر آگئے تھے۔ سراغ رسان محکمہ کی خفیہ سرکاری رپورٹ میں جو کل ہند اعداد و شمار دیے گئے تھے ان کے مطابق اس بائیکاٹ کا اثر کالجوں تک ہی محدود رہا تھا۔

طلباء کی تعداد

آرٹس کالج	ثانوی اسکول	پرائمری اسکول
52482-1919-20	1.281.810	6.133.521
45933 1920-21	1.239.524	6.310.451

(حوالہ: History of the Non - Cooperation and Khilafat Movemnets (1925)By Bamford)

کچھ قومی اسکول اور کالج (مثلاً علی گڑھ میں جامعہ اسلامیہ جو بعد میں دہلی منتقل ہو گیا بنارس میں کاشی ودیاپیٹھ اور گجرات ودیاپیٹھ وغیرہ) قائم کیے گئے۔ بمبئی میں اس طرح کے 189 بنگال میں 190، یوپی میں 137 اور بہار و اڑیسہ میں 442 تعلیمی ادارے شروع کیے گئے۔ ان میں بہت سے اسکولوں کی عمر بہت کم رہی، خاص طور پر اس لیے بھی کہ ایک سال کے اندر سوراج حاصل نہیں کیا جاسکا تھا اور روایتی ڈگریوں اور ملازمتوں کی اہمیت پھر سے بحال ہو گئی تھی۔ البتہ جو چند ادارے جاتی رہ گئے وہ قوم پرستی کی اہم تعلیم گاہ ثابت ہوئے۔

البتہ معاشی بائیکاٹ 08-1905 سے بھی زیادہ کامیاب اور موثر ثابت ہوا۔ غیر ملکی کپڑے کی درآمد کاری 21-1920 میں 102 کروڑ روپے سے گھٹ کر 22-1921 میں 57 کروڑ روپے تک گر گئی۔ اسی طرح ان برسوں میں برطانیہ سے موتی کپڑوں کی برآمد کاری بھی بالترتیب 1292 ملین گز اور 955 ملین گز رہی تھی۔ اگرچہ مظاہرے اور دھرنے کو مسلسل اہمیت حاصل رہی مگر سوداگروں نے بھی یہ اجتماعی عہد کیا تھا کہ وہ مقررہ معیاد تک باہر سے کپڑا نہیں منگائیں گے۔ اس کے علاوہ کچھ دوسرے دلچسپ طریقے بھی اختیار کیے گئے۔ مثال کے طور پر روہتک کے لوگ بھی فروری 1920 کی ہڑتال میں محض اس وجہ سے شامل ہو گئے تھے کہ دہلی کے ایک تاجر نے روہتک کی ہنڈیوں کو قبول نہ کرنے کی دھمکی دیدی تھی۔ لنکا شائر سے کپڑا درآمد کرنے والوں کے لیے 1921 کی تحریک تھوڑے سے عرصہ کے لیے کاروباری فائدے کا بھی باعث ہوئی۔ پونڈ کے لحاظ سے روپے کی شرح تبادلہ 1921 میں 2 شلنگ سے گھٹ کر 1 شلنگ 2 پنس رہ گئی تھی اور ہندوستانی تاجروں سے ان برطانوی اشیاء کی اور زیادہ قیمت ادا کرنے کے لیے کہا جارہا تھا جنھیں درآمد کرنے کا معاہدہ پہلے ہی ہو چکا تھا۔ گاندھی ینگ انڈیا میں مضامین کے ذریعے صنعت کاروں اور چرخہ کے درمیان امکانی مخاصمت کو کم سے کم کرنے کی کوشش کرتے آرہے تھے۔ ان کا یہ کہنا تھا کہ فی الوقت ان کی تحریک کا مقصد یہ ہے کہ سوت اور کپڑے کی کمی کو ملوں کے ذریعے پورا کیا جائے۔ (ینگ انڈیا، 19 جنوری 1921)۔ اسی مضمون میں یہ بھی کہا گیا تھا کہ مشینوں کے سلسلے میں گاندھی کے فی الحال ایسے کوئی عزائم نہیں ہیں۔

کانگریس کی مالی حالت میں تبدیلی میں کاروباری حلقے کی مدد نے اہم رول ادا کیا۔ 1920 میں AICC کے خزانے میں محض 43.000 روپے تھے مگر اس نے 1921 اور 1923 کی درمیانی مدت میں 130 لاکھ روپے سے زیادہ اکٹھا کر لیے تھے اور وہ بھی اس طرح کہ ایک کروڑ روپے کے تلک سوراج فنڈ کے لیے 37.5 لاکھ روپے صرف بمبئی شہر سے اکٹھا ہوئے تھے۔ تحریک عدم تعاون کے

لیے کاروباری حلقے کی مدد اور تائید پر انگریزوں کے کان پہلے ہی کھڑے ہو گئے تھے چنانچہ اکتوبر 1921 میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ ایک ایسا مالیاتی کمیشن تشکیل دیا جائے گا جس میں ہندوستانی نمائندے ہندوستانی صنعتوں کو محصولاتی تحفظ فراہم کرنے کے سوال کا جائزہ لیں گے۔ بہر حال کاروباری طبقے کے ایک قابل لحاظ حصے کی برہمی اس فیصلے کے بعد بھی برقرار رہی اور 1920 میں پرشوتم داس ٹھاکر داس، جمناداس دوارکاداس، کوواس جی جہانگیر، فیروز سیٹھنا اور سیتل واد نے Anti-Non-Cooperation Association کے نام سے ایک تنظیم بناڈالی تھی۔ جہاں سودیشی تحریک کے شباب کے زمانے میں کپڑا صنعت کو بہت مدد ملی تھی (1913 میں 100 عدد اشاریہ کے حساب سے اکتوبر 1921 میں کپڑا ملوں کے حصص کی قیمتوں کا اوسط 275 تک پہونچ گیا تھا جب کہ عام حصص کی قیمتوں کا اوسط محض 248 تھا)؛ وہیں مزدور طبقے میں عام بے چینی کے خدشے (جو کہ 1920-21 میں اپنے شباب پر تھا) کے تئیں سوداگروں کے رویے کے برخلاف صنعت کاروں کا رویہ کافی غیر واضح رہا تھا۔ کلکتہ میں انگریز تاجروں کے ترجمان۔ کیپٹل نے بھی کچھ اسی طرح کی بات 13 جولائی 1922 میں کہی تھی۔ کیپٹل کا کہنا تھا کہ قوم پرست سیاست کے نتیجے میں مل مالکان کا دائرہ کافی بڑھ گیا ہے اور ان کی مصنوعات کی بکری کو بھی خوب بڑھاوا ملا ہے۔ اگر تشویش کی کوئی بات ہے تو یہ کہ ورکر طبقہ کسی بھی وقت بے قابو ہو سکتا ہے" (حوالہ: سبیہ ساچی بھٹاچارجی، کاٹن ملز اینڈ اسپننگ وہلیز، سودیشی اینڈ دی انڈین کیپٹلسٹ کلاس، 1920-22، اکونومک اینڈ پولیٹکل ویکلی، 20 نومبر 1976)۔

محنت کش طبقہ 1921 میں پورے سال واقعی بے قابو رہا، 398 ہڑتالیں ہوئیں جن میں 600,351 ورکروں نے حصہ لیا اور 6,994,426 کام دنوں کا نقصان ہوا۔ جنگ کے خاتمے کے بعد جو تھوڑی بہت معاشی پیش رفت ہوئی تھی وہ 1920 کے وسط میں، اور خاص طور پر کلکتہ کی جوٹ صنعت میں، کساد بازاری میں تبدیل ہو گئی اور مل مالکان نے چار دن کے ہفتے کے ذریعے پیدا کاری میں کمی کرنے کی کوشش کی۔ ورکروں نے اس کا مقابلہ کیا۔ 1921 میں بنگال کی جوٹ ملوں میں 137 ہڑتالیں ہوئیں جن میں 186,479 ورکر ملوث تھے۔ سوامی وشوانند اور سوامی درشانند نے رانی گنج۔ جھریا بیلٹ کے کوئلہ مزدوروں کو منظم کرنے کی کوشش کی۔ اس میں انھیں شروع میں ان ہندوستانی کان مالکوں سے مدد ملی جو یوروپی بالادستی کا مقابلہ کر رہے تھے۔ دسمبر 1921 میں آل انڈیا ٹریڈ یونین کانگریس کے جھریا اجلاس کی خاص بات یہ تھی کہ اس میں ان لوگوں نے بھی بڑی تعداد میں حصہ لیا جو واقعی محنت کش تھے۔ یہ بھی قابل ذکر ہے کہ 1922 کے بعد AITUC کے اجلاس سے اس طرح کے عناصر برسوں غیر حاضر رہے تھے۔ بعض ہڑتالوں میں زیادہ تر مدراس اور بنگال میں مقامی کانگریسی لیڈر بھی سرگرم رہے تھے۔ بہر حال اس سلسلے میں گاندھی کا

موقف بالکل واضح اور دو ٹوک تھا: پر امن عدم تعاون کے منصوبے میں ہڑتالیں شامل نہیں ہیں" (اسٹرائکس، ینگ انڈیا، 16 فروری 1921) "ہندوستان میں ہم سیاسی ہڑتالیں ہرگز نہیں چاہتے...... ہمیں ایسے تمام قانون شکن اور انتشار پسند عناصر کو قابو میں رکھنا ہوگا...... ہم سرمائے یا سرمایہ داروں کو تباہ نہیں کرنا چاہتے...... بلکہ سرمائے اور محنت کے باہمی تعلقات کو باضابطہ بنانا چاہتے ہیں۔ ہم سرمائے کو اپنے فائدے کی طرف لانا چاہتے ہیں۔ ہڑتالوں کی تائید کرنا حماقت ہوگی" (حوالہ: The Lesson of Assam; Young India 15-6-1921)۔ کسانوں کے لیے، جنھیں مہاتما نظریاتی طور پر ہمیشہ اولیت دیا کرتے تھے، گاندھی نے اپنی مدد آپ کے ذریعے گاؤں کی تعمیر نو کا جو پروگرام تیار کیا تھا اس میں چرخے اور کرگھے (کھادی)، پنچایتوں، تنازعات کے عدالت سے باہر تصفیے، قومی اسکولوں، ہندو مسلم اتحاد کی مہم، نشہ بندی، اور چھوت چھات کے خاتمے کے ذریعے معاشی احیاء پر زور دیا گیا تھا۔ بہار اور اڑیسہ میں پنچایتیں بہت مقبول ہوئیں جبکہ بنگال میں فروری 1921 اور اپریل 1922 کی درمیانی مدت میں 866 ثالثی عدالتیں قائم ہو چکی تھیں اور اگست 1921 میں تو ان عدالتوں کی تعداد سرکاری عدالتوں سے بھی بڑھ گئی تھی۔ (حوالہ ہسٹری آف نان کو آپریشن ان بنگال۔ بنگال گورنمنٹ، پولیٹکل کنفیڈنشیل، 395/1924)۔ شراب کے خلاف مہم تو بہت خوفناک شکل اختیار کر گئی، جس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اس شراب بندی مہم کو نچلی ذاتوں نے اپنی سماجی ترقی کے ایک بڑے موقع کے طور پر استعمال کیا۔ شراب نوشی کے خلاف مہم کے نتیجے میں صرف پنجاب میں 22-1921 تک سرکاری مالیہ میں 33 لاکھ روپے کے بقدر کمی آگئی تھی اور مدراس میں بجٹ کا خسارہ 65 لاکھ روپے تک بڑھ گیا تھا۔ چرخہ مہم کے اثرات کے بارے میں واضح اعداد و شمار دستیاب نہیں ہیں لیکن 1920 اور 1923 کی درمیانی مدت میں ہتھ کرگھے کے ذریعے کپڑے کی تیاری بہت بڑھ گئی تھی۔ خلافت تحریک کے نتیجے میں ہندو مسلم اتحاد ایک طاقت ور حقیقت کی شکل میں ابھرا مگر عارضی ثابت ہوا۔ چھوت چھات کے خلاف مہم میں بھی قابل ذکر پیش رفت نہیں ہوئی مگر اس بات کا سہرا گاندھی کے سر ہے کہ سب سے پہلے انھوں نے ہی اسے قومی سیاست کے ایجنڈے میں سرفہرست جگہ دی۔ خود ان کے اپنے گجرات میں 1920 کے اواخر میں اس فیصلے سے کہ Antyajas ذات کے بچوں کو داخلہ نہ دینے والے اداروں کو قومی اسکول کے طور پر تسلیم نہیں کیا جائے گا، بحران جیسی صورت حال پیدا ہو گئی تھی (ینگ انڈیا، 24 نومبر 1920)۔ جبکہ ایک سال بعد بار دولی کے ایک گاؤں میں اونچی ذات والوں نے گاندھی کا انتظار کر رہے اچھوتوں کو اس وقت تک کافی فاصلے پر روک رکھا تھا جب تک کلیان جی مہتہ نے اونچی ذات والوں کی خوب ڈانٹ ڈپٹ نہیں کی تھی۔ (کرشن داس، سیون منتھس ود مہاتما گاندھی، حصہ دوم، صفحہ 37)۔

چنانچہ سارا زور اتحادی امور پر دیا گیا اور طبقاتی دوریوں کو کم سے کم کرنے کی کوشش کی گئی۔ چنانچہ مال گزاری کی عدم ادائیگی کا منصوبہ بنایا گیا۔ یہ منصوبہ کافی پس و پیش کے بعد کسی زمینداری والے علاقے کی بجائے، جہاں کہ دیگر محصولات میں لگان بھی شامل ہو جاتی، بادولی جیسے ایک رعیت واڑی تعلقے کو چنا گیا تھا۔ یوپی میں 1921 کے اوائل کے کسان بلووں کے بعد گاندھی نے فیض آباد میں تقریر کرتے ہوئے ایسی تمام کوششوں کی مذمت کی جن سے لگان داروں اور زمین داروں کے درمیان دوریاں بڑھتی ہوں۔ انھوں نے لگان داروں کو یہ تلقین کی کہ وہ ٹکراؤ کا راستہ اختیار کرنے کی بجائے صبر سے کام لیں کیونکہ انھیں بھی سب کے ساتھ مل کر سب سے بڑے زمیندار، یعنی حکومت کے خلاف جنگ میں حصہ لینا ہے (لیڈر، 13 فروری 1921)۔ ایک ماہ بعد یوپی کے کسانوں کو ہدایات جاری کرتے ہوئے کہا گیا کہ اگر کسی کسان لیڈر کی گرفتاری کی نوبت آئے تو وہ کسی بھی قسم کی بدامنی نہ ہونے دیں۔ ان ہدایات کے ذریعے یہ واضح حکم دیا گیا کہ "ہم حکومت کے محصولات یا زمیندار کے لگان کو نہیں روک سکتے...... یہ بات ذہن میں واضح ہونی چاہیے کہ ہم زمینداروں کو دوست بنانا چاہتے ہیں" (ینگ انڈیا 9 مارچ 1921)

علاقائی عدم یکسانیت

عدم تعاون کے باہم متغیر ابعاد اور تضادات کو مقامی اور علاقائی سطح کے مطالعے اور تجزیے کے ذریعے زیادہ بہتر طریقے پر سمجھا جاسکتا ہے اور اس سلسلے میں حال کی تحقیقی کاوشوں کے ذریعے اعداد و شمار بڑی تیزی سے اکٹھا کیے جارہے جارہے ہیں حالانکہ ابھی بہت سی کڑیوں کی نشان دہی نہیں ہو پائی ہے۔

پنجاب میں عدم تعاون کا آغاز لاہور میں تعلیمی اداروں سے طلباء کے باہر نکل آنے سے ہوا جس کی ترغیب جنوری 1921 میں لاجپت رائے نے دلائی تھی لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس صوبے کے شہروں میں یہ تحریک اپریل 1919 کے برخلاف کمزور رہی جس کی وجہ شاید یہ تھی کہ انگریزوں کے 1919 کے مظالم کی یاد لوگوں کے ذہنوں میں ابھی تازہ تھی۔ سکھوں کے غلبے والے پنجاب کے وسطی دیہی علاقے میں مذہبی اصلاح کی تحریک کی وجہ سے اکالیوں کا زور بڑھ رہا تھا اور کچھ عرصہ کے لیے تو مذہبی اصلاح کی آزاد تحریک اور عدم تعاون کی تحریک ایک دوسرے کے ساتھ گڈمڈ ہو گئی تھیں۔ اکالی سکھ عبادت گاہوں، گردواروں کو بدعنوان مہنتوں کے چنگل سے نکال کر انھیں اپنے کنٹرول میں لانے کی جد و جہد کر رہے تھے۔ اور ان مہنتوں نے انگریز افسروں کے ساتھ سانٹھ گانٹھ قائم کر رکھی تھی۔ حکومت کے ذریعے مقرر کردہ امرت سر کے سورن مندر کے پربندھک ارڑ سنگھ (Arur Singh) نے تو جنرل ڈائر کو اعزازی سکھ بن جانے کی پیش

کش تک کر دی تھی اور "یہاں تک کہ نکال سیان صاحب (نکلسن جس نے 1857 میں دہلی میں قتل عام کرایا تھا) سکھ بن گیا تھا"۔ 20 فروری 1921 کو ننکانہ صاحب کے المیے کی وجہ سے کشیدگی بڑھ گئی تھی۔ ہوا یہ تھا کہ مہنت نے تقریباً ایک سو سکھوں کو تہ تیغ کرا دیا تھا اور ایسا کرانے میں لاہور کے ڈویژنل کمشنر کا ہاتھ ہونے کا شک تھا اور اس شک کی وجہ بھی تھی، نومبر 1921 میں انگریزوں نے سورن مندر کے خزانے کی کنجی دینے سے انکار کر دیا تھا جس پر راست ٹکراؤ ہوا اور اکالیوں نے بڑے پیمانے پر گرفتاریاں دیں۔ عدم تعاون اور اکالیوں کی تحریک ایک وقت میں ہی چلنے کے نتیجے میں انگریزوں کو رویہ نرم کرنا پڑا، کنجیاں حوالے کرنی پڑیں اور جنوری 1922 کے وسط تک گرفتار شدہ لوگوں کو رہا کر دیا گیا۔ جنوری 1922 کی ایک سرکاری رپورٹ میں جن 15,506 اکالی رضاکاروں کی فہرست دی گئی تھی ان میں سے بیشتر جاٹ سکھ کسانوں اور خصوصاً جالندھر، ہوشیارپور، امرتسر، شیخوپورہ، اور لائل پور اضلاع سے تعلق رکھتے تھے۔ جہاں شرومنی گردوارہ پربندھک کمیٹی کی قیادت والی باضابطہ اکالی تحریک غیر تشدد پسندانہ طریقوں پر سختی سے کاربند رہی، اکالی دل کا ناراض گروپ، ببر اکالی، جو کہ کشن سنگھ اور موتا سنگھ کی قیادت میں مارچ 1921 میں جالندھر اور ہوشیارپور میں پیدا ہوا تھا اور لگان نہ ادا کرنے کی تحریک چلا رہا تھا، وہ کبھی کبھی حکومت کے وفاداروں کے خلاف دہشت پسندی پر بھی اتر آتا تھا۔ کبھی کبھی مہاجن اور ساہوکار بھی اس گروپ کا نشانہ بن جاتے تھے۔ اکالی تحریک جاری رہی یہاں تک کہ نومبر 1925 کے سکھ گردوارہ ایکٹ کے تحت گردواروں پر شرومنی گردوارہ پربندھک کمیٹی کا کنٹرول قائم ہو گیا۔ بہرحال وسیع تر قومی تحریک کے ساتھ رابطہ 1922 کے بعد دھیرے دھیرے ختم ہو تا گیا اور صوبہ اس فرقہ وارانہ یک جہتی سے بھی محروم ہو تا گیا جو کہ بڑی مشکل سے قائم ہو پائی تھی۔ وائسرائے کے کان اس حد تک کھڑے ہو گئے تھے کہ اس نے اس فرقہ وارانہ یک جہتی کو "خلافت، کانگریس اور متعدد سکھ تنظیموں کے درمیان قریب ترین رابطے" کا نام دیا تھا (سکریٹری آف اسٹیٹ کے نام ٹیلی گرام 9 نومبر 1921)۔

مضبوط کسان تحریک کے سلسلے میں ایک نمایاں اور دلچسپ تفاوت راجوں اور رجواڑوں والے صوبے، راجستھان میں سامنے آیا۔ راجستھان میں کسان تحریک کافی آگے چل کر اس شہری قوم پرستی کا پیش خیمہ ثابت ہوئی جو کہ انگریزوں کی عملداری کے علاقے اجمیر میں "راجستھان سیوا سنگھ" کی شکل میں 1920 میں شروع ہو چکی تھی۔ جیسا کہ پہلے ذکر کیا جا چکا ہے، میواڑ میں بجولیا تحریک کو 1922 میں جزوی طور پر کامیابی حاصل ہو گئی تھی۔ جبکہ مہارانا اودے پور کی خالصہ زمینوں پر چنگی اور بیگار کے خلاف احتجاج کا سلسلہ روایتی سالانہ متری کنڈیا میلے کے موقع پر ایک کسان ریلی کے ساتھ شروع ہو چکا تھا۔ بجولیا تحریک کے لیڈر مانک لال ورما نے قوم پرست تحریک

"میواڑ پر جامنڈل" کی بنیاد بہت بعد میں، 1938 میں رکھی تھی۔ موتی لال تیجاوت کی قیادت میں بھیل قبائلی تحریک 22-1921 میں اور زیادہ تشدد پسندانہ رخ اختیار کر گئی؛ اور دسمبر 1921 میں الور کے میو لوگوں نے پڑوس کے ضلع گڑگاؤں کے ایک پولس تھانے پر بلہ بول دیا تھا۔ اس تحریک کو برطانوی ہند کی پولس نیز ریاست الور کی پولس کی مشترک کاروائی کے ذریعے کچل دیا گیا۔

بمبئی پریزیڈنسی کے علاقے میں خلافت تحریک کی وجہ سے مسلم تاجروں اور سندھ کے کسانوں میں کافی جوش وولولہ پیدا ہو گیا تھا۔ اس علاقے کی ہندو اقلیت نے جے رام داس اور سوامی گووندانند کی شکل میں دو رہنما پیدا کیے۔ سابق الذکر گاندھی کے قریبی ساتھی تھے جبکہ آخرالذکر کو غداری کے الزام میں مئی 1921 میں پانچ سال قید کی سزا ہوئی تھی۔ سوامی گووندانند نے بعد میں کانگریس کی قدامت پرستی کو اپنی تنقید کا ہدف بنایا تھا۔

گاندھیائی تحریک سب سے زیادہ طاقت ور گجرات میں تھی۔ دسمبر 1921 میں کرشن داس نے مہاتما کے ساتھ باردولی تعلقہ کے دورے کا جس طرح ذکر کیا ہے اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ علاقے میں کسانوں کے اندر بیداری پیدا ہو رہی تھی۔ یہ بیداری اچانک ہی بہت زور پکڑ جانے کے ساتھ ساتھ پوری طرح سے قابو میں اور منضبط تھی (سیون منتھس ود مہاتما گاندھی، جلد دوم، صفحہ 40-27)۔ عدم تشدد کا یہ نظریہ پٹہ دار کسان مالکان کے مفادات کے عین مطابق تھا؛ کیونکہ تحریک کے بے لگام ہو جانے کی صورت میں نچلی ذات کے یا قبائلی زرعی مزدوروں اور دیہی خدمت گزاروں کو (مثلاً کھیڑا میں بریّوں یا باردولی کے کالی پرج سیاہ فام لوگوں جو کہ گوری چمڑی والے ہندوؤں (اجلی پات) سے ممیز تھے) کنٹرول کرنا مشکل ہو جاتا۔ اگرچہ اس تحریک کے سلسلے میں کھیڑا میں برساڑ اور آنند کو مرکزی مقام کی حیثیت حاصل رہی مگر گاندھی نے سول نافرمانی کے پہلے مرکز کے طور پر باردولی کو ترجیح دی۔ اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ فطرتاً سرکش بریوں کے مقابلے میں کالی پرج کہیں زیادہ پس ماندہ اور فرمانبردار قسم کے لوگ تھے۔ بریوں کی سماجی لوٹ پاٹ 1921 میں کھیڑا میں اس وقت نقطۂ عروج کو پہونچ گئی تھی جب ڈاکہ زنی کی 70 وارداتیں ہوئی تھیں، ان میں سے بیشتر ڈکیتیوں کا سرغنہ بابر دیوا تھا جس نے نچلی ذات والوں کے لیے ایک روایتی ہیرو کی حیثیت حاصل کر لی تھی۔ (حوالہ Haridınan: Peasant Agitations, pp 201.206)۔

بمبئی میں حالات کافی پیچیدہ تھے۔ جہاں گجراتی بیوپاریوں، پیشہ ور گروپوں اور کلرکوں نے جوش و خروش کے ساتھ تائید کی، مہاراشٹری ابھی بھی تلک کے سوگ میں تھے (یکم اگست 1920 کو ان کی ارتھی میں 2,00,000 لوگوں نے حصہ لیا تھا) اور گاندھی کی طرف سے ان کا دل صاف نہیں تھا؛ اور جہاں تک صنعتی مزدوروں اور نچلی ذات کے مسلمانوں کا تعلق تھا، تو انھیں کنٹرول کرنے کا مسئلہ تھا۔ 17 نومبر 1921 کی ہڑتال بڑی تیزی سے بلوؤں کی شکل اختیار کر گئی کیونکہ علی

برادران کی گرفتاری سے برہم ہو کر مسلمانوں اور مراٹھا ورکروں نے گوروں، عیسائیوں، انگریز زدہ پارسیوں یہاں تک کہ کہیں کہیں یوروپی پوشاک استعمال کرنے والوں پر بھی حملے شروع کر دیئے تھے۔ تقریباً 20 لوگ مارے گئے تھے۔ بہر حال گاندھی نے خود کو اس بات سے تسلی دے لی تھی کہ ان کے بھوک ہڑتال کے فیصلے کے نتیجے میں ہی یہ فسادات 23 نومبر کو رک گئے تھے۔ اس وقتی اُبال، سے کہیں زیادہ اہم اور دیرپا اثر کا حامل انقلاب پسند طالب علموں کے ایک گروپ کا ظہور تھا۔ یہ گروپ 1921 میں ایس اے ڈانگے، آر ایس نمب کار، وی۔ ڈی۔ ساٹھے، اور آر وی نند کرنی کی قیادت میں وجود میں آیا تھا۔ (جس میں بعد میں ایس۔ وی۔ دیش پانڈے اور کے۔ ایل جوگیلکر بھی شامل ہو گئے تھے)۔ یہ لوگ تحریک عدم تعاون میں بھرپور طریقے پر سرگرم تو تھے مگر گاندھی کے نکتہ چیں تھے اور مارکسی تصورات میں دلچسپی لینے لگے تھے۔ یہ دلچسپی اس لٹریچر کے مطالعے کا نتیجہ تھی جو کہ اشتراکیت کی طرف جھکاؤ رکھنے والے ایک لکھ پتی آر۔ بی۔ لوٹ والا نے فراہم کیا تھا۔ ڈانگے نے اپنی اپریل 1921 کی ایک تحریر۔ **Gandhi Versus Lenin** میں گاندھی کے فلسفے کا (جس کے سلسلے انھوں نے ٹالسٹائی تک جا ملائے تھے) بھرپور تقابل لینن کے فلسفے سے کیا تھا اور ایک ایسے 'سوراج'، کا تصور پیش کیا تھا جس میں تمام بڑے کارخانے قومی ملکیت میں لے لینے، دولت کی ایک حد مقرر کرنے اور زمینداری کی زمینوں کو کسانوں میں پھر سے تقسیم کر دینے کی بات کہی گئی تھی۔ عدم تشدد کو ایک کارگر حربے کے طور پر تسلیم کرتے ہوئے اس کتابچے میں، ٹیکس کی عدم ادائیگی اور عام سیاسی ہڑتال کا طریقہ اپنانے پر بھی زور دیا گیا تھا "اگر ہم کامیاب ہوتے ہیں تو ہم یہ کامیابی پرولتاری طبقے، یعنی مزدوروں اور کسانوں کی مدد کے ذریعے ہی حاصل کر سکیں گے"۔

عدم تعاون تحریک مہاراشٹر میں نسبتاً کم زور رہی جہاں تلک حامی سیاسی قیادت گاندھی کے سلسلے میں اتنی پرجوش نہیں تھی نیز غیر برہمن آبادی 1930 کی دہائی تک اس خیال کا شکار رہی تھی کہ کانگریس اونچی ذات والوں کی انجمن ہے اور اس خیال کی کچھ معقول وجوہ بھی تھیں۔ دوسرے علاقوں کی طرح ہی مہاراشٹر میں بھی گاندھیائی کنٹرول کمزور رہا تھا جس کے نتیجے میں مقامی نوعیت کے تشدد کے واقعات بھی ہوئے۔ ضلع ناسک میں مسلم اکثریت کے ایک علاقے، مالیگاؤں میں خلافت کے سلسلے میں جمع کچھ لوگوں نے 25 اپریل 1921 کو تین پولس مینوں کو زندہ جلا ڈالا تھا جو کہ دراصل چند مسلم لیڈروں کی گرفتاری کا ردعمل تھا۔ پونا کے قریب واقع ملشی پیٹا کے کسانوں نے اپنی زمینوں کے بچاؤ کے لیے ستیہ گرہ کا طریقہ اختیار کیا تھا۔ ٹاٹا ایک پن بجلی پروجکٹ کے لیے کسانوں کی یہ زمینیں حکومت کی مدد سے حاصل کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ پونا کانگریس نے ان کسانوں کا معاملہ اپریل 1921 میں اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا اور یہ جدوجہد رک رک کر برسوں جاری رہی تھی۔

عدم تعاون اور خلافت تحریک کی کل ہند نوعیت کا اندازہ اس بات سے بھی ہوتا ہے کہ اس

کے سلسلے جنوبی ہند کے کافی اندر تک جا پہونچے تھے۔ جنوبی ہند کے چاروں لسانی خطوں میں صرف کرناٹک ہی اس تحریک سے غیر متاثر رہا تھا۔ کرناٹک میں سیاسی بیداری کا سلسلہ 1930 کی دہائی سے ہی شروع ہو سکا تھا۔ دوسرے علاقوں کی طرح ہی مدراس پریزیڈنسی میں بھی شروع شروع میں اس تحریک کی اپیل صرف اونچے اور متوسط طبقے کے پیشہ ور گروپوں تک ہی محدود رہی تھی؛ اس طرح کہ 682 میں سے صرف 6 خطاب داروں نے اپنے خطاب واپس کیے تھے۔ تامل علاقے کے صرف 30 اور آندھرا علاقے کے 103 وکلاء نے وکالت چھوڑی تھی اور محض 92 قومی اسکول قائم کئے گئے جن کے طلباء کل تعداد تقریباً 5000 رہی ہوگی۔ مدراس شہر میں تحریک مل ورکروں کی شورش کی شکل میں نمایاں ہوئی جس کے عروج کے زمانے میں گوروں کی ملکیت والے بکنگھم اور کرناٹک کپڑا ملوں میں جولائی سے اکتوبر 1921 تک، یعنی چار ماہ ہڑتال رہی تھی۔ اس ہڑتال کو عدم تعاون تحریک کے مقامی لیڈروں، خصوصاً تھیرووی کا، (Thiru Vika) کی تائید حاصل رہی تھی۔ حکومت نے (جس میں 1921 کے انتخابات کے بعد براہمن مخالف جسٹس پارٹی کے وزراء بھی شامل ہو چکے تھے) اچھوت آدی دروڑوں کو ہڑتال چلانے والے ذاتیلے ہندوؤں کے مقابلے پر لاکر ہڑتال کو ناکام بنانے کی کوشش کی۔ جبکہ دوسری طرف قوم پرست لیڈرشپ نے ہڑتال فنڈ کی بجائے چرخے پیش کر کے مل مزدوروں کی اس تحریک کو گاندھیائی حکمت عملی سے منسلک کرنے کی غیر حقیقت پسندانہ کوشش کی۔ قوم پرستی کو کسی لیبر تحریک کے ساتھ بریکیٹ کرنے (جوڑنے) کی کوشش کا یہ تجربہ مدراس کے ایک بزرگ وکیل اور رضاکار آرگنائزر سنگرا ویلو چیٹیار کو سڑک پر لے آیا اور وہ جنوبی ہندوستان میں پہلے کیونسٹ کی حیثیت حاصل کر گئے۔ سنگراویلو نے گاندھی کے نام 5 مئی 1921 کے مکتوب میں کسان تحریکوں پر روک لگانے کی گاندھی کی کوششوں کی مذمت کی اور "سرمایہ دارانہ شخصی حکومت" کے خلاف پُرامن عدم تعاون کا راستہ اپنانے کی اپیل کی اور ایک ایسے وسیع المشربی کیمونزم، کی وکالت کی جس میں چرخہ بھی شامل تھا جس کے ذریعے ملک کا ہر گھرانہ اپنے آجر سے آزادی حاصل کر سکتا تھا...... "محض اسی وجہ سے میں یہ چاہتا ہوں کہ ہم میں ہر شخص کے پاس زمین کا ایک ٹکڑا ہونا چاہیے......"۔

براہمنوں کے قدامت پرستانہ جذبات، نٹاڈار، سوراشٹری اور کومتی جیسی غیر براہمن ذاتوں کے سنسکرتیانے کی کوشش نیز لائی سنس کی شرحوں میں اضافے کے ذریعے مالیہ میں اضافے کے لیے حکومت کی کوشش، شراب کے ڈیلروں کی حکومت سے برہمی اور اس طرح کی دوسری کئی باتیں شراب کی دکانوں پر مظاہروں کا باعث ہوئیں جو کہ عدم تعاون کی تحریک کی کامیاب شکل اختیار کرتی گئی تھیں۔ عدم تعاون کی یہ شکل ساحلی آندھرا اور تامل ناڈو کے اندرونی علاقوں میں نسبتاً بہت زیادہ کامیاب ثابت ہوئی تھی۔ حکومت مدراس کی پریشانی بہت بڑھ گئی تھی کیونکہ 1920

کی دہائی کے اوائل تک اسے 20 فی صد سے زائد مالیہ آب کاری سے حاصل ہو تا رہا تھا، یہ ایک ایسا تناسب تھا جو کہ دوسرے صوبوں کے مقابلے میں بہت زیادہ تھا۔ اس طرح کی تحریکوں کے نتیجے میں ایک نئی، خصوصاً گاندھیائی قیادت سر ابھار رہی تھی جس کا مرکز تامل ناڈو کا اندرونی علاقہ تھا اور جس کی باگ ڈور سیلم کے ایک وکیل راج گوپال آچاری کے ہاتھ میں تھی جنھوں نے 1921 میں وکالت چھوڑ دی تھی۔ اس کے برخلاف مدراس شہر کے ستیہ مورتی یا کستوری رنگا آئینگر جیسے قوم پرستوں نے عدم تعاون کو نیم دلی سے قبول کیا تھا۔ گویا اس سلسلے میں ان لوگوں نے مہاراشٹر کے تلک حامیوں یا بنگال کے سی۔ آر۔ داس جیسا رویہ اختیار کیا تھا۔

بہر حال تحریک عدم تعاون کو سب سے زیادہ طاقت آندھرا کے ڈیلٹا والے علاقے میں حاصل ہوئی جہاں کونڈا ونکاپیا، اے کالیسوررداؤ، ٹی، پرکاسم، اور پٹہ ابھی ستیہ رمیا جیسے مضبوط لیڈر تھے اور تاجر طبقے کی طرف سے قابل لحاظ تائید اور مدد حاصل تھی (مثال کے طور پر ایلور کے Mothey گھرانے، یا راجہ مندری ایوان تجارت نے کافی مدد کی۔ آخرالذکر نے تو عملاً عدم تعاون کمیٹی کی حیثیت اختیار کرلی تھی)۔ 1921 کے دوران پورے آندھرا میں پھیلی ہوئی بیداری کی لہر کی جھلک انوا لکشمی نارائن کے ناول مالا پلی (1922) میں بھی ملتی ہے۔ اس ناول کا ہیرو اونچی ذات کے ہندو زمینداروں اور اچھوتوں کے درمیان تناؤ کو کم کرنے کے لیے گاندھیائی طریقہ کار کی وکالت کرتا ہے۔ لیکن اس ہیرو کا ایک جذباتی بھائی بھی ہے جو کہ ایک طرح کا سماجی لٹیرا بن جاتا ہے اور ایک ایسا جذباتی گیت لکھتا ہے جس میں انسانوں کی گم شدہ مساوات کو پھر سے قائم کرنے نیز محنت و مشقت کرنے والوں کی بین الاقوامی یک جہتی کی بات کرتا ہے۔

آندھرا میں تحریک کے دوران نمایاں واقعات میں سے ایک تو یہ ہے کہ ضلع گنٹور کے ایک چھوٹے سے قصبے چرالا۔ پرالا کو میونسپلٹی کا درجہ دینے کی حکومت کی تحریک کی شدید مزاحمت کی گئی۔ (میونسپلٹی کا درجہ دینے کا مطلب یہ تھا کہ مقامی محصولات کی رقم 4000 روپے سے بڑھ کر 30,000 روپے ہو جاتی) قصبے کے 15,000 باشندوں نے دگی رالا گوپال کرشنیا کے جھنڈے تلے حکومت کے اس اقدام کی مزاحمت کرتے ہوئے محصولات ادا کرنے سے انکار کر دیا اور 11 ماہ کے لیے رام نگر نام کی ایک نئی بستی میں منتقل ہو گئے۔ دسمبر 1921 اور فروری 1922 کی درمیانی مدت میں ڈیلٹا کے علاقے میں لگان ادا نہ کرنے کی مہم کافی زور پکڑ گئی تھی۔ گاؤں کے عہدہ داروں نے اجتماعی طریقے پر استعفیٰ دیدیا تھا۔ گاؤں کی سطح کے یہ عہدہ دار اس لیے برہم تھے کہ حکومت ان کی مراعات میں تخفیف کرنے جا رہی تھی۔ حکومت کے خلاف برہمی کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ مانسون خراب رہنے کی وجہ سے کسان طبقہ بھی کافی پریشان تھا اور جیسا کہ ایک گاؤں والے نے ایک انگریز افسر کو بتایا تھا، لوگوں میں یہ خیال پھیل رہا تھا کہ "گاندھی والا سوراج بس آیا ہی چاہتا ہے اور لوگوں

کو ٹیکس وغیرہ ادا کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے"۔ (حوالہ M.Vankat Rangaya. (Freedom Struggle in Andhra Pradesh. Vol.III pp.276)۔ تحریک کے عروج کے زمانے میں گنٹور کے قریب Bapatla تعلقے کی Pedanandipad تحصیل میں نیز راج مندری کے قریب رگھو دیواپورم کے Firka میں سرکاری مالیہ جنوری 1922 میں 14.73 لاکھ روپے سے گھٹ کر صرف 4 لاکھ روپے رہ گیا تھا مگر کانگریس نے گاندھی کے اصرار پر یہ تحریک 10 فروری کو واپس لے لی تھی۔

آندھرا میں جنگلاتی پابندیوں کے خلاف 22-1921 کے دوران قبائلیوں اور کسان طبقوں میں جو زبردست بے چینی پیدا ہو گئی تھی اس کے رابطے قوم پرستانہ تحریک سے بھی قائم ہو گئے تھے۔ چنانچہ کڈپا کے رایاچوٹی تعلقے اور گنٹور کے پلناڈ تعلقے کے "فوریسٹ ستیہ گرہ" قابل ذکر ہیں۔ کیمبرج مکتب فکر کے مورخ سی۔ جے بیکر نے اس ستیہ گرہ کی اہمیت گھٹاتے ہوئے اسے مویشیوں پر لگائے گئے چرائی محصول میں اضافے کے خلاف ساحلی آندھرا کے خوش حال گلہ بانوں کے مفاد پرستانہ احتجاج کی شکل میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے جبکہ بعض ٹھوس شواہد سے اس تحریک میں نچلے طبقے کے لوگوں کی شمولیت کا بھی پتہ چلتا ہے۔ یہ بتائے جانے پر کہ گاندھی ان کے محصولات میں تخفیف کرادیں گے اور جنگلاتی پابندیوں سے متعلق قواعد و ضوابط کو ختم کرادیا جائے گا، گاؤں والوں نے ستمبر 1921 میں کڈپا میں گاندھی کو جوق در جوق خوش آمدید کہا تھا۔ دنکاپا جیسے کانگریسی لیڈروں نے اس احتجاج کو محکمۂ جنگلات کے افسروں کے سماجی بائیکاٹ تک ہی محدود رکھنے کی کوشش کی تھی لیکن کسانوں نے چرائی محصول ادا کئے بغیر ہی اپنے مویشی جنگلوں کی طرف ہانکنے شروع کر دیئے تھے؛ پلناڈ کے کچھ جنگلاتی دیہاتوں نے تو سوراج کا اعلان بھی کر دیا تھا اور پولس پارٹیوں اور جنگلاتی افسروں پر حملے شروع کر دیئے تھے جس کی وجہ سے پلناڈ اور رایاچوٹی میں جنگلاتی انتظامیہ بالکل مفلوج ہو کر رہ گیا تھا اور لوگ یہ کہتے پھر رہے تھے کہ گاندھی راج یا تو آچکا ہے یا بس آنے ہی والا ہے اور یہ کہ جنگل ان کا اپنا ہے جسے وہ اپنی مرضی کے مطابق استعمال کریں گے" (حوالہ: Madras Forest Administration Report 1921-22 pp30)۔ وقتاً فوقتاً اس طرح کی افواہیں 22-1921 کے دوران تحریک کو برابر ہوا دیتی رہیں: مئی 1921 میں ترچناپلی میں عام قیدی بھی جیل توڑ کر بھاگ نکلے تھے، اور اس کی وجہ یہ یقین تھا کہ برطانوی حکمرانی کی جگہ پر گاندھیائی سوراج بس قائم ہی ہونے والا ہے" (وائسرائے بنام سکریٹری آف اسٹیٹ 20 جون 1921)۔

اس وقت تک کی سب سے پر تشدد شورش مالابار علاقے کے موپلاؤں میں دیکھنے میں آئی جو مدا ہی سرکش رہے تھے۔ جہاں موپلاؤں کی سابقہ شورشوں کی وجہ مذہبی رسوم و عبادات ہوتی

تھیں جن میں صرف مٹھی بھر لوگ ہی حصہ لیا کرتے تھے، مگر اب انگریزی اقتدار کا قلعہ منہدم ہونے کی افواہیں اتنی شدت اختیار کر گئی تھیں کہ کوئی معمولی سا بھی احتجاج آسانی سے بغاوت کا رخ اختیار کر جاتا تھا۔ ہندو جینمیوں کے ذریعے مسلم پٹہ داروں کے استحصال، جس کے سماجی سیاق کا پہلے ہی ذکر کیا جاچکا ہے، نیز مسلمانوں کی مذہبی تشدد پسندی کی ایک طویل روایت (ملاحظہ ہو باب سوم) کے مد نظر تحریک کا رخ شروع میں فرقہ وارانہ رہا تھا اور اس کے اس فرقہ وارانہ پہلو کے سلسلے میں مبالغے سے کام لیا گیا ہے۔ مالا بار میں لگان دار کے حقوق کے سلسلے میں تحریک کی بنیاد 1916 میں ہی پڑ چکی تھی جسے خلافت تحریک نے اپریل 1920 کی منجیری کانفرنس کے بعد اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا۔ کاشت کاروں کو اپنی بات خلافت کانفرنس کے جلسوں میں رکھنے کا موقع دیا گیا۔ کہا جاتا ہے کہ مقامی لیڈر علی مسلیار نے یہ وعدہ کر لیا تھا کہ "قائم ہونے والی مسلم ریاست" میں مقدمے بازی اتنی مہنگی نہیں ہوگی...... کسی بھی شخص کو اپنی ضرورت سے زیادہ کچھ بھی رکھنے کی اجازت نہیں ہوگی.. ہم پولس کے موجودہ نظام کے حق میں نہیں ہیں......" فروری 1921 میں کانگریس اور خلافت تحریک کے ، کے۔ مادھون نائر، یو۔ گوپالا مینن، یعقوب حسن اور پی۔ معین الدین کویا جیسے بڑے لیڈروں کی گرفتاری کی وجہ سے ان انقلاب پسند لیڈروں کو میدان خالی مل گیا جو کہ ایک نئے ہزار سالہ کی بشارت دے رہے تھے۔ 20 اگست 1921 کو پولس نے ہتھیاروں کی تلاش میں تھیرورنگاڈی مسجد پر چھاپہ مارا جس پر بغاوت کی زبردست آگ بھڑک اٹھی اور پولس تھانوں، سرکاری دفتروں، مواصلاتی نظام، اور جابر زمینداروں کے گھروں پر حملے کے واقعات ہوئے۔ جنوبی مالا بار کے ارناڈ اور ولو لو وناڈ تعلقوں پر پولس کا مہینوں کوئی کنٹرول نہیں رہا تھا۔ مختلف مقامات پر مختلف لوگوں کی صدارت میں "جمہوریہ خلافت" بھی قائم کی جاچکی تھیں، مختلف مقامات پر جن لیڈروں کو ان خلافتی جمہوریتوں کا صدر بنایا گیا تھا ان میں کن حمد حاجی، کالا تھنگل ممد (Mammad)، علی مسلیار، سیتھی کویا تھنگل اور امبچی کویا تھنگل کے نام قابل ذکر ہیں۔ ایک برطانوی، جی۔ او سی نے 25 ستمبر کو اپنی رپورٹ میں کہا تھا کہ "صورتحال اب حقیقی جنگ جیسی ہو گئی ہے۔ اس جی۔ او سی نے حالات پر قابو پانے کے لیے جلد از جلد کمک روانہ کرنے کی درخواست کی تھی۔ رپورٹ میں یہ بھی کہا گیا تھا کہ اب موپلا چھاپہ مار طریقہ جنگ اپنا رہے ہیں زیادہ طاقت ور ہو چکے ہیں...... برسر پیکار مسلح گروپوں کی تعداد تقریباً 10,000 ہو گئی ہے" (حوالہ: وائسرائے کا مکتوب سکریٹری آف اسٹیٹ کے نام، 28 ستمبر 1921)۔

ہندوؤں نے عام طور پر ان موپلاؤں کو فرقہ پرست جنونی قرار دے کر ان کی مذمت کی اور یہ سچ ہے کہ اس شورش میں تقریباً چھ سو ہندو مارے گئے تھے اور (ایک آریہ سماجی ذریعے کے مطابق) تقریباً 25.00 جبراً مسلمان بنا لیے گئے تھے۔ یہ اعداد و شمار اس لحاظ سے کہیں کم معلوم

ہوتے ہیں کہ ان فرقہ پرست جنونیوں کا ایک ایسے علاقے پر مہینوں کنٹرول رہا تھا جس میں 4 لاکھ ہندو آباد تھے جن میں متعدد ظالم زمیندار اور خون چوس لینے والے مہاجن بھی تھے؛ اور کچھ ایسے بھی تھے جو انگریزوں کا ساتھ دے رہے تھے۔ جبراً تبدیلی مذہب کا پہلا واقعہ 10 ستمبر کو ہوا تھا اور کے۔ این۔ پانیکر نے اپنی ایک حالیہ تصنیف میں ہندو علاقوں سے موپلاؤں کی ایک ٹولی کے 23 میل لمبے مارچ کے سلسلے میں کچھ دلچسپ تفصیلات شامل کی ہیں۔ اس مارچ کا واحد مقصد ایک ظالم زمیندار کے کاغذات کو تباہ کرنا تھا۔ اس لمبے مارچ میں کوئی بھی شخص زخمی تک نہیں ہوا تھا، یہاں تک کہ اس زمیندار (Jenmi) کے کنبے کے کسی فرد کو بھی ہاتھ نہیں لگایا گیا تھا۔ اس سے بھی زیادہ حیرت انگیز دوسری حقیقت یہ ہے کہ موپلا قیدیوں کی پہلی ٹولی میں ایک نمبودری اور دو نائر بھی شامل تھے (سکریٹری آف اسٹیٹ کے نام وائسرائے کا مکتوب، مورخہ 3 نومبر 1921 جس کے ساتھ کوئمبٹور کے ایک ضلع جج کا مکتوب بھی منسلک تھا)، بہر حال اصل حقیقت یہ ہے کہ سامراج داد کے خلاف بڑے پیمانے پر مسلح بغاوت بھڑک اٹھی تھی جسے بڑی بے رحمی کے ساتھ کچل دیا گیا تھا۔ 2337 باغی مارے گئے تھے۔ 1652 باغی زخمی ہوئے تھے اور کم سے کم 45,404 لوگ قید کر دیئے گئے تھے۔ 1857، یا 1919 کی طرح ہی موپلا شورش کے سلسلے میں بھی انگریزوں کا لبرل ازم خطرات کا مقابلہ نہیں کر سکا تھا۔ 20 نومبر کو پوڈانور میں ریل کے ایک ویگن میں 66 لاشیں ملی تھیں۔ یہ ان موپلاؤں کی لاشیں تھیں جنھیں انگریزوں نے ویگن میں بند کر دیا تھا اور دم گھٹنے سے ان کی موت ہو گئی تھی۔ اسکول جانے والے ہر بچے کو تاریخ کے نصاب میں سراج الدولہ کے اس تاریک کنویں کے بارے میں تو ضرور پڑھایا جاتا ہے جس کی بابت زیادہ تر مبالغے سے کام لیا جاتا رہا ہے مگر آزاد ہندوستان میں بہت کم لوگ ایسے ہوں گے جو کہ پوڈانور کے اس سیاہ غار کے بارے میں جانتے ہوں گے جس کی بابت کوئی اختلاف رائے نہیں ہے۔

عام طور پر قومی دھارے سے الگ تھلگ، آسام میں، عدم تعاون کی تحریک اتنی طاقت پکڑ گئی تھی جس کی کہ بعد میں کہیں کوئی مثال نہیں ملتی۔ اس سلسلے میں سب سے اہم سرگرمی سرمادادی کے چائے باغان کے علاقے میں رہی جہاں چارگولا میں مزدوروں نے مئی 1921 میں 'گاندھی مہاراج کے جے' کے نعرے لگاتے ہوئے اپنی اجرتوں میں بھاری اضافے کا مطالبہ کیا تھا۔ اس کے بعد تقریباً 8000 (تقریباً 52%) مزدور کام چھوڑ کر باہر آ گئے اور یہ کہا گیا کہ انھوں نے ایسا گاندھی کے حکم پر کیا ہے۔ بظاہر اس طرح کی افواہیں پھیل چکی تھیں کہ گاندھی راج میں انھیں ان کے اپنے گاؤں میں وہ زمینیں پھر سے دلا دی جائیں گی جن سے انھیں جبراً یا دھوکے سے بے دخل کر دیا گیا تھا۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ چارگولا چائے باغان کے بیشتر مزدوروں کا تعلق مشرقی یوپی کے بستی اور گورکھپور اضلاع سے تھا۔ ان اضلاع میں عدم تعاون کی تحریک پہلے ہی کافی طاقت

حاصل کر چکی تھی۔ اکتوبر میں اور پھر دسمبر میں بھی، دارانگ اور سب ساگر اضلاع کے چائے باغان میں بھی وقفے وقفے سے ہڑتالیں ہوتی رہیں اور افسران نے مبینہ طور پر یہ شکایت کی تھی کہ عدم تعاون تحریک کے کارکن چائے مزدوروں میں سرگرم ہیں۔ بہر حال آسام کے بیشتر کانگریسی لیڈروں میں چائے باغات کی ہڑتالوں کے بارے میں زیادہ جوش و خروش نہیں تھا کیونکہ ان میں این۔ سی۔ باردولوائی جیسے کچھ لیڈر خود چائے باغان کے مالک تھے۔ ایک کانگریسی کارکن نے اپنی یادداشت میں تحریر کیا ہے کہ "اس وقت اسے سخت مایوسی ہوئی تھی جب کچھ مزدوروں نے ایک رات اس کے پاس آکر ہڑتال کی تجویز رکھی تھی۔" (حوالہ: P.Barthakur Swadhinata Ranar Sams Parshat) لگان کی عدم ادائیگی کی تحریک کے آثار بھی تھے۔ اور گاندھی کے ذریعے باردولی تحریک واپس لے لئے جانے کے باوجود بھی ضلع سب ساگر میں آسام رائفلز کا مارچ کرایا گیا تھا، اس کا مقصد "چائے باغان کے قلیوں کے مفادات کا تحفظ کرنا تھا"۔ (مکتوب وائسرائے کے بنام سکریٹری آف اسٹیٹ، مورخہ 20 فروری 1922)۔ 1921 کے واقعات نے آسامی زبان کے ادب کو بھی متاثر کیا۔ اس اثر کی واضح جھلک آسام کیسری امبیکا گری رائے چودھری کی شاعری نیز ان متعدد لوک گیتوں میں واضح طور پر ملتی ہے جن میں شری کرشن کی جگہ پر "گاندھی راجا" کا ذکر ملتا ہے۔

1920-21 کا عدم تعاون تحریک اور خلافت تحریک کا اتحاد، بنگال کی قومی تحریک کی پوری تاریخ کا سب سے روشن باب ہے۔ یہ صحیح ہے کہ بنگال کے بیشتر سیاسی لیڈروں نے گاندھی کی قیادت کو بہت بعد میں تسلیم کیا اور وہ بھی اس طرح کہ، محض سی۔ آر۔ داس کے خیالات میں ناگ پور اجلاس کے دوران تبدیلی آئی تھی جس کے بعد دہشت پسند قسم کے بنگالی لیڈر بھی ایک سال کے لیے گاندھائی طریقہ کار کو آزمانے کے لیے تیار ہو گئے تھے۔ کلکتہ کے اعلا تعلیم یافتہ طبقے نے بعض گاندھیائی طریقہ کار کے بارے میں زیادہ جوش اور دلچسپی کا مظاہرہ نہیں کیا۔ رابندرناتھ ٹیگور نے اپنے مضمون Call of Truth میں ایک اہم تنازعے کی بنیاد رکھ دی تھی۔ رابندرناتھ نے گاندھی کی اس بات کے لیے ستائش کی کہ انھوں نے ملک کے لاکھوں بے سہارا لوگوں میں بیداری کی لہر پیدا کر دی ہے مگر تنگ نظری، رجعت پسندی اور چرخہ چتھ کے غیر ہم آہنگ عناصر کی نکتہ چینی بھی کی۔ بنگال میں تحریک عدم تعاون کے ادبی اثرات، 1905 کی تحریک کے اثرات کے مقابلے میں بہت کم مرتب ہوئے اور 1920 کی دہائی نیز 1930 کی دہائی میں قوم پرستوں کو زیادہ تر سودیشی گیتوں سے ہی کام چلانا پڑتا تھا۔ بہر حال اس وقت بنگال کی بے مثال فرقہ وارانہ یک جہتی کے سامنے اس طرح کی باتیں غیر اہم ہو گئی تھیں۔ وجہ یہ ہے کہ بنگال میں ہندوؤں اور مسلمانوں کی آبادی کے تناسب کے لحاظ سے یہ فرقہ وارانہ یک جہتی بہت اہمیت رکھتی تھی، پھر یہ کہ سی آر

داس، نیز ان کے تین نو عمر مددگاروں (مدناپور کے بیر ندر ناتھ سسمال، چٹاگانگ کے جے ایم، سین گپتااور کلکتہ کے سبھاش بوس) نے بہت ہی اثرانگیز قیادت کی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ شہری اور دیہی علاقوں کے عوام میں زبردست بیداری پیدا ہو گئی تھی۔

1921 کے اوائل میں طالب علموں میں شروعاتی شورش کے بعد عدم تعاون کی تحریک بنگال میں اس وقت دوسری بار نقطہ عروج کو پہونچ گئی جب آسام کے چائے باغان سے بھاگ کھڑے ہونے والے قلیوں پر آسام رائفلو نے مشرقی بنگال کی چاندپور بندرگاہ پر حملہ کر دیا تھا۔ پورا بنگال حیرت انگیز طریقے پر آناً فاناً ہنگاموں کی لپیٹ میں آگیا جس کا تذکرہ سرکاری رپورٹوں میں مسلسل ہڑتالوں، کارخانوں میں اسٹرائکوں اور ریل نیز اسٹیمر سروسز کے مفلوج ہو جانے کے طور پر ملتا ہے۔ اس تحریک کی قیادت جے۔ ایم سین گپتا کر رہے تھے۔ اسٹیمر سروس کی ہڑتال تو جولائی کے شروع تک جاری رہی تھی جبکہ آسام۔ بنگال ریل لائن کی ہڑتال ستمبر تک چلی تھی۔ یہ بھی واقعہ ہے کہ ان ہڑتالوں کو کلکتہ کے مارواڑی بیوپاریوں کے ساتھ گاندھی نے بھی ناپسند کیا تھا۔ جولائی سے اکتوبر تک خاموشی رہی جس کا قوم پرستوں نے پورا فائدہ اٹھایا۔ اور اس دوران رضاکار گروپوں، ثالثی عدالتوں اور جلسوں کا اہتمام کیا۔ جون کے اوائل سے نومبر کے وسط تک کم سے کم 4205 جلسے ہوئے تھے۔ تحریک کے تیسرے اور سب سے شدید مرحلے کا آغاز پرنس آف ویلز کی نومبر میں آمد کے ساتھ شروع ہوا جو فروری 1922 اور اس کے بعد تک جاری رہا۔ 17 نومبر کی عوامی ہڑتال کلکتہ میں زبردست طریقے پر کامیاب رہی؛ تمام سڑکوں اور شاہراہوں پر صرف رضاکاروں کا کنٹرول تھا اور چند پولس میتوں نے ملازمت سے علاحدگی بھی اختیار کر لی تھی۔ ایک پولس افسر نے دسمبر 1921 میں کم سے کم سات اضلاع میں پولس والوں میں زبردست بے چینی کی رپورٹ دی تھی۔ حکومت کی سختیوں کا جواب بڑے پیمانے پر رضاکارانہ گرفتاری سے دیا گیا (صرف کلکتہ میں ہی سال کے آخر تک 3000 سے زائد لوگ گرفتاری دے چکے تھے) جیل جانے والے رضاکاروں میں اب اعلا طبقات کی خواتین بھی پہلی بار شامل تھیں۔ ان خواتین نے سی۔ آر۔ داس کی اہلیہ بسنتی دیوی کی پیروی کرتے ہوئے رضاکارانہ گرفتاری میں حصہ لیا تھا"۔ گرفتاری دینے والوں میں زیادہ تعداد مسلمانوں کی تھی جو کہ بیشتر ملوں کے ورکر تھے۔ خلافت تحریک کے رہنما خصوصاً محمد عثمان وغیرہ کلکتہ کے مضافات کے صنعتی علاقوں کے مسلم ورکروں میں 1921 کے اوائل سے ہی سرگرم چلے آرہے تھے اور خلافت کے سلسلے میں ایجی ٹیشن کے ساتھ ساتھ رضاکار گروپ اور ٹریڈ یونین بھی منظم کرتے رہے تھے۔ جنوری 1922 کے پہلے ہفتے میں کلکتہ میں جو 349 رضاکار گرفتار کیے گئے تھے ان میں 123 مل ورکر "خاصی تعداد میں مانجھی اور نچلی ذات کے مسلمان" شامل تھے۔ جبکہ طلباء کی تعداد محض 39 تھی، یہ تناسب سودیشی تحریک کے

زمانے کے سماجی تناسب سے قطعی مختلف تھا۔ بمبئی اور مدراس کی طرح ہی کلکتہ میں بھی 1921 کا تجربہ، بلکہ نتیجے میں ہاتھ آنے والی مایوسی، کلکتہ میں مظفر احمد جیسے لوگوں کی قیادت میں ابتدائی نوعیت کے کیمونسٹ گروپوں کی تشکیل کا آغاز ثابت ہوئی۔ بعد میں ایم۔این رائے کے ایلچی نلنی گپتا نے 1921 کے آخر میں مظفر احمد سے رابطہ قائم کیا تھا۔

دیہی علاقوں میں عدم تعاون کے تحت فروری 1921 میں جوٹ کے بائیکاٹ کی کوشش کی گئی جس کے تحت کاشت کاروں سے یہ اپیل کی گئی کہ وہ جوٹ کی جگہ پر دھان اور کپاس کی کاشت شروع کریں۔ اس کا مقصد انگریزوں کی ملکیت کے جوٹ ملوں کو نشانہ بنانا، غذائی اجناس کی قیمتوں میں کمی لانا اور کھادی کو فروغ دینا تھا۔ اس اپیل کا کسانوں پر کوئی خاص اثر نہیں ہوا جس کی وجہ یہ تھی کہ جوٹ کی کاشت بہر حال دیگر اشیاء کی کاشت کے مقابلے میں کہیں زیادہ منافع بخش تھی۔ سب سے زیادہ اثر خیز تحریک راج شاہی۔ نادیا۔ پٹنا۔ مرشد آباد کی سرحدی پٹی میں واقع مدنا پور زمین داری کمپنی کے خلاف رہی تھی جس کے مالک گورے تھے۔ اس علاقے میں کاشت کاروں نے نیل کی کاشت کے خلاف پہلے ہی سے تحریک شروع کر رکھی تھی اور ان کاشت کاروں کو اس جدو جہد کے سلسلے میں کلکتہ کے ایک طالب علم لیڈر سومیشور پرساد چودھری کی رہنمائی حاصل تھی۔ چودھری نے بعد میں اپنی خود نوشت میں ذکر کیا ہے کہ داس نے نجی طور پر اس کی حوصلہ افزائی بھی کی تھی اور اس کے ساتھ ہی خبردار بھی کیا تھا کہ کانگریس لگان کی عدم ادائگی کی تحریک کی باضابطہ طریقے پر کبھی بھی تائید نہیں کرے گی۔

دیہی علاقوں میں سب سے منظم تحریک ضلع مدناپور کے Contai اور Tamluk سب ڈویژنوں میں یونین بورڈ کے خلاف بریندرناتھ سسمال کی قیادت میں چلایا گیا ایجی ٹیشن تھا۔ یونین بورڈ جو کہ حال ہی میں قائم کیا گیا تھا، اس بات کا اشارہ تھا کہ مقامی محصول میں اضافہ کیا جانے والا ہے۔ سسمال نے نئے مقامی ٹیکسوں کی عدم ادائگی کی زوردار تحریک شروع کی، اور نومبر، دسمبر 1921 میں مدناپور کے لگان داروں میں جن میں کہ غالب اکثریت مہیشیوں (Mahishya) کی تھی، کافی اثر ورسوخ قائم کر لیا، جس پر حکومت نے مجبور ہو کر مدناپور کے سلسلے میں نافذ کیے گئے نئے قواعد وضوابط واپس لے لیے۔ 22-1921 کے موسم سرما میں کسانوں نے پبن، بوگرہ، اور خاص طور پر رام پورہاٹ (ضلع بیر بھوم) میں بندوبست کی کارروائی کی مزاحمت کی۔ اس تحریک مزاحمت کی قیادت جیتندر لال بنرجی نے کی تھی۔

یہ سب لازمی طور پر کسان تحریکیں تھیں جن کی قیادت مقامی وکیل اور سیاست داں کر رہے تھے، مگر اندر ہی اندر ایک بڑا طوفان بھی جنم لے رہا تھا۔ 24 مارچ 1921 کو کم از کم 669 قیدی راج شاہی جیل کو توڑ کر باہر آ گئے تھے اور یہ نعرہ لگا رہے تھے کہ اب "گاندھی راج" آ گیا ہے۔ ایک

سرکاری رپورٹ میں "1922 کے شروع کے تین مہینوں کے درواں بڑے پیمانے پر "لاقانونیت" کا ذکر ملتا ہے۔ اس رپورٹ کے مطابق "تحریک لیڈروں کے کنٹرول سے باہر ہو گئی ہے...... تشدد اور بڑے سے بڑے عہدہ دار کے خلاف لاپرانی جذبہ...... صرف لیڈروں کا ہی نہیں بلکہ عوام کا بھی ہے" یہاں تک کہ اپنے نظم وضبط کے لیے مشہور ضلع مدناپور میں بھی، یونین بورڈ کے فیصلے کو واپس لے لینے کے بعد لیڈروں نے چوکیداری ٹیکسوں کو ادا کرنے کی جو اپیلیں جاری کی تھیں، ان کو بھی قابل اعتناء نہیں سمجھا گیا اور کافی لوگوں نے لگان روک لیا۔ جھر گم سب ڈویژن کے سنتالوں نے ہاٹوں اور زمینداروں کی ملکیت والے جنگلوں کو لوٹنا شروع کر دیا تھا۔ فروری 1922 میں جلپائی گوڑی میں گاندھی کیپ پہنے ہوئے سنتالوں نے پولس پر حملے بھی کیے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ ان کی گاندھی کیپوں پر پولس کی گولیاں اثر نہیں کریں گی۔ پڑوس کے شمالی بنگال کے ضلع رنگ پور میں چوکیداری ٹیکس کی عدم ادائیگی بہت جلد لگان کی ادائیگی سے انکار کی شکل اختیار کر گئی، یہاں تک کہ نیل پھاماڑی کے مسلمانوں نے ایک "گاندھی" داروغہ کی سربراہی میں ایک "سوراج تھانا" بھی قائم کر لیا تھا۔ چٹاگانگ میں "محفوظ جنگلات" پر یلغار کے متعدد واقعات ہوئے۔ لوٹ پاٹ کے ان واقعات میں رضاکاروں کی بجائے مقامی گاؤں والے ملوث تھے اور انھوں نے ایسا اپنی مدد کے مقصد سے کیا تھا۔ ٹپیرا کے چودا گرام سب ڈویژن میں گاؤں پولس نے 1921 سے کام کرنا بند کر دیا تھا۔ "کوئی ٹیکس ادا نہیں کیا جا رہا ہے...... حکومت یا زمیندار کسی طرح کا لگان وصول نہیں کر رہے ہیں...... یہ تحریک تمام تر مسلمانوں کی ہے مگر فرقہ وارانہ یا مذہبی ہرگز نہیں ہے۔ لوگ صرف اپنا حق منوانے کی غرض سے باہر نکل آئے ہیں......" (حوالہ Govt. of Bengal, political, confidential, 395 of 1924. Hitory of the Non-Cooperation and Khilafat Movements in Bengal.)-

یہاں یہ بات ذہن نشیں رکھنا ضروری ہے کہ رنگ پور، چٹاگانگ اور ٹپیرا کافی دور دراز کے خطے تھے، جہاں بڑے لیڈر بہت کم پہونچ پاتے تھے اور سرکاری رپورٹوں میں بار بار یہ ذکر کیا گیا ہے کہ مقامی رضاکاروں اور سیاست دانوں نے عوام کو قابو میں رکھنے کی پوری کوشش کی مگر کامیاب نہیں ہو سکے۔ اس نظریے میں کوئی جان نہیں ہے کہ سرکردہ سیاست دانوں یا ذیلی ٹھیکداروں نے لوگوں کو بھڑکانے کی کوشش کی تھی۔

گاندھیائی بندشوں کو توڑ ڈالنے کا رجحان بنگال میں بار بار پیدا ہوتا رہا، جب کہ مہاتما نے بہار کی ستائش کرتے ہوئے اسے ایک ایسا صوبہ بتایا تھا جہاں "عدم تعاون کے سلسلے میں سب سے ٹھوس کام کیا جا رہا ہے"۔ اور یہ کہ اس صوبے کے "لیڈر عدم تشدد کے مفہوم کو صحیح طور سمجھتے ہیں"۔ (ینگ انڈیا، 2 مارچ 1921)۔ بہار میں جون 1922 تک 41 نیشنل ہائی اسکول، 600 نیشنل

پرائمری اسکول اور مڈل اسکول قائم کیے جا چکے تھے جن کے طلباء کی کل تعداد تقریباً 21,500 تھی۔ اسی طرح کپاس اور چرخہ تقسیم کرنے کے لیے 11 اضلاع میں 48 ڈپو بھی قائم کیے جا چکے تھے۔ بہار میں اگست 1922 میں 3,00,000 چرخے اور 89,000 ہتھ کرگے چل رہے تھے جن کے ذریعے 95,000 گز کھادی ماہانہ تیار کی جارہی تھی۔ یہ دوسری بات ہے کہ خود کانگریسی لیڈروں نے بھی یہ مانا تھا کہ زیادہ مہنگی ہونے کی وجہ سے کھادی لوگوں میں زیادہ مقبولیت حاصل نہیں کر سکی تھی اور اس کا استعمال محض ایک فیصد آبادی تک ہی محدود تھا۔ شراب کے بائیکاٹ میں بھی خاصی پیش رفت ہوئی اور اس سلسلے میں چھوٹا ناگ پور کے قبائیلیوں خصوصاً تانا بھگت فرقے کے لوگوں کے ساتھ رابطے قائم کیے گئے تھے۔ اس زبردست مگر منضبط تحریک کے ایک عام تاثر کے برخلاف، تشدد کے بھی کچھ واقعات یقیناً ہوئے۔ مثلاً مظفر پور، بھاگل پور، مونگیر اور پورنیہ میں جنوری 1921 میں ہاٹ لوٹ لینے کے تقریباً 35 واقعات ہوئے (ان واقعات میں وہ لوگ ملوث تھے جو کہ گاندھی کا پیروکار ہونے کا دعویٰ کرتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ اجناس کی صحیح قیمت متعین کرنے کی کوشش کے صحت ہی ایسا کر رہے ہیں)۔ اس کے علاوہ خلافت کے ایک رضاکار کی گرفتاری کے رد عمل میں گریڈیہہ پر حملہ ہوا، جس پر 25 اپریل 1921 کو فائرنگ ہوئی۔ بعض قبائلی علاقوں میں خلاف قانون طریقے پر شراب کشید کی جانے لگی تھی۔ اور گاؤں کی چراگاہوں کو زمینداروں اور نیل کی کاشت کرنے والوں کے ذریعے اپنے تصرف میں لے لیے جانے پر چمپارن اور مظفر پور میں کشیدگی پیدا ہو گئی تھی۔ بھاگل پور میں سون پرسا گاؤں کے بھومیہاروں نے جنوری 1921 میں یوروپی زمینداروں کے گور کھا ملازمین پر حملہ کر دیا تھا۔ اسی طرح مویشیوں کو چرانے کے حقوق کے سلسلے میں پیدا ہونے والے ایک تنازعے کے نتیجے میں نومبر 1921 میں چمپارن میں موتیہاری کی چوتروا نیل فیکٹری کو جلا دیا گیا تھا جبکہ مظفر پور کا سیتا مڑھی سب ڈویژن طوفان کے اصل مرکز کے طور پر مشہور ہو گیا تھا ،اور وہاں تعزیری کارروائی کے لیے باقاعدہ فوج بھیجی گئی تھی تاکہ ٹیکس ادا نہ کرنے کی تحریک آگے نہ بڑھ سکے۔ بہرحال زمینداروں کے خلاف کاشت کاروں کی اس تحریک میں دوبارہ جان نہ پڑ سکی جس نے 1920 میں پوری دربھنگہ عملداری کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا اور جس سے بہار کے کانگریسی لیڈروں نے خود کو الگ (لا تعلق) رکھا تھا۔ 1921 کے موسم گرم میں چھوٹا ناگ پور خطے کی کوئلہ کانوں کے گورے مالکان نے یہ خدشہ ظاہر کیا تھا کہ کوئلہ کانوں کے لیے جن علاقوں سے مزدور بھرتی کیے جاتے ہیں وہاں عدم تعاون کے زور دار پروپیگنڈے نیز سوامی دسوانند (جنھیں چند مارواڑی کان مالکان کی تائید حاصل تھی) کی سرگرمیوں کے نتیجے میں آسام کے چائے باغان کی طرح ہی ان کوئلہ کانوں کے مزدور بھی کام چھوڑ کر باہر آ سکتے ہیں۔ گریڈیہ

میں "خود کان مالکان نے ہی ایک ٹریڈ یونین قائم کر دی تھی"۔(Home, Political. 43/1921)۔

تحریک عدم تعاون کے دوران صوبہ متحدہ کو کانگریس کے سب سے مضبوط مرکز کی حیثیت حاصل ہو گئی تھی۔ اس کے ممبروں کی تعداد جولائی 1921 میں 328,966 (جو کہ صرف بہار میں کل 350,000 سے ذرا ہی کم) ہو گئی تھی۔ اس وقت یوپی کو ملکی سیاست میں جو قائدانہ حیثیت حاصل ہوئی وہ آزادی کیکئی دہائیوں کے بعد تک جاری رہی۔ 21-1920 کا زمانہ جواہر لال نہرو، پرشوتم داس ٹنڈن، گنیش شنکر ودیارتھی، گووند بلبھ پنت اور لال بہادر شاستری جیسے متعدد قوم پرست لیڈروں کی سیاسی زندگی کا ایک اہم نقطہ آغاز ثابت ہوا۔ کانگریس 1922 کے اوائل تک یوپی میں 9,00,000 رضاکار بھرتی کر چکی تھی۔ اس کے علاوہ خلافت تحریک کے سلسلے میں قائم کی جانے والی تنظیموں میں بھی زبردست اضافہ ہوا تھا۔ صوبے میں جولائی 1921 تک 137 قومی تعلیمی ادارے قائم کیے جا چکے تھے جن میں کاشی ودیا پیٹھ کو سب سے نمایاں حیثیت حاصل رہی۔ یوپی کے تعلیم یافتہ دانش ور طبقے پر گاندھیائی نظریات کے اثرات کی واضح عکاسی پریم چند کے ناولوں میں ملتی ہے جنھوں نے گورکھپور کے ایک اسکول کی نوکری فروری 1921 میں چھوڑ دی تھی تاکہ قوم پرست اخبار 'آج' اور کاشی ودیا پیٹھ کے لیے کام کر سکیں۔ ان کے ناول پریم آشرم (1921) میں ایک ایسے زمیندار کی کردار نگاری کی گئی ہے جو کہ گاندھی کے نظریات کی طرف جھکاؤ رکھتا ہے جبکہ 'رنگ بھومی' (1925) کا ہیرو ایک اندھا فقیر ہے جو کہ اپنے گاؤں کی چراگاہوں کو ایک اینگلو انڈین سگریٹ فیکٹری کے قبضے سے بچانے کے لیے ایک طویل اور پُر امن لڑائی لڑتا ہے۔ اس ناول میں دو دوسرے کردار بھی ہیں جو بعد میں انقلابی بن جاتے ہیں، ان دونوں کرداروں کے نام ونے سنگھ اور صوفیہ ہیں۔

یوپی میں عدم تعاون کی باقاعدہ تحریک شہروں اور چھوٹے قصبوں تک ہی محدود رہی، تاہم دیہی علاقوں میں بنیادی نوعیت کی تحریکوں کی اہمیت بھی کچھ کم نہیں ہے۔ یوپی کی کانگریسی قیادت نے بہار کی بہ نسبت یوپی میں اٹھنے والی کسان تحریکوں پر کہیں زیادہ اپنی توجہ مبذول کی۔ اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ اودھ کا تعلقہ دار بدنامی کی حد تک حکومت کا وفادار تھا۔ بہر حال یہ بھی دیکھنے میں آتا ہے کہ سارے اہم موقع پر کانگریس نے تحمل کا بھی مظاہرہ کیا اور تحریک کو بے قابو نہیں ہونے دیا۔ جنوبی نیز جنوب مشرقی اودھ کے خطے میں بابا رام چندر کی کسان تحریک رائے بریلی، پرتاپ گڈھ، فیض آباد اور سلطان پور میں جنوری اور مارچ 1921 کے درمیان بڑے پیمانے پر زرعی بلوے اور فساد کی شکل اختیار کر گئی۔ اس بلوے میں تعلقہ داروں اور زمینداروں کے گھروں اور فصلوں کے ساتھ ساتھ بازار بھی نشانہ بنے اور غذائی اجناس کے ساتھ ساتھ تجارتی اشیاء کی لوٹ پاٹ

بھی شروع ہو گئی تھی۔ مثال کے طور پر ضلع رائے بریلی کے فرصت گنج کے بازار پر 6 جنوری کو تقریباً دس ہزار لوگوں نے ہلّہ بول دیا تھا، کیونکہ لوگوں کو یہ شکایت تھی کہ بازار کے لوگوں نے غذائی اجناس اور کپڑے وغیرہ کی مصنوعی گرانی پیدا کر دی ہے۔ اس بھیڑ کا مطالبہ تھا کہ دکانداروں کو یہ حکم دیا جائے کہ وہ کپڑا چار آنے فی گز کے حساب سے اور آٹا فی روپیہ آٹھ سیر کے حساب سے فوراً فروخت کرنا شروع کر دیں۔ گویا کہ اس طرح عوام نے اشیاء کی قیمتیں طے کرنے کی کوشش کی تھی جس کی واحد مثال انقلاب فرانس کے زمانے میں ملتی ہے۔ پولس کے ساتھ ٹکراؤ کے بھی متعدد واقعات ہوئے اور عوامی عدالتوں کی مثالیں بھی ملتی ہیں جن میں تنازعات کا فیصلہ آناً فاناً (پنچایتی طریقے پر) کر دیا جاتا تھا۔ شاہ نعیم عطا نامی ایک شخص نے سلون کا بادشاہ ہونے کا دعوا کر دیا تھا جب کہ فیض آباد میں خود کو راجپندر بتانے والے ایک شخص نے لگان نہ ادا کرنے اور بے زمینوں کو زمین تقسیم کر دینے کی تبلیغ شروع کر دی تھی۔ یہ سب کام گاندھی کے نام پر کیے گئے۔

اس طرح کی باغیانہ تحریک کی مذمت خود گاندھی نے بھی کی، جس کا پہلے ہی ذکر کیا جا چکا ہے۔ لیکن یہ ایک دلچسپ بات ہے کہ 1921 میں جواہر لال نہرو کا موقف بھی مختلف نہیں تھا۔ انھوں نے اپنی سوانح عمری میں ذکر کیا ہے کہ فیض آباد کے ایک جلسے میں ان لوگوں کو سمجھانے کی کوشش کی تھی جو کہ تشدد کے واقعات میں ملوث رہ چکے تھے، حالانکہ وہ اس وقت پولس کی موجودگی سے بخوبی واقف تھے اور یہ بھی جانتے تھے کہ کہ ان لوگوں کو گرفتار کر لیا جائے گا۔ خلافت تحریک اور کانگریس کے رہنماؤں نے بابا رام چندر کو متاثرہ علاقوں سے دور رہنے کے لیے آمادہ کر لیا اور جب وہ 10 فروری کو گرفتار کر لیے گئے تو موتی لال نہرو اور گوری شنکر مشرا نے بڑی جلد بازی کے ساتھ ایک پمفلٹ شائع کیا جس میں اس بات پر زور دیا گیا تھا کہ "ہمیں اس پر ہرگز ناخوش نہیں ہونا چاہیے بلکہ ان کو رہائی کے لیے کوشش بھی نہیں کرنی چاہیے"۔ رام چندر نے 1930 کی دہائی میں تحریر کردہ اپنے سوانحی حالات میں کانگریس پر دھوکہ دینے کا الزام لگایا۔ بہر حال 1921 میں انھوں نے قوم پرست لیڈروں کی پیروی خوشی خوشی کی تھی۔

1921 کے موسم گرما کے آتے آتے ایسا معلوم ہونے لگا تھا کہ عدم تعاون کی تحریک کسان تحریک کو نگلتی جا رہی ہے، کیونکہ کسانوں کے بنیادی مطالبات کو پس پشت ڈال دیا گیا تھا جبکہ یو پی کی حکومت نے خطرے کی بو سونگھتے ہوئے تعلقہ داروں کو 1921 کے اودھ لگان ایکٹ کے تحت چند مراعات دینے کے لیے راضی کر لیا تھا۔ 1921 کے آخر اور 1922 کے شروع میں شمالی مغربی اودھ (ہردوئی، بہرائچ، بارہ بنکی اور سیتاپور اضلاع) میں حالات کے ایک بار پھر کنٹرول سے باہر ہو جانے کا خطرہ پیدا ہو گیا، جہاں کہ کچھ کانگریسیوں کے ذریعے شروع کی گئی "ایکا تحریک" کو ایک نسبتاً زیادہ انقلابی لیڈر 'مداری پاسی' نے اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا۔ اصل مطالبہ یہ تھا کہ اجناس کی

شکل میں دیا جانے والا لگان (بٹائی) نقد ادائیگی میں تبدیل کر دیا جائے (قیمتوں میں روز افزوں اضافے کی وجہ سے اس سے کسانوں کو یقیناً فائدہ ہوتا)۔ اس کے علاوہ منتر وغیرہ پڑھنے کے سلسلے میں کچھ دوسرے مطالبات بھی تھے۔ پولس نے اس تحریک کو کچل دیا اور جولائی 1922 میں مداری پاسی کو گرفتار کر لیا۔

سماج کے نچلے طبقات میں سیاسی بے چینی کے آثار سے بھی یوپی میں انگریزوں کے کان کھڑے ہو چکے تھے۔ 1921 کے موسم گرما میں پہاڑی علاقوں کے قبائلی لوگوں نے لوٹ پاٹ مچا رکھی تھی اور کمایوں ڈویژن میں ہزاروں ایکڑ محفوظ جنگلات جلا ڈالے گئے تھے (حوالہ: وائسرائے بنام سکریٹری آف اسٹیٹ 10 جولائی 1921)۔ اکتوبر 1921 میں، ریڈنگ نے اس بات پر تشویش ظاہر کی تھی کہ "اودھ میں دیہی علاقوں میں جلسوں میں حصہ لینے والوں کی اکثریت ان لوگوں کی ہوتی ہے جو اپنی زمینوں سے محروم ہو چکے ہیں اور اب یہ سمجھتے ہیں کہ ان کی یہ زمینیں گاندھی واپس دلا سکتے ہیں، ان جلسوں میں دوسرے نمبر پر زیادہ تر نچلے طبقے کے وہ مزدور ہوتے ہیں جو یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ گاندھی انھیں جوت دار بنادیں گے (مذکورہ مکتوب 13 اکتوبر 1921)۔

چوری چورا

چوری چورا کا واقعہ، جو کہ گاندھی کے لیے ناقابل برداشت ثابت ہوا، گورکھپور کے ایک گاؤں میں رونما ہوا تھا اور اس کا کسان سبھا یا ایکا تحریک سے کوئی واسطہ نہیں تھا؛ بلکہ ایک انتہائی منظم تنظیم کی سرگرمیوں کا نتیجہ تھا۔ یہ تنظیم شراب کی بکری اور قیمتوں میں اضافے کے خلاف تحریک چلا رہی تھی اور اس سلسلے میں اس نے مقامی بازار میں مظاہرے اور دھرنے کا سلسلہ شروع کیا تھا۔ خود گاندھی نے یہ اعتراف کیا ہے کہ لوگوں کو جان بوجھ کر اشتعال دلایا گیا تھا۔ پولس نے ایک رضاکار لیڈر (آرمی کے پنشنر بھگوان اہیر) کی پٹائی کی تھی اور جب لوگ اس کے خلاف احتجاج کرنے کے لیے پولس تھانے پہونچے تھے تو ان پر فائرنگ کی گئی تھی۔ اس واقعے سے انگریز بہت ہی دہشت زدہ ہو گئے تھے جس کا اندازہ اسی بات سے ہو جاتا ہے کہ سیشن عدالت نے شروع میں چوری چورا کے 225 ملزمان میں سے 172 کو موت کی سزا سنائی تھی (جن میں 19 کو پھانسی دیدی گئی تھی اور باقی کو کالا پانی بھیج دیا گیا تھا)۔ یہ ایک شرمناک حقیقت ہے کہ مارے گئے 22 پولس مینوں کے بدلے میں 172 لوگوں کی جان لے لینے کی اس بہیمانہ کوشش پر قوم پرستوں کی طرف سے کوئی احتجاج نہیں ہوا۔ البتہ جن لوگوں کی طرف سے احتجاج یا مذمت کا ریکارڈ ملتا ہے ان میں ایم۔ این۔ رائے کے کیمونسٹ جریدے Vanguard اور کیمونسٹ انٹرنیشنل کی ایکزیکیٹو کمیٹی قابل ذکر ہے، اور آج بھی حقیقت یہ ہے کہ چوری چورا میں اس واقع کے تعلق سے ایک پولس یادگار تو ہے مگر

شہید کسانوں کی یاد میں کچھ بھی نہیں ہے۔

جواہر لال نہرو نے بعد میں یہ لکھا ہے کہ گاندھی نے چوری چورا واقعے کے بعد تحریک کو جس طرح اچانک اور یک طرفہ طریقے پر واپس لے لیا تھا اس پر کانگریس کے تقریباً تمام بڑے لیڈروں نے ناگواری ظاہر کی تھی اور نئی عمر کے لیڈروں کی ناگواری تو اور بھی زیادہ شدید تھی (An Autobiogarphy, p. 8)۔اس سلسلے میں گاندھی کی طرف سے جو دفاع کیا گیا اس کی بنیاد دو دلیلوں پر ہوتی تھی۔ نمبر ایک، عدم تشدد کے فلسفے پر پختہ یقین ("میں ہر طرح کی توہین، ہر طرح کی اذیت برداشت کرنے کے لیے تیار ہوں، میں تحریک کو تشدد کے راستے پر نہ چلنے دینے کے لیے موت کا سامنا کرنے کے لیے بھی تیار ہوں") اور دوسرے یہ کہ وہ لوگوں کو یہ باور کرانے کی بھی کوشش کرتے رہے کہ اگر بالفرض خدا کی مہربانی سے باردولی کی پُر امن سول نافرمانی کی تحریک کامیاب ہوگئی ہوتی اور حکومتِ ہند بھی باردولی کے کامران لیڈروں کے حق میں دست بردار ہو گئی ہوتی تو ان قانون شکن عناصر کو کون کنٹرول کرتا......؟ جیسا کہ آر۔پی دت نے بھی نشان دہی کی ہے، ورکنگ کمیٹی نے باردولی کے سلسلے میں اپنی 12 فروری کی قرارداد کے ذریعہ تحریک کی واپسی کے فیصلے کی توثیق کرتے ہوئے قرارداد کی سات میں سے دو شقوں میں اس بات پر زور دیا تھا کہ " زمینداروں کے لگان کو روک لینا کانگریس کی قراردادوں (نمبر 6) کے منافی ہے اور زمینداروں کو یہ یقین دلایا تھا کہ کانگریس کا مقصد کسی بھی طرح ان کے قانونی حقوق پر حملہ کرنا نہیں ہے۔" (قرارداد نمبر 7 حوالہ:India Today, p. 290)۔ بہر حال چوری چورا واقعے کا لگان کی ادائیگی یا عدم ادائیگی سے کوئی واسطہ ہی نہیں تھا اور یہ کہ کپڑے یا شراب کے سلسلے میں دھرنے یا مال گزاری ادا نہ کرنے کے مقابلے میں زمیندار کا لگان روک لینے کے معاملے میں تشدد کا امکان کہیں کم تھا۔

گاندھی کے ساتھ انصاف کی بات کرتے ہوئے یہ کہا جاسکتا ہے کہ انھوں نے بار بار اور واضح طور پر خبردار کر دیا تھا کہ وہ ایک مخصوص قسم کی منضبط عوامی تحریک کی قیادت کے لیے تیار ہیں اور یہ کہ انھیں طبقاتی کشمکش یا سماجی انقلاب میں کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ گاندھی کے ذریعے واپس لے لیے جانے کے فوراً بعد ہی یہ تحریک بالکل بیٹھ گئی جس سے اس تحریک کی بنیادی کمزوری کا پتہ چلتا ہے۔22-1919 کی مدت میں ہندوستان میں بغاوت انگیز عوامل کی کوئی کمی نہیں تھی، بلکہ بعض اوقات تو غالباً انقلابی صورتحال بھی پیدا ہو جاتی تھی، لیکن انقلابی قیادت کا ہمیشہ فقدان رہا۔ عوام کو گاندھی راج، کے مبہم تصور سے کافی تحریک ملی تھی اور انھوں نے اس تصور کی تاویل اپنے اپنے طور پر کی تھی اور کچھ نے تو اس سلسلے میں اس کے رشتے انقلاب سے بھی جوڑ لیے تھے اور اس سلسلے میں ان کی نظریں قیادت کے لیے گاندھی کے سوا کسی

دوسرے کو نہیں دیکھ پاتی تھیں۔ کانگریس کے موتی لال نہرو، اجیت رائے اور سی۔ آر۔ داس جیسے دوسرے لیڈر جیل میں تھے اور بار دولی تحریک کی واپسی کو پسند نہیں کیا تھا۔ لیکن وہ بھی نہ تو گاندھی سے زیادہ انقلاب پسند تھے اور نہ ہی سماجی انقلاب کے معاملے میں کم رجعت پسند تھے۔ اگر گاندھی سے ان لوگوں کو کوئی اختلاف رائے تھا بھی تو وہ محض طریقہ کار کی بابت تھی۔ موتی لال اور سی آر داس کسی حد تک یہ بجا طور پر سمجھتے تھے کہ دسمبر 1921 میں پرنس آف ویلز کی دورے کے تعلق سے حکومت ہند کی طرف سے امن کے جو اشارے دیے جا رہے ہیں انھیں قبول کر لینے پر آئینی مراعات کی شکل میں فائدہ حاصل ہو سکتا ہے، لیکن گاندھی نے پہلے تو ہر طرح کی مفاہمت کو مسترد کر دیا تھا اور پھر کچھ بھی حاصل کیے بغیر ہی سول نافرمانی کی تحریک کو اچانک واپس لے لیا تھا۔

انگریز ہر بڑے کانگریسی لیڈر کو گرفتار کرنے کے باوجود بھی ابھی تک گاندھی پر ہاتھ ڈالنے کا حوصلہ نہیں کر سکے تھے۔ بہر حال انھوں نے ہمت کر کے 10 مارچ 1922 کو گاندھی کو گرفتار کر ہی لیا اور چھ سال کی قید کی سزا سنائی۔ یہ محض ایک انتقامی کارروائی تھی۔ بہر حال گاندھی نے عدالت میں اپنی شاندار تقریر کے ذریعے اسے ایک یادگار موقعے میں تبدیل کر دیا "میں یہاں ہوں ،اس لیے کہ وہ بڑی سی بڑی سزا خوشی خوشی قبول کر سکوں جو کہ قانون کی نظر میں کسی عمداً جرم کے لیے اور خود میری اپنی نگاہ میں کسی شہری کے سب سے بڑے فرض کی ادائگی کے لیے دی جا سکتی ہے"۔ بہر حال ایک اہم حقیقت یہ بھی ہے کہ گاندھی کی گرفتاری پر ملک کے کسی بھی حصے میں ذرا بھی احتجاج نہیں ہوا۔

1922-27: زوال اور تقسیم

اگر دیکھا جائے تو 1922 سے 1927 تک کا عرصہ ایک لحاظ سے سرگرمیوں سے خالی رہا، خاص طور پر اس لیے کہ گاندھی نے ایک سال کے اندر سوراج لانے کا جو وعدہ کیا تھا اس سے لوگوں کی امیدیں بہت بڑھ گئی تھیں۔ اب یہ امیدیں مایوسیوں میں تبدیل ہو رہی تھیں۔ مارچ 1923 میں کانگریس کے ممبروں کی تعداد (20 میں سے ان 16 صوبوں میں جنھوں نے اے آئی سی سی کو اپنی رپورٹ بھیج دی تھی) گھٹ کر 106.046 رہ گئی تھی۔ تبدیلی کے مخالف لیڈروں اور سوراجیوں میں اختلاف رائے اتنا بڑھ گیا تھا کہ قومی تحریک کے منتشر ہو جانے کا خطرہ پیدا ہو گیا تھا۔ ایک طرف حکومت کے تئیں گداگرانہ رویہ اپنانے کا رجحان پلٹ رہا تھا اور دوسری طرف 1919-22 کی درمیانی مدت میں قائم ہونے والا ہندو مسلم اتحاد سراب ثابت ہوا تھا اور بہت بڑے پیمانے پر فسادات پھوٹ پڑے تھے۔ بہر حال غالب گمان یہی ہے کہ زیر سطح دوسری قوتیں بھی مضبوطی حاصل کر رہی ہوں گی۔ کیونکہ آگے چل کر نومبر 1927 میں صرف گوروں پر مشتمل

سائمن کمیشن کا اعلان ایک بار پھر قومی اتحاد کا باعث ہوا جو سول نافرمانی کی تحریک کی شکل میں ابھر کر سامنے آیا۔

تبدیلی مخالف گروپ اور سوراجی گروپ

آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے اگلے عملی پروگرام کی سفارش کی غرض سے جون 1921 میں سول نافرمانی انکوائری کمیٹی قائم کی۔ اس کمیٹی کے اندر انصاری، راج گوپال آچاری اور کستوری رنگا ایر نے گاؤں کی تعمیر نو کے گاندھیائی پروگرام پر توجہ مرکوز کرنے پر زور دیا جب کہ موتی لال نہرو، وٹھل بھائی پٹیل اور حکیم اجمل خاں کا یہ کہنا تھا کہ بدلے حالات کے تقاضے کے تحت کانگریس کو کونسل انتخابات میں حصہ لینا چاہیے۔ ولبھ بھائی پٹیل اور راجندر پرساد جیسے قدامت پرست گاندھی حامیوں نے سابق الذکر گروپ کا ساتھ دیا جبکہ آخر الذکر گروپ کی زبردست تائید سی۔ آر۔ داس نے کی جو کہ دسمبر 1922 کی گیا کانگریس میں صدر چنے گئے تھے۔ انھوں نے کاؤنسل میں کانگریس کے داخلے کی وکالت بہت ہی انقلابی طریقے پر کی۔ ان کا کہنا تھا کہ کانگریس کو کاؤنسل کے اندر ہونا چاہیے تاکہ کارروائی میں رکاوٹ پیدا کر کے انھیں اندر سے نقصان پہونچایا جا سکے۔ اس طرح تعطل پیدا ہوگا جس کی وجہ سے انگریز مزید اصلاحات کے لیے مجبور ہو جائیں گے۔ گیا کانگریس سے دو ماہ قبل دہرہ دون میں صوبائی کانفرنس میں بھی داس نے اپنے مشہور فارمولے کی وضاحت کی تھی کہ "سوراج عوام کے لیے ہونا چاہیے نہ کہ محض مخصوص طبقات کے لیے"۔ گیا اجلاس نے کاؤنسل میں کانگریس کے داخلے کی تجویز 890 کے مقابلے میں 1740 ووٹوں سے مسترد کر دی مگر داس اور موتی لال نہرو نے اپنی کوشش جاری رکھی اور نومبر میں ہونے والے انتخابات میں حصہ لینے کے مقصد سے مارچ 1923 میں اپنی سوراج پارٹی بنائی۔ ستمبر 1925 میں دہلی میں کانگریس کے خصوصی اجلاس میں اور پھر دسمبر 1923 میں کاکی ناڑا کے باقاعدہ اجلاس میں مفاہمت ہو گئی جس کی رو سے کانگریسیوں کو الیکشن میں حصہ لینے کی اجازت دیدی گئی، پھر بھی تعمیری کام میں ایقان پر ایک بار پھر زور دیا گیا اور اس تعمیری کام کے سب سے اہم حصے کو منظم کرنے کی غرض سے آل انڈیا کھادی بورڈ کی تشکیل کی گئی۔ فروری 1924 میں جیل سے گاندھی کی رہائی سے کچھ عرصے ایسا لگا کہ توازن جیسے ایک بار پھر تبدیلی مخالف گروپ کے حق میں ہو گیا ہو۔ جون 1924 میں کانگریس کے احمد آباد اجلاس میں گاندھی نے کانگریس کی رکنیت کے لیے کتائی کی ایک کم سے کم مقدار کی شرط پر زور دیا، کاؤنسل میں داخل ہونے والے کانگریسیوں کو پارٹی کے عہدوں سے ہٹا دینے نیز بنگال میں دہشت گردی کے ایک تازہ واقعے کی بھرپور مذمت پر اصرار کیا۔ کانگریس کی رکنیت کے لیے کتائی کی شرط نیز کاؤنسل کے انتخابات میں حصہ لینے والے کانگریسیوں

کو پارٹی کے عہدوں سے ہٹا دینے کے مطالبے کو تو مسترد کر دیا گیا؛ گوپی ناتھ ساہا کی مذمت کی تجویز کی داس نے نیز بنگال کے دوسرے مندوبین نے سخت مخالفت کی تھی مگر یہ تجویز 70 کے مقابلے میں محض 78 ووٹوں سے منظور کر لی گئی۔ اس پر گاندھی نے خود کو "شکست خوردہ اور حقیر و عاجز" بتایا تھا (ینگ انڈیا، 3 جولائی 1929) اور نومبر 1924 میں داس اور موتی لال نہرو سے مصالحت کر کے "سوراجیوں" کو کونسل کے اندر "کانگریس تنظیم کے ایک اٹوٹ حصے" کے طور پر کام کرنے کی اجازت دیدی، اگرچہ اس کے بدلے میں کانگریس کی رکنیت کے لیے کتائی کی شرط (خود یا کسی دوسرے شخص کے ذریعے 2000 گز سوت کی کتائی) مان لینے کی بات طے پائی تھی۔ اگلے سال گاندھی نے کانگریس کی پوری تنظیمی مشینری کو سوراجیوں کے حوالے کر دینے اور اپنے خیالات کی تکمیل کی غرض سے آل انڈیا اسپنرز ایسوسی ایشن قائم کرنے کا فیصلہ کیا۔ ان کے اس اعلان سے کہ 1925 ان کے لیے خاموشی کا سال ہوگا، اس طرح کی افواہیں بھی پھیل گئی تھیں کہ وہ سیاست سے کنارہ کش ہونے جا رہے ہیں۔

ناگ پور، بارساڈ اور ویکم

ان اندرونی اختلافات کی وجہ سے کوئی بڑی تحریک یا احتجاج شروع کرنے کی کانگریس کی صلاحیت بہت کم ہو گئی تھی۔ ناگ پور شہر کے مخصوص حصوں میں کانگریسی جھنڈوں کے استعمال پر عائد پابندی کے خلاف 1923 کے وسط سے جو فلیگ ایجی ٹیشن شروع ہوا تھا وہ بہت ہی پھسپھسا ثابت ہوا اور ایک سمجھوتے پر ختم ہو گیا۔ یہ دوسری بات ہے کہ ولبھ بھائی پٹیل کی قیادت میں گجرات نے اپنی تنظیمی قوت کا ایک بار پھر مظاہرہ کیا تھا اور بہت بڑی تعداد میں رضاکار بھیجے تھے۔ اکالی تحریک جاری تھی اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جواہر لال جیسے انقلابی لیڈروں کی توجہ اپنی طرف مبذول کرا لے گی۔ گرو کے باغ ستیہ گرہ (اگست 1922 اپریل 1923)، جو کہ بے دخل شدہ مہنت اور شرومنی گردوارہ پربندھک کمیٹی کے درمیان ایک متنازعہ درخت کی کٹائی جیسے ایک بہت ہی معمولی واقعے کو لے کر شروع ہوا تھا، پولس کے ذریعے ہزاروں پُرامن اکالی رضاکاروں کی بے رحمانہ پٹائی کی وجہ سے پورے ملک کی ہمدردی حاصل کر گیا تھا۔ اگلے سال انگریزوں کے دباؤ پر نابھا کے مہاراجہ رپودمان سنگھ کی عملداری اس لیے توڑ دی گئی کیونکہ وہ اکالی تحریک کے ایک بڑے سرپرست تھے۔ اس کے خلاف Jaito میں ستیہ گرہ ہوا۔ جس میں تھوڑے سے عرصے کے لیے جواہر لال نہرو نے بھی حصہ لیا۔ بہر حال پنجاب کے نئے گورنر مالکم ہیلی نے 1925 کے سکھ گردوارہ ایکٹ کے ذریعے نیز سکھوں کے مذہبی مقامات پر ایس.جی.پی.سی کے کنٹرول کو تسلیم کر کے اکالیوں کے بحران کو حل کر لیا۔ 1924 میں کچھ اسی طرح کی صورت حال، جو کہ خالصتہً مقامی

نوعیت کی تھی، بنگال میں بھی پیدا ہو گئی جہاں تار کیسور میں سوامی وسوانانند نے بد عنوان مہنت کے خلاف ستیہ گرہ شروع کر دیا تھا۔ بعد میں آر۔ سی۔ داس نے اس ستیہ گرہ کو اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا۔

بہر حال اس عرصہ میں جو دو اہم ستیہ گرہ ہوئے ان میں سے ایک 24-1923 کا بور ساڈ (ضلع کھیڑا) کا ستیہ گرہ اور دوسرا 25-1924 کا ویکم (ریاست ٹراونکور) کا ستیہ گرہ ہے۔ ولبھ بھائی پٹیل کی بور ساڈ تحریک کا ذکر Hardiman نے دیہی گجرات میں پہلی کامیاب گاندھیائی تحریک کے طور پر کیا ہے۔ مسلسل ڈکیتیوں کے انسداد کی غرض سے درکار پولس کے اخراجات کو پورا کرنے کے لیے ستمبر 1923 میں بار ساڈ کے ہر بالغ باشندے پر دو روپے سات آنے کا محصول لگایا گیا تھا۔ (یہ ڈاکے زیادہ تر نچلی ذات کے بریاڈالا کرتے تھے اور پٹی داروں کا خیال تھا کہ انھیں کانگریس کی حمایت کرنے کی سزا دی جا رہی ہے)۔ اس محصول کے خلاف ستیہ گرہ شروع ہوا اور تمام 104 متاثرہ گاؤں کے لوگوں نے دسمبر میں اس نئے محصول کی ادائیگی سے صاف انکار کر دیا۔ اس ٹیکس کو 7 جنوری 1924 کو منسوخ کر دیا گیا۔ اس کامیابی سے وہ گاندھیائی وقار پھر سے بحال ہو گیا جو کہ فروری 1922 میں تحریک اچانک واپس لے لینے سے کافی مجروح ہو گیا تھا۔ اس گاندھیائی ستیہ گرہ کا دائرہ ایک رجواڑے تک وسیع کرنے کی کوشش بہر حال ناکام رہی تھی۔ یہ کوشش بڑودہ کے Petlad تعلقہ (جو کہ کھیڑا سے ہی متصل ہے) میں ٹیکسوں میں ایک حالیہ اضافے کی رد عمل میں کوئی بھی محصول ادا نہ کرنے کی شکل میں کی گئی تھی۔ اس کوشش کے ناکام ہونے کی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ ریاست بڑودہ کے عمال نے انگریزوں کے مقابلے میں زیادہ لوچ دار رویے سے کام لیا، اور بڑی تیزی کے ساتھ چند مراعات کا اعلان کر دیا۔ ویکم ستیہ گرہ 'مندر میں داخلے' کے معاملے سے شروع ہوا تھا۔ در اصل نچلی ذات کے لوگوں (ایزاوا) اور اچھوتوں کو ٹراونکور کے ایک مندر کے آس پاس سے گزرنے والی سڑکوں کو استعمال کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ اس پابندی کو ختم کرانے اور ایزاوا نیز اچھوتوں کے ذریعے ان سڑکوں کے استعمال کے حق پر زور دینے کی کوشش خالصۃً گاندھیائی طریقے پر کی گئی۔ اس تحریک کی قیادت کانگریس کے ایزاوا لیڈر ٹی۔ کے مادھون نے کی اور انھیں اس سلسلے میں کانگریس کے نائر لیڈروں (مثلاً کے۔ کیلاپن، اور کے۔ پی کیسوامین) کا بھی بھرپور تعاون حاصل تھا۔ اس تحریک کو بہت سی دوسری ذاتوں کی بھی تائید حاصل تھی، اس بات کا اشارہ اس سے ملتا ہے کہ نائروں کی ایسوسی ایشن کے لیڈر منتھم پدمانا بھا پائی نے بھی اس میں حصہ لیا تھا۔ البتہ گاندھی کے اس بیان سے کہ عیسائیوں کو ہندوؤں کے اس معاملے سے الگ رہنا چاہیے، عیسائی اس تحریک سے الگ رہے تھے۔ گاندھی نے مارچ 1925 میں ویکم کا دورہ کیا لیکن 20 ماہ بعد یہ ستیہ گرہ دم توڑ دیا گیا کیونکہ حکومت نے اچھوتوں کے لیے علاحدہ سڑکیں بنوا دی تھیں۔

تعمیراتی کام

وقتاً فوقتاً ابھرنے والی مقامی نوعیت کی تحریکوں سے قطع نظر، قدامت پرست، گاندھیائی لیڈروں نے ان برسوں کے دوران اپنی توجہ دیہی علاقوں میں تعمیراتی کاموں پر مرکوز رکھی۔ ان میں سیلاب کے زمانوں (1922 میں بنگال اور 1927 میں گجرات) میں راحت رسانی (جو کہ بسا اوقات سرکاری راحت رسانی سے کہیں زیادہ ہوتی تھی)، قومی اسکولوں کا قیام، کھادی کا فروغ، گھریلو دستکاریوں کی ترقی، شراب خوری کے خلاف مہم، نیز نچلی ذاتوں اور اچھوتوں کی سماجی بہبود جیسی سرگرمیاں شامل تھیں۔ دیہی ہندوستان کے سماجی اور معاشی مسائل کے حل کے لحاظ سے یہ پروگرام قطعی ناکام ثابت ہوا۔ جیسا کہ 1905 سے جاری مسلسل کوششوں کے نتائج سے بھی پتہ چلتا ہے، قومی اسکولوں کا زور بہت ہی مختصر عرصے تک قائم رہ سکا۔ یہ قومی اسکول ڈگریوں اور نوکریوں کے نقطہ نظر سے کسی بھی طرح کا متبادل ثابت نہیں ہو سکے۔ گاندھی نے 1927 میں نجی طور پر موتی لال سے یہ اعتراف کیا تھا کہ، کھادی کا پروگرام بہت صبر آزما ثابت ہو رہا ہے" (موتی لال بنام جواہر لال نہرو، 11 اگست 1927)۔ پھر یہ کھادی بہت مہنگی ثابت ہو رہی تھی، یہاں تک کہ اس کے مقابلے میں درآمد شدہ کپڑا یا ہندوستانی ملوں کا کپڑا بھی سستا تھا۔ اچھوت اُدھار، (اچھوتوں کی فلاح) کے پروگرام کو "ہری جن اودھار" کا نیا نام دیا گیا تھا اور بعض سیاسی وجوہ سے اس پروگرام کو 1932 کے بعد تک جاری رکھا گیا، مگر اس پروگرام میں بے زمین مزدوروں کے معاشی معاملے کو قابل اعتناء بھی نہیں سمجھا گیا، جب کہ واقعہ یہ ہے کہ ان غلام نما بے زمین مزدوروں کی غالب اکثریت اچھوتوں پر ہی مشتمل تھی، اگر اسے واقعی سماجی اصلاح کا پروگرام مان بھی لیا جائے تو اس میں 1920 کی دہائی میں خود گاندھی نے ہی رکاوٹ پیدا کر دی تھی کیونکہ انھوں نے ذات پات کے نظام کی اصولی طور پر مذمت کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ گاندھی نے 1925 میں ٹراونکور کے دورے کے موقع پر ایزاوا نہی رہنما سری نارائین گرو، کے ذات پات مخالف انقلابی افکار سے عدم اتفاق ظاہر کیا تھا، اور تامل ناڈو میں ای وی آر نائیکر جیسے غیر براہمن تشدد پسند لیڈروں کو 1927 میں مدراس میں گاندھی کی تقریروں سے سخت مایوسی ہوئی تھی، کیونکہ ان تقریروں میں ذات پات نظام (ورن آشرم) کا دفاع کیا گیا تھا۔

حالیہ تحقیقی کاموں (ہتیش سانیال۔ بنگال، گیان پانڈے۔ یوپی نیز ڈیوڈ ہارڈی مین۔ کھیڑا) میں گاندھیائی تعمیری کاموں کی سیاسی اہمیت کو نمایاں طور پر پیش کیا گیا ہے۔ کیونکہ ان کاموں کے نتیجے میں ہی کانگریس کی دیہی تائید کی بنیاد کافی مضبوط ہوئی تھی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ نچلی ذاتوں اور اچھوتوں پر کانگریس کا مکمل غلبہ قائم ہو گیا تھا۔ قومی اسکولوں، کھادی بورڈوں اور سماجی خدمت

کی تنظیموں (مثلاً لاجپت رائے کا لوک سیوک منڈل جو کہ پنجاب اور یوپی میں سرگرم تھا) کی وجہ سے کل وقتی کانگریسی کارکنوں کی تربیت اور مالی ضروریات کی تکمیل ممکن ہو سکی تھی۔ اگر قومی تعلیمی اداروں سے شہری علاقے کے غریب متوسط طبقے اور متمول کسانوں کو ہی فائدہ پہونچا (1920 کی دہائی میں یوپی میں اس طرح کے اسکولوں سے ایک بھی اچھوت کانگریسی کارکن نہیں ابھرا تھا) تو کھادی کے پروگرام سے گاؤں کے نادار طبقے کو تھوڑی بہت راحت ملی، اس بات سے بالکل قطع نظر کہ سیاسی فائدہ اٹھانے کی غرض سے اعلا طبقاتی سیاست دانوں نے دیہی لباس اختیار کر لیا تھا۔ بنگال جیسے صوبے میں بھی، جو کہ اپنے غیر گاندھیائی اندازِ فکر کے لیے مشہور تھا، کچھ اداروں نے کافی مفید کام انجام دیے۔ ان میں ستیش داس گپتا کا ادارہ۔ کھادی پرتسٹھان (سودے پور) اور سریس بنرجی کا ادارہ۔ کھادی آشرم (کومیلا) قابلِ ذکر ہیں۔ ہتیش سانیال نے 1922 کے بعد سے ہگلی کے آرام باغ جیسے ایک انتہائی پس ماندہ اور فلاکت زدہ خطے میں پرپھل سین جیسے لوگوں کی ان تھک خدمات کا بھی ذکر کیا ہے۔ آرام باغ یقیناً متمول کسانوں کی ترقی کا علاقہ نہیں تھا، لیکن اس سلسلے میں اسے ایک گاندھیائی مرکز کی حیثیت بھی حاصل نہیں تھی۔ حسب توقع گجرات میں؛ اور خاص طور پر کھیڑا اور باردولی میں تعمیری کام کو زبردست کامیابی حاصل ہوئی۔ پورے علاقے میں آشرموں کا سلسلہ قائم ہو تا گیا تھا اور بڑی تعداد میں مخلص گرام سیوک سرگرم ہو گئے تھے۔ یہاں تعمیری کام کے نتیجے میں گاندھی کا دائرہ اثر اب کافی وسیع ہو گیا تھا۔ باردولی کے "کالی پرج" ذات کے لوگوں اور کھیڑا کے بریا لوگوں کے درمیان تعمیری کام کے ساتھ ساتھ ان لوگوں کا تھوڑا بہت ادھار بھی ہوا، اور قانون شکن عناصر کو درست کرنے کا عمل بھی شروع ہوا۔ مثال کے طور پر روی شنکر مہاراج، ایک سادھو اور سوشل ورکر کے طور پر بریا آبادی والے دیہات میں برابر گھومتے رہے تھے جس کے نتیجے میں بورسد تعلقے میں ڈکیتی کے واقعات میں کافی کمی آگئی تھی۔ جہاں 1921 میں ڈکیتی کے 20 واقعات ہوئے تھے، 1927 سے 1929 تک سال میں صرف ایک واقعہ ہوا تھا۔ ہر جگہ تعمیری کام کے مراکز، 1930 کی سول نافرمانی کی تحریک کے دوران کانگریسی کارکنوں کی سرگرمیوں کا مرکز بن گئے تھے۔ کھیڑا کے کسانوں میں قوم پرستی کی جڑیں اتنی مضبوط ہو گئی تھیں کہ ڈانڈی مارچ کے موقع پر بورسد کے 16 گاؤوں کے لوگوں نے پہل کرتے ہوئے حکومت کو کسی بھی طرح کا ٹیکس نہ دینے پر زور دیا تھا، حالانکہ اس سال فصل بہت اچھی رہی تھی، حال میں ٹیکس یا لگان وغیرہ میں بھی کوئی اضافہ نہیں کیا گیا تھا اور 1930 کے آخر میں زرعی پیداوار کی قیمتوں میں جو بھاری گراوٹ آئی تھی وہ ابھی پردہ مستقبل میں ہی تھی۔ اس لیے یہی کہا جائے گا کہ ہندوستانی قوم پرستی کی تاویل ہمیشہ مالی مفاد کے ہی تناظر میں نہیں کی جا سکتی۔

سوراجی سیاست

ان برسوں کے دوران سوراجیوں کی انتخابی اور کونسلی سرگرمی کافی نظر فریب تو رہی مگر اسے کوئی خاص اہمیت حاصل نہ ہو سکی۔ 1923 کے انتخابات میں سوراجیوں کو وسطی صوبہ جات (C.P.) کی صوبائی اسمبلیوں میں اکثریت حاصل ہو گئی تھی جہاں تلک کے پرانے مہاراشٹری پیروکار این۔ سی۔ کیلکر وغیرہ جو کہ عدم تعاون کی طرف کبھی بھی راغب نہیں ہو سکے تھے، موتی لال اور داس کے خیمے میں آگئے تھے۔ پارٹی نے بنگال میں بھی اچھی کارکردگی کا مظاہرہ کیا جہاں پارٹی کے امیدوار بی۔ سی رائے نے سریندر ناتھ بنرجی کا بالکل صفایا کر دیا تھا جو کہ 1921 میں وزیر بھی رہ چکے تھے۔ پارٹی نے 85 ہندو مسلم منتخبہ سیٹوں میں سے 47 پر قبضہ کر لیا جن میں کم از کم 21 مسلم انتخابی حلقے شامل تھے۔ بنگال میں یہ کامیابی دیش بندھو چترنجن داس کی اثرانگیز اور سحر آفریں قیادت کا نتیجہ تھی۔ دیس بندھو چترنجن داس نے جون 1925 میں اپنی بے وقت موت تک کلکتہ کے سارے اہم سیاست دانوں، ضلع کی سطح کے لیڈروں اور انقلابی کارکنوں کو پوری طرح ملا کر رکھا تھا۔ (واضح رہے کہ بنگال کانگریس کے ذریعے 1924 تک 28 سابق نظر بندوں کو پارٹی میں شامل کیا جا چکا تھا۔) سب سے اہم بات یہ کہ وہ مسلم لیڈروں کو بھی ملا کر رکھنے میں کامیاب رہے تھے۔ مسلم لیڈروں کو داس کے معاہدہ بنگال (دسمبر 1923) کے ذریعے ساتھ ملایا گیا تھا۔ اس معاہدہ کے ذریعے یہ وعدہ کیا گیا تھا کہ سوراج کے بعد انتظامی نوکریوں میں مسلمانوں کا حصہ 55 فی صد ہوگا، مسجدوں کے سامنے باجا نہیں بجایا جائے گا اور بقر عید کے موقع پر گائے کی قربانی کے معاملے میں کوئی دخل اندازی نہیں کی جائے گی۔ کونسلوں کو اندر سے ناکام بنا دینے کے پروگرام پر عمل سی پی اور بنگال میں دوعملی حکومت کے وزراء کو تنخواہ کی ادائیگی سے انکار کے دھاکے کے ساتھ شروع ہوا۔ ان وزراء کو مجبوراً استعفیٰ دینا پڑا اور قانون سازی کے سلسلے میں گورنروں کو بار بار اپنے خصوصی اختیارات (تصدیق نامہ جاری کرنے کا اختیار) کو استعمال کرنا پڑا، جس سے یہ بات کھل کر سامنے آگئی کہ دوعملی حکومت (Dyarchy) کو کسی بھی لحاظ سے آئینی پیش قدمی قرار نہیں دیا جا سکتا۔ فروری 1924 میں مرکزی اسمبلی میں سوراجی لیڈروں کی تحریک پر ایک قرارداد پاس کر کے، اصلاحات پر تبادلۂ خیال کے لیے ایک گول میز کانفرنس بلانے کا مطالبہ کیا گیا تاکہ ایک جواب دہ حکومت قائم ہو سکے۔ موتی لال نہرو اور ولبھ بھائی پٹیل جیسے لیڈروں نے یہ ثابت کر دیا کہ وہ پارلیمانی امور پر پورا عبور رکھتے ہیں۔ ایک دوسری بات یہ ہوئی کہ اس دوران ہندوستان کے کاروباری گروپوں اور سوراجی سیاست دانوں کے درمیان وسیع تر رابطے قائم ہو چکے تھے، اور 1924 میں ٹاٹا اسٹیل انڈسٹری کو حکومت کی طرف سے تحفظ فراہم کرانے میں یہ سوراجی سیاست داں

بہت مددگار ثابت ہوئے تھے۔ اس اثناء میں کانگریس پورے ملک میں مقامی انتخابی اداروں اور میونسپلٹیوں پر بھی قبضہ کر چکی تھی اور اس سلسلے میں خاص طور پر یہ کامیابی کلکتہ میں داس اور سبھاش بوس کی قیادت میں، الہ آباد میں جواہر لال نہرو کی قیادت میں اور احمد آباد میں ولبھ بھائی پٹیل کی قیادت میں حاصل ہوئی تھی۔ یہ ادارے کچھ عرصہ کے لیے محدود قسم کی فلاحی سرگرمیوں کا سبب بنے اور سب سے اہم یہ کہ یہ ادارے سرپرستی اور فنڈ کا ایک وسیلہ بھی ثابت ہوئے۔

بہر حال جلد ہی یہ نمایاں ہونے لگا کہ کونسلوں میں داخل ہونے کی سیاست بہت سے دوسرے مسائل اور اندرونی چپقلش کا باعث ہو رہی ہے۔ ایک بار دوعملی حکومت کو شرمناک قرار دیا جا چکا تھا، تو اب سوال یہ تھا کہ آگے کیا کیا جانا چاہیے، کیونکہ وائسرائے اور صوبائی گورنر اپنے خصوصی اختیارات کے ذریعے جس بھی بل کو چاہتے قانون کی شکل دیدیتے تھے۔ مثال کے طور پر بنگال کے سوراجی لیڈر اکتوبر 1924 میں اس وقت کچھ بھی نہیں کر سکے تھے جب سبھاش بوس کو مقدمہ چلائے بغیر ہی نظر بند کر دیا گیا تھا۔ سبھاش اور دوسرے 80 لوگوں کو ایک ایسے آرڈی ننس کے تحت نظر بند کیا گیا تھا جو کہ جنگ کے زمانے کے ڈیفنس آف انڈیا قانون جیسا تھا اور تصدیق نامہ کے طریقے سے جسے قانون کی شکل دی گئی تھی۔ ان لوگوں پر دہشت گرد گروپوں کے ساتھ رابطہ رکھنے کا شبہ تھا۔ دوعملی حکومت کے منتخب وزیروں کو کسی طرح کے بھی حقیقی اختیارات حاصل نہیں تھے مگر انھیں کسی قدر حکومت کی سرپرستی اور سرکاری عملے کے چھوٹے بڑے افسروں کی قربت حاصل تھی، اس لیے اکزیکٹو عہدے سنبھالتے ہی ان کے اندر جوابی تعاون کا رجحان فروغ پانے لگا تھا، یہاں تک کہ سی۔ آر۔ داس جیسے لیڈر نے بھی اپنی موت سے ذرا پہلے اس خیال کا جائزہ لیا تھا کہ کیا قیدیوں (نظر بندوں) کی رہائی کے بدلے میں حکومت کو تعاون کی پیشکش کی جا سکتی ہے اور دستوری اصلاح کے بارے میں بات چیت ہو سکتی ہے۔ انھوں نے اپنا یہ خیال مئی 1925 کی فرید پور کانفرنس میں تقریر کرتے ہوئے پیش کیا تھا۔ یہ سلسلہ ایس۔ بی تامبے نے سی پی میں شروع کیا اور اکتوبر 1925 میں وزارتی عہدہ قبول کر لیا۔ موتی لال نہرو نے ان کی سخت مذمت کی، لیکن مہاراشٹر اور بمبئی کے سوراجیوں (این۔ جی کالیکر، بی ایس مونجے اور ایم۔ آر۔ جیاکر وغیرہ) نے ان کی تائید کی۔ سرکاری سرپرستی کے امکانات، نیز پارٹی کی ابھرتی ہوئی افسر شاہی اور مقامی اداروں اور سرکاری محکموں میں اثر و رسوخ کے آتجر گروہی رقابتوں کے باعث ہوئے۔ بنگال میں سی۔ آر۔ داس کی موت کے بعد جانشینی کی جنگ شروع ہو گئی تھی جس میں جے۔ ایم۔ سین گپتا نے 1927 میں بیرندر ناتھ سسمال کو تو بے دخل کر دیا تھا مگر اس کے فوراً بعد ہی سبھاش بوس جیل سے رہا ہو گئے تھے۔ چنانچہ انھوں نے سین گپتا کو چیلنج کیا۔ 1926 کے انتخابات کے موقع پر موتی لال کے پرانے حریف مدن موہن مالویہ نے لاجپت رائے نیز جوابی تعاون کے حامی

لیڈروں کے ساتھ مل کر آزاد کانگریس پارٹی بنالی جس کا سیاسی پروگرام سیاسی اعتدال پسندی اور ہندو فرقہ پرستی پر مشتمل تھا۔

فرقہ واریت

ان برسوں کے دوران ہندو اور مسلم فرقہ واریت کو سنگین حد تک بڑھاوا ملا۔ ستمبر 1924 میں شمالی مغربی سرحدی صوبے کے کوہاٹ میں ہندو مخالف فسادات پھوٹ پڑے تھے جن میں 155 لوگ مارے گئے تھے۔ 1926 میں اپریل اور جولائی کے درمیان کلکتہ میں تین بار فسادات ہوئے جن میں 138 لوگ مارے گئے تھے۔ اسی سال ڈھاکہ، پٹنہ، راولپنڈی اور دہلی میں بھی ہندو مسلم بلوے ہوئے۔ سب سے زیادہ اثر یوپی میں تھا، جہاں 1923 اور 1927 کے دوران کم از کم 91 فرقہ وارانہ فسادات ہوئے۔ ان فسادات کی وجہ وہی گھسی پٹی باتیں ہوتیں؛ یعنی مسلمانوں کا یہ مطالبہ ہوتا کہ مسجدوں کے سامنے باجانہ بجایا جائے اور ہندوؤں کا مطالبہ یہ ہوتا کہ گوکشی پر پابندی لگائی جائے۔ اس عرصہ میں فرقہ وارانہ تنظیموں کو بھی خوب فروغ حاصل ہوا اور سیاسی صف بندیاں زیادہ تر فرقہ وارانہ بنیادوں پر ہی عمل میں آئیں۔

1919-22 میں ہندو مسلم اتحاد کے انتہائی عروج کے زمانے میں بھی کانگریس اور خلافت تحریک کی رضاکار تنظیمیں الگ الگ ہی رہی تھیں؛ لیڈروں میں اتحاد کی وجہ سے ان تنظیموں میں اتحاد تھا مگر لیڈروں کے مابین تنازعہ پیدا ہو جانے کی صورت میں پھوٹ کے بھی سارے عوامل موجود تھے۔ خلافت تحریک کے سلسلے میں قدامت پرست قسم کے مولوی ملا بڑی تعداد میں سیاست کے میدان میں آگئے تھے اور جمیعۃ علمائے ہند نے دسمبر 1921 میں اپنا جو لائحۂ عمل سامنے رکھا تھا اس میں آزاد ہندوستان کو مختلف فرقوں کے ایک وفاق کی شکل دینے کی بات کہی گئی تھی۔ اسی طرح کانگریس کا پروپگنڈہ بھی، اور خاص طور پر نچلی سطح پر، مکمل طور پر سیکولر نہیں ہوتا تھا، مثلاً رام راجیہ، یقیناً ایک ایسا تصور تھا جو مسلمانوں کے نزدیک زیادہ دلچسپی کا باعث نہیں ہو سکتا تھا۔ گاندھی کے ذریعے فروری 1922 میں تحریک واپس لے لیے جانے پر کانگریس اور خلافت اتحاد کافی کمزور پڑ گیا تھا اور 1925 کے شروع میں اس وقت بالکل ہی ٹوٹ گیا جب بار بار کے فسادات کے پس منظر میں محمد علی نے گاندھی سے ناطہ توڑ لیا تھا۔ حالانکہ یہی محمد علی دسمبر 1923 کے کاکی ناڑا کانگریس اجلاس کی صدارت کر چکے تھے۔ پھر یہ کہ کمال اتاترک نے جب 1924 میں خلافت عثمانیہ کے خاتمے کا اعلان کر دیا تو خلافت تحریک کے لیڈران اپنے بنیادی نعرے سے بھی محروم ہو گئے تھے۔

جہاں تک سیاست دانوں اور تعلیم یافتہ افراد کے درمیان پھوٹ اور اختلاف کا تعلق ہے تو

1920 کی دہائی میں فرقہ واریت کے فروغ کی وجہ 1919 کے بعد سیاسی ڈھانچے میں حصے داری سے تعلق رکھتی ہے۔ مونٹفورڈ (Montford) اصلاحات کے نتیجے میں رائے دہی کا دائرہ وسیع ہو گیا تھا لیکن جداگانہ انتخابیہ (Electorate) کو نہ صرف محفوظ رکھا گیا بلکہ اس کی توسیع بھی کی گئی۔ چنانچہ اس نظام کے تحت سیاست داں اپنے اپنے فرقہ میں کام کرنے، فرقہ وارانہ نعرے لگانے اور اپنے مذہب، علاقے یا ذات پات کے لوگوں کو فائدہ پہونچا کر اپنے حامیوں کی تعداد بڑھانے پر مجبور تھے۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ 1920 کی دہائی میں تعلیم میں بھی کافی توسیع ہوئی تھی جبکہ روزگار کے مواقع میں تعلیم کی مطابقت سے قطعی اضافہ نہیں ہوا تھا۔ "......اسکول، دفتر اور دکان...... کے تئیں تلخی اور برہمی میں مزید شدت اس وجہ سے پیدا ہو گئی تھی کہ لوگوں کو بڑھتی ہوئی امیدوں کے بدلے میں مایوسی ملی تھی۔"

(حوالہ P. Hardy: Muslims of British India p-204)۔

تعلیم کے فروغ اور روزگار کے مواقع کی کمی کا سلسلہ ویسے 1880 کی دہائی سے ہی جاری تھا مگر اب صورت حال کافی سنگین ہو چکی تھی اور ضرورت سے بہت کم وسائل میں حصے داری کی کوشش فرقہ وارانہ تناؤ کا باعث ہوئی۔ سماج کی نچلی سطح پر کوئی بھی سماجی یا معاشی تناؤ فوراً فرقہ وارانہ رخ اختیار کر جاتا تھا، خاص طور پر اس لیے بھی کہ اب اس کے لیے ایک نظریاتی اساس بھی فراہم ہو گئی تھی۔ مثال کے طور پر کان پور جیسے شہر میں مارچ 1931 کے زبردست فرقہ وارانہ فسادات کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ 1920 کی دہائی میں ہتھ کرگھے کی بنائی میں زبردست گراوٹ آگئی تھی جس میں زیادہ تر مسلمان ہی لگے ہوئے تھے اور وہ بھی ایک ایسے وقت میں جب کہ ہندو بیوپاری اور صنعت کار آگے بڑھ رہے تھے۔ حکومت بنگال کی 1926 کی ایک رپورٹ میں میمن سنگھ کے دیہی علاقوں میں فرقہ وارانہ تناؤ کی وجہ یہ بتائی گئی تھی کہ "اس ضلع میں ہندو زمینداروں اور مسلمان تعلقہ داروں یا جوت داروں کے درمیان معاشی رقابت تھی، جس کا ثبوت یہ بھی ہے کہ بنگال لگان ایکٹ ترمیم بل میں مسلمان الیکٹروں (انتخاب کنندگان) نے کافی دلچسپی لی تھی۔ (حوالہ: Goverment of Bengal. Political. Confidential. 516-1926) بنگال کے تمام سوراجی لیڈروں نے، جن میں کیونسٹ نظریات والے سبھاش بوس بھی شامل تھے۔ لگان ایکٹ ترمیم بل پر بحث میں، جو کہ 1923 اور 1928 کی درمیانی مدت میں رک رک کر شروع ہوتی رہی تھی، زمینداروں کی حمایت کا رویہ اپنایا تھا جس کا ایک نتیجہ مسلمانوں کی دوری کی شکل میں بھی سامنے آیا تھا۔

فرقہ وارانہ تنظیموں اور نظریات کے تیز رفتار پھیلاؤ کے نتیجے میں اعلا طبقات اور عوام کی فرقہ واریت کے درمیان تال میل قائم ہو تا گیا۔ اس فرقہ واریت کے پھیلاؤ میں مسلمانوں کے رول سے سبھی واقف ہیں۔ مثلاً 1923 کے بعد سے مسلمانوں کے اندر تبلیغ اور تنظیم زور پکڑتی گئی

تھی، 1924 میں کوہاٹ میں زبردست ہندو دشمن فسادات ہوئے تھے، خلافت تحریک کے دم توڑتے جانے کے ساتھ ساتھ مسلم لیگ میں دوبارہ جان پڑ رہی تھی اور 1926 میں سوامی شردھانند کو قتل کر دیا گیا تھا۔ مسلم لیگ نے 1918 کے بعد 1924 میں پہلی بار کانگریس سے الگ اپنا اجلاس لاہور میں منعقد کیا جس کی صدارت جناح نے کی تھی اور اس اجلاس میں ایک ایسے وفاق کا مطالبہ کیا تھا جس میں "ہندو غلبے" سے مسلمانوں کے تحفظ کے لیے صوبوں کو مکمل خود مختاری حاصل ہو؛ اس کے علاوہ دونوں فرقوں کے لیے جداگانہ انتخابیہ کی تجویز بھی رکھی گئی تھی۔ یہ ایک ایسی تجویز تھی جسے مسلم لیگ کے سب سے اہم نعرے کی حیثیت حاصل رہی تھی یہاں تک 1940 میں مسلم لیگ نے پاکستان کا نعرہ بلند کر دیا۔ یہاں اس نکتے پر زور دینے کی ضرورت ہے کہ یہ سارا رویہ دراصل ان برسوں کے دوران ہندو فرقہ واریت میں تیزی سے پھیلاؤ کا ہی ایک ردِ عمل تھا۔ مسلمانوں کے اندر تبلیغ اور تنظیم کی کوشش دراصل آریہ سماجیوں کی "شدھی اور سنگٹھن" کی تحریک کا ہی ایک ردِ عمل تھی۔ شدھی اور سنگٹھن کی یہ تحریک موپلاؤں کے ذریعے جبریہ تبدیلی مذہب کے بعد شروع ہوئی تھی جس کا دائرہ سوامی شردھانند نے 1923 میں مغربی یوپی تک پھیلا دیا تھا۔ انھوں نے ایسا اُن مَلکانہ راجپوتوں، گوجروں اور جاٹوں کو دوبارہ ہندو بنانے کی غرض سے کیا تھا جو مذہب اسلام قبول کر چکے تھے۔ ہندو مہا سبھا، جو کہ 1915 میں ہردوار کے کنبھ میلے کے موقع پر مدن موہن مالویہ نے چند پنجابی لیڈروں کے ساتھ مل کر قائم کی تھی، عدم تعاون کی تحریک کے دوران قطعی غیر فعال ہو کر رہ گئی تھی۔ 23-1922 سے اس میں نمایاں طور پر پھر سے جان پڑنی شروع ہوئی اور اگست 1923 کے بنارس اجلاس میں، شدھی پروگرام کو قبول کر لیا گیا اور ہندوؤں کے خود حفاظتی دستے تشکیل دینے کا نعرہ دیا گیا نیز مالویہ کی صدارت میں ایک ہندو فرقہ وارانہ محاذ قائم کر کے اصلاح پسند آریہ سماجیوں اور قدامت پرست سناتن دھرمیوں کے درمیان اتحاد قائم کرانے کی کوشش کی گئی۔ جہاں ہندو اور ہندی پر ہی زور دینے کی وجہ سے ہندو مہا سبھا کا اثر صرف شمالی ہند (1923 کے اجلاس میں شریک 86 فی صد مندوبین کا تعلق یوپی، دہلی، پنجاب اور بہار سے ہی تھا اور بنگال، بمبئی اور مدراس سے مجموعی طور پر محض 6.6 فی صد مندوبین شریک ہوئے تھے) تک ہی محدود رہا۔ اس سلسلے کا سب سے اہم واقعہ یہ ہے کہ بی۔ ہیڈگیوار نے 1925 میں ناگ پور میں راشٹریہ سویم سیوک قائم کی۔ ہیڈگوار تلک کے ایک پرانے پیروکار مونجے (Monje) کے ساتھی تھے۔

نظریاتی طور پر سیکولرازم کا دم بھرنے کے باوجود بھی کانگریس کے قدامت پرست لیڈر بھی اور سوراجی لیڈر بھی ہندو فرقہ واریت کو کنٹرول کرنے میں بری طرح ناکام رہے بلکہ خود کو ہندو فرقہ وارانہ تنظیموں اور نظریات سے مکمل طور پر الا تعلق بھی نہیں رکھا۔ ستمبر 1924 کے

کوہاٹ فسادات کے بعد گاندھی نے محمد علی کی دہلی کی رہائش گاہ پر برت رکھا اور لیڈروں کی ایک اتحادی کانفرنس بلا کر فرقہ وارانہ کشیدگی کو کم کرنے کی کوشش کی۔ انھوں نے محض ایک گائے کی زندگی بچانے کی خاطر انسانوں کے بے رحمانہ قتل عام کے رجحان کی ایسے الفاظ میں مذمت کی جن کی معنویت آج بھی برقرار ہے (ینگ انڈیا، 29 مئی 1924)۔ تاہم یو پی میں پرشوتم داس ٹنڈن جیسے تبدیلی مخالف کانگریسی لیڈروں نے مالویہ کے ساتھ قریبی روابط قایم کر رکھے تھے اور خود گاندھی نے بھی مالویہ سے اپنا رابطہ کبھی منقطع نہیں کیا تھا۔ بنارس جیسے مقامات پر ہندو مہاسبھا اور سوراج پارٹی ایک دوسرے سے الگ نہیں تھیں۔ 1925 کے بعد سے مدن موہن مالویہ نے موتی لال نہرو کی رقابت میں ہندو فرقہ واریت سے بھرپور فائدہ اٹھایا اور لاجپت رائے کے ساتھ مل کر انڈیپنڈنٹ کانگریس پارٹی بھی بنائی تھی جو کہ ایک حد تک ہندو مہاسبھا کا ہی ایک ظاہری روپ تھی۔ الیکشن کی تیاریوں کے نتیجے میں بھی ہندو فرقہ واریت کو راست طور پر بڑھاوا ملتا رہا، جیسا کہ 26-1925 میں الہ آباد میں بھی دیکھنے میں آیا جہاں مسجدوں کے آگے باجا بجانے کے سلسلے میں مسلمانوں کی مصالحانہ پیش کش کو بار بار مسترد کیا جاتا رہا (مئی 1926 میں مسلمانوں نے یہ اپیل بھی کی تھی کہ مسجدوں کے سامنے صرف مغرب کے وقت پانچ یا دس منٹ کے لیے باجا نہ بجایا جائے)۔ بنگال میں داس کے ہندو مسلم معاہدے کو 1926 میں کالعدم کر دیا گیا۔ سین گپتا نے اس معاہدے کو بچانے کی کوشش کی جس کا صلہ انھیں یہ ملا کہ ان کے ساتھی کانگریسیوں نے ہی "ہندو مذہب خطرے میں ہے" کا نعرہ لگا کر اگلے سال مدنا پور کے ایک الیکشن میں انھیں ہرا دیا تھا۔ 1926 کے الیکشن سے پہلے خود موتی لال نہرو جیسے لیڈر بھی فرقہ وارانہ نوعیت کی اپیل کرنے کی سطح تک اتر آئے تھے۔ انھوں نے "مسلم نوازی" اور "گائے خوری" کے الزام کو دھونے کے لیے ہندو مہاسبھا کے کچھ گروپوں کی تائید حاصل کرنے کی بھی ناکام کوشش کی تھی۔

1926 کے انتخابات میں سوراجی لیڈروں کو مدراس کے سوا باقی سارے ملک میں ناکامی کا سامنا کرنا پڑا جس کے بعد ہندو مہاسبھا اور جوابی تعاون کے حامی وکلاء کے درمیان گٹھ جوڑ قایم ہو گیا۔ تیزی سے فرقہ وارانہ بنیاد پر ہونے والی صف بندی کا ایک واضح اشارہ اس بات سے بھی ملتا ہے کہ ان ساری باتوں کے باوجود بھی بنگال میں سوراجی لیڈر ہندوؤں کے لیے مخصوص 47 میں سے 35 سیٹیں جیتنے میں کامیاب ہو گئے تھے جب کہ مسلمانوں کے لیے مخصوص 39 میں سے صرف ایک ہی سیٹ ان کے ہاتھ لگ سکی تھی۔ اس سے بھی زیادہ اہم بات یہ تھی کہ 1920 کی دہائی کے وسط کی تلخ یادوں کی وجہ سے ہی مسلم فرقہ نے 34-1930 کے دوران غیر ملکی حکمرانی کے خلاف جدوجہد سے خود کو الگ رکھا تھا۔ اس صورت حال کا اصل فائدہ انگریزوں کو ہی پہونچا۔ یہ بات اکثر نظر انداز کر دی جاتی ہے کہ ملک پر انگریزوں کی حکمرانی کو طول دینے میں ہندو فرقہ پرست لیڈروں

کا رول مسلم لیگ سے کسی طرح کم نہیں تھا۔ اس ہندو فرقہ پرست قیادت میں مدن موہن مالویہ سے لے کر شیاما پرساد مکھرجی جیسے سبھی لیڈر شامل تھے، جہاں مالویہ محض ہند، ہندو اور ہندی کے ہی علم بردار نہیں تھے، بلکہ 1921 کی عدم تعاون کی تحریک کے مخالف بھی رہے تھے؛ وہیں شیاما پرساد مکھرجی، جنھوں نے بعد میں جن سنگھ کے نام سے ایک سیاسی جماعت بنائی، اگست 1942 میں اس وقت بنگال میں وزیر تھے جب "انگریزو! ہندوستان چھوڑو"، تحریک کو خاک اور خون میں غرق کر دینے کی کوشش کی جارہی تھی۔

نئی قوتوں کا ظہور: 27-1922

جواہر لال نہرو کے نام 30 مارچ 1927 کے مکتوب میں موتی لال نہرو کی مایوسی صاف جھلکتی ہے "مختصر یہ کہ ہندوستان میں حالات کبھی بھی اتنے خراب نہیں رہے ہیں، عدم تعاون تحریک کے سلسلے میں جو ردعمل 23-1922 سے سامنے آنا شروع ہوا ہے، اس سے عوامی سرگرمی پر رفتہ رفتہ مگر یقینی طور پر بہت ہی منفی اثر مرتب ہوا ہے، عوام کو فرقہ واریت کے سوا اور کوئی تعلیم نہیں مل رہی ہے؛ اور کانگریسی لیڈر سرکاری مراعات کے لیے ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ بہر حال 1927 کے آخر میں قومی تحریک میں نئی جان پڑے گی" چنانچہ ان عوامل کا جائزہ لینے کا یہی وقت ہے جو اس ڈرامائی تبدیلی کے لیے ذمہ دار رہے ہیں۔

سیاسی اور معاشی تناؤ

انگریزوں اور ہندوستانی عوام کے بیشتر حلقوں کے سیاسی اور معاشی مقاصد میں اتنا تضاد اور ٹکراؤ تھا کہ مفاہمت یا اشتراک کی کوئی بھی کوشش زیادہ عرصہ تک جاری رکھنا ممکن ہی نہیں تھا۔ تقریباً تمام ہی سیاست داں 1920 کی دہائی کے اس عام احساس سے مایوسی کا شکار تھے کہ چونکہ عالمی جنگ کے بعد سامراج کے خلاف جو ابال پیدا ہوا تھا وہ دب گیا ہے، اس لیے اب ہندوستان میں انگریزوں نے اپنا شکنجہ پھر سے کسنا شروع کر دیا ہے۔ لائیڈ جارج نے اگست 1922 میں اپنی "اسٹیل فریم" تقریر میں اعلان کیا تھا کہ "ہم..... کسی بھی ادارے کو..... اس کے کاموں اور مراعات سے محروم نہیں کریں گے..... اور اس ادارے سے ہماری مراد ہندوستان کی برٹش سول سروس ہے"۔ اس تقریر کے مضمرات کی وضاحت بعد میں 1924 کے رایل کمیشن اور 1926 کی انڈین سینڈ ہرسٹ کمیٹی نے اس خیال کی شکل میں کہ انڈین سول سروس میں 15 سال بعد اور پولس نیز آرمی میں 20 سال بعد ہندوستانیوں کا تناسب 50 فی صد تک بڑھا دیا جائے گا۔ (گویا آرمی میں ہندوستانیوں کا یہ پچاس فیصد تناسب کہیں جا کر 1952 میں ہو پاتا)۔ 1920 کی دہائی ایک ایسا زمانہ

ہے جس میں سفید فام آبادی والے ممالک محروسہ ایک لحاظ سے یکے بعد دیگرے آزادی حاصل کرتے جارہے تھے۔ یہ ایک ایسا عمل تھا جو بالآخر 1931 کے قانون ویسٹ منسٹر کی شکل میں منتج ہوا۔ حکومت کے ترجمان خصوصاً وزیر داخلہ مالکم ہیلی نے فروری 1924 میں بڑی جلد بازی کے ساتھ وضاحت کی کہ (1919 کے) گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کا مقصد یہ ہرگز نہیں ہے کہ ہندوستان کو ایک ڈومنی ان (مملکت محروسہ) کا درجہ دیدیا جائے گا، بلکہ اس کا مقصد ایک جواب دہ حکومت کا قیام ہے"۔ 1925 میں ٹوری حکومت کے سکریٹری آف اسٹیٹ برکن ہیڈ کے خیال میں لٹن یا کرزن کے زمانے سے بہ ظاہر کوئی بھی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ انھوں نے 7/ جولائی 1925 کو دارالامراء میں دہاڑتے ہوئے کہا تھا کہ "ابھی تو (اصلاحات کا بھی) دروازہ نہیں کھولا گیا ہے، اس لیے ہندوستان کا ذکر ایک (جداگانہ سیاسی) وجود کے طور پر کرنا زری حماقت ہے"۔ اس طرح کا کوئی ملک (قوم) ہی نہیں رہا ہے، اگر ہم کل ہندوستان کو خالی کردیں تو اس کا فوری نتیجہ یہ ہوگا کہ ہندوستان کی ہندو اور مسلم آبادی میں جنگ شروع ہو جائے گی۔"

شاید اس سے بھی زیادہ اہم بات یہ تھی کہ مختصر سی مراعات (1921 کا مالیاتی کمیشن نیز 1924 میں اسٹیل کا تحفظ وغیرہ) کے فوراً بعد ہی یعنی 1920 کی دہائی کے وسط سے ہی معاشی تضادات زیادہ نمایاں شکل اختیار کرنے لگے تھے۔ امتیازی صنعتی تحفظ کی پالیسی کا مقصد یہی تھا کہ ہندوستانی صنعت کاروں کی درخواستوں پر ٹیرف بورڈ کے ذریعے غور و خوض کے دوران زیادہ سے زیادہ انگریز تاجروں کے لیے راستہ نکالا جا سکے: پھر یہ بھی کہ حکومت درآمدات پر بھاری محصول سے متعلق سفارشات پر عمل درآمد کو بھی بعض اوقات روکے رکھتی تھی جس کی واضح مثال یہ ہے کہ 1927 کے ٹیکسٹائل ٹیرف بورڈ کی سفارشات پر عمل درآمد کو روکے رکھا گیا تھا: مشرقی ہندوستان میں برلا گروپ انگریزوں کے جوٹ مفادات کے بالمقابل اپنا راستہ بنانے کی کوشش کر رہا تھا جب کہ بمبئی میں والچند ہیرا چند اور لال جی نارائن جی کے ایک مشترکہ کاروبار۔ سندھیا اسٹیم نیوی گیشن کو ان انگریزوں کی زبردست مخالفت کا سامنا کرنا پڑرہا تھا جن کے اپنے جہاز رانی مفادات تھے۔ ان مفادات کی قیادت خود لارڈ انچ کیپ (Inchcape) کر رہے تھے۔ سبھی کو سب سے زیادہ شکایت اس بات پر تھی کہ 1926 کے ہلٹن۔ ینگ کمیشن نے اسٹرلنگ پونڈ کے مقابلے میں روپے کی شرح تبادلہ ایک شلنگ 6 پینس طے کی تھی۔ پرشوتم داس ٹھاکر داس نے، جو کہ 1921 میں حکومت کے وفاداروں میں شامل تھے، ہندوستانیوں کی طرف سے اس متفقہ مخالفت کا آغاز کیا کہ روپے کی شرح تبادلہ کم ہونے کے نتیجے میں اس کی قدر زر میں کمی آجائے گی جس سے درآمدات کی حوصلہ افزائی ہوگی جس سے ہندوستانی ملوں میں تیار ہونے والے کپڑے کے مفادات متاثر ہوں گے، برآمد کیے جانے والے ناتیار سامان کی قیمتوں میں اضافہ ہوگا اور اس طرح

ہندوستان کے زرعی سامان کی غیر ملکی کھپت میں کمی آئے گی (قابل ذکر ہے کہ ٹھاکر داس کے اپنے کاروباری مفادات خام (ناتیار) کپاس کی برآمدکاری سے وابستہ تھے)، نیز یہ کہ ان حالات کے تحت افراط زر کو بڑھاوا ملے گا جس کے نتیجے میں سرمایہ کاری کے امکانات میں کمی واقع ہوگی۔ اسٹرلنگ 6 پنس کی شرح کا مطلب یہ بھی تھا کہ اس سے ایسے انگریز عملے اور تاجروں کو بھی زبردست مالی فائدہ ہوگا جو پنشن یا منافع وغیرہ کی رقم برطانیہ بھیجتے تھے۔ ان تمام باتوں پر ناگواری بلکہ ناراضگی ظاہر کرنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ان برسوں کے دوران خود ہندوستانی سرمایہ داری بھی استحکام حاصل کر رہی تھی اور خود کو ملک گیر پیمانے پر منظم بھی کر رہی تھی۔ 7/دسمبر 1923 کو برلا نے ٹھاکر داس کو لکھا تھا کہ "میں ایسوسی ایٹیڈ چیمبرس (انگریز سرمایہ داروں کی کل ہند تنظیم جو کہ 1920 میں قایم کی گئی تھی) کی سرگرمیوں پر گہری نظر رکھتا آیا ہوں اور میرا خیال یہ ہے کہ اگر ہندوستانیوں کی بھی اس طرح کی تنظیم قایم کرنے کے لیے فوری طور پر قدم نہ اٹھایا گیا تو انگریزوں کی اس تنظیم کو ہندوستانیوں کے تجارتی مفادات کے سلسلے میں فیصلہ کن پوزیشن حاصل ہو جائے گی۔" (ٹھاکر داس پیپرس، ایف، این، 42 III)۔ برلا اور ٹھاکر داس نے 1927 میں فیڈریشن آف انڈین چیمبرس آف کامرس (ہندوستانی ایوانہائے تجارت کا وفاق) کی بنیاد رکھی۔ اگرچہ ٹاٹا گروپ کا دارومدار حکومت پر اتنا زیادہ تھا کہ اس کے لیے اس وفاق میں شامل ہونا بہت مشکل تھا، اور بمبئی کے مل مالکان کی اکثریت بھی اس سے دور ہی رہی، مگر FICCI کو اپنے قیام کے چند برسوں کے اندر ہی ہندوستان کے کاروباری حلقے کے فیصلہ ساز گروہوں کے طبقاتی مفادات کے معتبر ترجمان کی حیثیت حاصل ہو گئی تھی۔

1920 کی دہائی میں عوام کے حالات زندگی میں کوئی بہتری واقع نہیں ہوئی بلکہ ان کی مشکلات میں اضافہ ہی ہوا۔ اگرچہ 1921 کی مردم شماری کے بعد ملک کی آبادی میں قابل لحاظ اضافہ ہو تا رہا مگر پنجاب اور کسی حد تک مدراس کے ماسوا، ملک کے باقی حصوں میں زرعی پیداوار ایک ہی سطح پر قایم رہی تھی۔ 39-1938 کی قیمتوں کے لحاظ سے جوفی ایکڑ اوسط پیداوار 21-1920 سے 25-1924 کی درمیانی مدت میں 26.5 روپے کی بقدر رہی تھی وہ 26-1925 سے 30-1929 کی درمیانی مدت میں گھٹ کر 25.7 رہ گئی تھی (حوالہ: امیہ باگچی، صفحہ 95)۔ 1920 کی دہائی میں بمبئی اور مدراس کے بڑے حصوں میں مال گزاری پر نظر ثانی ہونی تھی جو کہ 30 سالہ رعیت واڑی بندوبست کے تحت ضروری تھی۔ دوسری طرف محنت کش طبقے کو اجرتوں میں کٹوتی نیز سوتی کپڑے اور جوٹ کی ملوں نیز ریلوے کی ورکشاپوں کی منطقی تنظیم کی شکل میں آجرین کا وار برداشت کرنا پڑا۔ ہندوستانی کپڑوں کو ایک بار پھر بحال شدہ لنکاشائر اور جاپان سے مقابلہ کرنا پڑ رہا تھا (کپڑے کی جو درآمدکاری 22-1921 میں 1090 ملین گز کے بقدر تھی وہ 28-1927 میں بڑھ کر 1973

ملین گز تک پہونچ گئی تھی۔ باگچی، صفحہ 238)، اور جوٹ کی بر آمدات 1930 کی دہائی کی زبردست کساد بازاری سے کافی پہلے ہی ایک سطح پر رکی ہوئی تھی۔ ہندوستانی اور انگریز یعنی دونوں ہی طرح کے سرمایہ داروں نے اس گھاٹے کا بوجھ ورکروں کے کاندھے پر ڈالنے کی پوری کوشش کی۔ 1926 میں ایک سرکاری کمیٹی نے تو ریل ورکشاپوں میں 75,000 سے زائد ورکروں کی چھٹنی (تخفیف) کا منصوبہ بھی تیار کیا تھا۔

قبائلی اور کسان تحریکیں

عدم تعاون کی تحریک کی وجہ سے ملک کے بہت سے علاقوں میں نچلے طبقات میں جو جوش اور ولولہ پیدا ہو گیا تھا وہ باردولی تحریک واپس لے لیے جانے کے فوراً بعد ہی ٹھنڈا نہیں پڑ گیا تھا۔ بارہ بنکی میں ایکا تحریک مارچ 1922 میں یوپی کے افسران کی پریشانیوں کا موجب بنی ہوئی تھی اور اس طرح بنگال کے دو اضلاع، مدنا پور اور چٹاگانگ میں جولائی تک امن و قانون بحال نہیں کیا جاسکا تھا۔ البتہ عوامی سطح پر جاری شدت پسندی کا سب سے نمایاں ثبوت گوداوری کے شمال میں واقع ایک نیم قبائلی Rampa علاقے میں ملا۔ یہ وہ علاقہ تھا جہاں بے چینی کسی نہ کسی شکل میں ہمیشہ موجود رہتی تھی۔ اس علاقے میں اگست 1922 اور مئی 1924 کی درمیانی مدت کے دوران چھاپہ مار جنگ کے حالات رہے تھے۔ اس چھاپہ مار جنگ کی کمان الوری سیتارام راجو کے ہاتھ میں رہی تھی۔ اس شخص کو آندھرا میں تو داستانوی ہیرو جیسی حیثیت حاصل تھی مگر ملک کے باقی حصے اس عظیم شخصیت سے اب بھی انجان ہیں۔ جیسا کہ اگست 1924 کی سرکاری رپورٹوں سے بھی واضح طور پر پتہ چلتا ہے، اس تحریک کے بھی وہی پرانے اسباب تھے، یعنی مہاجنوں کے ذریعے استحصال؛ محکمۂ جنگلات کے نئے قوانین کے تحت انتقالی زراعت اور چراگاہوں پر پابندی وغیرہ۔ ایک ناپسندیدہ تحصیلدار نے قبائلیوں سے سڑک کی تعمیر بلا اجرت (بیگار) کرانے کی کوشش کر کے گویا بھس میں چنگاری لگادی تھی۔ تحریک شروع ہو گئی۔ مگر اس مرتبہ اس کی کمان کسی مقامی سردار کی بجائے ایک ایسے غیر علاقہ شخص کے ہاتھ میں تھی جو کہ جھاڑ پھونک اور تقدیر کا حال بتانے کا دعوا کرتے ہوئے 1915 سے ہی ان قبائلیوں میں گھومتا آرہا تھا۔ یہ شخص عدم تعاون کی تحریک سے کافی متاثر ہوا تھا، خاص طور پر گاؤں پنچایتیں شروع کرنے اور شراب نوشی کے خلاف تحریک کی ترغیب بھی ملی تھی۔ اس تحریک میں متنوع قسم کے عناصر اس طرح شامل تھے کہ Hobsbawn جیسا مورخ اسے قوم پرستی کی "ابتدائی بغاوت" کا نام دینے پر مجبور ہو گیا تھا۔ راجو کا دعوا یہ ہوتا تھا کہ اس کا جسم بلٹ پروف ہے اور بندوق کی گولیاں اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتیں۔ اسی طرح ایک باغیانہ اعلان میں یہ کہا گیا تھا کہ کالکی اوتار، جلد ہی سامنے آنے والا ہے۔ لیکن بغاوت کے دوران مقامی افسروں کے

ساتھ ملاقاتوں میں سیتارام راجو "مسٹر گاندھی کا ذکر بڑے احترام سے کرتا تھا" مگر اس کا یہ بھی خیال تھا کہ "تشدد بھی ضروری ہے"۔ اسے اس بات پر افسوس تھا کہ "وہ یورپیوں کو اس لیے گولی نہیں مار سکا تھا کہ وہ ہمیشہ ہندوستانیوں سے گھرے رہتے تھے اور وہ ہندوستانیوں کو ہرگز نہیں مارنا چاہتا تھا"۔ اور 24/ ستمبر 1922 کو باغیوں نے دلار پلی میں گھات لگا کر جو حملہ کیا تھا، اس میں بھی باغیوں نے انگریز افسروں سے آگے چلنے والی ہندوستانی پارٹی کو تو گزرنے دیا تھا اور پھر دو انگریز افسروں کو مار گرایا تھا۔ انگریزوں نے چھاپہ مار طرز جنگ میں راجو کی مہارت اور چابکدستی کا اعتراف کیا تھا۔ وہ پولس تھانوں پر کامیاب چھاپے مارتا اور ہاتھ لگنے والے اسلحے سے اپنے لوگوں کو مسلح کرتا تھا۔ اس کا تقریباً 100 نفوس پر مشتمل جتھا اس علاقے میں اس طرح منڈلاتا رہتا تھا جس طرح کہ پانی میں مچھلی! تقریباً 2500 مربع میل رقبے میں پھیلے ہوئے پورے قبائلی علاقے میں اسے اکثریت کی ہمدردی حاصل تھی۔" اس بغاوت کو دبانے میں مدراس حکومت پر 15 لاکھ روپے کا اضافی بوجھ پڑا تھا اور اسے اس کے لیے مالابار اسپیشل پولس نیز آسام رائفلز کی مدد بھی حاصل کرنی پڑی تھی۔ راجو 6/ مئی 1924 کو پکڑ لیا گیا تھا اور مبینہ طور پر "بھاگنے کی کوشش کرتے ہوئے" مارا گیا تھا۔ گویا کہ پولس نے راجو کے سلسلے میں بھی اپنا گھسا پٹا فارمولا اپنایا تھا۔ بہرحال ستمبر 1924 میں یہ تحریک پوری طرح کچل دی گئی تھی۔

راجستھان 1920 کی پوری دہائی کے دوران کسانوں کی جاگیر دار مخالف تحریکوں کا مرکز بنا رہا تھا۔ میواڑ پولس نے بجیلی تحریک کو کچل دینے کے لیے مئی 1922 میں دو گاؤں جلا کر راکھ کر دیئے تھے۔ یہ تحریک موتی لال تیجاوت نے شروع کی تھی۔ 1927 سے بجولیا میں بھی ایک بار پھر زبردست سرگرمی شروع ہو گئی تھی جہاں دیجے سنگھ پاٹھک، مانک لال ورما اور ہری بھاؤ اپادھیائے کی قیادت میں کسانوں نے تازہ ٹیکسوں اور بیگار کے خلاف جنگ چھیڑ رکھی تھی۔ مئی 1925 میں ریاست الور کے ایک مقام نیمو چنا میں ان کسانوں کا قتل عام کیا گیا جو مال گزاری میں 50 فی صد اضافے کے خلاف احتجاج کر رہے تھے۔ پولس کی فائرنگ میں 156 لوگ ہلاک اور 600 سے زائد زخمی ہوئے تھے۔ کانگریس نے کسی بھی دیسی ریاست کے خلاف کسی بھی طرح کی تحریک میں باضابطہ حصہ لینے سے انکار کر دیا تھا (کانگریس کی یہ پالیسی 1938 میں ہری پورا میں تبدیل ہوئی تھی) اور شہری علاقوں کے متوسط طبقوں پر مشتمل پرجا پریشدیں قائم ہو رہی تھیں (پہلی پرجا پریشد 1917 میں بڑودہ میں اور پھر اس کے بعد 1921 میں کاٹھیاواڑ میں قائم ہوئی تھی؛ گجرات سے ان دونوں علاقوں کی قربت قابل ذکر ہے)۔ اسٹیٹس سبجیکٹ کانفرنس (بعد میں جس کا نام پیوپلز کانفرنس ہو گیا تھا۔) 1923 سے برابر اپنے سالانہ جلسے کرتی آ رہی تھی مگر یہ کانفرنس زیادہ زور نہیں پکڑ سکی تھی۔ اس میں شک نہیں کہ میواڑ جیسی دیسی ریاستوں میں کسانوں کی انقلاب پسندی کو

شہری علاقوں کی قوم پرستی پر تقدم زمانی حاصل ہے۔

کانگریس چونکہ بار بار اپنے مطالبات کو واپس لیتی رہی تھی، اس لیے کسان طبقے کے کچھ سرگرم کارکن کانگریس سے مایوس ہو کر، 1920 کی دہائی کے وسط سے دوسرے سیاسی نظریات کی طرف رجوع کرنے لگے تھے۔ 1922 میں سوامی ودیانند نے زمینداری کے خاتمے کا مطالبہ کیا اور بابا رام چندر نے نومبر 1925 میں لینن کا ذکر "کسانوں کے محبوب رہنما...... کے طور پر کیا تھا اور یہ بھی کہ کسان آج بھی روس کے علاوہ ہر جگہ غلام ہیں۔" (حوالہ پرتاپ 23/نومبر 1925) کانگریسی، خواہ سوراجی ہوں یا تبدیلی مخالف، زمینداروں نیز متوسط درجے کے جوت داروں کے درمیان مضبوط روابط کی وجہ سے ہی وہ کسانوں کی لگان میں کمی اور فصل کی منصفانہ تقسیم کے ذریعے بٹائی داری (سیجر داری) کی کوششوں سے لاتعلق ہی رہے تھے۔ کسانوں کی یہ کوشش بنگال، بہار اور یوپی میں زیادہ شدت اختیار کیے ہوئے تھی۔ اور بنگال میں جہاں کہ بٹائی داری (برگ داری) 1920 کی دہائی میں بڑی تیزی سے پھیل رہی تھی، کانگریس کی یہ لاتعلقی بہت ہی واضح اور کافی حد تک تباہ کن صورت اختیار کر چکی تھی۔ اس صوبے میں سوراجی کانگریسی برگ دار کسانوں کو لگان دار کا درجہ دینے کی تجویز کے سخت خلاف تھے۔ ان کانگریسیوں نے میمن سنگھ، ڈھاکہ، پابنا، کھلنا اور ندیا جیسے اضلاع میں 1920 کی دہائی کے وسط میں نام سودر اور مسلم برگ داروں کی تحریکوں کے لیے بھی کسی طرح کی ہمدردی نہیں دکھائی۔ یوپی کانگریس نے کسانوں کے سلسلے میں کسی قدر موافقانہ رویہ اپنایا تھا اور 1924 میں یوپی کسان سنگھ کی بنیاد بھی رکھی تھی تاکہ اس وقت لگان داری سے متعلق ایک بل میں زمینداروں کے حق میں رکھی گئی ایک شق میں ترمیم کرائی جا سکے۔ یہ بل اس وقت تک زیر بحث ہی تھا۔ تاہم یہ بھی وضاحت کر دی گئی تھی کہ یہ کسان سنگھ زمینداروں کے خلاف ایک لفظ بھی استعمال نہیں کرے گی بلکہ اس حکومت کو نشانہ بنائے گی جس کے ہاتھوں زمیندار آنکھیں بند کر کے کھیل رہے ہیں" (اے آئی سی سی، ایف این، 32/1924)۔

کسانوں کی جس واحد شکایت کے سلسلے میں کانگریسی لیڈران پوری طرح متفق تھے وہ رعیت واڑی علاقوں میں لگان میں اضافے سے تعلق رکھتی تھی۔ مال گزاری میں اس اضافے کی کسی حد تک کامیاب مخالفت 24-1923 میں تنجاور میں کی گئی۔ ساحلی آندھرا میں این۔ جی رنگا نے 1923 میں گنٹور میں رعیت واڑی ایسوسی ایشن کی بنیاد رکھ کر کسانوں کے اعلا طبقات میں کام شروع کر دیا تھا۔ کرشنا۔ گوداوری ڈیلٹا کے علاقے میں انگریزوں نے 1927 میں مال گزاری میں 18¾٪ (18.75) فی صد اضافہ کرنے کی کوشش کی جس کے خلاف ساحلی آندھرا میں زور دار کسان تحریک شروع ہوئی جس کی کمان بعد میں مشرقی گوداوری میں دنجی ستیہ نارائن اور مغربی گوداوری میں ڈانڈو نارائن راجو جیسے مقامی کانگریسی لیڈروں نے سنبھال لی تھی جبکہ 1928 سے اس طرح کی دوسری تمام

کسان تحریکوں کی قیادت ٹی پرکاشم، اور کونڈا او نکلسپیا جیسے مشہور قوم پرست لیڈروں نے کی جنھیں ولبھ پٹیل کی پوری رہنمائی حاصل تھی۔

ذات پات کی تحریکیں

سابقہ ادوار کی طرح ہی، اس عرصہ میں بھی ہندوستانی معاشرے کے تضادات ذات پات کی تنظیموں اور تحریکوں کی شکل میں ظاہر ہوتے رہے۔ یہ تحریکیں اور تنظیمیں اگرچہ علاحدگی پسندانہ اور نفاق انگیز عناصر کی حامل اور قدامت پرستانہ بھی ہوتی تھیں مگر ان کا انقلاب پسندانہ پہلو بھی اکثر نمایاں ہوتا رہتا تھا۔ مدراس کی براہمن مخالف جسٹس پارٹی نمایاں طور پر حکومت نواز تھی اور اس صوبے میں دو عملی طرز حکومت کو کامیاب بنا۔ نے میں پیش پیش رہی تھی۔ سرکاری افسروں اور منتخبہ وزیروں کے درمیان بھرپور تعاون کی ایک دوسری مثال پنجاب میں ملتی ہے جہاں فضل حسین کی یونینسٹ پارٹی ایک بہت ہی طاقت ور (زمینداروں اور متمول کسانوں پر مشتمل) زرعی لابی بنانے میں کامیاب ہو گئی تھی۔ یہ لابی غالب اثر رکھنے والے شہری علاقوں کے قوم پرستوں کے مقابلے پر کھڑی کی گئی تھی اور اس میں جاٹ اور مسلمان دونوں ہی شامل تھے۔ بھاسکر راؤ جادو کی غیر براہمن پارٹی نے اسی طرح کا وفادارانہ رول مہاراشٹر میں ادا کرنے کی کوشش کی۔ یہ پارٹی کانگریس کی کٹر مخالف تھی اور اس کا الزام یہ تھا کہ کانگریس دراصل براہمن عزائم کا ہی ایک مکھوٹا ہے۔

تاہم اگر جسٹس پارٹی نیز جادو جیسے غیر براہمن لیڈروں نے عملاً یہ ظاہر کر دیا تھا کہ وہ نچلے طبقات کے لیے سرکاری نوکریوں میں تحفظ اور اونچی ذات والوں کی نقل کرنے کے مقصد سے سنسکرتیانے کی کوشش کر رہے تھے تو دوسری طرف 1920 کی ہی دہائی میں اس سے بھی کہیں زیادہ انقلاب پسندانہ اور باغیانہ نوعیت کی تحریکیں بھی جنم لے رہی تھیں۔

حکومت بہار کی مئی 1924 کی ایک رپورٹ میں کہا گیا تھا کہ "پٹنہ، مونگیر، دربھنگہ اور مظفرپور کے گوال یا یادو لوگ اپنی ذات کے سماجی درجے میں بہتری کے لیے احتجاج کر رہے ہیں" اور پاری لیمو لوگ اپنے زمینداروں کی خدمت گزاری، خاص طور پر میلا ڈھونے جیسے کاموں سے نجات پانے کے لیے جنیو کے استعمال کی تجویز پر غور کر رہے ہیں"۔ یہاں یہ ذکر بھی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اگلی دہائی کے بہار کے بلکہ پورے ہندوستان کے سب سے اہم کسان لیڈر، سوامی سہج آنند سرسوتی نے بھومیار براہمن سبھا اور ضلع پٹنہ کے ایک مقام بیٹیہ میں آشرم قائم کر کے اپنا کام 1920 کی ہی دہائی میں شروع کر دیا تھا۔

مہاراشٹر کی ستیہ شودھک تحریک میں بعض انقلابی عناصر کی موجودگی کا ذکر پہلے ہی کیا جا چکا ہے۔ ستیہ شودھک کے دیہی کارکنوں نے 21-1919 کے دوران ضلع ستارا میں زمینداروں اور

مہاجنوں کے خلاف تحریک کی قیادت کی تھی۔ اس تحریک کا دائرہ اثر 30 گاؤں تک پھیلا ہوا تھا۔ کچھ تشدد کے واقعات بھی ہوئے تھے۔ اسی طرح پونا سے کیشو راؤ جیدھے اور دنکر راؤ جاولکر اس غیر براہمن تحریک کی قیادت کر رہے تھے جو کہ جتنی انگریزوں کے خلاف تھی اتنی ہی براہمنوں کے غلبے والی اس کانگریس کے بھی خلاف تھی جس کی کمان تلک حامیوں کے ہاتھ میں تھی۔ اگلی دہائی کے دوران مہاراشٹر کانگریس کسی نہ کسی طرح اس تحریک کے ساتھ رابطہ قائم کرنے اور بالآخر اسے جذب کر لینے میں کامیاب ہو گئی تھی اور یہی ستارا ضلع 1942 میں بمبئی میں قوم پرستی کا سب سے مضبوط قلعہ ثابت ہوا تھا۔

لیکن جہاں ایک طرف جوت دار (زمیندار) مراٹھوں کو قوم پرستانہ تحریک میں جذب کر لیا گیا تھا، وہیں اچھوت مہاروں نے ڈاکٹر امبیڈکر کی قیادت میں 1920 کی دہائی سے اپنی علاحدہ تحریک شروع کر رکھی تھی (ڈاکٹر امبیڈکر پہلے گریجویٹ مہار تھے)۔ ان مہاروں کے مطالبات میں دوسری باتوں کے علاوہ زیادہ زور جداگانہ نمائندگی، تالابوں کے استعمال اور مندروں میں داخلے کی اجازت اور مہار واتن (گاؤں کے کھیا کی روایتی خدمت گزاری) کے خاتمے پر تھا۔ 1927 میں بہار پولیٹیکل کانفرنس کے پہلے سال ہی امبیڈکر کے کچھ پیروکاروں نے ہندو مت سے اپنی کنارہ کشی کی علامت کے طور پر منوسمرتی کو جلانا شروع کر دیا تھا۔

تامل ناڈو میں کانگریسی قیادت مہاراشٹر کی قیادت کی بہ نسبت کم لوچ دار ثابت ہوئی اور ای۔ وی راماسوای پیریار نے، جو کہ عدم تعاون کی تحریک میں کافی سرگرم رہے تھے، اعلا طبقاتی جسٹس پارٹی کے متبادل کے طور پر ایک عوامی اور انقلابی تحریک شروع کرنے کے لیے 1920 کے وسط میں کانگریس سے اپنا ناطہ توڑ لیا تھا۔ شائستہ تحمل زبان میں اپنے جریدے کُڈی اراسو (1924) اور 1925 میں قائم کی گئی 'عزت نفس تحریک' کی جو تحریک اس اپیل سے شروع ہوئی تھی کہ شادی بیاہ اور دوسری رسوم براہمن پجاریوں کے بغیر ہی انجام دی جائیں، وہ آگے چل کر مندروں میں زبردستی داخلے، منوسمرتی کو نذر آتش کرنے اور بعض اوقات توالحاد کی شکل بھی اختیار کر جاتی تھی۔

اسی طرح کیرالہ میں بھی، بہت ہی چھوٹے پیمانے پر اور ڈھیلے انداز میں شروع کیا گیا ویکم ستیہ گرہ ایزہاوا لیڈر شری نارائنا گرو کو مطمئن نہیں کر سکا تھا، وہ یہ چاہتے تھے کہ ستیہ گرہی "تمام رکاوٹوں کو پار کر جائیں" اور ممنوعہ سڑکوں اور راستوں کو استعمال کرنے کے ساتھ ساتھ مندروں میں بھی داخل ہوں۔ ٹی۔ کے مادھون نے نچلی ذاتوں کے سنسکرتیانے کی جو تحریک شروع کی ہوئی تھی اس کی ایس این ڈی پی یوگم کی گاندھیائی قیادت کے۔ ایپن اور سی کیسون جیسے انقلابی ایزہاوا لیڈروں نے کڑی نکتہ چینی کی۔ یہ دونوں لیڈر مندروں میں داخلے کے معاملے کو خاص اہمیت نہیں دیتے تھے۔ کیونکہ یہ دونوں خدا کے منکر ہو گئے تھے۔

یہ ایک دلچسپ بات ہے کہ ان تمام علاقوں میں تشدد پسند نچلی ذاتوں کی تحریکوں نے اشتراکی رجحانات کے سر ابھارنے میں اہم رول ادا کیا۔ سیج آنند پہلے تو کانگریس کے شوشلسٹ گروپ میں شامل ہوئے اور پھر کیمونسٹوں کا ساتھ پکڑ لیا، جب کہ نانا پاٹل، جو کہ 21-1919 میں ستارا کی ستیہ شودھک تحریک میں حصہ لے چکے تھے اور جہاں وہ 1942 کی متوازی حکومت کے سربراہ بھی رہ چکے تھے، بعد میں مہاراشٹر کے سب سے نمایاں کیمونسٹ کسان لیڈر کے طور پر مشہور ہوئے۔ تامل ناڈو کے ابتدائی دور کے کیمونسٹوں مثلاً سنگر ویلو اور پی۔ جیوانندن وغیرہ نے 1930 کی دہائی میں کچھ عرصہ تک پیریار کے ساتھ تعاون کیا جبکہ ایپّن اور کیسون نے کیرالہ میں ایزہاوا برادری کے بہت سے لوگوں کو کیمونسٹ پارٹی کے راستے پر ڈال دیا مگر دونوں خود کیمونسٹ پارٹی میں کبھی شامل نہیں ہوئے۔

مزدور طبقہ

مزدور تحریک کی تاریخ میں 1922 سے 1927 کا زمانہ بادی النظر میں ہی انحطاط کا زمانہ معلوم ہوتا ہے۔ 1931 کے رایل لیبر کمیشن کے مطابق جہاں 1921 میں 376 ہڑتالیں ہوئی تھیں، 1924 سے 1927 تک سال میں محض 130 ہڑتالیں رکارڈ کی گئیں تھیں۔ اگرچہ آل انڈیا ٹریڈ یونین کانگریس (AITUC) کی رکنیت میں اضافہ ہوا اور جنوری 1925 میں الحاق شدہ یونینوں کی تعداد 183 تک پہونچ گئی تھی مگر مزدور تحریک کے لیڈر زیادہ تر اعتدال پسندی پر ہی گامزن رہے؛ وہ اس طرح کہ سیاسی مزاج کے اعتبار سے وہ یا تو لبرل رہے یا کانگریسی رہے؛ اور اس کے سالانہ اجلاس میں وہ جوش و خروش اور اتنی زیادہ شمولیت بھی نہیں رہی جیسی کہ 1921 میں جھریا کانفرنس میں دیکھنے میں آئی تھی۔ تاہم اگرچہ اس مدت میں اتنی زیادہ ہڑتالیں نہیں ہوئیں مگر یہ واقعہ ہے کہ جو ہڑتالیں ہوئیں وہ زیادہ دیر تک چلیں اور آجرین کے زیادہ جارحانہ رویہ کی وجہ سے نسبتاً زیادہ تلخی کا باعث بھی ہوتی تھیں۔ چنانچہ جہاں 1921 میں 70 لاکھ کام دنوں کا نقصان ہوا تھا، 1924 کے بعد ہر سال اس نقصان میں اضافہ ہوتا گیا تھا اور 1927 تو ایک نئی مزدور ہلچل کا نقطہ آغاز ثابت ہوا، کیونکہ اس سال 202 لاکھ کام دنوں کا نقصان ہوا تھا اور بعض مرکزوں میں نسبتاً زیادہ انقلابی اور کیمونسٹ قیادت کو ابھرنے کا موقع ملا تھا۔ 1926 میں پہلی بار ایک ایکٹ کے ذریعے ٹریڈ یونینوں کو کسی قدر قانونی تحفظ حاصل ہوا۔ یہ دوسری بات ہے کہ یہ ایکٹ بھی مزدور مفادات مخالف شقوں سے بھرا ہوا تھا۔ یہاں تک کہ غیر رجسٹر شدہ یونینوں کے ذریعے رقم (فنڈ) اکٹھا کرنا خلاف قانون قرار دیا گیا تھا، یونینوں کی مجلس عاملہ میں باہر کے لوگوں کی موجودگی پچاس فی صد تک محدود کر دی گئی تھی اور یونین فنڈ کے سماجی اور سیاسی استعمال پر پابندی لگادی گئی تھی۔ (یہ پابندیاں خود برطانیہ میں رائج طریقہ کار کے قطعی خلاف تھیں۔ وہاں ٹریڈ یونینیں لیبر پارٹی کے لیے مالی مدد

کا سب سے اہم وسیلہ تھیں)۔

عدم تعاون تحریک کے آخری دنوں میں درشانند اور وشوانند نے ایک زوردار ایسٹ انڈین ریلوے اسٹرائک کی قیادت کی تھی جو فروری سے اپریل 1922 تک جاری رہی تھی۔ قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ کسی بھی کانگریسی لیڈر نے حکومت پر دباؤ ڈالنے کی غرض سے اس تحریک کے امکانات کو بروئے کار لانے کے بارے میں شاید سوچنے کی بھی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ جمشید پور لیبر ایسوسی ایشن، جو کہ 1920 کی ہڑتال کے دوران بنگال کے ایس۔این ہلدر جیسے لیڈروں نے قایم کی تھی، مزدور طاقت کو ابھرنے دینے کی بجائے اسے اور دبانے کی کوشش کر رہی تھی۔ حال کے ایک تفصیلی تجزیے میں یہ دکھلایا گیا ہے کہ ستمبر 1922 کی ٹاٹا ہڑتال مزدور طبقے کے اچانک دباؤ پر شروع ہوئی تھی اور یونین نے خود کو تسلیم کرانے کے لیے اس موقع سے فائدہ اٹھایا تھا اور اس سلسلے میں مزدوروں کے مطالبات کو کم و بیش نظر انداز کر دیا تھا۔ جمشید پور لیبر ایسوسی ایشن کانگریس کے ساتھ اپنے بہترین روابط کی وجہ سے سی آر داس اور سی ایف آنڈریوز کی قیادت میں ایک مصالحتی بورڈ کی تشکیل کے لیے ٹاٹا پر دباؤ ڈالنے میں کامیاب ہو گئی تھی اور فولاد کے تحفظ کے سوال پر 1924 میں اسمبلی میں بحث کے دوران سوراجی لیڈروں کی تائید کی وجہ سے ہی ایسا ہو سکا تھا۔ یونین کو اگست 1925 میں، جب کہ سی ایف اندریوز اس کے صدر بن گئے تھے، تسلیم کر لیا گیا تھا۔ گاندھی کے دورۂ جمشید پور کے موقع پر انتظامیہ نے ان کا شاندار استقبال کیا تھا جس کے رد عمل میں انھوں نے اپنی تقریر میں سرمائے اور محنت کے درمیان بہتر تال میل کی ضرورت پر زور دیا تھا۔ انتظامیہ نے یونین کے واجبات وغیرہ تنخواہوں سے منہا کرنے کی پیش کش کی تھی اور اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں کہ 1928 کے آتے آتے کمپنی کے ورکرز آندریوز کی قیادت میں جمشید پور لیبر ایسوسی ایشن کو کمپنی کی یونین کہنے لگے تھے۔ احمد آباد میں 64 میں سے 56 کپڑا مل اپریل 1923 میں ایک زبردست ہڑتال کے نتیجے میں بند ہو گئے تھے۔ یہ ہڑتال اجرتوں میں 20 فیصد کٹوتی کے خلاف کی گئی تھی۔ قابلِ ذکر بات تو یہ ہے کہ یہ ہڑتال ایسے وقت میں کی گئی تھی جب گاندھی جیل میں تھے؛ کیونکہ گاندھی نے ہی آگے چل کر 1925 میں احمد آباد کے مل ورکروں سے یہ اپیل کی تھی کہ "وہ مندے کے زمانے میں اپنے آجرین کو پریشان نہ کریں۔ ایماندار ملازم اپنے آقاؤں کی خدمت اُجرت کے بغیر بھی کرتے ہیں۔"

بہر حال اس بات کے آثار بار بار ظاہر ہو رہے تھے کہ مزدور تحریک ہر طرح کے دباؤ اور بندش کے باوجود بھی زور پکڑتی جا رہی تھی۔ اس سلسلے میں مدراس شہر کو پہلے ہی کی طرح اہم مرکز کی حیثیت حاصل رہی؛ 23-1922 کے دوران بکنگھم کرناٹک ملوں میں مزید چار بار ہڑتال ہوئی اور پہلا یوم مئی 1923 میں مدراس کے ہی ساحل پر منایا گیا تھا جس کے سلسلے میں سنگر اویلو نے ایک

بڑی ریلی کا اہتمام کیا تھا۔ یونین کے ایک لیڈر کی برطرفی کے رد عمل میں نارتھ ویسٹرن ریلوے میں اپریل تا جون 1925 جو زبردست ہڑتال ہوئی تھی وہ اس لیے یادگار حیثیت اختیار کر گئی تھی کہ اس سلسلے میں لاہور میں جو بھاری جلوس نکالا گیا تھا اس کے سرخ جھنڈے ورکروں نے اپنے خون سے رنگے تھے۔ بہر حال سب سے بڑی ہڑتال بمبئی میں ہی پہلے تو جنوری تا مارچ 1924 میں اور پھر ستمبر۔ دسمبر 1925 میں ہوئی تھی۔ 1924 کی ہڑتال میں 150,000 ورکروں نے حصہ لیا تھا۔ یہ ہڑتال بونس (جو کہ پچھلے چار برسوں سے دیا جا رہا تھا) کی عدم ادائیگی کے خلاف ہوئی تھی۔ حکومت کی طرف سے انکوائری کمیٹی قائم کیے جانے پر Baptista اور این ایم جوشی نے ورکروں سے ہڑتال واپس لے لینے کی اپیل کی مگر پولس کی زیادتیوں اور فائرنگ کے رد عمل میں ورکر بھی اڑے رہے اور انھیں قوم پرست لیڈروں کی طرف سے کوئی مدد حاصل نہیں ہوئی، یہاں تک کہ فاقہ کشی نے انھیں ہڑتال واپس لے لینے پر مجبور کر دیا تھا۔ بعد میں حکومت کی قائم کردہ انکوائری کمیٹی نے بھی مزدوروں کے خلاف ہی اپنا فیصلہ دیا اور بونس کو منافع سے مشروط قرار دیا تھا۔ اگلے سال کپڑا صنعت کے مبینہ بحران کی بنیاد پر اجرتوں میں 11.5 فی صد کٹوتی کر دی گئی جس پر ستمبر میں پھر زبردست ہڑتال ہوئی۔ بمبئی کے مل مالکان کا یہ کہنا تھا کہ جب تک حکومت 3.5 فی صد کے بقدر عائد کردہ آب کاری محصول کو واپس لے کر ان کی کپڑا صنعت کو رعایت نہیں دے گی، اجرتوں میں یہ کٹوتی بھی واپس نہیں لی جائے گی۔ واضح رہے کہ یہ آب کاری محصول لنکاشائر کی کپڑا صنعت کی تقویت کے لیے 1894 میں لگایا گیا تھا اور قوم پرست حلقہ اسی وقت سے اسے ناپسند کرتا آ رہا تھا۔ چونکہ ہڑتال ٹوٹنے کے کوئی آثار نہیں تھے، حکومت نے یکم دسمبر 1925 کو کپاس آب کاری محصول کو معطل کر دیا جس پر مل مالکان نے بھی اجرتوں میں مذکورہ کٹوتی کو واپس لے لیا۔ اس طرح بمبئی کے پرولتاری قوم پرستوں کے ایک 30 سال پرانے مطالبے کو منوانے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ واضح رہے کہ ستمبر 1925 میں بھی سوراجی لیڈروں نے اس محصول کو معطل کرانے کی غرض سے اسمبلی میں ایک قرارداد پیش کی تھی جو منظور کر لی گئی تھی مگر اسے وائسرائے نے ویٹو کر دیا تھا۔ 1928 کی بڑی ہڑتال سے پہلے بھی بمبئی کے کپڑا ملوں کے ورکر اپنی شدت پسندی اور تنظیمی طاقت کی بدولت اپنی اجرتوں میں قابل لحاظ اضافہ کرانے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ اس طرح کلکتہ کی انگریز ملکیت والی ملوں کے مقابلے میں بمبئی کے مل ورکروں کی اجرت زیادہ ہو گئی تھی: جو اوسط ماہانہ اجرتیں 1919 میں بمبئی اور کلکتہ میں بالترتیب 24.75 روپے اور 16.40 روپے تھیں وہ 1927 میں بالترتیب 34.56 روپے اور 19.60 روپے تھیں (حوالہ باہگی صفحہ 126)۔ جہاں تسلیم شدہ بمبئی ٹکسٹائل لیبر یونین (نئے ایکٹ کے تحت 1926 میں رجسٹر شدہ پہلی یونین) کی کمان این ایم، جوشی کے ہاتھ میں تھی، وہیں بمبئی میں 1923 سے ہی عوامی سطح کی ایک آزاد تحریک بھی شروع ہو چکی تھی۔ یہ تحریک

گرنی کامگار مہامنڈل کے جھنڈے تلے شروع ہوئی تھی۔ یہ مہامنڈل اے۔ اے۔ الوے اور جی۔ آر کسلے نے شروع کیا تھا جو خود بھی مل ورکر تھے۔ اس رجحان کو بعد میں، 1928 میں کیمونسٹوں نے اپنا لیا تھا اور اسے گرنی کامگار (لال باوٹا) یونین کا نام دیدیا جو بہت مشہور یونین ثابت ہوئی۔

کمیونسٹوں کا ظہور

انگریز افسروں اور بعد کے کچھ مورخوں کے اس طرح کے تمام تر الزامات کے باوجود کہ یہ ساری تحریک ماسکو سے منظم کی جاری غیر ملکی سازش کے سوا کچھ اور نہیں تھی، واقعہ یہ ہے کہ ہندوستانی کیمونزم (اشتراکیت) کی جڑیں خود ہندوستانی قومی تحریک میں ہی پیوست تھیں۔ عدم تعاون کی تحریک رہی ہو یا خلافت کی، محنت کشوں کی تحریک رہی ہو یا کسانوں کی، ان سب کا مقصد سیاسی اور معاشی آزادی کے لیے راستہ تلاش کرنا تھا۔ اس تحریک کے بانی مشہور یوگانتری انقلابی نارین بھٹا چارجی (عرف مانا بیر ندرناتھ رائے) تھے: 1919 میں میکسیکو میں ان کا رابطہ بالشویک تحریک کے علمبردار میخائل بوردون سے قائم ہوا تھا، جہاں انھوں نے کیونسٹ پارٹی کے قیام میں مدد کی تھی اور کیونسٹ انٹرنیشنل کی دوسری کانگریس میں شرکت کی غرض سے 1920 کے موسم گرما میں روس گئے تھے۔ روس میں ان کا سابقہ نو آبادیاتی دنیا میں کیونسٹوں کی حکمت عملی کے تعلق سے لینن کے ساتھ ایک اہم تنازعے سے پڑا۔ لینن کا زور اس بات پر تھا کہ نو آبادیاتی یا نیم نو آبادیاتی ملکوں میں جاری تحریکوں کی، جن پر کہ زیادہ تر بورژوائی حلقوں کا غلبہ تھا، وسیع پیانے پر مدد کرنے کی ضرورت ہے، جبکہ ایم۔ این۔ رائے کا یہ کہنا تھا کہ ہندوستانی عوام گاندھی جیسے بورژوائی لیڈروں سے پہلے ہی اکتا چکے ہیں اور بورژوائی قوم پرستوں کی تحریک سے آزاد ہو کر انقلاب کی طرف پیش قدمی کرنا چاہتے ہیں۔ "قومی بورژوائی" اور بالعموم قوم پرست قومی دھارے کے تئیں رویہ ایک ایسا موضوع تھا جو ہندوستان میں اور اس سے باہر بھی کیونسٹوں کے لیے اختلاف رائے کا باعث رہا۔ یہاں تک کہ حصول آزادی کے بعد بھی یہ اختلاف رائے برقرار رہا۔

اکتوبر 1920 میں ایم۔ این۔ رائے: ابانی مکھرجی (جو کہ خود بھی ایک سابق دہشت پسند تھے اور رائے سے بات بات پر لڑ پڑتے تھے۔)، اور کچھ مہاجروں (خصوصاً خلافت تحریک کے وہ جوشیلے لیڈر جو 1920 میں ہجرت میں شامل ہوئے تھے اور افغانستان کے راستے روس چلے گئے تھے) محمد علی اور محمد شفیق نے مل کر تاشقند میں کیونسٹ پارٹی آف انڈیا قایم کی اور ساتھ ہی ایک سیاسی و قومی اسکول بھی شروع کیا۔ جب افغانستان کے راستے ہندوستان میں گھسنے کی امیدیں 1921 کے شروع میں بالکل ہی ختم ہو گئیں، کچھ نئے ہندوستانی ماسکو کی کیونسٹ یونیورسٹی میں داخل ہو گئے۔ رائے نے بھی اپنا مرکز 1922 میں برلن میں منتقل کر دیا اور یہاں سے پندرہ روزہ جریدہ (Vanguard

(of Indian Independence نکالنا اور ابانی مکھرجی کے اشتراک سے India In Transition شائع کرنا شروع کیا، جسے کہ ہندوستانی معاشرے اور معیشت کے مارکسی تجزیے کے لحاظ سے بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ اس دوران دوسرے ہندوستانی گروپ بھی مارکسزم کی طرف راغب ہو رہے تھے، ان میں ویریندر ناتھ چٹوپادھیائے، بھوپندر ناتھ دت اور برکت اللہ کے جھنڈے تلے کام کرنے والا برلن گروپ قابل ذکر ہے۔ برکت اللہ نے 1921 میں روس کی مدد حاصل کرنے کی کوشش کی تھی جسے رائے نے خالصۃً گروہی بنیاد پر کامیاب نہیں ہونے دیا تھا، لیکن انھوں نے اگلے سال برلن میں انڈیا انڈیپنڈنس پارٹی قائم کرلی تھی۔ دریں اثناء 1920 کی دہائی کے وسط تک غدر پارٹی کی جلاوطن حکومت کا ایک اہم حصہ بھی کیونسٹ ہو چکا تھا جن میں رتن سنگھ، سنتوکھ سنگھ اور تیجا سنگھ سوتنتر کے نام قابل ذکر ہیں۔

1922 کے آخر میں رائے نے نالنی گپتا (جو کہ ایک سابق دہشت پسند تھے) اور شوکت عثمانی (جو کہ ایک مہاجر تھے) جیسے ایلچیوں کے توسط سے ان کیونسٹ گروپوں کے ساتھ رابطے قایم کرلیے تھے جو عدم تعاون اور خلافت تحریک کے زائیدہ اور اپنی ابتدائی حالت میں تھے۔ اس میں بمبئی کے ایس۔ اے۔ ڈانگے۔ کلکتہ کے مظفر احمد، مدراس کے سنگراویلو اور لاہور کے غلام حسین کے نام قابل ذکر ہیں۔ اباَنی مکھرجی نے بھی حریف چٹوپادھیائے گروپ کی طرف سے اس طرح کی مگر کسی قدر ناکام کوشش کی تھی۔ مارکسی قوم پرست اخبارات، مثلاً کلکتہ میں آتم شکتی اور دھوم کیتو اور کھور میں لویگ نے لینن اور روس کے سلسلے میں ستائشی مضامین شائع کرنے شروع کردیئے تھے اور بعض اوقات Vanguard سے پیرے کے پیرے بھی نقل کیے جاتے تھے جب کہ ڈانگے نے اگست 1922 سے بمبئی سے ہفت روزہ جریدہ شوسلسٹ نکالنا شروع کردیا تھا، جسے ہندوستان میں شائع ہونے والا پہلا کیونسٹ جریدہ کہا جاسکتا ہے۔ رائے نے ڈانگے کے نام اپنے 2/ نومبر 1922 کے ایک مکتوب میں "ایک دوہری تنظیم، یعنی ایک قانونی اور دوسری غیر قانونی تنظیم" کا خاکہ پیش کیا تھا۔ سوشلسٹ کے 16 ستمبر کے شمارے میں اسی طرح کی تجویز پہلے ہی پیش کی جاچکی تھی۔ اس تجویز میں "سوشلسٹ لیبر پارٹی آف انڈین نیشنل کانگریس کے نام سے ایک نئی تنظیم قایم کرنے کی بات کہی گئی تھی۔ دوسری طرف سنگراویلو نے مئی 1923 میں لیبر کسان پ۔ ٹی۔ قایم کرنے کا اعلان کیا تھا۔ سنگراویلو نے کانگریس کے گیا اجلاس (دسمبر 1922) میں کیونسٹوں کی عظیم عالمی تنظیم، کے نام پر کھلم کھلا یہ کہہ کر سنسنی پھیلادی تھی کہ باردولی تحریک کی واپسی کا فیصلہ بہت ہی تباہ کن ثابت ہوا ہے۔ سنگراویلو نے اپنی اس تقریر میں عدم تعاون کو قومی سطح کی ہڑتالوں سے مربوط کردینے کی ضرورت پر بھی زور دیا تھا۔ یہاں یہ ذکر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ 1928 کی چھٹی کومن ٹرن کانگریس (کیونسٹوں کی بین الاقوامی کانفرنس) میں اشتراکی رخ اختیار کرنے تک،

ہندوستانی کیونسٹوں نے بحیثیت مجموعی قوم پرستی کے عام دھارے میں رہتے ہوئے کام کرنے کی کوشش کی: یہ دوسری بات ہے کہ وہ اس عرصہ میں سامراج ولد کے ساتھ کانگریسی قیادت کی سودے بازیوں کی کھل کر تنقید بھی کرتے رہے تھے۔ رائے کانگریس کے سالانہ اجلاسوں میں مندوبین میں تقسیم کرنے کے لیے کیونسٹ پروگراموں پر مشتمل بیانات باقاعدگی سے تیار کرتے تھے جب کہ Vanguard کے شماروں (مئی۔ جون 1922) میں گاندھی کا جو تجزیہ کیا گیا تھا وہ اگرچہ بہت سخت تھا، مگر 1928 کے بعد گاندھی کی بابت ان کی رائے کے مقابلے میں بہت ہلکا تھا۔ اس تجزیے میں "اپنے ہم وطنوں کے مصائب کے تئیں گاندھی کی دلچسپی کو سراہا گیا تھا، ایک ایسی دلچسپی جس کے لیے بڑی سے بڑی حکمتی غلطی کی جا سکتی تھی؛ گاندھی کی اس "طاقت" کی بھی ستائش کی گئی تھی جسے مشین گنوں سے بھی نہیں دبایا جا سکتا تھا۔ (حوالہ G. Adhikari Docu ments of History of CPI, 1 458,438)۔

ہندوستان میں چند چھوٹے موٹے کیونسٹ گروپوں کے ظہور پر انگریزوں کی گھبراہٹ (1920 کی دہائی کی وزارت داخلہ کی فائلیں بالشویک دہشت، سے بھری ملتی ہیں) اس طرح کی سرگرمیوں کی فوری اہمیت سے کہیں زیادہ بڑھی ہوئی تھی جس کی تاویل یہ کی جا سکتی ہے کہ جس طرح 1917 کے انقلاب روس نے پوری دنیا کے حکمراں طبقے کو دہلا دیا تھا اور انقلاب فرانس کی یادوں کو تازہ کر دیا تھا؛ اسی طرح ہندوستان کے انگریز حکمراں بھی دہشت زدہ تھے۔ ہندوستان میں دوبارہ داخل ہونے کی کوشش کرتے ہوئے جو مہاجر پکڑے گئے تھے ان کے خلاف 1922 اور 1927 کے درمیان پشاور سازش کیس کے نام سے پانچ مقدمے یکے بعد دیگرے چلائے گئے اور مئی 1924 میں ایس۔ اے۔ ڈانگے، مظفر احمد، شوکت عثمانی اور نالنی گپتا کو "کان پور بالشویک سازش کیس کے سلسلے میں قید کر دیا گیا۔ اس طرح کے ظالمانہ اقدامات سے تحریک کو جو دھکا پہونچا تھا وہ بہت ہی عارضی ثابت ہوا۔ دسمبر 1925 میں کان پور میں ایک کھلی "انڈین کیونسٹ کانفرنس منعقد ہوئی جس کا اہتمام ستیہ بھکت نے کیا تھا جو کہ ایک آشیاں بدوش قسم کے انسان ثابت ہوئے۔ حسرت موہانی کانفرنس کی استقبالیہ کمیٹی کے چیئرمین اور سنگراویلو صدر تھے۔ اگرچہ اس کانفرنس کا اہتمام ان لوگوں نے کیا تھا جن کے نظریات ایک دوسرے سے نہیں ملتے تھے اور جو قانونی گرفت سے بچنے کے لیے کیونسٹوں کی بین الاقوامی تنظیم (Comintern) سے اپنی لاتعلقی پر بھی زور دیتے تھے، مگر اس گروپ نے تنظیم کا جو بھی ڈھانچہ تیار کیا تھا اس پر جلد ہی بمبئی کے ایس۔ وی گھاٹے جیسے نسبتاً زیادہ پختہ قسم کے کیونسٹوں کا کنٹرول قایم ہو گیا تھا۔ 1959 میں متحدہ کیونسٹ پارٹی آف انڈیا نے یہ اعتراف کیا کہ 1925 کی یہ کان پور کانفرنس پارٹی کی باقاعدہ تاسیس ثابت ہوئی تھی۔ عملی اعتبار سے نسبتاً کہیں زیادہ اہم بات یہ ہے کہ 1925 اور 1927 کے درمیان جو

متعدد تنظیمیں قایم ہوئیں ان سب میں 23-1922 کا یہ مرکزی خیال موجود تھا کہ قانونی اثر حاصل کرنے کے لیے محنت کش طبقے اور کسانوں کی ایک وسیع تر پارٹی ہونی چاہیے۔ لیبر سوراج پارٹی، جس کا نام جلد ہی پیزنٹس اینڈ ورکرز پارٹی" ہو گیا تھا، 26-1925 میں بنگال میں مظفر احمد، ان کے دوست اور مشہور انقلابی شاعر نذر الاسلام، قطب الدین احمد، نیز انقلاب پسند سوراجی لیڈر ہیمنت کمار سرکار نے قائم کی تھی جو کہ اس سے پہلے سی۔ آر داس کے سکریٹری رہ چکے تھے۔ اس پارٹی میں بعد میں انوشیلن تحریک کے وہ سابق کارکن بھی شامل ہو گئے جن کے لیڈر گوپن چکرورتی اور دھرنی گوسوامی تھے۔ یہ گروپ دو بنگالی اخبارات 'بنگال' اور اگن بانی نکالتے تھے۔ پنجاب میں اسی طرح کا گروپ 1926 میں اخبار 'کیرتی' کے حلقے میں پیدا ہوا تھا جس کے ایڈیٹر غدر پارٹی کے بزرگ لیڈر سنتو کھ سنگھ تھے۔ اس گروپ میں انقلاپسند ببر اکالی تحریک کچھ کے بچے کھچے لیڈر بھی آ ملے تھے اور اس طرح سوہن سنگھ جوش کی قیادت میں کیرتی کسان پارٹی قائم ہو گئی تھی۔ بمبئی میں بھی جنوری 1927 میں ایس۔ ایس میراج کر، کے۔ این جوگ لیکر اور ایس۔ وی گھاٹے نے ورکرس اینڈ پیزنٹس پارٹی، کے نام سے ایک تنظیم قائم کی جس کا اپنا ایک اخبار بھی تھا۔ جس کا نام 'کرانتی' تھا۔ سب سے اہم بات یہ تھی کہ یہ سب کیونسٹ محنت کش طبقے کے ساتھ حقیقی نوعیت کے رابطے قائم کر رہے تھے۔ چنانچہ کھڑگ پور ریلوے ورکشاپ کی فروری اور ستمبر 1927 کی ہڑتالوں میں کیونسٹ بہت نمایاں رہے تھے بلکہ وی۔ وی گری اور آندریوز کی انتہائی اعتدال پسندانہ یونین قیادت پر ورکروں کی ناراضگی کا اظہار کر رہے تھے۔ جب آندریوز نے کیونسٹوں کی اس انتہائی معقول تجویز کی مخالفت کی کہ کھڑگ پور ہڑتال کا دائرہ اثر لیلواہ جیسی ورکشاپ تک وسیع کرنے کی کوشش کی جانی چاہیے تو ڈانگے نے آندریوز کو آڑے ہاتھوں لیتے ہوئے کہا تھا کہ وہ ٹریڈ یونین تحریک کا رخ موڑنے اور گمراہ کرنے کے لیے دوسرا ہیوم بننے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ان کے الفاظ یہ تھے "ایسا کبھی نہیں ہونے دیا جائے گا، محنت کش طبقہ اپنی تقدیروں کا خود مالک ہوگا۔" بمبئی کے کپڑا ملوں کے ورکروں میں بھی کیونسٹوں کا اثر 1926 سے تیزی سے بڑھنا شروع ہو گیا تھا۔ لیکن وہ دیہی علاقوں کے محنت کش طبقے میں زیادہ اثر قایم نہیں کر سکے۔ شاپور جی سکلات والا کے دورے سے، جو کہ ایسے پہلے ہندوستانی کیونسٹ تھے جو برطانوی پارلیمنٹ کے ممبر بنے تھے، 1927 سے کیونزم میں عام لوگوں کی دلچسپی پیدا ہونا شروع ہو گئی تھی۔ کانگریس کے کنٹرول والی میونسپلٹیوں نے انھیں شہری استقبالیے دیئے تھے، یہاں تک کہ خود گاندھی نے بھی ان کے ساتھ ایک دوستانہ مناظرہ کیا تھا۔ مہاتما نے سکلات والا کے "شفاف خلوص نیت" کی ستائش کی تھی اور کیونسٹوں کے ذریعے کسان طبقے کو نظر انداز کیے جانے کی نکتہ چینی کی تھی اور آخر میں یہ امید بھی ظاہر کی تھی کہ "ہو سکتا ہے کہ ہمارے راستے بہ ظاہر ایک دوسرے سے الگ معلوم ہوتے ہوں لیکن

مجھے امید ہے کہ ہم ایک دن ایک دوسرے سے ضرور آملیں گے"۔ ابتدائی دور کے کیونسٹوں کے ساتھ انصاف کے تقاضے کی تحت یہ کہا جا سکتا ہے کہ باقاعدہ کارکنوں کی کمی کی وجہ سے 1920 کی دہائی کے دوران دیہی علاقوں تک رسائی ممکن نہیں ہو سکی تھی۔ نیز یہ بھی واقعہ ہے کہ چینی انقلاب کے تجربے سے پہلے شہری علاقے کے محنت کش طبقوں کے درمیان کام کو ہی نظریاتی اولیت دی جاتی تھی۔ کیونسٹوں کے پروگراموں میں شروع سے ہی زمینداری کے خاتمے اور زمینوں کی از سر نو تقسیم کے مطالبے شامل ہوتے تھے؛ یہ وہ مطالبے ہیں جن پر کانگریس نے کافی پس و پیش کے بعد 1930 کی دہائی کے وسط سے ہی زور دینا شروع کیا تھا۔

انقلابی دہشت پسندی

1922 کے بعد کانگریس کے سرکردہ لیڈروں کے تئیں لوگوں کے اندر جو لاتعلقی کا احساس پیدا ہو گیا تھا اس کے نتیجے میں بنگال، یوپی، اور پنجاب کے تعلیم یافتہ نوجوانوں کے ایک طبقے کے اندر انقلابی دہشت پسندی کے طریقے اپنانے کا جذبہ پیدا ہونا ایک فطری بات تھی۔ 1922 میں اور اس کے بعد بھی "آتم شکتی"، سارتھی، اور "بجولی"، جیسے بنگالی جریدوں میں، جن کی ادارت اکثر وہ لوگ کرتے تھے جو کبھی نظر بند رہ چکے تھے، ایسی یادیں اور مضامین شائع ہوتے تھے جن میں پرانے انقلابیوں کے ایثار اور قربانی کے واقعات کو مبالغے کے ساتھ بیان کیا جاتا تھا۔ سچن سانیال کا جریدہ "بندی جیون" جو کہ ہندی اور گورمکھی میں بھی شائع ہوتا تھا، نوجوانوں پر خاص اثر رکھتا تھا۔ جب کہ بنگال کے سب سے مقبول ناول نگار، شرت چندر چٹرجی نے اپنا ناول پاتھر دیوی، 1926 میں شائع کیا تھا جس میں شہری متوسط طبقے کے "تشدد پسندانہ انقلاب" کی خوب ستائش کی گئی تھی۔ حکومت نے شرت کے اس ناول پر پابندی لگا دی جس سے اس کی مقبولیت اور بھی بڑھ گئی تھی۔
بنگال میں 24-1923 کے دوران تھوڑی سی مدت کے لیے جو دہشت پسندی پیدا ہوئی تھی وہ جنوری 1924 میں گوپی ناتھ ساہا کے ہاتھوں ایک انگریز مسمی Day کے قتل کے ساتھ اپنے نقطہ عروج کو پہونچ گئی (حالانکہ اصل نشانہ کلکتہ کا بدنام زمانہ پولس کمشنر Tegart تھا)۔ قتل کے اس واقعے پر اکتوبر 1924 کے بنگال آرڈی ننس کے تحت بڑے پیانے پر پکڑ دھکڑ کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا جس کے نتیجے میں صوبے میں انقلابی کارروائی پر، نہ کہ انقلابی نظریات کی توسیع پر، اس وقت تک کے لیے روک لگ گئی جب تک کہ 28-1927 میں نظر بند رفتہ رفتہ رہا نہیں کر دیے گئے تھے۔ اس اثناء میں یوپی میں قیام پذیر دو بنگالی لیڈر سچن سانیال اور جوگیش چندرا چٹرجی 'ہندوستان ری پبلکن ایسوسی ایشن' کے نام سے ایک تنظیم قائم کر کے ڈکیتیوں کے ذریعے فنڈ اکٹھا کرنے کا سلسلہ شروع کر چکے تھے۔ اگست 1925 کے کاکوری ٹرین ڈاکے کے بعد اس ایسوسی ایشن کے بیشتر

ممبر گرفتار کر لیئے گئے تھے مگر جو باقی رہ گئے تھے انھوں نے نئے ممبر بنا لیے تھے (جن میں اجے گھوش بھی شامل تھے جو بعد میں کیونسٹ پارٹی آف انڈیا کے جنرل سکریٹری بنے تھے) اور پنجاب کے اس گروپ کے ساتھ رابطے قائم کر لیے تھے جو ایک ذہین طالب علم بھگت سنگھ کی قیادت میں بڑی تیزی سے اُبھر رہا تھا۔ ان لوگوں نے ستمبر 1928 میں ہندوستان سوشلسٹ ری پبلکن آرمی قائم کی۔

1920 کی دہائی کے وسط میں ہونے والی دہشت پسندانہ کارروائیوں کا نہ تو جنگ کے زمانے کے واقعات سے کوئی مقابلہ ہے اور نہ ہی ان واقعات سے جو کہ 1930 اور 1934 کی درمیانی مدت میں تحریک کے آخری اور انتہائی کشیدہ مرحلے میں رونما ہوئے۔ البتہ اہم بات یہ ہے کہ 1920 کی دہائی کے وسط میں بعض انقلابی گروپوں کے اندر نئی سوچ ابھرنی شروع ہو گئی تھی۔ بنگال میں بزرگ سیاست داں اب بھی نہ صرف یہ کہ ماضی میں جی رہے تھے بلکہ ابھی تک یوگانتروں اور انسوشیلن سیاست دانوں کی شدید باہمی چپقلش میں ہی الجھے ہوئے تھے۔ یہ سیاست داں کاری سنگھ کے ذریعے کانگریس کی گروہی سیاست میں تیزی سے ملوث ہوتے جارہے تھے اور اس وجہ سے نو واردوں کی آنکھوں میں اپنی وقعت کھوتے جارہے تھے، ان نو واردوں میں چٹاگانگ کے سورجیا سین کے جھنڈے تلے ابھرنے والا 'انقلابی گروپ' بھی شامل تھا۔ یہ نو وارد فوری اور ڈرامائی کارروائی کے لیے بے چین تھے۔ کچھ لوگوں کے ذریعے کیونزم اختیار کر لینے اور 'دہشت پسندانہ کیونزم' (Terro-Communism) کی شکل میں نئے اور پرانے طریقوں کو ہم آہنگ کرنے کی اکادکا کوششوں سے قطع نظر، قدیم دہشت پسندانہ روایت اب بھی 'ہندو مذہبیت' انفرادی دہشت پسندی اور ایثار و قربانی کی انفرادی کوششوں جیسے امور کے بارے میں از سر نو غور کرنے کی راہ میں رکاوٹ بنی ہوئی تھی۔ 08-1905 کے دو بزرگ انقلابی۔ ہیم چندر قانون گو اور بھوپیندر ناتھ دت نے 1920 کی دہائی کے وسط میں جو اپنی اہم یادداشتیں قلم بند کی تھیں ان میں دہشت پسندی کی پرانی روایت کی سخت تنقید کی گئی تھی۔ 1925 کے ایک کتابچے میں، جو کہ غالباً ہندوستان ری پبلکن ایسوسی ایشن کے لیے سچن سانیال نے قلم بند کیا تھا، اس سے بھی سخت تنقید کی گئی تھی۔ اگرچہ اس کتابچے میں انفرادی دہشت پسندی کو اس بنیاد پر حق بجانب ٹھہراتے ہوئے کہ "کسی نئے ستارے کے وجود میں آنے کے لیے ایک خلاء کا ہونا ضروری ہے" یہ کہا گیا تھا کہ اصل مقصد "ان تمام نظاموں کا خاتمہ ہے جو انسان کے ذریعے انسان کے استحصال کا وسیلہ بن سکتے ہیں۔" اس کے ساتھ ہی "مزدوروں اور کسانوں کی تنظیموں کی ضرورت" پر بھی زور دیا گیا تھا۔ آگے چل کر یہ نیا انداز فکر مکمل لادنیت کی شکل اختیار کر گیا اور خاص طور پر بھگت سنگھ اور ان جیسے دوسرے انقلابیوں کی وجہ سے اشتراکی مقاصد اور بھی واضح ہو گئے تھے۔

سبھاش اور جواہر لال

متعینہ کمیونسٹ اور دہشت پسندانہ رجحانات سے قطعِ نظر، 1920 کی دہائی کے وسط اور آخر میں ابھرتی ہوئی نسل میں بڑھتی ہوئی بے چینی کے نتیجے میں طالب علموں اور نوجوانوں کی ایسی تنظیمیں پیدا ہونے لگی تھیں جو سوراجی اور تبدیلی مخالف لیڈروں کو نکتہ چینی کا نشانہ بنا رہی تھیں اور "پورن سوراج" (مکمل خود مختاری) کے نعرے کی شکل میں سامراج واد کے خلاف اور زیادہ شدید جدوجہد کا مطالبہ کر رہی تھیں اور اس کے ساتھ بین الاقوامی حالات وواقعات کے شعور اور قوم پرستی کو سماجی انصاف سے ہم آہنگ کرنے کی ضرورت پر بھی زور دے رہی تھیں۔ سبھاش بوس نے بھی 1927 میں اپنی رہائی کے بعد ایک حد تک اِسی طرح کے خیالات ظاہر کیے۔ یہ دوسری بات ہے کہ بنگال کے شہری علاقوں کے نوجوانوں میں اُن کی بڑھتی ہوئی مقبولیت کی وجہ ان کے یہ خیالات نہیں تھے بلکہ علاقائی جذباتیت تھی۔ ہندوستانی نوجوانوں میں ابھرتے ہوئے ایک دوسرے ستارے جواہر لال کا 27-1926 کا دورۂ یورپ فیصلہ کن اہمیت کا حامل ثابت ہوا۔ فرقہ وارانہ فسادات نے انھیں پہلے ہی یہ باور کرادیا تھا کہ "اگر ہندوستان میں مذہب پر قدغن نہ لگائی گئی تو وہ ملک اور عوام دونوں کو ہی تباہ کردے گا۔" ایس گوپال نے اس بات پر خاص طور سے زور دیا ہے کہ فروری 1927 میں نوآبادیاتی جبر اور استعماریت کے خلاف برو سلز کانفرنس میں ان کی شرکت "جواہر لال کی ذہنی نشوونما میں ایک اہم موڑ" ثابت ہوئی تھی، جہاں انھیں اشتراکی ملکوں نیز تیسری دنیا کی قوم پرست طاقتوں کے سامراج مخالف اتحاد اور یک جہتی کی بصیرت حاصل ہوئی تھی۔ یہ دوسری بات ہے کہ وہ ان قوتوں کے ساتھ نہ تو زیادہ دور تک چل سکے اور نہ ہی ان سے پوری طرح دامن کش ہی ہو سکے۔ جواہر لال کو اس سامراج مخالف لیگ کا اعزازی صدر بنایا گیا جو قومی آزادی کے مقصد سے برو سلز میں ہی شروع کی گئی تھی اور نومبر 1927 میں اُنھیں اور ان کے والد کو سوویت یونین نے مدعو کیا تھا۔ انھوں نے اپنے اس دورے کے سلسلے میں جو مضامین ہندو کے لیے لکھے تھے (جو 1928 میں 'سوویت روس' کے عنوان سے شائع ہوئے) ان سے پتہ چلتا ہے کہ "ہتھوڑے اور درانتی والے اس ملک نے، جہاں اقتدار کے تخت پر محنت کش اور کسان متمکن ہیں، جواہر لال کے ذہن پر گہرا نقش قائم کیا تھا؛ ان کی کتاب کے سرورق پر انقلاب فرانس کے سلسلے میں ورڈس ورتھ کا یہ مقولہ درج تھا۔

Bliss was it in that dawn to be alive.
But to be young was very heaven.

نومبر 1927 میں صرف گوروں پر مشتمل سائمن کمیشن کی تشکیل کے اعلان کے ساتھ ہی احیاء پسند طاقتوں نے ایک جٹ ہونا شروع کردیا۔ یہ بات آگے چل کر سامراج کے خلاف ایک عظیم تحریک کی شکل اختیار کر گئی۔

باب چھ

قوم پرستانہ پیش قدمی اور معاشی کساد بازاری: 37-1928
ایک طائرانہ نظر

سیاسی اتھل پتھل

نومبر 1927 میں سائمن کمیشن کی تشکیل اور جولائی 1937 میں صوبوں میں عوامی حکومتوں کے قیام کے درمیان کے ساڑھے نو سال کے عرصہ میں بہت سارے پیچیدہ اور بسا اوقات باہم متضاد سیاسی واقعات رونما ہوئے۔ قومی تحریک نے اگلے مرحلے کی آئینی تبدیلیوں کے بارے میں غور کرنے کے لیے تمام تر گوروں پر مشتمل سائمن کمیشن کے قیام کو جان بوجھ کر اور تحقیری انداز میں نظر انداز کیا اور سول نافرمانی کی پہلی تحریک کے ذریعے اپنی جدو جہد جاری رکھی یہاں تک کہ مارچ 1931 میں گاندھی ارون معاہدہ عمل میں آیا۔ بہر حال انگریزوں نے اس کا جواب ولنگڈن اور Ramsay میک ڈونالڈ کی قومی حکومت کی شکل میں دیا جس نے 34-1933 تک کانگریس کا بالکل ہی صفایا کر دیا تھا۔ بہر حال یہ کامیابی ایک سراب ثابت ہوئی اور کانگریس مارچ 1937 کے انتخابات بھاری اکثریت سے جیت گئی۔ اس سے قومی تحریک کو پہلی بار حقیقی معنوں میں صوبائی سطح پر انتظامیہ میں کانگریس کے کنٹرول کی شکل میں ایک اہم پیش رفت حاصل ہوئی۔

تمام تر نشیب و فراز کے باوجود بھی ہندوستانی قوم پرستی کی عمومی پیش قدمی کافی نمایاں ہونے کے ساتھ ساتھ تضادات کا بھی شکار رہی۔ گیان پانڈے نے صوبہ جات متحدہ کا جائزہ لیتے ہوئے ان تضادات پر تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالی ہے (The Ascendancy of the Congress in U.P.1926-1934)۔ ان تضادات کی وضع وہی رہی جس کا مبہم سا اشارہ 22-1919 میں بھی مل چکا تھا۔ بہر حال یہ تضادات 1930 کی دہائی میں بالکل کھل کر سامنے آگئے: کانگریس کی پیش قدمی اور اس کے تنظیمی استحکام کا مطلب تھا زیادہ بنیادی اور انقلابی قسم کے نچلے طبقات کے جذبات پر قدغن یا انھیں اپنے اندر جذب کر لینا۔ جیسا کہ اس کتاب کے شروع میں ہی ذکر کیا جا چکا ہے، کانگریس "راج" کے خلاف جدو جہد کرنے کے ساتھ ساتھ خود بھی "راج" کی شکل اختیار کرتی جارہی تھی، اور اس طرح 1947 کی زبردست مگر نامکمل اتھل پتھل کا اوراک بھی پیش کرتی جارہی تھی۔ سوال محض یہ نہیں تھا کہ پارٹی تنظیم نچلی سطح پر از خود ابھرنے والی کسی تحریک کو دبادے، بلکہ یہ بھی تھا کہ قومی تحریک پر بورژوائی طبقوں اور بااثر کسانوں کی بالا دستی کو ہر حال میں قائم رکھا جائے۔ کانگریس بار بار ایسی امیدیں اور آرزوئیں جگاتی رہی جنھیں وہ کبھی پورا

نہیں کر سکی جس کے نتیجے میں اسے ٹریڈ یونینوں، کسان سبھاؤں، انقلاب پسند طالب علموں کی تحریکوں، کانگریسی سوشلسٹوں، کیمونسٹوں اور خود کانگریس کے اندر دائیں گروپ اور بائیں گروپ کے درمیان ٹکراؤ کی شکل میں ایک ایسے چیلنج کا سامنا رہا جو 1930 کی دہائی کے وسط سے ملک کی سیاسی زندگی کے ایک اہم حصے کی شکل اختیار کر تا گیا۔ گاندھی کی طرف سے تھوپے گئے نظم و ضبط اور تحمل کے فلسفے سے متوسط طبقے کے انقلاب پسند نوجوان کافی بددل ہو چکے تھے اور بددلی کا اظہار 1928 اور 1934 کے دوران بنگال اور پنجاب میں دہشت پسندی کی آخری کوشش کی شکل میں ہوا تھا۔ یہ بددلی اس مدت کے آخر میں اشتراکی نظریات کے فروغ کا باعث بھی ہوئی اور انقلابی لیڈروں نے انفرادی دہشت پسندی کی جگہ پر عوامی جدو جہد اور مارکس واد کا راستہ اختیار کر لیا۔

جیسا کہ اس سے پہلے بھی ہو تا رہا تھا، سیاسی بیداری بعض اوقات گروہی یا فرقہ وارانہ رخ بھی اختیار کر لیتی تھی اور مشکلات کی شکار انگریز حکومت نے اس طرح کی صورت حال سے پہلے سے کہیں زیادہ فائدہ اٹھانے کی کوشش کی۔ چنانچہ "ہندوستانی اتحاد کا بحران" پیدا ہو تا گیا۔ آر۔ جے۔ مور نے اسی عنوان Crisis of Indian Unity سے اپنی کتاب میں اس بحران کا جائزہ لیتے ہوئے اسے انگریزوں کی "مرحلہ وار اختیارات کی منتقلی" کی حکمت عملی کا ہی ایک حصہ بتایا ہے۔ 1857 کی بغاوت کے بعد قوم پرستوں کے خلاف راجوں اور مہاراجوں کو استعمال کرنے کے تجربے کو، 1930 کی دہائی میں بھی "وفاق" (Federation) کے نام پر بروئے کار لانے کی کوشش کی گئی، اور (متعدد تحفظات و مراعات کے ساتھ) مرکز میں ایک جواب دہ حکومت کی تشکیل کی پیش کش کو سینٹرل اسمبلی میں مہاراجگان کی ایک طاقت ور اور ناعزو جمیت کے قیام کی شرط سے منتھی کر دیا گیا تھا، مسلمانوں میں ہندو بالادستی کا خدشہ پیدا کرنے کی ہر ممکن کوشش کی گئی اور دوسری طرف اچھوتوں کی قطعی جائز اور فطری شکایتوں کو، جن کا اظہار امبیڈکر کی تحریکوں کی شکل میں ہو رہا تھا، دور کرنے کی بجائے انھیں جلد از جلد آزادی کے لیے قوم پرستوں کے مطالبے میں رکاوٹ کے حربے کے طور پر استعمال کرنے کی کوشش کی گئی۔ اس سلسلے میں نو آبادیاتی حکمرانوں کی خطرناک حکمت عملی کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ چھوٹا ناگ پور جیسے قبائلی علاقوں میں علاحدگی پسندی کے رجحانات کی حوصلہ افزائی بھی کی گئی تھی۔ اس کے علاوہ 1935 کے ایکٹ کے ذریعے گورنروں کو عوام کے چنے ہوئے وزراؤ سے صلاح مشورہ کے بغیر ہی "پس ماندہ" قبائلی علاقوں کے بندوبست کے لیے بے تحاشا اختیارات دیے گئے تھے۔ قومی تحریک نے انگریزوں کی اس "لڑاؤ اور حکومت کرو" کی پالیسی کو ناکام بنا دینے کی کوشش کی اور اس میں اسے کسی قدر کامیابی بھی حاصل ہوئی۔ ریاستوں میں شخصی حکومتوں کے خلاف عوام کی تحریکوں میں شدت آتی جا رہی تھی۔ یہ دوسری بات ہے کہ کانگریس کی قیادت نے اور خاص طور پر گاندھی

نے ان تحریکوں کی کھلی تائید کا فیصلہ کرنے میں کافی عرصہ تک پس و پیش سے کام لیا حالانکہ ان دیسی ریاستوں میں سیاسی حقوق کے تقریباً مکمل فقدان اور بڑھتے ہوئے جاگیر دارانہ ظلم و ستم کے حوالے سے یہ تحریکیں اور احتجاج زبردست سماجی اور سیاسی امکانات کے حامل تھے۔ اگرچہ امبیڈکر کی تحریک کو نہ تو جذب کیا جاسکا اور نہ ہی ختم کیا جاسکا مگر 1932 کے بعد گاندھی نے اپنا بیشتر وقت ہری جنوں میں گزارنا شروع کر دیا تھا اور کانگریس 1930 کی دہائی میں مہاراشٹر، میسور، اور (کسی حد تک) تامل ناڈو جیسے علاقوں میں درمیانی سطح کی غیر برہمن ذاتوں کی تحریکوں کو اپنے ساتھ ملا لینے میں کامیاب ہو گئی تھی۔ فلاحی سرگرمیوں کے ذریعے قبائلیوں کی تائید حاصل کرنے کی کوشش کی گئی اور سول نافرمانی کی تحریک میں "جنگل ستیہ گرہ" کو کافی اہمیت دی گئی۔ جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے، تو 29-1928 میں نہرو رپورٹ پر بحث و مباحثے کے ساتھ ہی حد بندی واضح ہو گئی تھی۔ صوبہ سرحد کے علاوہ باقی سارے مقامات پر مسلمانوں نے خود کو سول نافرمانی کی تحریک سے الگ رکھا۔ تاہم صلح صفائی کے لیے دروازے کافی عرصہ تک کھلے رکھے گئے تھے کیونکہ 1937 کے انتخابات میں جناح کی مسلم لیگ کل 482 مسلم سیٹوں میں سے محض 109 سیٹوں پر ہی جیت پائی تھی، اور جیسا کہ ہم آگے چل کر جائزہ لیں گے، واقعہ تو یہ ہے کہ مونجے، جیاکار اور مالویہ جیسے جارح ہندو لیڈروں کے سخت طرز عمل کے رد عمل میں ہی جناح ایک بے لوچ فرقہ پرست لیڈر بن گئے تھے۔ مسلم اکثریت والے دو اہم صوبوں، بنگال اور پنجاب میں مسلم لیگ 1937 کا الیکشن ہار گئی۔ مگر اسے کانگریس نے نہیں بلکہ مسلمانوں کے غلبے والی علاقائی پارٹیوں (کرشک پارٹی، پرجا پارٹی یونینسٹ پارٹی وغیرہ) نے ہرایا تھا۔ ان پارٹیوں کا دعوا تھا کہ وہ زمینداروں، شہری بیوپاریوں اور ساہو کاروں کے مقابلے پر کسانوں کے حقوق کا تحفظ کریں گی۔ کانگریس کوئی انقلابی قسم کا زرعی پروگرام پیش کرنے میں ناکام رہی جس کا نتیجہ ان دونوں صوبوں میں دیکھنے میں آیا اور ملک کے اتحاد کے لیے تباہ کن ثابت ہوا۔

کیمبرج مورخین نے 1930 کی دہائی کے دستور سازی کے عمل میں پھر سے دلچسپی دکھائی ہے اور اس کے لیے انگریزوں کی پالیسیوں نیز قومی تحریک کے متعدد بار کے نشیب و فراز کے درمیان تعلق کو بنیاد بنایا ہے۔ اپنی نئی تصنیف **Gandhi And Civil Disobedience** 1977- میں جوڈتھ براؤن کا یہ کہنا ہے کہ گاندھی کا کل ہند رول کافی حد تک انگریزوں کی وجہ سے ہی ممکن ہو سکا تھا۔ براؤن کی یہ رائے ایک لحاظ سے ولنگڈن کے اس تجزیے کی ہی بازگشت معلوم ہوتی ہے کہ "مہاتما کا دائرہ اثر انگریزوں کے سلوک کی طرح تغیر پذیر رہا تھا۔ (وائسرائے بنام سکریٹری آف اسٹیٹ، مورخہ 25 جون 1932)۔ سائمن کمیشن کی وجہ سے آئینی تبدیلیوں کو جیسے ہی فوری اہمیت کے ایک قومی معاملے کی حیثیت حاصل ہو گئی، کانگریس میں بھی پھر سے جان سی پڑ

گئی۔ اروِن نے گاندھی کو بات چیت میں مساوی حیثیت دے کر ان کے قدو قامت کو اور بھی بڑھادیا۔ انگریز امبیڈکر کو استعمال کرنے کی کوشش کر رہے تھے جس کی وجہ سے گاندھی کو اپنی توجہ ہری جنوں پر مرکوز کرنی پڑی؛ اور ولنگڈن نے کانگریس کے ساتھ کسی بھی قسم کی گفت وشنید سے انکار کر دیا تھا جس کے نتیجے میں 33-1932 میں قوم پرست لیڈروں کا زور ہی ٹوٹ گیا۔ بہر حال جس طرح موٹیگیورڈ اصلاحات کارشتہ 22-1919 کی شورش سے جوڑنے کی کوشش کی گئی تھی، اسی طرح اس سارے معاملے پر بھی ایک طائرانہ نظر ڈالنے پر اسی طرح کے شکوک وشبہات پیدا ہوتے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ قوم پرستوں کے دباؤ کے تحت انگریزوں کی پالیسیاں برابر تبدیل ہوتی رہی تھیں، انگریزوں کی پالیسیوں کی وجہ سے قوم پرستوں کی تحریک میں کبھی تبدیلی نہیں ہوئی۔ اگر صرف گوروں پر مشتمل سائمن کمیشن نے، جو کہ قوم پرست تحریک کے انحطاط کے زمانے میں قائم کیا گیا تھا، کچھ معاملات کے سلسلے میں موٹیگو لبرل ازم سے پیچھے ہٹنے کا منصوبہ تیار کیا تھا، تو دوسری طرف 1928 کے بعد سے قومی تحریک کے احیاء اور شدت نے اروِن کو 31 اکتوبر 1929 کی پیش کش کرنے کے لیے مجبور کر دیا تھا اور جنوری 1931 میں میک ڈونالڈ کو مرکز میں ایک جواب دہ قسم کی حکومت قائم کرنے کے وعدے کو پورا کرنے کی یقین دہانی کرانی پڑی تھی۔ جن شدت پسندوں نے سول نافرمانی کی تحریک میں حصہ لیا تھا انھیں گول میز کانفرنس میں کی جاری آئینی موشگافیوں کی نہ تو سمجھ ہی تھی اور نہ ہی کوئی دلچسپی! لیکن ان لوگوں کے ہی دباؤ اور ذاتی قربانیوں نے ہی اروِن کو گاندھی کے ساتھ گفت وشنید کے لیے مجبور کر دیا تھا اور کانگریس کی 34-1933 کی انتخابی شکست 1937 میں بھاری انتخابی فتح مندی میں تبدیل ہو گئی تھی۔ تاریخ کی بنیاد، خواہ وہ ہندوستان کی تاریخ ہو یا برطانیہ کی، ہمیشہ اعلا طبقاتی سیاست دانوں پر ہی قائم نہیں ہوتی۔ بلکہ اس میں عوام کا بھی زبردست رول ہوتا ہے۔

کساد بازاری اور ہندوستان

1930 کی دہائی کے واقعات کی ایک بڑی وجہ فیصلہ کن معاشی تبدیلیاں بھی تھیں۔ کساد بازاری کا جو سلسلہ عالم گیر سطح پر 1929 سے شروع ہوا تھا وہ ہندوستان پر دو طرح سے اثر انداز ہوا: یعنی ایک طرف تو قیمتوں میں بڑی تیزی سے گراوٹ آتی چلی گئی اور خاص طور پر غذائی اشیاء کے دام بالکل ہی گھٹ گئے اور دوسری طرف برآمدات پر مبنی نوآبادیاتی معیشت بھی زبردست بحران کا شکار ہو گئی۔ قیمتوں کا کل ہند عدد اشاریہ (1873=100 کے حساب سے) 1929 میں 209 سے گھٹ کر 1930 میں 171، 1933 میں 127، 1932 میں 126، 1933 میں 121، اور 1934 میں 119، رہ گیا تھا۔ اس کے بعد اس میں معمولی سا اضافہ ہوا مگر 1937 میں 136 سے آگے نہیں جا سکا

تھا۔ زرعی اشیاء کی قیمتوں میں گراوٹ 1926 سے ہی شروع ہو چکی تھی لیکن ہندوستان میں 1930 سے بھاری گراوٹ ہوئی۔ ناتیار (خام) کپاس کی کل ہند قیمتوں کا اوسط (1873=100) 1929 میں 133 سے گھٹ کر 1931 میں 70 رہ گیا تھا۔ بنگال میں موسم سرما کے چاول کی قیمت (1929=100 کے حساب سے) 1932 میں گھٹ کر 45.9 رہ گئی تھی جب کہ جوٹ کی قیمت 1934 میں گھٹ کر 43.5 ہو گئی تھی۔ صوبہ جات متحدہ میں جو تھوک قیمتیں (1901-05=100 کے حساب سے) 1929 میں 218 تھیں وہ 1930 میں گھٹ کر 162 پر، 1931 میں 112 پر، اور 1934 میں 103 پر آ گئی تھیں۔ (حوالہ: C.J. Baker: Politics of South India.1920)۔ اس کساد بازاری کے نتیجے میں مال گزاری، لگان اور سود کی ادائیگیوں کے بوجھ میں تیزی سے اضافہ ہونا لازمی تھا اور جو لوگ اس صورت حال سے سب سے زیادہ متاثر ہوئے وہ خوش حال اور متوسط کسان تھے جو فاضل زرعی پیداوار فروخت کر دیا کرتے تھے (یہ صورت حال 1918 کے افراط زر کی صورت حال کے قطعی برعکس تھی کیونکہ اس وقت سب سے زیادہ ملک کا غریب طبقہ متاثر ہوا تھا)۔ ہمیں 1930 کی دہائی میں اس سلسلے میں ہونے والی سرگرمیوں کے بارے میں جو بھی علم ہے وہ اس معاشی صورت حال سے مطابقت رکھتا ہے۔ کانگریس (اور کچھ تاخیر سے اور محدود حد تک کمیونسٹ نظریات کی طرف جھکاؤ رکھنے والی کسان سبھاؤں) نے بٹائی دار یا زرعی مزدوروں کی بجائے زمین کے مالک کسانوں اور چھوٹے لگان داروں کے تئیں یک جہتی ظاہر کی اور مال گزاری میں تخفیف، آب پاشی محصول میں کمی، لگان اور قرضوں کے بوجھ کو کم کرنے، منتقل شدہ زمینوں کی واپسی کے مطالبے اور اس وقت کے سب سے زور دار نعرے، یعنی زمینداری کے خاتمے کی تائید کی۔ یہ تحریک، عدم تعاون کی تحریک کے مقابلے میں دیہی علاقوں میں بڑی تیزی سے پھیلی گئی اور مضبوط قسم کی تنظیمیں قائم ہوتی گئیں مگر اس تحریک کی سب سے بڑی کمی یہ تھی کہ اسے 1919-22 کی تحریک والا الفی سعادت (Millenarian) جیسا جوش و خروش حاصل نہیں تھا۔ زمیندار طبقے کے ساتھ اپنے قریبی روابط کی وجہ سے کانگریس اس طرح کے کسی بھی مطالبے کی کھل کر تائید نہیں کر پا رہی تھی اور Hardiman کے مطابق مختلف علاقوں، خصوصاً گجرات میں کسانوں کے اندر قدامت پرستی کا رجحان ظاہر ہو رہا تھا جس کی وجہ سے باردولی تحریک کے ہیرو ولبھ بھائی پٹیل کو کانگریس کے اندر دائیں گروپ کے نقیب کی حیثیت حاصل ہو گئی تھی۔

یہ کساد بازاری انگریزوں کے ذریعے ہندوستان کے نوآبادیاتی استحصال کے طریقہ کار میں تبدیلی کا بھی باعث ہوئی۔ یہ طریقہ کار اگرچہ پہلی عالمی جنگ کی وجہ سے کسی قدر کمزور پڑ گیا تھا مگر 1929 تک اس میں کوئی بنیادی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ 1920 کی دہائی کے آخر تک بھی برطانیہ کی

کل بر آمدات کا 11 فیصد حصہ ہندوستان میں ہی در آمد کیا جاتا تھا اور اس میں 28 فیصد حصہ لنکا شائر کے کپڑوں کا ہوتا تھا۔ دوسری طرف برطانیہ کے علاوہ دوسرے ملکوں کو ہندوستان سے ناتیار غذائی سامان کی بر آمد کاری، برطانیہ کی ادائیگی کے توازن کے لیے بہت اہمیت رکھتی تھی جب کہ ہندوستان میں کان کنی، چائے، اور جوٹ جیسی صنعتیں برطانوی سرمایہ کاری کے لیے اہم میدان کی حیثیت رکھتی تھیں۔ کساد بازاری کی وجہ سے ہندوستانی بر آمدات کی جو قدر 30-1929 میں 311 کروڑ روپے تھی وہ 33-1932 میں گھٹ کر 132 کروڑ روپے رہ گئی تھی، (اس زمانے میں در آمدات بھی 241 کروڑ روپے سے گھٹ کر 133 کروڑ روپے کے بقدر رہ گئی تھیں) اور اس طرح ہوم اخراجات کو سونے کی بر آمد کاری کے ذریعے ہی پورا کیا جا سکتا تھا (Claude Markovits: Indian Business and Nationalist Politics pp-19-20) لنکا شائر کو بھی شدید تجارتی بحران کا سامنا کرنا پڑا جو کہ ناقابل تلافی ثابت ہوا۔ برطانیہ سے سوتی کپڑے کی در آمد کاری میں بھاری کمی آگئی، 30-1929 میں 1248 ملین گز کپڑے کی در آمد کاری کے مقابلے میں 32-1931 میں محض 376 ملین گز کپڑا در آمد کیا گیا، کسی قدر اضافے کے بعد 40-1939 میں یہ در آمد کاری 145 ملین گز کے بقدر ہو گئی تھی (حوالہ Amiya Bagchi p.238)۔

اس بحران پر قابو پانے کے لیے برطانیہ، خاص طور پر لنکا شائر کی کوششیں 1932 سے قومی تحریک کی قیادت کی جوابی سیاسی کارروائی کی وجہ سے زیر سطح ہی جاری رہ سکیں۔ لنکا شائر کی تجارت کو نہیں بچایا جا سکا تھا اور ہندوستان کی انگریز حکومت کو مالیاتی مشکلات کی وجہ سے کپاس، کاغذ اور شکر وغیرہ پر تحفظاتی محصول لگانا پڑا جس سے ہندوستان میں صنعتی ترقی کو مدد ملی، جسے عام طور پر اس ثبوت کے طور پر پیش کیا جاتا ہے کہ ہندوستان کو معاشی آزادی تو 1947 سے کافی پہلے ہی حاصل ہو گئی تھی۔ حکومت برطانیہ نے (1935 کے ایکٹ کی مالیاتی شقوں کے ذریعے) کونسل کے منتخب شدہ ہندوستانی ممبروں کو کنٹرول حوالے نہ کیا ہو مگر اس نے حکومت ہند کے حوالے ضرور کر دیا تھا"۔

B.R. Tomlinson: Indian National Congress. and the Raj. (1929-42) واقعہ تو یہ ہے کہ معاملات کہیں زیادہ پیچیدہ تھے۔ جیسا کہ ہم آگے چل کر جائزہ لیں گے، تحفظاتی محصولات دراصل شاہی ترجیحات سے ہی تعلق رکھتے تھے اور لنکا شائر میں برطانیہ کی سرمایہ دارانہ نوآبادیت کی دلچسپی کم ہوتی جا رہی تھی۔ 36-1935 میں برقی سامان، مواصلات اور وائرلیس کے آلات اور شکر صنعت میں کام آنے والی مشینری وغیرہ جیسی غیر روایتی اشیاء نے برطانوی بر آمدات میں سے کپڑے کو بے دخل کر دیا تھا اور ہندوستان میں ان چیزوں کی در آمد کاری بڑھتی جا رہی تھی۔ ہندوستان میں غیر ملکی کمپنیوں (1933 میں لیور برادرز اور میٹل باکس

اور 37-1936 میں ڈنلپ اینڈ امپریل کیمیکلز وغیرہ) اور کارخانوں کے قیام کے ساتھ ساتھ غیر ملکی کنٹرول والے انڈیا لمیٹیڈ گروپوں، کی تشکیل کا مشورہ، ایسی باتیں ہیں جن سے یہ اشارہ ملتا ہے کہ ہندوستان میں مخصوص قسم کے صنعتی میدانوں میں ایک نئی سامراجی دلچسپی پیدا ہونے لگی تھی۔ گویا کہ ہندوستانی کاروباری گروپوں کے ساتھ اشتراک کے ذریعے بالواسطہ معاشی کنٹرول کے لیے یہ کوشش اس وقت کی آئینی سرگرمیوں کے متوازی جاری تھی، اگر تجارتی غلبہ ختم ہو رہا تھا تو معاشی کنٹرول کو محفوظ رکھنے کی سر توڑ کوشش کی جا رہی تھی اور اس کوشش میں قابل لحاظ حد تک کامیابی بھی مل رہی تھی۔ روپے کی قدر زر اسٹرلنگ پونڈ کے ساتھ منسلک رکھی گئی تھی جو کہ ڈیڑھ شلنگ کے برابر تھی، ریزرو بنک کو قانون ساز ادارے کے دائرہ اثر سے باہر رکھا گیا تھا اور 1935 کے ایکٹ سے وائسرائے کو زبردست مالیاتی "تحفظات" حاصل ہو گئے تھے۔ جیسا کہ بسودیو چٹرجی نے اپنے ایک حالیہ تحقیقی مقالے میں روشنی ڈالی ہے، ہندوستان سے برطانیہ کو غیر ظاہر ترسیل زر (ہوم اخراجات، نجی سرمایہ کاری سے حاصل منافع، بیمے اور بنکوں کے ذریعے ترسیل زر، بھاڑے کے اخراجات وغیرہ جنھیں کہ قوم پرست لیڈر "دولت کا بہاؤ" کا نام دیتے تھے) 1922 میں برطانیہ کی کل غیر ظاہر آمدنی کے 16.31 فیصد کے بقدر، 1931 میں 14.77 فیصد کے بقدر، یہاں تک کہ 1936 میں بھی 15.75 فیصد کے بقدر تھی (Lankashire Cotton Trade and British Policy in India -p.257)۔

ہندوستان کے بورژوائی طبقے کے نقطۂ نگاہ سے اگرچہ اس کساد بازاری سے بہت سارے مسائل پیدا ہوئے مگر اس کے ساتھ ہی کم سے کم نوآبادیاتی معاشی روابط کی پرانی شکلوں میں جو تھوڑی بہت ڈھیل دی گئی اس سے زبردست پیش قدمی کے امکانات اور مواقع بھی پیدا ہوئے۔ ہندوستانی ملوں میں کپڑوں کی تیاری 30-1929 میں 2356.5 ملین گز کے مقابلے میں 33-1932 میں بڑھ کر 2982.7 ملین گز اور 39-1938 میں 3905.3 ملین گز ہو گئی تھی جو کہ لنکاشائر کی درآمدات سے کہیں زیادہ تھی؛ حالانکہ جاپان کی طرف سے اب بھی زبردست مقابلہ تھا اور یہ مقابلہ خاص طور پر بمبئی کے لیے ایک چیلنج تھا۔ 1930 کی دہائی میں شکر، سمنٹ اور کاغذ کی صنعتوں کو تیزی کے ساتھ فروغ حاصل ہوا اور ٹاٹا اسٹیل تو اتنا توانا ہو چکا تھا کہ 1934 کے بعد اسے کسی طرح کے تحفظ کی ضرورت ہی نہیں رہی تھی۔ ہندوستانی سرمایہ کاروں کی یہ پیش قدمی محض بمبئی۔ احمد آباد خطے تک ہی محدود نہیں رہی تھی کیونکہ 1930 کی ہی دہائی میں کلکتہ، یوپی، جنوبی ہندوستان (صوبہ مدراس میں کاٹن ملیں 1932 میں 26 اور 1937 میں 47 تھیں)، بڑودہ، میسور اور بھوپال وغیرہ جیسی ریاستوں میں بھی قابل لحاظ پیش قدمی ہوئی۔ لنکاشائر کے بحران نیز سرکاری محصولوں کی شکل میں مارکیٹ کا تحفظ حاصل ہونے سے قطع نظر، ہندوستانی صنعت کو اس بات سے

بھی کافی فائدہ پہونچا کہ صنعتی اشیاء کی قیمتوں کے مقابلے میں زرعی اشیاء کی قیمتوں میں زیادہ تیزی سے گراوٹ آئی تھی جب کہ تجارتی، اور دیہی کساد بازاری (سرد بازار) کی وجہ سے سرمایہ کاری کا رُخ تجارت، سود خوری اور زمین کی خریداری سے ہٹ کر صنعت کاری کی طرف ہو گیا تھا۔

ہندوستان کے سرمایہ کاروں کی اس بڑھتی ہوئی طاقت کے سیاسی اثرات پوری طرح واضح تھے؛ کیونکہ، جیسا کہ آنے والے ابواب میں جائزہ لیا جائے گا، ایک طرف تو رویوں میں علاقائی نوعیت کے اختلافات تھے اور مختصر مدتی نیز طویل مدتی مفادات میں بھی ٹکراؤ ہوتا رہتا تھا۔ فی الحال ہم خود کو اس عام رائے تک ہی محدود رکھنے کی کوشش کریں گے کہ قومی سیاست میں بورژوائی طبقے کے اثرات 1930ء کی پوری دہائی کے دوران مستحکم ہوتے گئے تھے؛ یہاں تک کہ سول نافرمانی، آئینی اصلاحات سے متعلق بحث اور تنازعے اور وزارت سازی جیسے معاملات میں اس گروپ کو گویا فیصلہ کن حیثیت حاصل ہو گئی تھی۔ اردن، ہورے یا بمبئی کے گورنر Sykes جیسے انگریز افسروں کے نجی کاغذات سے ہندوستان کے کاروباری حلقے کے رویے کے تئیں فکر مندی کا پتہ چلتا ہے، جب کہ حال ہی میں پرشوتم داس ٹھاکرداس، ایچ۔ پی۔ مودی، وال چند ہیرا چند اور فیروز سیٹھنا جیسے متعدد سرکردہ تاجروں اور صنعت کاروں کے جو کاغذات حال ہی میں سامنے لائے گئے ہیں اور جنھیں بہت ہی اہم ماخذ کی حیثیت حاصل ہو گئی ہے، ان سے بھی یہی نتیجہ برآمد ہوتا ہے یا اس طرح کی بات کی توثیق ہوتی ہے۔

ایسے حالات میں، جب کہ نوآبادیاتی معاشی غلبہ کمزور پڑتے جانے کے باوجود بھی کافی طاقت ور تھا، کساد بازاری نے پوری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ سرمایہ کاری کی نمو کا مطلب تھا مزدور طبقے پر اور زیادہ بوجھ کا اضافہ! محنت اور پیداوار میں توازن (تعقیل Rationalisation) پیدا کرنے کی بار بار کی کوشش کی وجہ سے محنت کشوں کے کام کے حالات بد سے بدتر ہو چکے تھے۔ 1928-29 میں اور پھر 1934 کے بعد بھی یہ سلسلہ جاری رکھا گیا۔ اجرتوں میں تخفیف کی گئی اور ورکروں کی جبریہ چھٹی کر دی گئی۔ جس کی وجہ سے حالات اور بھی خراب ہو گئے تھے۔ اس طرح ورکر طبقے میں جو بے چینی بڑھتی جارہی تھی وہ 1928-29 میں نقطۂ عروج کو پہونچ گئی۔ (1928 میں 203 ہڑتالیں اور تالابندی ہوئی تھی جس سے 506851 ورکر متاثر ہوئے تھے اور 31،647، 404 کام دنوں کا نقصان ہوا تھا) حکومت کے ظلم و تشدد کے نتیجے میں یہ بے چینی کسی قدر دب گئی (اس سلسلے میں 1929-33 کا میرٹھ مقدمہ قابل ذکر ہے)، ورکروں میں پھوٹ پڑ گئی، لیکن 1930 کی دہائی کے وسط میں ان میں ایک بار پھر زندگی پیدا ہوئی (1937 میں 397 ہڑتالیں اور تالابندیاں ہوئی جن میں 647،801 ورکر شامل ہوئے۔ حوالہ: آر۔ پی۔ دت، انڈیا ٹوڈے، صفحہ 337) جیسا کہ 1919-22 کے تعلق سے پہلے بھی ذکر کیا جا چکا ہے، واقعہ یہ ہے کہ محنت کش طبقے میں شدت

پسندی کے عروج اور قوم پرستی کی تحریک میں اُبال کے درمیان ہمیشہ زمانی فاصلہ رہا، یعنی یہ دونوں باتیں کبھی بھی ایک ساتھ نہیں ہوئیں۔ یہ ایک ایسی بات ہے جو ہمارے ملک کی جدید تاریخ کے لیے بہت اہمیت رکھتی ہے۔

جہاں برطانیہ اور سرمایہ دارانہ عالمی معیشت کے ساتھ تجارتی روابط کمزور پڑ جانے کی وجہ سے دیسی صنعت کاری کو کسی قدر فروغ اور تقویت حاصل ہوئی، وہیں اس سے شدید قسم کی زرعی سرد بازاری سے پیدا ہونے والے عدم توازن کو پورا کرنے میں بھی مدد ملی۔ سیوا سبرامینم کے مطابق 1930 کی دہائی میں فی کس قومی آمدنی میں کمی آگئی تھی اور اس کے ساتھ ہی 1920 کی دہائی سے آبادی میں اضافے کا سلسلہ شروع ہونے کے نتیجے میں مسائل اور بھی سنگین نوعیت اختیار کر گئے تھے۔ 1901 سے 1921 تک کی 20 سال کی مدت میں ملک کی آبادی میں بہت معمولی یعنی تقریباً دو کروڑ کا اضافہ ہوا تھا اور آبادی 28 کروڑ 40 لاکھ سے بڑھ کر 30 کروڑ ساٹھ لاکھ ہو گئی تھی، جب کہ یہی آبادی 1931 میں 33 کروڑ 80 لاکھ اور 1941 میں 38 کروڑ 90 لاکھ ہو گئی تھی، گویا بعد کے دس برسوں میں ملک کی آبادی میں 8 کروڑ کا اضافہ ہوا تھا، معاشی جمود اور وسیع پیمانے پر پھیلی ہوئی غربت کو نو آبادیاتی ہندوستان میں سب سے نمایاں حیثیت حاصل رہی۔ 39-1938 کی قیمتوں کے حساب سے جہاں 17-1916 میں فی کس قومی آمدنی 60.4 روپے رہی تھی۔ یہ آمدنی 1946.47 میں 60.7 روپے تھی۔ یعنی 17-1916 سے 47-1946 تک فی کس قومی آمدنی میں محض اعشاریہ 3 فیصد کے بقدر ہی اضافہ ہوا تھا۔

29-1928: سائمن کا بائیکاٹ اور محنت کش طبقے میں اُبال

سائمن کمیشن اور نہرو رپورٹ

صرف گوروں پر ہی مشتمل سائمن کمیشن کی تشکیل کے اعلان (8 نومبر 1927) سے ہندوستانی سیاست پر دوہرے اور باہم متضاد اثرات مرتب ہوئے۔ سپرو جیسے لبرل سیاست داں اور جناح کی قیادت میں مسلم لیڈر Birkenhead کے اس طنز سے تلملا کر کہ 'ہندوستانی اس کے اہل ہی نہیں ہیں کہ کسی قابل عمل سیاسی لائحہ عمل سے اتفاق کر سکیں' "Dominion" ریاست کا دستور تیار کرنے کی غرض سے کانگریس سے آملے۔ مگر جلد ہی فرقہ وارانہ نوعیت کا اختلاف رائے پیدا ہو گیا اور 1928 کے آخر میں اس طرح نسبتاً اعتدال پسند گروپوں میں جو اتحاد قائم ہوا تھا وہ پارہ

پارہ ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی سائمن کے بائیکاٹ کی تحریک ایسی انقلابی قوتوں کے فروغ کا باعث ہوئی جو مکمل آزادی کے ساتھ ساتھ اشتراکی خطوط پر مختلف قسم کی سماجی اور معاشی تبدیلیوں پر بھی زور دے رہی تھیں۔

1927 کے آخر میں مکمل اتحاد کے آثار پیدا ہونے لگے تھے کیونکہ عملی اعتبار سے تمام پرانے سیاسی گروپ (مدراس میں جسٹس پارٹی اور پنجاب میں یونینسٹ پارٹی کے ماسوا) سائمن کمیشن کے بائیکاٹ کا فیصلہ کر کے دستور اساسی تیار کرنے کی غرض سے ایک آل انڈیا کانفرنس کی تیاریاں شروع کر چکے تھے۔ جناح اس سے کافی پہلے مارچ 1927 میں ہی دہلی کی ایک کانفرنس میں متعدد مسلم لیڈروں کو ایک مصالحتی فارمولہ پر راضی کر چکے تھے۔ اس فارمولے میں. جداگانہ انتخابیہ کے بدلے میں ایک ایسے مشترکہ انتخابیہ کی بات کہی گئی جس میں اقلیتوں کے لیے نشستیں محفوظ ہوں، مسلمانوں کو سینٹرل اسمبلی میں ایک تہائی نمائندگی حاصل ہو نیز بنگال، پنجاب اور تین نئے صوبوں، سرحد، بلوچستان اور سندھ میں آبادی کے تناسب سے نمائندگی حاصل ہو۔ مسلم لیگ کے دسمبر 1927 کے اجلاس میں بھی اس پیش کش کو دوہرایا گیا۔ اس اجلاس نے بھی سائمن کمیشن کے بائیکاٹ کی اپیل کی تھی۔ بہرحال محمد شفیع کی قیادت میں مسلم لیگ کے ایک منحرف گروپ نے اپنا اجلاس لاہور میں منعقد کر کے جداگانہ انتخابیہ کے مطالبے سے، جس پر کہ 1906 سے ہی زور دیا جاتا شروع ہو چکا تھا، دست بردار ہونے سے انکار کر دیا اور سائمن کمیشن کے ساتھ تعاون کرنے کا فیصلہ کیا۔

اگرچہ مئی 1927 میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے جلسے میں اور دسمبر 1927 میں کانگریس کے مدراس اجلاس میں جناح کی پیش کش کو قبول کر لیا گیا تھا، مگر جلد ہی پنجاب اور مہاراشٹر کے ہندو فرقہ پرستوں نے دباؤ ڈال کر کانگریس کو فیصلہ واپس لینے پر مجبور کر دیا جو کہ آگے چل کر تباہ کن ثابت ہوا۔ آل پارٹیز کانفرنس کا جلسہ فروری 1928 دہلی میں اور مئی میں بمبئی میں ہوا جس نے اگست میں لکھنؤ میں نام نہاد نہرو رپورٹ (جس کا مسودہ زیادہ تر موتی لال نہرو اور تیج بہادر سپرو نے تیار کیا تھا) کو آخری شکل دی اور اس طرح فرقہ وارانہ نمائندگی کی بحث میں بری طرح الجھ گئی۔ این۔ سی۔ کلکر کی قیادت میں ہندو مہاسبھا کے جبل پور اجلاس (اپریل 1928) میں جارحانہ قسم کی قرار دادیں پاس کی گئیں جن میں غیر ہندوؤں کو ہندو بنا لینے کے لیے کہا گیا تھا۔ ہندو فرقہ پرستوں نے عام طور پر مسلم اکثریت والے نئے صوبوں کی تشکیل اور پنجاب نیز بنگال میں اکثریتی فرقے کے لیے نشستیں محفوظ کرنے کی تجویز کی سخت مخالفت کی، کیونکہ ان کے خیال میں اس طرح ان دونوں صوبوں کے قانون ساز اداروں پر مسلمانوں کا کنٹرول یقینی ہو جاتا۔ ان ہندو فرقہ پرستوں نے ملک کے وحدانی ڈھانچے پر بھی زور دیا اور اس سلسلے میں جس وضع کی نشان دہی کی تھی اسے

آگے چل کر 31-1930 کی گول میز کانفرنس میں بھی دہرایا گیا۔ نہرو رپورٹ میں مہاسبھا کے لیے متعدد رعایتوں کا ذکر تھا۔ مشترکہ انتخابیہ کے ساتھ ساتھ، بنگال اور پنجاب کے ماسوا، صرف مسلم اقلیت والے دوسرے صوبوں اور مرکز میں نشستیں محفوظ کرنے کی بات بھی کہی گئی تھی۔ یہ بھی کہا گیا تھا کہ سندھ کو بمبئی سے الگ کر دیا جائے گا اور ایک الگ صوبہ بنا دیا جائے گا۔ مگر صرف اسی وقت جب ہندوستان کو ایک ڈومنی ان کا درجہ حاصل ہو جائے گا۔ ملک کا بنیادی ڈھانچہ وحدانی (Unitary) ہوگا اور وہ بھی اس طرح کہ باقی سارے اختیارات مرکز کے پاس ہوں گے۔ جناح نے، جو کہ مشترک انتخابیہ کے معاملے پر پنجابی مسلمانوں کے شفیع۔ فضل حسین گروپ کے ساتھ اپنا سلسلہ منقطع کر چکے تھے اور 1927 کے وعدوں کی خلاف ورزی کے سلسلے میں کانگریس سے جن کی شکایت حق بجانب تھی، کلکتہ میں دسمبر 1928 میں آل پارٹیز کانفرنس کے آخری جلسے میں اتحاد کی سرتوڑ کوشش کی۔ انھوں نے سندھ کی فوراً علاحدگی، صوبوں کے لیے مابقیہ اختیارات، سینٹرل اسمبلی کی ایک تہائی نشستیں مسلمانوں کے لیے محفوظ کرنے اور بالغ حق رائے دہی کے تعین تک بنگال اور پنجاب میں مسلمانوں کے لیے سیٹیں محفوظ کرنے کی اپیل کی اور اپنی تقریر اتحاد کی اس زوردار اپیل کے ساتھ ختم کی کہ "ہم سب اسی دھرتی کے سپوت ہیں، ہم سب کو ایک ساتھ رہنا ہے،..... مجھ پر بھروسہ کیجئے، جب تک ہندو اور مسلمان متحد نہیں ہوں گے، ہندوستان ذرا بھی ترقی نہیں کر سکے گا" (حوالہ Uma Kaura, Muslims and Indain Nationlalism, Delhi-1977 p.45)۔ مہاسبھا لیڈر ایم۔ آر۔ جیاکر نے مصالحت کے سلسلے میں اس طرح کی ساری اپیلوں کو مسترد کر دیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جناح پھر شفیع گروپ سے جا ملے اور مارچ 1929 میں اپنے مشہور "چودہ نکات" پیش کیے۔ ان نکات میں بھی نئے صوبوں کی تشکیل، مرکز میں ایک تہائی سیٹوں اور صوبوں کو مکمل خود مختاری کے ساتھ وفاقی ڈھانچے کے مطالبات کو دوہرایا گیا تھا اور جداگانہ انتخابیہ (Seperate Electorate) کے نعرے کو پھر سے زندہ کر دیا گیا تھا۔

بعد میں جناح نے یہ کہا کہ آل پارٹیز کانفرنس میں جیاکر کے نقطہ نظر کو تسلیم کر لیے جانے کے ساتھ ہی دونوں کے راستے الگ الگ ہو گئے تھے۔ شاید اس میں کسی حد تک مبالغہ معلوم ہوتا ہے: 1927 کی پیش کش کی بنیاد پر اگر سیاست دانوں کے درمیان اتفاق رائے ہو بھی جاتا تو بھی فرقہ وارانہ ٹکراؤ کی سماجی و معاشی جڑوں تک پہونچنے کی کوشش نہیں کی جاتی۔ پانچ صوبوں میں مضبوط مسلم اکثریت کے بدلے میں جداگانہ انتخابیہ کے مطالبے سے دست برداری کے نتیجے میں ہرگز ضروری نہیں تھا کہ مسلمانوں کی جداگانہ سیاسی شناخت کا تصور کمزور پڑ جاتا یا ختم ہو جاتا۔ بہر حال 1928 میں اتحاد کی کوشش ناکام ہو جانے کا ایک نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمان کنارہ کش ہوتے گئے اور

دو سال بعد شروع ہونے والی سول نافرمانی تحریک کے تئیں ان کا رویہ عام طور پر مخالفانہ ہی رہا۔ ہندو فرقہ پرستی کی وجہ سے سامراج کے خلاف قومی تحریک کو ایک نازک موڑ پر سخت دھکا پہونچا تھا۔ ایسا نہ صرف پہلی بار ہوا تھا اور نہ ہی آخری بار! بلکہ اس کے تکرار بار بار ہوتی رہی۔

اس بات سے قطع نظر کہ نہرو رپورٹ فرقہ وارانہ نمائندگی کی مسئلے کو حل کرنے میں ناکام رہی، مگر اسے ایک یادگار دستاویز کی حیثیت حاصل رہے گی، کیونکہ یہ رپورٹ ملک کے لیے ایک ایسا آئینی ڈھانچہ تیار کرنے کی پہلی کوشش تھی جس میں مرکز اور صوبوں کے اختیارات اور بنیادی حقوق کی مکمل وضاحت کی گئی تھی۔ جیسا کہ زیادہ تر اعتدال پسندوں پر مشتمل آل پارٹیز کانفرنس جیسی تنظیم کے لیے یہ ایک بالکل فطری بات تھی، اس رپورٹ میں مرکز اور صوبوں میں جواب دہ حکومتوں کے قیام کا مطالبہ کرنے کے ساتھ ساتھ، مکمل آزادی کی بجائے محض Dominion ریاست کا درجہ دیے جانے کی وکالت کی گئی تھی جس پر کانگریس کا وہ نوجوان انقلاب پسند طبقہ جھنجھلا اٹھا تھا جس کی تعداد برابر بڑھتی جارہی تھی اور جس میں موتی لال کے صاحبزادے جواہر لال نہرو بڑی تیزی سے نمایاں حیثیت حاصل کرتے جارہے تھے۔ بہر حال اس کانفرنس نے تمام مردوں اور عورتوں کے لیے حق رائے دہی کا مطالبہ سامنے رکھا۔ یہ ایک ایسی بات تھی جسے انگریزوں نے 1947 تک بھی کبھی بھی تسلیم نہیں کیا۔ اس سے بعض مبصرین کی اس رائے کی قلعی بھی کھل جاتی ہے کہ تمام ہندوستانی قوم پرست اعلا طبقات سے وابستہ سیاست داں تھے اور انگریز حکمراں عوام کے مفادات کے تحفظ کی کوشش کررہے تھے۔

دستور سازی کے عمل کے دوران یہ سوال اٹھنا بھی فطری تھا کہ مستقبل میں دیسی ریاستوں اور جواڑوں کی کیا حیثیت ہوگی! یہ ایک ایسا معاملہ تھا جس سے کانگریس کافی عرصہ سے کتراتی آرہی تھی۔ منٹو کے زمانے سے انگریزوں کی یہ کوشش چلی آرہی تھی کہ قومی تحریک کے مقابلے پر ان راجوں اور رجواڑوں کے ساتھ ان کا اتحاد مضبوط تر رہنا چاہیے۔ مونٹفورڈ اصلاحات کے تحت فروری 1921 میں ایک صلاح کار ایوان راجگان (Chamber of Prmінces) کی تشکیل کی گئی تھی جو کہ بیکانیر اور پٹیالہ جیسی متوسط درجے کی ریاستوں کے لیے ایک فورم کی حیثیت حاصل کر گیا تھا جب کہ حیدر آباد، میسور، تراونکور، بڑودہ جیسی بڑی اور اہم ریاستوں نے خود کو اس ایوان راجگان سے الگ رکھا تھا اور انگریز حکمرانوں کے ساتھ بلاواسطہ رابطے کو ہی ترجیح دی تھی۔ 1922 کے شروع میں عدم تعاون کی تحریک کے شباب کے زمانے میں اس ایوان راجگان نے خطرے کی بو سونگھتے ہوئے، کل ہند سطح پر اقتدار کی جمہوری منتقلی کے امکان کے مد نظر انگریزوں سے مرکز کی بالادستی میں کمی کی اپیل بھی کی تھی کہ بعد میں اُن کے ساتھ "آیرلینڈ کے وفاداروں" جیسا سلوک نہ ہو" "آیرلینڈ کے وفاداروں جیسے سلوک" سے بچنے کی بات بیکانیر کے مہاراجہ نے

وائسرائے ریڈنگ سے بھی کہی تھی۔1920 کی دہائی کے وسط میں انگریزوں نے راجگان کو مطمئن کرنے کی کوئی ضرورت محسوس نہیں کی کیونکہ اس وقت کانگریس کی تحریک کسی قدر کمزور پڑگئی تھی اور ریڈنگ نے برار کو ریاست حیدر آباد میں پھر سے ضم کرنے کے معاملے کے تصفیے کے لیے ایک آزاد ٹریبونل کی تشکیل کے مطالبے کو مسترد کر کے 1926 میں نظام کو ایک زبردست جھٹکا دیا تھا۔ ریڈنگ کا یہ کہنا تھا کہ مرکز کی یہ بالادستی خصوصی قسم کے معاہدوں پر ہی مبنی نہیں ہے بلکہ ان معاہدوں سے ماوراء بھی ہے اور انگریزوں کو ریاستوں کے اندرونی معاملات میں بھی مداخلت کا حق ہے کیونکہ پورے ملک کی سلامتی کے لیے آخر کار وہی ذمہ دار اور جواب دہ ہیں۔ 28-1927 میں قومی تحریک میں پھر سے شدت آجانے پر انگریزوں کو ایک بار پھر یہ محسوس ہونے لگا تھا کہ راجگان کو مطمئن کرنا اور مرکزی بالادستی میں کمی کے مطالبے پر توجہ دینا ضروری ہو گیا ہے۔ اگرچہ نہرو رپورٹ میں ریاستوں میں فوری تبدیلی کے بارے میں کچھ نہیں کہا گیا تھا مگر مرکز کی بالادستی کو بنیادی طور پر ایک وحدانی جمہوری مرکز میں تبدیل کرنے کا تصور یقیناً پیش کیا گیا تھا اور کانگریس کے ساتھ ہمدردی رکھنے والے سیاست دانوں نے دسمبر 1927 میں بمبئی میں جو آل انڈیا اسٹیٹس پیوپلز کانفرنس بلائی تھی اس نے جواب دہ حکومت کے دائرے میں دیسی ریاستوں کو بھی شامل کرنے کی سفارش کی تھی۔ اروِن نے ریڈنگ کی پالیسی میں ترمیم کر کے بالادستی کے سوال کا جائزہ لینے کے لیے اسی ماہ (دسمبر 1927) ہرکورٹ بٹلر کی سرکردگی میں ایک کمیٹی قائم کر دی تھی (ہرکورٹ بٹلر یوپی میں تعلقہ داروں کے تئیں نرم گوشہ رکھنے کے لیے بدنامی کی حد تک مشہور تھے) بٹلر رپورٹ (مارچ 1929) میں پھر اسی بات پر زور دیا گیا کہ "بالادستی ہر حال میں بالادست رہنی چاہیے۔" مگر ساتھ میں یہ بھی کہا گیا تھا کہ یہ ایک ایسی بالادستی ہے جو کہ تاج برطانیہ سے آئندہ کے ڈومنی ان کا درجہ رکھنے والے خود اختیار (Self govrerming) مرکز کو منتقل نہیں کی جا سکتی، یعنی یہ کہ اس بالادستی کا استعمال گورنر جنرل کی بجائے خود وائسرائے کو ہی کرنا چاہیے؛ ظاہر ہے کہ اس طرح دیسی ریاستوں کو کانگریس کی بالادستی والی امکانی مرکزی حکومت سے دور رکھنے کی کوشش کی گئی تھی جو کہ ملک کے اتحاد کے لیے واضح بدشگونی تھی۔

نہرو رپورٹ تیار کرنے والوں کی بنیادی قدامت پرستی کا پتہ اس بات سے بھی چلتا ہے کہ انھوں نے اگست 1928 میں مالویہ کی پیش کردہ اس ترمیم کو قبول کر لیا تھا جس کے ذریعے "نجی اور ذاتی جائیدادوں کے استحقاق" کی ضمانت دی گئی تھی۔ اس پر آل پارٹیز کانفرنس کے کلکتہ اجلاس میں سخت تنقید کی گئی اور دلچسپ بات تو یہ ہے کہ اس فیصلے کو نشانہ بنانے والوں میں یوپی کسان سبھا کے ممبر بابا رام چندر اور بنگال کے دو مندوب، نریش سین گپتا اور جے۔ این۔ بنرجی بھی شامل تھے۔ آخر الذکر دونوں لیڈروں کا یہ کہنا تھا کہ "..... نئی ریاست بنگال کے ..... لازمی فرائض میں سے

ایک یہ ہوگا...... کہ دوامی بندوبست کو ختم کردینا ہوگا" بہر حال مالویہ اپنی بات منوانے میں کامیاب ہو گئے(حوالہ: Indian Annul Register 1928)۔

بہر حال سائمن کمیشن کے سلسلے میں ہندوستانیوں کا رد عمل محض آئینی بحث ومباحثے تک ہی محدود نہیں رہا تھا۔ "سائمن واپس جاؤ" کے نعروں، کالے جھنڈوں، جھنڈیوں، ہڑتالوں اور مظاہروں کا سلسلہ ایک شہر سے دوسرے شہر تک پھیلتا چلا گیا تھا۔ سائمن کمیشن جس شہر میں بھی پہونچا وہاں اس کے خلاف زبردست مظاہرہ ہوا اور اس طرح 1928 میں ایک بار پھر انگریزی سامان کے بائیکاٹ کی تحریک شروع ہو گئی۔ سائمن مخالف تحریک میں 3 فروری کی ملک گیر ہڑتال، اور 19 فروری کو کلکتہ کے زبردست مظاہرے کو نمایاں حیثیت حاصل رہی۔ 19 فروری کو ہی یعنی سائمن کمیشن کے کلکتہ پہونچنے کے دن، شہر کے سارے 32 وارڈوں میں جلسے ہوئے جن میں انگریزی سامان کے بائیکاٹ کا اعلان کیا گیا، 30 اکتوبر کو لاہور میں پولس کے ساتھ زبردست ٹکراؤ ہوا تھا جس میں لالہ لاجپت رائے زخمی ہو گئے تھے (اور جو 17 فروری کو زخموں کی تاب نہ لاکر فوت ہو گئے تھے)، اور 30-28 نومبر کو لکھنؤ میں زبردست عوامی مظاہر ہوا جس میں خلیق الزماں نے ایسی پتنگیں اور غبارے اڑائے تھے جن پر "سائمن واپس جاؤ" لکھا ہوا تھا۔ یہ مظاہرہ ایک تعلقہ دار کی طرف سے قیصر باغ میں سائمن کمیشن کے اعزاز میں دیئے جانے والے استقبالیہ کے موقع پر ہوا تھا۔ اس مظاہرے کے دوران پولس نے پنڈت جواہر لال نہرو اور گووند ولبھ پنت کی خاصی پٹائی کی تھی۔

نوجوانوں کی تحریکیں

ان مظاہروں میں متوسط طبقے کے طلباء اور نوجوان پیش پیش تھے۔ 1928 اور 1929 میں طلباء کی کانفرنس کی بھرمار رہی اور ان کانفرنسوں میں مکمل آزادی نیز سماجی اور معاشی میدانوں میں انقلابی تبدیلیوں کے نعرے بلند کیے جاتے رہے۔ نوجوان طبقے کی اس بے چینی میں کہیں نہ کہیں تعلیم یافتہ بے روزگاری کا عنصر بھی شامل تھا۔ دوہری حکومت کے تحت تعلیم کا شعبہ منتخبہ وزیروں کے کنٹرول میں آجانے کے نتیجے میں طلباء کی تعداد میں اضافہ (سائمن کمیشن کی رپورٹ کے مطابق کل آبادی کے لحاظ سے طلباء کو جو تناسب 1922 میں 5.04 فی صد تھا وہ 1927 میں بڑھ کر 6.91 فیصد ہو گیا تھا) ہوا تھا جب کہ روزگار کے مواقع میں نسبتاً بہت کم بہتری آئی تھی۔ 1929 میں FICCI نیز برلا کے کنٹرول والے ہندوستانی ایوان تجارت یعنی دونوں نے ہی اس سلسلے میں تشویش ظاہر کی تھی۔ کانگریس نے ہندوستانی سیوادل کے ذریعے نوجوانوں کو متحد کرنے کی کوشش کی۔ اس سیوادل کو 1920 کی دہائی میں کرناٹک میں این۔ ایس۔ ہارڈیکر نے شروع کیا تھا۔ 1928 اور 1929 کے دوران جواہر لال نہرو اور سبھاش بوس ملک کے مختلف حصوں میں یوتھ

کانفرنسوں سے خطاب کرتے رہے تھے۔ مثال کے طور پر دسمبر 1928 میں کلکتہ میں جواہر لال نہرو نے اس سوشلسٹ یوتھ کانگریس کی صدارت کی تھی جس نے آزادی کا نعرہ اشتراکی سماج کی تشکیل کی اولین شرط کے طور پر بلند کیا تھا جب کہ سبھاش نے بھی ایک دوسری یوتھ کانگریس سے خطاب کیا تھا مگر کسی قدر مبہم طریقے پر! انھوں نے اپنے خطاب میں جرمنی، اٹلی، روس اور چین کی نوجوان تحریکوں کی ستائش کی تھی۔ بہر حال کانگریس کے بائیں مکتب فکر سے تعلق رکھنے والے ان دونوں ابھرتے ستاروں کے باہمی تعلقات ذاتی مقابلہ آرائی اور باہمی حسد سے پہلے ہی متاثر ہو چکے تھے۔

اس سے ایک سال قبل مدراس میں جواہر لال کو ری پبلکن کانگریس کا صدر بنایا جا چکا تھا جس نے مکمل آزادی اور سامراج کے خلاف لیگ کے ساتھ روابط قائم کرنے کا مطالبہ کیا تھا اور الوری سیتارا ما راجو نیز امریکہ کے اطالوی شہید مزدوروں Sacco اور Vanzetti کو خراج تحسین پیش کرنے کے لیے قرار داد پاس کی تھی۔ کانگریس کے مدراس اجلاس (دسمبر 1927) میں ہی جس میں کہ گاندھی نے شرکت نہیں کی تھی، نہرو جلد بازی کے ساتھ ایسی قرار داد پاس کرانے میں کامیاب ہو گئے جس میں مکمل آزادی کی حمایت کی گئی تھی البتہ مندوبین نے اس قرار داد کی ان ضمنی شقوں کو مسترد کر دیا تھا جن کے ذریعے "مکمل" اور "فوراً" کی تشریح کی گئی تھی۔ انگریزوں کی واپسی؛ اور غیر واضح سوراج پر کانگریس کا ایقان بدستور برقرار رہا۔ گاندھی نے جواہر لال نہرو کو نجی طور پر بڑی سختی کے ساتھ خبردار کیا تھا کہ ان کی رفتار بہت زیادہ تیز ہے اور جیسا کہ بعد کے واقعات سے بھی ظاہر ہوتا گیا، نہرو نے بھی مکمل خلاف ورزی نہیں کی۔ نہرو نے گاندھی کے نام اپنے 23 جنوری 1928 کے مکتوب میں لکھا تھا کہ "اگرچہ میں ایک ضدی اور خطاکار بچہ ہو سکتا ہوں مگر سیاست میں آپ کا بچہ ہرگز نہیں ہوں۔" جب، نہرو رپورٹ میں Dominion درجے کے حق میں فیصلہ کر لیا گیا تو جواہر لال اور سبھاش نے "مکمل آزادی" کے حق میں کانگریس کے اندر ایک دباؤ گروپ پیدا کرنے کی غرض سے آزادیٔ ہند لیگ قائم کر لی تھی۔ اس لیگ کی یوپی شاخ نے اپریل 1929 میں "مکمل آزادی" کے ساتھ ساتھ ایک "ایسی سوشلسٹ اور جمہوری ریاست" کے نصب العین کو بھی اپنے ایجنڈے میں شامل کر لیا تھا "جس میں ہر شخص کو ترقی کے بھرپور مواقع حاصل ہوں"۔ اور پیداوار اور تقسیم کے نظام پر ریاست کا کنٹرول ہو" ایک دوسری وضع یہ بھی سامنے آئی کہ کانگریس کی اشتراکی نظریہ پر مبنی یہ انقلاب پسندی کبھی بھی عملی پیرایہ اظہار حاصل نہیں کر سکی۔ جولائی 1929 میں جواہر لال نے گاندھی سے اعتراف کیا تھا کہ آزادی ہند لیگ بری طرح ناکام ثابت ہوئی تھی......

میرے پاس گروپ یا پارٹیاں بنانے کے لیے سیاست دانوں والی خوبی نہیں ہے۔"

(حوالہ: Selected Works)۔

ہندوستان سوشلسٹ ری پبلکن آرمی

شہری علاقے کے تعلیم یافتہ نوجوانوں کا ایک بڑا حلقہ اس طرح کی زیادہ تر محض زبانی انقلاب پسندی سے اکتا چکا تھا اور ایک بار پھر انقلابی دہشت پسندی کے راستے پر چلنے کی طرف راغب ہو چکا تھا۔ خود بنگال میں انوشیلن اور یگانتر تحریکوں سے وابستہ رہے بزرگان (دادا) نے خاموشی کے ساتھ تیاری کرنے کا مشورہ دیا، کسی فوری اقدام کی حوصلہ شکنی کی اور اس اثناء میں خود کانگریس کی اندرونی چپقلش میں الجھے رہے۔ بوس کی رہائی کے فوراً بعد ہی 1928 میں جو زوردار جنگ شروع ہو گئی تھی اس میں یوگانتر گروپ نے بوس کی حمایت کی اور انوشیلن گروپ نے سین گپتا کی حمایت کی۔ اپنے بزرگوں کی مرضی کے برخلاف نوعمروں کے "انقلابی گروپ" سامنے آگئے۔ ان گروپوں میں سے ایک کا دسمبر 1929 میں مچھوا بازار سازش مقدمے میں قلع قمع ہو گیا تھا۔ مگر ان میں سب سے نمایاں گروپ نے جس کی کمان چٹاگانگ کے سوریہ سین کے ہاتھ میں تھی، کسی واقعی ڈرامائی کارروائی کے لیے اپنی تیاریاں مسلسل جاری رکھی تھیں۔ بنگال میں انقلابی دہشت پسندی کی روایت بہت مضبوط ہونے کی وجہ سے وسیع تر سماجی مقاصد یا طریقہ کار پر نظر ثانی یا ازسر نو غور کرنے کی نوبت نہیں آسکی۔ مچھوا بازار گروپ کی طرف سے اس سلسلے میں Youths of Bengal کے عنوان سے جو کتابچہ شائع کیا گیا تھا اس میں بھی "مٹھی بھر لوگوں کے دلیرانہ ایثار و قربانی پر زور دیا گیا تھا" اور یہ بھی کہا گیا تھا کہ "اگر خون کے پیاسے انگریزوں کے ظلم و ستم کے مقابلے میں آپ تنہا بھی کھڑے پائے جائیں تو یہ بڑے فخر اور ناز کی بات ہو گی۔ اس طرح محض ایثار و قربانی پر ہی زور دیا گیا تھا کسی طرح کے سماجی پروگرام کا کوئی ذکر ہی نہیں تھا۔

بہر حال اس صورت حال کے قطعی برعکس، نئے تصورات کے تئیں ذہنی کشادگی کی ایک قابل ذکر اور نمایاں جھلک ہندوستان سوشلسٹ ری پبلکن آرمی کے بعض لیڈروں نے پیش کی۔ یہ آرمی دہلی کے فیروز شاہ کوٹلہ کے ایک انتہائی رومانوی ماحول میں بھگت سنگھ اور ان کے پنجاب گروپ کے ساتھیوں، سچن سانیال کے بھائی جتندر ناتھ، یوپی کے اجے۔ گھوش اور بہار کے پھنندر ناتھ گھوش نے ستمبر 1928 میں قایم کی تھی۔ بھگت سنگھ خاص طور پر مارکسی سوشلزم کے تئیں بڑی پختگی کے ساتھ عہد بستہ تھے اور سابقہ دہشت پسندوں کی سخت ہندو مذہبیت کے رد عمل کی وجہ سے ان کا رجحان تشدد پسندانہ لادینیت کی طرف ہو گیا تھا۔ اس آرمی کی کارروائیوں میں، لاجپت رائے کے ساتھ مارپیٹ کے انتقام میں دسمبر 1928 میں لاہور میں Saunders کا قتل، 8 اپریل 1929 کو بھگت سنگھ اور بٹوکیسور دت کے ذریعے اسمبلی ہال میں بم پھینکا جانا، دسمبر 1929 میں دہلی کے قریب ارون کی ٹرین کو بم سے اڑا دینے کی کوشش نیز یوپی اور پنجاب کے شہروں اور قصبوں

میں دوسری دہشت پسندانہ کارروائیاں (اس سال صرف پنجاب ۔ میں ہی اس طرح کی 20 کارروائیاں ریکارڈ کی گئیں تھیں) شامل ہیں۔ اگرچہ بظاہر یہ سب ایک طرح سے دہشت پسندانہ کارروائیاں ہی معلوم ہوتی ہیں مگر واقعہ یہ بھی ہے کہ ہندوستان سوشلسٹ ری پبلیکن آرمی، نیز اس آرمی کے زیر اثر تنظیم "نوجوان بھارت سبھا" کا ایجنڈا اس سے کہیں زیادہ وسیع تھا۔ جیسا کہ بعد میں بھگت سنگھ نے اپنے خلاف مقدمے کی سماعت کے دوران بھی وضاحت کی تھی، انقلاب کا مطلب ان کے نزدیک "محض بم اور پستول کا استعمال" ہی نہیں تھا بلکہ انقلاب کا مفہوم ایک ایسی مکمل سماجی تبدیلی کا تھا جس میں ملکی اور غیر ملکی، دونوں ہی طرح کے سرمایہ دارانہ نظام کو ختم کیا جا سکے اور پرولتاری طبقے کی ڈکٹیٹر شپ قائم کی جا سکے"۔ انقلاب نسل انسانی کا نا قابل تنسیخ حق ہے۔ آزادی تمام انسانوں کا ایسا پیدائشی حق ہے جسے کسی بھی قانون کے ذریعے ساقط نہیں کیا کیا جا سکتا۔ محنت کش طبقے کی بدولت ہی سماج کی بقاء ہے...... اب ہمارے نوجوان انقلاب کی اس قربانگاہ پر بھینٹ چڑھنے کے لیے بے تاب ہیں کیونکہ ایسے عظیم الشان نصب العین کے لیے بڑی سے بڑی قربانی بھی کم ہے۔ ہم قناعت پسند ہیں۔ ہمیں انقلاب کی آمد کا انتظار ہے۔ انقلاب زندہ باد "۔ اسمبلی ہال پر بم محض علامتی طور پر پھینکے گئے تھے اور اس کے لیے مزدور دشمن "تجارتی تنازعات بل" پر بحث کے موقع کو چنا گیا تھا اور یہ بات کافی اہمیت رکھتی ہے۔ اس 23 سالہ نوجوان نے Saunders کے قتل کی پاداش میں سزائے موت کا انتظار کرتے ہوئے باقاعدہ طور پر مارکسزم کا مطالعہ شروع کر دیا تھا اور "میں لامذہب کیوں ہوں!" کے عنوان سے ایک شاندار مضمون بھی تحریر کیا تھا جس میں انسانی عزت و وقار اور قوم پرستانہ بنیادوں پر دنیا کے تمام مذاہب کو مسترد کر دیئے جانے کی وکالت کی گئی تھی۔ بھگت سنگھ کے ایک قریب ترین ساتھی اجے گھوش ایک دن کیمونسٹ پارٹی آف انڈیا کے جنرل سکریٹری بن گئے تھے۔

ہندوستان سوشلسٹ ری پبلکن آرمی کے بہادروں (سورماؤں) اور شہیدوں کو زبردست عوامی مقبولیت حاصل رہی تھی۔ سیاسی قیدیوں کی حالت میں بہتری کے سوال پر جب بھوک ہڑتال کے 64ویں دن ستمبر 1929 میں جتن داس کا جیل میں انتقال ہو گیا تھا تو کلکتہ میں ان کی ارتھی میں دو میل لمبے جلوس نے حصہ لیا تھا۔ بعد میں جواہر لال نہرو نے خود نوشت میں پنجاب اور پورے شمالی ہندوستان میں بھگت سنگھ کی "مقبولیت اچانک اور حیرت ناک طریقے پر بڑھ جانے" کا تذکرہ کیا ہے اور انٹلی جنس بیورو کی ایک خفیہ رپورٹ (Terrorism in India. 1917-1936) میں تو یہاں تک کہا گیا ہے کہ "ایک وقت تو یہ خطرہ بھی پیدا ہو گیا تھا کہ وہ کہیں گاندھی کی اس وقت کی سب سے بڑی سیاسی شخصیت والی حیثیت کو ہی ختم نہ کر دیں"۔

محنت کش طبقے میں ہلچل اور کمیونسٹ رہنما

بھگت سنگھ کے اندر رونما ہونے والی اس زبردست مارکسی تبدیلی کو 29-1928 کی سب سے نمایاں خصوصیت، یعنی مزدور طبقے میں زبردست ہلچل، خاص طور پر ریلوے، سوتی کپڑا ملوں اور جوٹ صنعت سے وابستہ مزدور طبقے میں ہونے والی ہلچل، کے تناظر میں دیکھنے کی ضرورت ہے۔ یہی وہ زمانہ ہے جب ٹریڈ یونینوں میں کمیونسٹوں کے اثرات بھی بڑھ رہے تھے۔

بنگال میں، کھڑگ پور کی 1927 کی ہڑتالوں کے بعد، دو کمیونسٹ لیڈروں گوپن چکر برتی اور دھرنی گوسوامی نیز کرن مترا اور سب ناتھ بنرجی کی لیڈری میں للواہ ریل ورکشاپ کی طویل اور تلخ جدو جہد (جنوری۔ جولائی 1928) کا سلسلہ شروع ہوا۔ اس جدو جہد کے دوران بامن گاچی میں فائرنگ (28 مارچ) ہوئی نیز کلکتہ کے صنعتی مضافاتی علاقوں میں ورکروں کے بڑے بڑے جلوس نکالے گئے۔ کمیونسٹوں کے غلبے والی" ورکرز اینڈ پیزنٹس پارٹی، کے کارکنوں نے 1928 کے دوران کلکتہ کارپوریشن کی متعدد ہڑتالوں کے ساتھ ساتھ چینگیل اور بوڑیا کی جوٹ ملوں کی ہڑتالوں میں بھی نمایاں رول ادا کیا تھا۔ ان ہڑتالوں میں پربھا جاتی داس گپتا جیسے آزاد لیبر لیڈر نیز کمیونسٹوں کے لیے نرم گوشہ رکھنے والے، بنکم مکرجی اور رادھا رمن مترا جیسے کانگریسوں نے بھی اہم رول ادا کیا تھا۔ مزدور تحریک کے لیے دوسرے علاقوں کے مقابلے میں بنگال میں قوم پرستوں کی تائید زیادہ آسانی سے حاصل ہو سکی اور اس کی وجہ یہ تھی کہ بنگال میں بیشتر آجرین یا تو انگریز تھے یا غیر بنگالی ہندوستانی! بہر حال یہ بھی واقعہ ہے کہ مزدور تحریک میں بنگال کے اعلا کانگریسی لیڈران بہت کم اور کافی درمیانی وقفے سے حصہ لیتے آرہے تھے۔ مثال کے طور پر بوڑیا کے ہڑتالیوں کی مدد کی غرض سے رقم کی درخواست جواہر لال نہرو کے وسیلے سے سبھاش بوس تک پہونچائی گئی تھی (نہرو بنام سبھاش، 24 جنوری 1929)۔

دسمبر 1928 میں کلکتہ کے محنت کش طبقے نے سیاسی سرگرمیوں میں اپنی شمولیت کا زبردست مظاہرہ کیا اور ورکرز اینڈ پیزنٹس پارٹی کے جھنڈے تلے، کانگریس کے اجلاس پر دھاوا بول کر پنڈال پر متعدد گھنٹے اپنا قبضہ رکھا اور مکمل سوراج (پورن سوراج) کے لیے قرار دادیں پاس کیں۔ کانگریس کے منتظمین نے ان تمام باتوں کو قطعی پسند نہیں کیا اور کہا جاتا ہے کہ رضاکاروں کے انچارج سبھاش بوس تو اس سلسلے میں پولس بھی بلالینا چاہتے تھے۔ بہر حال کسی نہ کسی طرح ٹکراؤ کو ٹال دیا گیا تھا۔

سبھاش بوس نے جمشید پور کی مزدور تحریک میں زیادہ دلچسپی لی جہاں ورکر طبقہ سی۔ ایف۔ آندریوز کی جمشید پور لیبر ایسوسی ایشن کی اعتدال پسندانہ قیادت سے نا مطمئن تھا اور 1928 کے

دوران متعدد بار جزوی طور پر ہڑتالیں کر چکا تھا۔ اس صورت حال سے ایک موقع پرست قسم کے مقامی وکیل نے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی جسے ٹاٹا گھرانے سے بغض تھا۔ اس شخص کا نام مانک ہومی (Manik Homy) تھا۔ یہ کوشش سبھاش نے بھی کی۔ اس طرح رقابت کا جو سلسلہ شروع ہوا اس کا نتیجہ جمشید پور میں مزدور تحریک کی شکست کی شکل میں سامنے آیا۔ ہندوستانیوں کی ملکیت والے کاروبار سے متعلق محنت تحریکوں میں قوم پرست لیڈروں کی کم دلچسپی کا انکشاف پرشوتم داس ٹھاکر داس کے نام برلا کے ایک دلچسپ مکتوب (16 جولائی 1929) سے بھی ہوتا ہے جس میں سبھاش کے ساتھ برلا کی ایک گفتگو کا حوالہ دیا گیا ہے۔ برلا کے الفاظ میں "سبھاش کے ساتھ ٹھیک طریقے پر برتاؤ نہیں ہوا" اور یہ کہ "مگر میں اب بھی یہ یقین دلا سکتا ہوں کہ ٹاٹا آئرن اینڈ اسٹیل ورکس کی مدد کے سلسلے میں بوس پر اب بھی بھروسہ کیا جاسکتا ہے، بشرطیکہ انھیں ٹھیک طریقے پر ہینڈل کیا جائے" "ہمیں ان لوگوں کے ساتھ پیش آتے وقت ان کی نفسیات کو سامنے رکھنا چاہیے۔"

جولائی 1928 میں، ساؤتھ انڈین ریلوے میں ایک مختصر سی مگر بہت ہی زبردست ہڑتال ہوئی۔ جسے حکومت نے بری سختی سے کچل دیا تھا۔ اس ہڑتال کے لیڈر مکند لال سرکار کو قید کی سزا سنائی گئی اور ایک ملٹننٹ ورکر پیرو مل کو کالے پانی کی سزا ہوئی تھی۔ بہر حال سب سے مشہور ہڑتال بمبئی کے کپڑا مل مزدوروں کی تھی جو اپریل سے اکتوبر 1928 تک جاری رہی تھی۔ 1920 کی دہائی کے اواخر کے سارے عرصے میں مل مالکان کی ساری کوشش یہ رہی تھی کہ لنکا شائر اور جاپان کی کپڑا صنعت کے مقابلے میں ہندوستانی کپڑا کو محصولاتی تحفظ فراہم نہ کرنے کے نتیجے میں صنعت پر پڑنے والے بوجھ کو ورکروں پر ڈال دیا جائے۔ اس کے علاوہ مل مالکان نے معقولیت کاری کے نام پر ورکروں کی اجرت میں کٹوتی بھی کی تھی جس پر 1928 میں اسٹرائک ہوئی۔ اسٹرائک کے دوران کمیونسٹوں کے زیر اثر ایک مشہور تنظیم۔ گرنی کامگار یونین، جڑ پکڑتی گئی جو آخر کار این۔ ایم جوشی کی اعتدال پسند تنظیم ٹیکسٹائل لیبر یونین کی انقلاب پسندانہ متبادل کی شکل اختیار کر گئی۔ اس یونین کی جڑیں عام محنت کشوں (ورکروں) میں پھیلی ہوئی تھیں۔ اس یونین کے لیڈروں اے۔ اے الوے، اور جی۔ آر۔ کاسلے کے رابطے بمبئی کے کمیونسٹ لیڈروں، جوگلیکر، میراج کر، اور ڈانگے وغیرہ کے ساتھ 27-1926 سے ہی قائم ہو چکے تھے۔ اپنے عروج کے زمانے میں گرنی کامگار یونین (GKU) کی طاقت کا اصل سرچشمہ وہ گرنی سمیتیاں (کمیٹیاں) تھیں جن کا باقاعدہ انتخاب ہوتا تھا۔ اپریل 1929 میں اس طرح کی تقریباً 42 سمیتیاں سرگرم تھیں۔ اس یونین کے ذریعے 1928 میں کرائی گئی ہڑتال بہت بڑے پیمانے پر، کافی کامیاب پُرامن رہی تھی۔ بمبئی کے گورنر نے سکریٹری آف اسٹیٹ کے نام 16 اگست کے مکتوب میں اس حقیقت کا اعتراف کرتے ہوئے یہ بھی لکھا تھا" یہ لوگ اپنی یہ ہڑتال جس ثابت قدمی کے ساتھ چلا رہے ہیں وہ ایک حیرت

ناک بات ہے۔ میں اس بات سے مسلسل پریشان ہوں کہ اگرچہ مِل مالکان نے اپنی ملوں کے کچھ حصے بار بار کھولے اور خاطر خواہ پولس تحفظ بھی فراہم کیا گیا مگر ایک بھی ورکر کام پر نہیں لوٹا"۔ 1927 کی اجرتوں پر مِل مالکان کے راضی ہو جانے پر ہی یہ ہڑتال ختم ہو سکی تھی۔ عروج کے زمانے میں گرنی کامگار یونین کے ممبروں کی تعداد تقریباً 60,000 تھی جب کہ اس کی حریف این۔ ایم جوشی کی یونین کے ممبروں کی تعداد محض 8900 تھی اور احمد آباد کی جی جمائی گاندھیائی ٹکسٹائل لیبر ایسوسی ایشن کے ممبروں کی تعداد 27,000 تھی۔ 1928 کے آخر میں بمبئی میں اور خاص طور پر جی۔ آئی۔ پی۔ ریلوے ورکروں اور تیل ڈپوؤں کے ملازمین میں کیمونسٹوں کے اثرات پھیلنے شروع ہو گئے تھے۔

یہ ایک ایسی صورت حال تھی جس پر سرمایہ داروں اور حکومت کی طرف سے شدید رد عمل لازمی تھا۔ بمبئی میں ہڑتالوں کو توڑوانے کے لیئے پٹھانوں سے کام لیا جاتا تھا جس پر فروری 1929 میں بھیانک قسم کے فرقہ وارانہ فسادات پھوٹ پڑے تھے۔ غیر براہمن وزیر بھاسکر راؤ جادو نے زیادہ تر نچلی ذاتوں پر مشتمل مزدور طبقے کے براہمن مخالف جذبات بھڑکانے کی کوشش کی (واضح رہے کہ زیادہ تر کیمونسٹ لیڈر براہمن تھے)، اور کالسلے کو اپنا ہم نوا بنانے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ یہ افواہ بھی تھی کہ اس پروپیگنڈے کے لیے درکار رقم کا ایک حصہ ہومی مودی نے فراہم کیا تھا جو کہ بمبئی مل مالکان ایسوسی ایشن کے سربراہ تھے۔ 29-1928 کے دوران بنگال کے گورنر جیکسن اور بمبئی کے گورنروں ولسن اور اسکائز کی خط و کتابت میں خطرے کے احساس کا صاف اشارہ ملتا ہے اور ہندوستانی ورکروں کے مقابلے میں دیسی سرمایہ داروں کی تائید اور مدد کی خواہش کی جھلک بھی ملتی ہے۔ لیکن اس طرح کی خواہش ہندوستانی صنعت کاروں کو محصولاتی تحفظ فراہم کرنے یا پونڈ کے مقابلے میں روپے کی کم شرح تبادلے کو درست کرنے کے معاملے میں قطعی ناپید تھی۔ مثال کے طور پر ولسن نے 22 اگست 1928 کو اِرون کو یہ اطلاع دی تھی کہ "وہ ان میں سے (مل مالکان) ہر ایک سے ذاتی طور پر ملاقاتیں کر کے انھیں خطرات سے آگاہ کرتا آ رہا ہے......" حکومت نے ایک ایسے عوامی سلامتی ایکٹ پر زور دیا جس کے تحت حاصل ہونے والے اختیارات کے تحت وہ برطانوی کیمونسٹوں فلپ اسپریٹ اور بن بریڈلے کو ملک بدر کر سکے جو کہ بنگال اور بمبئی کے ورکروں کو منظم کر رہے تھے۔ اپریل 1929 کے تجارتی تنازعات ایکٹ کے ذریعے ٹریبونل کے نظام کو لاگو کر کے، تجارتی تنازعات کے ماسوا کسی دوسرے معاملے یا حکومت پر دباؤ ڈالنے یا ورکر برادری کی مشکلات میں اضافے کی غرض سے ہڑتال کرنے پر پابندی لگانے کی کوشش کی گئی۔ اگرچہ کانگریس نے سرکاری طور پر ان دونوں بلوں کی مخالفت کی مگر "انڈین کوارٹرلی رجسٹر" میں یہ نوٹ بھی ملتا ہے کہ " عوامی سلامتی بل پر بحث کے موقع پر کانگریسی ممبران خلاف معمول

طریقے پر بڑی تعداد میں غیر حاضر رہے تھے"۔ حکومت کا اصل مقصد 20 مارچ کو ان 31 لیڈروں کی پکڑ دھکڑ کرنے کا تھا جن میں تقریباً سبھی کیونسٹ تھے۔ ان میں بمبئی کے ڈانگے، میراج کر، گھاٹے، جوگ لیکر، ادھیکاری، نمب کر۔ الوے، اور کاٹلے، کلکتہ کے مظفر احمد، کشوری لال گھوس، دھرنی گوسوای، گوپن چکر برتی، رادھا رمن مترا، گوپال باسک، اور سب ناتھ بنرجی، پنجاب کے سوہن سنگھ جوش، یوپی کے پی۔ سی۔ جوشی اور وشوا ناتھ مکھرجی کے ساتھ ساتھ تین انگریز بڑیڈلے، اسپریٹ اور ہچن سن شامل تھے۔ ان لوگوں پر سازش کا مقدمہ میرٹھ میں چلایا جانا تھا کیونکہ انگریز یہ معاملہ جیوری کو سونپ کر کسی طرح کا خطرہ مول لینا نہیں چاہتے تھے" اس بات کا اعتراف خود ہوم ممبر ایچ۔ جی۔ ہیگ نے اپنے 20 فروری کے ایک خفیہ نوٹ میں بھی کیا تھا۔ بہر حال آخر میں اس مقدمے کے کئی منفی اثرات سامنے آئے، کیونکہ کیونسٹوں نے اس موقع سے پورا فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنی صفائی کی تقریروں میں اپنے نظریات کی جم کر تبلیغ کی۔ لیکن چونکہ یہ مقدمہ پورے چار سال تک چلتا رہا تھا اور جنوری 1933 میں ان لوگوں کے خلاف قید کی بھاری سزائیں سنائی گئی تھیں (جن میں بعد میں اپیل پر اور بین الاقوامی دباؤ کی وجہ سے تخفیف کر دی گئی تھی)، بیشتر تجربہ کار اور سرگرم لیبر لیڈروں کو 1930 کی دہائی کے شروع کے برسوں میں نظر بند رکھا گیا تھا۔ ساری قوم نے میرٹھ سازش مقدمے میں سنائی گئی سزا کی مذمت کی۔ جن لیبر لیڈروں کو سزا سنائی گئی تھی ان میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے آٹھ نمایاں ممبر بھی شامل تھے۔

بہر حال میرٹھ سازش کیس اور سزا سے لیبر شدت پسندی کو فوراً ہی دبایا نہیں جا سکا تھا۔ جب یہ دیکھا گیا کہ Fawcett کمیٹی کی رپورٹ میں مزدور طبقے کے حق میں کچھ نہیں کہا گیا ہے اور واڈیا گھرانے نے بڑے پیمانے پر ورکروں کو نوکریوں سے برطرف کرنا شروع کر دیا ہے تو گرنی کامگار یونین نے جس کی کمان اب دیش پانڈے اور بی۔ ٹی۔ رانادیوے کے ہاتھ میں تھی، دوسری عام ہڑتال (اپریل۔ اگست 1929) کرائی۔ اب مل کمیٹیاں بہت زیادہ تشدد پسندی پر اتر آئی تھیں اور ایک سرکاری انکوائری میں "نوجوان، نا تجربہ کار اور جاہل ورکروں کے ذریعے پھیلائے گئے انتشار کی" سخت مذمت کی گئی تھی۔ بہر حال اسٹرائک کو غیر دانش مندانہ طریقے پر زیادہ طول دیا گیا اور اس کے ناکام ہو جانے پر گرنی کامگار یونین بھی کمزور ہو گئی۔ جوٹ ملوں میں پہلی عام ہڑتال بنگال جوٹ ورکرز یونین کے جھنڈے تلے جولائی۔ اگست 1929 میں ہوئی تھی اور اس پر زیادہ تر کیونسٹوں کا ہی کنٹرول رہا تھا اور اوقات کار فی ہفتہ 54 گھنٹے سے بڑھا کر 60 گھنٹے کر دینے کی مالکان کی کوشش ناکام کر دی گئی تھی۔

آل انڈیا ٹریڈ یونین کانگریس (AITUC) پر کیونسٹوں کا سب سے زیادہ اثر اور غلبہ دسمبر 1929 میں کانگریس کے ناگ پور اجلاس کے موقع پر دیکھنے میں آیا اور این۔ ایم جوشی کی قیادت میں

لبرل گروپ نے واک آؤٹ کر کے آل انڈیا ٹریڈ یونین فیڈریشن بنائی؛ جب کہ نہرو باقی ماندہ گروپ کے ساتھ ہی جڑے رہے اور اجلاس کی صدارت بھی کی۔ آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے 1929 میں باقر علی مرزا کی قیادت میں لیبر ریسرچ ڈپارٹمنٹ کی تشکیل کی اور اس طرح کے آثار بھی پیدا ہو گئے تھے کہ بوس (کلکتہ) اور بھولا بھائی ڈیسائی (بمبئی) جیسے کچھ کانگریسی رہنما ان ٹریڈ یونیسٹ کیونسٹوں کی جگہ کو پر کرانے اور اس طرح محنت کش طبقے پر اپنا دائرہ اثر بڑھانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ مثال کے طور پر جمشید پور کے قریب ایک غیر ملکی ملکیت کے کارخانے، گولموری ٹن پلیٹ کی ہڑتال میں کانگریس نے بہت زیادہ دلچسپی لی۔ خاص بات یہ ہے کہ ہندوستانی صنعت کو تحفظ فراہم کرنے کے سلسلے میں سوراجی لیڈروں کی اپیلوں سے اس کارخانے کو کافی فائدہ پہونچا تھا۔ بہر حال بوس نے ان ہڑتالیوں کی ہمدردی میں بیچ بیچ میں ہڑتال کرائی، اور راجندر پرساد نے تو گول موری کا دورہ بھی کیا۔ کانگریس اور محنت کش طبقے کے درمیان اتحاد کے امکان پر انگریز افسروں کے کان کھڑے ہو چکے تھے، مگر انھیں یہ اطمنان تھا کہ اگر کانگریس نے اس طرح کے اتحاد کی کوئی کوشش کی تو اس کی مخالفت اندر سے ہی ہوگی اور یہ مخالفت وہ لیڈر کریں گے جو کسی نہ کسی حد تک کیونزم کی طرف جھکاؤ رکھتے ہیں اور ورکر طبقے پر اثر انداز رہے ہیں۔" (انٹیلی جنس سربراہ۔ پیٹری کا نوٹ، مورخہ 9 اکتوبر 1929)۔

فروری۔ مارچ 1930 میں کمونسٹوں کی قیادت میں جی۔ آئی۔ پی ریلوے میں ایک بڑی مگر ناکام ہڑتال ہوئی۔ کلکتہ میں سول نافرمانی کے ہی موقع (اپریل 1930) پر ایک نوجوان تشدد پسند کیونسٹ عبدالمومن نے دوپہر کے بعد اشیاء کے نقل و حمل پر عائد پابندی کے خلاف گاڑی بانوں کی ایک کامیاب ہڑتال کرائی۔ مومن نے اس ہڑتال کے سلسلے میں یہ حکمت عملی اپنائی کہ سڑکوں پر مال ڈھونے والی گاڑیوں کے ذریعے جگہ جگہ پر بڑی بڑی رکاوٹیں کھڑی کر کے ٹرانسپورٹ نظام کو بالکل مفلوج کر دیا تھا۔ پولس کے ساتھ ٹکراؤ کے واقعات ہوئے جن میں قوم پرست نوجوانوں نے گاڑی بانوں کا پورے جوش کے ساتھ ساتھ دیا تھا اور پولس کمشنر Tegart نے حکومت پر دباؤ ڈال کر اسے جلد ہی کسی فیصلے کے لیے مجبور کر دیا تھا۔ بہر حال 1930 میں ہی اس طرح کے آثار کافی واضح ہو چکے تھے کہ گویا لیبر تحریک پوری تیز رفتاری سے زوال کی طرف بڑھ رہی ہے۔ کیونسٹ بھی کمزور پڑ گئے تھے، محض حکومت کی سختیوں کی وجہ سے ہی نہیں بلکہ اس وجہ سے بھی کہ ان کی اپنی حکمت عملی میں بھی زبردست بدلاؤ آگیا تھا۔ 1928 کے آخر تک یہ کیونسٹ لیڈر کانگریس کے تئیں اتحاد اور مشترکہ جدو جہد کی پالیسی پر گامزن رہے تھے۔ اس طرح کیونسٹ کانگریس کی حد بندیوں کو نکتہ چینی کا نشانہ بھی بناتے رہے تھے اور سامراج کے خلاف ایک متحدہ محاذ بنانے کی کوشش بھی کرتے آرہے تھے۔ بنگال کی ورکرز اینڈ پیزنٹس پارٹی کی ایکزیکیٹو کمیٹی نے

اپنی 28-1927 کی رپورٹ میں یہ کہا تھا کہ کانگریس کی مخالفت صرف واضح اور متعینہ امور کے بارے میں ہی ہونی چاہیے۔ اور یہ کہ "بصورت دیگر ہمارے مخالفوں کو یہ کہنے کا موقع مل جائے گا کہ ہم کانگریس کے خلاف ہیں۔ بلکہ اس طرح ہم اپنے مخالفوں کو یہ کہنے کا موقع بھی دیدیں گے کہ ہم قوم دشمن ہیں اور یہ کہ ہم محنت کش طبقے کے محض جزوی مفاد کے ہی حامی ہیں"۔ لیکن دسمبر 1928 میں کیونسٹوں کی چھٹی بین الاقوامی کانگریس نے واضح طور پر اشتراکی رخ اختیار کرلیا اور ہندوستانی کیونسٹوں نے خود کو قومی دھارے سے الگ کرنا شروع کردیا اور اسٹالن کی پالیسی اپناتے ہوئے کانگریس کے نہرو جیسے اُن اشتراکی عناصر پر بھی حملے کرنے لگے جنھیں کہ 1930 میں سامراج مخالف لیگ سے بھی نکال دیا گیا تھا۔ لیبر تحریک میں کانگریس کی دلچسپی ہمیشہ غیر مسلسل شکل میں اور محدود رہی تھی اور سول نافرمانی کی تحریک شروع ہو جانے پر کانگریس پر گاندھی کی گرفت بہت مضبوط ہو گئی تھی، اس لیے وہ ہڑتال کا راستہ اپنانے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتی تھی کیونکہ کانگریس کی گاندھیائی قیادت ہڑتال کو ایک انتہائی نفاق انگیز اور خطرناک حربہ تصور کرتی تھی۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ معاشی صورت حال بھی لیبر تحریک کے لیے ناسازگار ہوتی جارہی تھی، سرد بازاری کے آغاز کے ساتھ ہی بے روزگاری بھی بڑھ رہی تھی اور قیمتیں گر رہی تھیں جس کے نتیجے میں محنت کش طبقے کی سودے بازی کی طاقت کافی گھٹ گئی تھی اور برسر روزگار طبقے کی مشکلات میں کسی قدر کمی بھی آگئی تھی۔

کسان تحریکیں اور باردولی

اگرچہ ورکروں اور کسانوں کی پارٹیاں نظریاتی طور پر کسانوں کے لیے بڑے بڑے انقلابی اور جاگیردارانہ مخالف پروگرام پیش کرنے کے دعوے کیا کرتی تھیں، مگر دیہی علاقوں میں ان کی رسائی نہیں کے برابر تھی اور اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ ان پارٹیوں کے مٹھی بھر کارکن خود کو محض ٹریڈ یونین کی سرگرمیوں میں ہی الجھائے رکھتے تھے۔ بنگال اکائی کو کسی قدر اثر ورسوخ حاصل ہو گیا تھا اور خاص طور پر مشرقی بنگال کے مسلم کسانوں میں اس کا خاصہ اثر قائم ہو چکا تھا۔ اسی طرح بھگت سنگھ کی ہندوستانی سوشلسٹ ری پبلکن آرمی، پرولتاری طبقے کی ڈکٹیٹر شپ کی بات تو کرتی تھی مگر کسانوں کے امور کے سلسلے میں اس کا کوئی واضح نظریہ نہیں تھا۔ بہر حال ملک کے بہت سے حصوں میں بے چینی پھیل رہی تھی کیونکہ زرعی اشیاء کی قیمتیں یا تو ایک ہی سطح پر رکی ہوئی تھیں یا ان میں گراوٹ آتی جارہی تھی جبکہ رعیت واڑی علاقے میں مال گزاری کی از سر نو شرح بندی کا وقت بھی آگیا تھا۔

کسانوں کے مطالبات کے سلسلے میں کانگریس کے اندر واضح اختلاف رائے تھا۔ بنگال میں یہ

اختلاف رائے اپنی انتہا کو پہونچا ہوا تھا جہاں انقلاب پسند سبھاش بوس اور سین گپتا کے بشمول سارے سوراجی لیڈر بنگال لگان داری ترمیمی بل (اگست۔ ستمبر 1928) پر بحث کے دوران کسانوں اور بٹائی داروں کے مفادات کا تحفظ کرنے میں بری طرح ناکام رہے تھے۔ جیتندر لال بنرجی نے زمینداروں کے مقابلے پر رعیتوں کے لیے بعض اضافی حقوق کی تائید کی لیکن انھوں نے بھی اس ترمیم کی مخالفت کی جس کے ذریعے بٹائی داروں (برگ داروں) کو لگان حقوق دینے اور اس طرح جوت داروں کے غلبے کو کم کرنے کی بات کہی گئی تھی۔ ہندو جوت داروں اور مسلم برگ داروں کے درمیان اگست 1926 میں پبنا میں پہلے ہی ٹکراؤ ہو چکا تھا۔ یہ ٹکراؤ فرقہ وارانہ تصادم کی شکل اختیار کر گیا تھا جسے کلکتہ کے ایک اخبار نے "طبقاتی جنگ" کا نام دیا تھا۔ 1928 میں کونسل کے مسلم ممبروں نے، کسانوں کی حمایت کا موقف اختیار کیا، حالانکہ بہت سے مسلم زمینداروں نے بھی "برگ دار شق" کی مخالفت کی تھی۔ لگان داری بل کا معاملہ اتنا اچھلا کہ جولائی 1929 میں اکرم خاں، عبدالرحیم اور فضل الحق کی قیادت میں پرجا پارٹی بھی قائم ہو گئی جس میں شروع شروع میں جیتندر لال بنرجی، نریش گپتا اور اتل گپتا جیسے سماجی انقلاب پسند ہندو بھی شامل تھے۔ بہر حال اس پارٹی پر ہمیشہ مسلم قیادت ہی چھائی رہی اور سماجی سطح پر بھی اسے مسلم جوت داروں کی بھرپور تائید حاصل رہی۔

اسی سے ملتی جلتی وضع پنجاب میں بھی ابھر رہی تھی جہاں شہری ساہوکاروں کے چنگل سے کسانوں کو بچانے کے لیے فضل حسین کی کوششوں کی مخالفت کانگریس کے ہندو لیڈر اور مہاسبھا کے لیڈر یکساں طور پر کر رہے تھے۔ یونینسٹ گروپ، جس میں غالب اکثریت مسلم لیڈروں کی تھی (1926 میں کونسل میں پارٹی کے کل 36 منتخبہ ممبروں میں 33 مسلمان تھے)، چھوٹو رام کے ساتھ اتحاد نیز شہریوں کے مقابلے میں کسانوں کے لیے پروگرام پیش کر کے ہریانہ کے جاٹوں کی تائید حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ پرجا پارٹی کے کسان موافق موقف کی اپنی کچھ حدود تھیں۔ کیونکہ پرجا پارٹی اور یونینسٹوں، یعنی دونوں کی اصل توجہ کا مرکز چھوٹے موٹے کسانوں اور زرعی مزدوروں کی بجائے خوش حال کسان تھے۔ کانگریس ان دونوں صوبوں میں اپنے تئیں تائید کھوتی جا رہی تھی کیونکہ ایک طرف تو اس پر ہندو فرقہ پرست عناصر حاوی ہوتے جا رہے تھے اور دوسری طرف وہ زرعی اصلاح کا بھی کوئی پروگرام پیش نہیں کر سکی تھی۔ مشرقی پنجاب، میں جہاں کہ سکھ کسانوں کا غلبہ تھا، 1920 کی دہائی کے دوران پٹیالہ کے مہاراجہ بھوپندر سنگھ کے ساتھ اکالیوں کی چپقلش چلتی رہی تھی کیونکہ 1923 میں نابھا کے حکمراں کی معزولی کے پیچھے مہاراجہ پٹیالہ کا ہاتھ ہونے کا شبہ تھا۔ اکالی دل کے ایک سرگرم کارکن سیوا سنگھ ٹھیکری والا کی پٹیالہ میں مسلسل نظر بندی ایک اہم معاملے کی شکل اختیار کر گئی تھی۔ جہاں یہ ظاہر تھا کہ اس نظر بندی میں مسلکی عنصر اور مہاراجہ کا اشارہ بھی شامل تھا، وہیں اکالیوں کی یہ جدو جہد مشرقی پنجاب کی اس

ریاست میں شہری اور سیاسی حقوق کے لیے کسانوں کی ایک وسیع ترجدوجہد کی شکل بھی اختیار کرگئی تھی۔ جولائی 1928 میں منسا میں قائم کیے گئے پنجاب ریاستی پرجامنڈل، نے 1926 میں ریاست پٹیالہ کے ذریعے لگان میں کیے گئے 19 فیصد اضافے کو منسوخ کرنے اور مہاراجہ کے لیے محفوظ شکار کے علاقے کو ختم کرنے اور اس جیسے دوسرے مطالبات پیش کیے۔ اگست 1929 میں ٹھیکری والا کی رہائی کے بعد کچھ اکالیوں نے بھوپندر سنگھ کی طرف سے بھیجے جانے والے اشاروں پر مثبت ردعمل ظاہر کرنا شروع کیا جب کہ ریاستی پرجامنڈل کے نسبتاً زیادہ انقلابی قسم کے کارکن مارکسزم کی طرف راغب ہوگئے۔ ان انقلابی لیڈروں میں جاگیر سنگھ جوگا، اور ماسٹر ہری سنگھ کے نام قابل ذکر ہیں۔

کانگریس کے لیے دوامی بندوبست والے بہار میں بھی زمینداری کا بہت بڑا دباؤ تھا مگر فرق یہ تھا کہ اس صوبے میں زرعی طبقاتی تقسیم فرقہ وارانہ بنیادوں پر نہیں تھی اور ذات پات کی وابستگی بسا اوقات اعلا کسان طبقے نیز چھوٹے اور متوسط درجے کے زمینداروں کے مابین اتحاد کا باعث بھی ہو جاتی تھی جس بات نے 1947 سے پہلے کے برطانوی ہند میں سب سے بڑی کسان تحریک کی شکل اختیار کرلی تھی اس کی تخم کاری 1920 کی دہائی میں سوامی سہج آنند کی سرگرمیوں کی شکل میں ہو چکی تھی۔ سہج آنند غازی پور (مشرقی یوپی) کے ایک چھوٹے زمیندار گھرانے میں پیدا ہوئے تھے اور 1907 میں سنیاسی ہوگئے تھے۔ تحریک عدم تعاون کے دوران کانگریس کی سرگرمیوں میں حصہ لے چکے تھے اور شروع میں بھومیہاروں کی سماجی ترقی کے مقصد سے 1927 میں بہٹا (پٹنہ) میں ایک آشرم شروع کیا تھا۔ اس کے بعد انھوں نے کسانوں کے اندر تنظیم پیدا کرنے کا کام شروع کردیا تھا۔ انھوں نے بالکل ہی اعتدال پسندانہ بنیاد پر نومبر 1927 میں بہار صوبائی کسان سبھا، کی بنیاد رکھی جس کے پہلے سکریٹری کانگریس کے کونسل لیڈر سری کرشن سنہا تھے۔ بہر حال سہج آنند، اور خود وہ تحریک جو انھوں نے شروع کی تھی ان معمولی مقاصد سے کہیں آگے جانے والی تھی۔

رعیت واڑی علاقوں میں، جہاں کہ لگان میں حکومت کے ذریعے اضافے کے نتیجے میں ایک ایسا مسئلہ پیدا ہوتا تھا جو سماجی اعتبار سے خطرات سے خالی اور اتحاد کا باعث ثابت ہو سکتا تھا، کسان تحریکوں کے لیے کانگریس کی طرف سے تائید نسبتاً زیادہ بے دھڑک انداز میں سامنے آتی تھی۔ آندھرا کی ساحلی پٹی میں لگان میں 1927 میں 18.75 فی صد کے حساب سے اضافے کے سلسلے میں حکومت مدراس کی تجویز کے خلاف 29-1928 کے دوران ایک زوردار ایجی ٹیشن چلا۔ یہ ایجی ٹیشن اس علاقے میں چلا جو کہ متمول اور متوسط درجے کے کسانوں کے لیے مشہور تھا۔ مغربی گوداوری کے ٹی۔ پیر کاسم اور ڈنڈو نارائن راجو، مشرقی گوداوری کے کونڈاو نکپیا اور وینانی ستیہ نارائنا، نیز کنعور میں ناول "ملاپلی" کے مشہور مصنف اُنّاوا لکشمی نارائنا جیسے لیڈر سول نافرمانی شروع ہونے سے پہلے ہی کانگریس کی ایک مضبوط کسان بنیاد تیار کرچکے تھے اور علاقے میں لگان نہ دینے کی

تحریک پہلے ہی سے شروع ہو چکی تھی۔ دوسرے صوبوں کے مختلف بکھرے ہوئے علاقوں میں بھی گاؤں کے تعمیری کاموں اور دوسرے پروگراموں کے ذریعے کانگریس کی دیہی بنیاد قائم ہو چکی تھی۔ اس سلسلے میں گاندھی کے تبدیلی مخالف پیروکاروں نے اہم رول ادا کیا تھا۔ مثال کے طور پر بنگال کے ضلع ہگلی کے آرام باغ میں پرپھل سین کی قیادت میں اور گورکھپور میں بابا راگھو داس کی قیادت میں یہ کام ہوا تھا۔ ان دونوں لیڈروں کو وقت کے گزرنے کے ساتھ ساتھ اپنے اپنے علاقے کے "گاندھی" کی حیثیت حاصل ہوتی گئی تھی۔

دیہی علاقوں میں دیہی تنظیم اور ایجی ٹیشن کے گاندھیائی طریقہ کار کی پہلی حقیقی پیش رفت 1928 میں گجرات کے سورت ضلع میں باردولی تحریک کی کامیابی کی شکل میں سامنے آئی۔ 137 گاؤں اور 87,000 کی آبادی والے اس تعلقے میں دیہی تعمیری کام 1922 سے چل رہا تھا۔ کنور راجی اور کلیان جی مہتہ جیسے مقامی لیڈر پٹی دار یووک منڈل کے ذریعے 1908 سے ہی تعلقے کے با اثر کاہنی پٹہ داروں کو منظم کرتے آرہے تھے۔ اس سلسلے میں ان لوگوں کا اپنا ایک رسالہ "پٹیل بندھو" اور ایک پٹی دار آشرم بھی تھا جو سورت میں طلباء کا ایک ہوسٹل بھی چلا رہا تھا۔ پٹی دار اپنی زمینوں کی جوتائی ان زرعی غلاموں سے کراتے تھے جو Dubla قبائل سے تعلق رکھتے تھے اور کالی پرج (کالے لوگ) کے نام سے جانے جاتے تھے۔ باردولی کی پوری آبادی کا پچاس فی صد حصہ انھیں لوگوں پر مشتمل تھا۔ یہ کالی پرج انتہائی پس ماندہ تھے جن کا تذکرہ گاندھی کے سکریٹری مہادیو ڈیسائی نے اپنی تصنیف آ ہسٹوری آف باردولی (1929) میں "انتہائی سادہ لوح، بے ضرر"......اور پابند قانون" کے طور پر کیا ہے۔ جیسا کہ Jan Breman نے جنوبی گجرات کے اناول براہمنوں اور ڈبلا قبائل کے درمیان بھی اسی طرح کے روابط کا جائزہ لیتے ہوئے یہ لکھا ہے کہ "یہ مقروض غلامی غیر آزاد مزدوری کی ایک ایسی الجھی ہوئی شکل تھی جس میں سرپرستی کا بھی ایک عنصر موجود ہوتا تھا"۔ کالی پرج بندھوا مزدور کو پٹی دار کی طرف سے خوراک اور کپڑے کی فراہمی کی ضمانت حاصل ہوتی تھی اور استحصال سے متعلق حقائق اس دو طرفہ تعلق کی وجہ سے اکثر سامنے نہیں آپاتے تھے۔ گاندھیائی تعمیری کام سے وابستہ کارکن کالی پرج عوام میں بھی سرگرم رہے تھے۔ ان گاندھیائی کارکنوں نے انھیں کالی پرج (کالے لوگ) کی جگہ پر "رانی پرج" (جنگل باش) کا نام دیا تھا۔

جب حکومت بمبئی نے 1927 میں باردولی میں لگان میں 22 فی صد اضافے کا اعلان کیا، وہ بھی ایسے وقت میں جب کہ کپاس کی قیمتیں بھی گر رہی تھیں، تو مہتہ برادرس نے ولبھ بھائی پٹیل کو لگان کی عدم ادائیگی کی تحریک کے لیے راضی کر لیا۔ یہ تحریک بہت جاندار بھی رہی اور پرامن بھی! بڑے پیمانے پر مویشیوں اور زمین کی قرقی کے باوجود بھی کسان حکومت کے دباؤ میں نہیں آئے اور کالی پرج قبائل نے بھی حکومت کی طرف سے زمین کی پیش کش کو نامنظور کر دیا۔ پٹیل اور

دوسرے مقامی لیڈروں نے اس تحریک کے سلسلے میں مختلف ایسوسی ایشنوں، ذات پات پر مبنی دوسری تنظیموں، بایکاٹ، مذہبی اپیلوں، اور بھجنوں وغیرہ سے بھرپور فائدہ اٹھایا۔ جلسوں میں شریک قبائلیوں سے کہا جاتا کہ ان کے دیوتا سلیا اور سالیا بوڑھے ہو گئے ہیں اور انھوں نے گاندھی کو اپنا نمائندہ بنا کر بھیجا ہے جو اب ان کی دیکھ بھال کریں گے۔ کیا مہاتما بھی ان کی ہی طرح محض ایک لنگوٹی استعمال نہیں کرتے اور نسبتاً زیادہ مہنگے گائے کے دودھ کی بجائے کیا بکری کا دودھ نہیں پیتے۔ (حوالہ: گھنشیام شاہ)۔ سورت سے 10 ہزار کی تعداد میں شائع ہونے والے اخبار "ستیہ گرہ پتریکا، میں شائع ہونے والے مضامین اور تقریروں میں اس بات پر ہی سارا زور ہوتا کہ اصل دولت تو کسان اور دیہی مزدور ہی پیدا کرتے ہیں اور یہی دونوں ریاست کے حقیقی ستون ہیں۔ اس کے ساتھ دیہی آبادی کے طبقاتی اتحاد اور روایتی بھائی چارے کی اہمیت پر بھی زور دیا جاتا تھا "ساہوکار لگان دار کے اندر اس طرح گھل مل گیا ہے جس طرح کہ دودھ میں پانی، ان دونوں کو الگ کرنا ممکن نہیں ہے"۔ (پٹیل کی ایک تقریر جس کا حوالہ مہادیو ڈیسائی نے دیا ہے)۔

باردولی تحریک جلد ہی ایک قومی نوعیت کا معاملہ بن گئی۔ احمد آباد کے ورکروں نے ایک آنہ فی کس کے حساب سے چندہ اکٹھا کر کے 1300 روپے جمع کر لیے تھے جب کہ بمبئی کونسل میں ہندوستانی ایوان تجارت کے نمائندے لال جی نارن جی نے جولائی میں ثالثی کی کوشش ناکام ہو جانے پر اپنی سیٹ سے استعفیٰ دیدیا تھا۔ باردولی تحریک اور گرنی کامگار یونین کی ہڑتال ایک ساتھ چلنے کے باوجود بھی ان دونوں میں کسی طرح کی قائدانہ یا نظریاتی قربت نہیں تھی۔ حالانکہ سکریٹری آف اسٹیٹ کے ساتھ گورنر ولسن کی خفیہ خط کتابت سے اس دلچسپ حقیقت کا انکشاف ہوتا ہے کہ انگریزوں کو ان دونوں کے درمیان کسی طرح کے تعلق کا پورا خدشہ تھا۔ جولائی کے آخر میں مسلح پولس دستے بلکہ فوج باردولی بھیجے جانے کے منصوبے کو اگست کے پہلے ہفتہ میں واپس لے لیا گیا۔ جوڈیشیل انکوائری نیز قرق شدہ زمینوں کی واپسی کی شرائط کے ساتھ مصالحت ہو گئی۔ سکریٹری آف اسٹیٹ کے نام گورنر ولسن کے خفیہ مکتوب کے الفاظ یہ تھے۔ "میرے پولس افسران مجھے یہ بتاتے ہیں کہ انھیں اس بات کا پورا یقین ہے کہ حکومت نے اگر وہاں کوئی کارروائی کی تو کمیونسٹ ایک عام ہڑتال کا نعرہ دینے کے لیے صورتحال کا پورا فائدہ اٹھائیں گے یا پولس افسران کو یہ بھی یقین ہے کہ اس طرح کمیونسٹ بی بی ریلوے، سی آئی ریلوے اور جی آئی پی ریلوے میں ہڑتال کرانے میں کامیاب ہو جائیں گے"۔ میکس ویل بردم فیلڈ انکوائری کمیٹی نے اس بات کو قبول کیا کہ باردولی کے سلسلے میں (بلکہ صوبے میں دوسرے مقامات کے سلسلے میں بھی) حکومت کا اندازہ غلط تھا اور باردولی میں لگان میں اضافہ 1،87،492 روپے سے گھٹا کر 48،648 روپے کر دیا گیا تھا۔ جیسے ہی پٹیل لگان پر نظر ثانی کے خلاف پورے گجرات اور مہاراشٹر میں مہم کا منصوبہ بنا

رہے تھے اور "بمبئی پریزیڈنسی لینڈ لیگ، منظم کرنے کی کوشش کر رہے تھے کہ بمبئی کی حکومت نے 16/ جولائی 1929 کو یہ اعلان کر دیا کہ مال گزاری پر نظر ثانی کا کام رواں آئینی اصلاحات کے عمل کی تکمیل تک کے لیے ملتوی کر دیا گیا ہے۔ کھیڑا میں 1870 کی دہائی کی مال گزاری شرحیں برقرار رکھی گئیں جن میں بنیادی طور پر 1940 کی دہائی کی تک کوئی اضافہ نہیں کیا گیا۔ اس میں شک نہیں کہ گاندھیائی تحریک کی وجہ سے گجرات کے کسان مالکوں کو کافی فائدہ پہونچا۔

کاروباری طبقے کا رویہ

جہاں 1928 اور 1929 کے دوران شہری علاقے کے تعلیم یافتہ نوجوانوں، ورکروں اور کسانوں میں تشدد پسندی بڑھتی جارہی تھی، وہیں ہندوستان کے کاروباری حلقوں میں بھی انگریزوں کی بعض پالیسیوں کے تعلق سے بے چینی بڑھتی جارہی تھی۔ روپے کی اسٹرلنگ 6 پنس کی شرح کے سلسلے میں عام شکایت پہلے ہی سے موجود تھی، اور حکومت نے جاپان اور لنکاشائر کے بڑھتے مقابلے کے پیش نظر درآمدی محصول 11 فیصد سے بڑھاکر 15 فی صد کر دینے کے لیے کاٹن ٹیرف بورڈ کی تجاویز کو جون 1927 میں مسترد کر کے مشکلات میں مزید اضافہ کر دیا تھا۔ جنوری 1928 میں بمبئی کے ایوان تجارت نے سائمن کے بائیکاٹ کے اپیل کی توثیق کر دی تھی جب کہ اس کے لیڈروں پرشوتم داس ٹھاکر داس نیز لال جی نارن جی نے آٹھ سال قبل تحریک ترک موالات کی مخالفت کی تھی۔ وال چند ہیرا چند اور لال جی نارن جی کی کمپنی، سندھیا سٹیم نیوی گیشن، کا سخت مقابلہ انگریز جہاز راں کمپنیوں سے چل رہا تھا۔ حکومت نے ساحلی جہاز رانی کو دیسی کمپنیوں کے لیے محفوظ کر دینے کے لیے انڈین مرکنٹائل میرین کمیٹی کی سفارش کو عمل میں لانے سے انکار کر دیا تھا اور اس سلسلے میں حاجی بل (مارچ 1928) انگریزوں اور حکومت کی طرف سے سخت مخالفت کے باوجود پیش کیا گیا تھا۔ ٹھاکر داس کے نام برلا کے خطوط نیز برڈ کمپنی کے سربراہ ایڈورڈ بینتھال کے نجی کاغذات سے پتہ چلتا ہے کہ کلکتہ کے مارواڑی کاروباری گروپوں اور انگریزوں کے جوٹ مفادات کے درمیان زبردست ٹکراؤ چل رہا تھا۔ "ہم کلکتہ میں ہندوستانی تجارت کو ہر طرح سے منظم کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ تمام نئی تشکیل شدہ ایسوسی ایشنز ہندوستانی ایوان تجارت کے ساتھ اپنا الحاق کر رہی ہیں،...... ان تمام باتوں سے یوروپیوں کا حسد بڑھ رہا ہے...... امپریل بنک بعض معاملات کے سلسلے میں ٹھیک ٹھاک برتاؤ نہیں کرتا" (برلا بنام ٹھاکر داس، 2/ مئی 1928)۔ امپریل بنک اور ایکسچینج بنکوں کے واسطے سے انگریزوں کا مالیاتی کنٹرول بھی ہندوستانی سرمایہ کاروں کے لیے پریشانی کا ایک دوسرا بڑا سبب تھا اور ٹھاکر داس نے انڈین بینکنگ انکوائری رپورٹ کے اختلافی نوٹ میں ان ایکسچینج بنکوں کی اجارہ داری کے خلاف سخت تنقید کی تھی"۔

بہر حال ہندوستانی کاروباری حلقوں کا رویہ کافی تغیر پذیر اور متنوع رہا، مزدور طبقے کی تشدد پسندی کی وجہ سے خاص طور پر بمبئی کے مل مالکان سرکاری تائید اور مدد پر منحصر ہو کر رہ گئے تھے۔ بمبئی مل مالکان کی ایسوسی ایشن کے چیرمین ہوی مودی نے مارچ 1929 میں اپنی سالانہ رپورٹ میں شرح تبادلہ اور محصولاتی تحفظ کے فقدان جیسے امور کا بھی ذکر کیا تھا مگر ان کا سارا زور "بے مثال عام ہڑتال" پر ہی رہا تھا۔ انھوں نے "فطری طور پر" تجارتی تنازعات بل کی تائید کی اور دھرنے مظاہرے پر مکمل پابندی کا مطالبہ کیا۔ ان کا کہنا تھا کہ "پُرامن دھرنا" نام کی کوئی چیز نہیں ہوتی۔ بمبئی کی کپڑا صنعت کو لنکاشائر سے کہیں زیادہ جاپان کے ارزاں سامان کی وجہ سے خطرہ پیدا ہو گیا تھا جس کے نتیجے میں انگریز حامی رویہ اختیار کرنے کے لیے ایک طرح کا معاشی جواز سامنے آگیا تھا۔ ہندوستان کا سب سے کامیاب اور سب سے بڑا صنعتی سرمایہ کار گروپ، یعنی ٹاٹا گروپ بھی زیادہ تر انگریزوں کا وفادار ہی رہا کیونکہ فولاد سازی جیسی صنعت کا سارا دارو مدار سرکاری ٹھیکوں اور سرپرستی پر تھا اور 1924 میں اسے محصولاتی تحفظ بھی حاصل ہو چکا تھا۔ 1929 میں گرنی کامگار یونین نے جو ایک طرح کا "لال خطرہ" پیدا کر دیا تھا، اس کے تعلق سے دوراب جی ٹاٹا، کوواس جی جہانگیر اور ابراہیم رحمت اللہ نے واضح طور پر ایک ایسی سرمایہ دار تنظیم قائم کرنے کی کوشش کی جو کانگریس سے بالکل مختلف ہو، اور "تخریب کار قسم کے لال لیڈروں" کے مقابلے پر یوروپی آجرین کے ساتھ تال میل قائم کر لیا تھا (ٹاٹا گروپ کے این۔ این مجمدار کا مکتوب بنام ٹھاکر داس، 22 مئی 1929) ایچ۔ پی۔ مودی، نیس واڈیا، لال جی نارن جی، اور ایم۔ آر۔ جیاکر "سرمائے اور محنت کے درمیان مفاہمت کا بہتر ماحول پیدا کرنے" کے مقصد سے بمبئی سے ایک مراٹھی اخبار کی اشاعت کے بارے میں سنجیدگی سے غور کرنے لگے تھے۔ (لال جی نارن جی بنام جیاکر مورخہ 18 اکتوبر 1929)۔ بمبئی کے گورنر کے ذہن میں اس طرح کی بات چھ ماہ پہلے ہی آچکی تھی (حوالہ (Sykes to Irwin 22.5.1929:۔

برلا ایک مختلف حکمت عملی پر گامزن تھے۔ ان کی حکمت عملی نسبتاً زیادہ وطن پرستانہ اور دور اندیشی پر مبنی تھی۔ اگست 1928 میں ان کے ہندوستانی ایوان تجارت نے لنکاشائر کی درآمدات میں کمی کے سلسلے میں کچھ کرنے کے لیے کلکتہ مارواڑی ایسوسی ایشن کی تجویز کے سلسلے میں مکمل سرد مہری سے کام لیا تھا۔ برلا نے نہ صرف یہ کہ ایک الگ سرمایہ دار پارٹی کی تشکیل کے لیے ٹاٹا کے تصور کی تائید نہیں کی، بلکہ انھوں نے 1929 میں مالویہ (جن کی انھوں نے 1926 کے انتخابات میں تائید کی تھی) اور موتی لال کے درمیان ثالثی کے ذریعے سوراجی لیڈروں کو مضبوط کرنے کی بھی کوشش کی تھی۔ برلا اور ٹھاکر داس، یعنی دونوں نے ہی ٹاٹا کے خیال کی مخالفت کی "میرے ذہن میں اس بابت ذرا بھی شک و شبہ نہیں کہ کمیونزم کی موثر روک تھام کے لیے ایک خالصۃً

سرمایہ دار تنظیم آخری حربہ ثابت ہو سکتی ہے..... ہم سرمایہ دار جو کر سکتے ہیں..... وہ یہ ہے کہ..... ان لوگوں کے ساتھ تعاون کریں جو موجودہ حکومت کی جگہ پر ایک قومی حکومت کے لیے آئینی طریقوں سے جدو جہد کر رہے ہیں" (برلا بنام ٹھاکر داس، 30 جولائی 1929)۔ بہر حال سرمایہ داروں (سرمایہ کاروں) کے درمیان اختلاف رائے کے سلسلے میں نہ تو مبالغہ آرائی ہی مناسب ہے اور نہ ہی اسے اتنی آسانی سے بیان کیا جا سکتا ہے۔ مئی 1929 میں برلا کے ساتھ ایک ملاقات کے بعد پیٹھال نے یہ امید ظاہر کی تھی کہ ...... ہم مارکیٹ میں ان کی پوزیشن کا تعین کر کے...... انھیں مستقبل میں نسبتاً کم جارحانہ رویے کے لیے تیار کر سکتے ہیں۔" (پیٹھال ڈائری، 15/ مئی 1929)۔ ٹھاکر داس نے این۔ ایم مجمدار کے نام اپنے مکتوب (7/ جون 1929) میں جس ستائشی انداز میں ٹاٹا کی تجویز کو مسترد کر دیا تھا وہ بھی توجہ کا طالب ہے۔ ٹھاکر داس کا یہ کہنا تھا کہ یورپیوں پر یہ واضح کیے بغیر کہ ہم ہندوستانی پہلے ہیں اور سوداگر یا صنعت کار بعد میں، ان کے ساتھ اشتراک کرنے کی بجائے قوم پرستوں کے ساتھ اپنے روابط برقرار رکھنے چاہئیں۔ مگر ان کے اس مکتوب کا اگلا جملہ اس طرح بھی ہے کہ "میں یہ مانتا ہوں کہ ہم یوروپیوں کے ساتھ مل سکتے ہیں مگر ابھی نہیں، آگے چل کر اور آج کے مقابلے میں نسبتاً زیادہ مضبوط بنیادوں پر......"۔

ڈومنی ان درجے سے مکمل سوراج تک

1928 اور 1929 کے پورے عرصے میں گاندھی نے اگلے مرحلے کی کل ہند عوامی جدو جہد کے لیے بڑھتے ہوئے دباؤ پر قدغن کا کام کیا۔ اس مرتبہ یہ دباؤ مکمل آزادی کی جدو جہد کے لیے تھا۔ انھوں نے آزادی سے متعلق جواہر لال نہرو کی اس قرارداد پر ناپسندیدگی ظاہر کی جو کہ کانگریس کے مدراس اجلاس (1927) میں ان کی عدم موجودگی میں پاس کرائی گئی تھی اور اگلے سال کلکتہ اجلاس میں ایک ایسا مصالحتی فارمولہ منظور کرانے میں کامیاب ہو گئے جس کے ذریعے نہرو رپورٹ میں ظاہر کردہ ڈومنی ان اسٹیٹ کے درجے کی بات کو تسلیم کر لیا گیا تھا بشرطیکہ انگریز اس مطالبے کو 1929 کے آخر تک منظور کر لیں؛ اور اگر انگریزوں نے ایسا نہ کیا تو کانگریس سول نافرمانی کی تحریک چلانے اور مکمل سوراج کے لیے جدو جہد کرنے کے لیے آزاد ہو گی۔ بوس نے اس مصالحتی فارمولے میں ترمیم پیش کرتے ہوئے مکمل آزادی پر اصرار کے لیے کہا جس کی جواہر لال نہرو نے تائید کی۔ ان کے علاوہ تامل ناڈو کے ستیہ مورتی، بنگال کے بہت سارے مندوبین اور بمبئی کے کیمونسٹ لیڈر منجیت کمار اور جوگ لیکر نے بھی اس کی تائید کی لیکن یہ ترمیم 973 کے مقابلے میں 1350 ووٹوں سے مسترد کر دی گئی۔ گاندھی نے 1928 کے دوران کانگریس کی سرگرمیوں کو گاؤں میں تعمیری کام، نشہ بندی، انگریزی سامان کے بائیکاٹ نیز مخصوص قسم کی شکایتوں کا باردولی

طرز پر ازالہ کرنے کی کوششوں تک محدود رکھنے کی کوشش کی۔ انھوں نے غیر ملکی کپڑوں کی ہولی جلانے کی حوصلہ افزائی کی (جس کے لیے انھیں مارچ میں کلکتہ میں گرفتار کر لیا گیا تھا اور علامتی جرمانہ عائد کیا گیا تھا) اور کھادی کے لیے چندہ اکٹھا کرتے ہوئے پورے ملک کا دورہ کیا مگر کسی بھی بھرپور جدوجہد کے لیے پڑنے والے دباؤ کو بار بار مسترد کرتے رہے۔

1928-29 کے دوران گاندھیائی تحمل کے ساتھ ساتھ بورژوائی طبقے نے بھی غیر واضح موقف اختیار کیے رکھا اور اس کی بیشتر وجہ یہ تھی کہ اس مدت میں جن گروپوں کو زیادہ نمایاں حیثیت حاصل رہی ان پر گاندھی کا کنٹرول نہیں کے برابر تھا۔ ان گروپوں میں بنگال، پنجاب اور بمبئی کا شہری تعلیم یافتہ طبقہ اور کلکتہ نیز بمبئی کا صنعتی مزدور طبقہ شامل تھا۔ انھوں نے جولائی 1929 میں بڑی صفائی کے ساتھ یہ اعلان کیا کہ "میں سول نافرمانی میں ان لوگوں کی رہنمائی کرنا اچھی طرح جانتا ہوں جو میری شرطوں پر اس تحریک میں کود پڑنے کے لیے تیار ہیں، مگر مجھے دور دور تک امید کے آثار نظر نہیں آتے"۔ اس سلسلے میں تامل کی ایک دوسری بڑی وجہ خود کانگریس کی تنظیمی صورت حال تھی: ممبروں کی تعداد گھٹ کر مئی 1929 میں صرف 56,000 رہ گئی تھی اور جواہر لال کی بھرپور کوششوں کے نتیجے میں یہ تعداد چھ ماہ بعد بڑھ کر پانچ لاکھ تک پہونچ سکی تھی۔ بیشتر صوبے ممبروں کی تعداد اور فنڈ کی فراہمی کے کوٹے کو پورا کرنے میں کامیاب رہے تھے۔ علاحدگی پسندانہ اور باغی قوتوں کو کنٹرول کرنے کی گاندھی کی زبردست صلاحیت کا انکشاف بھی اسی ماہ میں ہوا جب انھوں نے کانگریس کے بیشتر صوبائی یونٹوں (10 صوبے گاندھی کے حق میں 5 صوبے ولبھ بھائی پٹیل کے حق میں اور محض 3 صوبے جواہر لال کے حق میں تھے) کی زبردست مخالفت کے باوجود بھی جواہر لال کو کانگریس کے اگلے اجلاس کا صدر بنوا دیا تھا حالانکہ خود جواہر لال بھی اس کے لیے تیار نہیں تھے۔ جواہر لال کا کہنا تھا کہ گاندھی "بلاشبہ ایک انتہا پسند ہیں، اس لیے کہ وہ اپنے آس پاس کے لوگوں سے کہیں زیادہ آگے کی سوچتے ہیں مگر ساتھ میں وہ اتنے ہی منکسر مزاج اور عملی انسان بھی ہیں کہ وہ کسی معاملے کو ٹوٹ جانے کی حد تک طول نہیں دیتے، بھاپ اسی وقت ایک طاقتور توانائی بن پاتی ہے جب وہ خود کو مقید کر لینے دیتی ہے...... اسی طرح اس ملک کے نوجوانوں کو بھی اپنی بے کنار توانائی کو مقید کر کے رکھنا ہے، اسے کنٹرول کرنا ہے اور پھر اسے نپے تلے طریقے پر بروئے کار لانا ہے"۔ (حوالہ: Young India. September. 1929)۔

کانگریس کے اجلاس کی صدارت کے لیے جواہر لال کا انتخاب بہر حال اب بھی اس بات کا اشارہ تھا کہ ٹکراؤ کی نوبت آتی جا رہی ہے: خاص طور پر اس لیے بھی کہ کلکتہ کانگریس نے جو ایک سال کی مہلت دی تھی وہ بھی ختم ہو رہی تھی۔ اروِن کی 31 اکتوبر کی اس پیش کش سے معاملہ اور بھی پیچیدہ ہو گیا جس کے ذریعے وائسرائے نے یہ اعلان کیا تھا کہ ہندوستان کی آئینی پیش رفت

میں ڈومنی ان اسٹیٹ کے درجے کو فطری معاملے کی نوعیت حاصل رہے گی۔ اس کے علاوہ سائمن کمیشن کی رپورٹ کی اشاعت کے بعد ایک گول میز کانفرنس بلانے کا بھی وعدہ کیا گیا تھا۔ وائسرائے دراصل سائمن کمیشن کے موثر بائیکاٹ کے پیش نظر اس طرح کی کسی سیاسی چال کے لیے نجی طور پر دسمبر 1928 سے ہی زور دیتا آرہا تھا۔ برطانیہ کی نئی لیبر حکومت (جون 1929) نے وائسرائے کی اس تجویز کی توثیق کر دی مگر بیشتر ٹوری اور لیبرل ممبروں نے اسے پسند نہیں کیا۔ اور دارالعوام میں بحث کے دوران اپنی ناپسندیدگی واضح کر دی تھی جس کی وجہ سے اس تجویز کی معتبریت بہت کم ہو گئی تھی۔ 2 نومبر کو گاندھی، موتی لال اور مالویہ نے بھی لیبرل لیڈروں کی طرح اس پیش کش کو قبول کر لیا مگر اس کے ساتھ چار شرطیں بھی جوڑ دیں: گول میز کانفرنس میں ڈومنی ان درجے کی تفصیلات کے بارے میں بھی بحث ہونی چاہیے؛ اس کانفرنس میں کانگریس کو اکثریتی نمائندگی حاصل ہونی چاہیے اور یہ کہ حکومت کو عام معافی اور مصالحت کی پالیسی اپنانی چاہیے۔ بوس نے اس "دہلی بیان" پر دستخط کرنے سے انکار کر دیا۔ نہرو نے دستخط تو کر دیے مگر جلد ہی شکوک و شبہات کا شکار ہو گئے اور اس سے الگ ہو جانا چاہا۔ 23 دسمبر کو اروِن کے ساتھ گاندھی کی ملاقات پر بات چیت ٹوٹ گئی کیونکہ وائسرائے نے کانگریس کی شرطوں کو یک لخت مسترد کر دیا۔

جواہر لال نہرو نے کانگریس کے لاہور اجلاس (دسمبر 1929) کی صدارت کی۔ اور اپنے زوردار "صدارتی خطبے میں تحریک آزادی کے لیے بین الاقوامی اور سماجی اعتبار سے ایک نیا انقلابی تناظر پیش کیا۔ ایک ایسا تناظر جو اس وقت محض ایک چھوٹے سے اشتراکی طبقے تک ہی محدود رہا تھا۔ "میں پورے کھلے دل سے یہ اعتراف کرتا ہوں کہ میں ایک سوشلسٹ اور ری پبلکن ہوں؛ میں حکمرانوں، بادشاہوں، راجاؤں میں، یا ایسے نظام میں یقین نہیں رکھتا جو موجودہ دور میں صنعتی حکمراں پیدا کرتا ہے۔" جواہر لال نہرو نے، زمیندار۔ کسان یا سرمائے۔ محنت تنازعے کے حل کے سلسلے میں گاندھی کے "ٹرسٹی شپ" کے تصور پر بھی تنقید کی۔ "بہت سے انگریز بڑی ایمانداری کے ساتھ خود کو ہندوستان کا ٹرسٹی باور کرتے ہیں مگر ان انگریزوں نے ہی ہمارے ملک کو کہاں پہونچا دیا ہے! بہر حال اجلاس کی کارروائی سے صاف پتہ چلتا ہے کہ گاندھی کو پوری کمان حاصل تھی۔ بوس نے محصولات کی ادائیگی فوراً روک دینے، جہاں کہیں اور جب کبھی بھی ممکن ہو، عام ہڑتال کرانے اور ایک متبادل حکومت قائم کرنے کی جو متبادل تجویز پیش کی تھی اسے مسترد کر دیا گیا تھا۔ گاندھی نے اروِن کی ٹرین پر بم حملے کی مذمت میں ایک قرارداد پاس کرائی (یہ قرارداد 794 کے مقابلے میں 942 ووٹوں سے پاس کی گئی تھی) اور وہ اہم قرارداد بھی پاس کرانے میں کامیاب ہو گئے جس میں اروِن کا حوالہ دوستانہ انداز میں دیا گیا تھا؛ اروِن کی پیش کش پر کانگریس ورکنگ کمیٹی کے ابتدائی ردعمل کو حق بجانب بتایا گیا تھا اور آئندہ گفت و شنید کے دروازے بند کر دینے سے انکار

کیا گیا تھا۔ اس قرارداد کے سلسلے میں گاندھی کا یہ کہنا تھا کہ مندوبین یا تو اسے مکمل طور پر پاس کریں یا مکمل طور پر مسترد کر دیں۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ اگرچہ نہرو کی طرح ہی بوس نے بھی ایک ایسی سول نافرمانی کا تصور کیا پیش کیا تھا جو بالآخر ایک عام ہڑتال پر منتج ہوتی۔ مگر عملی پروگرام طے کرنے کا معاملہ اے آئی سی سی پر اور اس کے وسیلے سے گاندھی پر چھوڑ دیا گیا تھا۔ بہر حال اس طرح کی تمام باتوں کے ساتھ ساتھ اس حقیقت پر بھی توجہ دینے کی ضرورت ہے کہ دنیا کی سب سے بڑی نوآبادی میں سامراج مخالف تحریک اس وقت نئے مرحلے میں داخل ہو گئی جب سال نو کے موقع پر نصف شب میں کانگریس نے بالآخر مکمل سوراج، کا نعرہ اپنایا تھا اور بندے ماترم کی جگہ پر انقلاب زندہ باد کی گونج میں قومی ترنگا لہرایا گیا تھا۔

1930-31: سول نافرمانی تحریک

نمک ستیہ گرہ

کانگریس کے لاہور اجلاس کے بعد دو ماہ مکمل خاموشی رہی کیونکہ ملک اور حکومت، دونوں کو، گاندھی کی طرف سے مکمل سوراج کے لیے غیر تشدد پسندانہ جدوجہد کے طریقہ کار کے اعلان کا انتظار تھا۔ 26/ جنوری کو ملک بھر میں جلسے ہوئے جن میں آزادی کا حلف لیا گیا؛ ہندوستان کے معاشی، سیاسی، ثقافتی اور روحانی استحصال کے لیے انگریزوں کی مذمت کی گئی؛ غلامی کو انسان اور خدا کے تئیں جرم اور پاپ قرار دیا گیا؛ سول نافرمانی کے لیے تیار رہنے کے لیے کہا گیا اور سول نافرمانی میں محصولات کی عدم ادائیگی کو بھی شامل کیا گیا۔ 6 جنوری کو کانگریسی قانون سازوں سے استعفیٰ دینے کے لیے کہا گیا جس پر عام طور پر عمل کیا گیا۔ ناراض گروپ کے لیڈروں میں این۔ جی۔ کالیکر، ستیہ مورتی اور انصاری (جو نہرو رپورٹ سے متعلق مذاکرات کے ٹوٹ جانے کے وقت سے ہی اس بات پر ناخوش تھے کہ کسی طرح کے فرقہ وارانہ معاہدے کے بغیر ہی قومی تحریک کا اگلا مرحلہ شروع کر دیا گیا تھا) جیسے کانگریس کے مسلم لیڈر شامل تھے۔ جہاں تک باقی لوگوں کا تعلق تھا، تو بمبئی اور پونا میں کمیونسٹوں کی قیادت میں کرائی گئی زوردار جی آئی پی ریلوے ہڑتال کو فروری 1930 میں ناکام ہو جانے دیا گیا تھا۔ گاندھی نے 31 جنوری کو اروِن کو جو 11 نکاتی الٹی میٹم دیا تھا وہ بہت سے لیڈروں کے نزدیک مکمل سوراج کی قرارداد سے پیچھے ہٹ جانے کے مترادف تھا، کیونکہ ملک کے سیاسی ڈھانچے میں کسی بھی تبدیلی کا مطالبہ نہیں کیا گیا تھا، یہاں تک کہ ڈومنی آن ورجے کا بھی ذکر نہیں کیا گیا تھا۔ نمک کے معاملے کو مرکزی حیثیت دینے کی بات بھی لوگوں کو کچھ عجیب سی لگی تھی اور خود نہرو نے بھی بعد میں ذکر کیا ہے کہ انھیں بھی اس پر حیرت ہوئی تھی۔

اروِن نے سکریٹری آف اسٹیٹ کے نام اپنے 20 فروری 1930 کے مکتوب میں لکھا تھا کہ "فی الحال نمک ستیہ گرہ کے امکانات سے میری رات کی نیندیں خراب نہیں ہوتیں"۔

بہر حال جلد ہی یہ خدشات غلط ثابت ہوئے اور گاندھی کا موقف کسی حد تک درست ثابت ہوا۔ اگر گاندھی کے 11 نکاتی الٹی میٹم سے قدم پیچھے ہٹا لینے کا احساس ہوا تھا، تو اس کے ساتھ ہی قومی مطالبے کو ایک ٹھوس بنیاد بھی حاصل ہوئی تھی اور اس قومی مطالبے سے خصوصی شکایات بھی جڑ گئی تھیں۔ اروِن کے نام گاندھی کے مراسلے میں عام مفادات کے معاملے (آرمی کے اخراجات اور سول سروس ملازمین کی تنخواہوں میں 50 فی صد تخفیف، مکمل نشہ بندی، سیاسی قیدیوں کی رہائی، سی آئی ڈی کی اصلاح، اسلحہ ایکٹ میں ترمیم تاکہ آتشیں اسلحہ کے لیے لائسنس کے اجراء پر عوامی کنٹرول قائم ہو سکے) کے ساتھ ساتھ تین خاص بورژوائی مطالبے (روپے کی شرح تبادلہ گھٹا کر اشلنگ 4 پنس کر دینے، کپڑا صنعت کو تحفظ فراہم کرنے اور ساحلی جہاز رانی ہندوستانی کمپنیوں کے لیے محفوظ کر دینے) اور تین کسان مطالبے (زمین کے لگان میں پچاس فی صد تخفیف، نمک محصول اور نمک پر حکومت کی اجارہ داری کے خاتمے) شامل تھے۔ یہ بات دلچسپ بھی ہے اور اہم بھی کہ جنوری 1930 میں "مرکنٹائل میرین کانفرنس انگریز جہاز رانوں نیز وال چند ہیرا چند اور لال جی نارن جی کی کمپنی، سندھیا اسٹیم نیوی گیشن کے درمیان تنازعے کو حل کرانے میں ناکام رہی تھی جب کہ بمبئی کے مل مالکان کی ایسوسی ایشن کی مارچ 1930 کی سالانہ رپورٹ میں یہ کہا گیا تھا کہ جاپان اور برطانیہ کی طرف سے درپیش مقابلے کے خلاف تحفظ "صنعت کے لیے زندگی اور موت کا معاملہ بن گیا ہے۔ حکومت نے مارچ 1930 میں برطانوی کپڑے کے تھانوں پر 15 فی صد اور غیر برطانوی درآمدات پر 20 فی صد محصول بڑھا کر بمبئی کے کپڑا مل مالکان کو راضی کرنے کی کسی حد تک کامیاب کوشش کی مگر اس کے پس پشت کارفرما سامراجی ذہنیت ظاہر تھی جس پر بمبئی کے باہر کے تمام کاروباری حلقوں نے زبردست ناراضگی ظاہر کی۔ برلا اس بل کی مخالفت کرتے ہوئے قانون ساز اسمبلی سے یہ کہتے ہوئے واک آؤٹ کر گئے تھے کہ "بمبئی کا تاجر طبقہ اپنا توازن کھو بیٹھا ہے"۔ انھوں نے مل مالکان کو یہ وارننگ بھی دی کہ اگر سامراجی ترجیحی محصول کے ذریعے جاپان کو دور کر دیا گیا تو پھر ایسی صورت میں اگر ان تاجروں نے مستقبل میں کسی طرح کا تحفظ حاصل کرنا چاہا تو انھیں پتھر کی دیواروں سے سر ٹکرانے کے سوا کچھ ہاتھ نہیں لگے گا"۔ (حوالہ: G.P. Birla The Path of Prosperity -p.193) ٹھاکر داس نے 14 فروری 1930 کو FICCI کے سالانہ اجلاس میں قرارداد پیش کی جس کے ذریعے روپے کی اشلنگ 4 پنس کی شرح تبادلہ کی مذمت کی گئی تھی اور جی۔ ڈی برلا نے اس اجلاس کے صدر کی حیثیت میں ہندوستانی معیشت پر برطانوی سرمائے کے شکنجے پر کھل کر تنقید کی اور حکومت کی مالیاتی پالیسیوں کو "امتیازی" قرار دے

کر انھیں تختہ مشق کا نشانہ بنایا۔ 5 مارچ کو برلا کے ایک قریبی مددگار ڈی۔پی کھیتان نے کلکتہ کے ہندوستانی ایوان تجارت کی ایک خصوصی میٹنگ میں یہ اعلان کیا تھا کہ "آخر کار اب ہم پر یہ بات منکشف ہونے لگی ہے کہ ہندوستان جب تک حکومت خوداختیاری حاصل نہیں کرے گا، اپنی معاشی حالت کو سدھارنا اس کے لیے مشکل ہوگا۔"

جہاں تک کسانوں کے معاملوں کا سوال تھا، تو گاندھی جواہر کی ان انقلابی تجویزوں کی توثیق کرنے کے لیے ہرگز تیار نہیں تھے جن میں زمینداروں کے خلاف تحریک شروع کرنے اور لگان نہ ادا کرنے کی بات کہی گئی تھی۔ جواہر لال نے یہ تجویز 15 فروری کو رائے بریلی میں ایک کسان ریلی سے خطاب کرتے ہوئے پیش کی تھی۔ انھوں نے کہا تھا "میرے خیال میں زمیندار طبقہ بالکل فاضل ہے" جواہر لال نہرو نے 26 فروری کو کانگریس کے صوبائی اجلاس میں زمینی بچولیوں کے خاتمے کے لیے جو قرارداد پیش کی تھی اسے نظرانداز کر دیا گیا تھا۔ البتہ جنوری اور فروری 1930 میں گاندھی کی تقریروں اور مضامین میں کسانوں کی مشکلات کا بار بار ذکر کیا گیا اور نمک کے مسئلے کو عام شکایت سے جوڑا گیا۔

گاندھی کے ڈانڈی مارچ کو، جو کہ سابرمتی آشرم سے سمندر کے لیے 12 مارچ کو شروع ہوا تھا اور گجرات کے اہم علاقوں سے گزرا تھا اور جس میں ملک کے تمام حصوں سے تعلق رکھنے والے سابرمتی آشرم کے 71 ممبران بھی شامل تھے؛ خوب تشہیر حاصل ہوئی بلکہ اس کا چرچا دنیا بھر میں ہوا۔ گاندھی نے خود 11 مارچ کو ڈانڈی میں نمک قانون کی خلاف ورزی کرنے کے بعد یہ اعلان کیا تھا کہ "اب بڑے پیمانے پر نمک کی خلاف قانون تیاری اور نیلامی شروع ہو جانی چاہیے، اس کے بعد غیر ملکی کپڑے اور شراب کا بائیکاٹ شروع ہوگا اور ہر شخص کو من مانی کرنے کا حق حاصل ہوگا" مگر اس کے لیے عدم تشدد اور سچائی کا راستہ اختیار کرنا ہوگا اور یہ کہ ان کی گرفتاری کے بعد مقامی لیڈروں کی پیروی کی جانی چاہیے۔ "قومی تحریک کی نچلی سطح کا دباؤ شروع سے ہی موجود رہا تھا جس کا پتہ اس بات سے چلا تھا کہ گاندھی کے مارچ کے راستے میں پڑنے والے گاؤں کے عہدہ داروں نے استعفیٰ دینا شروع کر دیا تھا، اور ضلع کھیڑا کے بوساڑ تعلقے کے ایک گاؤں 'راس' کے تعلقہ داروں نے 19 مارچ کو یہ درخواست کی تھی کہ انھیں لگان نہ ادا کرنے کی اجازت دی جائے۔ گاندھی نے اس درخواست کو کافی غور و خوض کے بعد منظور کر لیا تھا۔ مئی کے وسط میں گاندھی کی گرفتاری کے بعد کانگریس ورکنگ کمیٹی نے ان صوبوں میں لگان نہ ادا کرنے کی اجازت دی دی جہاں رعیت واڑی بندوبست تھا۔ اس کے علاوہ زمینداری بندوبست والے صوبوں میں چوکیداری محصول ادا نہ کرنے کی مہم اور سی پی میں محکمہ جنگلات کے قوانین کی خلاف ورزی کی بھی اجازت دی دی گئی تھی۔

چٹاگانگ، پشاور، شولاپور

اپریل کے اختتام تک انگریزوں کا رد عمل اعتدال پسندانہ رہا تھا، حالانکہ پٹیل 6 مارچ کو اور جواہر لال 16 اپریل کو گرفتار کر لیے گئے تھے اور کراچی، کلکتہ اور مدراس میں پولس اور بھیڑ کے درمیان ٹکراؤ کے پر تشدد واقعات ہوئے تھے۔ تشدد کے تین بڑے واقعات سے صورت حال بالکل ہی تبدیل ہو گئی تھی اور چٹاگانگ، پشاور اور شولاپور میں گاندھیائی سول نافرمانی تمام حدود کو پار کر گئی تھی۔ انقلابیوں کے چٹاگانگ گروپ نے سوریہ سین کی قیادت میں 18 اپریل کو دہشت پسندی کی تاریخ میں سب سے بڑی بغاوت کرتے ہوئے مقامی اسلحہ خانے پر قبضہ کر لیا تھا، انڈین ری پبلکن آرمی، کے نام پر آزادی کا اعلان کر دیا تھا اور 22 اپریل کو جلال آباد کی پہاڑیوں پر سرکاری فوجوں کے ساتھ بہادرانہ جنگ بھی لڑی تھی جس میں 12 انقلابی شہید ہو گئے تھے۔ اگرچہ یہ صورت حال گاندھیائی طریقہ کار سے قطعی مختلف تھی مگر انقلابیوں نے اسلحہ خانہ پر قبضہ کرتے ہوئے "گاندھی راج" کا ہی نعرہ بلند کیا تھا۔ چٹاگانگ کا یہ واقعہ بنگال میں دہشت پسندی کی تیز و تند لہر کا نقیب ثابت ہوا جہاں 1930 میں کم از کم 56 واقعات دہشت پسندی اور تشدد پسندی کے ہوئے، (جب کہ 1919 سے 1929 کی پوری دہائی میں محض 47 واقعات ہوئے تھے) جن میں 8 دسمبر کو کلکتہ میں رائٹرس بلڈنگ میں واقع سرکاری صدر دفتر پر حملہ بھی شامل ہے۔ اس اثناء میں ہندوستان سوشلسٹ ری پبلکن آرمی، بھی پنجاب میں کافی سرگرم ہو چکی تھی جہاں 1930 میں دہشت پسندی کے 26 واقعات ہوئے تھے۔

بہر حال انگریزوں کے نقطہ نظر سے سب سے زیادہ خطرے کی بات روایتی پر انتہائی حساس علاقے، یعنی صوبہ سرحد کی راجدھانی پشاور میں ہونے والی ہلچل تھی۔ پشاور کے قریب عثمان زئی کے ایک خوش حال گھرانے کے چشم و چراغ عبدالغفار خاں نے 1912 سے ہی اپنے پٹھان ہم وطنوں میں تعلیمی اور سماجی اصلاح کا کام شروع کر رکھا تھا۔ انھیں یہ تحریک دیوبند کے قوم پرست مسلم گروپ سے حاصل ہوئی تھی۔ اس کے علاوہ خلافت تحریک اور افغانستان کے حکمراں امیر امان اللہ خان (جنھیں اپنی سوویت نواز اور ترقی پسندانہ پالیسیوں کی وجہ سے 1928 میں تخت سے بے دخل کر دیا گیا تھا) کی اصلاحات نے بھی انھیں کافی متاثر کیا تھا۔ عبدالغفار خان نے، جنھیں 1920 کی دہائی کے وسط سے بادشاہ خاں بھی کہا جانے لگا تھا، پشتو زبان کا پہلا روزنامہ "پختون" مئی 1928 سے نکالنا شروع کیا اور اگلے سال "خدائی خدمت گار" نام سے ایک رضاکار دستہ تیار کرنا شروع کر دیا جس کے ارکان لال رنگ کی قمیص پہنتے تھے کیونکہ گاؤں کا دورہ کرتے وقت یہ رنگ جلد خراب یا میلا نہیں ہوتا تھا۔ 1929 تک عبدالغفار خان گاندھی کے ایک راسخ العقیدہ شاگرد بن چکے تھے۔

عدم تشدد کے فلسفے سے پٹھانوں میں دیرینہ دشمنی کی روایت کو ختم کرنے میں اور اس طرح اندرونی سماجی تناؤ کو کم کرنے میں بڑی مدد ملی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ خدائی خدمت گاروں میں چھوٹے اور بچولیئے زمیندار، لگان دار، غریب کسان اور زرعی مزدور بھی شامل تھے۔ کانگریس کے اجلاس کے بعد جس میں کہ پٹھانوں کی ایک بڑی جمعیت کے ساتھ غفار خان نے بھی شرکت کی تھی، خدائی خدمت گار کی رکنیت اچانک 500 سے بڑھ کر چھ ماہ کے اندر اندر 50,000 ہو گئی تھی۔ 5/ مئی 1930 کو حکومت کے ایک نوٹ میں، پشاور کے آس پاس کے دیہات میں 'نوجوان بھارت سبھا' کی مقامی شاخ کی اشتراکی سرگرمیوں کی بات بھی کہی گئی تھی۔ 23 اپریل کو بادشاہ خاں اور دوسرے لیڈروں کی گرفتاری پر پشاور میں زبردست ہلچل مچ گئی، مختلف مقامات پر لوگوں کی بھیڑ نے مسلح گاڑیوں سے ٹکر لی اور قصہ خوانی بازار میں تین گھنٹے تک مسلسل فائرنگ کا سامنا کیا۔ سرکاری نوٹ کے مطابق اس فائرنگ میں 30 لوگ مارے گئے تھے جب کہ غیر سرکاری طور پر مارے جانے والوں کی تعداد 200 اور 250 کے درمیان بتائی گئی تھی۔ گڑھوال رائفلو کو طلب کر کے ہندو فوجیوں کو مسلم بھیڑ کے مقابلے پر کھڑا کر دیا گیا تھا، جنھوں نے بھیڑ پر فائرنگ کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ کورٹ مارشل کیے جانے سے پہلے ان ہندو فوجیوں نے اعلان کرتے ہوئے کہا تھا کہ "ہم اپنے غیر مسلح مسلم بھائیون کو گولی نہیں ماریں گے، کیونکہ ہندوستانی آرمی ہندوستان کے دشمنوں سے لڑنے کے لیے ہے۔ آپ چاہیں تو ہمیں اپنی بندوقوں سے اڑا سکتے ہیں"۔ انگریز پشاور میں امن و قانون دس دن بعد ہی بحال کرا سکے تھے اور پورے صوبہ سرحد میں مارشل لا کے نفاذ کے ساتھ خوف و دہشت کا ماحول پیدا کر دیا گیا تھا۔ اروِن نے سکریٹری آف اسٹیٹ کو یہ رپورٹ دی تھی کہ "صوبہ سرحد کے چیف کمشنر کی دماغی حالت ٹھیک نہیں ہے اور یہ کہ 92 فی صد مسلم آبادی والے سرحدی صوبے میں انگریزوں کے خلاف اتنی زبردست شورش سے سارے سرکاری اندازے اور حکمت عملی مخدوش ہو گئی ہے۔" اگرچہ غفار خان کی اپنی تحریک پشاور، کوہاٹ، بنو، ڈیرہ اسماعیل خاں اور ہزارہ اضلاع تک ہی محدود رہی تھی مگر 1930 کے اواخر میں بعض قبائلی علاقوں میں بھی شورش ہوتی رہی تھی اور ان قبائلیوں پر بم باری بھی کی گئی تھی۔ اس مرتبہ قبائلی حملہ آوروں نے گاؤں وغیرہ کی لوٹ پاٹ سے احتراز کیا اور انتہائی سادگی کے ساتھ بادشاہ خان، ملنگ بابا (گاندھی) اور انقلاب کی رہائی کا مطالبہ کیا۔ 'انقلاب زندہ باد' کے نعرے سن سن کر وہ یہ سمجھ بیٹھے تھے کہ "انقلاب" بھی کوئی بڑا لیڈر ہے جو جیل میں بند ہے۔

مہاراشٹر کے صنعتی شہر شولاپور میں گاندھی کی گرفتاری کی خبر پر 7/ مئی سے کپڑا ملوں میں ہڑتال ہو گئی۔ زیادہ تر مل ورکروں پر مشتمل بھیڑ شراب کی دکانیں نذر آتش کرتی، پولس چوکیوں پر حملے کرتی، عدالتوں، میونسپل عمارتوں اور ریلوے اسٹیشنوں کو نشانہ بنایا جاتا۔ مارشل لا لگا کر

16 مئی کے بعد ہی امن و قانون بحال کیا جا سکا تھا۔ اگرچہ شراب کی ساری دکانیں توڑ پھوڑ دی گئی تھیں مگر بد مستی کا کوئی واقعہ سامنے نہیں آیا تھا اور حکام کے لیے بڑی حیرت کی بات تو یہ تھی کہ 10/ مئی کو بقر عید کا تہوار خیر و عافیت کے ساتھ گزر گیا تھا جب کہ دو روز قبل ہی تین مسلم پولس مین زندہ ہی جلا دیئے گئے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کچھ دنوں کے لیے ایک متوازی حکومت بھی قائم کی گئی تھی۔ شولاپور کے ضلع مجسٹریٹ نے 13/ مئی کو اپنی رپورٹ میں لکھا تھا کہ "کانگریس کے رضاکار ٹریفک کو ڈائریکٹ کر رہے ہیں اور مجھے بتایا گیا ہے کہ ضلع مجسٹریٹ کے عہدے سے شروع کر کے ادنیٰ درجے تک افسران کا ایک نظام بھی قائم کیا گیا ہے"۔ یہ ایک دلچسپ بات ہے کہ کامگار طبقہ، جس نے شولاپور کی شورش میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا، سول نافرمانی کے ابتدائی دنوں میں کچھ دوسرے مرکزوں میں بھی سرگرم رہا تھا۔ مثلاً کراچی بندرگاہ کے مزدور، مدراس میں چولائی مل کے ورکرز اور کلکتہ کے مضافاتی علاقوں کے ٹرانسپورٹ ورکرز سرگرم رہے تھے اور اپریل کے وسط میں نہرو کی گرفتاری اور 4 مئی کو گاندھی کی گرفتاری پر بج بج مل ورکروں کا پولس کے ساتھ ٹکراؤ بھی ہوا تھا۔ یہ سب کچھ اس حقیقت کے باوجود ہوا تھا کہ گاندھی کے 11 نکاتی مطالبے میں اور عام طور پر کانگریس کی حکمت عملی میں محنت کش طبقے کی شکایتوں کو یک لخت نظر انداز کر دیا گیا تھا اور خود کمیونسٹوں نے بھی اپنی شدت پسندانہ اشتراکیت کی وجہ سے سول نافرمانی کی تحریک میں حصہ نہیں لیا تھا۔

سول نافرمانی کے مرحلے

چوری چورا کے بعد کے واقعات کے قطعی برعکس، گاندھی نے چٹاگانگ، پشاور، شولاپور کے پر تشدد واقعات کے باوجود بھی تحریک کو واپس نہیں لیا۔ انھوں نے 27 فروری 1930 کے 'ینگ انڈیا' کے ایک مضمون میں یہ یقین دہانی کرائی تھی کہ انھیں اب راستہ معلوم ہو چکا ہے، یہ باردولی تحریک کو واپس لے لینے کا راستہ نہیں ہے بلکہ تشدد کے بعض واقعات کے باوجود، عدم تشدد کے دھارے کے ساتھ آگے بڑھتے جانے کا راستہ ہے۔ سول نافرمانی جب ایک بار شروع ہو گئی ہے تو اسے اب روکا نہیں جا سکتا اور روکا جانا بھی نہیں چاہیے۔" اس معاملے سے نیز دوسرے متعدد پہلوؤں کے اعتبار سے بھی 1930 میں انقلاب پسندی 22-1921 کے مقابلے میں کہیں آگے نکل چکی تھی۔ اب اعلان شدہ نصب العین مکمل آزادی کا تھا جب کہ اس سے پہلے کی تحریک کا مقصد دو غلط اقدامات کا ازالہ اور سوراج تھا۔ اس مرتبہ قانون کی خلاف ورزی کی بات شروع سے ہی واضح تھی، جب کہ اس سے پہلے معاملہ محض ایک غیر ملکی حکومت کے ساتھ تعاون نہ کرنے تک ہی محدود تھا۔ اب جیل جانے والوں کی تعداد بھی 22-1921 کے مقابلے میں تین گنا ہو چکی

تھی۔ یہ بات بھی مد نظر رہے کہ اب قومی تحریک میں شمولیت میں 22-1921 کے مقابلے میں کہیں زیادہ خطرہ تھا، کیونکہ مئی کے بعد حکومت خوف زدہ ہو کر پر امن ستیہ گرہیوں کے سلسلے میں بھی وحشیانہ طریقہ کار پر اتر آئی تھی۔ مئی 1930 میں بمبئی کے ایک ساحلی مقام دھر ساتا میں ایک خوف زدہ، غیر ملکی صحافی ویب ملر نے "کسی طرح کی مزاحمت نہ کرنے والے لوگوں کو بے رحمی کے ساتھ پیٹ پیٹ کر کچومر بنا دینے کا واقعہ اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔" ٹھاکر داس نے بھی عورتوں اور دس بارہ برس کے بچوں کے ساتھ وحشیانہ مار پیٹ کے واقعات پر شکایت کی تھی۔ زندگی اور جسمانی اعضاء کے ساتھ ساتھ غریب لوگوں کی چھوٹی موٹی املاک بھی خطرے میں تھیں کیونکہ مال گزاری یا چوکیداری محصول کی عدم ادائیگی پر گھر کا سارا اسباب قرق کر لیا جاتا تھا۔ ایک خاص بات یہ تھی کہ اس تحریک میں عورتوں اور نو عمر لوگوں نے بھی خوب حصہ لیا۔ 15 نومبر 1930 کو جو 29054 لوگ جیل میں تھے ان میں کم سے کم 2050 افراد 17 سال سے کم عمر کے تھے، اور ان میں 359 خواتین تھیں۔ سول نافرمانی کی تحریک ہندوستانی خواتین کی پیش رفت کے لیے ایک نمایاں سنگ میل ثابت ہوئی اس بات کا اعتراف یوپی کے ایک پولس افسر نے بھی بڑے جارحانہ انداز میں کیا تھا۔ "ہندوستانی عورت کو یہ یک وقت گھریلو آزادی کے لیے بھی لڑنا پڑ رہا ہے اور قومی آزادی کے لیے بھی! اور ایک عورت ہونے کے ناطے وہ اپنے مطالبات کو منوانے کے لیے غیر منطقی اور غیر استدلالی طریقہ اختیار کرتی ہے مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ ایک عورت ہونے کے ناطے اسے مردوں پر پورا اثر حاصل ہے...... پولس افسروں کے بشمول بہت سے افسروں کو...... مردوں کی بجائے ان کی خاتون رشتہ داروں کے طعنوں اور طنز کی چوٹ کہیں زیادہ سہنی پڑی ہے"۔ ظاہر ہے کہ اس پولس افسر کے اس اعتراف میں وہ مردانہ جذبہ پوری طرح جھلک رہا ہے جو عورتوں کے بڑھتے قدم کو برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں تھا۔

بہر حال یہ کہنا کہ سول نافرمانی کی تحریک ہر لحاظ سے عدم تعاون کی تحریک سے آگے نکل گئی تھی، حقیقت کو سرسری انداز میں پیش کرنے کے مترادف ہو گا۔ 22-1919 کے دوران جو ہندو مسلم اتحاد ابھرا ہوا تھا وہ 1930 میں قصہ پارینہ بن چکا تھا۔ کیونکہ اس درمیانی عرصہ میں نہ صرف یہ کہ نہرو رپورٹ پر مذاکرات ٹوٹ گئے تھے بلکہ اس ایک دہائی میں فرقہ وارانہ تنظیموں کا بھی سیلاب سا آ گیا تھا اور برادر کشی کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔ صوبہ سرحد سے باہر نیز دہلی جیسے اکا دکا مقامات پر جہاں کہ پندرہ روزہ سرکاری رپورٹ میں ستمبر 1930 میں یہ تسلیم کیا گیا تھا کہ کانگریس نچلی ذات کے مسلمانوں کے ایک بڑے حصے کو اپنا ہمنوا بنانے میں "قابل ستائش طریقے پر کامیاب" ہو گئی ہے، سول نافرمانی تحریک میں مسلمانوں کی شمولیت برائے نام ہی رہی تھی۔ مثال کے طور پر یوپی میں، جہاں کہ 22-1919 میں خلافت تحریک اور کانگریس کے درمیان اتنا مضبوط

اتحاد رہا تھا۔ الہ آباد میں سول نافرمانی کی تحریک کے سلسلے میں 1930 اور 1933 کے درمیان جو 679 لوگ جیل میں بند کیے گئے تھے ان میں محض 9 مسلمان تھے۔ (گیان پانڈے۔ صفحہ 112)۔
عدم تعاون تحریک کے برخلاف، سول نافرمانی کی تحریک کے موقع پر ایک بار پھر محنت کش طبقے میں کوئی ہل چل نہیں ہوئی! جون 1930 کی ایک سرکاری رپورٹ میں کہا گیا تھا کہ "بمبئی کی صورتحال کے سلسلے میں ایک بڑی تسلی بخش بات یہ ہے کہ فی الوقت شہر کے مل ورکروں پر کوئی اثر نہیں ہے۔ ...... مل ورکر شاید پچھلے سال کی ہڑتال کے اثرات نہیں بھولے ہیں۔ (ہوم پولٹیکل، 257/v/1930)۔ پھر یہ کہ اس تحریک کے دوران، وکیلوں کے وکالت چھوڑ دینے یا طلباء کے کالجوں اور اسکولوں سے باہر نکل آنے اور قومی اسکول اور کالج شروع کرنے جیسی کوئی پرانی بات بھی دیکھنے میں نہیں آئی۔ گاندھی نے کانگریس کے لاہور اجلاس میں اسکولوں اور عدالتوں کے بائیکاٹ کو ناقابل عمل قرار دیتے ہوئے مسترد کر دیا تھا۔ "میرے خیال میں ہمارے ارد گرد کے ماحول میں اس طرح کا بائیکاٹ ہمارے لیے ضروری نہیں ہے"۔ بہار کانگریس کی جولائی 1930 کی ایک رپورٹ میں اعتراف کیا گیا تھا کہ "اس سلسلے میں طلباء اور وکلاء نے کوئی مثبت رد عمل ظاہر نہیں کیا تھا" اور بمبئی کانگریس نے بار بار پمفلٹ شائع کر کے "ہمارے بے جان طلباء" کی مذمت کی تھی۔

محنت کش اور شہری تعلیم یافتہ طبقے کی اس سرد مہری کو حد سے کہیں زیادہ پورا کیا کاروباری اور کسان طبقے نے! سول نافرمانی کی ایک ایسی سماجی تاریخ لکھنی ہوگی جس میں یہ دیکھا جائے کہ تحریکوں میں مختلف علاقوں اور سماج کے ان دونوں طبقوں (کاروباری و کسان) کی شمولیت میں کس طرح کا تنوع رہا ہے۔ کانگریس 22-1921 کے مقابلے میں اب تنظیمی اعتبار سے بھی کافی مضبوط ہو چکی تھی، 22-1921 میں تو اس نے ایک عوامی پارٹی کی شکل اختیار کرنے کی سمت میں محض پہلا قدم ہی بڑھایا تھا۔ جیسا کہ ہم پہلے بھی سرسری طور پر ذکر کر چکے ہیں، اس کا ایک متضاد اثر مرتب ہوا تھا۔ تنظیمی نظم و ضبط اور طاقت کی بدولت محض مخصوص اور چیدہ نوعیت کے امور کے سلسلے میں موثر پیش رفت کی گئی مگر اس کے ساتھ ہی اس کی وجہ سے عوامی جوش اور انقلاب پسندی پر روک بھی لگی۔ زمان و مکان کے تغیرات ایک بار پھر اہمیت حاصل کر گئے تھے۔ سی پی، مہاراشٹر اور کرناٹک جیسے خطوں یا وسطی ہندوستان کے لبرل علاقوں میں، جہاں کہ تحریک عدم تعاون کا بہت کم اثر رہا تھا، اور گاندھی کے تصورات کو اب بھی غیر واضح سمجھا جاتا تھا: سول نافرمانی کے زمانے میں بھی ایک طرح کا بنیادی اور الف سعادتی جوش و خروش اب بھی موجود تھا جو کہ گاندھیائی اثرات والے گجرات، یوپی، بہار یا ساحلی آندھرا جیسے علاقوں میں ناپید تھا۔ تاہم گرفتاری دینے کی گاندھی کی بنیادی حکمت عملی کا مطلب تھا سرکردہ لیڈروں اور کارکنوں کو منظر نامے سے ہٹا دینا، جس سے تحریک کی نچلی سطح کے لوگوں کو غبار نکالنے کے لیے تشدد پسندانہ کارروائیوں کا موقع مل جاتا، اس

طرح کے عناصر کو بھی علاقوں میں اور خاص طور پر زرعی اشیاء کی قیمتوں میں تیزی سے گراوٹ کی وجہ سے کافی طاقت حاصل ہو گئی تھی۔

ستمبر۔اکتوبر1930 کو سول نافرمانی کے دونوں مرحلوں کے درمیانی خط فاصل قرار دیا جاسکتا ہے۔ پہلے مرحلے میں قصبوں اور شہروں کے بورژوائی طبقے نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور گاندھیائی قیادت کے ذریعے چنے جانے والے معاملات کے سلسلے میں کسانوں کو متحرک کیا۔ ان معاملات میں نمک ستیہ گرہ، محصولات کی عدم ادائیگی، شراب کی دکانوں پر دھرنا، اور چوکیداری ٹیکس کی عدم ادائیگی قابل ذکر ہیں۔ بمبئی کے گورنر "......Sy kes سے ہمیں یہ اطلاع ملتی ہے کہ بمبئی کا سوداگر طبقہ گاندھی کو مدد کی پیش کش کر چکا ہے، حالانکہ یہی طبقہ 22-1921 کی تحریک عدم تعاون کے آخری مرحلے تک گاندھی کو یہ مدد دینے کے لیے تیار نہیں ہوا تھا" (اروِن بنام سکریٹری آف اسٹیٹ، 24اپریل1930)۔ تجارتی اور کاروباری لیڈروں میں جی۔ڈی برلا نے، برطانوی سراغ رساں ادارے کے مطابق، تحریک کی ایک سے پانچ لاکھ روپے تک کی مدد کی تھی۔ اور "ٹھاکرداس کاغذات" میں محفوظ ان کے مراسلوں سے پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے کلکتہ کے مارواڑی درآمدکاروں کو اس بات کے لیے آمادہ کرنے کی سرگرم کوشش کی تھی کہ وہ اپنے تجارتی روابط احمدآباد اور بمبئی کی کاٹن ملوں کا ساتھ قائم کریں۔ جہاں جمنا لال بجاج کو کانگریس کا ایک با قاعدہ کارکن ہونے کی وجہ سے سرمایہ داروں میں ایک منفرد حیثیت حاصل ہے (وہ برسوں اے آئی سی سی کے خزانچی رہے اور1930 میں جیل بھی گئے تھے)، وال چند ہیراچند نے FICCI کے نام اپنے 28اپریل1930 کے مراسلے کے ذریعے ساتھی تاجروں سے "کنارہ کش رہنے کی پالیسی، ترک کردینے کی اپیل کی تھی۔ "اگر حکومت ہند ہندوستانی تجارتی رائے عامہ سے آنکھیں ملانے کے لیے تیار نہیں ہے، تو ایسی حالت میں ہمیں ان لوگوں کا ساتھ دینا ہی ہوگا جو سوراج کے لیے حکومت سے لڑ رہے ہیں"۔ مئی1930 میں FICCI نے یہ فیصلہ کیا کہ جب تک گاندھی گول میز کانفرنس سے دور رہیں گے اور وائسرائے ڈومنی ان کا وعدہ نہیں کرے گا وہ بھی اس کا بائیکاٹ کرتا رہے گا۔ 1921 کے حکومت کے وفاداروں لال جی نارن جی اور ٹھاکرداس نے بھی Ficcl کے اس احتجاج نامے پر دستخط کیے تھے اور پورے عرصہ ٹھاکرداس کے توسط سے افسران کے ساتھ رابطہ بھی قائم رکھا تھا، حالانکہ لال جی نارن جی نے مئی1930 میں وائسرائے سے "مالیات، مالیاتی پالیسی، کرنسی اور محکمہ ریل پر مکمل ہندوستانی کنٹرول" کا مطالبہ بھی کیا تھا۔ یہ صحیح ہے کہ بمبئی کے مل مالکان کے ساتھ کانگریس کے روابط، کپڑے کی بڑھتی ہوئی قیمتوں، مل میں تیار کپڑے کو کھادی کے طور پر پاس کرنے، غیر ملکی سوت کے استعمال جیسی باتوں کی وجہ سے کافی کشیدہ رہے تھے۔ (اگست1930 میں بمبئی کی 24 ملوں کو غیر سودیشی قرار دے کر بلیک لسٹ کردیا گیا تھا)۔ اگرچہ احمد

آباد کے مل مالکان امبالال سارا بھائی، اور کستور بھائی لال بھائی نے ان شکایتوں کو دور کرنے میں موتی لال نہرو کی مدد کی تھی، مگر سوداگر اور چھوٹے موٹے تاجر 1921 کی طرح ہی اب بھی قومی تحریک میں صنعت کاروں سے کہیں زیادہ بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہے تھے۔ غیر ملکی سامان نہ منگانے کے لیے سوداگروں کی حلف برداری بمبئی، امرت سر، دہلی، اور کلکتہ میں (جہاں مارواڑی درآمد کاروں نے اس طرح کا پیان 30/اپریل کو کیا تھا) ایک عام سی بات کی شکل اختیار کر گئی تھی، اور عورتوں کے ذریعے دھرنے اور مظاہرے کے مقابلے میں یہ پیاں کہیں زیادہ کارگر ثابت ہوا تھا۔ اس میں شک نہیں کہ عالمی کساد بازاری کی وجہ سے قیمتوں میں گراوٹ کے پیش نظر مزید درآمدات کے آرڈر منسوخ کر دینے سے بعض اوقات مالی فائدہ بھی ہوتا تھا اور یہ بات وطن پرستی کے کھاتے میں بھی جاتی تھی مگر بمبئی کی یکے بعد دیگرے دو سرکاری رپورٹوں سے اس کے طویل مدتی اور نظریاتی پہلوؤں کا بھی پتہ چلتا ہے۔

"بمبئی کے تاجر حکومت ہند کی معاشی اور تجارتی پالیسیوں سے کافی عرصہ سے نامطمئن چلے آرہے ہیں...... ان تاجروں کا خیال یہ ہے کہ، اگر اس وقت کوئی قربانی دی جائے تو اس کی اہمیت ہوگی، بشرطیکہ اس سے انھیں وہ معاشی اور مالیاتی خود مختاری حاصل ہوتی ہو، جس کے لیے وہ ایک بڑے عرصہ سے کوشاں ہیں" (ایچ۔ جی۔ ہیگ، 13/ جون 1930، ہوم پولٹیکل، ایف۔ این 457/v/1930...... ایک انتہائی اثر انگیز خصوصیت یہ ہے کہ بہت سارے معمولی، سنجیدہ اور حساس قسم کے تاجر اس تحریک کو جاری رکھنے کے لیے آمادہ معلوم ہوتے ہیں، خواہ اس کے نقصانات ان کے سامنے ہی کیوں نہ آگئے ہوں"۔ (پیٹری، 20/اگست 1930، ہوم پولٹیکل، ایف۔ این۔504/1930)۔

اس کا واضح نتیجہ برطانوی کپڑے کی درآمد کاری میں بھاری گراوٹ کی شکل میں سامنے آیا، جو درآمد کاری 1929 میں 26 ملین پونڈ کے بقدر تھی وہ 1930 میں گھٹ کر 13.7 ملین پونڈ کے بقدر رہ گئی تھی، اور مقدار کی لحاظ سے 30-1929 میں 1240 ملین گز کی جگہ پر 31-1930 میں محض 523 ملین گز کپڑا درآمد کیا گیا تھا۔ یہ صحیح ہے کہ کساد بازاری کی وجہ سے پوری دنیا میں ہی تجارت میں گراوٹ آرہی تھی مگر مارچ 1931 میں بمبئی کے مل مالکان کی انجمن سے ہوئی مودی کے خطاب میں اب بھی بہت دلچسپ باتیں سامنے آتی ہیں۔

"سودیشی تحریک سے...... بلاشبہ ایک انتہائی سنگین مشکل کے وقت میں ہندوستانی صنعت کو بڑی مدد ملی" اور "اب یہ کہا جاسکتا ہے کہ مستقبل کا دامن بھی امیدوں سے بھرا ہوا ہے"، دوسری برطانوی درآمدات کو بھی دھکا پہونچا، اور 1930 میں مئی سے اگست تک برٹش کمشنر کے دفتر میں گوروں کی فرموں، خصوصاً امپیریل ٹوباکو، ڈنلپ وغیرہ کی پرتشویش شکایتوں اور رپورٹوں کی بھرمار

رہی تھی۔

دیہی علاقوں میں گاندھی کی سول نافرمانی تحریک ابتدائی "سرکاری" انداز میں ان مقامات سے شروع ہوئی جو گاندھی کے ذریعے دیہی تعمیراتی کاموں سے پہلے ہی روشناس ہو چکے تھے۔ ان میں گجرات میں بارودلی اور کھیڑا، بنگال میں بنکورا اور آرام باغ، نیز بہار میں ضلع بھاگلپور میں بیہ پور کے نام قابل ذکر ہیں۔ نمک ستیہ گرہ ابتدا میں ایک اہم محرک ثابت ہوا تھا مگر مانسون شروع ہو جانے کی وجہ سے خلاف قانون طریقے پر نمک کی تیاری مشکل ہو گئی تھی اور اس طرح اس ستیہ گرہ کو مسلسل بنیاد پر محض بمبئی پریزیڈنسی، آسام میں بالاسوریا بنگال میں مدناپور کی ساحلی پٹی میں ہی جاری رکھا جا سکا تھا۔ شراب کی دکانوں اور اس کے لائسنس کی نیلامی کے خلاف دھرنے اور مظاہرے کو چھوٹے شہروں اور دیہات میں کافی اہم نوعیت حاصل ہو گئی تھی اور بہار کے شمالی و وسطی اضلاع اور مدناپور جیسے علاقوں میں کسانوں کی اکثریت نے چوکیداری ٹیکس ادا کرنے سے صاف انکار کر دیا تھا۔ دیہی افسروں کے اجتماعی استعفوں کے ذریعے دیہی انتظامیہ کو مفلوج کر دینے کی کوشش کی گئی تھی۔ چنانچہ 21/ جون تک کھیڑا میں 655 میں سے 224 کھیا مستعفی ہو چکے تھے۔ ضلع کھیڑا کے آنند، بورساڈ اور عیاڈ تعلقے نیز ضلع سورت کا بارودلی تعلقہ لگان کی عدم ادائیگی تحریک کے بڑے مرکز بن گئے تھے اور پٹی داروں نے "ہجرت" کر کے پڑوس کی دیہی ریاست بڑودہ میں پناہ لے لی تھی۔ کھیڑا میں اس ہجرت کے نقطہ عروج پر اکتوبر میں تقریباً 15 ہزار کسان ہجرت کر گئے تھے۔ بارودلی کے مال گزاری کے 397,000 روپے کے کوٹے میں سے گاندھی۔ ارون معاہدے پر دستخط ہونے تک صرف 20,000 روپے ہی وصول ہوئے تھے۔ وسطی صوبہ جات (سی۔پی) مہاراشٹر، اور کرناٹک میں کانگریسی قیادت نے جنگلاتی قواعد وضوابط کے سلسلے میں قبائلیوں اور کسانوں کی ناراضگی سے فائدہ اٹھانے کی محتاط کوشش کی اور "جنگل ستیہ گرہ" کی تربیت کے لیے کیمپ بھی قائم کیے تھے اور ستیہ گرہ مرکزوں کا انتخاب کافی سوچ سمجھ کر کیا تھا، اور تحریک کو محکمۂ جنگلات کے نیلاموں کے بائیکاٹ، چارے اور عمارتی لکڑی کے استعمال پر پابندی کی پر امن خلاف ورزی، اور خلاف قانون طریقہ پر حاصل کی گئی جنگلاتی پیداوار کی عوامی نیلامی تک محدود رکھنے کی کوشش کی۔ کرناٹک ستیہ گرہ منڈل نے تو ان درختوں کی قسموں کی بھی نشان دہی کرنے کی کوشش کی تھی جنھیں کاٹا جانا تھا۔

ستیہ گرہ کے پہلے مرحلے میں اس کی طاقت کا مظاہرہ یرودہ جیل کے ناکام مذاکرات کے موقع پر قومی قیادت کے ذریعے اختیار کردہ سخت موقف کی شکل میں ہوا تھا۔ یہ مذاکرات جولائی، اگست 1930 میں سپرو اور جیاکر کی ثالثی کی کوششوں کے نتیجے میں شروع ہوئے تھے۔ گاندھی نے سپرو کے توسط سے موتی لال اور جواہر لال کو بھیجے گئے اپنے رقعے میں "عبوری تحفظات" کے سلسلے میں

تبادلہ خیال کے امکان کے بارے میں اپنا عندیہ ظاہر کیا تھا، لیکن اس کے ساتھ ہی انھوں نے یہ بھی واضح کر دیا تھا کہ اس سلسلے میں "...... جواہر لال کی رائے کو آخری فیصلے کی حیثیت حاصل ہونی چاہیے"۔ ان کا یہ بھی کہنا تھا کہ "لاہور قرار داد کے سلسلے میں اور زیادہ مضبوط موقف کی تائید کرنے میں انھیں ذرا بھی پس و پیش نہیں ہوگا" یروودہ سے گاندھی اور نہرو دوں کے 15/ اگست کے مشترکہ مراسلے میں ایک مکمل قومی حکومت کے مطالبے پر اصرار کیا گیا تھا، ایک ایسی قومی حکومت جسے دفاع اور مالیات پر مکمل کنٹرول حاصل ہو اور برطانوی مالیاتی دعووں کے تصفیے کے لیے ایک آزاد ٹریبونل قائم ہو۔ اس نکتے پر بات چیت کا ٹوٹ جانا فطری تھا۔ اس تحریک کی طاقت کا مظاہرہ ستمبر 1930 میں قانون ساز اسمبلی کے انتخابات کے کامیاب بائیکاٹ کی شکل میں بھی ہوا۔ بمبئی کے شہری ہندو حلقوں میں محض 8 فیصد ووٹ پڑے جب کہ رائے دہی کا کل ہند اوسط 1926 کے 48.67 فی صد کے مقابلے میں محض 26.1 فی صد رہا تھا۔

محض چھ ماہ بعد ہی، یعنی فروری۔ مارچ 1931 میں دہلی میں اروِن کے ساتھ اپنی گفت و شنید میں بھی گاندھی نمایاں طور پر ایک قطعی مختلف اور کہیں زیادہ اعتدال پسندانہ موقف اختیار کرنے والے تھے۔ ان کے اس رویے کی توضیح سول نافرمانی کے تغیر پذیر رُخ کی روشنی میں کی جاسکتی ہے۔

ستمبر 1930 کے بعد سے سرکاری رپورٹوں میں تکرار کے ساتھ اس بات پر زور دیا جارہا تھا کہ اس تحریک کا جوش و خروش اور شہری علاقوں کے تاجر طبقے کی طرف سے حاصل مدد کم زور پڑتی جارہی ہے، یہاں تک کہ بنارس میں تاجروں نے غیر ملکی کپڑوں پر کانگریس کی لگائی گئی مہروں کو توڑنا شروع کر دیا تھا اور امرت سر کے تاجروں نے فاضلکا میں غیر ملکی کپڑوں کی بکری شروع کر دی تھی۔ بمبئی میں جن سوداگروں کے پاس پچھلے سال کا غیر ملکی سامان پڑا ہوا تھا انھوں نے کانگریس کے فیصلے کے خلاف آواز بلند کرنی شروع کر دی تھی (Home, Political18/XI/1930)۔

اگر سوداگر صورت حال پر نظر ثانی کر رہے تھے، تو مل مالکان نے بھی زیادہ جوش و خروش نہیں دکھایا تھا۔ کیونکہ سودیشی مانگوں سے ہونے والا منافع، مارچ 1931 میں ہومی مودی کے بیان کے مطابق اس "روز روز کی ہڑتال" میں چلا جاتا تھا جس کی وجہ سے صنعت و تجارت تہ و بالا ہو کر رہ گئی تھی اور ایک طرح کی غیر یقینی صورت حال پیدا ہو گئی تھی۔ اگرچہ برلا نے یروودہ میں گاندھی کے اختیار کردہ موقف کی تائید کی تھی (مکتوب بہ نام ٹھاکر داس، مورخہ 6 ستمبر 1930)، چند روز بعد لالہ شری رام نے FICCI سے گول میز کانفرنس کے بائیکاٹ کے مئی کے فیصلے پر نظر ثانی کرانے کی کوشش کی تھی اور ٹھاکر داس نے لال جی نارن جی کے توسط سے موتی لال کو خبر دار کیا تھا کہ "تجارتی اور کاروباری برادری کی قوت برداشت اب اپنی آخری حد کو پہونچ چکی ہے" یہی بات ٹھاکر داس نے برلا کے ایک قریبی رفیق دیوی پرساد کھیتان کے نام اپنے 18 اکتوبر کے مراسلے میں

اور زیادہ تیکھے انداز میں کہی تھی "اس سفر سے میں نے جو نتیجہ اخذ کیا ہے وہ یہ ہے کہ دہلی، امرت سر اور کان پور وغیرہ میں کپڑے کے نان کے در آمد کار اور بیوپاری روز روز کے دھرنے اور در آمد شدہ کپڑے سے ہونے والے نقصان سے اکتا چکے ہیں،...... بہر حال بمبئی کے علاوہ باقی سارا ہندوستان کنٹرول میں ہے اور اس کے ختم ہو جانے میں زیادہ دیر نہیں لگے گی...... مجھے ڈر ہے کہ کانگریس کو سخت دھکا پہونچے گا اور اس کی وجہ سے ملک کو بھی بھاری نقصان اٹھانا پڑے گا" (ایضاً)۔

مصالحت کے لیے کاروباری طبقے کے اصرار، اور اس پر قوم پرست لیڈروں کے رد عمل کا تعلق کافی حد تک دیہی علاقوں میں ہونے والے واقعات سے بھی تھا۔ دیہی علاقوں میں انگریزوں کی جابرانہ پالیسیوں کی وجہ سے صاحب جائیداد کسانوں کا حوصلہ ٹوٹنے لگا تھا۔ اس کے ساتھ ہی تحریک کی ایک ذیلی سطح (لہر) کے آثار بھی ہویدا ہونے لگے تھے جو جلد ہی ایک خطرناک اور بے قابو شکل اختیار کرتی جا رہی تھی۔ آثار یہ بھی تھے کہ لگان کی عدم ادائیگی یا قبائلی علاقوں میں جنگلاتی قوانین کی خلاف ورزی ایک سماجی مسئلے کا باعث بنتی جا رہی تھی۔ نومبر 1930 میں بمبئی سے موصول ہونے والی ایک رپورٹ میں بڑودہ سرحد پر خیمہ زن پٹی داروں کی خستہ حالی کا ذکر کرتے ہوئے کہا گیا تھا کہ "ان کے رویوں میں تشدد کی بات تو دور ہی، گستاخی کا بھی شائبہ نہیں تھا۔ یہ لوگ بری طرح سے دل شکستہ معلوم ہوتے تھے"۔ تاہم بالکل اسی وقت چانک پور (ضلع ناسک) میں 20/ اکتوبر کو کولی قبائلیوں میں اس طرح کی افواہیں خوب پھیل گئی تھیں کہ برٹش راج کی جگہ پر "گاندھی راج، قائم ہو گیا ہے"...... بھالوں اور تلواروں اور دوسرے ہتھیاروں سے مسلح ہو کر ...... کانگریس کے حق میں نعرے بلند کرنے شروع کر دیے تھے...... منتشر ہونے سے انکار کر دیا تھا، اور پولس کی فائرنگ کا سامنا کرتے ہوئے سنگ باری شروع کر دی تھی" (ہوم پولیٹیکل، 18/XI/18/XII/1930)۔ مغربی گھاٹوں کے کولی قبائلیوں اور سی پی کے گونڈ قبائلیوں میں "جنگل ستیہ گرہ" گاندھیائی کنٹرول سے بالکل باہر ہو گیا تھا، پولس کی ٹکڑیوں پر حملے ہونے لگے تھے، اور درختوں کی بے تحاشا کٹائی شروع ہو گئی تھی، ملک کے دوسرے حصوں میں بھی تشدد کے واقعات ہوئے اور کسانوں نے اپنے لیڈروں کی گرفتاری کی پر تشدد مزاحمت کی اور شنکھ بجا کر اڑوس پڑوس کے گاؤں والوں کو بھی متحرک کرنے کی کوشش کی، پولس پارٹیوں کا گھیراؤ کیا اور ان پر حملے کیے۔ زرعی اشیاء کی قیمتوں کے گرتے جانے کی وجہ سے لگان کی عدم ادائیگی کے لیے دباؤ بڑھتا گیا تھا اور یوپی کانگریس کو اکتوبر 1930 میں اس کی بادل ناخواستہ منظوری دینی پڑی تھی۔

علاقائی سطح کے تجزیے

ہم نے اب تک سول نافرمانی کا تجزیہ ایک کل ہند تحریک کے طور پر کیا ہے۔ عدم تعاون کی

تحریک کی طرح ہی سول نافرمانی کی تحریک کے علاقائی فرق کا جائزہ لینے کی ضرورت ہے تا کہ ان باہم مخالف واقعات اور داخلی تناؤ کی نشان دہی کی جاسکے جن کے نتیجے میں گاندھی۔ ارون معاہدہ ہوا تھا۔

1930 کے پورے عرصے میں میٹروپولیٹین بمبئی کو سول نافرمانی کے سب سے بڑے مرکز کی حیثیت حاصل رہی تھی۔ ہوم ممبر ایچ۔ جی ہیگ نے بڑی تشویش اور خدشے کے ساتھ 13 جون کو یہ رپورٹ پیش کی تھی کہ شہر میں ہر طرف گاندھی کیپ ہی دکھائی دیتی ہے، یونیفارم میں ملبوس رضاکار دھرنے کے لیے پابندی کے ساتھ تعینات کیے جاتے ہیں جن کا نظم وضبط پولس کانسٹبلوں جیسا ہی ہوتا ہے؛ اور جو بڑے بڑے عوامی جلوس (جن میں سے ایک بڑا جلوس 23 مئی کو تقریباً 28 ہندوستانی تجارتی تنظیموں کے زیر اہتمام نکالا گیا تھا) نکالے جاتے ہیں، وہ خود ہی ٹریفک کا بھی بندوبست کرتے ہیں"۔ یہ درست ہے کہ مسلمان زیادہ تر اس تحریک سے الگ ہی رہے، اور 1929 کی اسٹرائک کی ناکامی، معاشی سرد بازاری کی وجہ سے قیمتوں میں گراوٹ اور اس کے نتیجے میں بڑھتی ہوئی بے روزگاری اور کمیونسٹوں کی از حد اشتراکیت کے اثرات سے بیشتر محنت کش طبقہ بھی الگ تھلگ رہا تھا۔ مگر بمبئی کے گورنر نے یہ اعتراف کیا تھا کہ بمبئی میں تحریک سے اس نظریے کی بنیاد پر عہدہ برآ نہیں ہوا جاسکتا تھا کہ "ہمارا سابقہ محض ایک چھوٹے سے سیاسی طبقے سے ہے"۔ وجہ یہ ہے کہ سول نافرمانی تحریک کو بمبئی کی تقریباً ساری گجراتی آبادی کی بھرپور تائید حاصل تھی اور ان گجراتیوں کی غالب اکثریت تجارت وکاروبار میں لگی ہوئی ہے یا دفتروں میں کام کرتی ہے" (Sykes to Irwin ,sand 20 June)۔ شہر میں قدامت پرست گاندھیائی قیادت کی نمائندگی جمنالال بجاج نے اور پٹیل کے نائب ایس کے پاٹل نے کی البتہ کانگریس کے نوجوان گروپ میں انقلاب پسندی کی لہر بھی پیدا ہو رہی تھی۔ اس گروپ کی قیادت کے۔ ایف نریمان اور یوسف مہر علی کر رہے تھے جو بعد میں ایک نمایاں سوشلسٹ لیڈر کی حیثیت میں ابھرے تھے۔ 1930 کی آخری چوتھائی میں کانگریس کے رضاکاروں نے گودی اور ملوں کے علاقوں میں ورکروں کی تائید حاصل کرنے کی کوشش شروع کی تھی اور بمبئی ستیہ گرہ کمیٹی کا خبر نامہ سائکلو اسٹائل شکل میں شائع کیا جاتا تھا۔ جس میں ٹھاکرداس جیسے تاجروں اور صنعت کاروں کو تنقید کا نشانہ بنایا جاتا تھا۔

گاندھیائی قیادت والی تحریک کا سب سے اہم مرکز گجرات رہا اور گجرات میں بھی زیادہ سرگرمی آنند، بورساڈ، ناڈیاڈ تعلقے، جمبوسار (بروچ) اور باردولی (سورت) میں رہی تھی۔ ان تمام تعلقوں میں 31-1930 میں سیاسی وجوہ سے مالیہ کی وصولی میں زبردست گراوٹ آگئی تھی اور کھیڑا جیسے بعض علاقوں میں تو پٹی دار طبقہ عدم تشدد کا راستہ ترک کر کے تشدد پر بھی اتر آیا تھا جس کی وجہ یہ تھی کہ ان کی زمینوں کو قرق کر لینے کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ بعض علاقوں میں کسانوں نے

اپنے لیڈروں کی گرفتاری کی مزاحمت بھی کی تھی اور ڈھول پیٹ کر اور شنکھ بجا کر اڑوس پڑوس کے گاؤں والوں کی مدد بھی حاصل کرنے کی کوشش کی تھی اور بوساڑ میں ایک گاؤں کے عہدہ دار کو قتل بھی کر دیا گیا تھا کیونکہ اس نے تحریک کے موقع پر استعفیٰ دینے سے انکار کر دیا تھا۔
(مورخہ: Home Political 14/201931)۔

نمک ستیہ گرہیوں کے خلاف مقدمے کے خلاف احتجاج کے دوران 16 اپریل کو کراچی میں بھیڑ اور پولس کی درمیان ٹکراؤ کے واقعے اور سوامی گووند آنند جیسے چند لیڈروں کی موجودگی کے باوجود بھی سندھ میں سول نافرمانی کی تحریک کافی کمزور رہی تھی کیونکہ مسلمانوں نے (دیہی علاقوں میں جن کی آبادی تقریباً 90 فی صد تھی) تحریک سے خود کو الگ ہی رکھا تھا۔ بلکہ اگست 1930 میں سکھر میں میں ہندو مسلم فساد بھی ہوا تھا۔ عدم تعاون کے تعلق سے یہ فرق مہاراشٹر کے اضلاع میں برعکس شکل میں سامنے آیا تھا۔ کیونکہ ان علاقوں میں کانگریس کو چت پاون براہمنوں کی جماعت سمجھا جاتا تھا۔ این۔ وی گڈگل (جو کہ کسی حد تک سوشلسٹ انداز فکر بھی رکھتے تھے) کی سرکردگی میں کانگریسیوں کی نئی نسل "ستیہ شودھک سماج"، کے کیشور راؤ جید ھے (پونا) جیسے غیر براہمن انقلاب پسندوں کے ساتھ اختلاف رائے دور کرنے میں کامیاب ہو چکی تھی۔ یہ کامیابی دراصل مندروں میں اچھوتوں کے داخلے کے معاملے کی تائید کے ذریعے حاصل کی گئی تھی حالانکہ کیلکر اور منجے جیسے تلک کے پرانے پیروکار ہندو مہاسبھا کی قیادت سنبھالنے کے لیے عام قومی دھارے سے دور ہوتے جارہے تھے۔ بہر حال کانگریس اچھوت مہاروں کی تحریک کو اپنا ہمنوا بنانے میں ناکام رہی تھی جس کے لیڈر بی۔ آر۔ امبیڈکر نے 1930 میں گول میز کانفرنس میں شرکت کی اور اس میں جداگانہ انتخابیہ کا مطالبہ بھی رکھا۔

اسی طرح کی وضع سی۔ پی میں بھی دیکھنے میں آتی ہے۔ گورنر نے اپنی 23 جولائی کی رپورٹ میں کہا تھا کہ "سول نافرمانی کی لہر اب بمبئی سے چل کر برار اور مراٹھاواڑ میں بھی داخل ہو چکی ہے۔ عام لوگوں کا رویہ اس تحریک کے تئیں نیم مذہبی قسم کا ہے اور ایک حد تک ذاتی فائدے یا نقصان کی بات کو نظر انداز کر دیا گیا ہے" (Sykes papers)۔ مہاراشٹر اور کرناٹک کی طرح ہی سی پی میں بھی، جو کہ عدم تعاون کی تحریک کے اثرات سے دور رہا تھا، جنگل ستیہ گرہ بڑی تیزی سے پھیل کر تشدد آمیز سول نافرمانی کی شکل اختیار کر گیا تھا۔ آل انڈیا کانگریس کمیٹی کی فائلوں سے پتہ چلتا ہے کہ جنگل قوانین کی بہت بڑے پیمانے پر اور پرامن طریقے پر خلاف ورزی کی گئی: 22/ جولائی کو سنگم نیر (ضلع احمد نگر) میں 100.000 دیہاتیوں نے، 5/ اگست کو بگلان (ناسک) میں 70.000 دیہاتیوں نے اور 28/ اگست کو ضلع ستارا میں 32 مقامات پر جنگل قوانین کی خلاف ورزی کی گئی، جب کہ چاندا، امراوتی، بیتول، رائے پور، بھنڈارا اور سیونی جیسے اضلاع کے بشمول سی پی کے بہت

بڑے حصوں میں بھی طوفان برپا ہوا تھا۔ ان کے علاوہ شمالی کنارا، سرسی اور سداپور تعلقے میں بھی کافی طوفان برپا رہا تھا۔ تقریباً تمام ہی مقامات پر جنگل ستیہ گرہ کنٹرول سے باہر ہو تا گیا تھا، اور تحریک کے لیڈر خود قبائلیوں کے اندر سے ہی ابھر آئے تھے جن میں بیتول میں گونڈ قبائل کے لیڈر گنجن کورکو کا نام قابل ذکر ہے۔ ان تمام لوگوں کے لیے جنگل کے محافظوں اور پولس پارٹیوں پر حملے ایک معمول بن گئے تھے اور کانگریس کے تشدد کے سلسلے میں تیار کیے گئے ایک سرکاری کیٹلاگ میں جولائی اور اکتوبر کے دوران سی پی میں تشدد کے اس طرح کے 10 واقعات کی تفصیل پیش کی گئی تھی۔ اس کیٹلاگ کے مطابق بمبئی پریزیڈنسی میں بھی مئی اور اکتوبر کی درمیانی مدت میں20 واقعات ہوئے تھے(Home Political. 14/14/1919/31)۔ 1931 کے آتے آتے کرناٹک کے بعض اضلاع میں لگان ادا نہ کرنے کی تیاریاں شروع ہو چکی تھیں جب کہ دسمبر 1930 کی ایک Fortnightly Report میں مہاراشٹر کے کچھ حصوں میں لگان داروں کو اپنا لگان روک لینے کے لیے راضی کر کے مہاراشٹر کے کھوٹ قبائل کو بھی لگان کی عام ادائگی کے لیے آمادہ کرنے کی کوشش کی جارہی تھی۔ عوامی ایجی ٹیشن کے اثرات اڑدس پڑدس کی دیسی ریاستوں تک پہونچ جانے کے بھی آثار پیدا ہو گئے تھے۔ میسور کے رضاکاروں نے کنارا تحریک میں حصہ لیا جب کہ لگان کی ادائگی کے خلاف ایک زوردار تحریک وسطی ہند کے بندیل علاقے کی چھترپور ریاست میں بھی سر ابھار رہی تھی۔ اکتوبر۔ دسمبر کی اس تحریک کی کمان مشہور ڈاکو منگل سنگھ کے ہاتھ میں تھی جس نے زمین کے لگان میں تخفیف کا مطالبہ کیا تھا جس کے بارے میں یہ کہا جاتا تھا کہ وہ اپنے لیے ایک ریاست تشکیل دینا چاہتا تھا۔ 30 دسمبر کو20,000 افراد پر مشتمل ایک بھیڑ کو جن میں تقریباً ایک ہزار لوگ رائفلوں سے بھی مسلح تھے، فوج کے ذریعے ہی منتشر کیا جا سکا تھا، اگر بروقت فوجی کمک نہ پہونچی ہوتی تو یہ لوگ چھترپور تک پیش قدمی کر گئے ہوتے اور مہاراجہ سے اپنے سارے مطالبات منوالیتے(Home Political, 18/XI-18/XII/1930)۔

تامل ناڈو میں سول نافرمانی کا سلسلہ شروع ہونے کے نتیجے میں ہی قدامت پرست گاندھیائی لیڈر سی۔ راج گوپال آچاری، جنھوں نے 1925 میں ضلع سیلم میں تروچن گوڈو آشرم کو اپنا مرکز بنا لیا تھا، مدراس کے سودیشی حریفوں ستیہ مورتی اور شری نواس آینگر کو مارچ 1930 میں صوبائی کانگریس کی قیادت سے بے دخل کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ راجہ جی نے تنجاور کی ساحلی پٹی میں اپریل 1930 میں نمک قانون توڑنے کی غرض سے تروچناپلی سے ویدارنیم تک ایک بڑے مارچ کا اہتمام کر کے اپنے قائد (آقا) کی ہم سری حاصل کر لی تھی۔ اس کے بعد غیر ملکی کپڑوں کی دکانوں پر بڑے پیمانے پر دھرنے اور مظاہرے کا سلسلہ شروع ہو گیا؛ اور 1921 کی طرح ہی شراب کے خلاف مہم کوئمبتور، مدورائی اور وردوھانگر (جہاں کامراج نے اپنا سیاسی سفر شروع کیا تھا

اور ناڈاروں کی جسٹس پارٹی سے قطع تعلق کر لیا تھا) جیسے تامل ناڈو کے اندرونی شہروں اور قصبوں میں کافی زور پکڑ گئی تھی۔ راجاجی نے سول نافرمانی کو پرامن رکھنے کی حتی الامکان کوشش کی اور ان علاقوں سے جان بوجھ کر کترا گئے جہاں نچلی ذات کے غریب کسان اور محنت کش طبقہ آباد تھا۔ بہرحال دوسرے مقامات ہی کی طرح تامل ناڈو میں بھی سول نافرمانی "عوام کے تشدد پسندانہ اقدامات اور پولس کی تشدد پسندانہ جوابی کارروائی کی بدولت ہی برقرار رہی تھی" (Arnold: Congress and the Raj . p.265)۔ یہ تشدد پسندانہ کارروائیاں 27 اپریل کو مدراس بیچ پر بڑے پیمانے پر ٹکراؤ کے واقعات سے شروع ہوئیں۔ نمک ستیہ گرہیوں کے خلاف پولس کی کارروائی اور جولائی مل ورکروں کی ہڑتال کو توڑوانے کی سرکاری کوشش ان واقعات کا باعث ہوئی تھی۔ جولائی میں نارتھ ارکاٹ کے ایک مقام، گوڈی یاتم میں بے روزگار بنکروں نے شراب کی دکانوں اور پولس کے سورچوں پر حملے کیے اور اجناس کی گرتی ہوئی قیمتوں سے پریشان کسانوں نے اگست میں مدورا کے بودی نایاکانور علاقے میں بلوہ کیا۔ معاشی کساد بازاری اور عوامی بے چینی کا باہمی تعلق مدورا شہر میں بھی کافی واضح معلوم ہوتا تھا، جہاں تحریک کو سوراشٹر برادری کے تاجروں اور بنکروں کی قابل لحاظ تائید حاصل تھی اور جس کی وجہ سے تحریک کافی طاقت ور ہو گئی تھی۔ بیکر نے اپنی تصنیف Politics of South India میں اس صورت حال کو میونسپلٹی پر قبضے کی جدوجہد سے منسوب کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ کوشش کسی حد تک نامکمل معلوم ہوتی ہے۔

مالابار علاقے میں نمک کے سلسلے میں مارچوں کا اہتمام کانگریس کے ایک نائر لیڈر کے لاپن نے کیا تھا جنھوں نے ویکم مندر ستیہ گرہ کے طفیل میں نچلی ذات کی ایزہاوا برادری کے ساتھ رابطے قائم کر لیے تھے۔ واضح رہے کہ ویکم کے مندر میں اچھوتوں کے داخلے کی تحریک 1920 کی دہائی کے وسط میں چلائی گئی تھی۔ پی۔ کرشنا پلائی کی سیاسی شہرت اسی وقت سے پھیلنی شروع ہو گئی جب 11 نومبر 1930 کو انھوں نے کالی کٹ بیچ پر پولس کی لاٹھیاں کھاتے ہوئے بڑی بہادری کے ساتھ قومی جھنڈے پر آنچ نہیں آنے دی تھی۔ بعد میں کرشنا پلائی نے ہی کیرالہ میں کمیونسٹ تحریک کی بنیاد رکھی تھی۔

مدراس پریزیڈنسی میں تنظیمی اعتبار سے کانگریس کا مضبوط گڑھ ساحلی آندھرا تھا جہاں کانگریس کے اندر قدامت پرستوں اور سوراجیوں کی باہمی رقابت تامل ناڈو کے مقابلے میں کسی قدر دبی ہوئی یا کم تھی اور 1927 سے ہی مال گزاری میں اضافے کے خلاف تحریک چل رہی تھی۔ مشرقی اور مغربی گوداوری، کرشنا اور گنٹور کے علاقوں میں نمک کے سلسلے میں ضلع کی سطح کے مارچ منظم کیے گئے؛ تاجروں نے کانگریس کے فنڈ میں بے تامل چندہ دیا، علاقے کی بالادست ذاتوں، کما اور راجو کاشت کاروں نے ظالمانہ کارروائیوں کی مزاحمت کی۔ ان ظالمانہ کارروائیوں میں مغربی گوداوری میں 1420 ایکڑ زمین کے لیے پانی کا روک لیا جانا بھی شامل تھا۔ تاہم ساحلی

آندھرا میں کانگریس کے اندر وہ تنظیم نہیں تھی جو کہ 22-1921 میں دیکھنے میں آئی تھی۔ حکومت کو مال گزاری روک لیے جانے کا جو خدشہ تھا وہ محض ایک گاؤں نیلور کے علاوہ ہر جگہ بے بنیاد ثابت ہوا تھا۔ آندھرا میں طبقاتی معاملے کو لے کر ایک زوردار کسان تحریک شروع ہو سکتی تھی، جو بالآخر پہلے 1931 میں اور پھر 1934 میں اور اس کے بعد ہی شروع ہو سکی جب کہ سول نافرمانی کی تحریک معطل کی جاچکی تھی یا ناکام ہو چکی تھی۔ آندھرا کی قبائلی پٹی میں 22/ جنوری 1931 کو وزاگاپٹنم ایجنسی کے ایک علاقے کلیان سنگھ پور میں پولس پارٹی پر حملے کا محض ایک واقعہ ہوا تھا۔ مگر کانگریس نے اس خطے میں جو کہ 1921 میں اس کا ایک بنیادی گڑھ رہ چکا تھا، جنگل ستیہ گرہ میں جان ڈالنے کی کوئی کوشش نہیں کی۔ 1930 میں آندھرا میں سول نافرمانی کے سلسلے میں 2878 سزائیں ہوئی تھیں جب کہ تامل ناڈو میں ہی یہ تعداد 2991 رہی تھی جو کہ کل ہند تعداد 90,000 کے لحاظ سے محض 6 فی صد کے بقدر تھی۔

اڑیسہ میں، جہاں کے گوپابندھو چودھری کی کمان میں گاندھیائی قیادت کی جڑیں 1920 کی دہائی میں ہی کافی مضبوط ہو چکی تھیں، بالاسور، کٹک، اور پوری اضلاع کے ساحلی علاقوں میں نمک ستیہ گرہ، ایک بہت ہی اثر انگیز تحریک کی شکل اختیار کر گیا تھا۔ خاص طور پر بالاسور میں مقامی آبادی کے ایک قابل لحاظ حصے کے بارے میں یہ "رپورٹ دی گئی تھی کہ وہ اس تحریک کے تئیں کافی ہمدردی رکھتا ہے"۔ اور اس نے یہ ہمدردی بلاشبہ اڑیسہ کی پرانی نمک صنعت پر لاگو کی گئی قانونی پابندی پر ناپسندیدگی کی شکل میں ظاہر کی تھی۔(Home, Political, 252/1/1930)۔

آندھرا کی طرح ہی آسام میں بھی سول نافرمانی تحریک 22-1921 کی بلندی کو نہیں پہونچ سکی اور اس کی بڑی وجہ آپسی اختلافات کی تھی: آسامیوں اور بنگالیوں کے درمیان، ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان تنازعات بڑھتے جارہے تھے، اور گھنی آبادی والے مشرقی بنگال سے مسلم کسانوں کی بھاری تعداد میں آمد کے نتیجے میں تناؤ بڑھ رہا تھا۔ کانگریس کے سربرآوردہ لیڈروں میں ترن رام پھوکن سول نافرمانی کے شدید مخالف تھے جب کہ این۔ سی۔ باردالوئی پر سرد مہری چھائی ہوئی تھی۔ سیاست میں حصہ لینے پر پابندی سے متعلق کننگھم کے اعلان پر طلباء میں بے چینی پھیل گئی تھی اور طلباء نے مئی میں ہڑتال ہی کر دی تھی اور سرکاری اسکولوں کے کل 15,186 طلباء میں سے 3117 اسکول چھوڑ کر باہر آگئے تھے۔ سلہٹ اس تحریک کا مرکز رہا تھا اور 31-1930 میں اس سلسلے میں جو کل 2373 لوگ گرفتار کیے گئے تھے ان میں سے 892 کا تعلق اسی ضلع سے تھا۔ محفوظ جنگلات کی کٹائی اتنی بڑھ گئی تھی کہ جنوری 1931 میں کامروپ کے سارے جنگلاتی علاقوں میں آسام رائفلز کے دستوں کا مارچ ایک معمولی بن گیا تھا، اور مسز چندراپربھا سیکیانی کے بارے میں یہ رپورٹ دی گئی تھی کہ وہ دسمبر میں اس علاقے کے دیہاتیوں کو جنگل قوانین کی خلاف ورزی کے لیے

اکسار ہی ہیں۔ بہر حال آسام کانگریس نے جنگل ستیہ گرہ کا معاملہ باقاعدہ طور پر اپنے ہاتھ میں لینے سے انکار کر دیا تھا۔ اس مرحلے پر چائے باغان کے ورکروں کے ساتھ بھی کوئی رابطہ نہیں رہا تھا اور آندھرا کی طرح یہاں بھی رعیت سبھاؤں کو 1931 کے بعد سے ہی اہمیت حاصل ہو پائی تھی۔

بنگال کانگریس بری طرح گروہ بندی کا شکار تھی، سبھاش بوس اور جے ایم سین گپتا سول نافرمانی منظم کرنے کے لیے حریف تنظیمیں قائم کر رہے تھے اور اپنی زیادہ تر توانائی کلکتہ کارپوریشن کی انتخابی سرگرمیوں میں صرف کر رہے تھے حالانکہ اس وقت 1930 کی تحریک اپنے شباب پر تھی۔ گروہی چپقلش، اور اس کے نتیجے میں دیہی عوام سے کلکتہ کے بھدرلوک لیڈروں کی دوری اور اس سے جڑی ہوئی، 1937 کے انتخابات میں کانگریس کی شکست کی بنیاد پر ہی یہ رائے قائم کی جاتی ہے کہ 1930 کی پوری دہائی کے دوران کانگریس بنگال میں زوال آمادہ رہی تھی۔ (Gallaghar: Locality , Province and Nation)۔ بہر حال یہ بھی واقعہ ہے کہ سب سے زیادہ، یعنی 15,000 گرفتاریاں بنگال میں ہی ہوئیں اور تشدد کے سب سے زیادہ (136) واقعات بھی بنگال میں ہی ہوئے، جن میں ایک سرکاری رپورٹ کے مطابق دہشت پسندی کے واقعات شامل نہیں ہیں۔ (Home Political 14/02/1931)۔ گجرات، آندھرا، یوپی یا بہار کے مقابلے میں بنگال میں کانگریس تنظیم کے اعتبار سے نسبتاً زیادہ کمزور رہی تھی۔ تحریک زیادہ تشدد پسندانہ رخ اختیار کر گئی تھی۔ یہ دوسری بات ہے کہ تشدد کے اکا دکا واقعات اور ایک دوسرے سے کافی وقفے پر ہوئے تھے۔ مدناپور، آرام باغ، نیز دوسرے دیہی خطوں میں نمک ستیہ گرہ اور چوکیداری محصول جیسے معاملات کے سلسلے میں زوردار تحریکیں چلیں اور گاندھی کے تعمیراتی کام میں لگے ہوئے وہ لوگ جو کہ ان تحریکوں کو مہمیز دینے کا کام کرتے تھے، کلکتہ کے شہری بھدرلوک لیڈروں کی عصبیت کو سخت ناپسند کرتے تھے۔ جن علاقوں میں گاندھیائی مراکز پہلے سے موجود نہیں تھے (مثال کے طور پر پڑوس کے آرام باغ کے برعکس مدناپور کی گھاٹل تحصیل میں ایسا کوئی مرکز نہیں تھا)، اور دوسرے مقامات میں بھی بڑے لیڈروں کے ہٹا دئے جانے کے بعد کسانوں کی سرگرمیاں اکثر پولس کے ساتھ تشدد آمیز ٹکراؤ کی شکل اختیار کر جاتی تھیں؛ جب کہ متوسط طبقے کی دہشت پسندی بھی اپریل 1930 میں چٹاگانگ میں اسلحہ خانے پر حملے کے بعد اپنے آخری اور زیادہ زوردار مرحلے میں داخل ہو چکی تھی۔ پھر بھی 1921 کے مقابلے میں کافی فرق واضح تھا۔ بااثر مرکزی قیادت حاصل نہیں تھی، صنعتی ورکر قنوطیت کا شکار تھا، قبائلیوں اور غریب کسانوں میں وہ ہلچل بھی پیدا نہیں ہو سکی تھی جس کا مظاہرہ 1921 کی تحریک کے دوران جھرگ رام، رنگ پور، چٹاگانگ اور ٹپرا جیسے دور دراز کے علاقوں میں ہوا تھا؛ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ مسلمان عام طور پر تحریک سے دور ہی رہے تھے۔ شروع شروع میں مسلمانوں کی شمولیت کے آثار پیدا ہو گئے تھے جو

مئی میں ڈھاکہ شہر میں اور جولائی 1930 میں کشور گنج کے دیہی علاقوں میں فرقہ وارانہ فسادات کی وجہ سے یک لخت معدوم ہو گئے۔ حالیہ تحقیق سے یہ پتہ چلتا ہے کہ ان دونوں مقامات پر سماجی تناؤ کو فرقہ وارانہ رنگ دیدینے کی کوشش کی گئی تھی حالانکہ اعتدال پسند سیاسی لیڈر اس سماجی تناؤ کو سامراج مخالف جدو جہد کا رخ آسانی سے دے سکتے تھے۔ ان فسادات میں اصل نشانہ ہندو ساہو کاروں اور تاجروں کی دکانیں، مکانات اور گودام تھے اور بلوائیوں کی دلچسپی گائے کشی یا عبادت گاہوں کے سامنے باجانہ بجانے سے کہیں زیادہ رہن ناموں اور قرض ناموں کو تباہ کر دینے میں تھی۔ کشور گنج میں بلوے کا سلسلہ ایک مسلم تعلقہ دار کے مکان پر حملے سے شروع ہوا اور یہاں ورکرز اینڈ پیزنٹس پارٹی نے جو تحریک طبقاتی خطوط پر شروع کی تھی اس پر کمیونسٹوں کی گرفتاری کے بعد ملا حاوی ہو گئے تھے۔ سودیشی تحریک کے دوران جو وضع سامنے آئی تھی اسی کو پھر دوہرایا گیا: بنگال کی قومی تحریک کی بنیادی کمزوری ایک بار پھر آڑے آگئی اور وہ کوئی زمیندار مخالف یا ساہو کار مخالف پروگرام پیش کرنے میں ناکام رہی، اور وہ بھی ایک ایسے وقت میں جب کہ قیمتوں میں تیزی کے ساتھ گراوٹ کی وجہ سے دیہی علاقوں میں کشیدگی بڑھ رہی تھی۔ دیہی علاقوں کے گاندھیائی پیروکاروں میں شہری علاقے کے بھدرلوک لیڈروں جیسی کسی طرح کی عصبیت نہیں تھی لیکن یہ لوگ بھی 31-1930 میں لگان نہ دینے کی تحریک میں پیچھے رہے تھے۔ اس کے علاوہ کانگریس نے خود کو جوت داروں اور بٹائی داروں کے تنازعے سے بھی الگ رکھا۔

اسی طرح کی وضع پنجاب میں بھی دیکھی جا سکتی ہے، جہاں کانگریس پر شہری ہندو تاجر طبقے کی پارٹی ہونے کا ٹھپہ لگا ہوا تھا جس کی وجہ سے سکھ اور مسلم کسانوں کو متحرک کرنا مشکل ہو گیا تھا، پھر یہ کہ خلافت تحریک یا گردوارہ پربندھک کمیٹی کے ٹکراؤ جیسا کوئی مذہبی معاملہ بھی نہیں رہا تھا جو مذہبی اتحاد کا باعث ہوتا۔ یونینسٹ گروپ واضح طور پر حکومت کا وفادار رہا، جب کہ اکالی لیڈروں کا رویہ ایک دوسرے سے مختلف تھا، اور وہ اس طرح کہ تارا سنگھ کانگریس کی تائید کر رہے تھے جب کہ کھڑک سنگھ نے خود کو الگ رکھا تھا۔ آرمی میں پنجابیوں کے غلبے، ایک ایسے سرحدی صوبے سے پنجاب کی قربت جہاں خدائی خدمت گار حکومت کے لیے ایک سنگین مسئلہ بنے ہوئے تھے اور دہشت پسندی اور مارکسزم کے ساتھ ساتھ انقلاب پسندی کے جذبات کے فراغ پانے کی وجہ سے انگریز پنجاب کے معاملے میں کافی خدشہ محسوس کرنے لگے تھے۔ انگریزوں کو زیادہ تشویش دو تنظیموں، نوجوان بھارت سبھا اور 'کیرتی کسان گروپ' سے تھی۔ تاجروں کی تائید کی وجہ سے بائیکاٹ کی تحریک شروع میں کافی اثر انگیز رہی، اور جولائی میں امرت کے سب سے بڑے تجارتی مرکز میں انگریزی کپڑے کی بکری 25 لاکھ روپے سے گر کر محض 2 لاکھ روپے رہ گئی تھی، مگر دوسرے صوبوں کی طرح ہی پنجاب میں بھی ستمبر کے آتے آتے کپڑے کے بیوپاروں میں بے

چینی پیدا ہونے لگی تھی جن میں بہت سے بیوپاری تو دیوالیہ ہو جانے کے دہانے پر بھی پہونچ گئے تھے(Home. Political 18/X/1930)۔ بہر حال دوسرے علاقوں کے قطعی برعکس یہاں 7/اکتوبر کو بھگت سنگھ کے خلاف سزائے موت سنائے جانے پر شہری علاقوں کے نوجوانوں میں انقلاب پسندی کا جذبہ امنڈ آیا تھااور پنجاب کے گورنر نے زرعی اشیاء کی قیمتوں میں گراوٹ پر 18/اکتوبر کو سخت تشویش کااظہار کیا تھا"۔ شرارت پسند عناصر زمینداروں اور کاشت کاروں کو بھکار ہے ہیں اور زمین کالگان ادانہ کرنے کے لیے اکسارہے ہیں"(اِروِن سے متعلق کاغذات)۔ اکالی دل کے اثر والی "پنجاب زمیندار سبھا، نے جو کہ اکتوبر میں ہی قائم کی گئی تھی، خاموشی کے ساتھ اعتدال پسندی کا راستہ اپنایا تھا جس پر انگریزوں کو استعجاب آمیز خوشی ہوئی تھی، جب کہ ریاستی پرجا منڈل نے سول نافرمانی کی تائید بھی کی اور پھلکیان ریاستوں کے سکھ کسانوں میں مہاراجہ پٹیالہ کے خلاف پروپیگنڈہ ابھی کیا۔ بہر حال اس سے بھی زیادہ اہم اور دلچسپ بات یہ ہے کہ بعض مقامات پر اچانک تشدد کے واقعات بھی ہوئے۔ اپریل میں ضلع حصار کے کسانوں نے لگان دینے سے انکار کر دیا تھااور زمینداروں کی فصلوں پر زبردستی قبضہ کر لیا تھا، ستمبر میں کانگڑا میں جنگل قوانین کی خلاف ورزی کی گئی تھی اور دسمبر میں روہتک میں لوٹ پاٹ کے متعدد واقعات ہوئے تھے جن میں جاٹوں نے دوسری نچلی ذاتوں کے لوگوں کی مدد سے ساہوکاروں اور غلہ بیوپاریوں پر حملے کر کے ان کی املاک لوٹ لی تھیں اور بہی کھاتے جلا ڈالے تھے"......اس میں اب شک کی ذرا بھی گنجائش نہیں کہ دیہی علاقوں کے جاٹوں کی ہمدردیاں کافی حد تک ان لوگوں کے ساتھ ہیں......اگر یہ ہندو بہ مقابلہ ہندو، معاملہ نہ ہوتا تو پریس کے ذریعے اس کے بارے میں بہت کچھ سننے کو ملتا(مکتوب گورنر بنام اِروِن، 7دسمبر 1930)۔

بہار میں سول نافرمانی کی مجموعی صورت حال کا اندازہ صوبائی کانگریس کمیٹی کی 21/جولائی 1930 کی رپورٹ سے ہوتا ہے "عملی طور پر وکیلوں اور طالب علموں کی طرف سے خاموشی رہی تھی"۔ عملاً ساری تحریک دیہی علاقوں میں اور دیہی لوگوں کے کنٹرول میں ہے "اور نئے بنائے گئے صوبائی ڈکٹیٹر، دیپ نارائن سنگھ کو ایک بڑے زمیندار اور پرانے قوم پرست کی حیثیت میں ورکنگ کمیٹی کا ممبر بنانے کی سفارش کی جارہی ہے۔(Aicc.g/80/1930)۔ جہاں بیشتر بڑے زمیندار حکومت کے وفادار رہے، کانگریس نے چھوٹے زمینداروں میں اپنی مضبوط اور منظم بنیاد قائم کر لی تھی۔ کانگریس نے خوش حال لگان داروں کو بھی اپنا ہم نوا بنا لیا تھا۔ بہار میں کانگریس کی مضبوطی کا اندازہ صوبائی کانگریس کی اس سال کی رپورٹ میں کئے گئے اس دعوے سے ہوتا ہے کہ "ہم نے اپنے ڈاک نظام کا بندوبست کر لیا ہے "ممکن ہے کہ شروع کے پر تشدد واقعات کی وجہ سے کانگریس کا تنظیمی پھیلاؤ متاثر ہوا ہو، کیونکہ جولائی میں گورنر اسٹیفینسن کی رپورٹ یہ تھی کہ "صورت حال عدم تعاون کی تحریک کے مقابلے میں کہیں بہتر رہی تھی" اور یہ کہ جس نیم مذہبی

ہسٹریا کا مظاہرہ بمبئی اور سی پی میں ہوا وہ بہار میں نا پید تھا۔ (شملہ گورنرس کانفرنس رپورٹ۔ مشمولہ سائکیز کاغذات)۔ جیسے ہی نمک تحریک، چوکیداری ٹیکس کی عدم ادائیگی کی ایک زوردار مہم کی شکل اختیار کر گئی، افسروں کا رویہ بھی یکسر تبدیل ہو گیا۔ نومبر تک تقریباً 11 ہزار لوگ جیلوں میں ڈالے جا چکے تھے، تمام اضلاع کے لوگوں نے چوکیداری محصول ادا کرنے سے انکار کر دیا تھا، غیر ملکی کپڑوں اور شراب کی بکری میں بھاری کمی آگئی تھی اور مونگیر کے باڑھی جیسے علاقوں میں انتظامیہ بالکل مفلوج ہو گیا تھا۔ 1929 میں بہار میں سوامی سہج آنند کی قیادت مین جو ایک خود مختار تحریک بہار کسان سبھا کی شکل میں شروع ہوئی تھی وہ اگلے سال بالکل غائب ہو گئی تھی۔ بہر حال یہ بھی واقعہ ہے کہ کانگریس کی صوبائی قیادت نے چھوٹے زمینداروں کے ساتھ مضبوط روابط کی وجہ سے ہی لگان کی عدم ادائیگی کی تحریک کو اپنے پروگرام میں شامل کرنے سے انکار کر دیا تھا حالانکہ قیمتوں میں گراوٹ کی وجہ سے کسان طبقہ کافی پریشان تھا۔ جو بہار کسان سبھا 1930 میں غائب ہو گئی تھی وہ 34-1933 میں سول نافرمانی کی تحریک کے ناکام ہو جانے پر ایک بار پھر زندہ ہو اٹھی۔

سول نافرمانی کے دونوں مرحلوں کی وضع سب سے نمایاں شکل میں صوبہ جات متحدہ (یوپی) میں سامنے آئی۔ جواہر لال نہرو نے اکتوبر 1930 کے وسط میں جیل میں تھوڑا عرصہ گزارنے کے بعد اس کا خلاصہ اس طرح کیا تھا "شہروں اور متوسط طبقوں کے لوگ ہڑتالوں اور جلوسوں سے کسی حد تک اکتا گئے تھے"۔ مگر کسان طبقے کی طرف سے اس تحریک میں برابر جان ڈالی جا رہی تھی۔ شاید اس وجہ سے کہ دیہی علاقوں میں محفوظ ذخیرہ وافر تھا" (سوانح عمری صفحہ 232)۔ صاحب فکر طبقے کی شرکت شروع سے ہی 1921 کے مقابلے میں کافی کم رہی تھی؛ اسکولوں اور عدالتوں سے بہت کم لوگوں نے استعفے دیئے تھے، اور شہری علاقوں کے تاجروں کا جوش و خروش بھی زیادہ دنوں تک قائم نہیں رہ سکا تھا۔ دیہی علاقوں میں لگان کی عدم ادائیگی پر دباؤ، اور "فورٹ نائٹلی رپورٹ" کے مطابق "تشدد اور نافرمانی کا رجحان" بڑھتا جا رہا تھا کیونکہ 1930 کے موسم خزاں سے زرعی اشیاء کی قیمتوں میں بھاری گراوٹ جاری تھی۔ یوپی کے انسپکٹر جنرل پولس نے 21 اضلاع کا دورہ کرنے کے بعد یہ رپورٹ دی تھی کہ کانپور صوبے کا وہ ایک بڑا شہر ہے جہاں کی صورت حال تشویش کی باعث ہے، لیکن جاٹوں کے غلبے والے علاقے اور خاص طور پر میرٹھ۔ بلند شہر کی دیہی پٹی میں صورت حال خوفناک ہے۔ عدم تعاون کی تحریک کے لحاظ سے ایک دوسرا بڑا فرق یہ سامنے آتا ہے کہ اس مرتبہ مسلمانوں نے تحریک میں حصہ نہیں لیا تھا۔ جس کی وجہ سے شہروں اور قصبوں میں تحریک کافی کمزور رہی تھی۔ (یوپی کی شہری آبادی میں مسلمانوں کا تناسب 37 فی صد تھا۔ جب کہ صوبے کی کل آبادی میں یہ تناسب محض 14 فی صد تھا)۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کانگریس نے مسلم غلبے والے دیہی علاقوں کو جان بوجھ کر نظر انداز کیا تھا۔ فروری 1931 میں بنارس میں بھیانک فساد ہوا تھا جس

کی وجہ ایک مسلمان کی کپڑے کی دکان کے خلاف دھرنا تھا؛ اور مارچ میں کانگریس نے بھگت سنگھ کے احترام میں ہڑتال کا جو نعرہ دیا تھا اس پر کانپور میں فرقہ وارانہ فسادات پھوٹ پڑے تھے جن میں 290 لوگ مارے گئے تھے، پولس حیرت انگیز طریقے پر ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھی رہی تھی اور اس طرح دونوں فرقوں کو چھوٹ دینے میں اس نے اہم رول ادا کیا تھا۔ اسی طرح کی صورت حال ایک سال قبل ڈھاکہ میں بھی دیکھنے میں آئی تھی۔

عدم تعاون اور سول نافرمانی کا یہ باہمی فرق دوہری شکل میں بھی سامنے آیا، کیونکہ یوپی کے بہت سے علاقوں میں سول نافرمانی کی تحریک محض گاؤں والوں کی تحریک بن کر رہ گئی تھی، اور اب کانگریس کی تنظیم کافی وسیع، اصول و ضوابط کی پابند اور واضح ہو چکی تھی۔ (Gayan Panday: Ascendancy of the Congress in U.P. p.p. 40,154)۔ انگریزوں کو 1920-21 میں اودھ کے کسانوں کی ہل چل کا پہلے ہی تجربہ ہو چکا تھا۔ اس لیے وہ لگان کی عدم ادائیگی کے سلسلے میں شروع سے ہی فکر مند تھے اور بہار کے بر خلاف کانگریس کی صوبائی قیادت اکتوبر میں لگان نہ دینے کی اپیل جاری کر چکی تھی۔ اس نے زمینداروں کو مال گزاری ادا نہ کرنے کا اور کسانوں کو لگان ادا نہ کرنے کا واضح مشورہ دیا تھا۔ غالب گمان یہی ہے کہ کانگریس کی صوبائی قیادت کے اس فیصلے کے پس پشت جواہر لال نہرو کی انقلاب پسندی ہی کار فرما رہی ہوگی، ویسے یوپی کے زمیندار کھلے عام حکومت کے وفادار تھے (فروری 1930 میں لکھنؤ میں زمینداروں کی ایک کانفرنس نے قرار داد آزادی کی مخالفت کی تھی)، اور جن کسانوں کے ذہن میں دس سال پہلے کی کامیاب تحریک کی یاد تازہ تھی ان کے لیے زرعی اجناس کی گرتی ہوئی قیمتوں کے پس منظر میں خود کو کنٹرول میں رکھنا مشکل تھا، بہر حال یوپی میں کانگریس اور کسانوں کی شدت پسندی کے درمیان ایک طرح کا تعلق واضح تھا۔ کانگریسی نظم و ضبط کا واضح مظاہرہ شری کرشنا پالی وال کی قیادت میں آگرہ میں ہوا، یہ ایک ایسا علاقہ تھا جہاں بڑے زمیندار صرف چند ہی تھے مگر چھوٹے زمینداروں اور خوش حال کسانوں کا تناسب بہت زیادہ تھا، اور ان کسانوں کو زیادہ تر حق دخل (Occupancy Right) حاصل تھا۔ بردوا اور بھلاوٹی جیسے گاؤں میں باردولی کا طریقہ دوہرایا گیا، یعنی محصولات کی ادائیگی روک دی گئی تھی۔ پولس کارروائی کے وقت لوگ گاؤں چھوڑ جاتے تھے اور زمیندار مخالف ایجی ٹیشن نیز تشدد سے احتراز کرنے کی کوشش کی جاتی تھی۔ رائے بریلی میں بڑے تعلقہ دار زیادہ تعداد میں تھے؛ دخل دار کاشت کار کے پاس محض 1.5 فی صد ہی زمین تھی، پھر یہ کہ 1920-21 کی کسان تحریک کی یادیں ابھی تازہ تھیں، تحریک کی نچلی سطح کا انقلابی دباؤ بہت شدید تھا؛ ایک مقامی لیڈر، کالکا پرساد کا لوگوں سے یہ کہنا تھا کہ وہ لگان دینا بند کر دیں کیونکہ جون سے سوراج قائم ہو چکا ہے اور اب لگان بہت کم دینا ہوگا۔ بہر حال کالکا پرساد جیسے لوگ وقت کے گزرنے کے ساتھ

ساتھ 1931 تک نظم وضبط کے پابند ہو گئے تھے۔ کیونکہ گاندھی۔ اروِن بات چیت اور معاہدے کے بعد کانگریس نے اس ضلع پر اپنی گرفت مضبوط کر لی تھی۔ تشدد کے اہم واقعات، جن میں چند مخالف زمینداروں کے قتل کی وارداتیں بھی شامل تھیں، مارچ 1931 کے بعد ہوئے تھے نہ کہ تحریک کے دوران! یہ واقعات ایسے علاقے میں ہوئے جو کانگریس کی تحریک سے قطعی متاثر نہیں تھے۔ مثال کے طور پر اس طرح کے کچھ واقعات الہ آباد کی دو آبے والی تحصیلوں میں بھی ہوئے تھے۔ کانگریس نے ان علاقوں کو اپنی تحریک کے سلسلے میں اس لیے نظر انداز کر دیا تھا کہ یہاں مسلم زمینداروں کا سامنا ہندو لگان داروں سے تھا جس کی وجہ سے فرقہ وارانہ بلوے کا خطرہ تھا۔ بارہ بنکی میں کھادی یا چرخہ بہت کم دیکھنے میں آتا تھا لیکن مقامی کانگریسی لیڈر 1931 میں یہ تبلیغ کر رہے تھے کہ زمین خدا کا عطیہ ہے اس لیے وہ محض زمینداروں کی ہی ملکیت نہیں ہو سکتی۔ (گیان پانڈے، باب چھ اور سات)۔ اکتوبر 1930 میں لگان کی عدم ادائیگی کی تجویز منظور ہوتے ہی کانگریس نے یو پی میں محصولات کی عدم ادائیگی کی کامیاب تحریک چلائی اور معاہدے کی مدت کے دوران کسانوں کو قابو میں رکھنے کی کوشش کی۔ جیسا کہ ہم آگے چل کر جائزہ لیں گے، کسانوں کے نقطہ نگاہ سے یہ ایک نفسیاتی مرحلہ تھا جسے ہمیشہ کے لیے گنوا دیا گیا تھا۔ میرٹھ کے ایک بندوبست افسر نے 1934 میں اپنے تذکرہ میں لکھا تھا کہ "جب آخر کار 1931 کے موسم خزاں میں کانگریسیوں نے لگان کے خلاف اپنی تحریک شروع کی تو انھیں پتہ چلا کہ انھوں نے موقعہ گنوا دیا تھا۔

مقامی سطح کے اس طرح کے متعدد اختلافات کے باوجود بھی، دستیاب علاقائی سطح کے اعداد و شمار سے ان دونوں تحریکوں کے درمیان ایک طرح کی مماثلت کا بھی اشارہ ملتا ہے جس کا سلسلہ 1930 کے بعد سے یہ ایک وقت انحطاط اور انقلاب پسندی کی شکل میں شروع ہوا تھا: بورژوائی گروپوں یا کسانوں کے اعلا طبقے سے جڑی ہوئی جدوجہد میں کمزوری پیدا ہونے لگی تھی اور اس کے ساتھ ہی اکا دکا طریقے پر مگر وسیع پیمانے پر تشدد کے واقعات بھی شروع ہو گئے تھے۔ ایسی صورت حال میں کسی بھی مصالحت کے لیے تحریک کا پیدا ہونا ایک فطری امر تھا، کیونکہ ایک طرف تو کانگریس کی گاندھیائی قیادت عوام کی پرامن شمولیت میں یقین رکھتی تھی جب کہ دوسری طرف تاجر طبقے کی کاروباری ذہنیت بھی کام کر رہی تھی اور انھیں کسانوں کی انقلاب پسندی سے بھی خطرہ تھا (کیونکہ بیشتر تاجروں کے مفادات زمین سے بھی وابستہ تھے یہاں تک کہ 40-1939 کی انڈین ایئر بک میں جی۔ڈی برلا کا ذکر "کروڑ پتی تاجر اور زمیندار" کے طور پر کیا گیا تھا)۔ اس اثناء میں گول میز کانفرنس کے پہلے اجلاس (نومبر 1930، جنوری 1931) کے موقع پر لندن میں کچھ ایسی باتیں ہوئیں جن سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ مصالحت کے لیے ماحول تیار ہو رہا ہے۔

گول میز کانفرنس

جب ہزاروں ہندوستان جیل جارہے تھے یا پولس کی لاٹھیاں اور گولیاں کھارہے تھے اور اپنی جائداد واملاک کو داؤ پر لگارہے تھے، مٹھی بھر لوگ، جن میں سے بیشتر کو کسی طرح کی نمائندگی بھی حاصل نہیں تھی، برطانیہ کے کثیر پارٹی وفد سے آئینی بات چیت کے لیے لندن گئے ہوئے تھے، کانگریس نے اور ہوی مودی کے علاوہ باقی سارے تاجر گروپ نے خود کو اس سے الگ رکھا تھا۔ البتہ مسلم لیڈران (محمد علی، محمد شفیع، آغا خان، فضل الحق جناح وغیرہ) بڑی تعداد میں لندن گئے تھے جبکہ فضل حسین وائسرائے کی ایکزیکٹیو کے ایک رکن کی حیثیت میں پردے کے پیچھے سے اہم رول ادا کر رہے تھے۔ ان کے علاوہ ہندو مہاسبھا کے لیڈر مونجے اور جیاکر، لبرل لیڈر سپرو، چنتامنی۔ سری نواس شاستری اور دیسی راجگان کی ایک بھاری جمعیت بھی لندن پہونچی ہوئی تھی۔ ہندوستان میں زبردست عوامی ہل چل کی وجہ سے سائمن کمیشن کی رپورٹ پر عمل درآمد مشکل ہی نہیں ناممکن بھی ہو گیا تھا۔ مئی 1930 کی اس رپورٹ میں، صوبوں میں دو عملی حکومت کی جگہ پر ایک جواب دہ حکومت کا وعدہ کیا گیا تھا، اس شرط کے ساتھ کہ چند ہنگامی اختیارات گورنر کے پاس رہیں گے۔ مرکزی حکومت میں کسی بھی طرح کی تبدیلی کے بارے میں کچھ نہیں کہا گیا تھا۔ اروِن نے 19 جون کو سکریٹری آف اسٹیٹ سے نجی طور پر یہ اعتراف کیا تھا کہ چونکہ اس میں Dominion درجے کا کہیں ذکر نہیں کیا گیا ہے اس لیے اس سے یہاں دھماکہ خیز صورت حال پیدا ہو جائے گی"۔ چنانچہ اس طرح مرکزی حکومت میں بھی کسی حد تک تبدیلی کا وعدہ کرنا ضروری ہو گیا تھا اور اس موقع پر دیسی ریاستوں کے بشمول وفاق کی تشکیل کی تجویز انگریزوں کے لیے خداداد نعمت ثابت ہوئی تھی۔ وزیر اعظم میک ڈونالڈ کے خیال میں ایک ایسی وفاقی قانون ساز اسمبلی جس کے ممبروں کی ایک خاصی تعداد رجگان کی نامزد کردہ ہو گی، ایک محفوظ ادارہ ثابت ہو گی۔ چنانچہ میک ڈونالڈ نے گول میز کانفرنس کے خاتمے پر 19 جنوری کو یہ اعلان کیا تھا کہ "تاج برطانیہ کی حکومت مقننہ کے تئیں عاملہ کی جواب دہی کے اصول کو تسلیم کرنے کے لیے تیار ہے"۔ یہ تصور دراصل راجگان کا ہی سجھایا ہوا تھا۔ خاص طور پر حیدر آباد کے دیوان (اکبری حیدری) اور میسور کے دیوان (مرزا اسماعیل) اس میں پیش پیش تھے اور حیدری کو بھی اس کے لیے برطانوی ریزیڈنٹ لفٹنٹ کرنل ٹیرنس نے ہی کافی پہلے آمادہ کر لیا تھا اور مالکم ہیلی جیسے انگریز افسروں اور ریڈنگ، ہور اور زیٹ لینڈ جیسے سیاست دانوں نے اس تجویز کو ہاتھوں ہاتھ لیا تھا اور لیبر پارٹی کے انتہائی اعتدال پسند سکریٹری آف اسٹیٹ وجوڈ بین نے بھی اس تجویز کو سراہنے کی حد تک قبول کر لیا تھا۔ ہندوستانی راجگان کی دلچسپی ایک کمزور مرکز میں تھی جسے ان کی شمولیت کے ذریعے غیر جمہوری رکھا جا سکتا

تھا، خاص طور پر ایک ایسے وقت میں جب کہ عوام کے بھاری دباؤ کی وجہ سے ڈومنی ان (Dominion) درجہ دیئے جانے کا بھی خطرہ پیدا ہو گیا تھا، یعنی ایک ایسی Dominion جس کی مرکزی حکومت میں کانگریس کا غلبہ ہوتا، پھر یہ کہ راجگان کے مفادات اور مسلمانوں کے مفادات میں ایک طرح کی مماثلت بھی تھی، کیونکہ مسلم قیادت بھی ہندو اکثریت کے خطرے کو محسوس کر رہی تھی۔ انگریزوں نے چالاکی سے کام لیتے ہوئے "متعین تحفظات" کے ساتھ مرکز میں ایک جواب دہ حکومت کا وعدہ کر لیا۔ اس اسکیم کی تفصیلات طے کرنے کے لیے پانچ سال کی مدت درکار ہوتی، کیونکہ یہ بات جلد ہی واضح ہو گئی تھی کہ وفاق ایک ایسا تصور ہے جو صدا اپنی ہیئت تبدیل کرتا رہتا ہے اور پھر یہ کہ جنوری 1931 میں وفاق کی تجویز بوجوہ قبول کی گئی تھی۔ راجگان کا خیال یہ تھا کہ اس طرح کے بندوبست سے مرکز کی بالادستی کم ہو جائے گی، مسلمانوں کے نزدیک ایک کمزور مرکز ان کے لیے زیادہ بہتر ثابت ہوتا، سپرو جیسے لبرل لیڈر ایک جواب دہ مرکزی حکومت کے وعدے کے جال میں آگئے تھے جب کہ بیشتر انگریز سیاست دانوں کا خیال یہ تھا کہ "اس طرح وہ ایک جواب دہ حکومت سے ملتی جلتی کوئی چیز منظور کر سکیں گے اور اس کے باوجود بھی انگریزی کنٹرول کو برقرار رکھ سکیں گے" (حوالہ: R.J. Moore: Crisis of Indian Unity p. 155)۔

انگریزوں کے ہاتھ میں کھیلنے جیسی ایک دوسری بات یہ ہوئی کہ کانفرنس کی مانیارٹیز کمیٹی میں کسی بھی بات پر اتفاق رائے نہیں ہو سکا تھا جس کے لیے سکھ لیڈروں کے ساتھ ساتھ ہندو مہاسبھا کے لیڈر مونجے اور جیاکر ذمہ دار تھے۔ 1927 کے موقف، یعنی ایک ایسے انتخابیہ کے ساتھ جس میں مسلمانوں کے لیے سیٹیں محفوظ ہوتیں، لبرل لیڈروں کے سپرو گروپ کے ساتھ جناح، شفیع اور آغا خان وغیرہ کا اتفاق رائے تقریباً ہو چلا ہی تھا کہ ہندو مہاسبھا نے 29-1928 کی طرح اس مرتبہ بھی پنجاب اور بنگال میں مسلمانوں کے لیے سیٹیں محفوظ کرنے کی تجویز کی مخالفت کی جس پر بات ٹوٹ گئی۔ پھر یہ کہ پنجاب میں سکھوں نے اپنے لیے 30 فی صد سیٹیں محفوظ کرنے کا دعوا پیش کر دیا جس سے معاملہ اور بھی پیچیدہ ہو گیا (آبادی میں سکھوں کا تناسب محض 11 فی صد تھا جب کہ انھیں 19 فیصد نمائندگی حاصل تھی)۔ مہاسبھا کی دلیل یہ تھی کہ چونکہ پنجاب اور بنگال میں مسلمانوں کی اکثریت ہے اس لیے ان دونوں صوبوں میں انھیں تحفظ کی کوئی ضرورت نہیں ہے جس کا جواب محمد علی نے اس اپیل سے دیا تھا کہ ان دونوں صوبوں میں مسلمانوں کو جو بہت معمولی سی اکثریت حاصل ہے، وہ پنجاب میں ہندو ساہوکاروں اور بنگال میں ہندو زمینداروں کے اثر کی وجہ سے بے معنی ہو جائے گی، کیونکہ عام حق رائے دہی کا نظام فی الحال لاگو نہیں کیا جا رہا تھا۔ مگر مونجے اور جیاکر ایک انچ بھی ہلنے کے لیے تیار نہیں ہوئے اور اس طرح کم سے کم سماج کے اعلا طبقے کی سطح پر ہی سہی، اتحاد کا ایک اور موقع گنوا دیا گیا تھا۔

گاندھی۔اروِن معاہدہ

بلاشبہ لبرل لیڈروں نے گول میز کانفرنس کو ہندوستان کی ایک بڑی کامیابی کی شکل میں پیش کرنے کی کوشش کی، اور لندن سے واپسی پر کانگریس کے لیڈروں سے، جو کہ 26 جنوری کو رہا کیے جا چکے تھے، مصالحت کی اپیل کی۔ لیکن سپرو اور جیاکر 1930 کے پورے عرصہ تصفیے کی اپیل کرتے رہے تھے جنھیں یرودہ میں مسترد کر دیا گیا تھا۔ بہر حال اس دفعہ گاندھی کے ردِ عمل میں کسی قدر ایک مثبت پہلو کی جھلک کا احساس ہوتا ہے "میں نہیں مانتا کہ میک ڈونالڈ کے بیان میں ہمارے لیے کچھ منظور کیا گیا ہے۔" انھوں نے یہ بات 31/ جنوری کو کہی تھی اور اپنے عوامی بیانوں اور نجی خط و کتابت کے ذریعے کسی بھی تصفیے کے امکان کے بارے میں 11 فروری تک ناامیدی ظاہر کرتے رہے تھے۔ مگر 16 فروری سے (اس تاریخ کو گاندھی نے خط لکھ کر اروِن سے ملاقات کا وقت مانگا تھا) ان کے موقف میں تبدیلی آنی شروع ہو گئی تھی۔ گاندھی نے دہلی میں اروِن کے ساتھ بات چیت میں "وفاق، ہندوستانی جواب دہی نیز تحفظات" پر اروِن کے اصرار کو فوراً تسلیم کر لیا۔ 5/ مارچ کے دہلی معاہدے کی شق نمبر 2 کے ذریعے، اس اسکیم پر آئندہ کسی بات چیت کے امکان کو کالعدم کر دیا گیا جس کا خاکہ گول میز کانفرنس میں تیار کیا گیا تھا۔ جہاں سول نافرمانی کے سلسلے میں بند لوگ رہا کیے جانے تھے۔ وہیں بھگت سنگھ کی جان بچانے کے لیے بظاہر کوئی کوشش نہیں کی گئی اور نمک کے سلسلے میں جو تھوڑی بہت علامتی مراعات حاصل ہوئی تھیں، وہ اس لیے کالعدم ہو گئی تھیں کہ گاندھی نے اروِن کے ساتھ بات چیت کے بعد پولس کی زیادتیوں کی چھان بین اور قرق شدہ زمینوں (جو کہ کسی تیسرے فریق کو پہلے ہی فروخت کی جا چکی تھی) کی واپسی کے مطالبوں پر زور دینا بند کر دیا تھا جس پر خاص طور پر گجرات میں شدید ردِ عمل ظاہر ہوا تھا۔ یرودہ (Yeroda) میں گاندھی کے اختیار کردہ سخت موقف نیز 1930 کے پورے عرصہ کانگریس کی طرف سے جاری کیے جانے والے بیانوں میں "فیصلہ کن جنگ" پر اصرار کے بالکل برعکس گاندھی کے اس اقدام سے جواہر لال نہرو جیسے انقلابی لیڈروں کا یہ احساس تھا کہ ان کی سبکی ہوئی ہے۔ خود نوشت میں جواہر لال کے الفاظ یہ ہیں "اس طرح دنیا ختم ہو جاتی ہے کسی دھماکے یا ہنگامے کے ساتھ نہیں بلکہ بالکل خاموشی کے ساتھ" (صفحہ 259)۔

گاندھی کے رویے میں اس بھاری تبدیلی کی تاریخی گتھی کی توضیح نہ تو لبرل لیڈروں کے دباؤ کی لحاظ سے کی جا سکتی ہے (اگرچہ یہ لیڈر ذاتی طور پر بہت محترم تھے مگر ملک میں ان کی کوئی تائیدی بنیاد نہیں تھی)۔ اور نہ ہی پوری سنجیدگی کے ساتھ یہ کہا جا سکتا ہے کہ گاندھی پر اروِن کا جادو چل گیا ہوگا، اور وہ اچانک ہی، مرکز میں ایک جواب دہ حکومت سے متعلق گول میز کانفرنس کے

وعدے پر یقین لے آئے ہوں گے، کیونکہ اس وعدے میں ابہام کے ساتھ ساتھ اس کی اپنی حدود بھی تھیں کیونکہ ایک ایسے وفاق کی بات کہی گئی تھی جس میں راجگان کو بہت زیادہ دخل حاصل ہوتا، اور اس کی تفصیلات ابھی تیار کی جانی تھیں، مختلف قسم کے تحفظات کا بھی ذکر تھا اور فرقہ دارانہ مسئلہ کا کوئی حل نہیں پیش کیا گیا تھا۔ اس بات کے بھی کچھ شواہد موجود ہیں کہ اس سلسلے میں سب سے اہم دباؤ تجارتی طبقے کا تھا۔ کابینہ کی مخالفت اور کساد بازاری کے شکار لنکاشائر کے زوردار احتجاج کے باوجود بھی فروری کے اوائل میں کپاس کی درآمد کاری پر 5 فی صد کے بقدر اضافی محصول لگادیا گیا تھا اور حکومت نے اس مرتبہ شاہی ترجیح سے چشم پوشی کرتے ہوئے غیر برطانوی درآمدات پر کوئی اضافی محصول عائد نہیں کیا تھا۔ ایسا شاید سیاسی بنیادوں پر کیا گیا تھا۔ بمبئی کے گورنر نے 7 فروری کو وائسرائے کو یہ رپورٹ دی تھی کہ "گاندھی کے کچھ پیروکار، جن میں خاص طور پر تجارتی برادری کے لوگ بھی شامل ہیں، یہ سوچ رہے ہیں کہ اگر انھوں نے معتدل موقف اختیار نہ کیا تو ان سے قطع تعلق کرلیا جائے گا" اور اروِن نے سکریٹری آف اسٹیٹ کو 11 فروری کو یہ اطلاع دی تھی کہ "ٹھاکر داس تجارتی دباؤ ڈالنے کے مقصد سے گاندھی سے ملنے کے لیے شاید الہ آباد جائیں گے۔" بات چیت کے دوران ٹھاکر داس دہلی میں موجود رہے تھے اور گجرات میں زمینوں کی قرقی کے مسئلے کے حل میں حائل رکاوٹ کو 4 مارچ کو دور کرنے میں مدد بھی کی تھی۔ 11 فروری کو برلا کے قریبی مددگار ڈی۔ پی۔ کھیتان نے کلکتہ کے ہندوستانی ایوان تجارت میں اپنا صدارتی خطبہ پیش کرتے ہوئے یہ کہا تھا کہ "مہاتما گاندھی اور کانگریس کو یہ مشورہ دینا نامناسب نہیں ہوگا کہ کسی باعزت تصفیے کے امکانات کا جائزہ لینے کا وقت آگیا ہے"۔ یہاں بھی تاریخوں کا اتفاق کافی اہمیت رکھتا ہے۔

مارچ۔دسمبر 1931: پرطوفان خاموشی

ابہامات

مارچ 1931 سے جنوری 1932 کی درمیانی مدت کے سلسلۂ واقعات، یعنی انگریزوں کی جابرانہ کارروائیاں اور ان کارروائیوں کے ردعمل میں کانگریس کی طرف سے سول نافرمانی کی دوبارہ تحریک دراصل گاندھی۔ اروِن معاہدے کے مبہم مضمرات کا ہی نتیجہ تھی۔ کانگریس کے کراچی اجلاس سے ذرا ہی قبل، 23 / مارچ کو بھگت سنگھ، سکھ دیو اور راج گرو کی پھانسی کی سزا سے انقلابی قوم پرستوں کی مایوسی اور غصہ اور بھی بڑھ گیا تھا اور بھارت نوجوان سبھا نے کراچی ریلوے اسٹیشن پر گاندھی کے خلاف مظاہرہ منظم کیا تھا۔ تاہم کراچی اجلاس کی ایک بڑی اہمیت یہ ہے کہ

اس میں گاندھی کے نکتہ چینوں کی کمزوری سامنے آگئی۔ جواہر لال نہرو نے اکتوبر سے جنوری تک کی اپنی نظر بندی کے زمانے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ایک واقعی زرعی پروگرام تیار کیا تھا اور ایک مرکزی سیاسی نعرے کے طور پر دستور ساز اسمبلی کی تشکیل کا ایک فارمولا بھی تیار کر لیا تھا جسے آگے چل کر تیسری دہائی کے وسط میں بائیں بازو کے قوم پرستوں کی حکمت عملی میں بنیادی عنصر کی حیثیت حاصل ہو گئی تھی (حوالہ: Notes in Naini Prison, December, 1930 Selected works. Vol IV, pp. 437-51)۔ دہلی معاہدے کے بعد انھوں نے کئی راتیں جاگ کر کاٹی تھیں مگر بعد میں گاندھی کے آگے ہتھیار ڈال دیے تھے اور کراچی اجلاس میں وہ قرارداد پیش کرنے کے لیے راضی ہو گئے تھے جس کے ذریعے معاہدے کی توثیق چاہی گئی تھی۔ موتی لال کے انتقال (6 فروری) کی وجہ سے وہ نفسیاتی طور پر گاندھی پر اور زیادہ منحصر ہو گئے تھے؛ پھر یہ کہ انھیں گاندھی کے مقابلے میں اپنی حدود کا بھی پورا احساس تھا۔ یہ ایک اہم بات ہے کہ ان کی خود نوشت میں جو کہ پانچ سال بعد شائع ہوئی معاہدے پر بحث کے فوراً بعد گاندھی کی ستائش "ہندوستان کے کسان عوام کے نمائندے" کے طور پر کی گئی تھی۔ کراچی اجلاس میں معاہدے کے دوسرے نکتہ چینیوں کی تقریروں میں بھی مایوسی کا احساس موجود تھا۔ یوسف مہر علی نے جو کہ جلد ہی ایک نمایاں سوشلسٹ لیڈر کی حیثیت اختیار کر گئے تھے، 'سودے بازی کی سیاست' کی سخت مذمت کی تھی اور برلا، پرشوتم داس ٹھاکر داس، دال چند ہیرا چند، حسین بھائی، اور لال جی جیسے تاجروں پر سخت حملے کیے تھے جو ان کے بقول "اب باہر آگئے ہیں اور دوسروں کے مصائب اور قربانیوں کا پھل ہڑپ جانے کی کوشش کر رہے ہیں" مگر ان کی تقریر کا اختتامیہ کافی منکسرانہ تھا: گاندھی کو پھر جدوجہد کا اعلان کرنا ہوگا، کیونکہ گول میز کانفرنس کا ناکام ہو جانا یقینی ہے، اور اس طرح انقلاب پسندوں کو پھر موقع ملے گا، "ہمیں جنگ کے اعلان کا بے صبری سے انتظار ہے، انقلاب زندہ باد"۔

کراچی اجلاس نے بنیادی حقوق اور معاشی پالیسی کے سلسلے میں ایک قرارداد پاس کی جس کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ ایسا بائیں بازو کے لیڈروں کی خوشنودی کے مقصد سے کیا گیا تھا۔ یہ صحیح ہے کہ بعض افسروں کو اس کے پیچھے ایم۔ این رائے کا ہاتھ ہونے کا شبہ تھا اور چند ماہ بعد امبالال سارا بھائی نے FICCI کے ممبروں کے لیے ایک گشتی نوٹ میں اس قرارداد کے بعض حصوں کو سخت نشانہ بناتے ہوئے ہندوستان میں بھی روس کی طرز پر حکومت قائم کرنے کے خطرے سے خبردار کیا تھا۔ جب کہ واقعہ یہ ہے کہ کراچی اجلاس کی اس 20 نکاتی قرارداد میں "سوشلزم" نام کی کوئی چیز نہیں تھی بلکہ اس میں شہری آزادی، قانونی برابری، بالغ رائے دہی، مفت پرائمری تعلیم اور مذہبی غیر جانب داری کی سرکاری پالیسی، جیسے عام قسم کے جمہوری مطالبے

ہی شامل تھے۔ اس کے علاوہ 1930 کے گاندھی کے 11 نکات کے کچھ حصے اور محنت کش طبقے، کے لیے کچھ وعدے (قابل گزر اجرت، بیگار کے خاتمے، ٹریڈ یونین حقوق، وغیرہ) بھی شامل تھے۔ کلیدی صنعتوں اور معدنی وسائل پر حکومت کے کنٹرول کے سلسلے میں ایک غیر مبہم سی شق اور زرعی اصلاحات کے سلسلے میں ایک جامع پروگرام بھی پیش کیا گیا تھا۔ بہر حال کانگریس کا کراچی اجلاس حسب سابق گاندھی کے ہی تابع رہا اور فروری 1922 کی طرح ہی یہ اجلاس بھی لیڈر کی بجائے پوری تحریک کی بعض بنیادی کمزوریوں کا ایک اشاریہ ثابت ہوا تھا۔ سول نافرمانی کے دوران کہیں کہیں انقلابی عناصر بھی ابھرے تھے مگر ایسے نہیں تھے کہ متبادل قیادت فراہم کر سکتے۔ اس متبادل انقلابی قیادت کی عدم موجودگی کے نتیجے میں دیہی علاقے کی شدت پسندی منتشر اور غیر آہنگ شکل میں سامنے آتی تھی، یا پھر ان کی قیادت ایسے مقامی گاندھیائی لیڈروں کے ہاتھ میں ہوتی تھی جس کا زاویہ نگاہ کافی محدود ہوتا تھا۔ محنت کش طبقے کی تنظیم اور شدت پسندی میں 29-1928 سے کمی آتی گئی تھی، اور کمیونسٹ، جو کہ میرٹھ میں کی گئی گرفتاریوں کی وجہ سے کافی کمزور پڑ گئے تھے، داخلی گروپ بندی کے مرحلے سے گزر رہے تھے جس میں انھوں نے اپنی ساری توجہ بائیں بازو کے قوم پرستوں کے خلاف کارروائی پر مرکوز کر رکھی تھی، اپریل 1930 میں نہرو کو امپریلزم مخالف لیگ سے نکال دیا گیا تھا اور بوس کے ساتھ ٹکراؤ شروع کر رکھا تھا جس کے نتیجے میں AITUC جولائی 1931 میں کلکتہ کے اجلاس میں دوبارہ تقسیم ہو گئی۔ یہ لوگ سول نافرمانی کی تحریک سے الگ رہے اور اپنی توانائی آپسی چپقلش پر ہی خرچ کرتے رہے تھے۔

گاندھی۔ اروِن معاہدے سے بائیں بازو کے انقلاب پسندوں کے علاوہ دوسرے لوگوں کو بھی مایوسی ہوئی تھی۔ ہارڈی مین کے مطابق کھیڑا کے پٹی داروں کا یہ کہنا تھا کہ یہ "معاہدہ ان کے ساتھ دھوکہ" تھا کیونکہ مال گزاری میں کمی نہیں کی گئی تھی اور زیادہ تر قرق شدہ زمینیں بحال نہیں کی گئی تھیں جو کہ 1928 کی باردولی کی کامیابی کے بالکل برعکس بات تھی "پولس کی لاٹھیوں کی بجائے اس معاہدے نے ان کے حوصلے کو توڑ دیا تھا" (Hardiman: Peasant Agitations in Kheda District, p. 289)۔

Brian Stoddart اور گیان چند پانڈے نے ساحلی آندھرا اور یوپی کے سلسلے میں بھی اسی طرح کا نتیجہ اخذ کیا ہے۔ ان دونوں علاقوں کے لیے 1931 کا سال پہلی زبردست کساد بازاری کے پیش نظر لگان اور مال گزاری کی عدم ادائیگی کی تحریکوں کے لیے ایک نفسیاتی مرحلے کی حیثیت اختیار کر گیا تھا، مگر کانگریس نے معاہدہ کے احترام کی کوشش کرتے ہوئے کسان طبقے کو پورے 9 ماہ تک روکے رکھا تھا۔

بہر حال گاندھی۔ اروِن معاہدے کے اثر کی وضاحت محض منفی پہلوؤں کے مد نظر کرنا

درست نہیں ہے۔ گاندھی کی طرف سے حکومت کو دی گئی رعایتوں اور قوم پرست تحریک کو حاصل ہونے والے فوائد سے قطع نظر، اب وائسرائے قوم پرست لیڈروں کے ساتھ نسبتاً زیادہ شرافت اور برابری کا سلوک کرنے پر مجبور ہو گیا تھا، یہ ایک ایسی بات تھی جو زبردست نفسیاتی اہمیت کی حامل تھی اور اسی وجہ سے ہندوستان کے بیشتر انگریز افسران وائسرائے کے اس رویے پر شروع سے ہی ناپسندیدگی ظاہر کرتے آرہے تھے۔ جیل سے رہائی کے بعد عام کانگریسی ورکر فتح مند کے طور پر گاؤں یا شہر واپس لوٹے تھے، اس طرح اب ان کا موڈ 1922 کی مایوسی اور بددلی کے مقابلے میں قطعی مختلف تھا۔ جہاں باردولی تحریک کی واپسی کے بعد کانگریس کی تنظیم بری طرح سے منتشر ہو گئی تھی، 1931 میں بہت سے علاقوں میں پارٹی کی مشینری میں قابل لحاظ توسیع ہوئی۔ مثال کے طور پر مئی 1931 تک یوپی کے صرف رائے بریلی ضلع میں کانگریس کے 32 دفاتر، 8040 ممبر اور 13081 رضاکار تھے اور 1019 گاؤں میں کانگریس کے جھنڈے لہرا رہے تھے (گیان پانڈے، صفحہ 41) اور اس سے بھی زیادہ اہم یہ کہ معاشی دباؤ، عام کانگریسی کارکن کے بڑھتے ہوئے حوصلے، انقلابی پروگراموں کے سلسلے میں کانگریس کے تامل اور اعلا قیادت کے تئیں ایک حد تک احساس مایوسی اور اس طرح کی دوسری باتیں مل کر تحریک کی نچلی سطح کے لوگوں کے دباؤ کی شکل اختیار کر گئی تھیں جس کی وجہ سے انگریزوں کے ساتھ عارضی مصالحت کی بنیاد اور بھی کمزور ہو گئی تھی اور حکومت نے جوابی کارروائی کے لیے تیاریاں شروع کر دی تھیں۔

نچلی سطح کا دباؤ

بنگال میں، جہاں کہ گاندھیائی عدم تشدد کے سلسلے میں تعلیم یافتہ نوجوانوں کی بددلی میں دہلی معاہدے کے بعد اور اضافہ ہی ہوا تھا، دہشت پسندی 1931 میں اپنے پچھلے سارے رکارڈ پار کر گئی تھی۔ اس سال دہشت پسندی کے 92 واقعات ہوئے تھے جن میں 9 قتل بھی شامل تھے، اور مارے جانے والوں میں دو ضلع مجسٹریٹ (پیڈی، مدنا پور اور اسٹیونس، ٹپرا بھی شامل تھے)۔ ٹپرا کے ضلع مجسٹریٹ کو، دو اسکولی لڑکیوں سانتی اور سنیتی چودھری نے قتل کیا تھا جس سے انقلابی تحریک میں عورتوں کی شمولیت کی ایک نئی سطح کا پتہ چلا تھا۔ پھر یہ کہ یہ دہشت پسندی بھی محض شہروں اور قصبوں تک ہی محدود نہیں تھی۔ صرف چٹاگانگ میں ہی مئی میں 52 گاؤں شورش زدہ قرار دیے گئے تھے۔ برطانوی حکومت کی تشویش اس حد تک بڑھ گئی تھی کہ اس نے جلد ہی جابرانہ طریقے اختیار کرنے شروع کر دیے تھے؛ چٹاگانگ شہر میں 16 سے 25 سال کی عمر کے تمام ہندو بھدرلوک نوجوانوں پر رات کا کرفیو لگا دیا گیا تھا اور 16 ستمبر کو ہجلی کی جیل میں قیدیوں کو گولی سے اڑا دیا گیا تھا۔ باوجودیکہ رابندرناتھ اس زمانے میں قومی سیاست سے کنارہ کش رہے تھے مگر انھوں نے اس

واقعے کے سلسلے میں کلکتہ میں منعقدہ ایک احتجاجی جلسے میں تقریر کی تھی، حالانکہ وہ دہشت پسندی کے سخت دشمن تھے۔ 29 اکتوبر کو ایک آرڈی ننس جاری کر کے دہشت پسندوں کے ہمدردوں کو اندھادھند طریقے پر گرفتار کر لینے کی اجازت دیدی گئی تھی۔ اس اثناء میں ملک کے دوسرے سرے یعنی صوبہ سرحد میں خدائی خدمت گار تحریک تیزی سے پھیلتی جارہی تھی اور اس کے رضاکار اگست 1931 میں باقاعدہ طریقے پر کانگریس میں ضم ہو گئے تھے جس پر حکومت نے کانگریس پر معاہدے کی خلاف ورزی کا الزام لگایا تھا۔

انگریزوں کے لیے اور خود اس مصالحتی پالیسی کے لیے جس پر کانگریس بھی عمل پیرا رہنے کی کوشش کر رہی تھی، سب سے بڑا خطرہ دیہی علاقوں میں بڑھتی بے چینی نے پیدا کیا تھا کیونکہ غذائی اجناس کی قیمتیں انتہائی نچلی سطح پر آ گئی تھیں (یوپی میں 05-1901 میں 100 کے حساب سے قیمتوں کا عدد اشاریہ 1929 میں 218 سے گھٹ کر 1930 میں 162 اور 1931 میں 112 ہو گیا تھا پانڈے۔ صفحہ 160)، اور مال گزاری، لگان اور قرض کا بوجھ ناقابل برداشت ہو گیا تھا۔ کھیڑا اور باردولی میں قرق شدہ زمینوں کے خریدنے والوں اور نئے بھرتی ہونے والے دیہی عہدہ داروں کا سماجی بائیکاٹ کیا گیا اور مئی سے ایک بار پھر مال گزاری کی وصولی میں کافی کمی آ گئی۔ چونکہ گجرات کا دیہی علاقہ بہت اہمیت رکھتا تھا، اس لیے گاندھی نے مارچ سے اگست تک کی درمیانی مدت کا بیشتر حصہ ان دونوں ہی اضلاع میں گزارا۔ انہیں دوسری گول میز کانفرنس میں شرکت کے لیے 29/ اگست کو روانہ ہونا تھا۔ انھوں نے گجرات میں تدارک اقدام نہ ہونے کی صورت میں اپنا سفر انگلینڈ منسوخ کرنے کی دھمکی بھی دی اور 25.27 اگست کو شملہ میں وائسرائے ولنگڈن اور کونسل کے ہوم ممبر ایمرسن کے ساتھ گفت و شنید کے ذریعے باردولی کی کانگریس شکایتوں کی انکوائری کا فیصلہ کرانے میں کامیاب ہو گئے تھے۔

یوپی کے دیہی علاقوں کی صورت حال قابو میں رہنے کی بجائے زیادہ دھماکہ خیز ثابت ہوئی۔ یہاں کانگریس نے زمینداروں اور لگان داروں کے درمیان ثالثی کی کوشش کرتے ہوئے کسانوں سے لگان میں کمی کی درخواستیں کانگریس کے مقامی دفتروں کو بھیجنے کے لیے کہا کیونکہ اس کے خیال میں اس طرح حکومت کے دفتروں کے متوازی دفاتر قائم کرنے کی کوشش کی جا سکتی تھی۔ گاندھی نے 24 مئی کو یوپی کے کسانوں کے لیے ایک منشور جاری کیا جس میں ایک ایسا مصالحتی فارمولا پیش کیا گیا تھا جس کی رو سے بے دخل دار لگان داروں کو رواں شرح کے حساب سے روپے میں آٹھ آنے لگان اور دخل دار لگان داروں کو روپے میں بارہ آنے لگان ادا کرنے کا مشورہ دیا گیا تھا۔ اس اپیل کا اصل نشانہ زرعی انقلاب پسندی تھی۔ "میں آپ لوگوں کو خبردار کرنا چاہتا ہوں کہ آپ اس مشورے پر ہرگز کان نہ دھریئے کہ تعلقہ داروں اور زمینداروں کو کسی طرح کا لگان ادا کرنے کی

ضرورت نہیں ہے"۔ بہر حال افسروں کی طرف سے یہ شکایت جلد ہی موصول ہونے لگی تھی کہ کسانوں نے گاندھی کی مجوزہ کم از کم شرح کو زیادہ سے زیادہ شرح تصور کر لیا ہے بلکہ بہت سے کسانوں نے تو مال گزاری کی ادائیگی بالکل ہی روک دی ہے۔ اسی طرح مقامی لیڈر اور کارکن کانگریس کے نام پر ابھر رہے تھے لیکن تبلیغ زیادہ انقلابی قسم کے اقدامات کی کر رہے تھے، جیسے کہ رائے بریلی میں کالکا پرساد یا رنجن کمار سرگرم تھے، جنھوں نے نادہندلگان داروں کی بے دخلی کے خلاف راجہ شیو گڑھ کے مکان پر احتجاجی دھرنے میں حصہ لیا تھا۔ دلچسپ بات تو یہ ہے کہ راجہ شیو گڑھ نے ایک کھادی دودیالیہ شروع کیا تھا اور جواہر لال سے قریب تعلق رکھنے والے ایک مقامی کانگریسی لیڈر سیتل سہائے کی اہلیہ کو اس میں بطور ٹیچر ملازمت دی تھی (Home, Political, 33/24/1931)۔ کانگریس پر لوگوں کو بھڑکانے کے سرکاری الزام کے باوجود، اس بات کے واضح شواہد ہیں کہ جواہر لال نہرو کے بشمول پارٹی کی پوری قیادت نے لوگوں کو کنٹرول میں ہی رکھنے کی پوری کوشش کی۔ کالکا پرساد کو ضلع کانگریس سے نکال دیا گیا تھا اور جون میں جواہر لال کے دورے کے بعد رائے بریلی میں حالات کافی حد تک پُر سکون ہو گئے تھے۔ آگرہ، جہاں کانگریس کی مشینری بہت مضبوط تھی اور ایک قوم پرست زمیندار سیٹھ اچل سنگھ کے مالی عطیے سے منگرام سیوا سنگھ، سرگرم تھا، فساد کے ایک واقع کے علاوہ بحیثیت مجموعی پر سکون رہا تھا، جب کہ زرعی انقلاب پسندی کے اہم مراکز، رائے بریلی سے قطع نظر، بارہ بنکی میں تھے جہاں کانگریس کی تنظیم برائے نام ہی تھی، یا پھر الہ آباد کی منجھن پور تحصیل میں تھے جسے 1930 میں قوم پرستوں نے اس لیے نظر انداز کر دیا تھا کہ وہاں مسلم زمیندار تھے۔ دسمبر 1931 میں، جب کہ گول میز کانفرنس کی گفت وشنید ناکام ہوتی معلوم ہونے لگی تھی، کانگریس نے کچھ اضلاع میں لگان نہ دینے کی اجازت دیدی تھی لیکن تب تک گورنر مالکم ہیلی کی جبر واستبداد اور مصالحت کی ملی جلی پالیسی نے کسانوں کا کس بل کافی حد تک نکال دیا تھا تاہم یوپی کے کسان کچھ نہ کچھ حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے اور مال گزاری اور لگان میں تخفیف کرالی تھی۔ یہ معافی بھلے ہی ناکافی رہی ہو، مگر دوسرے صوبوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ تھی۔ بہر حال یہ ایک ایسی بات تھی جس نے قومی تحریک کے مستقبل کے لیے زرعی روابط سے متعلق سوالات کی اہمیت کو اجاگر کر دیا تھا۔ 1936 کے آتے آتے یوپی کی کانگریسی قیادت کو خواہ نظریاتی طور پر ہی سہی، زمینداری کے خاتمے کی تائید کرنی تھی اور دوسرے تمام صوبوں کے مقابلے میں یوپی کی کانگریس قیادت کا یہ فیصلہ یقیناً تقدم زمانی کا حامل تھا۔

عارضی مفاہمت کے ان 9 مہینوں کے دوران دوسرے کئی علاقوں میں بھی سرگرمیاں جاری رہی تھیں، یہ دوسری بات ہے کہ ان سرگرمیوں کو یوپی کی سرگرمیوں کے مقابلے میں کم تشہیر حاصل ہوئی تھی۔ جولائی 1931 میں کچھ دیسی ریاستوں، مثلاً کشمیر وغیرہ میں شخصی حکمرانی اور

جاگیردارانہ نظام کے خلاف ایجی ٹیشن جنم لے رہا تھا۔ کشمیر میں غالب اکثریت والی مسلم رعایا اور ہندو موروثی حکمراں کے درمیان ٹکراؤ ناگزیر ہوتا جارہا تھا جو بعض اوقات فرقہ وارانہ رخ بھی اختیار کرجاتا تھا، لیکن اسی زمانے میں وہاں نیشنل کانفرنس کی شکل میں ایک طاقت ور تحریک کی بنیادیں بھی رکھی جارہی تھیں۔ شخصی حکمرانی کے خلاف ایجی ٹیشن کا سلسلہ مسلم گریجویٹوں کے ایک گروپ نے، جس میں شیخ عبداللہ بھی شامل تھے، شروع کیا تھا۔ اس ایجی ٹیشن کی نمایاں شکل 13/جولائی کو سری نگر جیل پر زبردست عوامی حملے کے ساتھ سامنے آئی۔ اس حملے کے موقع پر پولس کی فائرنگ میں 21 لوگ مارے گئے تھے۔ اگرچہ اس واقعے کا فوری نتیجہ فرقہ وارانہ تشدد کی شکل میں سامنے آیا تھا، لیکن ستمبر 1931 میں جابرانہ اقدامات کے رد عمل میں ہندوؤں کی بجائے پولس کو نشانہ بنایا جانے لگا تھا اور صورت حال اتنی خراب ہو گئی تھی کہ مہاراجہ کی مدد کے لیے انگریزوں کو فوج بھیجنی پڑی تھی جموں خطے کے میرپور، کوٹلی، اور راجوری تعلقوں میں ساہوکاروں کے خلاف بلوے شروع ہو گئے تھے۔ ریاست کو 12 نومبر کو ایک شکایت جانچ کمیشن قائم کرنا پڑا تھا جس میں چند غیر سرکاری ممبر بھی شامل تھے۔ جولائی میں ترواچراپلی کے قریب ایک چھوٹی سی ریاست پڈوکوٹہ میں، انڈین اینول رجسٹر کے مطابق، کئی دنوں تک "انبوہ کی حکمرانی" رہی تھی۔ لوگوں نے نئے محصولات کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے پولس اور فوج کو اپنے قابو میں کرلیا تھا، عدالتوں کے رکارڈ نذر آتش کردیے تھے، جیل سے قیدیوں کو رہا کرالیا تھا، اور ریاست کے حکمراں کو اضافی محصول عارضی طور پر منسوخ کرنے کے لیے مجبور کردیا تھا۔ بہار میں کانگریسی قیادت زمیندار حامی موقف پر قائم رہی۔ لیکن اس اثناء میں ضلع گیا میں جادو نندن شرما کی قیادت میں ایک مضبوط "کسان سبھا" تحریک ابھر رہی تھی۔ اتکل صوبائی کانگریس کمیٹی نے ستمبر 1931 میں پورے اڑیسہ میں "کرشک سنگھ" قائم کرنے کا فیصلہ کیا تھا اور سرکاری افسران کو یہ اعتراض تھا کہ کانگریس کے دیہی کام کی وجہ سے پوری جیسے اضلاع میں زمینداروں اور لگان داروں کے روابط بری طرح متاثر ہورہے تھے۔ ساحلی آندھرا میں بھی 1931 کے آخر میں مال گزاری کی عدم ادائیگی کے لیے دباؤ بڑھتا جارہا تھا۔ اس تحریک کی کمان ڈگی رالا بلرام کرشنیا (ضلع کرشنا) کے ہاتھ میں تھی جن کی تلگو نظم 'گاندھی گیتا' نے زرعی اور قومی تحریکوں کو بہت مقبول بنادیا تھا۔ آندھرا میں زمینداری والے علاقوں کے کسان بھی پہلی بار منظم ہورہے تھے، انھیں خاص طور پر نیلور میں 2117 مربع میل رقبے پر پھیلی ہوئی وسیع اور عریض ریاست وینکٹاگری میں منظم کیا جارہا تھا۔ یہاں 1931 میں چارہ محصول کے خلاف جنگل ستیہ گرہ بھی شروع ہو گیا تھا۔ زمیندار نئے چارہ محصول کے وسیلے سے عمارتی لکڑی اور چارہ سے متعلق کسانوں کے روایتی حقوق کو سلب کرنے کی کوشش کررہا تھا۔ اس تحریک کی قیادت این۔ وی۔ راما نائیڈو اور این۔ جی رنگا نے کی تھی۔ ستمبر 1931 میں کرشنا اور

گوداوری کے اضلاع میں مہاجن مخالف بلوے بھی ہوئے تھے جن میں 4000 سے زائد لوگوں پر مشتمل بھیڑ ملوث رہی تھی۔ کیرالہ میں جہاں کہ ذات پات کے نظام کی پوری جکڑ بندی تھی، نومبر 1931 میں کانگریس لیڈر کی لاپن کی قیادت میں گرودیور مندر کے سلسلے میں جو ستیہ گرہ شروع ہوا تھا اس کا ایک بہت اہم انقلاب کارانہ اثر مرتب ہوا تھا۔ رضاکاروں کے جتھے مالا بار نیز ٹراونکور اور کوچین کے مختلف حصوں سے پیدل ہی طویل فاصلے طے کرتے ہوئے پہونچے تھے اور سول نافرمانی شروع ہو جانے کے باوجود بھی گرودیور کا ستیہ گرہ ستمبر 1932 تک جاری رہا تھا۔ یہ ستیہ گرہ گاندھی کے حکم پر واپس لیا گیا تھا۔ اس ستیہ گرہ کے سرگرم کارکنوں میں ایک اسکول ماسٹر بھی شامل تھا جس کا نام اے۔ کے گوپالن تھا جو بعد میں جلد ہی کیرالہ کے مقبول ترین کیمونسٹ کسان لیڈر کی حیثیت حاصل کر گیا تھا۔

سرکاری رویہ

مفاہمت کے مہینوں کے دوران بڑھتے گئے عوامی دباؤ کے نتیجے میں برطانیہ کے سرکاری حلقوں میں، اچانک کاروائی کے ذریعے جوابی اقدامات کی منصوبہ بندی کے رجحان کو تقویت ملتی گئی۔ ڈی۔ اے۔ لو (Low) نے ایک اہم مضمون میں یہ دکھایا ہے کہ انگریزوں کے رویے میں پیدا ہونے والی تبدیلی اروِن کے جانشیں ولنگڈن سے منسوب کی جاتی ہے۔ اس کی جڑیں دراصل پہلی سول نافرمانی کے دوران انگریز افسروں کے انداز فکر نیز فروری۔ مارچ 1931 میں گاندھی کے ساتھ اروِن کے مساوی درجے کے سلوک پر افسر شاہی کے شدید رد عمل میں پیوست تھیں۔ لو (Low) کے مطابق بنیادی خیال یہ تھا کہ "سول مارشل لا" کے ذریعے سول حکام کو فوج جیسے خصوصی اختیارات دیدیئے جائیں اور براہ راست طور پر فوج نہ طلب کی جائے۔" (D. A. Low: Cogress and the Raj)۔ ہوم ممبر ایمرسن نے مئی 1931 میں اس بات پر زور دیا تھا کہ فی الوقت دہلی معاہدے کو برقرار رکھنے کے ساتھ ساتھ "اس معاہدے کے ٹوٹ جانے کی صورت میں اچانک کارروائی اور سخت کارروائی" کے لیے بھی فیصلہ کرنا بہت ضروری ہے"۔ چنانچہ جنوری 1932 میں معاہدے کے ٹوٹ جانے سے کافی پہلے ہی "خصوصی اختیارات آرڈی ننس، کا مسودہ تیار کر لیا گیا تھا۔

ہندوستان میں افسروں کے رویے میں سختی کو مزید مدد اس بات سے بھی ملی کہ خود برطانیہ کی سیاست میں ایک بار پھر قدامت پرستوں کو غلبہ حاصل ہو گیا تھا اور ستمبر 1931 میں منحرف لیبر لیڈر میک ڈونالڈ کی قیادت میں ایک ایسی قومی حکومت قائم ہوئی تھی جس پر قدامت پرستوں کا پورا غلبہ تھا اور عالمی معاشی بحران کے سنگین تر ہوتے جانے کے ساتھ ساتھ لنکاشائر کپڑا صنعت اور برطانوی کاروباری حلقے کے جوابی اقدامات کا خاکہ تیار کیا جارہا تھا۔ جیسے ہی حکومت نے معاشی

بحران کی وجہ سے انکم ٹیکس، کسٹم اور ریلوے سے ہونے والی آمدنی میں بھاری کمی سے پیدا شدہ مالی مشکلات پر قابو پانے کے مقصد سے، اور سیاسی اعتبار سے کوئی دھماکہ خیز قدم اٹھانے کی بجائے، کپاس محصول 20 فی صد سے بڑھ کر 25 فیصد کر دینے کا فیصلہ کیا تھا تو ٹوری پارٹی سے وابستہ نئے سکریٹری آف اسٹیٹ سموئل ہورے نے ستمبر 1931 میں مالیاتی خود مختاری کنونشن کو بالا اختیار منسوخ کر دینے کی دھمکی دیدی تھی۔ جیسا کہ 1930 کی پوری دہائی کے دوران دیکھنے میں آتا رہا، لنکا شائر کے احتجاج کے باوجود وزارت داخلہ کے افسران نے نئے محصول سے اتفاق کر لیا مگر روپے کی شرح تبادلہ 1 شلنگ 6 پینس پر ہی ٹکی رکھنے پر اصرار کیا۔ یہ 21 ستمبر 1931 کی بات ہے جب برطانیہ کا سونا کرنسی معیار کافی ڈگمگا گیا تھا۔ سونا کرنسی معیار سے الگ ہو جانے پر روپے کی قدر زر میں کافی کمی آجاتی جس سے داخلی اخراجات نیز منافع کی ترسیل بری طرح متاثر ہو جاتی؛ چنانچہ اس طرح دار السلطنت سے متعلق مالیاتی پہلوؤں کو ہی سب سے زیادہ ترجیح دی گئی تھی اور اس سلسلے میں لنکا شائر کے بعض مفادات کو بھی قربان کر دیا گیا تھا۔ گول میز کانفرنس کے دوسرے اجلاس (ستمبر۔ دسمبر 1931) میں افسروں اور برطانیہ کے تجارتی نمائندوں نے اس بات پر اصرار کیا کہ وائسرائے کو اعلا مالیاتی اختیارات اپنے پاس ہی محفوظ رکھنے چاہیں۔ برلا کا اندازہ یہ تھا کہ مجوزہ وفاقی ڈھانچے کے تحت مفروضہ "جواب دہ" ہندوستانی وزیر مالیات کا کنٹرول 130 کروڑ روپے کے کل مالیہ میں محض 15 کروڑ روپے پر ہی ہوگا۔ (برلا بنام میرو، 31/ اکتوبر 1931)۔ برطانیہ کے Ben thall جیسے تجارتی نمائندوں نے ایسے تجارتی تحفظات کے لیے بھی زور دیا جن کی رو سے ہندوستان میں قوم پرست حکومت کے کسی بھی "امتیازی سلوک" کے خلاف تحفظ کی ضمانت حاصل ہو سکے۔ سیاسی سطح پر بھی "سائمن طرز فکر" کی طرف مراجعت کے آثار پیدا ہونے لگے تھے۔ یعنی یہ کہ وائسرائے ولنگڈن کے نام سکریٹری آف اسٹیٹ کے 2/ اکتوبر 1931ء کے مکتوب کے مطابق "پہلے قدم کے طور پر ہندوستانیوں پر صوبائی خود مختاری کے لیے زیادہ سے زیادہ دباؤ ڈالنا ہوگا"۔

مجموعی صورت حال کی وجہ سے گول میز کانفرنس میں گاندھی کی شرکت لا حاصل ثابت ہوئی۔ اقلیتوں کے معاملے کو لے کر اجلاس جلد ہی تعطل کا شکار ہو گیا تھا، کیونکہ اب جداگانہ انتخابیہ کا مطالبہ، مسلمانوں کے علاوہ نچلی ذاتوں، ہندوستانی نسل کے عیسائیوں اور یوروپی نسل کے لوگوں نے بھی پیش کر دیا تھا اور مشترکہ اقدام کے لیے 13 نومبر کو آپس میں ایک معاہدہ بھی کر لیا تھا۔ Benthall نے خاص طور پر مسلم مندوبین پر کافی کام کیا تھا اور اس وعدے کے بدلے میں کہ "ہمیں بنگال میں ان کی معاشی خستہ حالی کو نہیں بھولنا چاہیے اور...... یوروپی فرموں میں انھیں جگہ دلانے کے لیے ہمیں ہر ممکن کوشش کرنی چاہیے"۔ ان کی تائید حاصل کر لی تھی۔ گاندھی نے آئینی پیش رفت کو فرقہ وارانہ مسائل کے حل سے مشروط کرنے کی کوششوں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔

ان کا کہنا تھا کہ فرقہ وارانہ مسئلے کا یہ حل سوراج کے آئین کا تاج، تو ہو سکتا ہے مگر اس کی بنیاد ہرگز نہیں"۔ اور 5 اکتوبر کو یہ پیش کش بھی کر دی تھی کہ مسلمانوں کے تمام دعوؤں کو تسلیم کر لیا جائے گا مگر اس کے لیے انھیں کانگریس کے سوراج کے مطالبے کی تائید کرنی ہوگی۔ لیکن مسلم مندوبین نے اس پیش کش کو یک لخت مسترد کر دیا اور مہا سبھا نے بھی گاندھی کی اس فراخ دلی کو قطعی پسند نہیں کیا تھا اور سکھوں کے ساتھ مل کر ایسے کسی بھی بندوبست کی سخت مخالفت کی تھی جس سے پنجاب میں مسلمانوں کو اکثریت حاصل ہوتی ہو۔ وفاق کے سوال پر بھی، اب راجگان ایک دوسرے سے مختلف لہجوں میں بات کرنے لگے تھے اور 1930 کے مقابلے میں اب ان کا جوش و خروش کافی ٹھنڈا پڑ گیا تھا، وجہ یہ تھی کہ کانگریس کے ذریعے تحریک واپس لے لینے پر مرکز میں کسی فوری تبدیلی کا خطرہ ٹل گیا تھا۔ مرکز میں تبدیلی سے متعلق تبادلہ خیال کو ملتوی کر دینے کے لیے انگریزوں کی کوشش پر محض اس لیے روک لگ گئی تھی کہ سپرو، جناح اور امبیڈکر نے اس کی مخالفت کی تھی اور میک ڈونالڈ نے اجلاس کا اختتام یکم دسمبر کو اپنے 19 / جنوری کے موقف کو دوہرا کر کیا اور مسلم اکثریت کے دو نئے صوبوں (صوبہ سرحد اور صوبہ سندھ) کی تشکیل، ایک ہندوستانی مشاورتی کمیٹی، (مالیات، رائے دہی اور ریاستوں کے سلسلے میں تین ایکسپرٹ کمیٹیاں) قائم کرنے کے اعلان کے ساتھ ساتھ یہ بھی کہا کہ اگر ہندوستانی لیڈر فرقہ وارانہ مسئلے کا حل تلاش کرنے میں ناکام رہے تو انگریز یک طرفہ طور پر حل کا اعلان کر دیں گے، جو کہ ہندوستانی نقطہ نگاہ سے اہانت آمیز ہونے کے ساتھ ساتھ ایک انتہائی خطرناک بات بھی تھی۔

بہر حال ساری سرگرمی لاحاصل ثابت ہوئی تھی اور ایسا ہونا اس لیے لازمی تھا کہ گاندھی نے دہلی مذاکرات کے دوران اپنی پارٹی کے لیے اکثریتی نمائندگی کے مطالبے کو ترک کر دیا تھا جب کہ اسی مطالبے کی وجہ سے دسمبر 1929 میں اروِن کی پیش کش کو مسترد کر دیا گیا تھا، کانگریس نے گول میز کانفرنس میں اکثریتی نمائندگی کی بجائے مساوی نمائندگی کو قبول کر لیا تھا۔ جب 28 / دسمبر کو گاندھی ہندوستان واپس لوٹے تو نہرو اور غفار خان جیل میں تھے اور بنگال، یوپی اور صوبہ سرحد میں بڑے پیمانے پر استبدادی کارروائیاں چل رہی تھیں۔ ولنگڈن نے ملاقات کے لیے گاندھی کی درخواست کو بڑی ترشی کے ساتھ مسترد کر دیا تھا جس کی وجہ سے ورکنگ کمیٹی کے سامنے سول نافرمانی کی تحریک پھر سے شروع کر دینے کے علاوہ کوئی دوسرا راستہ نہیں رہا تھا۔ بڑے پیمانے پر منصوبہ بند تدارکی کارروائی کا سلسلہ 4 جنوری 1932 کو شروع ہو گیا، جس کے سلسلے میں متعدد آرڈی ننس جاری کیے گئے، ہر سطح پر کانگریس تنظیم پر پابندی لگا دی گئی۔ لیڈروں کی گرفتاری شروع کر دی گئی اور املاک کو قرق کیا جانے لگا، Hoart کا اعلان یہ تھا کہ "اس بار آر پار کی جنگ ہوگی"۔ بنگال میں پہلے ہی دن کم از کم 272 تنظیموں اور انجمنوں پر پابندی لگائی گئی تھی۔

1932-34: سول نافرمانی کی دوسری تحریک

استبداد اور مزاحمت

کانگریس کی قیادت میں قومی تحریک نے بے مثال استبدادی اقدامات کا ڈٹ کر مقابلہ کیا اور اپنی جدو جہد ڈیڑھ سال تک جاری رکھی۔ جنوری 1932 سے مارچ 1933 تک کی 15 ماہ کی مدت کے دوران تقریباً 1,20,000 لوگ گرفتار کیے گئے تھے۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ 1930-31 کی تحریک کے مقابلے میں، جب کہ 90,000 گرفتاریاں ہوئی تھیں، یہ تحریک زیادہ زور دار رہی تھی؛ بلکہ اس مرتبہ زیادہ گرفتاریوں کی وجہ یہ تھی کہ اس مرتبہ انگریزوں کا جبر و ظلم بہت بڑھا ہوا اور بہت ہی منظم تھا۔ دوسری اہم بات یہ کہ زیادہ تر گرفتاریاں شروع کے ہی چند مہینوں کے دوران کی گئی تھیں۔ ایک سرکاری رپورٹ کے مطابق اپریل 1933 تک جو کل 74,671 سزائیں ہوئی تھیں ان میں جنوری 1932 میں 14,803 فروری میں 17,818، مارچ میں 6909، اور اپریل میں 5254 سزائیں ہوئی تھیں، اس کے بعد یہ تعداد 4000 سے آگے کبھی نہیں بڑھی اور ولنگڈن کی 9/ اپریل 1932 کی رپورٹ میں "صورت حال کنٹرول میں ہونے" اور اسی سال 6/ نومبر کی رپورٹ میں "سول نافرمانی تحریک جان کنی کی حالت میں" پہونچ جانے کی بات کہی گئی تھی۔ کل آبادی کے لحاظ سے سزاؤں کا صوبائی تناسب بمبئی پریزیڈنسی (14,101؛ 0.064 فی صد)، بہار اور اڑیسہ (14903؛ 0.040 فی صد)، یوپی (14659؛ 0.030 فی صد) بنگال (12791؛ 0.026 فی صد)، اور سی پی (4014؛ 00.26 فی صد) میں بہت زیادہ رہا تھا۔ جب کہ پنجاب میں یہ تناسب محض 0.008 فی صد اور مدراس میں 0.007 فی صد رہا تھا۔ اگرچہ مسلمانوں کی حصے داری عام طور پر کم رہی، مگر پورے ملک میں سب سے زیادہ فی صد تناسب صوبہ سرحد (6053؛ 0.25 فی صد) میں رہا تھا۔ عورتوں کی تعداد 3630 تھی اور کانگریس کس حد تک ایک عوامی تحریک کی حیثیت اختیار کر چکی تھی اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ مدراس میں کل سزایافتہ 904 میں 759 اور یوپی میں کل 2004 میں 1550 لوگ ناخواندہ تھے؛ 1932 کے اوائل کے ایک تخمینے کے مطابق یوپی کے ان کل 2004 سزایافتہ لوگوں میں 1397 لگان دار یا مزدور تھے۔ (Home Political . F. N. 3/11/1933)۔

1932-33 کی سول نافرمانی کی تحریک میں متنوع قسم کی سرگرمیاں شامل رہیں، اس کی وجہ یہ تھی کہ بہت ساری سرگرمیاں خلاف قانون قرار دیدی گئی تھیں اور شہری آزادیوں کا گلا گھونٹ دیا گیا تھا۔ ولنگڈن نے 4/ جنوری کے جابرانہ اقدامات کے منصوبے کو آخری شکل دیتے ہوئے

اپنے اس احساس کا اعتراف کیا تھا کہ وہ "ہندوستان میں ایک دوسرا مسولینی بنتا جارہا ہے" (مکتوب بنام ہوائے، 20دسمبر 1931)۔ پابندیوں کی خلاف ورزی میں، کپڑے اور شراب کی دکانوں پر دھرنا اور، بازاروں کو بند رکھنا، گوروں یا وفاداروں کے کاروبار کا بائیکاٹ، کانگریس کے جھنڈے کا لہرانا، خلاف قانون طریقے پر کانگریس کا عوامی جلسے منعقد کرنا (جیسا کہ اپریل 1932 میں دہلی کے چاندنی چوک علاقے میں گھنٹہ گھر کے قریب یا اگلے سال کلکتہ میدان میں جلسہ کیا گیا تھا) نمک ستیہ گرہ، چوکیداری محصول، لگان اور مال گزاری کی عدم ادائیگی، جنگل قوانین کی خلاف ورزی اور کانگریس کی کارروائیاں خلاف قانون طریقے پر جاری رکھنا وغیرہ شامل تھا۔ بم وغیرہ بھی استعمال کیے جاتے تھے بعد میں جس کی گاندھی نے شدید مذمت کی تھی۔

ولنگڈن کے 4/اپریل 1932 کے مراسلے میں بمبئی شہر اور بنگال کو "دو سیاہ دھبے" بتایا گیا تھا۔ گورنر کے مطابق بمبئی شہر گاندھی ازم کا رکھیل بنا رہا تھا جہاں "کانگریس کی گرفت کافی گہری تھی" (Sykes to Hoare 6, March ,1932)۔ تحریک میں گجراتی بیوپاری برادری کی بھاری شرکت کی وجہ سے (جن میں زیادہ تعداد چھوٹے بیوپاریوں کی تھی) خام کپاس کی مرکزی مل جی تھے، مارکیٹ اکتوبر 1932 تک بری طرح متاثر رہی تھی۔ اگرچہ حکومت نے ہندوستانیوں کے بائیکاٹ کے نتیجے میں تباہی کے دہانے پر پہونچی ہوئی گوروں کی فرموں کو سہارا دینے کے لیے متعدد اقدامات کیے مگر مل ورکر الگ ہی رہے اور مسلمان بار بار برانگیختہ ہوئے، چنانچہ مئی سے جولائی 1932 کی درمیانی مدت میں بمبئی شہر میں کئی فرقہ وارانہ فسادات ہوئے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دیہی علاقوں میں خواہ، وہ بمبئی کے ہوں یا کسی اور صوبے کے، لوگوں کا ردعمل 1930 کے مقابلے میں کسی قدر دبا دبا رہا، اور اس کی وجہ یہ تھی کہ کانگریس نے 1931 کی مفاہمت کے دوران اپنی بندوقوں کو زنگ لگالیا تھا اور لگان و مال گزاری کی قطعی عدم ادائیگی کے اہم ترین نفسیاتی لمحے کو گنوادیا تھا۔ انگریز ریاست بروڈہ کی سرحدیں بند کرانے میں کامیاب ہوگئے تھے جس سے کھیڑا اور باردولی کے لوگوں کے لیے ایک بڑی مجبوری پیدا ہوگئی تھی اور فروری 1932 میں کھیڑا میں محض 15 گاؤں کے کسانوں نے لگان روک رکھا تھا۔ کھیڑا میں راس جیسے ایک گاؤں کے کسانوں نے 1933 میں بھی لگان کی ادائیگی سے انکار کر رکھا تھا، جب کہ اس گاؤں کے پٹی دار اس وقت تک 2000 ایکڑ زمین سے ہاتھ دھو چکے تھے، اور ان میں کچھ تو ایسے بھی تھے جنھیں سر عام برہنہ کیا گیا تھا، کوڑے لگائے گئے تھے اور بجلی کے جھٹکے دیئے گئے تھے۔ کرناٹک کے کچھ علاقوں، بالخصوص شمالی کنارا کے انکولہ اور سدا پور تعلقوں میں مال گزاری کے خلاف زوردار تحریک شروع ہوئی تھی اور 200 گاؤں کے کسانوں نے مال گزاری روک رکھی تھی اور آل انڈیا کانگریس کمیٹی کی رپورٹوں سے جنوبی اور وسطی ہند کے بھی بہت سے حصوں میں بھی جنگل ستیہ گرہ شروع ہو جانے کا پتہ چلا۔

مثال کے طور پر انکولہ میں یکم مئی 1932 کو4000 گاؤں والے تازہ کٹی ہوئی لکڑیاں نیلام کرنے کے لیے انکولہ تعلقے کے صدر مقام میں در آئے تھے، اور اسی ماہ سی پی(C.P.) کے ایک مقام بیتول میں بھی قبائل لیڈروں منو گونڈ اور چیتو کوکو کی قیادت میں ایک زور دار جنگل ستیہ گرہ کی پیش کش کی گئی تھی۔ کیرالہ صوبائی کانگریس نے بھی اگست اور اکتوبر1932 میں مالابار کے کیسر گوڈ تعلقے میں جنگل ستیہ گرہ کی رپورٹ دی تھی(AICC.F.N. 1/1932)۔

تامل ناڈو اور آندھرا میں سول نافرمانی کی تحریک1930 کے مقابلے میں نسبتاً کم زور رہی؛ حالانکہ مدراس، مدورائی اور ویدرنیم(تامل ناڈو) جیسے مقامات پر کافی دھرنے دیئے گئے تھے اور مظاہرے ہوئے تھے، اور ساحلی آندھرا میں مال گزاری کی عدم ادائیگی کی تحریک کے آثار سے 1933 میں انگریزوں کے کان کھڑے ہو گئے تھے۔ بہار میں فروری1932 میں مونگیر اور مظفر پور میں پولس تھانوں پر بڑی بڑی بھیڑ کے حملے کے واقعات ہوئے تھے اور آب کاری محصول میں1933 تک گراوٹ آتی رہی تھی۔ یوپی میں اگرچہ اے آئی سی سی کے مارچ 1933 کے ایک خفیہ خبرنامے میں متعدد اضلاع میں لگان کی عدم ادائیگی کی تحریکوں کی خبر دی گئی تھی، مگر سول نافرمانی عام طور پر ایک شہری معاملہ بن کر رہ گئی تھی۔ مثال کے طور پر آگرہ ضلع، گاؤں بروا میں لگان کے خلاف تحریک کے علاوہ، اس مرتبہ مکمل طور پر پر سکون رہا تھا۔ جب کہ رائے بریلی میں کل واجب لگان کا80 فیصد حصہ وقت سے دو ماہ قبل ہی، جولائی1932 میں وصول کیا جا چکا تھا۔ (گیان پانڈے۔ صفحہ 177، 187)۔

بنگال میں اے آئی سی سی کے مارچ1932 کے خبرنامے میں صوبے کے ساحلی علاقوں میں نمک ستیہ گرہ پھر سے شروع ہو جانے، چوکیداری محصول نہ ادا کرنے، بہت سے اضلاع میں یونین بورڈ کے بائیکاٹ نیز ہگلی کی آرام باغ تحصیل اور میپرا، سلہٹ اور جل پائی گوڑی میں لگان کی عدم ادائیگی کی رپورٹ دی گئی تھی۔ کانگریسی قیادت شدید مندی کے حالات میں بھی زرعی انقلاب پسندی کا کوئی پروگرام نہیں پیش کر سکی جس کی وجہ سے مسلم کسانوں کی تحریکیں علاحدگی پسندانہ خطوط پر فروغ پاتی گئیں۔ ان برسوں میں پرجا تحریک کافی زور پکڑ چکی تھی اور دسمبر 1932 میں مولانا بھاشانی نے، جو آگے چل کر زرعی پروگرام کو فرقہ وارانہ اپیلوں سے خلط ملط کرتے رہے، سراج گنج میں ایک بڑے پرجا سمیلن کا اہتمام کیا جس نے زمینداری کے خاتمے اور قرضوں میں تخفیف کا مطالبہ کیا تھا۔ بہر حال دہشت پسندی کی وجہ سے بنگال انگریزوں کے لیے ہمیشہ تشویش کا باعث بنا رہا۔ اگرچہ نیا گورنر اینڈرسن آئرلینڈ کی خانہ جنگی کے زمانے سے ہی جابرانہ اقدامات کا ماہر سمجھا جاتا تھا، مگر 1932 میں دہشت پسندی کے سب سے زیادہ واقعات (104) ہوئے تھے، بہر حال یہ واقعات گھٹ کر 1933 میں 33 اور 1934 میں 17 رہ گئے تھے۔ ضلع مدناپور میں دو مزید گورے ضلع مجسٹریٹ قتل کر دیئے گئے تھے، گورنر جیکسن پر یونیورسٹی کانوو کیشن

میں ایک طالبہ نے حملہ کیا تھا اور سوریہ سین کو کہیں فروری 1933 میں ہی جاکر گرفتار کیا جاسکا تھا۔ بکسا، ہجلی اور دیولی کے کنسنٹریشن کیمپوں میں 3000 سے زائد لوگوں کو حراست میں رکھا گیا تھا جب کہ چٹاگانگ کے قیدیوں کو انڈمان (کالے پانی) بھیج دیا گیا تھا۔

دوسری سول نافرمانی تحریک کے ساتھ ساتھ دوریاستوں میں بھی کافی ہلچل رہی۔ کشمیر میں اپریل 1932 میں گریونسز انکوائری کمیشن کی پیش کردہ رعایتوں (مسلمانوں میں تعلیم کو فروغ دینے کے اقدامات، سرکاری قبضے والی مسلم مذہبی عمارتوں کی واپسی، چارہ ٹیکس کا جزوی التواء اور ریاست کے کاموں کی اُجرت کی ادائیگی) سے بھی تحریک کو نہیں روکا جاسکا تھا۔ مسلم کانفرنس کی داغ بیل اکتوبر 1932 میں ڈالی گئی تھی اور اگرچہ صرف چھ سال بعد ہی اس کا نام تبدیلی کرکے نیشنل کانفرنس کردیا گیا تھا، مگر اس کے رہنما شیخ محمد عبداللہ جموں میں شخصی حکومت کے مخالف ان ہندو لیڈروں کے ساتھ پہلے ہی قریبی روابط قائم کرچکے تھے جن کے لیڈر پی۔ این بزاز تھے۔ راجستھان کی ریاست الور میں 1933 کے اوائل میں مہاراجہ جے سنگھ سوائی کے ذریعے مال گزاری میں اضافے، بیگار، چراگاہی واجبات اور شکار کے لیے جنگلات کو محفوظ کردینے کے خلاف ایک نمایاں شورش شروع ہو گئی تھی۔ اپنے ہی تک محدود رہنے والی اور نیم قبائلی قسم کی میو برادری نے جو کہ زیادہ تر اسلام کی طرف جھکاؤ رکھتی تھی، بڑے پیانے پر چھاپہ مار جنگ شروع کردی تھی۔ ولنگڈن نے اپنی 12 / فروری 1933 کی رپورٹ میں الور کی صورت حال کو "کزحد بدتر" بتایا تھا جب کہ انڈین اینوول رجسٹر کے مطابق اس "فرقہ وارانہ" شورش میں 80، 90 ہزار میوؤں نے حصہ لیا تھا۔ جہاں پنجاب کے مسلم لیڈر محمد یاسین خان نے اس مہاراجہ مخالف تحریک کو فرقہ وارانہ (نیز انگریز حامی) رنگ دینے کی کوشش کی تھی، وہیں شعوری طور پر ایک انقلابی رجحان بھی پروان چڑھ رہا تھا جو کہ سید مطلبی فرید آبادی اور کے۔ ایم۔ اشرف سے منسوب تھا۔ یہی کے۔ ایم۔ اشرف بہت جلد ہندوستان کے اوّلین مارکسی سورخین کی صف میں پہونچ گئے تھے۔ آخرکار انگریزوں کو مجبوراً مہاراجہ کو یورپ بھیجنا پڑا تھا اور الور کے انتظامیہ کو کچھ برسوں کے لیے اپنے ہاتھ میں لینا پڑا تھا۔ 1932 کے نصف آخر میں سول نافرمانی کی تحریک نمایاں طور پر ناکامی سے دوچار ہونا شروع ہو گئی تھی۔ یہ صحیح ہے کہ تحریک میں کسان طبقے کی کم شرکت، جو کہ گجرات، یوپی، یا آندھرا میں بہت نمایاں تھی، کی وجہ یہ نہیں تھی کہ کانگریس میں لوگوں کا یقین نہیں رہا تھا بلکہ یہ تھی کہ انگریزوں نے اس تحریک کے خلاف اپنی طاقت کا بھرپور استعمال کیا تھا اور یہ کہ 34-1930 کے دوران انگریزوں نے ہندوستانیوں کے ایثار اور قربانی کو جس بے رحمی سے ناکام بنانے کی کوشش کی تھی، اس کے رد عمل میں کانگریس اس کے بعد سارے انتخابات جیتتی چلی گئی تھی، بہر حال اس سلسلے میں Hardiman کی اس بات میں بھی وزن ہے کہ "دو ننگ کی نوعیت ویسی نہیں رہی تھی

جیسی کہ ایجی ٹیشن کی تھی...... گاندھیائی ستیہ گرہ کا زمانہ بیت چکا تھا"۔ ملکی کسان کانگریس کو ووٹ دیتے تھے مگر وہ اب اپنی زمین کی قربانی دینے کے لیے تیار نہیں تھے، خاص طور پر اس لیے بھی کہ گاندھی 1931 میں قرق شدہ زمینوں کو بحال کرانے میں ناکام رہے تھے اور کچھ علاقوں میں، اور واضح طور پر گجرات میں، یہ کسان عالمی مندی کے بعد جنگ شروع ہو جانے کے مثبت فوائد کے نتیجے میں نسبتاً زیادہ خوش حال بھی ہو گئے تھے، (کیونکہ کھیڑا میں تمباکو کی قیمتوں میں 500 فی صد اضافہ ہو گیا تھا) اور اس طرح ان کی تشدد پسندی کافی کم ہو گئی تھی۔ دیہی سرمایہ داری 1947 سے پہلے چند منتشر علاقوں میں ہی فروغ پا سکی تھی اور کسان طبقے کی انقلاب پسندی ملک کے بڑے حصے میں ایک بار پھر اجاگر ہونے لگی تھی۔ خاص طور پر زمینداری بندوبست والے علاقوں میں اس کے امکانات زیادہ واضح ہو گئے تھے۔ یہ ایک ایسی انقلاب پسندی (انتہاپسندی) تھی جو تیسری دہائی کے وسط سے کانگریس سے باہر، اظہار کے مختلف وسیلوں کی تلاش میں تھی اور یہ وسیلہ اظہار اسے کافی حد تک اشتراکیت کی طرف جھکاؤ رکھنے والی کسان سبھاؤں اور فرقہ وارانہ نوعیت کی تنظیموں کی شکل میں ملا تھا۔

تاجر طبقے کی نئی صف بندی

اگر سول نافرمانی کی تئیں کسانوں کا رویہ تضاد کا شکار تھا تو شہری بورژوائی طبقے نے بھی زیادہ دلچسپی کا مظاہرہ نہیں کیا۔ 1932 میں پورے سال کے دوران گجراتی بیوپاریوں کی تائید حاصل رہنے کی وجہ سے بمبئی میں تحریک کافی بھیانک شکل اختیار کر گئی تھی؛ بمبئی کے ہندوستانی ایوان تجارت پر 1932 کے اوائل میں ایک قوم پرست گروپ نے ٹھاکرداس کی زبردست مخالفت کے باوجود بھی قبضہ کر لیا تھا اور جب سول نافرمانی کی تحریک پھر سے شروع کی گئی تو FICCI نے آئینی مذاکرات سے خود کو دور رکھنے کا فیصلہ کیا تھا۔ مگر جی۔ ڈی برلا نے جو کہ 1931 میں گول میز کانفرنس کے دوران نجی بات چیت میں مصالحت جوئی کا مظاہرہ کر کے Benthall کو پہلے ہی متحیر کر چکے تھے، 14 مارچ 1932 کو بڑی جلد بازی کے ساتھ Hoare کو یہ یقین دہانی کرائی کہ مصالحت کا دروازہ مکمل طور پر بند نہیں ہے اور یہ کہ گول میز کانفرنس کے بائیکاٹ کی قرارداد FICCI کے لیڈروں نے تنظیم کے ممبروں کے دباؤ پر بادل ناخواستہ پاس کی تھی (حوالہ In the Shadow of Mahatma) جیسے جیسے تحریک انحطاط پذیر ہوتی گئی، سیاسی حقیقت پسندی کے ساتھ ساتھ مخصوص گروہی معاشی اندازوں نے بھی بعض تاجر گروپوں کو حکومت کے ساتھ تعاون اور اشتراک کے لیے مجبور کر دیا تھا۔ 1932 کے موسم گرما میں اوٹاوا امپیریل اکونومک کانفرنس میں ہندوستان نے بعض خام اشیاء کے سلسلے میں برطانیہ میں ترجیحی سلوک کے بدلے میں

بعض برطانوی اشیاء پر درآمدی محصول کی شرح کم کرنے کی بات مان لی تھی۔ ہندوستان کی ان خام اشیاء کو جن میں زیادہ تر چائے اور خام چمڑا شامل تھا۔ نسبتاً کم مقابلے کا سامنا تھا، اگرچہ حکومت ہند کے اس فیصلے کی قوم پرستوں نے اور کھلے عام برلا نے بھی مذمت کی، اس معاہدے کی توثیق قانون ساز اسمبلی میں بڑی آسانی سے کرالی گئی تھی، بمبئی کے تمام بڑے ٹکسٹائل صنعت کار 33-1932 میں لنکا شائر کی کپڑا صنعت کے مقابلے میں جو کہ اس وقت خاصی کمزور چل رہی تھی، زیادہ پریشان جاپان کی طرف سے ہی در پیش مقابلے سے تھے۔ اور یہی بات اکتوبر 1933 میں بدنام زمانہ لیز مودی معاہدے (Lees-Modi Pact) کی بنیاد ثابت ہوئی تھی، جس کے تحت بمبئی کے تاجر اور زیادہ تر ہندوستانی کپاس خریدنے کے لنکا شائر کے وعدے کے بدلے میں برطانوی کپڑے کی درآمدات کو مزید ترجیحات دینے کے لیے راضی ہوگئے تھے۔ اپنی برآمدات پر بھاری محصول لگائے جانے کے انتقام میں جاپان نے ہندوستان سے ناتیار کپاس کی خریداری کافی کم کردی تھی؛ اس لیے جاپانی برآمدات پر بھاری محصول جاری رکھنے کی صورت میں ہندوستان کو اپنی کپاس کی کھپت کے لیے نئی منڈی کی ضرورت تھی۔ لنکا شائر کی برآمدات پر کم محصول کی شکل میں ملک کے ساتھ کی گئی اس "غداری" پر قوم پرست لیڈروں کے ساتھ ساتھ احمد آباد کے وہ کپڑا تاجر اور مل مالکان بھی سخت برہم تھے جو لنکا شائر کے ساتھ مقابلے بازی میں بہت عمدہ کپڑا تیار کرتے تھے اور ہرگز اس حق میں نہیں تھے کہ لمبے ریشے والی وہ کپاس، جس کی خود انھیں بھی ضرورت ہے۔ سستے داموں پر برطانیہ بھیج دی جائے۔ لیکن بمبئی کے مل مالکان اور ٹاٹا گروپ (جس نے کہ بلجیم کے مقابلے کے پیش نظر اسی طرح کا ایک معاہدہ برطانیہ کے فولاد کے تاجروں سے کیا تھا) مل کر بہت بڑی طاقت بن گئے تھے، یہاں تک کہ جون 1932 میں ٹھاکرداس نے "کسی بھی طرح کی مفاہمت" کی اپیل کی تھی اور برلا نے 33-1932 کے دوران اس سلسلے میں حکومت اور گاندھی کے درمیان ثالثی کی بار بار کوشش کی تھی۔

بہر حال بعض اہم سیاسی اور معاشی وجوہ سے کاروباری حلقہ پوری طرح انگریزوں کی گود میں نہیں جاسکا تھا۔ روپے کی شرح تبادلہ 1 شلنگ 6 پینس پر برقرار رکھنے کے لیے انگریزوں کا اصرار ایک مستقل شکایت کا موجب بنا ہوا تھا؛ کیونکہ اس سے محض درآمدات کو ہی بڑھاوا ملتا تھا اور اس کو برقرار رکھنے کے لیے تقلیلی (Deflationary) معاشی و مالیاتی پالیسیوں پر عمل پیرا رہنا ضروری تھا۔ سرمایہ دار دنیا کے دوسرے ملکوں کی حکومتیں عالمی کساد بازاری کا مقابلہ کر رہی تھیں اور اس کے لیے عوامی اخراجات کا دائرہ زیادہ سے زیادہ وسیع کیا جارہا تھا، جب کہ ہندوستان میں نام نہاد "مستحکم مالیات" کبھی بھی ایک مفروضے سے آگے نہیں بڑھ سکی تھی۔ اور ریل نیز آب پاشی کے میدانوں میں سرمایہ کاری میں بھاری کٹوتی کی گئی تھی (باگ چی صفحہ 18.7،46)۔ سونا اسٹینڈرڈ

سے اسٹرلنگ کی علاحدگی کے بعد روپے کی قدر زر میں بھاری کی آجانے کے سبب 1931 سے سونے کی بڑے پیمانے پر برآمدکاری شروع ہو گئی تھی اور اس سے حکومت کو ایک ایسے وقت میں ،جب کہ برآمدات میں بھاری کی آگئی تھی، ہوم اخراجات اور قرضوں کی ادائیگی میں بڑی مدد ملی تھی۔ ان تمام باتوں پر ہندوستان کے کاروباری حلقوں اور رائے عامہ نے زبردست برہمی ظاہر کی کیونکہ عام خیال یہ تھا کہ مندے کے مارے ہوئے کسان پریشان ہو کر اپنا سونا فروخت کر رہے ہیں۔ کانگریس کے رضاکاروں نے بمبئی کی سونا برآمد کرنے والی دکانوں پر دھرنا دینے کی کوشش کی۔ انتہا پسند قوم پرستوں کو بھی کبھی کبھی یہ شک ہوتا تھا کہ ٹھاکرداس اور برلا جیسے لوگ "......اس ناجائز دھندے سے...... لاکھوں بنا رہے ہیں" (بمبئی کانگریس خبر نامہ، 17/ اکتوبر 1932)۔ لال جی نارن جی نے جو کہ 1921 میں عدم تعاون کی تحریک کی کھلے عام مخالفت کر چکے تھے، 27/ جنوری 1932 کو جیاکر جیسے لبرل لیڈر کو خبردار کیا تھا کہ "میں اپنے کاروباری انداز فکر کے تحت گاندھی کی پالیسیوں میں زیادہ یقین رکھتا ہوں" کیونکہ "...... ہمارے تئیں حکومت کی بے حسی نے ہم سرمایہ داروں کو کانگریس جیسی سوشلسٹ تنظیموں کے ساتھ کام کرنے پر مجبور کر دیا ہے......"۔ لال جی نارن جی کا خیال یہ تھا کہ اگر انگریز سونے کی برآمدکاری روک دیں، ہندوستان کی کپڑا صنعت کو تحفظ فراہم کریں، کرنسی، آب کاری اور مالیات کی پالیسیوں میں بہتری لائیں اور بنک کاری، بیمے اور جہاز رانی پر اپنی اجارہ داری کو ختم کر دیں تو کانگریس فوراً سول نافرمانی تحریک کو واپس لے لے گی "جس کے وہ زیادہ رسیا نہیں ہیں، اور خاص طور پر "مہاتما کو پورا یقین ہے کہ ہمارے مطالبات پورے ہو جانے پر تحریک واپس لے لی جائے گی"۔

بہر حال حکومت کے ساتھ اس اشتراک و تعاون میں الجھن پیدا ہو گئی کیونکہ برطانیہ کے کاروباری حلقوں نے 34-1932 کے دوران جوابی جارحانہ اقدامات کا سلسلہ جاری رکھا تھا اور خاص طور پر لنکاشائر نے آئینی مراعات کو سائمن کمیشن کی سفارشات تک ہی محدود رکھنے کے سلسلے میں، چرچل کی قیادت والے ٹوری حزب اختلاف سے ہاتھ ملا لیا تھا اور مرکز میں کسی بھی طرح کی تبدیلی کو غیر معین مدت کے لیے ملتوی کر دینے کا، یا بصورت دیگر ایسے سخت قسم کے کاروباری اور مالیاتی تحفظات کا مطالبہ شروع کر دیا تھا کہ جن کی وجہ سے 1919 کا مالیاتی خود مختاری کنونشن کالعدم ہو کر رہ جائے۔ لنکاشائر کے دباؤ کے نتیجے میں ٹیرف بورڈ کی دسمبر 1932 کی ان سفارشات کو بھی دبا دیا گیا جن میں برطانیہ کے ساتھ ترجیحی سلوک کے بغیر ہی کپاس کے درآمدی محصول میں اضافے کی بات کہی گئی تھی اور 1934 میں Lees Modi معاہدے کو باضابطہ شکل دینے کی بھی کوشش کی گئی۔ جنوری 1935 کے ہند۔ برطانیہ ضمنی معاہدے کی رو سے کپاس محصولات کو اس معاہدے کے دائرہ کار میں شامل کر لیا گیا: یہ محصولات اس سے پہلے اوٹاوا بندوبست سے باہر رکھے گئے تھے۔ اس

کے ساتھ ہی مالی حالات کے سازگار ہوتے ہی 25فی صد در آمدی محصول میں تخفیف کی بات بھی کہی گئی تھی (بسو دیو چٹرجی باب چھ) ۔لا نے 14/ نومبر 1934 کو بڑے ڈرامائی انداز میں ٹھاکر داس کو آگاہ کیا تھا۔ "میرے خیال میں نئا شائر کو انسانی خون کا چسکا لگ گیا ہے...... وہ Lees Modi معاہدے سے اور زیادہ مطمئن نہیں رہ سکے گا۔

انگریزوں کے ساتھ اشتراک اور ٹکراؤ کے لیے بہ یک وقت پڑنے والے باہم مخالف دباؤ کا بدیہی نتیجہ کاروباری حلقے کی از سر نو صف بندی کی شکل میں سامنے آیا۔ یہ صف بندی عوامی ایجی ٹیشن سے بالکل دور، محض کانگریس کی پالیسی میں تبدیلی نیز اسمبلی اور وزارت میں حصے داری سے متعلق رویوں سے تعلق رکھتی تھی۔ اس صف بندی کی وجہ سے ہی ہندوستان کا سرمایہ دار طبقہ دو حصوں، وفاداروں اور قوم پرستوں میں تقسیم ہونے سے بچ گیا تھا جن کے جداگانہ خدوخال تیسری دہائی کے شروع میں ہی نمایاں ہو گئے تھے۔ کاروباری حلقے کی یہ نئی صف بندی خود کانگریسی قیادت کی صورت حال سے بھی مطابقت رکھتی تھی، کیونکہ کانگریس حکومت کی جابرانہ کارروائیوں کی وجہ سے تحریک کے کمزور پڑتے جانے سے عہدہ بر آ ہونے کی کوشش کر رہی تھی۔

ہریجن مہم

گاندھی نے اس ٹکراؤ سے، جو کہ اپنے مقصد میں ناکام رہا تھا، باوقار طریقے پر پیچھے ہٹنے کے بارے میں 1932 کے اوائل میں جیل میں ہی سوچنا شروع کر دیا تھا۔ اس دفعہ ایسا کرنا واقعی بہت مشکل کام تھا کیونکہ حکومت نے، ان کے ساتھ کسی طرح کی گفت و شنید نہ کرنے کا فیصلہ کر رکھا تھا۔ 1922 کے بعد کی ہی طرح اس مرتبہ بھی ان کا پہلا جبلی رد عمل گاؤں میں تعمیری کام کی طرف مراجعت کی شکل میں سامنے آیا۔ پھر یہ کہ اگست 1932، میں فرقہ وارانہ مسئلے کے حل کے لیے میک ڈونالڈ فارمولے کے اعلان نے جس میں اچھوتوں کے لیے بھی جداگانہ انتخابیہ کی بات کہی گئی تھی، ان کی توجہ ہریجنوں کی بہبود کی طرف مبذول کرادی تھی۔ گاندھی نے اچھوتوں کے لیے الگ انتخابیہ کے معاملے پر 20/ اگست سے مرن برت شروع کر دیا تھا۔ اور اونچی ذات کے ہندو لیڈروں اور اچھوت لیڈروں کے درمیان ایک معاہدہ (پونا معاہدہ) کرانے میں کامیاب ہو گئے تھے جس کے ذریعے میک ڈونالڈ ایوارڈ میں رد و بدل کیا گیا تھا۔ اچھوتوں کے لیے محفوظ سیٹوں کے بندوبست کے ساتھ ہندو مشترکہ انتخابیہ کو برقرار رکھا گیا تھا اور وہ بھی اس طرح کہ اچھوتوں کو میک ڈونالڈ ایوارڈ کی بہ نسبت کہیں زیادہ نمائندگی دینے کی بات کہی گئی تھی۔ یہ نظام 1947 کے بعد بھی جاری رکھا گیا۔ ہریجنوں کی ترقی اب گاندھی کا سب سے اہم نصب العین بن گئی تھی۔ اس کے لیے انھوں نے ستمبر 1932 میں ایک آل انڈیا اینٹی ان ٹچ ایبلیٹی لیگ قائم کی؛ اپنی رہائی سے

پہلے ہی جنوری 1933 سے ایک ہفت روزہ اخبار 'ہری جن' نکالنا شروع کیا؛ نومبر 1933 اور اگست 1934 کی درمیانی مدت میں 12500 میل لمبی ہری جن یاترا کی؛ اور یہاں تک کہ 15/ جنوری 1934 کے بہار کے خوفناک زلزلے کو ذ تیلے ہندوؤں کے پاپوں کا خمیازہ بتایا۔ یہ ایک ایسی بات تھی جس سے رابندر ناتھ کو بھی سخت جھٹکا لگا تھا۔ سول نافرمانی کو بتدریج پس منظر میں جانے دیا گیا اور مئی 1933 میں اسے عارضی طور پر معطل کر دیا گیا۔ 23/ اگست 1933 کو جیل سے حتمی رہائی کے بعد گاندھی نے خود کو اس تحریک سے الگ کر لینے کا فیصل کر لیا۔ اور یہ تحریک اپریل 1934 میں باضابطہ طور پر واپس لے لی گئی۔

گاندھی کے دوسرے متعدد پروگراموں کی طرح ہی ان کی ہری جن مہم بھی مقاصد اور اہمیت کے لحاظ سے بالکل غیر واضح تھی۔ جواہر لال جیسے انتہاپسند قوم پرستوں کے خیال میں یہ مہم، سامراج کے خلاف جدو جہد کے اصل کاز کے راستے سے ہٹ جانے کے مترادف تھی۔ اس احساس کو اس بات سے مزید تقویت ملتی گئی کہ انگریز اس کے لیے بھی تیار تھے کہ گاندھی اپنی یہ مہم جیل سے بھی جاری رکھ سکتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی قدامت پرست کانگریسی ہندو بھی اسے پسند نہیں کرتے تھے۔ مثال کے طور پر جو مالویہ دوسری دہائی کے وسط میں گاندھی کے بہت قریب رہے تھے اب وہ بھی گاندھی سے کٹتے جا رہے تھے۔ میک ڈونالڈ ایوارڈ کے دوسرے امور پر زیادہ توجہ دینے سے گاندھی کے انکار پر ہندو فرقہ پرستوں کی ناراضگی اور بھی بڑھ گئی۔ واضح رہے کہ اس ایوارڈ میں مسلمانوں کو پنجاب میں 49 فی صد سیٹیں اور بنگال میں 48.6 فی صد سیٹیں دینے کی بات کہی گئی تھی، اس طرح ان دونوں صوبوں میں یوروپی ممبروں کو ملا کر مسلمانوں کو واضح اکثریت حاصل ہو جاتی۔ بنگال کے قدامت پرست ہندوؤں نے پونا معاہدے پر سخت حملے کیے کیونکہ اس کے ذریعے ذ تیلے ہندوؤں کے لیے دوامی اقلیتی حیثیت تسلیم کر لی گئی تھی؛ جب کہ کانگریس ورکنگ کمیٹی نے جون 1934 میں ایک مصالحتی فارمولہ تیار کیا جس میں نہ تو اس معاہدے کو مسترد ہی کیا گیا تھا اور نہ ہی تسلیم؛ جس پر مالویہ نے کانگریس نیشنلسٹ پارٹی کے نام سے ایک علاحدہ گروپ قائم کر لیا تھا۔ جولائی 1934 میں بکسر، جسی ڈیہہ اور اجمیر میں گاندھی کی ہریجن میٹنگوں میں سناتن دھرمیوں نے ہنگامہ آرائی کی تھی، اور 25 جون کو پونا میں ان کی کار پر بم سے حملہ بھی ہوا تھا۔ برطانوی حکومت بھی روشن خیالی کے تمام تر دعوؤں کے باوجود بھی قدامت پرستوں کو ناراض کرنے کے موڈ میں ہرگز نہیں تھی اور قانون ساز اسمبلی میں اگست 1934 میں مندروں میں داخلے سے متعلق بل کو ناکام بنانے میں سرکاری ممبروں نے فیصلہ کن رول ادا کیا تھا۔

نسبتاً زیادہ طویل مدتی نقطہ نگاہ سے، ممکن ہے کہ گاندھی کے پیروکاروں کے ذریعے ہریجنوں کی بہبود کے کاموں سے قوم پرستی کا پیغام وہی معاشرے کے سب سے پس ماندہ اور نادار طبقوں تک

پہونچانے میں بالواسطہ مدد ملی ہو، اور ملک کے بیشتر حصوں میں ہریجن اسی وجہ سے کانگریس کے ساتھ روایتی طور پر جڑے ہوں گے جس سے پارٹی کو آزادی کے بعد بھی کافی مدد ملی۔ گاندھی کی دوسری عوامی تحریکوں کی طرح ہی اس مہم میں بھی توسیع کو کنٹرول (ضبط) سے مشروط رکھا گیا اور گاندھی نے اس مہم کو محدود نوعیت کی سماجی اصلاحات (کنوئیں، سڑکوں اور خاص طور پر مندروں کے دروازے ہریجنوں کے لیے کھولنے اور انسانی نوعیت کے کام) تک ہی محدود رکھا، اور اس میں کسی طرح کے معاشی مطالبے کو شامل نہیں ہونے دیا؛ حالانکہ ہری جنوں کی بیشتر تعداد زرعی مزدوروں پر ہی مشتمل تھی۔ گاندھی نے اس سلسلے میں ذات پات کی بنیاد پر حملہ کرنے سے بھی انکار کر دیا۔ انھوں نے مخلوط خورد و نوش اور مخلوط شادیوں کے بارے میں احتیاط سے کام لینے کا بھی مشورہ دیا اور اصل ورن آشرم نظام کا دفاع بھی کیا جس کا نتیجہ یہ ہوا تھا کہ امبیڈکر نے ہفت روزہ ہری جن کو اپنا پیغام دینے سے اس بنیاد پر انکار کر دیا تھا کہ "ذات باہر لوگوں کی نجات ذات پات کے نظام کے خاتمے کے سوا کسی دوسری چیز سے ممکن نہیں"۔ (حوالہ Tendulkar, Vo. III p. 236)۔ کسان تحریکوں کی طرح ہی اس ہریجن مہم کا مقصد بھی شاید یہ تھا کہ نچلی سطحوں سے اٹھنے والے انتہاپسندانہ دباؤ پر اپنا غلبہ قائم کر لیا جائے۔ تامل ناڈو میں ای۔ وی۔ راماسوامی نائیکر کی "عزت نفس تحریک" تیسری دہائی کے اوائل میں بڑی تیزی سے زور پکڑتی گئی تھی جس میں براہمن مخالف رویے کو فروغ دیا گیا تھا جو کہ حکومت کے وفاداروں اور اعلا طبقے کے لوگوں کی جسٹس پارٹی سے بالکل مختلف بات تھی۔ نائیکر نے 1932 میں سوویت یونین کے سفر کے بعد کوئمبٹور میں 'اسٹالن ہال' تعمیر کرایا تھا اور اپنے جریدے "کوڑی اراسو" میں بزرگ کمیونسٹ سنگراویلو چیٹیار کی الحادی اور اشتراکی تحریروں کو شائع کیا تھا۔ اگرچہ نائیکر کا "سوشلزم" "ایک عارضی معاملہ" ثابت ہوا تھا، عزت نفس تحریک کے کچھ کارکن (مثلاً پی۔ جیوانندن) بعد میں کمیونسٹ لیڈر بنے۔ گاندھی نے کیرالہ میں بھی مذہب مخالف موڑ کا توڑ کیا کیونکہ یہاں ایزہاوا ذات کے لوگوں کی تنظیم "ایس این ڈی پی۔ یوگم" پر 1930 میں گاندھیائی لیڈر ٹی۔ کے مادھون کے انتقال کے بعد سی۔ کیسون کے ایمن جیسے انتہاپسندوں نے قبضہ کر لیا تھا جو کہ مندروں میں داخلے کو ایک بہت ہی کم اہم معاملہ سمجھتے تھے، انتہاپسندی کی حد تک مذہب مخالف تھے اور لوگوں کو کمیونسٹ بن جانے کی تلقین کرتے تھے جب کہ خود کبھی مارکسٹ نہیں بنے۔ بہر حال بہ حیثیت مجموعی، ہندوستانی کمیونسٹ مختلف ذاتوں اور طبقوں کے درمیان پیچیدہ تعلقات کی نوعیت پر خاطر خواہ توجہ دینے میں ناکام رہے اور جب گاندھی نے کانگریس سوشلسٹ پارٹی کے پروگرام کے مسودے میں غلطی سے چھوت چھات کا ذکر نہ کرنے پر 2/ اگست 1934 کو نریندر دیو سے سخت باز پرس کی تھی تو اس کی ایک معقول وجہ تھی (Tendulkar. Vol. III pp. 344.)۔

کونسلی سیاست کی طرف مراجعت

جہاں برلا نے ہریجن مہم میں مالی طور پر حصہ لیا اور چھوت چھات مخالف لیگ کے جلسے کی صدارت کے لیے بھی رضامند ہو گئے تھے وہیں دوسرے تمام تاجر گروپوں کی دلچسپی عام طور پر، اس بات میں تھی کہ کانگریس مقننہ میں پھر واپس آ جائے تاکہ ایک موثر دباؤ گروپ کی حیثیت میں ان کے لیے فضا ہموار کر سکے۔ واضح رہے کہ اس وقت تک سول نافرمانی تحریک مکمل طور پر ناکام ہو چکی تھی۔ صوبوں میں مکمل طور پر جواب دہ حکومت کے امکان سے قانون ساز اداروں کے تئیں دلچسپی اور بھی بڑھ گئی تھی اور اس کا احساس کانگریس کے لیڈروں کو بھی تھا۔ سوتنترپارٹی میں پھر سے جان ڈال کر انتخابی سیاست کی طرف مراجعت کا منصوبہ ستیہ مورتی اکتوبر 1931 میں ہی پیش کر چکے تھے جسے اپریل 1934 میں ولبھ بھائی ڈیسائی، انصاری اور بی سی رائے نے ہاتھوں ہاتھ لیا تھا۔ میک ڈونالڈ کے فرقہ وارانہ ایوارڈ کے معاملے پر ہندو فرقہ پرستوں کے مالویہ۔ اینی گروپ کے الگ ہو جانے پر معاملات کسی قدر پیچیدہ ہو گئے تھے لیکن روایتی سیاست کی طرف واپسی کا رجحان بالکل واضح تھا۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ گاندھی نے برلا کے نام اپنے اپریل 1934 کے ایک مکتوب میں یہ مانا تھا کہ "کانگریس کے اندر ہمیشہ ایک ایسی پارٹی موجود رہے گی جو کونسل میں داخلے کی حامی ہے، کانگریس کی باگ ڈور اسی گروپ کے ہاتھ میں رہنی چاہیے" (In the Shadow of the Mahatma p. 138)۔ 1934 میں تامل ناڈو میں جو لوگ کونسل میں داخلے کے حامی تھے ان میں راج گوپال آچاری بھی شامل تھے جو کہ دوسری دہائی کے تبدیلی مخالف گروپ کے سرخیل تھے ۔ پرانے سوراجی لیڈر ستیہ مورتی بھی کونسل میں داخلے کے حامی تھے۔ تیسری دہائی کے وسط میں قدامت پرست گاندھیائی تعمیری ورکرز اور کونسل میں داخلے کے حامی ایک دوسرے کے قریب آتے گئے تھے اور کمیونسٹوں کے بڑھتے ہوئے چیلنج کے خلاف ایک متحدہ فرنٹ کی شکل اختیار کرتے گئے تھے۔ اس بات کے بھی شواہد موجود ہیں کہ کانگریس کو کمیونسٹ انداز فکر سے دور کرنے میں تجارتی طبقے کی صلاح اور دباؤ نے بہت اہم رول ادا کیا تھا۔ برلا نے 12/اپریل 1934 کو ٹھاکر داس کو صلاح دیتے ہوئے لکھا تھا کہ "میں یہ چاہوں گا کہ آپ بھولا بھائی (ڈیسائی) سے برابر رابطہ قائم رکھیں "اور یہ کہ "اگر سوراج پارٹی کامیاب ہو جاتی ہے تو اگلے الیکشن کے لیے وہ فنڈ اکٹھا کریں گے۔ میرا مشورہ یہ ہے کہ یہ اطمینان کیے بغیر کہ صحیح لوگ بھیجے جا رہے ہیں، بمبئی سے کوئی چندہ نہیں ملنا چاہیے"۔ اور پھر 3/اگست 1934 کو یہ کہ "ولبھ بھائی۔ راجہ جی۔ راجندر بابو سب کے سب سوشلزم اور کمیونزم کا مقابلہ کر رہے ہیں۔ اس لیے یہ ضروری ہے کہ ہم میں سے وہ کچھ لوگ جو صحت مند سرمایہ داری کی نمائندگی کرتے ہیں انھیں گاندھی جی کی ممکن حد تک مدد کرنی چاہیے اور ایک مشترکہ مقصد

کے ساتھ کام کرنا چاہئے۔(حوالہ Thakudas Papess F. N. 126-42)۔

اشتراکی متبادل

یہ اشتراکی متبادل، جس سے اس طرح کے لوگوں کے کان کھڑے ہو گئے تھے، دراصل سول نافرمانی کے بطن سے ہی پیدا ہوا تھا، کیونکہ اُس تحریک نے لوگوں میں اس طرح کی امیدیں جگادی تھیں جن کو پورا نہیں کیا جاسکتا تھا۔ اس سلسلے میں عالمی سطح پر رونما ہونے والے حالات وواقعات نے بھی اہم رول ادا کیا۔ جہاں ایک طرف بیش پیداوار (Over Production) کے بحران سے عالمی سرمایہ داری بری طرح متاثر ہو چکی تھی، اور اس نازی ازم کو جنم دے رہی تھی جس سے ساری انسانی اور جمہوری اقدار کی نفی ہوتی تھی، وہیں ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سوویت یونین اپنے پانچ سالہ منصوبوں پر عمل پیرا رہے گا؛ کیونکہ اس نے اپنی اس تعمیر کے سلسلے کو جاری رکھا تھا جسے مارکسزم کے دو شدید قسم کے نقاد جلد ہی "نئی تہذیب" کا نام دینے پر مجبور ہو گئے تھے۔ اسٹالن کے بعض سخت اقدامات یا نازیوں کے ساتھ سوویت روس کے معاہدے کے باوجود بھی اس کی ساکھ پر کوئی دھبہ نہیں آیا تھا۔

مئی 1933 میں جب گاندھی نے پہلی بار سول نافرمانی کو معطل کرنے کا اعلان کیا تو سبھاش بوس اور وٹھل بھائی پٹیل نے یوروپ سے بیان جاری کر کے ان کی قیادت کو تنقید کا نشانہ بنایا۔ اس سے بھی زیادہ اہم بات یہ تھی کہ جواہر لال نہرو نے جیل میں قیام کے دوران اپنی انتہا پسندی کو دانشوری سے ہم آہنگ کر دیا تھا۔ اپنی بیٹی کے نام ان کے خطوط سے، جو بعد (1934) میں Glimpses of world History کے نام سے کتابی شکل میں شائع ہوئے اور جیل ہی میں 1933-34 کے دوران لکھی ہوئی خود نوشت سے مارکسی سوشلسٹ نظریات کے تئیں نہرو کی دلچسپی اور عہد بستگی کا صاف اندازہ ہو جاتا ہے۔ جواہر لال نہرو جب جولائی 1933 اور فروری 1934 کی درمیانی مدت میں تھوڑے سے عرصہ کے لیے جیل سے باہر تھے تو انھوں نے اپنے مراسلات اور مضامین پر مشتمل کتاب White India کے ذریعے گاندھی کے ساتھ اپنے نظریاتی اختلافات کی وضاحت کی تھی اور قومی مقاصد کو انقلاب پسندانہ سماجی اور معاشی پروگراموں سے ہم آہنگ کرنے کی ضرورت پر بار بار زور دیا تھا۔ اور ہندو فرقہ پرستی کو سخت تنقید کا نشانہ بنایا تھا(ہندو مہا سبھا نے اکتوبر 1933 کے اجمیر اجلاس میں ہندوؤں کے لیے Self Defence کا نعرہ لگانے کے ساتھ ساتھ "بطور ایک طبقے کے زمین داروں اور سرمایہ داروں کے خاتمے کی کسی بھی تحریک" کی مذمت بھی کی تھی)۔ ہمیشہ کی ہی طرح اس مرتبہ بھی نہرو گاندھی سے مکمل ترک تعلق نہیں کر سکے تھے اور ان کے سامنے "ایسی کوئی وجہ نہیں تھی کہ وہ کانگریس سے باہر آجاتے اور سماجی رجعت

پسندوں کے لیے میدان کھلا چھوڑ دیتے۔ "انھوں نے اس وقت ایک سوشلسٹ پارٹی شروع کرنے کی تحریک کو بھی پسند نہیں کیا۔ گاندھی کو خاص طور پر کوئی خدشہ نہیں تھا۔ "ان کے کمیونسٹ نظریات سے کسی کو بھی ...... خوف زدہ ہونے کی ضرورت نہیں ہے" (انٹرویو، بمبئی کرانیکل، 18/ستمبر 1933)، لیکن بہت سے انگریز افسر نہرو کو "کمیونزم کا کھیا پجاری" سمجھتے تھے۔ اس لیے ایک ایسے وقت میں جب کہ عملاً تمام لیڈروں کو رہا کیا جا رہا تھا، نہرو کو پھر جیل میں ڈالدیا گیا تھا۔

ایک ایسا گروپ بنانے کی بات، جو کہ کانگریس کے اندر کام کرے اور اسے اشتراکیت کی طرف لے جائے، 1933 میں ناسک جیل میں ایک میٹنگ میں سوچی گئی تھی جس میں جے۔ پرکاش نارائن، اچیوت پٹوردھن، یوسف مہر علی، اشوک مہتہ اور مینو مسانی نے حصہ لیا تھا۔ یوپی کانگریس کے لیڈر سمپورنانند نے اپریل 1934 میں ہندوستان کے لیے ایک عبوری سوشلسٹ پروگرام تیار کیا تھا اور اگلے سال پٹنہ میں نریندر دیو کی صدارت میں منعقدہ ایک کانفرنس میں "کانگریس سوشلسٹ پارٹی" شروع کی گئی تھی۔ اس سلسلے میں ابہامات شروع سے ہی موجود تھے کیونکہ کانگریس سوشلسٹ پارٹی کانگریس کے ساتھ ہی رہنا چاہتی تھی مگر کانگریس کی قیادت کے سخت خلاف تھی اور اس لیے غیر کانگریسی اشتراکی گروپوں کے ساتھ تعاون کے لیے تیار تھی۔ اس پارٹی کے بانیوں کے تصورات اور نظریات باہم گڈمڈ اور غیر واضح تھے، ان کے یہاں انتہا پسندانہ قوم پرستی بھی تھی اور "مارکسی سائنسی سوشلزم" کے لیے زبردست تائید بھی تھی اور جسے پٹنہ کانفرنس میں نریندر دیو نے "محض سماجی اصلاح پسندی" سے بالکل مختلف بتایا تھا۔ سرمایہ داری کی طرف جھکاؤ رکھنے والے کانگریسی لیڈروں نے اس نئے رجحان کو سخت ناپسند کیا، اور سیتارمیہ نے تو پٹیل کے نام اپنے 21 ستمبر 1934 کے مکتوب میں اس پارٹی کے بانیوں کے لیے لفظ "فضلہ" استعمال کیا تھا اور ورکنگ کمیٹی نے جون 1934 میں "نجی املاک کی ضبطی اور طبقاتی جنگ کی ضرورت کی بابت ناشائستہ طرز گفتگو" کی مذمت کی تھی کیونکہ نجی املاک کی ضبطی اور طبقاتی جنگ کی ضرورت عدم تشدد کے منافی تھی۔ نہرو کو ان لوگوں سے ہمدردی تو تھی مگر وہ کانگریس سوشلسٹ پارٹی میں کبھی باقاعدہ شامل نہیں ہوئے۔ اور دلچسپ بات تو یہ ہے کہ گاندھی نے نریندر دیو کے نام اپنے مذکور مراسلے (2/اگست 1934) میں یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ جواہر لال "جنھوں نے ہمیں سوشلزم کا منتر دیا ہے، اگر جیل سے باہر ہوتے تو رفتہ رفتہ وہ بھی تیز رفتاری دکھاتے"۔ اس مکتوب میں یہ پیش گوئی بھی کی گئی کہ "جب میں اور دوسرے عمر رسیدہ مرد اور عورتیں سبکدوش ہو جائیں گے تو کانگریس کا کانٹوں بھرا تاج فطری طور پر نہرو کے ہی سر پر رکھا جائے گا۔" گاندھی نے اسی طرح کی بات جلد ہی ولبھ بھائی پٹیل کے سلسلے میں بھی کہی تھی (Tendulkar, Vol III. P. 386)۔

یوپی جیسے صوبوں میں کانگریس سوشلسٹ پارٹی کی پیش قدمی محض ایک سراب تھی۔ اسے جو

زیادہ تر تائید حاصل ہوئی وہ موقع پرستانہ تھی اور وہ لوگ پیش پیش تھے جو کہ کانگریس کے بجائے مختلف سطح کے لیڈروں کے ساتھ آویزش میں ملوث تھے اور اس کے بیشتر بانی لیڈر اپنے اشتراکی اور سماجی نظریات پر زیادہ عرصہ تک ثابت قدم بھی نہیں رہ سکے تھے۔ بہر حال اس میں شک نہیں کہ سی ایس پی کے پروپیگنڈے نے کانگریسیوں کو انقلابی زرعی اصلاح، صنعتی مزدوروں کے مسائل، دیسی ریاستوں کے مستقبل، اور عوامی سرگرمی وجدوجہد کے لیئے غیر گاندھیائی طریقہ کار جیسے امور کے بارے میں سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔

سی ایس پی کے کارکن کسان سبھا تحریک کے ساتھ خاص طور پر بہار اور آندھرا میں قریبی رابطے قائم کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔1933-34 کے دوران ساحلی آندھرا میں متعدد کسان مارچ منظم کیے گئے؛1933 میں ایلور زمینداری رعیت کانفرنس نے زمینداری کے خاتمے کا مطالبہ کیا اور کانگریس سوشلسٹ پارٹی کے لیڈر این۔ جی رنگا نے کسانوں کو تربیت دینے کے مقصد سے نڈو برولو میں ایک انڈین پیزنٹ انسٹی ٹیوٹ قائم کیا۔ بہار میں کانگریسی لیڈروں کے ایک حلقے نے کسان سبھا کو پھر سے زندہ کرنے کے لیے 1933 میں سوامی سہج آنند کی حوصلہ افزائی کی۔ واضح رہے کہ اس کسان سبھا کو سول نافرمانی کے دوران حکومت کے وفادار زمینداروں کے غلبے والی یونائیٹڈ پارٹی کے مقابلے پر غیر فعال ہو جانے دیا گیا تھا تاکہ درخت لگانے کے حق، کنواں کھودنے کے حق اور سلامی کی ادائیگی کے بعد جوت داری کو منتقل کرنے کے حق جیسے چھوٹے موٹے معاملات میں رعایت کے ذریعے کسانوں کو الیکشن میں اپنا ہم نوا بنایا جا سکے۔ یونائیٹڈ پارٹی نے لگان کی معافی، زراعت (نجی ملکیت) اور بہ کاشت (وہ زمین جس کے موروثی لگان داروں کی جگہ پر مندے کے زمانے میں مختصر مدتی پٹے داری قائم کی جارہی تھی)، جیسے اہم مسائل پر کوئی توجہ نہیں دی۔ سہج آنند اس طرح کے امور کے سلسلے میں وسطی اور شمالی بہار کے کسانوں کے ایک بڑے حلقے کو متحرک کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے، اور ان کی کسان سبھا کے ممبروں کی تعداد بڑھ کر 1935 میں 80,000 تک پہونچ گئی تھی۔ وہ زمینداری کے خاتمے یا کسی طرح کی طبقاتی جدوجہد کے خلاف تھے لیکن کانگریس سوشلسٹ پارٹی کے مسلسل دباؤ کی وجہ سے سہج آنند کو یہ انتہا پسندانہ پروگرام تسلیم کرنا پڑا تھا اور اس طرح بہار کی صوبائی کسان سبھا نے بھی نومبر 1935 میں حاجی پور اجلاس میں اس پروگرام کی توثیق کی تھی۔ یہاں یہ ذکر بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ کانگریس سوشلسٹ پارٹی نے 1930 کی دہائی کے وسط اور آخر میں ایک ایسے پل کے طور پر کیا جس کی ایک طرف انتہا پسند قسم کے قوم پرست کیمونسٹ پارٹی کے باقاعدہ مارکسزم کی طرف گامزن رہے۔ بعد میں این۔ جی رنگا کو یہ زبردست شکایت پیدا ہو گئی تھی کہ انھوں نے اپنے نڈوبرولو انسٹی ٹیوٹ میں جن نوجوانوں کو تربیت دی ان میں سے ایک تہائی کو کیمونسٹ پارٹی آف انڈیا نے اپنے کنٹرول میں کر

لیا تھا۔ اسی طرح آندھرا میں بھی کانگریس سوشلسٹ پارٹی کے اصل 90 فیصد ممبر بھی کیمونسٹ پارٹی کا حصہ بن گئے تھے۔ (حوالہ :Revolutionary Peasants, pp 75)۔ کانگریس سوشلسٹ پارٹی کو سزلیافتہ کیمونسٹوں نے ایک قانونی محاذ یا آڑ کے طور پر استعمال کیا، کیونکہ کیمونسٹ پارٹی آف انڈیا 1934 سے 1942 تک ایک خلاف قانون پارٹی رہی تھی۔

1933 اور 1934 آخر کار محنت کش طبقے کے احیاء کے سال ثابت ہوئے اور ان دونوں برسوں میں کیمونسٹ سرگرمیوں کا کافی زور رہا۔ جہاں 1920 سے 1932 کی درمیانی مدت میں سب سے کم ہڑتالیں ہوئی تھیں، 1933 میں ہڑتالوں کی تعداد میں زبردست اضافہ ہونا شروع ہو گیا تھا۔

برطانیہ کے جوٹ تاجروں اور ہندوستان کے کپاس تاجروں نے کساد بازاری (مندے) کا بار ورکروں پر ڈالنے کے لیے اجرتوں میں کٹوتی، ملازمین کی تعداد میں تخفیف (چھنٹائی) اور دوسرے طریقے اپنانے کی کوشش کی۔ مثال کے طور پر بمبئی کی کپڑا صنعت کی روزانہ کمائی کے اوسط میں جولائی

سال	ہڑتالوں کی تعداد	ملوث ورکروں کی تعداد	کام دنوں کا نقصان
1932	118	128,099	1,922,437
1933	146	164,938	2,168,961
1934	159	220,808	4,775,599

(کے۔ ریوری: انڈین ٹریڈ یونین موومنٹ (1972) صفحہ 5-183) 1926 کے مقابلے میں دسمبر 1933 میں 16.94 فی صد کے بقدر کمی آ گئی تھی۔ باوجودیکہ اشیاء کی قیمتوں میں گراوٹ کی وجہ سے اجرتوں میں کمی کا اثر کسی قدر کم ہو گیا تھا مگر 1934 میں حقیقی اجرتوں میں بھی کمی شروع ہو گئی تھی (ریوری، صفحہ 179، باسچی، صفحہ 122)۔ میرٹھ کی گرفتاریوں اور 1929 نیز پھر 1931 میں ہونے والی بار بار کی تقسیم کی وجہ سے ٹریڈ یونین کی تحریک کو سخت دھکا لگا تھا اور اعتدال پسند نیشنل ٹریڈ یونین فیڈریشن اور کیمونسٹ ریڈ ٹریڈ یونین کانگریس AITUC کی حریف بن گئی تھیں۔ اگرچہ جیل میں بند لیڈروں کی جگہ بہت جلد ہی بی ٹی رانا ڈیوے اور ایف وی دیش پانڈے جیسے نوعمر کیمونسٹوں نے بمبئی میں اور عبدالحلیم، سوم ناتھ لاہری اور رانین سین نے کلکتہ میں سنبھال لی تھی، لیکن 1930 کی دہائی کے اوائل کی از حد اشتراکیت کے نتیجے میں ایسے بہت سے گروپ پیدا ہو گئے تھے جو ایک دوسرے کے کٹر مخالف تھے؛ بلکہ اس کے نتیجے میں یہ لوگ قومی تحریک کے عام دھارے سے بھی الگ پڑ گئے تھے۔ Comintern (بین الاقوامی کیمونسٹ تنظیم) سے ناراض ایم۔ این رائے اور سومیندر ناتھ ٹیگور نے اپنا الگ گروپ قائم کرنے کی کوشش کی جس سے معاملہ مزید پیچیدہ ہو گیا اور رائے کے حامیوں کو وی بی کارنک، منی بین کارا اور رجنی مکھرجی جیسے لیڈروں کے ذریعے ٹریڈ یونین کی سرگرمیوں میں قابل لحاظ کامیابی حاصل ہو گئی۔ کلکتہ میں نہار بند دوتا نے جو

کہ ایک بیرسٹر تھے اور بعد میں ایک بااثر ٹریڈ یونین لیڈر کی حیثیت حاصل کر گئے تھے، کلکتہ میں لیبر پارٹی کی داغ بیل ڈالی۔

1934 کے بعد سے محنت کش طبقے میں پھر سے شدت پسندی نیز کیونسٹوں اور ٹریڈ یونین لیڈروں میں پھر سے اتحاد پیدا ہونے کے آثار واضح ہونے لگے تھے۔ کیونسٹوں اور رائے کے پیروکاروں نے 1934 میں کپڑا ملوں میں ایک عام ہڑتال کے لیے کوشش کی اور شولاپور (فروری ۔ مئی)، ناگ پور (مئی جولائی)، اور سب سے بڑھ کر بمبئی میں اپریل سے زبردست ہڑتال شروع ہوئی۔ سرکاری حلقوں میں محنت کشوں اور کیونسٹوں کی اس شدت پسندی سے تشویش پیدا ہو گئی تھی جس کا پتہ اس بات سے چلتا ہے کہ 1934 میں اس سلسلے میں سرکاری کاغذات کا جیسے سیلاب سے آگیا تھا اور 1908 کے ایک پرانے ایکٹ کے تحت سی پی آئی پر باقاعدہ پابندی لگادی گئی تھی۔ بہر حال 1929 کے برخلاف اس مرتبہ جابرانہ کاروائیاں کیونسٹ تحریک کو دبانے میں ناکام رہیں بلکہ 1930 کی دہائی کے وسط میں یہ تحریک متحدہ محاذ کی حکمت عملی کے ذریعے اور بھی پیش قدی کرتی گئی اور کانگریس نیز کیونسٹ پارٹی کے اندر لوگ ایک دوسرے سے رابطے قائم کرتے گئے۔ بہر حال پارٹی کے اندازِ کار میں نمایاں تبدیلی کا تعلق متحدہ محاذ کے اس امکان سے تھا جس کا خاکہ 1935 میں Comintern کی ساتویں کانگریس میں فاشزم کے بڑھتے ہوئے خطرے کے پس منظر میں پیش کیا گیا تھا۔ بہر حال یہاں اس نکتے پر زور دینے کی ضرورت ہے کہ اس سلسلے میں کچھ داخلی دباؤ بھی تھے، کیونکہ سول نافرمانی کی تحریک کے بعد کیونسٹ تحریک میں وہ گاندھیائی قوم پرست اور انقلاب پسند بھی داخل ہو گئے تھے جن کے روابط بہت وسیع تھے۔ مثال کے طور پر کیرالہ میں پی کرشنا پلائی، ای۔ ایم۔ ایس نمبودری پاد اور اے کے گوپالن جیسے لیڈر 1930 کی دہائی کے وسط میں کانگریس کو پھر سے استوار کرنے کی کوشش کر رہے ہیں تھے جو کہ حکومت کی جابرانہ کارروائیوں کی وجہ سے کافی منتشر ہو گئی تھی۔ ان لوگوں نے اس سلسلے میں کانگریس سوشلسٹ پارٹی کی مقامی شاخ کی تشکیل کی اور کیرالہ میں کیونسٹ پارٹی کی بنیاد بھی رکھی اور اس عمل میں ترونندرم کی چھوٹی اور گروہی تنظیم کیونسٹ لیگ کو بھی اپنے اندر جذب کر لیا۔ واضح رہے کہ ترونندرم کیونسٹ لیگ اس علاقے کا پہلا مارکسٹ حلقہ اثر تھا۔ اسی طرح بنگال میں بھی اضلاع تک کیونزم کی حقیقی توسیع اس طرح عمل میں آئی کہ 1930 کی دہائی کے وسط میں شدید نظریاتی بحث و مباحثے اور ذاتی قربانیوں کے نتیجے میں نظر بندی کیمپوں اور انڈمان میں رکھے گئے دہشت پسندوں نے کیونزم قبول کر لیا تھا۔ بھوانی سین اور ہرے کرشنا کونار جیسے بنگالی کیونسٹ لیڈر اسی دہشت پسندی کی دین تھے۔ اس طرح کیونسٹ پارٹی کی بنگال شاخ سب سے باوقار انقلابی گروپ، یعنی چٹا گانگ اسلحہ خانے پر حملے میں شریک بہادروں کو بھرتی کرنے میں کامیاب ہو گئی تھی۔

اس طرح ہم یہ دیکھتے ہیں کہ قومی تحریک کے اندر دائیں گروپ اور بائیں گروپ کے درمیان باقاعدہ ٹکراؤ کے سارے حالات پیدا ہو چکے تھے اور خاص طور پر 1935 میں اور اس کے بعد انگریزوں کے ذریعے آئینی ڈھانچے کے تھوپے جانے کے نتیجے میں اس ٹکراؤ کے مواقع اور اسباب پیدا ہوتے چلے گئے تھے۔

1935-37: آئین اور کانگریس

1935 کا ایکٹ

آٹھ سال قبل سائمن کمیشن کے تقرر کے ساتھ ہی جابرانہ کارروائیوں کا جو طویل سلسلہ شروع ہوا تھا وہ آخر کار اگست 1935 میں گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کے ساتھ ختم ہو گیا۔ آئین سازی کے عمل میں حقیقی ہندوستانی شرکت 1932 سے برائے نام ہی رہی تھی۔ نومبر، دسمبر 1932 میں گول میز کانفرنس کا تیسرا اور آخری اور ہر لحاظ سے غیر اہم اجلاس منعقد ہوا۔ اس اجلاس میں مندوبین کی تعداد (1931 میں 112 کے مقابلے میں) بھی بہت کم محض 46 تھی۔ اس غیر اہم اور محض رسمی اجلاس کے بعد برطانوی حکومت نے 1933 میں ایک وہائٹ پیپر جاری کیا اور ممبران پارلیمنٹ پر مشتمل ایک جوائنٹ سلیکٹ کمیٹی تشکیل کی جسے محض ہندوستانیوں سے صلاح و مشورے کا ہی اختیار دیا گیا تھا۔ بہر حال برطانوی پارلیمنٹ کے اندر ہی زوردار بحث کے بعد ہی حتمی ایکٹ سامنے آیا۔ سول نافرمانی کے دوران دباؤ کی وجہ سے 31-1930 میں خود انگریزوں کے بقول جن محدود نوعیت کی رعایتوں کی پیش کش کی گئی ان میں اس عمل کے نتیجے میں تخفیف کی گئی جو کہ کوئی غیر فطری بات بھی نہیں تھی۔ چنانچہ ہندوستانی رائے عامہ کے تمام حلقوں (لبرل لیڈروں، جناح نیز کانگریس) کی طرف سے اس ایکٹ کی نکتہ چینی کی گئی کیونکہ اس ایکٹ میں 1919 کے مقابلے میں کوئی پیش رفت ہی نہیں کی گئی تھی۔ مثال کے طور پر لنکا شائر کی تائید نیز چرچل کی قیادت میں ٹوریوں کے دباؤ کی وجہ سے وفاقی سطح پر راست الیکشن کی تجویز کو بالواسطہ الیکشن کی تجویز سے تبدیل کر دیا گیا تھا، اور سرکاری "تمیزی اختیارات" اور "تحفظات" کا دائرہ مزید وسیع اور سخت کر دیا گیا تھا۔

اگر کوئی اہم پیش رفت کی بھی گئی تھی تو وہ صوبوں سے ہی تعلق رکھتی تھی، جہاں دو عملی حکومت کی جگہ پر جواب دہ حکومت کی بات مانی گئی تھی اور انتخاب کنندگان کی تعداد 65 لاکھ سے بڑھا کر 3 کروڑ کر دی گئی تھی۔ بہر حال قانون ساز اداروں کا اجلاس طلب کرنے، بلوں کو منظوری دینے اور مخصوص نوعیت کے (خصوصاً قبائلی) انتظام جیسے امور کے سلسلے میں گورنروں نے تمیزی

اختیارات اپنے ہی پاس رکھے تھے اور ان امور کے سلسلے میں وزراء کو مشورہ دینے کا بھی مجاز نہیں بنایا گیا تھا۔ گورنروں کو انفرادی صواب دید کا بھی اختیار دیا گیا تھا، یعنی وزراء مشورہ تو دے سکتے تھے مگر ان کے مشورے کو مسترد کیا جا سکتا تھا۔ خاص طور پر اقلیتوں کے حقوق، سول ملازمین کے لیے مخصوص مراعات اور برطانوی کاروباری مفادات کے خلاف کسی طرح کے امتیاز کی روک تھام کے امور کے سلسلے میں وزراء کی رائے کو مسترد کیا جا سکتا تھا۔ اس کے علاوہ گورنر کو یہ اختیار بھی دیا گیا کہ وہ اس 1935 کے ایکٹ کی بدنام زمانہ شق نمبر 93 کے تحت کسی بھی صوبے کے انتظام کو غیر معین مدت تک کے لیے اپنے ہاتھ میں لے سکتا تھا۔ کم سے کم پچاس فی صد راجگان (ریاستی حکمرانوں) کی رضامندی سے مشروط مجوزہ وفاقی ڈھانچے کے ذریعے اب تک کے مضبوط مرکز کے انتظامیہ میں دو عملی حکومت کا عنصر شامل کر دیا گیا تھا۔ جو امور منتخب وزراء کو منتقل کیے گئے تھے وہ مختلف قسم کے تحفظات کے ذریعے کافی حد تک محدود کر دیے گئے تھے اور خارجہ امور اور دفاع کو مکمل طور پر وائسرائے کے کنٹرول میں رکھا گیا تھا۔ نئے ریزرو بنک آف انڈیا کو پوری احتیاط کے ساتھ اسمبلی کے کنٹرول سے باہر رکھا گیا تھا۔ یہی معاملہ محکمہ ریل کا بھی تھا۔ جب کہ قرض خدمات اور آئی سی ایس افسران کی تنخواہوں کو محفوظ امور میں شامل کیا گیا تھا۔ نیز کرنسی اور شرح تبادلہ کے سلسلے میں کسی بھی قسم کی قانون سازی کے لیے وائسرائے کی پیشگی منظوری ضروری قرار دی گئی تھی۔ یہ صحیح ہے کہ اس ایکٹ کی وجہ سے مالیاتی کنٹرول لندن سے نئی دہلی منتقل ہو گیا تھا، اور یہ ایک ایسا نکتہ ہے جس پر ٹوم لنسن جیسے عصر جدید کے مورخ کافی زور دیتے ہیں، مگر اس سلسلے میں اس نکتے کو نظر انداز کر جاتے ہیں کہ یہ مالیاتی کنٹرول سکریٹری آف اسٹیٹ سے ان وائسرائے کو منتقل کیا گیا تھا جس کا تقرر برطانوی حکومت ہی کرتی تھی۔ دو ایوانی مرکزی مقننہ میں 30 سے 40 فی صد سیٹیں راجگان کے نامزد کردہ ممبروں کے لیے مخصوص کی گئی تھیں۔ (کاؤنسل آف اسٹیٹ کی کل 276 میں سے 104 سیٹیں اور وفاقی اسمبلی میں کل 375 میں سے 125 سیٹیں)۔ جب کہ اس ایکٹ میں میک ڈونالڈ ایوارڈ ختم کر کے مرکز اور صوبوں میں مسلمانوں نیز دوسرے مخصوص رائے دہندگان کو بھی کافی وزن دیا گیا۔ سب سے خطرناک بات یہ تھی کہ اب تک دیسی ریاستوں کے جو تعلقات براہ راست تاج برطانیہ کے ساتھ تھے انھیں تاج کے نمائندے، یعنی وائسرائے کو منتقل کر دیا گیا اور وہ بھی اس طرح کہ اس معاملے پر سارا کنٹرول وزرا کی بجائے سرکاری پولیٹکل ڈپارٹمنٹ کا رکھا گیا اور بیچ میں مقامی ریزیڈنٹ اور پولیٹیکل ایجنٹ کو بھی شامل کر لیا گیا۔ 1935 کے ایکٹ کا وفاقی حصہ کبھی بھی عملی شکل اختیار نہ کر سکا کیونکہ ریاستی حکمرانوں میں بھی سول نافرمانی کی تحریک ختم ہونے پر سرد مہری آ گئی تھی اور اس کی وجہ یہ تھی کہ اب مرکزی حکومت پر کانگریس کا کنٹرول قائم ہو جانے کا خدشہ پوری طرح ٹل گیا تھا اور جیسے ہی یہ احساس پھیلا گیا کہ

وفاق کے ساتھ الحاق کے بدلے میں انگریز اپنی بالادستی میں کسی طرح کی کمی کا کوئی ارادہ نہیں رکھتے تو مسلم لیڈروں کو بھی یہ احساس ہو گیا تھا کہ مجوزہ وفاقی ڈھانچہ اب بھی بہت زیادہ وحدانی ہے جس کی وجہ سے ہندو اکثریت کا غلبہ قائم ہو جانے کا پورا احتمال ہے۔ دوسری طرف کانگریس کے تمام گروپوں نے اس مجوزہ وفاقی ڈھانچے کو شرمناک قرار دیتے ہوئے مسترد کر دیا تھا۔ دوسری طرف انگریز بھی اس طرح کے تعطل سے بہت زیادہ ناخوش نہیں تھے جس کے نتیجے میں مرکز پر مکمل سرکاری کنٹرول کے 1919 کے نظام کو کسی تبدیلی کے بغیر غیر معین مدت تک جاری رہنے دیا گیا تھا۔ آخر میں اس نکتے پر زور دینے کی ضرورت ہے کہ ارون کی 1929 کی پیش کش کے چھ سال بعد 1935 کے ایکٹ میں ہندوستان کو مملکت محروسہ کا درجہ دینے کے بارے میں مکمل سکوت اختیار کیا گیا تھا۔ جوائنٹ پارلیمنٹری کمیٹی کے چیئرمین اور 1936 سے وائسرائے لنلتھگو (Linlithgow) نے شاید اس ایکٹ کے بارے میں بالکل درست اندازہ پیش کیا تھا۔ لنلتھگو کا کہنا تھا کہ یہ قانون اس لیے بنایا گیا ہے کہ "ہم یہ سمجھتے تھے کہ...... ہندوستان میں انگریزوں کے اثر کو برقرار رکھنے کا...... یہی بہترین طریقہ تھا"۔

1935 میں اور خاص طور پر 1936 میں ہندوستانی سیاست کی ایک بالکل نئی وضع سامنے آئی، جس کی بار بار تکرار ہوتی رہی، حصول آزادی سے پہلے بھی اور بعد بھی! ظاہراً تو یہی آثار تھے کہ ملکی سیاست اشتراکیت کی طرف جا رہی ہے: 1934 میں کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا پر پابندی کے ماسوا، سوشلسٹ اور کمیونسٹ سرگرمیوں میں تیزی آتی جا رہی تھی، مزدوروں اور کسانوں کی متعدد تحریکیں چل رہی تھیں، کمیونسٹوں کی قیادت میں متعدد کل ہند قسم کی تنظیمیں قائم ہو رہی تھیں اور لکھنؤ نیز فیض پور میں کانگریس کے اجلاس میں نہرو کے صدارتی خطبے (اپریل اور دسمبر 1936) سے بھی اس طرح کا تاثر پیدا ہوا تھا۔ ان صدارتی خطبوں میں کمیونسٹوں کی امنگوں اور پروگراموں کو شامل کیا گیا تھا۔ لیکن آخر میں رجعت پسندوں نے بڑی چابکدستی سے کام لیا اور اس طوفان نہ آب کو اپنے کاز کے لیے استعمال کرنے کی کوشش کی۔ اس کا نتیجہ اس طرح سامنے آیا کہ 1937 کے موسم گرما تک کانگریسی وزارتیں قائم ہونے لگی تھیں اور مقصد تھا اس آئین کو عملی جامہ پہنانا جس کی ہر سیاست داں برسوں سے مذمت کرتا آ رہا تھا۔

محنت کشوں اور کسانوں کی تحریک

لیبر کے محاذ پر تقریباً 1934 سے کساد بازاری (مندی) کا سلسلہ ختم ہونا شروع ہو گیا تھا جس کے نتیجے میں ٹریڈ یونین کی جدوجہد کے لیے ماحول سازگار ہو گیا تھا۔ روزگار کے اعداد و شمار میں اضافہ (1935 میں جوٹ ملوں میں 14247 نئے ورکر رکھے گئے تھے) ہو رہا تھا، مگر اب بھی

بے چینی پہلے سے کہیں زیادہ تھی، کیونکہ ملکی اور غیر ملکی (گورے) سرمایہ داروں نے؛ یعنی دونوں نے ہی سابقہ برسوں کے دوران اجرتوں میں کی گئی کٹوتی کو برقرار رکھنے کی کوشش کی۔ اس سلسلے میں جو ہڑتالیں ہوئی تھیں ان میں کلکتہ کے کیسورام کاٹن ملز اور احمد آباد کے کپڑا ملوں کی ہڑتالیں (1935)، بنگال ناگ پور ریلوے کی ہڑتال (دسمبر 1936، فروری 1937) نیز کلکتہ کے جوٹ ملوں اور کان پور کے کپڑا ملوں میں متعدد لیبر تنازعے (1936) قابل ذکر ہیں۔ 1936 کے ان لیبر تنازعوں کا سلسلہ یہاں تک پہونچا کہ ان دونوں صنعتی مرکزوں میں اگلے سال زبردست عام ہڑتال ہوئی۔ اس اثناء میں 1929 اور 1931 میں لیبر تحریک میں پڑنے والی پھوٹ پر بھی قابو پالیا گیا تھا۔ اپریل 1935 میں کیونسٹوں کی تنظیم ریڈ ٹریڈ یونین کانفرنس پھر سے آل انڈیا ٹریڈ یونین کانگریس میں شامل ہو گئی۔ اس وقت A1TUC پر ایم۔ این رائے کے پیرو کاروں اور چند سوشلسٹوں کا کنٹرول تھا۔ اعتدال پسند تنظیم "نیشنل ٹریڈ یونین فیڈریشن کے ساتھ مل کر مشترکہ اقدام کے مقصد سے چند ماہ بعد جوائنٹ لیبر بورڈ کی تشکیل کی گئی۔ 1936 کے آتے آتے کیونسٹ اپنے نئے جنرل سکریٹری پی۔ سی جوشی کی قیادت مین اس بات کی پرزور وکالت کرنے لگے تھے کہ ایک متحدہ فرنٹ کی حکمت عملی اپنائی جانی چاہیے۔ اس نئے لائحہ عمل کا خاکہ 1935 کے موسم گرما میں Comintern (بین الاقوامی کیونسٹ تنظیم) کے ساتویں اجلاس میں دیمتروف نے پیش کیا تھا جس کی ہندوستان میں عمل آوری کی تفصیل آر۔ پی۔ دت اور بین بریڈلے نے اس مضمون میں پیش کی تھی جو کہ برطانیہ کے کیونسٹ جریدے لیبر منتھلی کے مارچ 1936 کے شمارے میں شائع ہوا تھا۔ اس میں کہا گیا تھا کہ کانگریس کو ایک "سامراج مخالف عوامی محاذ کی شکل دینے کے لیے اس کے اندر رہ کر کام کرنا ہو گیا، ٹریڈ یونینوں اور کسانوں کی تنظیموں کا کانگریس کے ساتھ اجتماعی طریقے پر الحاق کیا جائے، انتخابات انقلابی پروگراموں کی بنیاد پر لڑنے چاہئیں، لیکن کسی طرح کا عہدہ قبول کرنے سے انکار کر دیا جائے اور سب سے بنیادی اور مثبت مطالبہ ایک ایسی دستور ساز اسمبلی کے لیے ہو جس کا انتخاب عام رائے دہی کے ذریعے عمل میں لایا جائے۔ واقعہ یہ ہے کہ نہرو اس طرح کا مطالبہ 1930 میں ہی پیش کر چکے تھے اور دت نیز بریڈلے نے اس مضمون کو ضبط تحریر میں لانے سے ذرا ہی پہلے لوسانے میں نہرو سے ملاقات کی تھی۔ ایک ماہ بعد لکھنؤ اجلاس کے صدارتی خطبے میں اجتماعی الحاق اور دستور ساز اسمبلی کی تشکیل کے مطالبوں کو دوہرایا گیا تھا۔

اشتراکیت کی طرف جھکاؤ رکھنے والے قوم پرستوں، سوشلسٹوں اور کیونسٹوں کے مابین اتحاد و اشتراکیت کے اس جذبے کا اظہار کانگریس کے لکھنؤ اور فیض پور اجلاسوں کے دوران آل انڈیا کسان سبھا کی شکل میں بھی ہوا۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے آندھرا میں تحریک شروع ہوئی جہاں این۔ جی۔ رنگا، جو کہ 34-1933 سے صوبائی رعیت ایسوسی ایشن اور زمین رعیت ایسوسی

ایشن برائے زمینداری لگان داروں کے لیڈر تھے، 1935 سے ایک طرف کسان تحریک کو مدراس پریزیڈنسی کے دوسرے لسانی علاقوں تک وسیع کرنے کی کوشش کر رہے تھے اور دوسری طرف زرعی مزدوروں کو بھی اپنی طرف راغب کرنے کی جد و جہد کر رہے تھے۔ کسانوں اور زرعی مزدوروں کی جنوبی ہند فیڈریشن اپریل 1935 سے شروع ہوئی جس کے جنرل سکریٹری این۔جی۔ رنگا اور جوائنٹ سکریٹری ای۔ ایم۔ ایس نمبودری پاد بنائے گئے تھے۔ اس فیڈریشن نے اپنی اکتوبر 1935 کی کانفرنس میں یہ تجویز رکھی تھی کہ جلد از جلد کسانوں کی ایک کل ہند تنظیم قائم کی جائے۔ اس خیال کو سوشلسٹوں نے جنوری 1936 میں اپنی میرٹھ کانفرنس میں اپنالیا اور اگرچہ بہار نے (جو کہ ابتدائی کسان تحریکوں کا اہم مرکز رہا تھا) شاید اس اتحاد کے بارے میں سرد مہری کا مظاہر کیا تھا۔ لیکن سوامی سہج آنند اپریل 1936 میں لکھنؤ میں منعقد آل انڈیا کسان سبھا کے پہلے اجلاس کی صدارت کے لیے تیار ہو گئے تھے۔ اس سلسلے میں دوسرے نقیب اندولال یاجنک تھے جو کہ گجرات کے ایک گاندھیائی لیڈر تھے اور کسان بلیٹن کے ایڈیٹر بنائے گئے تھے۔ کسان سبھا نے اپنی توجہ زیادہ تر کسانوں کی مشکلات پر ہی مرکوز رکھی اور ایسا کرنا ناگزیر بھی تھا، لیکن اس کے ساتھ ہی ساہوکاروں، زمینداروں، بیوپاریوں اور حکومت سے متعلق چھوٹے اور منجھلے کسانوں کے مسائل کو اولیت دی۔ اگست 1936 کے کسان منشور کے ذریعے زمینداری کے خاتمے، موجودہ مال گزاری کی جگہ پر پانچ سو روپے سے زائد زرعی آمدنی پر درجہ بند محصول لگانے اور قرضوں کو منسوخ کر دینے کا مطالبہ رکھا۔ اس نے کم سے کم مطالبات کا ایک چارٹر بھی پیش کیا۔ مال گزاری اور لگان میں 50 فی صد تخفیف، عام لگان داروں کے لیے حق دخل، بیگار کے خاتمے، قرضوں اور سود کی شرحوں میں کمی اور روایتی جنگلاتی حقوق کی بحالی کے مطالبے اس محضر میں شامل تھے۔ خود کسانوں کے اندر طبقاتی اختلافات نیز جوت دار کسانوں اور بے زمین زرعی مزدوروں کی باہمی کشیدگی کے مسائل کسان سبھا کے لیے مشکلات کا باعث رہے۔ بہر حال کسان سبھا کے منشور میں یہ تجویز بھی پیش کی گئی کہ غیر مزروعہ سرکاری اور زمینداری زمینوں کو پانچ ایکڑ سے کم زمین رکھنے والے کسانوں اور بے زمین زرعی مزدوروں میں تقسیم کر دیا جائے۔ البتہ جوت داری یا قبضے والی آراضی کی ایک حد مقرر کرنے کا کوئی مطالبہ نہیں کیا گیا تھا۔ سہج آنند نے کسان بلیٹن کے ایک ابتدائی شمارے میں، زرعی اجرتوں کے بارے میں تحقیقات کرانے کے لیے کہا تھا اور یہ خیال بھی ظاہر کیا تھا کہ "کسانوں کے ساتھ گفت و شنید" اور "زمینداروں کے خلاف ان کی منظم ہڑتال کی تائید کر کے زرعی مزدور طبقے کے حالات میں بہتری لائی جا سکتی ہے۔ گویا اس طرح انھوں نے کسانوں اور زرعی مزدوروں کے مابین ایک واضح اور کافی حد تک دلچسپ خط امتیاز قائم کرنے کی کوشش کی تھی۔

کسان سبھاؤں کی ابتدائی سرگرمیوں میں کسانوں کا مارچ کرانے اور آل انڈیا کسان ڈے (یکم

ستمبر 1936، جب کہ صرف ایک ضلع گھور کے دیہی علاقوں میں 100 جلسے ہوئے تھے) منانے، کے علاوہ دوسری مقامی سرگرمیاں بھی شامل تھیں۔ مثال کے طور پر بہار کسان سبھا نے نومبر 1936 سے ضلع مونگیر کے بڑھیا تال میں دخل دار لگان داروں کو بے دخل کر دینے کی زمیندار کی کوشش کے خلاف ایک بڑی تحریک شروع کی تھی۔ یہ زمیندار اس طرح بے دخل کی گئی زمین کو "باکاشت زمین میں تبدیل کرنا چاہتا تھا۔ آل انڈیا کانفرنسوں کے نتیجے میں نئی صوبائی تنظیموں کی تشکیل کی حوصلہ افزائی ہوئی مثلاً، لکھنؤ اجلاس سے واپسی پر کلکتہ کے مندوبین نے بنگال پردونشیل کسان سبھا قائم کرنے کی غرض سے ان لوگوں سے رابطے قائم کرنے شروع کر دیے تھے جو اس سلسلے میں پہلے سے سرگرم تھے مگر منتشر حالت میں تھے۔

جاگیردارانہ نظام کی انتہائی بھیانک اور جابرانہ شکل ریاستوں میں تھی، اور جیسا کہ ہم پہلے جائزہ لے چکے ہیں، ان ریاستوں میں بھی متعدد مقامی نوعیت کی کسان تحریکیں سر ابھارتی رہی تھیں۔ ان میں تازہ ترین تحریک، جے پور کے سکر ٹھکانہ (جاگیر) میں کساد بازاری کے دوران مال گزاری میں اضافے کے خلاف جدو جہد یا پھر پنجاب کے مقام لوہارو میں اونٹ ٹیکس کے خلاف 1935 کی تحریک تھی جس میں پولس فائرنگ بھی ہوئی تھی۔ ریاستی عوام کی کل ہند کانفرنس اب تک ایک اعتدال پسند اور اعلا طبقے کی تنظیم رہی تھی جس کی سرگرمیاں صرف عرضداشتیں پیش کرنے یا کتابچے جاری کرنے تک ہی محدود رہی تھیں جب کہ کانگریس بھی ریاستوں کے معاملات میں دخل نہ دینے کی پالیسی پر سختی سے کاربند چلی آرہی تھی۔ یہاں تک کہ 1934 میں بھی گاندھی نے اس سلسلے میں کانگریس کی "بے بسی" کو دوہرایا تھا اور یہ امید ظاہر کی تھی کہ راجگان کو اس بات کے لیے رضامند کیا جا سکتا ہے کہ وہ اپنی رعایا کے ساتھ اچھے سرپرست جیسا سلوک کریں۔ کانگریس اسمبلی پارٹی کے سب سے مضبوط رجعت پسند لیڈر بھولا بھائی ڈیسائی نے تو 1935 میں ریاست میسور کا دورہ کرتے ہوئے یہ یقین دہانی بھی کرائی تھی کہ مستقبل میں قائم ہونے والے وفاق کے ساتھ تعلقات کی نوعیت طے کرنے کا حق صرف راجگان کو ہی حاصل ہوگا۔ سن 1936 میں واضح تبدیلی کے آثار پیدا ہو گئے۔ اسٹیس پیوپلز کانفرنس کے پانچویں اجلاس سے نہرو کے خطاب میں محض درخواست پیش کرتے رہنے کی جگہ پر عوام کے ساتھ رابطے قائم کرنے کی ضرورت پر زور دیا گیا۔ اس اجلاس میں پہلی بار زرعی مطالبات کا پروگرام بھی تیار کیا گیا جس میں مال گزاری میں ایک تہائی تخفیف، قرضوں میں کمی اور کشمیر، الور، سکر (جے پور) اور لوہارو کے المیے کے پس منظر میں کسانوں کی شکایتوں کی تحقیقات کرانے کا مطالبہ بھی شامل تھا۔ اگلے سال کانگریسی وزارتوں کی تشکیل پر ان ریاستوں کے بیشتر حصوں میں اتھل پتھل پیدا ہو گئی تھی۔

ادب میں اشتراکیت

1936 میں ہی آل انڈیا اسٹوڈنٹس فیڈریشن اور انجمن ترقی پسند مصنفین کی بنیاد بھی رکھی گئی جس سے تعلیم یافتہ نوجوانوں پر کیمونزم کے بڑھتے ہوئے اثر کا پتہ چلتا ہے جو کہ سول نافرمانی کے قطعی برعکس بات تھی، کیونکہ عدم تعاون کی تحریک کی طرح ہی سول نافرمانی کی تحریک بھی ان نوجوانوں اور صاحب رائے طبقے کو متاثر کرنے میں ناکام رہی تھی۔ وجہ یہ تھی کہ اس وقت کی علمی دنیا گاندھیائی اصول پرستی کی وجہ سے مایوسی کا شکار اور انتہا پسندانہ طریقہ کار کی منتظر تھی۔ پریم چند کے آخری اور عظیم ترین ناول گودان (1936) میں کسان طبقے کی مشکلات اور مصائب کی انتہائی اثر انگیز ترجمانی کی گئی۔ اس ناول میں نہ تو گاندھیائی آدرش واد تھا اور نہ ہی رنگ بھومی (1925) جیسی رجائیت ہی تھی، اور انتقال سے ذرا ہی پہلے تحریر کردہ ان کے مضامین "مہاجنی سبھیتا" میں سوویت تجربے کی ستائش کے ساتھ ساتھ سرمایہ دار طبقے کی منافع خورانہ نیت کو ہدف بنایا گیا تھا۔ 1932 میں میکسم گورکی کے ناول ماں کے ترجمے کے بعد آندھرا میں محنت و مشقت کرنے والوں کی زندگی کے بارے میں ناول نگاری کا ایک فیشن سا شروع ہو گیا تھا جب کہ تیلگو علاقے میں شاعر شری شری کو زبردست عروج حاصل ہوا۔ شری شری نے ہی سب سے پہلے بول چال کی تلگو کو نظم کی زبان کا درجہ دیا۔ انھوں نے بھگت سنگھ کی شہادت سے ہی متاثر ہو کر اپنی مشہور نظم "مارے پراپنچم" تخلیق کی تھی۔ مارے پراپنچم (دوسری دنیا دوسری دنیا، دوسری دنیا بلا رہی ہے) لال جھنڈے کی طرف توجہ مبذول کراتے ہوئے اختتام پذیر ہوتی ہے۔ بمبئی کی لیبر تحریک سے ہی متاثر ہو کر دہ کھول کر اور ماما وریکر نے کپڑا ملوں کی ہڑتالوں کو موضوع بنا کر مراٹھی میں کہانیاں لکھی تھیں۔ بنگال میں جہاں شہری صاحب رائے حلقہ نے گاندھی میں کوئی خاص دلچسپی نہیں لی تھی، وہیں رابندر ناتھ نے خود کو نہ صرف یہ کہ سول نافرمانی سے الگ رکھا تھا بلکہ غالب گمان یہ ہے کہ وہ دہشت پسندی کے بھی سخت خلاف تھے (جس کا اندازہ ان کے ناول چار ادھیائے، 1934 سے بھی ہوتا ہے)، لیکن روس سے لکھے گئے ان کے مراسلات (1930) میں دہشت پسندی کی ستائش ملتی ہے۔ کلکتہ کے اہم ادبی ماہنامے۔ پریچے، (1931 سے جاری کیا گیا) میں بھی جہاں ایک طرف اس وقت کی گاندھیائی تحریکوں بلکہ کسان تحریکوں کے سلسلے میں لاتعلقی کا مظاہرہ کیا گیا تھا وہیں دوسرے بین الاقوامی حالات و واقعات میں کافی دلچسپی دکھائی جاتی تھی، خاص طور پر فاشزم کے خلاف عالم گیر تحریک، مارکسی نظریے اور عمل کی بابت بحث و مباحثے پر لگاتار زور دیا جاتا تھا۔

اشتراکی رجحان رکھنے والے نئے ادیبوں اور شاعروں کے لیے ایک آل انڈیا فورم شروع کرنے کے سلسلے میں پہلی سجاد ظہیر کی قیادت میں اردو دانشوروں کے ایک گروپ نے کی تھی۔ سجاد ظہیر نے 1935 میں، جبکہ وہ لندن میں زیر تعلیم ہی تھے اس سلسلے میں ایک منشور کا مسودہ تیار کیا

تھا جس میں عوام کی مشکلات یعنی بھوک، غربت، سماجی پس ماندگی اور سیاسی تابع داری جیسے موضوعات کو اپنا کر فنون لطیفہ کو عوام سے ہم آہنگ کرنے کی ضرورت پر زور دیا گیا تھا۔ اپریل 1936 میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی پہلی کانفرنس لکھنؤ میں ہوئی جس کی صدارت منشی پریم چند نے کی اور 1938 میں رابندر ناتھ نے اپنے جوشیلے پیغام کے ذریعے عوام سے الگ تھلگ پڑ جانے پر خود اپنی ہی نکتہ چینی کی تھی۔ انجمن ترقی پسند مصنفین کو ایک آل انڈیا تحریک کے طور پر سب سے زیادہ طاقت بلاشبہ اردو دنیا میں حاصل ہوئی کیونکہ اردو ایک بین علاقائی زبان تھی۔ یہ دوسری بات ہے کہ اس کا دائرہ اثر زیادہ تر شہروں تک اور وہ بھی زیادہ تر اعلا طبقوں تک ہی محدود تھا۔ اردو کی سرکردہ شخصیتوں میں انقلابی سیاست داں اور ممتاز غزل گو شاعر حسرت موہانی، جوش ملیح آبادی، فراق گورکھپوری اور کرشن چندر جیسے شاعر اور ادیب شامل تھے۔ اگرچہ انجمن کے اشتراکی آرگنائزروں کے طریقہ کار میں بعض اوقات موقع پرستی یا ناموری کی خواہش کا عنصر بھی شامل ہوتا تھا مگر کچھ لوگوں نے عوام کے ساتھ رابطہ قائم کرنے کی واقعی کوشش کی۔ اس سلسلے میں 1936 کے موسم گرما میں دہلی کے قریب فرید آباد کی کسان شاعروں کی کانفرنس یا بمبئی کے محنت کش طبقوں کے درمیان کیفی اعظمی کے انقلابی مشاعرے قابل ذکر ہیں۔ اس طرح کی سرگرمیاں چوتھی دہائی کے دوران انڈین پیوپلز تھیٹر ایسوسی ایشن کے ذریعے لوک ثقافت کو پھر سے زندہ کرنے کی کمیونسٹوں کی کوششوں کا پیش خیمہ ثابت ہوئی تھیں۔

لکھنؤ اور فیض پور

یورپ سے واپسی پر نہرو 1929 کی ہی طرح اس مرتبہ بھی گاندھی کی تائید سے کانگریس کے صدر بن گئے۔ لکھنؤ اور فیض پور (اپریل، دسمبر 1936) کے کانگریس کے اجلاسوں سے نہرو کے خطاب سے بادی النظر میں ایسا لگا تھا کہ گویا قومی تحریک پر کمیونسٹوں کا غلبہ اپنے نقطۂ عروج پر آگیا ہو۔ جہاں نہرو نے کانگریس تنظیم پر اپنے افکار تھوپنے کی کوشش سے انکار بھی نہیں کیا، انھوں نے لکھنؤ اجلاس میں واضح طور پر یہ کہا کہ وہ لفظ سوشلزم۔ عالمی مسائل اور ہندوستان کے مسائل کے حل کی واحد کلید۔ کا استعمال ایک مبہم انسانی طریقہ کار کے طور پر نہیں بلکہ اس کے خالصۃً سائنسی معاشی معنوں میں کر رہے ہیں۔ انھوں نے اپنے اس خطاب میں سوویت یونین کی متعدد خامیوں کے باجود بھی اس کی ستائش "ایک نئے تمدن" کے طور پر کی اور یہ اعلان کیا کہ "ہم لوگوں کو، جو کہ آزاد ہندوستان کے لیے جدوجہد کر رہے ہیں...... ناگزیر طور پر...... دنیا کی ان ترقی پسند قوتوں کے ساتھ چلنا ہوگا جو سامراج اور فاشزم سے نبرد آزما ہیں" نہرو نے اٹلی اور جاپان کی جارحیت کی مذمت میں اور ابی سینیا (Abyssinia)، چین اور ری پبلکن اسپین کے تئیں یک جہتی

ظاہر کرنے کے لیے دونوں اجلاسوں میں قرار داد پاس کرائی، جسے قومی تحریک کے لیے نہرو کی سب سے قابل قدر دین کی حیثیت حاصل ہے۔ داخلی امور کے سلسلے میں انھوں نے انقلابی پروگرام کی بنیاد پر الیکشن لڑنے کی وکالت کی، کوئی عہدہ قبول کرنے سے انکار کیا، اور عام رائے دہی پر مبنی دستور ساز اسمبلی کی تشکیل کے لیے نعرہ بلند کیا۔ انھوں نے لکھنؤ میں خبردار کرتے ہوئے کہا تھا کہ "یہ دستور ساز اسمبلی نیم انقلابی صورت حال میں ہی تشکیل پا سکے گی"۔ نہرو کو یہ امید تھی کہ کانگریس کو ایک حقیقی سامراج مخالف "مشترکہ عوامی محاذ" کی شکل دی جا سکتی ہے۔ انھوں نے اس سلسلے میں پہلے قدم کے طور پر ٹریڈ یونینوں اور کسان سبھاؤں کی کارپوریٹ (اجتماعی) رکنیت کی تجویز پیش کی۔ نہرو نے کانگریس کے اندر اس تحکم پسندانہ رجحان کی بھی نکتہ چینی کی جس پر گاندھی اس سے پہلے اجلاس (اکتوبر 1934) میں زور دے چکے تھے۔ اس کے علاوہ انھوں نے مندوبین کی تعداد میں کمی، تنظیم کے عہداروں کے لیے کھادی کی شرط نیز صدر اور اس کی نامزد کردہ ورکنگ کمیٹی کی جکڑبندی کی بھی نکتہ چینی کی۔ نہرو نے لکھنؤ اجلاس کے بعد جو ورکنگ کمیٹی نامزد کی تھی اس میں جے پرکاش، نریندر دیو، اور اچیوت پٹوردھن جیسے تین سوشلسٹ لیڈر بھی شامل تھے۔ کانگریس کے انتخابی منشور (اگست 1936) کی سماجی و معاشی امور سے متعلق شقوں میں نیز فیض پور میں منظور کیے گئے عبوری زرعی پروگرام میں جہاں زیادہ واضح طریقے پر کراچی قرار داد کو دوہرایا گیا؛ وہیں کسی حد تک آل انڈیا کسان سبھا کے کسان منشور میں شامل کم سے کم مطالبوں۔ مال گزاری اور لگان میں تخفیف، زرعی آمدنی ٹیکس، متعین مدت کار، قرضوں کے پیمانے کو گھٹانے، بیگار کے خاتمے، جنگل سے متعلق حقوق اور کسان یونینوں کو تسلیم کرنے کو بھی شامل کیا گیا تھا۔ 1937 کے انتخابات میں نہرو نے کانگریس کے لیے بہت ہی زوردار مہم چلائی اور اس طرح اپنی پارٹی کو زیادہ سے زیادہ ووٹ دلانے والے لیڈر کی حیثیت حاصل کر گئے۔ ان کی یہ حیثیت آگے بھی تین دہائیوں تک جاری رہی۔

رجعت پسندوں کا استحکام اور تجارتی حلقوں کا دباؤ

ذرا گہرائی میں جانے سے پتہ چلتا ہے کہ 37-1935 کے دوران کمیونسٹوں کی پیش رفت، کم از کم اہم فیصلہ لینے کے تعلق سے، ایک دھوکہ اور زبانی جمع خرچ سے زیادہ نہیں تھی، یہ صحیح ہے کہ کانگریس سے باہر کے لبرل یا فرقہ پرست رجعت پسند گروپ، جو کہ بہادرانہ جدوجہد کے اعزاز سے عاری تھے، روز بروز بے وقعت سے ہوتے جا رہے تھے۔ فرقہ وارانہ ایوارڈ کے نتیجے میں پیدا ہونے والے ابہام کے باوجود بھی مالویہ اور انی کی کانگریس نیشلسٹ پارٹی نے 1934 کے انتخابات میں مایوس کن کارکردگی کا مظاہرہ کیا اور مثال کے طور یوپی میں قانون ساز اسمبلی کی آٹھوں سیٹیں

کانگریس کے حق میں ہار گئی۔ جب کہ اسی طرح کے ایک دوسرے منحرف گروپ نے (جس کی قیادت مالویہ اور لاجپت کر رہے تھے) چھ سیٹوں پر قبضہ کر لیا تھا۔ جناح نے 1937 کے انتخابات سے پہلے آل انڈیا مسلم پارلیمنٹری بورڈ کے ذریعے مسلم لیگ میں پھر سے جان ڈالنے کی سر توڑ کوشش کی تھی مگر وہ بھی زیادہ کامیاب نہیں ہو پائے تھے۔ وہ پنجاب اور بنگال میں کسانوں پر مشتمل دو بڑی علاقائی پارٹیوں یونینسٹ پارٹی اور کرشک پرجا پارٹی کو بھی اپنے اثر میں لینے میں ناکام رہے تھے۔ اس طرح مسلم لیگ 1937 کے صوبائی اسمبلی کے انتخابات میں مسلمانوں کے لیے محفوظ کل 482 میں سے صرف 109 سیٹ ہی جیت سکی تھی۔ لیکن سب سے اہم بات یہ تھی کہ روایتی قسم کی اسمبلی سیاست کے حامیوں نیز گاندھیائی تعمیری کام کے ورکروں کے درمیان مفاہمت کی بنیاد پر رجعت پسند حلقہ کافی مستحکم ہوتا جا رہا تھا۔ اس حلقے کو 1934 سے ہی کاروباری اور تجارتی حلقے کی تائید حاصل تھی۔ یہ رجعت پسند حلقہ دباؤ اور زبانی رعایتوں جیسے حربے استعمال کر کے اس پورے عرصہ میں قومی تحریک پر اپنا غلبہ قائم رکھنے میں کامیاب رہا تھا۔ انتہا پسندانہ صدارتی خطبوں، انقلابی قسم کے بیانات اور انتخابی تقریروں کی شکل میں اشتراکی افکار کے لیے جو تھوڑی بہت گنجائش پیدا کی گئی تھی وہ سول نافرمانی کے دوران پیدا ہونے والی عوامی بیداری کے پیش نظر ناگزیر تھی، پھر یہ کہ انتخابیہ (Electorate) میں بھی پانچ گنا اضافہ ہو چکا تھا۔

ٹھاکر داس کاغذات سے ان طریقوں پر کافی روشنی پڑتی ہے جو کہ رجعت پسندوں نے کانگریس کے اندر اشتراکی اثرات پر قابو پانے کی غرض سے اختیار کیے تھے۔ اس زمانے میں نہرو اس اشتراکی اثر کی علامت بن گئے تھے۔ اگست 1935 میں ایچ۔ پی۔ مودی نے ایک نئی، سرمایہ دار اور اعتدال پسند پارٹی قائم کرنے کی جو کوشش کی تھی وہ دوسرے دور اندیش تاجر ساتھیوں (ٹھاکر داس یا برلا وغیرہ) کی بھرپور تائید حاصل کرنے میں ناکام رہی تھی جن کے نزدیک کانگریس کے اندر بھولا بھائی ڈیسائی اور ولبھ بھائی پٹیل جیسے لیڈروں کو آگے بڑھانے کی حکمت عملی زیادہ بہتر تھی۔ اس میں شک نہیں کہ نہرو کے لکھنؤ اجلاس کے خطبے نے بمبئی کے 21 سرکردہ تاجروں (جن میں ایچ۔ پی مودی جیسے کانگریس مخالف عناصر اور وال چند ہیرا چند اور اے۔ او۔ شروف جیسے قوم پرست تاجر بھی شامل تھے) کو خوف زدہ کر دیا تھا۔ ان تاجروں نے مئی 1936 میں ایک بہت ہی سخت منشور جاری کر کے سوشلزم کو ہر طرح کی املاک، مذہب، اور ذاتی آزادی کے لیے خطرہ قرار دے کر اس کی مذمت کی تھی۔ بہر حال برلا نے اس سلسلے میں برتی گئی حماقت کے لیے وال چند اور ٹھاکر داس کی کافی کھینچائی کی تھی۔ "کسی بھی صاحب ملکیت شخص کو یہ کہنا ہرگز زیب نہیں دیتا کہ وہ کسی بھی طرح کی ضبطی کا مخالف ہے یہ معاملہ ان لوگوں پر چھوڑ دینا چاہیے جو کہ "جائیداد سے دست بردار ہو چکے ہیں"۔ "اگر ہم ان لوگوں کے ہاتھ مضبوط کریں تو ہم اس طرح ہر شخص کے

ہاتھ مضبوط کر سکتے ہیں"۔ (برلا بنام دال چند ہیرا چند، 26 مئی 1936)۔ واقعہ تو یہ ہے کہ برلا۔ لکھنؤ اجلاس کے سلسلے میں بہت خوش تھے۔ "مہاتما جی نے اپنا وعدہ نبھایا، انھوں نے اس بات کا خیال رکھا کہ نئی عہد بستگی نہ ظاہر کی جائے۔ جواہر لال نہرو کی تقریر ایک طرح ردی کی ٹوکری میں ڈال دی گئی تھی...... جواہر لال نہرو ایک مخصوص قسم کے انگریزی ڈیمو کریٹ معلوم ہوتے ہیں...... جو کہ کسی نہ کسی شکل میں اپنے افکار کا اظہار چاہتے ہیں...... مگر وہ یہ بھی سمجھتے ہیں کہ عملی اقدام ممکن نہیں ہے، اس لیے اس پر زور بھی نہیں دیتے۔" معاملات بالکل صحیح رخ میں جارہے ہیں" (برلا بنام ٹھاکر داس، مورخہ 20/اپریل 1936)۔ اس سلسلے میں تاجر حلقے کا باہمی اختلاف رائے محض طریقہ کار تک ہی محدود تھا، کیونکہ ٹھاکر داس نے اپنے 23/اپریل کے جواب میں یہ لکھا تھا کہ "مجھے ج۔ (جواہر) کے بارے میں کبھی کوئی شک و شبہ نہیں رہا ہے۔ میرا احساس صرف یہ ہے کہ ج کو صحیح راستے پر رکھنے کے لیے ہمیں کافی محنت کرنی ہوگی"۔

کانگریسی قیادت ہمیشہ ہی بھولا بھائی ڈیسائی اور بی۔ سی۔ رائے جیسے ان عناصر کو کنٹرول میں رکھتی آئی تھی جو عوامی جدوجہد کے سلسلے میں گاندھیائی طریقہ کار کے بارے میں بھی زیادہ پُرجوش نہیں تھے اور اس سے بڑھ کر یہ کہ اس طرح کے لوگ میونسپل یا اسمبلی سیاست سے ہی مطمئن تھے۔ 1930 کی دہائی کے وسط میں جو نئی بات سامنے آئی وہ یہ تھی کہ ولبھ بھائی پٹیل، راجندر پرساد، راج گوپال آچاری اور دوسری دہائی کے قدامت پرستوں کے رویے میں قابل لحاظ تبدیلی کے نتیجے میں اس طرح کے لوگوں کی طاقت میں کافی اضافہ ہو گیا تھا۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ اس وقت ادھیڑ عمر کے سیاست دانوں کی جگہ نوجوان سیاست داں لے رہے تھے۔ اس سے بھی زیادہ اہم بات یہ تھی کہ تعمیری کام اور منضبط عوامی جدوجہد سے عبارت گاندھی کی دونوں حکمت عملیاں ناکام ہوتی محسوس ہو رہی تھیں۔ 1932 کے بعد یہ بات منکشف ہو گئی تھی کہ سول نافرمانی کی تحریک حکومت کی جابرانہ کارروائیوں کا مقابلہ نہیں کر سکے گی جب کہ 35-1934 کے دوران گاندھی کے ذریعے قائم کی گئی آل انڈیا ولیج انڈسٹریز ایسوسی ایشن کبھی باقاعدہ شکل بھی اختیار نہیں کر سکی تھی، دسمبر 1935 میں بہار کے ایک افسر نے اسے "ٹائیں ٹائیں فش" قرار دیا تھا۔ شاید گاندھی نے بھی خود کو تدریجی دیہی کام اور سماوات پر مبنی ترقی کے لیے تیار کر لیا تھا۔ وہ بالآخر 1934 کے آخر میں کانگریس سے سبکدوش ہو گئے اور ان کے سکریٹری مہادیو ڈیسائی نے 20/اگست 1936 کو برلا کو یہ اطلاع دی تھی کہ "باپو اب گاؤں کے کام میں زیادہ سے زیادہ مصروف ہوتے جارہے ہیں...... حقیقت تو یہ ہے کہ وہ اب اپنا ذہن کانگریس سے اور دوسری تمام خارجی سرگرمیوں سے ہٹاتے جارہے ہیں اور ساری توجہ گاؤں اور گاؤں کے مسائل پر مبذول کر رہے ہیں۔ (حوالہ In the Shadow of the Mahatma)۔ بہر حال ان کے چند قریبی رفقا،

کار میں ایسے بھی تھے جو اس طرح کے صبر و تحمل اور عینیت سے مملو تھے جب کہ خود گاندھی کے بشمول دوسرے تمام رہنما اشتراکی چیلنج سے خطرہ محسوس کرنے لگے تھے۔ ایسا معلوم ہونے لگا تھا کہ اشتراکی نظریات ملک گیر قومی عوامی تحریک کا متبادل ثابت ہوتے جارہے ہیں۔

لکھنؤ اجلاس کے چند مہینوں کے اندر ہی برلا کی دوراندیشی سچ ثابت ہوگئی۔ جواہر لال نہرو نیز ورکنگ کمیٹی کے 14 ممبروں میں سے تینوں سوشلسٹ ارکان ایک طرح سے داہنے گروپ کے پابند ہو کر رہ گئے تھے، کیونکہ ان کے پاس عملی اختیارات بھی نہیں تھے اور پارٹی کے عہدیدار ہونے کی وجہ سے کانگریس کے طرز عمل کی کھل کر نکتہ چینی بھی نہیں کر سکتے تھے۔ نہرو کی اشتراکی تقریروں کو بہانہ بنا کر ورکنگ کمیٹی کے سات ممبروں نے، جن کی کمان راجندر پرساد، راج گوپال آچاریہ، پٹیل اور کرپلانی کے ہاتھ میں تھی، 29 جون 1937 کو استعفے کی دھمکی تک دیدی تھی۔ خاص بات تو یہ ہے کہ ان ممبروں نے اپنا احتجاجی مراسلہ گاندھی کے واردھا صدر دفتر میں ہی تیار کیا تھا۔ گاندھی نے اس وقت تو صلح صفائی کرادی تھی، مگر اس سلسلے میں نہرو کو ہی جھکنا پڑا تھا۔ واقعہ تو یہ ہے کہ گاندھی نے نہرو کی "عدم رواداری" کی نکتہ چینی کی تھی اور نہرو کے یہ گوش گزار کیا تھا کہ "آپ ابھی اقتدار میں بھی نہیں ہیں۔ آپ کو پارٹی عہدہ دیئے جانے کا مقصد یہ ہے کہ آپ اس سے کہیں جلد اقتدار میں آجائیں جس قدر کہ آپ اپنی کوششوں سے اقتدار حاصل کر سکتے ہیں۔ (مکتوبات، 8/ اور 15 جولائی)۔ لکھنؤ اجلاس میں ہی مزدور اور کسان انجمنوں کی کارپوریٹ رکنیت کی اسکیم کا پورا حلیہ ہی بگاڑ دیا گیا تھا، اور سوشلسٹوں کی مخالفت کے باوجود بھی محض ایک عوامی رابطہ کمیٹی تشکیل دیدی گئی تھی اور اس میں راجندر پرساد اور جے رام داس دولت رام جیسے لوگوں کو شامل کر کے جے پرکاش وغیرہ کو بالکل بے اثر کر دیا گیا تھا اور یہ کمیٹی اگر فیض پور اجلاس منعقد ہونے تک بھی اپنی رپورٹ تیار نہیں کر سکی تھی تو اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں تھی۔ اس کے علاوہ صوبائی کانگریس کمیٹیوں نے غیر ضروری تاخیر اور ٹال مٹول کے طریقے اپنا کر زرعی پروگرام میں بھی رکاوٹ پیدا کی۔ چنانچہ فیض پور اجلاس میں آل انڈیا کسان سبھا کے کسان منشور کے تمام اہم مطالبوں (لگان، مال گزاری اور قرضوں کے بار میں قابل لحاظ کمی اور سود کی حد بندی وغیرہ) میں کافی کتربیونت کردی گئی تھی۔ اس کے علاوہ زمینداری کے خاتمے اور سرکاری یا زمینداری کی غیر کاشت زمینوں کی از سر تقسیم کے مطالبے ترک کر دیئے گئے تھے۔ جب پٹیل نے این۔ جی۔ رنگا کو اس بات کے لیے سخت نشانہ بنایا کہ انھوں نے آندھرا کانگریس کے انتخابی امیدواروں سے کسان سبھا کی تائید کے بدلے میں کسانوں کے کم سے کم مطالبات کی تائید کرنے کے حلف نامے پر دستخط کرانے کی کوشش کی تھی، تو نہرو نے رنگا کی کوئی مدد نہیں کی تھی بلکہ "غلط فہمی" کے نام پر سارا معاملہ ہی درگزر کر دیا تھا اور رنگا سے یہ معاملہ بھول جانے کے لیے کہا تھا اور رنگا نے بھی

کسان حلف نامے کی شرط امیدواروں سے واپس لے لی تھی۔ (حوالہ India Annual Register, July . Dec. 1936)-

عہدے قبول کرنے سے متعلق اہم سیاسی معاملے میں بھی داہنے گروپ کی ہی چلی اور وہ یہ معاملہ لکھنؤ میں اور پھر فیض پور میں بھی ملتوی کرانے میں کامیاب ہو گئے۔ پھر جیسے ہی انتخابات میں کانگریس کو کامیابی حاصل ہو گئی، کانگریس کے صدر اور پورے بائیں گروپ کی انتہاپسندانہ بیان بازی کے باوجود بھی وزارت سازی کے لیے دباؤ پر قابو پانا ناممکن ہو گیا۔ برلا کی یہ پیش گوئی ایک بار پھر صحیح ثابت ہو گئی: جو الیکشن ہو گا اس پر ولبھ بھائی گروپ کا کنٹرول ہو گا، اور اگر لارڈ لنلتھگو حالات سے صحیح طریقے پر عہدہ برآ ہوئے تو اس بات کا غالب امکان ہے کہ کانگریس برسراقتدار آجائے گی" (برلا کا مکتوب بنام ٹھاکرداس مورخہ 20/اپریل1936)۔

باب سات

سیاسی تحریکیں اور جنگ

1937-1945

1937-39: کانگریسی وزارتیں

انتخابات اور وزارت سازی

کانگریس نے 1937 کے انتخابات میں شاندار کامیابی کا مظاہرہ کیا اور صوبائی اسمبلیوں کی کل 1585 میں سے 711 سیٹیں اس طرح جیت لیں کہ کل 11 میں سے پانچ صوبوں (مدراس، بہار، اڑیسہ، سی پی اور یوپی) میں واضح اکثریت اور بمبئی میں تقریباً اکثریت (175 میں 86 سیٹیں) حاصل ہوئی۔ وفادار زمیندار گروپوں مثلاً یوپی میں نواب چھتاری کی نیشنل اگری کلچرسٹ پارٹی اور مدراس میں جسٹس پارٹی کو سرکاری اعانت بھی شرمناک شکست سے نہیں بچا سکی تھی، یہاں تک کہ مسلم اکثریت کے انتخابی حلقوں میں بھی (جہاں کانگریس نے کل 482 میں سے 58 پر انتخاب لڑا تھا اور 26 سیٹیں جیتی تھیں) ان گروپوں کو جو کامیابی حاصل ہوئی تھی وہ اس لحاظ سے بے اثر ثابت ہو گئی تھی کہ مسلم لیگ مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت ہونے کا دعوا ثابت نہیں کر سکی تھی۔ مسلم لیگ صوبہ سرحد میں ایک بھی سیٹ نہیں جیت سکی تھی اور پنجاب میں 84 محفوظ سیٹوں میں محض 2 اور سندھ میں 33 میں سے 3 سیٹیں ہی جیت پائی تھی۔ کانگریس نے بیشتر شیڈولڈ کاسٹ سیٹیں بھی جیت لی تھیں، سوائے بمبئی کے، جہاں ہریجنوں کے لیے محفوظ 15 میں سے 13 سیٹیں ڈاکٹر امبیڈکر کی انڈیپنڈنٹ لیبر پارٹی جیتی تھی۔

کروڑوں ہندوستانیوں کے لیے، خاص طور پر ہندو اکثریت والے جنرل حلقوں میں "گاندھی جی کے لیے ووٹ اور پیلا بکس" وطن پرستانہ ایثار و قربانی کی ستائش اور سماجی و معاشی تبدیلیوں کی آرزو کی علامت کی حیثیت اختیار کر گئے تھے۔ کانگریس کے انتخابی منشور اور فیض پور میں منظور کیے گئے زرعی پروگرام کے ذریعے، پارٹی کے سابقہ پالیسی بیانات کے مقابلے میں کہیں زیادہ پیش رفت کا مظاہرہ کیا گیا تھا۔ یہ دوسری بات ہے کہ ان میں اشتراکی نظریات کو مکمل طور پر شامل نہیں کیا گیا تھا۔ عام رائے دہی کی بجائے محض وسیع رائے دہی کی بنیاد پر انتخابات میں حصہ لینے کے لیے زیادہ وسائل کے ساتھ مقامی طور پر بااثر حلقوں، شہری علاقوں کے بیوپاریوں اور دیہی علاقوں کے بااثر زمینداروں اور کسانوں کے ساتھ رابطہ قائم کرنا بھی ضروری تھا۔ برلا نے کانگریس سینٹرل پارلیمنٹری بورڈ کے لیے۔ جس کے صدر پٹیل تھے، پانچ لاکھ روپے کا عطیہ دیا تھا،

جب کہ کے۔ کے۔ ڈالمیا نے بہار کانگریس کمیٹی کے ذریعے جمع کردہ 37 ہزار روپے میں سے 27 ہزار روپے خود دیئے تھے۔ چونکہ اس طرح کی رقوم ناکافی تھیں (ہر حلقے میں الیکشن کے مصارف تقریباً دو ہزار روپے کے بقدر تھے)، اس لیے ہر امیدوار سے یہی امید تھی کہ وہ اپنے انتخابی مصارف خود ہی پورے کرے گا؛ جس کا واضح مطلب یہی تھا کہ امیدوار بنانے کے سلسلے میں صاحب جائیداد لوگوں کو ہی ترجیح دی جاتی۔ مثلاً بہار میں مقامی زمینداروں کے دباؤ کی وجہ سے کسان سبھا کے بہت سے شدت پسندوں کو امیدوار نہیں بنایا گیا تھا اور کانگریس کے لیڈر راے۔ این سنہا نے تسلیم کیا تھا کہ ان کی پارٹی کے بیشتر امیدواروں کا تعلق زمیندار طبقے سے تھا۔ اس طرح ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اس پورے عرصے میں کانگریس پر باہم مخالف حلقوں کا پورا دباؤ رہا، یعنی بائیں گروپ کا بھی اور داہنے گروپ کا بھی!

اس انتخابی کامیابی کی وجہ سے کانگریس پر وزارت سازی کے لیے دباؤ اتنا بڑھ گیا کہ مزاحمت ناممکن ہو گئی۔ آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے مارچ 1937 کے اجلاس میں راجندر پرساد اور پٹیل کی پیش کردہ وہ قرارداد منظور کر لی گئی جس میں "مشروط طریقے پر عہدہ قبول کر لینے" کے لیے کہا گیا تھا اور شرط یہ تھی کہ صوبائی اسمبلی پارٹی کے کانگریسی لیڈر کو یہ اطمینان ہو اور وہ اعلانیہ طور پر کہہ سکتا ہو کہ گورنر اپنے خصوصی اختیارات کو بروئے کار نہیں لائے گا"۔ کوئی بھی عہدہ قبول نہ کرنے کے سلسلے میں جے پرکاش کی ترمیم کو 78 کے مقابلے میں 135 ووٹوں سے مسترد کر دیا گیا تھا اور برلا نے وائسرائے لنلتھگو کے پرائیویٹ سکریٹری کے نام اپنے ایک مراسلے میں اسے "کانگریس کے داہنے گروپ کی ایک بڑی کامیابی" بتایا تھا (حوالہ: In the Shadow of the Mahatma p-214)۔

اگرچہ لنلتھگو نے اس طرح کی کوئی اعلانیہ ضمانت دینے سے انکار کر دیا تھا کہ گورنر کے خصوصی اختیارات کو استعمال نہیں کیا جائے گا، مگر گاندھی جولائی 1937 میں اپنا ذہن بنا چکے تھے اور مہادیو ڈیسائی نے 16 جولائی کو برلا کو یہ اطلاع دی تھی کہ "نہرو کی اس بات کے لیے ستائش کی جائے گی کہ وہ آسانی سے راضی ہو گئے تھے۔ بہر حال ورکنگ کمیٹی عہدہ قبول کرنے کی بات اس سے ایک ہفتہ قبل ہی اس معمولی سی بنیاد پر ہی منظور کر چکی تھی کہ اگرچہ انگریزوں کی یقین دہانیاں اطمینان بخش نہیں ہیں مگر "صورت حال یہ باور کر لینے کا تقاضہ کرتی ہے کہ اپنے خصوصی اختیارات کو استعمال کرنا گورنروں کے لیے آسان نہیں ہوگا۔" یوپی، بہار، اڑیسہ، سی پی، بمبئی اور مدراس میں کانگریسی وزارتیں بن گئیں۔ ستمبر 1938 میں جوڑ توڑ کے ذریعے آسام میں بھی کانگریسی وزارت قائم ہو گئی۔ یہ وزارت دوسری پارٹیوں کے ممبروں کو توڑ کر بنائی گئی تھی اور اس میں کانگریس کے اشتراکی صدر سبھاش بوس نے اہم رول ادا کیا تھا۔

اس طرح ملک کے بڑے حصے میں وہ لوگ وزیر بن گئے جو کہ اس سے پہلے مظلوم رہ چکے

تھے۔ نئی اسمبلیوں کو "بندے ماترم' کے تناؤ کا سامنا کرنا پڑا اور جس قومی جھنڈے کے لیے لوگوں نے لاٹھیاں اور گولیاں کھائی تھیں وہ سرکاری عمارتوں پر لہرانے لگا تھا۔ کانگریسی وزارتوں نے شروع شروع میں سامراج مخالف تحریک سے وابستہ تمام حلقوں کو بڑھاوا دیا۔ کانگریس کی رکنیت، جو کہ 1936 میں پانچ لاکھ تھی، 1937 میں بڑھ کر 31 لاکھ اور 1938 میں 45 لاکھ تک پہنچ گئی۔ اشتراکی رجحان کے طلباء، کسان اور مزدور تحریکیں آگے بڑھتی گئیں اور عوامی حکومتوں کے قیام کی وجہ سے ریاستوں میں بھی تحکم پسندانہ، طریقہ کار اور جاگیرداری کے خلاف سرگرمی شروع ہو گئی۔ وزارتی ذمہ داری قبول کرنے کے نسبتاً زیادہ منفی اور متضاد پہلو بھی جلد ہی سامنے آنے لگے۔ اوّل تو یہ کہ "مکمل سوراج" کے لیے عہد بستہ پارٹی، جو کہ 1935 کے دستور کو بھی مسترد کر چکی تھی، اب سرکاری تحفظات کی وجہ سے انتہائی محدود اختیارات کے تحت کام کرنے پر مجبور تھی اور وہ بھی اس طرح کہ اس کی وزارتوں کے مالی وسائل بھی بہت محدود تھے، اور اسے اپنے فیصلوں کو ایک ایسی پولس اور سول افسروں کے ذریعہ زیر عمل لانا تھا جن کے ساتھ تعلقات کافی عرصہ سے معاندانہ رہے تھے۔ اگرچہ گاندھی کے اصرار پر ورکنگ کمیٹی نے وزراء کی تنخواہوں کے لیے 500 روپے ماہانہ کی حد قائم کر دی تھی مگر اقتدار اور سرپرستی اچانک ہی حاصل ہو جانے کے نتیجے میں موقع پرستانہ جوڑ توڑ اور گروہی چپقلش کا شروع ہو جانا لازمی تھا۔ بہار میں پارٹی کی صورت حال کے سلسلے میں اے آئی سی سی کے ایک انسپکٹر کی رپورٹ (1938) میں یہ تسلیم کیا گیا تھا کہ "کوئی خاص کام نہیں کیا گیا، سوائے اس کے کہ مخصوص اضلاع میں کانگریسی لوکل باڈیز کا الیکشن لڑ رہے ہیں۔" جولائی 1938 میں وسطی صوبہ جات میں روی شنکر شکلا نے ڈی پی مشرا کی تائید اور مدد سے این۔ بی۔ کھرے کو وزارت عظمیٰ سے باہر کر دیا تھا۔ اگرچہ اس معاملے کو ہندی اضلاع رائے پور نیز جبل پور اور مراٹھی اضلاع کے درمیان علاقائی مقابلہ آرائی کی شکل میں پیش کیا گیا تھا، کیونکہ کھرے مراٹھی اضلاع کے لیڈر تھے، مگر اس معاملے میں بھی سارا عمل دخل گروہ بندی کا ہی تھا (مشرا ایک سال قبل ہی شکلا کے مقابلے پر کھرے کی تائید کر چکے تھے)۔ بہر حال اصل مسئلہ فرقوں اور طبقوں کے مفادات کے درمیان توازن قائم کرنے کا تھا۔ کانگریس کے قومی اور کثیر طبقاتی تصورات و نظریات کی حامل ہونے کے باوجود بھی اسے یہ لگا کہ وہ ایک برسر اقتدار پارٹی کے طور پر ہندوؤں اور مسلمانوں، زمینداروں اور کسانوں، اور تاجروں اور ورکروں کو بہ یک وقت خوش نہیں کر پائے گی۔ بہر حال 1937 اور 1939 کی درمیانی مدت میں کانگریسی وزراتوں اور پارٹی کی اعلا کمان کا طریقہ کار یہ رہا کہ دونوں کا رجحان کبھی رجعت پسندی کی طرف ہو جاتا تھا تو کبھی اشتراکیت کی طرف!

کانگریس اور افسر شاہی

رجعت پسندی کی طرف رجحان سے، سرکاری حلقے میں کسی بڑے ٹکراؤ کے فقدان کی

وضاحت ہوتی ہے۔ بہرحال ستمبر 1939 میں جنگ چھڑ جانے سے ایک بالکل نئی صورت حال پیدا ہو گئی۔ ایک بحران تو فروری 1938 میں پیدا ہوا جب یو پی میں گوند بلبھ پنت کی وزارت نے اور بہار میں شری کرشن سنہا کی وزارت نے اس لیے استعفیٰ دیدیا تھا کہ ان دونوں صوبوں کے گورنروں نے سیاسی قیدیوں کو فوراً رہا کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ جولائی 1937 میں انڈمان جیل میں بھوک ہڑتال کے بعد قیدیوں کی رہائی ایک اہم قومی معاملے کی حیثیت اختیار کر گئی تھی۔ بنگال میں بڑی تعداد میں قید سیاسی لوگوں کے بارے میں کچھ نہ کرنے کی وجہ سے کانگریس پارٹی وہاں کی فضل الحق وزارت کی کڑی نکتہ چینی کر رہی تھی اور کانگریس کے ہری پورہ اجلاس کے موقع پر بائیں گروپ کو خاموش رکھنے کے لیے کچھ نہ کچھ کرنا ضروری تھا۔ اجلاس کے ختم ہونے کے کچھ دن بعد ہی یہ استعفے واپس لے لیے گئے تھے، اور گورنر بھی فوری اور مکمل رہائی کی بجائے انفرادی طور پر قیدیوں کو رہا کرنے کے اصول پر راضی ہو گئے تھے۔

کانگریس وزارتوں نے اپنا کام، 1932 سے برقرار ایمرجنسی اختیارات کو کالعدم کرنے کی شکل میں شروع کیا۔ بہرحال اکتوبر 1938 میں راج گوپال آچاری کے خلاف کارروائی کی گئی۔ یہ کارروائی مدراس میں باغیانہ تقریریں کرنے کے سلسلے میں کی گئی تھی۔ اس کے علاوہ کانگریسی وزارت کے صوبوں میں فرقہ وارانہ فسادات ہوئے نیز اشتراکی مزدوروں اور کسانوں کی تحریکوں کے خلاف جابرانہ اقدامات کیے گئے۔ ستمبر 1938 میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے "جان و مال کے تحفظ کے لیے کانگریسی حکومتوں کو تمام ضروری اقدامات" کرنے کی کھلی چھوٹ دیدی اور "کانگریسیوں کے بشمول ان تمام لوگوں کی"...... مذمت کی جو شہری آزادی کے نام پر قتل، لوٹ مار اور پُر تشدد طریقے پر طبقاتی جنگ" کی وکالت کرتے ہوئے پائے جائیں گے۔ سامراجی مورخ 'کوپ لینڈ' کے خیال میں امن اور قانون قائم رکھنے کے سلسلے میں اقتدار کے آخری سال کانگریس کے طریقہ کار اور دوسری حکومتوں یا 1937 سے پہلے کے افسر شاہی کے طریقہ کار میں کوئی فرق نہیں تھا۔ کوپ لینڈ تو اس سلسلے میں کانگریس کو شاباشی دینے کے بھی موڈ میں تھا۔"...... یہ کہا جا سکتا ہے کہ کانگریسی حکومتیں امن و قانون قائم رکھنے کے سلسلے میں اپنے اوپر تھوپی گئی آزمائش میں کامیاب رہی تھیں (R- Coupland : The Constitutional problem in India Part II, p. 135)۔

فرقہ وارانہ مسئلہ

کوپ لینڈ نے اس طرح کی ستائش کے ساتھ ساتھ کانگریس اعلا کمان کی مبینہ "کلیت" کی بھی کڑی نکتہ چینی کی ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ اعلا کمان کی اس "کلیت" نے وفاقی تصور کو بالکل کھوکھلا

کر دیا تھا۔ اس کلیت نیز کانگریس وزارتوں کے دوسرے ہندو نواز اقدامات کے نتیجے میں مسلم فرقہ فیصلہ کن طریقے پر الگ پڑتا چلا گیا تھا۔ مسلم لیگ کا بھی یہی کہنا تھا۔ چنانچہ جناح نے لیگ کے پٹنہ اجلاس (دسمبر 1938) میں "کانگریسی فاشزم" کی مذمت کی تھی۔ لیگ کے ترجمانوں کے علاوہ دوسرے لوگوں نے بھی مسلمانوں کے الگ پڑ جانے کے لیے 1937 اور 1939 کے دوران کانگریس کی بعض مخصوص پالیسیوں اور رویوں کو ذمہ دار ٹھہرایا ہے۔ مثال کے طور پر مولانا آزاد نے اپنی تصنیف انڈیا ونس فریڈم (1959) میں اور پینڈرل مون نیز ایچ۔ وی۔ ہوڈسن جیسے برطانوی مورخین نے بھی یہی خیال ظاہر کیا ہے۔

چونکہ 1937 کے بعد مسلم لیگ کے احیاء کی ساری کوشش یوپی میں ہی مرکوز رہی تھی، کانگریس نے صوبے میں مخلوط حکومت سازی کی تجویز کو نامنظور کر دیا تھا۔ کانگریس کے اس اقدام کو فرقہ وارانہ تقسیم کے لحاظ سے فیصلہ کن قرار دیا جاتا ہے۔ انتخابات کے دوران کانگریس۔ لیگ تعلقات کافی دوستانہ رہے تھے، کیونکہ یہ دونوں ہی پارٹیاں نواب چھتاری کی نیشنل اگری کلچرسٹ پارٹی کا مقابلہ کر رہی تھیں۔ کل ہند سطح پر بھی، مسلم لیگ کے انتخابی منشور میں 1935 کے ایکٹ کے سلسلے میں کانگریس ہی کی طرز پر تنقیدی رویہ اپنایا گیا تھا اور معاہدہ لکھنؤ (1916) کے اصولوں کی بنیاد پر اشتراک و تعاون کا خیال بھی ظاہر کیا گیا تھا۔ بہر حال انتخابات کے بعد یوپی میں واضح اکثریت حاصل ہو جانے پر کانگریس نے مخلوط حکومت کے لیے خلیق الزماں کی پیش کش کو مسترد کر دیا تھا۔ خلیق الزماں لیگ کے وہ لیڈر تھے جو 1934 تک کانگریس پارلیمانی بورڈ کے ممبر رہے تھے۔ نہرو اور آزاد کے ساتھ گفت وشنید کا سلسلہ وزراء کے انتخاب کے معاملے پر ٹوٹا تھا ویسے اس کی دوسری بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ کانگریس نے جولائی 1937 میں کانگریس میں مسلم لیگ اسمبلی پارٹی کے مکمل طور پر ضم ہو جانے پر اصرار کیا تھا، 1937 کے وسط میں اس طرح کا اصرار نہ تو غیر فطری تھا اور نہ ہی غیر واجبی! جیسا کہ خلیق الزماں کو بھی اعتراف تھا کہ یوپی میں مسلم لیگ "زمینداری، فوجی اور سول سروسز (خدمات) سے بندھی" ہوئی تھی (Pathway to Pakistan p173)۔ اس کے کل ہند انتخابی منشور میں "ایسی تحریک کی مذمت کی گئی تھی جس کا مقصد نجی جائیداد کی ضبطی" ہو۔ لیگ کے لکھنؤ اجلاس (اکتوبر 1937) میں خلیق الزماں نے مسلم کسانوں کی حالت میں بہتری کے لیے اپیل کرتے ہوئے بھی ہر طرح کی زمینی اصلاحات کو مسترد کر دیا تھا۔ اس کے نتیجے میں ہی نہرو نیز کانگریس کے بائیں بازو کے زیندر دیو اور کے ایم اشرف جیسے لیڈروں کو یہ خدشہ تھا کہ مسلم لیگ کو کانگریس میں مکمل طور پر ضم کیے بغیر مخلوط حکومت سازی کے نتیجے میں انقلابی قسم کی سماجی و معاشی اصلاحات ناممکن ہو جائیں گی۔ چنانچہ ان لوگوں نے "عوامی رابطے" کے ذریعے مسلمانوں کو اپنا ہمنوا بنانے کی کوشش کو ترجیح دی اور اس کی ذمہ داری

اشرف کو سونپی گئی۔ اس کے علاوہ یوپی میں کانگریس کو بھاری اکثریت حاصل تھی (جہاں اس نے 228 میں سے 134 سیٹیں جیتی تھیں)، دیوبندی علماء کی تائید بھی حاصل تھی جو کہ جمیعۃ العلماء ہند پر چھائے ہوئے تھے۔ اسے شمالی ہند میں احرار پارٹی کی تائید حاصل تھی۔ یہ پارٹی چند سال پہلے ہی پنجاب میں خلافت تحریک کے سابق لیڈروں نے بنائی تھی۔ مئی 1937 میں احرار پارٹی کی ایک کانفرنس میں جناح کی "ایک فرسودہ سیاست داں" کے طور پر مذمت کی گئی تھی اور مسلم لیگ کو "چند زمینداروں، خان بہادروں اور نوابوں کا ٹولہ" بتایا گیا تھا۔

مسلم لیگ نے اپنے لکھنؤ اجلاس کے بعد خود کو ایک عوامی پارٹی کی شکل میں پیش کرنے کی سر توڑ اور انجام کار کامیاب کوشش کی۔ اس نے اقلیتوں کے لیے موثر تحفظات کے ساتھ مکمل آزادی کے نعرے کو قبول کر لیا۔ "طبقاتی تلخی اور فرقہ وارانہ جنگ" پیدا کرنے کے لیے کانگریس کی نکتہ چینی کی اور یوپی میں 1,00000 نئے ممبران بنائے اور پنجاب و بنگال کے وزراء اعظم یعنی یونیسٹ پارٹی کے سکندر حیات خاں اور کرشک پرجا کے لیڈر فضل الحق کی (رسمی) حمایت حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئی تھی۔ "ہندوستانی سیاسیات کا ایک ادنیٰ طالب علم بھی یہ جانتا ہے کہ یوپی سے ہی مسلم لیگ کی تنظیم نو ہوئی تھی" (خلیق الزماں، صفحہ 13)۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ جو بات تباہ کن ثابت ہوئی وہ یہ نہیں تھی کہ کانگریس نے مخلوط حکومت سازی کے لیے مسلم لیگ کی پیش کش کو ٹھکرا دیا تھا بلکہ یہ کہ یوپی اور دوسرے صوبوں میں بھی صحیح سماجی انقلابی اقدامات ترتیب دینے اور عمل میں لانے میں کانگریس ناکام رہی تھی۔ مسلمانوں کے ساتھ عام رابطہ قائم کرنے کی بات محض کاغذ تک ہی محدود رہی اور آخر میں سیکولر اور انقلابی لیڈروں نے مسلم عوام کا دل جیتے بغیر ہی مسلم مفاد پرستوں کو خبردار کرنا شروع کر دیا تھا۔

بنگال میں وزارت کی تشکیل اسی طرح کے بلکہ نسبتاً کم حق بجانب واقعات سے جڑی ہوئی تھی۔ عبدالمنصور احمد، شمس الدین احمد، اور نوشیر علی جیسے انتہاپسند لیڈروں کے دباؤ پر فضل الحق کی کرشک پرجا پارٹی نے اپریل 1936 میں جو الیکشن پروگرام وضع کیا تھا اس میں معاوضہ کی ادائیگی کے بغیر ہی زمینداری کے خاتمے، لگان میں فوراً کمی اور لازمی پرائمری تعلیم کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ جناح کے ساتھ الیکشن سے پہلے کی بات چیت زمینداری کے خاتمے کے سوال پر ٹوٹ گئی تھی اور کرشک پرجا پارٹی لیگ کی ایک بہت سخت انتخابی مدمخالف ثابت ہوئی تھی، وہ بھی اس طرح کہ فضل الحق پٹوا کھالی کی اہم سیٹ خواجہ ناظم الدین کو ہرا کر جیت گئے تھے۔ تاہم بنگال میں کانگریسی قیادت نے زرعی اصلاح کا نعرہ رسمی طور پر بھی بلند نہیں کیا تھا۔ جس کی وجہ شاید یہ تھی کہ یوپی کے برخلاف بنگال میں زمیندار عام طور پر ہندو تھے جب کہ ادھر کے تعلقہ داروں کی اکثریت مسلمان تھی۔ مخلوط حکومت سازی کے لیے کرشک پرجا پارٹی کے ساتھ بات چیت ٹوٹ گئی تھی۔ کیونکہ

کانگریس کا یہ اصرار تھا کہ قیدیوں کو فوراً رہا کیا جائے جبکہ عبدالمنصور احمد کا یہ کہنا تھا کہ وزارت کے پروگرام میں لگان اصلاح کو ترجیح دی جائے کیونکہ قیدیوں کی رہائی کے معاملے میں گورنر اپنا حق تنسیخ بھی استعمال کر سکتا ہے اور اس کے نتیجے میں وزارت کے استعفے کی نوبت آسکتی ہے۔ چنانچہ اس طرح فضل الحق کو لیگ کے ساتھ اتحاد پر مجبور کر دیا گیا تھا۔

صوبوں میں کانگریسی حکومت کے سارے ستائس ماہ کے دوران مسلم لیگ نے پروپیگنڈا مہم جاری رکھی تھی۔ اس سلسلے میں پیر پور رپورٹ (1938 کے آخر)، بہار سے متعلق شریف رپورٹ (مارچ 1934)، اور فضل الحق کی کتاب Muslim Sufferings under Congress Rule)۔ (دسمبر 1939) نقطہ عروج کی حیثیت رکھتی ہے۔ ان میں جو الزامات لگائے گئے تھے، ان میں، فرقہ وارانہ فسادات کی روک تھام نہ کرنے، بقر عید کے موقع پر گاؤ کشی پر پابندی لگانے، عوامی تقریبات کے موقع پر 'بندے ماترم' اور خاص طور پر اس کے بت پرستانہ حصے گائے جانے اور اردو کے ساتھ زیادتی کرتے ہوئے دیوناگری رسم خط میں ہندی اور ہندوستانی کو آگے بڑھانے کے الزامات قابل ذکر تھے۔ ظاہر ہے کہ ان سارے الزامات میں کافی حد تک مبالغے سے کام لیا گیا تھا اور خاص بات تو یہ ہے کہ کانگریس نے چیف جسٹس موریس گویر کے ذریعے ان الزامات کی تحقیقات کرانے کی پیش کش کی تھی جسے مسلم لیگ نے مسترد کر دیا تھا۔ مسلم لیگی لیڈر مارچ 1940 کی قرار داد پاکستان سے پہلے نامطمئن قسم کے سیاست داں تھے جن کا کوئی واضح پروگرام نہیں ہوتا تھا۔ کیونکہ جداگانہ انتخابیہ، صوبائی خود مختاری صوبہ، سرحد اور صوبہ سندھ کو مکمل صوبے کا درجہ، جیسے پرانے مطالبات نیز بنگال اور پنجاب میں مسلمانوں کی سیاسی بالادستی کو کانگریس اور انگریز، دونوں ہی کم و بیش تسلیم کر چکے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ جناح نے مئی 1938 میں بوس کے ساتھ اپنی بات چیت میں یہ اصرار کیا تھا کہ مسلم لیگ کو مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت کے طور پر تسلیم کیا جائے جو کہ 1940 کی دہائی کے وسط سے پہلے ہمیشہ ایک غیر حق بجانب دعوا رہا تھا کیونکہ مسلم لیگ یوپی، بمبئی اور مدراس کے مسلمانوں میں بہت مضبوط ہونے کے باوجود بھی بنگال میں بہت کمزور تھی۔ پنجاب اور صوبہ سرحد میں برائے نام ہی تھی؛ اور صوبہ سندھ میں بھی (جہاں مارچ 1938 میں اللہ بخش کی قیادت میں کانگریسی وزارت بنی تھی)، حکومت بنانے میں ناکام رہی تھی۔ خلیق الزماں نے بڑی صفائی کے ساتھ یہ اعتراف کیا ہے کہ جناح کے موقف کا کانگریس کی طرف سے مسترد کر دیا جانا ہمارے لیے ایک حد تک خوش بختی ثابت ہوا۔ کیونکہ ......"اگر کانگریس جناح کی پوزیشن کو اسی وقت تسلیم کر لیتی جب کہ مطالبہ کیا گیا تھا تو ہم شاید کوئی بھی مثبت مطالبہ پیش کرنے کی پوزیشن میں نہ رہتے۔"

کانگریس اعلا کمان کے خلاف "آمریت پسندی" کا الزام ایک پُر جستجو مطالعے کی حیثیت رکھتا

ہے، کیونکہ ایک آل انڈیا پارٹی کو اپنی پوزیشن مستحکم کرنے کے لیے مورد الزام نہیں ٹھہرایا جا سکتا، اور خود جناح 1937 سے 1947 کی دس سال کی درمیانی مدت میں اپنی ساری توانائی صوبائی مسلم لیڈروں کو کنٹرول کرنے میں صرف کرتے رہے تھے۔ کانگریسی صوبوں میں فرقہ وارانہ فسادات کافی جلد جلد ہوتے تھے مگر دوسرے صوبوں کے مقابلے میں زیادہ نہیں ہوتے تھے۔ اکتوبر 1937 سے ستمبر 1939 کے دوران آٹھ کانگریسی صوبوں میں 60 فسادات ہوئے تھے جب کہ 3 غیر کانگریسی صوبوں میں 25 فسادات ہوئے تھے۔ کانگریس ورکنگ کمیٹی نے "بندے ماترم" کے بعض حصوں کے سلسلے میں مسلم دوستوں کے اعتراض کے پیش نظر اکتوبر 1937 میں اس کے ٹیپ کے بند کو ہٹا دینے کا فیصلہ کیا۔ جہاں مسلم لیگ نے بنیادی تعلیم سے متعلق واردھا اسکیم کو ہندوزدہ قرار دے کر اسے سخت نکتہ چینی کا نشانہ بنایا، وہیں ہندو مہاسبھا نے اس میں اردو کو شامل کیے جانے کی بنیاد پر اس کی مذمت کی اور ممتاز مسلم دانشور ذاکر حسین واردھا اسکیم میں بھی نمایاں رہے تھے اور بمبئی کے اسکولوں کے لیے اردو نصابی کتابوں کی تیاری میں بھی پیش پیش رہے تھے۔ ان کتابوں کو مسلم لیگ نے غیر اسلامی قرار دے کر مذمت کی تھی۔

تاہم نہرو نے 18/ اکتوبر 1939 کو راجندر پرساد سے یہ اعتراف کیا تھا کہ "اس میں کوئی شک نہیں کہ ہم فرقہ پرستی اور مسلمانوں کے اندر کانگریس مخالف احساسات کی روک تھام کرنے میں ناکام رہے ہیں" (حوالہ Uma Kaura p 123)۔ کانگریس کی حکومت والے ایک مسلم اکثریت کے صوبے، سرحد میں خان صاحب کی وزارت مسلم کسانوں کی حمایت کھونے لگی تھی کیونکہ وہ ہندو اور سکھ تاجروں اور مہاجنوں کی طرف سے مخالفت کی وجہ سے دیہی قرضداری کو کم کرنے کے سلسلے میں کوئی قدم نہیں اٹھا پائی تھی (حوالہ: اے۔ کے گپتا، این۔ ڈبلیو ایف پی لے جس لے چر اینڈ فری ڈم اسٹرگل، صفحہ 93)۔ شمالی اور وسطی ہندوستان کے بیشتر حصوں میں کانگریس کے دیہی پروگراموں کی بنیاد ہندوازم اور ہندی پر مبنی ہوتی تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ مسلمان زیادہ تر شہری علاقوں سے تعلق رکھتے تھے اور خواندہ بھی تھے اور اردو اعلا طبقوں کی زبان تھی۔ اگرچہ کانگریسی قیادت 1930 کی دہائی کے آخر میں سیکولرزم کی دہائی پہلے سے کہیں زیادہ دینے لگی تھی مگر قیادت کے رویئے سے سبھی متفق نہیں تھے اور فیصلوں پر عمل بھی نہیں ہوتا تھا۔ مثال کے طور پر 1937 میں آزاد کو یہ شکایت تھی کہ سی پی کی کانگریس لیگ سے تو ہاتھ نہیں ملا سکی تھی مگر اس کے لیڈر ہندو مہاسبھا میں اکثر سرگرم رہتے تھے۔ کانگریس ورکنگ کمیٹی نے کہیں جا کر دسمبر 1938 میں یہ اعلان کیا تھا کہ ہندو مہاسبھا کی رکنیت رکھنے والا کانگریس سے وابستہ رہنے کا اہل نہیں رہے گا۔ ہندو مہاسبھا ان برسوں میں طاقتور ہوتی جا رہی تھی اور اس کے نئے صدر، وی۔ ڈی ساورکر نے جو کہ مہاراشٹر کے ایک سابق انقلابی تھے، ناگ پور اجلاس (دسمبر 1938) میں اعلان کیا تھا کہ "ہم

ہندو اپنے آپ میں ایک مکمل قوم ہیں...... ہندو قوم پرستوں کو ہندو فرقہ پرست کہے جانے پر معذرت خواہ ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے"۔ بہر حال اس سے بھی زیادہ تشویش کی بات یہ تھی کہ نیم فوجی قسم کی فرقہ وارانہ تنظیمیں قائم ہوتی جارہی تھیں۔ ان میں 1931 میں قائم کی گئی عنایت اللہ مشرقی کی خاکسار پارٹی (پنجاب) اور کے۔ بی۔ ہیڈگیوار کی راشٹریہ سویم سوک سنگھ (آر ایس ایس) قابل ذکر تھیں۔ آر ایس ایس کو شروع شروع میں مہاراشٹر کے تلک کے پیروکار لیڈر بی۔ ایس مونجے کی بھی سرپرستی حاصل رہی تھی، اور اس کا دائرہ اثر 1930 کی دہائی میں ناگ پور سے پھیل کر یوپی، پنجاب اور ملک کے دوسرے حصوں تک پہنچ گیا تھا۔ 1940 میں جب کہ اس کی کمان گول والکر کے ہاتھ میں آگئی تھی، اس کے انتہائی تربیت یافتہ اور منضبط سیوکوں کی تعداد ایک لاکھ سے بھی تجاوز کر گئی تھی جو کہ بے لوچ فرقہ پرستی میں کامل یقین رکھتے تھے۔

بعد میں تقسیم کے زمانے کے فرقہ وارانہ مسئلے کی نوعیت سے یہ پتہ چلتا ہے کہ 1930 کی دہائی کے آخر میں اس مسئلے کے سلسلے میں مبالغہ آرائی سے کام لیا گیا تھا۔ بلاشبہ کانگریسیوں نے مسلم لیگ کو کبھی بھی اہم چیلنج نہیں سمجھا اور وہ کانگریسی وزارتوں کو ایک دوسرے سے مختلف اور متضاد طریقوں سے استعمال کرنے کی کوششوں میں ہی مصروف رہے۔ یعنی انھوں نے ان وزارتوں کی موجودگی کو ذاتی مفاد آگے بڑھانے کے موقع کے طور پر بھی استعمال کیا، گاندھیائی نظریات کو عمل میں لانے کے طور پر بھی استعمال کیا اور ہندوستان کے سرمایہ دار طبقے کے اشتراک وتعاون سے قومی معاشی ترقی کے منصوبے تیار کرنے اور پس ماندہ عوام کی حالت میں سدھار کے موقع کے طور پر بھی استعمال کیا۔

گاندھیائی اصلاحات

اکتوبر 1937 میں واردھا کی ایک تعلیمی کانفرنس میں "مقامی زبانوں میں بنیادی تعلیم" سے متعلق گاندھی کی تجاویز کی توثیق کردی گئی، ایک ایسی بنیادی تعلیم جو پیداواری (Productive) کام سے بھی جڑی ہو۔ چنانچہ ان خطوط پر کانگریس وزارتوں والے صوبوں میں اسکول قائم کیے گئے جنھیں تھوڑی بہت سرکاری مدد بھی حاصل تھی۔ اگرچہ یہ اسکول سادگی، ذہنی اور جسمانی محنت کے درمیان فرق میں کمی اور اپنی مصنوعات کی فروخت کاری کے ذریعے ان اسکولوں کو خود کفیل بنانے جیسے اہم اور دلچسپ مقاصد کے تحت شروع کیے گئے تھے مگر یہ بنیادی اسکول روایتی اسکولوں اور کالجوں کا بدل ثابت نہ ہو سکے اور بڑی تعداد کا خیال یہ بھی تھا کہ بنیادی تعلیم کے ساتھ صنعت وحرفت کا جوڑا جانا محض ایک گاندھیائی اختراع تھی۔ گاندھی نے نشہ بندی پر بھی اصرار کیا حالانکہ انتخابی منشور میں اس کا کوئی ذکر نہیں کیا گیا تھا۔ زبردست مالی نقصان کے باوجود بھی کانگریسی اعلا

کمان نے کانگریسی وزارتوں پر مکمل نشہ بندی کے لیے دباؤ ڈالا اور خاص طور پر مدراس نیز بمبئی میں اس سلسلے میں فوراً قدم اٹھانے کی ہدایت کی۔ مدراس میں مندروں میں داخلے سے متعلق بھی تھوڑی بہت قانون سازی کی گئی مگر ہریجنوں کی بہبود سے متعلق گاندھی کے منصوبے کے سلسلے میں کچھ بھی نہیں کیا گیا۔ 1930 کی دہائی کے آخر میں ڈاکٹر امبیڈکر بھی کانگریس کے اتنے شدید نکتہ چیں ہو گئے تھے جتنی کہ مسلم لیگ؛ بلکہ اکتوبر 1939 میں کانگریسی وزارتوں کے استعفے کا جشن جناح کے ساتھ مل کر منایا تھا اور اسے 'یوم نجات' قرار دیا تھا۔

ایسے کانگریسیوں کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہوتا جارہا تھا جو گاندھی کے نظریات اور تصورات کو ناقابل عمل سمجھتے تھے، خاص طور پر بھاری صنعتوں کے تئیں ان کے معاندانہ رویے کو غلط سمجھتے تھے۔ صوبوں میں کانگریسی حکومتوں کے دوران جو خاص بات ہوئی وہ یہ تھی کہ Claude Markovitz کے الفاظ میں "کانگریس اور ہندوستان کے تاجر طبقے کے درمیان ایک دیرپا اتحاد" کی بنیاد قائم ہو گئی تھی۔

سرمایہ دار طبقہ اور کانگریس

یہ ایک ایسا عمل تھا جو علاقوں اور وقت کے لحاظ سے تضادات اور اختلافات سے ماوراء نہیں تھا۔ جہاں برلا نے یہ خبر سن کر کہ کانگریس حکومت سازی کے لیے تیار ہو گئی ہے، زبردست خوشی ظاہر کی تھی، وہیں کانگریسی وزارتوں والے صوبوں (کلکتہ کے ماسوا) کے صنعت کار اور تاجر پریشان ہو گئے تھے کیونکہ ان کے خیال میں ان عوامی حکومتوں کی وجہ سے ٹریڈ یونینوں کے حوصلے بہت بڑھ جائیں گے۔ اکتوبر 1937 میں کانگریس لیبر کمیٹی نے بہبود سے متعلق قانون سازی کا ایک مبہم سا پروگرام تیار کیا تھا اور یوپی کی وزارت نے مزدور سبھا کو تسلیم کرنے پر اصرار کیا تھا جس پر 1937 اور 1938 میں کان پور کی کپڑا ملوں میں زبردست ہڑتالیں ہوئی تھیں۔ یوپی کے ایک سر کردہ صنعت کار جے پی سری واستو نے جو کہ بعد میں وائسرائے کی ایکزیکیٹو میں بھی شامل ہو گئے تھے، بعد میں Wawell کو یہ بتایا تھا کہ ...... 1937 میں یوپی میں کانگریس وزارت قائم ہو جانے کے بعد سر کردہ صنعت کاروں نے...... جو کہ میرے خیال میں سب کے سب ہندو تھے ... اکٹھا ہو کر جناح، مسلم لیگ بلکہ ہندو مہاسبھا کی مدد کرنے کا فیصلہ کیا تھا تاکہ یہ دونوں انتہا پسند فرقہ پرست پارٹیاں کانگریس کا مقابلہ کر سکیں، کیونکہ ان صنعت کاروں کو خدشہ تھا کہ کانگریس حکومت سے ان کے مفادات کے لیے خطرہ پیدا ہو سکتا ہے"۔ (واویل وائسرائے جرنل، اندراج برائے نومبر 1944، صفحہ 402)۔ پھر یہ کہ مالیات کے شعبے کی وجہ سے بھی ٹکراؤ کا غالب امکان تھا۔ حکومت بمبئی نے فروری 1939 میں شہری جائیداد ٹیکس اور کپڑے پر سیلز ٹیکس نافذ کیا تھا تاکہ گاندھیائی نشہ

بندی کی وجہ سے ہونے والے مالی خسارے کو کسی قدر پورا کیا جاسکتا۔ نئی دہلی کی حکومت نے بھی صنعت کاروں کو خوش کرنے کی کوشش کرتے ہوئے اسمبلی کی اس قرارداد کو تسلیم کرلیا جس کے ذریعے 1935 کے اوتاوا معاہدے اور ہند۔ برطانیہ ضمنی معاہدے کو ختم کردیا گیا تھااور برطانیہ کے ساتھ نئے معاہدے کے لیے بات چیت میں برلا، ٹھاکرداس اور کستور بھائی لال بھائی کو صلاح کار کے طور پر شرکت کے لیے مدعو کیا۔ یہ مذاکرات اگست 1936 سے مارچ 1939 تک جاری رہے تھے۔ اس بات چیت کا مرکزہ وہ سودے بازی تھی جس کی رو سے لنکا شائر کی درآمدات پر کم محصول کے بدلے میں اور زیادہ ہندوستانی برآمدات برطانیہ بھیجی جاسکتی تھیں۔ ہندوستانی برآمدات میں اضافے سے خود حکومت ہند کا مفاد بھی وابستہ تھا، کیونکہ اس طرح ہندوستان سے ترسیل زر میں بھی اضافہ ہو سکتا تھااور جہاں تک بمبئی کا سوال ہے تو کپڑوں کے لحاظ سے ملکی منڈیوں پر اس کا کنٹرول قائم ہو چکا تھااس لیے درآمداتی محصول میں کمی کے سلسلے میں کسی قسم کی رعایت دینے میں اسے کوئی اعتراض نہیں تھا(حوالہ:Basudev Chatterji Vol.VII)۔

ان تمام مسائل کے باوجود بھی ہندوستانی سرمایہ داروں اور کانگریس کی قیادت کے فیصلہ ساز حلقوں کے درمیان ایک طرح کی مفاہمت کے آثار 1938 کے وسط سے ہی ہویدا ہونے شروع ہو گئے تھے۔ ذخیرہ کاری کی غرض سے اشیاء کی خریداری کے سلسلے میں کانگریسی وزارتوں کی سودیشی اساس پالیسی سے تاجروں کو فائدہ ہوااور خاص طور پر بمبئی میں سرمایہ داروں کے ساتھ قریبی روابط کو فروغ حاصل ہو تا گیا۔ مثال کے طور پر ٹھاکرداس کاغذات سے پتہ چلتا ہے کہ پٹیل کلک نکسن کی بابت اسٹیم نیوی گیشن کمپنی پر کنٹرول کے لیے لال چند ہیرا چند کی براہ راست مدد کررہے تھے۔ کپاس کے درآمدی محصولات کو برقرار رکھنا بھی قوم پرستوں کے لیے ایک وقار کا معاملہ بن گیا تھااور کانگریس کے دباؤ کی وجہ سے یہ غیر سرکاری صلاح کار گفت وشنید سے الگ ہو گئے تھے۔ وجہ یہ تھی کہ اب ہندوستانی سرمایہ داروں کاایک اہم حلقہ اس پارٹی سے الگ تھلک نہیں پڑسکتا تھاجو ملک کے گیارہ میں سے آٹھ صوبوں میں حکومت کر رہی تھی۔ حکومت ہند نے مارچ 1939 میں برطانیہ کے ساتھ اپنے طور پر ہی جو معاہدہ کیا اس میں برطانیہ میں ہندوستانی خام کپاس کی کھپت اور ہندوستان کو کپڑوں کی درآمدکاری کے تناسب سے لنکا شائر کی درآمدات پر محصول میں کمی کی بات مان لی گئی تھی۔ تمام تاجر ممبران اسمبلی نے اس معاہدے کے خلاف کانگریس کے ساتھ مل کر ووٹ دیااور اس طرح یہ معاہدہ وائسرائے کے تصدیق نامہ کے طریقہ کار کے ذریعے ہی منظور ہو سکا۔

اور زیادہ بنیادی نوعیت کے معاشی حالات وواقعات تاجر حلقے اور خود کانگریس کے رویوں میں تبدیلی کا باعث ہو رہے تھے اور اس طرح یہ دونوں گروپ باہمی اتحاد کی طرف بڑھ رہے تھے۔ ہندوستان کی محصولاتی حصار بندی کے پس پشت بڑی بڑی برطانوی (اور اب چند امریکی) کمپنیوں کی

شاخوں کا قیام بھی ایک اہم خطرے کی شکل اختیار کرتا جا رہا تھا۔ مثال کے طور پر 1937 تک لیور برادران نے ایک بڑی صابن ساز کمپنی کے طور پر گودریج کی جگہ حاصل کر لی تھی، اس طرح امپیریل ٹوبیکو نے بھی وزیر سلطان کمپنی کے نام سے اپنی شاخ قائم کر لی تھی۔ اسی طرح کیمیادی اشیاء، انجینئرنگ اور ربڑ کی صنعت بھی بری طرح متاثر ہو چکی تھی جس کا ذکر 1938 کے دوران ہری جن کے متعدد مضامین میں ایک "لعنت" کے طور پر کیا گیا تھا۔ FICCI نے یہ معاملہ اپریل 1939 میں اپنے ہاتھ میں لیا اور بمبئی کے ایک کانگریس لیڈر این۔ وی۔ گیڈگل نے بھی اسی ماہ مرکزی اسمبلی میں اس سلسلے میں ایک قرارداد کی تحریک بھی پیش کی تھی۔

اس اثناء میں 1937 سے کساد بازاری پھر شروع ہو گئی تھی، جس کی وجہ شکر کی ضرورت (مانگ) سے زیادہ پیداوار تھی (بہر حال اس مسئلے پر یوپی اور بہار کی وزارتوں نے شکر کے پیداکاروں کی ایک سنڈی کیٹ بنوا کر موثر طریقے پر قابو پا لیا تھا۔ اسی طرحس سیمنٹ سازی کے میدان میں بھی بحران پیدا ہو گیا تھا اور کپڑا صنعت میں بھی ٹھہراؤ آ گیا تھا۔ اشیاء صرف کی صنعتوں میں نشو و نما کی حدود پوری ہو گئی تھیں، کیونکہ ملک کی دیہی منڈیوں میں بھاری توسیع کے لیے زبردست زمینی اصلاحات جیسی بنیادی تبدیلیوں کی ضرورت تھی جسے کانگریس اور افسر شاہی، دونوں ہی سماجی اعتبار سے ناقابل قبول سمجھتے تھے۔ درمیانی اور اصل اشیاء کی تیاری کے لیے شروع میں بھاری سرمایہ کاری، تکنیکی جانکاری، اور شروع میں کم سے کم منافع کے لیے آمادگی ضروری تھی۔ اس لیے متبادل راستہ یہی تھا کہ یا تو "انڈیا لمیٹیڈ" قسم کی کمپنیوں کو (حالانکہ غیر ملکی سرمایہ داروں کو کم منافع بخش اصل اشیاء کی تیاری میں کوئی دلچسپی نہیں تھی) بڑھاوا دیا جاتا یا سرکاری پہل، سرمایہ کاری اور منصوبہ بندی کے ذریعے مساوی نوعیت کی صنعتوں کو فروغ دینے کی کوشش کی جاتی۔ جہاں مالیاتی ممبر، گریگ جیسے برطانوی افسران، صنعتی ترقی اور عوامی سرمایہ کاری جیسے معاملات کے سلسلے میں لاتعلقی کے لیے بدنامی کی حد تک مشہور تھے، میسور کے سابق دیوان ایم۔ وسویسوریا 1934 میں ہی سرکاری سرمایہ کاری کے لیے کہہ چکے تھے۔ جیسا کہ بعد کے واقعات سے بھی بار بار یہ بات سامنے آئی، ہندوستان جیسے ایک پس ماندہ ملک میں بورژوائی طبقے کا نسبتاً زیادہ دور اندیش حلقہ بنیادی نوعیت کی صنعتوں میں سرکاری ضابطے بندی، منصوبہ بندی اور سرکاری سرمایہ کاری کے اقدامات کو قبول کرنے کے لیے تیار رہتا، کیونکہ اس سے خود ان کی اپنی نشو و نما کے لیے ایک سازگار بنیادی ڈھانچہ تیار ہوتا بلکہ یہ حلقہ سماجی نعرے بازی کو بھی قبول کر لیتا، کیونکہ اس وقت سوشلزم کا مطلب ہر چیز کو مکمل طور پر قومی ملکیت میں لے لینا ہرگز نہیں تھا۔ سبھاش چندر بوس نے اکتوبر 1938 میں نہرو کی قیادت میں قومی منصوبہ بندی کمیٹی کے سلسلے میں جو پہل کی تھی اس کا ہندوستان کے تاجر حلقے نے بے تابی سے خیر مقدم کیا تھا۔ برلا، لالہ شری رام، اور وسویسوریا کو

کانگریس کے وزراء صنعت کی اس کانفرنس میں شرکت کے لیے مدعو کیا گیا تھا جس میں قومی منصوبہ بندی کمیٹی کی تشکیل کی گئی تھی۔ اس کمیٹی نے بعد میں جو 29 ذیلی کمیٹیاں بنائی تھیں ان میں تجارتی حلقے کے اہم ممبران بھی شامل کیے گئے تھے اور نہرو نے موجودہ ڈھانچے کو تسلیم کرنے کی ضرورت کو مان لیا تھا۔ (مکتوب بنام کے۔ ٹی۔ شاہ 13/ مئی 1939)۔ "سوشلسٹ منصوبہ بند ڈھانچہ" یا "سرکاری ملکیت کے طویل موتی نصب العین" یا اہم صنعتوں پر سرکاری کنٹرول، جیسی باتوں سے ہندوستانی سرمایہ داروں کو کوئی تشویش نہیں تھی، کیونکہ کانگریسی وزارتوں کی غیر اشتراکی کارکردگی ان کے سامنے تھی۔ اس طرح 39-1938 میں ایک نادر اور اہم صف بندی کے آثار پیدا ہو گئے تھے۔ جہاں سرمایہ داروں نے کانگریس کے اندر پٹیل اور راجاجی جیسے رجعت پسند گاندھیائی لیڈروں کے ساتھ قریبی روابط قائم رکھے، وہیں کانگریس کے اندر اشتراکیت کی طرف جھکاؤ رکھنے والے لیڈروں کے ساتھ بھی ربط وضبط پیدا کرنا شروع کر دیا تھا۔ جدید صنعتی ہندوستان سے متعلق نہرو کا تصور، دیہی سادگی اور دیہی حرفوں کو فروغ دینے سے متعلق گاندھیائی نظریے کے مقابلے میں بورژوائی طبقے کو کہیں زیادہ قابل قبول ہو سکتا تھا۔

کانگریس اور محنت کش طبقہ

بورژوائی طبقے کے ساتھ مفاہمت کے لیے محنت کش طبقے کے تئیں رویوں میں تبدیلی ناگزیر تھی۔ عوامی وزارتوں کے قیام کے نتیجے میں مزدور تنظیم اور شدت پسندی کو شروع میں تحریک ملی، اور ٹریڈ یونینوں کی رکنیت میں 1937 کے مقابلے میں 1938 میں پچاس فیصد اضافہ ہو گیا نیز AITUC اور NFTO کے قریب آجانے کے نتیجے میں مزدور اتحاد کو کافی تقویت ملی۔ (ان دونوں تنظیموں کا ایک مشترکہ اجلاس ناگ پور میں اپریل 1938 میں منعقد ہوا تھا)۔ اس زمانے کے بڑے صنعتی تنازعات میں بنگال کے جوٹ ملوں میں ایک زبردست عام ہڑتال (مارچ۔ مئی 1937)، کان پور کی کاٹن ملوں میں بار بار کام میں رکاوٹ، امرت سر، احمد آباد اور خاص طور پر مدراس کے کپڑا ملوں میں ہڑتالیں، مارٹن برن کے کلٹی اور ہیرا پور کے فولاد ساز کارخانوں میں 1938 میں ہڑتالیں، نیز آسام کے ڈگبوئی کی تیل تنصیبات میں چھ ماہ طویل جدوجہد قابل ذکر ہیں۔ محنت کش طبقے کو اپنے ساتھ ملانے کے لیے کانگریس کی کوشش کے باوجود (نہرو اور بوس نے اکتوبر 1937 میں کلکتہ میں محنت کشوں کی ایک بڑی ریلی سے خطاب کرتے ہوئے ورکروں سے متحد ہونے، منظم ہونے اور کانگریس کے ہاتھ مضبوط کرنے کی اپیل کی تھی اور پٹیل، راجندر پرساد نیز جے بی کرپلانی جیسے لیڈروں نے 1938 میں ہندوستان مزدور سبھا بھی قائم کی تھی)، مزدور تحریک زیادہ تر لبرل اور بائیں بازو کے (زیادہ تر کمیونسٹ) لیڈروں کے ہی زیر اثر رہی تھی۔ نومبر

1937 میں احمد آباد کی ٹکسٹائل ہڑتال سے پتہ چلا کر کیمونسٹوں کا اثر و رسوخ اس زبردست گاندھیائی گڑھ میں نفوذ کر گیا تھا۔

ورکنگ کمیٹی نے اپریل 1937 میں بنگال کے جوٹ ورکروں کے تئیں یک جہتی ظاہر کی اور بنگال میں فضل الحق وزارت اور پنجاب میں سکندر حیات کی یونینسٹ حکومت کے جابرانہ اقدامات کی مذمت کی۔ لیکن ابتداء میں کانگریس نے، خاص طور پر کانگریسی وزارتوں نے جو مزدور حامی رویّہ اپنایا تھا اس کے خلاف سرمایہ دار طبقے کا دباؤ جلد ہی شروع ہو گیا۔ چنانچہ برلا نے "کانگریسی صوبوں میں عام بد نظمی" کی شکایت کی (مکتوب بنام مہادیو ڈیسائی، 4 ستمبر 1937)، اور سرمائے کو کانگریسی اقتدار والے صوبوں، یوپی اور بمبئی سے نکال کر ان دیسی ریاستوں میں منتقل کر دینے کی دھمکی دی گئی جہاں لیبر قوانین برائے نام ہی تھے اور اگر تھے بھی تو ان پر عمل قطعی نہیں ہوتا تھا۔ کانگریس نے کیمونسٹوں کے اثر والے علاقوں میں بورژوائی طبقے کی خوشنودی کے لیے مزدور طبقے کی بے چینی کو کچل دینے کی کوشش کی جس کا واضح ثبوت وہ بامبے ٹریڈس ڈسپیوٹ ایکٹ (نومبر 1938) ہے جسے گورنر لیملے نے بھی "قابلِ ستائش" قرار دیا تھا۔ یہ ایکٹ سلیکٹ کمیٹی میں بحث کے بغیر ہی محض دو ماہ کے اندر اندر جلد بازی میں پاس کیا گیا تھا جس کی رو سے ثالثی کو لازمی قرار دیا گیا تھا۔ خلاف قانون ہڑتالوں کے لیے چھ ماہ قید کی سزا مقرر کی گئی تھی (جب کہ تالا بندی کے خلاف کوئی تعزیری شق نہیں رکھی گئی تھی) اور نئی یونین کو تسلیم کرانے کے سلسلے میں ایسے قواعد و ضوابط طے کیے گئے تھے کہ موجودہ یونینوں کے لیے بھی کام کرنا مشکل ہو گیا تھا۔ احمد آباد کے گاندھیائی لیبر لیڈروں گلزاری لال نندہ اور کھنڈو بھائی ڈیسائی کے علاوہ ملک بھر میں مزدور تحریک نے اس ایکٹ کی مذمت کی تھی، یہاں تک کہ مسلم لیگ کے بشمول تمام غیر کانگریسی پارٹیوں نے بھی احتجاج کیا۔ اس سلسلے میں 6 نومبر کو بمبئی میں ایک زبردست احتجاجی ریلی ہوئی جس میں 80,000 لوگوں نے شرکت کی تھی اور اس ریلی سے ڈانگے، اندرلال یاجنک اور امبیڈکر نے خطاب کیا تھا اور اگلے دن پورے صوبے میں جزوی ہڑتال بھی کی گئی۔ انگریزوں کی ملکیت والی آسام آئل کمپنی کے خلاف ڈگبوئی کی 1939 کی ہڑتال کے دوران کانگریس نے جو ہمدردی ظاہر کی تھی وہ اس لیے بے کار ثابت ہو گئی کہ این سی باردولائی کی وزارت مزدوروں کے حق میں دیے گئے ایک آئی سی ایس افسر کے فیصلے کو لاگو نہیں کر سکی تھی اور اکتوبر میں کانگریسی وزارت نے اس ہڑتال کو کچل دینے کے لیے جنگی زمانے کے نئے نئے نافذ ڈیفنس آف انڈیا رولز کے آزادانہ استعمال کی اجازت بھی دے دی تھی۔ یہ ایک دلچسپ بات ہے کہ یونینوں کے رجسٹریشن سے متعلق بعض شقوں کی نکتہ چینی کرنے سے قطع نظر نہرو نے بھی اس بمبئی ایکٹ کو "...... بہ حیثیت مجموعی ...... ایک اچھا ایکٹ" قرار دیا تھا۔ (حوالہ: Markovits Page-218)، جب کہ کانگریس کے بائیں نظریات والے صدر، سبھاش

چندر بوس نے نجی طور پر پٹیل سے احتجاج تو کیا لیکن اس بابت اعلانیہ کچھ کہنے سے انکار کر دیا تھا۔(مکتوب بنام نہرو 29 مارچ 1939)۔

کانگریس اور کسان

کسانوں کی پارٹی ہونے کا دعوا رکھنے کے ناطے کانگریس زرعی اصلاحات کے اقدامات کی پابند تھی۔ چنانچہ شرح سود کو جامد کر کے قرضوں کے بوجھ کو کم کرنے کی کوشش کی گئی، اودھ کے باقاعدہ لگان داروں کا درجہ بڑھا کر انھیں موروثی قبضے اور جوت داری کی حیثیت دی گئی، یو پی میں لگان میں کسی قدر کمی کی گئی اور بہار میں کساد بازاری کے زمانے میں کاشت کاروں کو جن زمینوں سے بے دخل کر دیا گیا تھا، وہ انھیں بحال کر دی گئی تھیں۔ اسی طرح رعیت واڑی علاقے کے زمینداروں کے کھوٹی ذیلی لگان داروں کو بمبئی میں کچھ حقوق دیدیئے گئے بمبئی میں چراہ گاہ محصول کے خاتمے اور مدراس میں اس محصول میں کمی کے ذریعے جنگل ستیہ گرہ کے مطالبوں کو جزوی طور پر پورا کیا گیا۔ تاہم Coupland کے خیال میں کانگریس کی زرعی قانون سازی کی سب سے نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ "......زمینداروں کے تئیں اس کا سلوک نا قابل برداشت حد تک سخت نہیں تھا......اس سلسلے میں کانگریس کی پالیسی کو قدامت پرستانہ کہا جاسکتا ہے"کوپ لینڈ نے اس سلسلے میں جن دو تجاویز کو انتہا پسندانہ بتایا ہے، وہ مدراس میں پرکاسم کمیٹی کی ان سفارشات سے تعلق رکھتی ہیں جن میں رعیت واڑی کسانوں کو ملکیت کا حق دینے اور زمینداری علاقوں میں لگان میں تخفیف کر کے 1802 کی سطح پر لے آنے کی تجویز پیش کی گئی تھی مگر ان سفارشات کو ترک کر دیا گیا تھا۔جب کہ اڑیسہ کے ایک ایکٹ کے ذریعے زمینداری لگان کا تعین متصل رعیت واڑی علاقے کے لگان سے 12.5 فیصد زیادہ کیا گیا تھا، جسے گورنر نے نامنظور کر دیا تھا اور کانگریس نے اس پر کوئی رد عمل ظاہر نہیں کیا تھا۔ اس سلسلے میں کانگریس نے جو قانون سازی کی اس میں فیض پور اجلاس کی اعتدال پسندانہ تجویزوں کو بھی شامل نہیں کیا گیا اور یو پی نیز بہار کی صوبائی کانگریس کمیٹیوں نے بالترتیب 1936 اور 1937 میں زمینداری کے خاتمے کے سلسلے میں جو قرار دادیں منظور کی تھیں انھیں بھی بھلا دیا گیا تھا، کیونکہ اب کانگریس ہی برسر اقتدار تھی۔ ستمبر 1935 میں زمینداروں کی 'سول نافرمانی' کے خدشے کے پیش نظر بہار کی کانگریسی وزارت نے اپنے لگان داری بل میں کافی کتر بیونت کر ڈالی تھی اور تین ماہ بعد آزاد اور راجندر پرساد نے پٹنہ میں زمینداروں کے ساتھ خفیہ گفت و شنید کی تھی۔ بعد میں زمینداروں کی ایک کانفرنس میں ایک مندوب نے بہار کی وزارت کی ستائش کرتے ہوئے اسے "بہت ہی معقول" بتایا تھا، کیونکہ "بہار میں زمینداروں نے کچھ ایسی رعایتیں حاصل کر لی تھیں جو کسی دوسری حکومت کے لیے منظور کرنا ممکن نہ ہوتا"۔(حوالہ: W. Hauser The

-(Bihar Provincial Kisan Sabba, Cbiicago 1961

اس معاملے میں کانگریسی اور غیر کانگریسی صوبوں میں کوئی فرق نہیں تھا۔ فضل الحق وزارت نے لگان اور شرح سود میں اضافے پر روک لگادی تھی، مگر زمینداری کے خاتمے کا معاملہ Floud کمیشن پر چھوڑ دیا اور فلاوڈ کمیشن نے زمینداری کو معاوضے کی ادائیگی کے ساتھ سرکاری تحویل میں لے لینے کی جو سفارش 1940 میں کی تھی اس پر حصول آزادی کے بعد ہی عمل ہو سکا تھا۔ اسی طرح پنجاب میں یونینسٹ پارٹی نے پنجاب کے 1900 کے لینڈ ایکٹ پر سختی سے عمل در آمد کرنے کی کوشش کی جسے ہندو مہا سبھا کے لیڈروں نے اور اعلا کمان کی دخل اندازی سے پہلے تک خود کانگریسی لیڈروں نے 'کالا بل' قرار دے کر مخالفت کی تھی۔

1937-38 کے دوران جو تھوڑی بہت زرعی اصلاحات عمل میں لائی گئیں ان کے پیچھے ایک زبردست کسان تحریک کا دباؤ تھا۔ 1938 میں کسان سبھا کی رکنیت پانچ لاکھ سے بھی تجاوز کر گئی تھی، جب کہ صرف بہار میں یہ رکنیت 2,50,000 اور پنجاب میں 73,000 تھی۔ یوپی میں یہ تعداد 60,000، آندھرا میں 53,000 اور بنگال میں 34,000 تک پہونچ گئی تھی۔ کسان مارچ ایک معمول بن چکے تھے۔ مثال کے طور پر بہار کے کسان تو مارچ کرتے ہوئے بہار اسمبلی تک جا پہونچے تھے اور تھوڑے سے وقت کے لیے نشستوں پر قبضہ بھی کر لیا تھا، جب کہ کانگریسی وزارت کے تحت اسمبلی کا پہلا اجلاس چل رہا تھا۔ اس واقعہ سے دہشت زدہ ہو کر برلا نے یہ کہا تھا کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ لوگ آزادی اور بد نظمی کے درمیان فرق قائم نہیں کر پار ہے ہیں۔ (In the Shadow of the Mahatma P. 228)۔ اس کے علاوہ متعدد مقامی نوعیت کی تحریکیں اور جدوجہد بھی جاری رہیں تھی۔ مثلاً بنگال کے ضلع بردوان میں نہری پانی کی شرحوں کے خلاف تحریک (1937)، 1937-38 میں مشرقی بنگال کے ضلع میمن سنگھ کے گارو ہلز میں مونی سنگھ کے پرچم تلے ہاجونگ (Hajong) قبائلیوں کی تحریک، جس کے نتیجے میں پیداوار لگان (ٹنکا) فصل کے ½ سے گھٹا کر 1/6 کر دیا گیا تھا؛ مونگیر (بہار) میں بڑھیا تال کی تحریک جس میں باکاشت زمینوں کی بحالی کا مطالبہ کیا گیا تھا اور یہ مطالبہ کریانند شرما کی قیادت میں 1936 سے 1939 تک جاری رہا تھا۔ یہ شرما بعد میں ایک نمایاں کمیونسٹ لیڈر کی شکل میں ابھرے تھے؛ 1938-39 میں آندھرا کے ضلع کرشنا میں منا گلا اور کالی پٹنم میں زمینداری مخالف تحریک: لائل پور (پنجاب) اور سکھر (سندھ) میں پانی محصول کے خلاف تحریک: 1938-39 کے ہی دوران امرت سر اور لاہور میں لگان میں اضافے کے خلاف تحریک نیز اڑیسہ کی ساحلی پٹی میں زوردار کسان تحریکیں شامل ہیں۔ 1938 کے موسم خزاں اور 1939 کے وسط کی درمیانی مدت میں ایسا معلوم ہوتا تھا کہ بہار میں محصولات کی وصولی کا سارا نظام ہی ٹھپ ہو کر رہ گیا تھا اور زمینداروں کی فصلوں کی حفاظت کے

لیے مسلح پولس دستے تعینات کرنے پڑتے تھے۔ ان دنوں بہاروں کے گاؤں سہج آنند کے ان شدت پسندانہ نعروں سے گونجتے رہتے تھے: لگان لیں گے کیسے!؛ ڈنڈا ہمارا زندہ باد۔ آل انڈیا کسان سبھا کے سامنے کے لیڈروں میں سوشلسٹ اور کمیونسٹ نمایاں اہمیت حاصل کرتے جارہے تھے؛ یہاں تک کہ کسان سبھا نے اکتوبر 1937 میں لال جھنڈے کو اپنے امتیازی نشان کے طور پر استعمال کرنا شروع کر دیا تھا۔ خود سہج آنند بھی بڑی تیزی سے اشتراکیت کی طرف راغب ہوتے جارہے تھے کیونکہ وہ کانگریسی وزارتوں کی کارکردگی سے مایوس ہو چکے تھے اور کانگریس سوشلسٹ پارٹی کے ساتھ رابطے سے بھی کچھ حاصل نہیں ہوا تھا۔ اگرچہ انھوں نے اپنی سنیاسی پوشاک کو برقرار رکھا تھا۔ انھوں نے 1937 میں یہ اعلان بھی کیا تھا کہ مذہبی پوشاکوں کے ذریعے ملک کا ایک طویل عرصہ سے استحصال کیا جاتا رہا ہے، وہ اب ان مذہبی پوشاکوں کا استعمال کسانوں کے کاز کے لیے کریں گے۔ (Hauser p 86)۔ مئی 1938 میں مشرقی بنگال میں مسلم اکثریتی علاقے کے قلب میں آل انڈیا کسان سبھا کی جو کامیاب ترین کانفرنس کومیلا میں منعقد ہوئی تھی اور جس کی مخالفت مسلم لیگ کے ساتھ ساتھ بعض سرکردہ کانگریسی لیڈروں نے بھی کی تھی۔ اس میں گاندھیائی "طبقاتی اشتراک" کی مذمت کی گئی تھی، "زرعی انقلاب" کو حتمی نصب العین قرار دیا گیا تھا اور سوامی سہج آنند کی طرف سے زمینداروں کی زیادتی کے مقابلے کے لیے "ڈنڈا" کے دفاع میں کی گئی تقریر کو توجہ سے سنایا گیا تھا۔

بے زمین مزدوروں کے ساتھ اتحاد کی بات کرنے کی باوجود بھی کسان سبھا بنیادی طور پر چھوٹے اور بڑے کسانوں کی ہی نمائندگی کرتی تھی۔ اس کے لیڈروں میں، یہاں تک کہ بہار کی اکائی کے عام ممبروں میں بھی ہریجنوں اور قبائلیوں کی بجائے بھومی ہار ہی نمایاں تھے۔ فلاوڈ کمیشن کو بنگال صوبائی کسان سبھا کی عرضداشت میں ساہوکاری اور زمینداری کے خاتمے پر دیا گیا تھا اور برگ داروں (بٹائی داروں) کے لیے کوئی مطالبہ شامل نہیں کیا گیا تھا۔ آندھرا میں ابتدائی کسان سبھا (بلکہ کمیونسٹوں) کی اصل بنیاد کرشنا گوداور کے طاس میں آباد خوشحال کما (Kamma) کسانوں میں ہی تھی، جب کہ پنجاب میں کسان تحریکوں کا سارا زور لگان میں اضافے اور آب پاشی محصول کے امور پر ہی مرکوز رہا تھا۔

کسان وزیروں اور لیڈروں نے کسان سبھا کی تشدد پسندی کے تئیں کافی معاندانہ رویہ اپنایا۔ چمپارن، سارن اور مونگیر کی ضلع کانگریس کمیٹیوں نے 1937 کے اواخر میں سہج آنند کے جلسوں میں کانگریسیوں کی شرکت پر پابندی لگادی تھی، بہار، یوپی، اڑیسہ اور مدراس کی کانگریسی حکومتیں پولس دستوں اور دفعہ 144 کا بے محابا استعمال کرتی تھیں، سہج آنند کے ڈنڈے کا مطلب تشدد کی تبلیغ لیا جاتا تھا اور آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے ستمبر 1938 میں "طبقاتی جنگ" کی مذمت کا اعلان

بھی دراصل کسان سبھا کی احتجاجی سرگرمیوں کے ہی حوالے سے کیا تھا۔ یہ سب کچھ اس وقت ہوا جب پہلے نہرو اور پھر بوس کانگریس کی صدارت پر باقاعدہ فائز تھے۔ کوپ لینڈ کا کہنا ہے کہ زرعی کشیدگیاں پڑوس کے بہار کے مقابلے میں یوپی میں کہیں زیادہ تھیں اور اس کی ایک وجہ، یہ تھی کہ "پنڈت نہرو نے لگان کی ادائیگی کے معاملے میں وزارت کی قابل قدر تائید اور مدد کی تھی۔" (صفحہ 127)۔ 23/اپریل 1938 کو نہرو نے الہ آباد کے کسانوں کو کانگریسی وزارت کے کاموں میں خلل نہ ڈالنے کا مشورہ دیا تھا۔ کانگریس کے صدر سبھاش بوس نے بھی ستمبر 1938 کی قرارداد (جو کہ بھولا بھائی ڈیسائی نے پیش کی تھی اور گاندھی نے جس کی زوردار تائید کی تھی) پر کوئی اعتراض نہیں کیا تھا، حالانکہ وہ اگلے ہی سال گاندھی سے الگ ہو گئے تھے۔ مگر گاندھی سے ان کی یہ لڑائی کانگریس کی صدارت کے لیے دوبارہ انتخاب کے معاملے پر ہوئی تھی۔

ریاستوں میں عوامی تحریک

1937 اور 1939 کی درمیانی مدت میں قومی تحریک کی سب سے اہم پیش قدمی رجواڑوں میں ہوئی: یہ رجواڑے شخصی حکمرانی اور جاگیردارانہ استحصال کی علامت بن کر رہ گئے تھے جسے برطانوی وفاق کے منصوبوں نے ہندوستان کو منقسم اور غلام بنائے رکھنے کے لیے سامراج واد کی کوششوں کی تائید و مدد کے طور پر اجاگر کر دیا تھا۔ قومی تحریک کے دوسرے مرحلوں کی ہی طرح ان رجواڑوں میں اس استحصال کے خلاف جدوجہد کی ابتداء بھی سرکردہ لیڈروں یا تنظیموں کی بجائے سماج کے نچلے طبقوں سے ہی ہوئی تھی۔ آل انڈیا اسٹیٹس پیپلز کانفرنس اپنے سکریٹری بلونت رائے مہتہ کی قیادت میں کافی فعال ہو گئی تھی، مگر اس کی سرگرمیاں متوسط طبقے کے سیاست دانوں کی گاہے بہ گاہے ملنگوں تک ہی مرکوز رہی تھیں۔ ان سیاست دانوں کا سارا سروکار محض شہری حقوق اور جواب دہ حکومت کا مطالبے سے ہی تھا۔ تاہم یہ لوگ کبھی کبھی کسانوں یا قبائلیوں کے مسائل بھی اٹھایا کرتے تھے۔ اس کانفرنس نے ریاستوں کے الحاق کا بھی کبھی مطالبہ نہیں کیا، اور 1939 کے لدھیانہ اجلاس میں، (جس کی صدارت نہرو نے کی تھی) صرف یہ تجویز رکھی تھی کہ چھوٹی چھوٹی اور ناقابل عمل ریاستوں کو پڑوس کے صوبوں میں ضم کر دیا جائے۔ کانگریس کے دائیں بازو نے عدم مداخلت کی پرانی پالیسی پر قائم رہنے کی کوشش کی اور شروع میں گاندھی نے بھی اس سلسلے میں غیر معمولی انتہاپسندی کا مظاہرہ کیا، اور آل انڈیا کانگریس کمیٹی کی اکتوبر 1937 کی اس قرارداد پر کھلم کھلا اپنی ناراضگی ظاہر کی جس کے ذریعے "ریاستوں اور برطانوی ہند کے لوگوں سے میسور کی عوامی جدوجہد کی مکمل تائید اور حوصلہ افزائی" کرنے کی اپیل کی گئی تھی۔ بہر حال پہلی بار ہری پورہ اجلاس (فروری 1938) میں پاس کی گئی مصالحتی قرارداد میں یہ کہا گیا تھا کہ پورن

سوراج کے تصور کا اطلاق برطانوی ہندہی کی طرح ریاستوں پر بھی ہوتا ہے مگر ساتھ میں اس بات پر اصرار بھی کیا گیا کہ "فی الوقت" کانگریس ریاستی عوام کی تحریکوں کی "محض اخلاقی تائید کرے گی" اور یہ کہ ریاستوں میں یہ عوامی تحریکیں کانگریس کے نام پر نہیں چلائی جانی چاہیں۔ چند ماہ بعد گاندھی نے یہ اشارہ دیا کہ اگر ریاستی حکمراں اپنے عوام کے لیے شہری آزادیوں اور آزاد عدالتوں کو منظور کرلیں اور اپنا صرف خاص کم کردیں تو یہ بات ان کے لیے باعث اطمینان ہوگی، گویا جواب دہ حکومت کا کوئی مطالبہ نہیں کیا گیا، الحاق کی بات تو بہت دور کی تھی۔ (آر ایل ہانڈا، ہسٹری آف فریڈم اسٹرگل ان پرنسلی اسٹیٹس نئی دہلی، 1968، صفحہ-116)۔

1939 کے اوائل میں گاندھی نے تقریباً تمام ریاستوں میں عوامی تحریکوں کی تیز رفتار پیش قدمی کے سلسلے میں پہلی بار ایک دیسی ریاست میں باپند عوامی جدوجہد کے اپنے طریقوں کو بروئے کار لانے کا فیصلہ کیا۔ انھوں نے اپنے ایک قریبی معتمد اور بڑے تاجر جمنالال بجاج کو جے پور میں ایک ستیہ گرہ کی قیادت کرنے کی اجازت دیدی اور دوسری طرف ولبھ بھائی پٹیل کے ساتھ راجکوٹ کی اس تحریک میں دخل دینا شروع کردیا جسے یو۔ این۔ دھیبر کی قیادت میں مقامی پرجا پریشد نے شروع کیا تھا۔ راجکوٹ کے انتہائی ناپسندیدہ دیوان ویراوالا نے ایسی بہت سی اجارہ داریاں تھوپ رکھی تھیں جن سے مقامی بیوپاری برہم تھے۔ اس کے علاوہ دیوان نے منتخبہ مشاورتی کونسل کا جلسہ بلانا بھی بند کر رکھا تھا، جب کہ ریاست کے مالیہ کا تقریباً نصف حصہ حکمراں کے صرف خاص کی نذر ہو جاتا تھا۔ گاندھی کے ذریعے راجکوٹ کا انتخاب بہت اہمیت رکھتا ہے۔ یہ ایک ایسی چھوٹی سی ریاست تھی جو کہ گاندھی کے مضبوط مرکز گجرات سے گھری ہوئی تھی جس کی تقریباً نصف آبادی راجدھانی میں ہی رہتی تھی، اس لیے ریاست میں ایسی کسی زرعی انتہاپسندی کا کوئی خطرہ نہیں تھا جو پُرامن ستیہ گرہ کو اپنے اندر نگل جاتا۔ کستوربا گاندھی اور منی بہن پٹیل نے فروری 1939 میں گرفتاری دی اور خود گاندھی نے راج کوٹ پہونچ کر 3/مارچ سے برت شروع کردیا، جب کہ کانگریس کا تری پوری اجلاس شروع ہی ہونے والا تھا، جس میں بوس کے دوبارہ انتخاب کے ذریعے گاندھی کی قیادت کے لیے زبردست چیلنج پیدا ہو گیا تھا۔ بہر حال راج کوٹ میں گاندھی کی دخل اندازی ناکام ثابت ہوئی کیونکہ انگریزوں نے ویراوالا کو بھڑکا کر پیش کی گئی رعایتوں کو واپس لے لینے اور مجوزہ اصلاحات کمیٹی میں مزید نشستوں کے لیے مسلمانوں اور اچھوتوں کے مطالبے کی عیاری کے ساتھ حوصلہ افزائی کے لیے تیار کرلیا تھا۔ گاندھی نے یہ اعلان کرتے ہوئے کہ ان کا برت بھی دباؤ آمیز تھا اور اس لحاظ سے تشدد سے مکمل طور پر عاری بھی نہیں تھا، خود کو مئی 1939 میں راج کوٹ کے معاملے سے الگ کرلیا تھا۔

دریں اثناء دوسرے بہت سے رجواڑوں میں بھی اس سے بھی کہیں زیادہ پُر اثر اور اہم

تحریکیں زور پکڑ چکی تھیں۔ ان رجواڑوں میں اڑیسہ کی ریاستیں، حیدر آباد اور ٹراونکور نیز راجپوتانہ کے کچھ حصے اور پنجاب میں پٹیالہ، کالسیا، کپور تھلہ، اور سر مور قابل ذکر ہیں۔

گاندھیائی کنٹرول میسور میں پوری طرح کامیاب رہا، جہاں کے ٹی بھاشیم کی اسٹیٹ کانگریس نے، جو کہ شہری براہمن پیشہ ور گروپوں پر مبنی تھی، دیہی غیر براہمن زمینداروں کی پیوپلز فیڈریشن میں ضم ہو کر اپنا تعاون پیش کیا۔ کانگریس کو قانونی حیثیت دینے اور جواب دہ حکومت کے لیے احتجاج کا پہلا دور اکتوبر 1937 سے شروع ہوا جس کا نتیجہ 11/اپریل 1938 کو ضلع کولار کے وِدور سوا تھا گاؤں میں خون کی ہولی کی شکل میں سامنے آیا جہاں 10,000 کی ایک بھیڑ پر پولس فائرنگ میں 30 لوگ مارے گئے تھے۔ اگلے مہینے پٹیل نے دیوان مرزا اسماعیل کے ساتھ ایک معاہدہ کیا جس کی رو سے کانگریس کو قانونی حیثیت حاصل ہو گئی لیکن اہم دستوری اصلاحات پر عمل در آمد کے وعدے پورے نہ کرنے کی وجہ سے ستمبر 1939 سے سول نافرمانی کا دوسرا دور شروع ہو گیا۔ پابند عوامی تحریک کی کانگریسی قیادت نے کرناٹک خطے میں کانگریس کی ایک مضبوط بنیاد قائم کر لی تھی جو کہ جنوبی ہند کے لحاظ سے ایک غیر معمولی بات تھی، جس کا اندازہ 1947 کے بعد کی سیاست سے بھی کیا جا سکتا ہے۔

اڑیسہ کی دور دراز کی پس ماندہ ریاستوں میں جبریہ مزدوری، جنگلاتی پیداوار پر محصول، تقریبات کے موقع پر 'نذرانے' کے نام پر جبریہ وصولی یا لگان داری حقوق جیسے امور کو سیاسی اصلاح کے مطالبوں سے زیادہ نہیں تو برابر کی اہمیت یقیناً حاصل تھی۔ سی ایس پی کے لیڈر نبا کرشنا چودھری نے ڈھینکنال علاقے میں ایک ستیہ گرہ کی قیادت کی، ٹیلکری، نیا گڑھ، تلچیر اور رن پور میں زور دار تحریکیں شروع ہوئیں جن کے دوران پُر تشدد واقعات بھی ہوئے جن میں قبائلیوں نے ریاستی حکمرانوں کی مسلح طاقت کا جواب تیر کمان سے دیا۔ ہزاروں لوگ نقل وطن کر کے کانگریسی حکومت والے اڑیسہ کے انگل اور کوسالہ علاقوں میں کیمپوں میں آ گئے اور رن پور میں انگریز پولیٹیکل ایجنٹ، میجر بازل گیٹ کو سنگسار کر دیا گیا (5/جنوری 1939) کیونکہ اس نے شاہی محل کے سامنے جمع ایک بھیڑ پر اندھادھند فائرنگ کی تھی۔ گاندھی نے ڈھینکنال اور تلچیر میں چند علامتی قسم کی سیاسی اصلاحات کے بدلے میں اڑیسہ کی تحریکوں کو ختم کرا دینے کی بھرپور کوشش کی۔ ان کی یہ کوشش اڑیسہ کے گاندھیائی پیروکاروں نیز سوشلسٹوں اور کیونسٹوں کے مابین ایک اہم تنازعے کی شکل اختیار کر گئی تھی۔ دونوں آخر الذکر گروپ اڑیسہ میں کسان سبھا کی رہنمائی کر رہے تھے۔

ہندوستان کی سب سے بڑی ریاست (راجواڑے) حیدر آباد میں 90 فی صد سرکاری ملازمتوں پر ایک چھوٹے سے اعلا مسلم طبقے کا قبضہ تھا نیز 50 فی صد تلگو، 25 فی صد مراٹھی اور 11 فی صد کنڑ بولی والی اس ریاست میں اردو واحد سرکاری زبان اور ذریعۂ تعلیم تھی۔ ریاست میں بنیادی

نوعیت کے شہری اور سیاسی حقوق کا بھی فقدان تھا؛ ویٹی یا جبریہ مزدوری اور لازمی غیر نقد ادائگی جیسے ظالمانہ استحصال کا بول بالا تھا۔ صورت حال تلنگانہ خطے میں اور بھی ناگفتہ بہ تھی۔ شروع شروع میں عوامی بیداری، متوسط طبقوں کی زبان کی بنیاد پر ثقافتی تنظیموں کی شکل میں سامنے آئی (تلنگانہ میں آندھرا مہا سبھا اور مراٹھواڑہ میں مہاراشٹر پریشد) اور دبے الفاظ میں سیاسی اصلاحات کی درخواست کی جانے لگی۔ کانگریس کی عدم مداخلت کی پالیسی کے نتیجے میں آریہ سماج اور ہندو مہا سبھا جیسی فرقہ پرست ہندو تنظیموں کو نظام اور اتحاد المسلمین کے جبر و ظلم کے خلاف تحریک چلانے کا موقع مل گیا جب کہ یہی ہندو مہا سبھا ہندو حکمرانوں والی ریاستوں میں جواب دہ حکومت کے نام پر کانگریس کی دخل اندازی (ناگ پور اجلاس، دسمبر 1938) کی مذمت کر رہی تھی۔ آریہ سماجی لیڈر پنڈت نریندر جی نے ہندوؤں کے لیے زیادہ سرکاری نوکریوں کا مطالبہ کرتے ہوئے حیدر آباد شہر نیز مراٹھواڑ علاقے (سی پی کے مراٹھی علاقوں، یعنی ہندو فرقہ پرستوں کے گڑھ سے متصل) میں ایک خالصۃً ہندو تحریک (ستیہ گرہ) شروع کی تھی۔ تقریباً اسی زمانے میں مراٹھواڑ کے سوامی رامانند تیرتھ اور گوبند داس شراف، تلنگانہ کے روی نارائن ریڈی اور حیدر آباد شہر کے سراج الحسن ترمذی جیسے چند مسلمانوں نے مل کر سیکولر بنیادوں پر ایک اسٹیٹ کانگریس قائم کی تھی۔ اس اسٹیٹ کانگریس نے قانونی حیثیت دیے جانے اور ایک جواب دہ حکومت کے مطالبوں کے ساتھ ایک متوازی اور موثر ستیہ گرہ شروع کر دیا جب کہ عثمانیہ یونیورسٹی کے طلباء میں ایک زبردست بندے ماترم تحریک شروع ہو گئی تھی۔ یہ وہ طلباء تھے جو اس ترانے پر نظام کے ذریعے پابندی عائد کیے جانے پر یونیورسٹی سے باہر آ گئے تھے۔ بہر حال گاندھی کے کہنے پر کانگریسی ستیہ گرہ دسمبر 1938 میں واپس لے لیا گیا تھا، کیونکہ فرقہ پرستوں کے ایجی ٹیشن کے ساتھ اس ستیہ گرہ کے خلط ملط ہو جانے کا خدشہ تھا۔ بعد میں رامانند تیرتھ نے یہ اعتراف کیا تھا کہ "ہم اس فیصلے کی معقولیت کو نہیں سمجھ سکے تھے" (میموائرس آف حیدر آباد فریڈم اسٹرگل، بمبئی 1967، صفحہ 107)۔ اس کے جلد ہی بعد آندھرا اور کروں کا سب سے اچھا گروپ جس نے اس ستیہ گرہ میں قائدانہ رول ادا کیا تھا" (ایضاً صفحہ 87) روی نارائن ریڈی کی قیادت میں کیمونسٹوں کے خیمے میں چلا گیا تھا ساحلی آندھرا میں 1939 میں کیمونسٹ پارٹی آف انڈیا نے نظام اسٹیٹ کمیٹی" کے نام سے ایک خفیہ گروپ بنایا تھا۔ کیمونسٹ، آندھرا مہا سبھا کے وسیع اثرات کو کام میں لاتے ہوئے بڑی تیز رفتاری سے تلنگانہ کے اندرونی علاقوں میں نفوذ کرتے چلے گئے تھے اور اس علاقے میں چند برسوں کے اندر ہی اپنی ایک مضبوط بنیاد قائم کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ اسی مضبوط بنیاد کی وجہ سے ہی ہندوستان کی اب تک کی سب سے بڑی کسان چھاپہ مار جنگ 1946 سے 1951 تک جاری رکھی جا سکی تھی۔

ٹراونکور اور کوچین میں، پاس کے مالابار کے ضلع ملایالی کی ہی طرح، قومی تحریک کو کیمونسٹ قیادت اور رہنمائی میں ہی فروغ حاصل ہوا تھا۔ اے۔ کے گوپالن نے اپنی خود نوشت میں یہ بتایا ہے کہ کس طرح 1930 کی دہائی کے وسط اور آخر میں کرشنا پلائی، ای۔ ایم ایس نمبودری پاد اور خود ان جیسے پارٹی کارکنوں نے کانگریس اسٹیٹ پارٹی قائم کی تھی اور پھر کانگریس کو کس طرح پہلی بار ایک حقیقی عوامی تنظیم میں تبدیل کر دیا تھا اور اس کے ساتھ ہی یہ لوگ کس طرح کیمونزم (اشتراکیت) کی طرف راغب ہوتے چلے گئے تھے۔ (ان دی کاز آف دی پیوپلز مدراس، 1937)۔ نمبودری پاد بالآخر کیرالہ پی سی سی کے سکریٹری بن گئے تھے۔ کیرالہ کانگریس پارٹی 1940 کی دہائی تک کیمونسٹوں کے ہی کنٹرول میں رہی تھی۔ 1938 میں ٹرانکور اسٹیٹ کانگریس نے دیوان سی۔ پی راما سوامی ایئر کی شخصی حکمرانی کے خلاف ایک زوردار ایجی ٹیشن شروع کیا۔ ظالمانہ اقدامات (دو ماہ کے اندر فائرنگ کے 12 واقعات کے بشمول) کے باوجود بھی طلباء بڑی تعداد میں ستیہ گرہ میں شامل ہو گئے اور کیرالہ کے بہت سے حصوں سے جتھوں نے ٹرانکور کی طرف کوچ کر دیا تھا۔ ایک جتھے کی قیادت اے۔ کے۔ گوپالن نے بھی کی تھی۔ اس طرح علاقائی۔ لسانی اتحاد کو زبردست بڑھاوا ملا تھا۔ اس سلسلے میں محنت کش طبقے کا رول بہت اثر آفریں تھا۔ الپّی کے ورکروں نے کرشنا پلائی کے جھنڈے تلے اکتوبر 1938 میں ہڑتال کر دی تھی۔ ان کا مطالبہ محض اجرت میں اضافے یا یونین کو تسلیم کیے جانے تک ہی محدود نہیں تھا بلکہ سیاسی قیدیوں کی رہائی اور عام رائے دہی پر مبنی جواب دہ حکومت کے قیام کے لیے بھی تھا۔ دیوان کو کانگریسی ستیہ گرہ کے خلاف ظالمانہ اقدامات روک دینے کے لیے مجبور کیا گیا تاکہ الپّی کے تشدد پسند ورکروں کو الگ تھلگ کیا جا سکے۔ دوسرے مقامات کی طرح ہی یہاں بھی گاندھی اور کانگریس اعلا کمان کا رول چند علامتی قسم کی رعایتوں کے حصول کے بعد ستیہ گرہ کو واپس لے لینے کی صلاح تک ہی محدود رہا تھا۔

کانگریس کے اندر بایاں گروپ

مزدور اور کسان تنظیم نیز ریاستوں کے اندر ستیہ گرہ اور ایجی ٹیشن کی لہر ایسے معاملات کو لے کر تھی جو کانگریس کے اندر وزارتوں اور اعلا کمان کی اکثریت کی بڑھتی ہوئی قدامت پرستی کے چیلنج کے لیے ایک وسیع تر بائیں متبادل کی بنیاد بن سکتے تھے۔ اس زمانے کے بائیں گروپ میں سوشلسٹ لیڈر، ایم این رائے کے پیروکار (جو کہ ٹریڈ یونینوں میں اب بھی اہم حیثیت رکھتے ہیں) اور خلاف قانون قرار دی گئی کیمونسٹ پارٹی آف انڈیا شامل تھی جو کہ اس زمانے میں سی ایس پی کے وسیلے سے کام کر رہی تھی اور جس نے کیرالہ میں کرشنا پلائی، نمبودری پاد اور گوپالن جیسے متعدد عوامی مقبولیت رکھنے والے لیڈر فراہم کیے تھے۔ ان کے علاوہ تامل ناڈو میں جیوانندن، آندھرا میں سندریا

اور پنجاب میں موہن سنگھ جوش جیسے عوامی لیڈر کمیونسٹ پارٹی سے ہی تعلق رکھتے تھے۔اس گروپ کے لیڈروں کو اس زمانے کے دو اہم ترین کانگریسی صدر نہرو اور بوس کی غیر یقینی اور زبانی تائید بھی حاصل تھی۔اس تائید کو آج بھی قدر کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔کچھ اندرونی تناؤ بھی تھا، خاص طور پر جے۔ پرکاش نارائن، مینو مسانی اور این۔ جی رنگا جیسے سوشلسٹ لیڈر کمیونسٹ پارٹی کے تیزی سے بڑھتے ہوئے اثر و نفوذ کو خطرے کی نظر سے دیکھ رہے تھے۔ان لیڈروں کا یہ خدشہ غلط بھی نہیں تھا، کیونکہ 40-1939 میں ہی کمیونسٹ پارٹی پورے کیرالہ یونٹ نیز تامل ناڈو اور آندھرا کے بہت سارے ممبروں کے ساتھ الگ ہو گئی تھی۔وسیع تر اتحاد کی بات 1939 تک، اور بعض صورتوں میں 1942 تک جاری رہی تھی۔بائیں گروپ کے تمام حلقوں کو اس بات سے اتفاق تھا کہ کانگریس کے اندر رہنا حق بجانب تھا، اور در حقیقت بعض سودے بازیوں کے باوجود بھی یہ معلوم ہوتا تھا کہ اس سے بہت فائدہ ہوگا۔ٹریڈ یونین کے میدان اور کسان سبھا میں بائیں گروپ کا پورا غلبہ قائم ہو جانے کے علاوہ بھی اب بنگال جیسے علاقوں کے طلباء بھی کمیونسٹ طرز فکر کی طرف راغب ہونے لگے تھے (ان علاقوں میں دہشت پسندی کا خاتمہ ہو چکا تھا اور گاندھی ازم کا کوئی خاص اثر نہیں تھا)۔ کمیونسٹوں کی قیادت والی آل انڈیا اسٹوڈنٹس فیڈریشن کی بنگال اکائی 38-1937 کے دوران قیدیوں کی رہائی کے لیے چلائی گئی تحریک کے طفیل میں کلکتہ سے لے کر مضافات کے کالجوں اور اسکولوں تک پھیل گئی تھی۔اس کے بعد نتیجہ اسٹوڈنٹس یونینوں کے لیے تحریکیں، سامراج مخالف پروپیگنڈے کی حامل تعلیم بالغان مہم، اور اسپین نیز چین کے ساتھ اظہار یگانگت کے مظاہرے کے نتیجے میں بھی کمیونسٹ نظریات کی توسیع ہوئی۔اس طرح طالب علموں کی انتہا پسندی کی ایک ایسی وضع تیار ہو رہی تھی جو ایک نسل تک جاری رہی تھی (جی۔ چٹوپادھیائے، سوادھینتا سنگرام، بنگلر چھاتر سماج، کلکتہ، 1980)۔

پورے بائیں گروپ نے کانگریسی قیادت کو ٹریڈ یونینوں اور کسان سبھاؤں کے تئیں اور زیادہ ہمدردانہ رویہ اپنانے اور رجواڑوں میں عوامی تحریکوں کی تائید کے لیے تیار کرنے کی کوشش کی جس میں کوئی نمایاں کامیابی نہیں ملی۔ جہاں کانگریس برطانوی وفاق کے اس منصوبے کی وقتاً فوقتاً مخالفت کرتی رہتی تھی جو وائسرائے کے لیے مخصوص اختیارات نیز ایک ایسی مرکزی دستور ساز اسمبلی پر مبنی تھا جس میں ریاستوں کے نامزد کردہ ممبران بھی شامل ہوں، مگر اس نے اس سلسلے میں ریاستو میں عوامی تحریک چلانے کے لیے بائیں گروپ کے مطالبے کو مسترد کر دیا تھا۔ کیونکہ اس وقت کانگریس صوبائی وزارتوں پر ہی قانع معلوم ہوتی تھی۔

نہرو نے اپنے نجی مراسلوں میں کانگریسی وزارتوں کے قدامت پرستانہ طریقہ کار کے بارے میں بار بار اپنی تشویش کا اظہار کیا، بلکہ انھیں "انقلاب مخالف" اور "لکیر کی فقیر" بھی بتایا۔ (نہرو بنام

جی۔بی پنت، 25/نومبر 1937ء اے بنچ آف اولڈ لیٹرس، صفحہ 263) لیکن عمل، الفاظ (خاص طور پر شک وشبہے کے نجی اظہار) سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے اور یہاں ہم بار بار یہ دیکھ چکے ہیں کہ نہرو اور بوس یعنی دونوں ہی کانگریس کو قدامت پرستی کی طرف جانے سے نہیں روک پائے تھے۔

بہر حال جہاں تک بین الاقوامی امور کا تعلق ہے، تو کانگریس کے ترقی پسند (بائیں) گروپ کی ہی چلی اور اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ اس سلسلے میں ترقی پسندوں کو نہرو کی مکمل تائید اور رہنمائی حاصل رہی تھی۔ جواہر لال دراصل ملک میں موثر ترقی پسندانہ اقدام کی کمی کو اس بین الاقوامی روّیہ سے پورا کرنا چاہتے تھے۔ "میں خود کو بے کل اور ناموزوں محسوس کرتا آیا ہوں۔ یہ بھی ایک وجہ تھی...... میرے یوروپ جانے کی" (مکتوب بنام گاندھی، 28/اپریل 1938ء، اے بنچ آف اولڈ لیٹرس، صفحہ 284)۔ جنگ کے بادل منڈلانے کے تعلق سے قوم پرستوں اور بائیں بازو کے لیڈروں کا اس بابت پورا اتفاق تھا کہ اس مرتبہ برطانیہ کی خارجہ پالیسی کی غیر مشروط تائید کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا جس کی رو سے 1930 کی دہائی کے آخر میں چیمبرلن نے ابی سینیا، اسپین، آسٹریا، چیکوسلواکیہ اور چین میں فاشسٹ جارحیت کو سراہا تھا۔ پنجاب میں سوشلسٹوں اور کمیونسٹوں نے 1938 میں ہی یہ نعرہ لگانا شروع کر دیا تھا۔ "نہ ایک پائی، نہ ایک بھائی"۔ یہ دوسری بات ہے کہ فوجی بھرتی اس نعرے سے متاثر نہیں ہوئی تھی اور اس کی وجہ یہ تھی کہ پنجاب کے کسان طبقے کے لیے فوج کی تنخواہ اور پنشن خوش حالی کی ایک بہت بڑی بنیاد تھی۔ انگریز جارحیت کو واضح طور پر نظر انداز کر رہے تھے اور سوویت یونین کے خلاف جرمنی کو مقابلے پر لانے کی کوشش کر رہے تھے، اس لیے برطانیہ مخالف قوم پرستی اور فاشزم مخالف بین الاقوامیت میں کوئی تضاد نہیں تھا۔ کانگریس نے ایک آواز ہو کر فاشسٹ جارحیت کی بار بار مذمت کی اور میڈرڈ کا دفاع کر رہی انٹرنیشنل بریگیڈ کے ساتھ اظہار یک جہتی کی غرض سے نہرو 1938 میں اسپین گئے اور مدد کے لیے CHU TEH کی اپیل پر کانگریس نے ایک طبی مشن چین بھیجا تھا۔ اس مشن کے ایک رکن ڈاکٹر کوٹنیس (Kotnis) ہند۔ چین دوستی نیز سامراج کے مخالفوں کے ساتھ اظہار یک جہتی کرتے ہوئے شہید ہو گئے تھے وہ وہاں کمیونسٹ ایٹھ روٹ آرمی چھاپہ ماروں کے ساتھ کام کر رہے تھے۔ رابندر ناتھ نے بھی ری پبلکن اسپین کی مدد کے لیے اپیل کی اور چین میں جاپانی جارحیت کی بار بار مذمت کی۔ فاشزم اور جنگ کے بڑھتے ہوئے سائے کی وجہ سے رابندر ناتھ کی اس زمانے کی بعض نظموں کا انداز ہی بالکل بدل گیا تھا۔

تری پوری کا بحران

بہر حال بین الاقوامی امور پر اتفاق رائے، جو کہ اظہار یک جہتی سے کہیں زیادہ عملی اقدام کا

متقاضی تھا، گھریلو مسائل کے سلسلے میں اختیار کی جانے والی انتہاپسندی کا متبادل ثابت نہیں ہو سکتا تھا، اور یہاں معاملات تری پوری اجلاس کے موقع پر بحران کی سطح تک پہونچ گئے تھے جب بوس نے کانگریس کی دوبارہ صدارت کے لیے الیکشن لڑنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اگرچہ شروع میں اس کی تجویز سی ایس پی کے آٹھ لیڈروں (جن میں سبھی کے کیونسٹوں کے ساتھ گہرے روابط تھے) نے رکھی تھی، اور بوس نے اپنی امیدواری کو انگریزوں کو ایک معیادی الٹی میٹم کی شکل میں سوراج کے لیے "قومی مطالبے" سے جوڑنے کی کوشش کی تھی، مگر اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ قابل لحاظ حد تک یہ ایک ذاتی نوعیت کا ہی معاملہ تھا۔ ہری پورہ اجلاس کے بعد بوس نے جو ورکنگ کمیٹی بنائی تھی اس میں جواہر لال نہرو کے علاوہ ایک بھی ترقی پسند (Leftist) شامل نہیں کیا گیا تھا۔ اس کے علاوہ مزدوروں اور کسانوں کی شدت پسندی کے تئیں اعلان کمان اور کانگریسی وزارتوں کے بڑھتے ہوئے معاندانہ رویہ کی روک تھام کے لیے بھی بوس نے کچھ نہیں کیا تھا۔ ان باتوں کے باوجود بھی، سیتار میا کے ساتھ انتخابی ٹکراؤ میں پورا بایاں گروپ بوس کے ساتھ ہی رہا تھا۔ واضح رہے کہ مولانا آزاد کے مقابلے سے ہٹ جانے پر گاندھی نے سیتار میا کی امیدواری کا اعلان کر دیا تھا۔ سبھاش بوس 29/ جنوری 1939 کو 1377 کے مقابلے میں 1580 ووٹوں سے چن لئے گئے۔ انھیں بنگال اور پنجاب میں بھاری اکثریت سے تائید حاصل ہوئی تھی جب کہ کیرالہ، کرناٹک، تامل ناڈو، یوپی اور آسام میں وہ آگے رہے تھے۔ مہاراشٹر اور مہاکوشل (سی پی ہندوستانی) میں برابر کا مقابلہ رہا تھا جب کہ گجرات، بہار، اڑیسہ اور آندھرا نے سیتار میا کے ہی حق میں ووٹ دیا تھا۔

ایک تو کانگریس کے بائیں گروپ میں اتحاد کا فقدان تھا اور دوسرے گاندھی اور کانگریس کے دائیں گروپ (قدامت پسندوں) نے زیادہ چالاکی سے کام لیا جس کے نتیجے میں دائیں گروپ کی یہ ناکامی فتح میں تبدیل ہو گئی۔ گاندھی نے جلد ہی اسے اپنے ذاتی وقار کا معاملہ بناتے ہوئے یہ اعلان کر دیا کہ "یہ سیتار میا سے کہیں زیادہ ان کی اپنی شکست ہے" (31/ جنوری)۔ پرانی ورکنگ کمیٹی کے 15 میں سے 13 ممبروں نے یہ کہہ کر استعفیٰ دیدیا کہ سبھاش بوس نے ان کی اعلانیہ نکتہ چینی کی ہے۔ ان میں نہرو بھی شامل تھے، اگرچہ ان کے استعفیٰ کی وجہ اوروں سے مختلف تھی۔ کانگریس کے تری پوری اجلاس (8 تا 12/ مارچ) کے موقع پر بوس بیماری کی وجہ سے قطعی غیر فعال ہو گئے تھے اور گاندھی راج کوٹ میں برت کے بعد واپس لوٹ چکے تھے۔ گووند ولبھ پنت کی پیش کردہ اس قرارداد کے ذریعے کانگریس کی دائیں گروپ نے اپنا داؤ بنا لیا تھا، جس میں پرانی ورکنگ کمیٹی اور گذشتہ 20 سال سے جاری گاندھیائی پالیسیوں میں اعتماد کا اظہار کیا گیا تھا اور بوس سے "گاندھی جی کی خواہشات کے مطابق" نئی مجلس عاملہ تشکیل کرنے کے لیے کہا گیا تھا۔ سبجیکٹ کمیٹی میں یہ قرارداد 133 کے مقابلے میں 218 ووٹوں سے اور کھلے اجلاس میں بھاری تائید

سے منظور کر لی گئی تھی۔ اس قرارداد کے لیے نہرو کی تائید غیر متوقع نہیں تھی، کیونکہ گاندھی کے تئیں اپنی مکمل وفاداری کے علاوہ بھی بوس کے ساتھ ان کا معاملہ کبھی بھی خوشگوار نہیں رہا تھا۔ لیکن سوشلسٹوں، رائے کے پیروں کاروں اور کیونسٹوں (بنکم مکھرجی جیسے چند بنگالی ممبروں کو چھوڑ کر) نے بھی پنت کی پیش کردہ قرارداد کی مخالفت نہیں کی، اس لیے کہ یہ لوگ پارٹی کے اندر مکمل تقسیم سے بچنا چاہتے تھے۔ جے پرکاش نارائن نے "قومی مطالبے" کی قرارداد پیش کی تھی جس کی تائید نہرو اور کیونسٹ بھاردواج نے بھی کی تھی۔ اس قرارداد کی زبان کافی نرم کر کے بوس کی معیادی الٹی میٹم کی تجویز کو بھی حذف کر دیا گیا تھا اور صرف یہ نعرہ دیا گیا تھا کہ کانگریس کو مضبوط کر کے دستور ساز اسمبلی کے حصول کے لیے جدوجہد کی تیاریاں شروع کر دی جائیں۔

بہر حال بائیں بازو کے گروپ کے لیے یہ طے کرنا کافی مشکل ہو گیا تھا کہ وہ کس کا ساتھ دے۔ وجہ یہ تھی کہ بوس کا اب تک کا رکارڈ ایسا نہیں رہا تھا کہ یہ گروپ مکمل علیحدگی کا جوکھم اٹھاتے ہوئے ان پر بھروسہ کر سکتا۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ بائیں گروپ کے نقطہ نظر سے سب سے بنیادی غلطی یہ تھی کہ کانگریسی وزارتوں کی مزدور دشمن اور کسان دشمن پالیسیوں کی موثر مزاحمت نہ تو تری پوری اجلاس سے پہلے اور نہ ہی اس کے بعد کی گئی۔ یہ دراصل چوٹی کے کانگریسی لیڈروں کے ساتھ اتحاد کو ہر قیمت پر برقرار رکھنے کی خواہش کا ہی نتیجہ تھا۔ مثال کے طور پر کیونسٹ پارٹی کے جنرل سکریٹری پی۔ سی۔ جوشی نے پارٹی کے ترجمان 'نیشنل فرنٹ' کی اپریل 1939 کی اشاعت میں یہ لکھا تھا کہ ...... "آج سب سے بڑی طبقاتی جدوجہد ہماری قومی جدوجہد ہے، جس کا کانگریس سب سے اہم وسیلہ ہے۔ اور اس لیے کانگریس۔ کسان اتحاد کو برقرار رکھنا ہے"۔

بوس نے جو کہ پہلے ہی یہ کہہ چکے تھے کہ اگر وہ ملک کی سب سے بڑی شخصیت کا اعتماد حاصل نہ کر سکے تو ان کی یہ انتخابی کامیابی بے معنی رہے گی، ایک متفقہ ورکنگ کمیٹی تشکیل کرنے کی دو ماہ تک کوشش کی۔ ان کی کمزور پوزیشن، خاص طور پر بائیں گروپ کے اندر عدم اتحاد کے لحاظ سے، اس وقت کھل کر سامنے آگئی جب وہ 29/اپریل کو آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے اجلاس میں گاندھی کا یہ چیلنج قبول نہیں کر سکے کہ "آپ اپنی عاملہ کے انتخاب میں بالکل آزاد ہیں"۔ ان حالات میں بوس نے مستعفی ہو جانا ہی بہتر سمجھا۔ ان کی جگہ پر دائیں بازو کے پکے گاندھیائی راجندر پرساد کو صدر بنایا گیا۔ بوس نے 3 مئی کو اپنی نئی تنظیم فارورڈ بلاک کی تشکیل کا اعلان کیا۔ شروع میں ان کا خیال اس تنظیم کے ساتھ کانگریس کے اندر کام کرتے رہنے اور مختلف بائیں بازوؤں کو متحد کرنے کا تھا اور اسی مقصد سے فارورڈ بلاک نے جون 1939 میں ایک باقاعدہ کمیٹی بھی بنائی تھی۔ ان کی ان کوششوں کی کیونسٹوں نے تائید کی۔ ایم این رائے کے پیروکاروں اور سوشلسٹوں (جے پرکاش

نارائن وغیرہ) نے اوّلین ترجیح کانگریس کے اتحاد کو دی اور فارورڈ بلاک کی مسلسل نکتہ چینی کی۔ اس طرح فارورڈ بلاک پہلے ہی سے عدم اتحاد کے شکار بائیں گروپ کا ایک دوسرا الگ گروپ بن کر رہ گیا۔
اب سبھاش کو بنگال میں ایک ایسے علاقائی ہیرو کے طور پر بہت زیادہ مقبولیت حاصل ہو چکی تھی جس کے ساتھ صحیح برتاؤ نہیں کیا گیا ہو! اس کے علاوہ دوسرے علاقوں، خصوصاً بہار، پنجاب، بمبئی اور تامل ناڈو، میں بھی ان کا ذاتی اثر تھا۔ بہر حال کانگریس اعلا کمان نے کانگریس کے اندر ان کے اثر کو بالکل ختم کر دینے کا تہیہ کر رکھا تھا۔ اور جب بوس نے آل انڈیا کانگریس کمیٹی کی ایک حالیہ قرارداد (جو کہ پٹیل نے پیش کی تھی) کے خلاف، جس میں کانگریس کی صوبائی اکائیوں کی اجازت کے بغیر ہی کانگریسیوں کی سول نافرمانی پر پابندی لگانے کی بات کہی گئی تھی، 9/جولائی کو کل ہند احتجاج کا اعلان کیا تو ان کے خلاف فوراً تادیبی کارروائی کی گئی۔ 11/اگست کو آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے بوس کو بنگال کی صدارت سے ہٹا دیا اور انھیں تین سال تک کوئی بھی کانگریسی عہدہ نہ دینے کا بھی فیصلہ کیا گیا۔ بنگال کانگریس کے امور کی انجام دہی کے لیے ایک ایڈہاک کمیٹی بنائی گئی جس میں آزاد اور پی۔ سی۔ گھوش جیسے گاندھیائی لیڈروں کے علاوہ کلکتہ کے ان "پانچ بڑوں" میں سے دو (بی۔ سی رائے اور کرن شنکر رائے) شامل کیے گئے تھے جو کہ پہلے کبھی بوس کے مالی معاون رہ چکے تھے۔

بوس کو پوری صفائی کے ساتھ کانگریس سے الگ کر دیا گیا تھا۔ تاہم ہائی کمان کے نقطہ نظر سے بائیں گروپ سے مکمل انقطاع بھی دانش مندی کی بات نہ ہوتی۔ کانگریس وزارتوں کا تسلسل، اندرونی تناؤ اور پارٹی کی امیج کے لحاظ سے، 1939 کے اواخر میں ضرر رساں ثابت ہونے لگا تھا۔ ان کانگریسی وزارتوں کا سب سے بڑا المیہ یہ تھا کہ مزدور اور کسان طبقہ نیز خود پارٹی کے اندر بایاں گروپ کٹتا جا رہا تھا اور اس کے ساتھ ہی یہ وزارتیں زمینداروں اور کاروباری حلقوں کو بھی حقیقی معنوں میں خوش رکھنے میں ناکام ثابت ہو رہی تھیں۔ مثلاً کاروباری حلقے بمبئی شہری جائیداد ٹیکس جیسی باتوں سے سخت ناراض تھے۔ پٹیل نے جولائی 1939 میں یہ اشارہ دیا تھا کہ صوبوں کو انکم ٹیکس میں ان کا واجب حصہ نہ دیئے جانے کی صورت میں کانگریسی وزارتیں مستعفی بھی ہو سکتی ہیں۔ ستمبر میں جنگ شروع ہو جانے کے ساتھ یہ خطرہ بڑھ گیا تھا کہ کانگریسی وزارتوں کو جنگ کے خلاف مظاہرہ کرنے پر اپنی ہی پارٹی کے کارکنوں کے خلاف ہنگامی اختیارات کا استعمال کرنا پڑ سکتا ہے۔ اس طرح 29-30/اکتوبر کو کانگریسی وزارتوں کا استعفیٰ منطقی اعتبار سے قطعی درست اور ناگزیر ہو گیا تھا۔ یہ دوسری بات ہے کہ اس کے لیے موقع لنلتھگو کی احمقانہ ضد پسندی نے فراہم کیا تھا۔

1939-42: جنگ اور ہندوستان کی سیاست

پہلا مرحلہ

سرکار کی جوابی کارروائی

3/ستمبر 1939 کو وائسرائے نے صوبائی وزارتوں یا کسی ہندوستانی لیڈر کو اعتماد میں لیے بغیر ہی، جرمنی کے خلاف برطانیہ کے اعلان جنگ میں ہندوستان کو بھی ملوث کر لیا تھا۔ فاشسٹ جارحیت کے تئیں کانگریس کا مخالفانہ موقف برطانیہ کے موقف سے کہیں زیادہ واضح اور مستحکم تھا۔ اس کے باوجود بھی چند اقل ترین شرطوں--- آزاد ہندوستان کے سیاسی ڈھانچے کے تعین کے لیے ایک دستور ساز اسمبلی کی تشکیل کا وعدہ؛ مرکز میں جواب دہ حکومت جیسا کوئی فوری بندوبست، کی تکمیل پر جنگ کے امور میں مکمل تعاون کی متعدد پیش کش کو لنلتھگو نے نظر انداز کر دیا تھا۔ کانگریس کی یہ دلیل کافی حد تک حق بجانب تھی کہ اس جنگ کے سلسلے میں، جو کہ 1939 میں (بلکہ دسمبر 1941 تک جاری رہنے تک) ہندوستان سے بہت دور لڑی جا رہی تھی، ہندوستانی رائے عامہ کو اگر واقعی متحرک کرنا ہے، تو ان شرطوں کی تکمیل ضروری ہے، کیونکہ بصورت دیگر اتحادی ملکوں کا یہ پروپگنڈہ بالکل کھوکھلا معلوم ہوگا کہ وہ جمہوریت اور قوموں کے حق خود ارادیت کے حق میں اور جارحیت اور استبداد کے خلاف جنگ کر رہے ہیں۔ لنلتھگو کے 17/اکتوبر 1939 کے بیان میں محض غیر معین مستقبل بعید میں ہندوستان کو ڈومنی ان کا درجہ دینے کی پیش کش، جنگ کے خاتمے پر 1935 کے ایکٹ میں ردوبدل کے لیے (جمہوری طریقہ پر چنی گئی دستور ساز اسمبلی کی بجائے) متعدد فرقوں کے نمائندوں کے ساتھ صلاح مشورے؛ نیز وقتی طور پر ہندوستانی سیاست دانوں اور ریاستوں کے نمائندوں پر مشتمل (مگر ہر طرح کے عملی اختیار سے عاری) ایک مشاورتی گروپ کی تشکیل کے وعدوں کو محض دوہرا دیا گیا تھا، جب کہ وائسرائے اپنی نجی گفتگو میں "فی الحال کذب بیانی سے کام لینے" اور کانگریس کے پیچھے نہ بھاگنے" کی بات کر تا رہا تھا۔ (لنلتھگو بنام سکریٹری آف اسٹیٹ، 9/اور 13/فروری 1940)۔

لنلتھگو کا یہ رویہ دراصل اس عام برطانوی پالیسی کا ہی ایک حصہ تھا جس کا مقصد گوروں کے غلبے والی مرکزی حکومت اور افسر شاہی کے لیے اس مضبوط بنیاد کو پھر سے حاصل کرنے کے لیے جنگ سے فائدہ اٹھانا تھا جس پر 1937 یا اس سے بھی پہلے کانگریس کا قبضہ ہوتا گیا تھا۔ جنگ کے باقاعدہ اعلان سے پہلے ہی 1935 کے ایکٹ میں برطانوی پارلیمنٹ نے بڑی جلد بازی کے ساتھ ترمیم کرتے ہوئے صوبائی امور کے سلسلے میں نئی دہلی کی حکومت کو ایمرجنسی اختیارات دیدیے

تھے۔ جنگ کے باقاعدہ اعلان کے دن ہی ڈیفنس آف انڈیا آرڈی ننس نافذ کر دیا گیا جس کے ذریعے تمام شہری آزادیوں کو محدود کر دیا گیا تھا۔ حکومت نے مئی 1940 میں بڑی رازداری کے ساتھ انقلابی تحریکات آرڈی ننس کا مسودہ بھی تیار کیا تھا جس کا مقصد کانگریس کے کسی بھی اقدام سے پہلے ہی پہلی فرصت میں تدارکی کارروائی کرنا تھا۔ 1931 ہی کی طرح اب بھی برطانوی افسر شاہی کا ایک بااثر حلقہ اس حق میں تھا کہ ایک ایسے وقت میں جب کہ حکومت کو بے مہار اختیارات حاصل ہیں، کانگریس کو ٹکراؤ کے لیے اشتعال دلایا جائے اور پھر ہندوستان میں موجود برطانوی اور دوسری اتحادی فوجوں کو استعمال کیا جائے اور (1941 میں سوویت یونین پر نازی حملے کے بعد) کانگریس کی تحریک کو جاپان اور جرمنی کی معاون قرار دے کر کچل دیا جائے اور اس سلسلے میں دنیا بھر کے لبرل اور بائیں گروپوں کی ہمدردی بھی حاصل کی جائے۔

ونسٹن چرچل نے، جو کہ مغربی محاذ پر نازیوں کی بھاری پیش قدمی کے حالات میں مئی 1940 میں برطانیہ کی مخلوط قومی حکومت کے سربراہ بنائے گئے تھے، برطانوی ہند کی ان رجعت پسند پالیسیوں کی بھرپور تائید اور حوصلہ افزائی کی۔ نئے سکریٹری آف اسٹیٹ Amery نے ایک بار کابینہ کی ایک میٹنگ کے دوران وادیل کے کان میں یہ کہا تھا کہ "چرچل ہندوستان کے مسائل سے بالکل اسی طرح واقف ہیں جس طرح کہ جارج سوم امریکی نوآبادیوں کے امور سے تھے۔ (وائسرائے جرنل، صفحہ 21)۔ چرچل نے نومبر 1942 میں بہ بانگ دہل یہ کہا تھا کہ "میں برطانوی مملکت کے خاتمے کے عمل کی دیکھ ریکھ کے لیے وزیر اوّل (وزیر اعظم) نہیں بنا ہوں۔" چرچل کے وزیر اعظم بن جانے کے نتیجے میں کابینہ میں اٹلی اور کرپس جیسے لیڈروں کی شمولیت بے اثر ہو گئی تھی، جنھوں نے جون 1939 میں کرپس کے ایک دیہی مکان میں ایک نجی ملاقات کے دوران نہرو اور کرشنا مینن سے یہ وعدہ کیا تھا کہ برطانیہ کی اگلی لیبر حکومت ایک عبوری مدت کے لیے ہند میں برطانوی ذمہ داریوں اور مفادات کے تحفظ کے لیے ہند۔ برطانیہ معاہدے کی شرط کے ساتھ عام رائے دہی پر مبنی دستور سازی اسمبلی کو اقتدار کی مکمل منتقلی کے لیے تیار ہو جائے گی۔ (پی۔ ایس۔ گپتا: امپیریل ازم اینڈ برٹش لیبر، صفحہ 9-257)۔ اگست 1940 میں جب کہ برطانیہ کی جنگ دور دراز کے ایک الگ تھلگ جزیرے میں چل رہی تھی، لنلتھگو اور سکریٹری آف اسٹیٹ Amery ہندوستان کی مکمل تائید حاصل کرنے کی غرض سے چند رعایتیں دینے کے لیے تیار تھے مگر ان کی تجویز کو چرچل نے بڑی بے وقعتی کے ساتھ مسترد کر دیا تھا "اگست پیش کش" (8/اگست 1940) میں ان کے 5/اکتوبر 1939 کے بیان --- "غیر معین مدت میں ڈومنی آن کا درجہ، دستور کی تیاری کے لیے جنگ کے خاتمے پر ایک ادارے کی تشکیل (جسے برطانوی پارلیمنٹ کے ذریعے توثیق سے مشروط کیا گیا تھا اور اس کے عام رائے دہی کے ذریعے چنے جانے کا

کوئی ذکر نہیں تھا)، چند مزید ہندوستانیوں کی شمولیت کی غرض سے وائسرائے کی عاملہ میں توسیع اور ایک جنگی مشاورتی کونسل کے وعدوں کو ہی کم و بیش دوہرایا گیا تھا۔ ہندوستانی ممبروں کی اکثریت (12 میں سے 8) قائم کرنے کی غرض سے جولائی 1941 میں وائسرائے کی ایگزیکٹیو میں پہلی بار توسیع کی گئی مگر دفاع، مالیات اور داخلہ کے امور کو گوروں کے ہی چارج میں رکھا گیا اور محض مشاورتی مقصد سے نیشنل ڈیفنس کونسل بنائی گئی۔ باقی امور کے سلسلے میں کوئی پیش رفت نہیں کی گئی تاوقتیکہ جنوب مشرقی ایشیاء میں ہونے والی بھاری ہزیمتوں نے برطانیہ کو ڈرامائی طریقے پر مارچ۔ اپریل 1942 کے کرپس مشن کے لیے مجبور کر دیا۔ یہ دوسری بات ہے کہ اس مشن کو بھی چرچل اور لینلتھگو نے ناکام بنادیا تھا۔

مسلم لیگ اور پاکستان

مسلم لیگ کے دعووں کی حوصلہ افزائی کو جنگ کے زمانے کی سامراجی پالیسیوں میں بہت زیادہ اہم مقام حاصل رہا۔ 17 اکتوبر 1939 کے بیان میں مختلف فرقوں کے نمائندوں کے ساتھ صلاح مشورے کی ضرورت کا ذکر کیا گیا تھا اور "اگست پیش کش" میں یہ واضح کر دیا گیا تھا کہ انگریز کسی بھی ایسے حکومتی نظام کو ذمہ داریاں منتقل نہیں کریں گے جسے ہندوستان کی قومی زندگی کے تمام اہم عناصر کی مکمل تائید حاصل نہیں ہوگی۔ اس طرح گویا جناح کے ایک مرکزی اہمیت کے مطالبے کو تسلیم کر لیا گیا تھا۔ یعنی یہ کہ مسلم لیگ نہ صرف یہ کہ تمام ہندوستانی مسلمانوں کی واحد نمائندہ ہے بلکہ آئندہ کی دستوری ترمیمات کے سلسلے میں مسلم لیگ کو تنسیخ کا حق بھی حاصل ہوگا۔

مطالبۂ پاکستان کے ارتقاء کے آخری مرحلوں میں بھی انگریزوں کی طرف سے ترغیب اور حوصلہ افزائی کا سلسلہ جاری رہا تھا۔ پاکستان کے مطالبے کی قرارداد مارچ 1940 میں مسلم لیگ کے لاہور اجلاس میں پاس کی گئی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ پاکستان کا تصور سب سے پہلے اقبال نے مسلم لیگ کے 1930 کے اجلاس کے صدارتی خطبے میں "شمال مغربی ہندوستانی مسلم ریاست" کی ضرورت کے طور پر پیش کیا تھا، مگر ان کے اس خطاب کے سیاق و سباق سے یہ واضح ہوتا ہے کہ اس عظیم اردو شاعر کے ذہن میں ملک کی تقسیم جیسی کوئی بات ہونے کی بجائے یہ تھا کہ شمال مغربی ہندوستانی کے مسلم اکثریت کے علاقوں کی تنظیم نو کر کے انھیں ایک کمزور ہندوستانی فیڈریشن میں ایک خود مختار اکائی کے طور پر تسلیم کر لیا جائے۔ کیمبرج یونیورسٹی میں چودھری رحمت علی کے پنجابی مسلم طلباء کے گروپ کا یہ دعوا کافی وزن رکھتا ہے کہ تصور پاکستان کے اصل خالق وہی تھے۔ 1933 اور 1935 میں لکھے گئے دو کتابچوں میں چودھری رحمت علی نے پنجاب، افغان صوبے، کشمیر، سندھ اور بلوچستان کے علاقوں پر مشتمل ایک نئے خطے کو جداگانہ قومی حیثیت دینے کا مطالبہ

کیا تھااور اس خطے کا نام پاکستان تجویز کیا تھا۔ اس وقت کسی نے بھی اس کا سنجیدگی سے نوٹس نہیں لیا تھا، کم از کم گول میز کانفرنس میں شریک تمام لیگی اور دوسرے مسلم مندوبین نے اسے طلباء کا خواب و خیال قرار دے کر مسترد کر دیا تھا۔ جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں 1937 کے بعد لیگ کو جلد ہی کسی مثبت پلیٹ فارم کی ضرورت تھی، جب کہ 1935 کے ایکٹ کی وفاقی شقوں پر عمل در آمد کے آثار دور دور تک نظر نہیں آرہے تھے بلکہ مسلم لیڈروں کے خیال میں یہ شقیں ایک مضبوط اور ہندو غلبے والی مرکزی حکومت کی تشکیل کے مقصد سے رکھی گئی تھیں جو کہ انھیں قبول نہیں ہو سکتی تھیں۔ چنانچہ 39-1938 کے دوران متبادل تجویزیں رکھی گئیں اور مارچ 1939 میں مسلم لیگ نے مختلف اسکیموں کا جائزہ لینے کی غرض سے ایک سب کمیٹی کی تشکیل کی۔ جہاں ظفر الحسن اور حسین قادری کی علی گڈھ اسکیم میں پاکستان، بنگال، حیدر آباد اور ہندوستان کے نام سے چار آزاد ریاستیں بنانے کی تجویز پیش کی گئی تھی، دوسرے منصوبوں میں صرف مکمل تقسیم کی بات ہی نہ کہہ کر ایک ڈھیلے ڈھالے ہندوستانی وفاق کے اندر ہی خود مختار مسلم بلاکوں کی تشکیل کی بات کہی گئی تھی، پنجاب کے یونینسٹ وزیر اعظم سکندر حیات خاں نے ایک ایسے تین درجاتی، سات زمروں میں تقسیم، خود مختار صوبوں پر مشتمل ڈھیلے ڈھالے وفاق کی تجویز پیش کی تھی جس میں صوبوں کی علاقائی قانون ساز اسمبلی ہو اور مرکزی حکومت کو محض دفاع امور خارجہ، کسٹم اور کرنسی پر ہی کنٹرول حاصل ہو۔ کچھ اسی طرح کا منصوبہ کافی بعد 1946 میں کیبنٹ مشن نے بھی پیش کیا تھا۔ اچانک اس طرح کے متبادل تلاش کرنے کی کوشش کے پس پشت انگریزوں کی حوصلہ افزائی کارفرما ہی تھی۔ خلیق الزماں کی روایت کے مطابق سکریٹری آف اسٹیٹ زیٹ لینڈ نے 20 مارچ 1939 کو رحمت علی کی اسکیم کی نئی تشریح کو کافی ہمدردی کے ساتھ سنا تھا۔ اس نئی تشریح میں دو مسلم بلاک، ایک شمال مغرب میں اور دوسرا مشرق میں بنانے کی تجویز پیش کی گئی تھی۔ (Pathway to Pakistan , pp. 205-7) لینلتھگو اور زیٹ لینڈ کے کاغذات سے جو کہ حال ہی میں سامنے لائے گئے ہیں، اس سلسلے میں انگریزوں کا رول اور بھی واضح ہو گیا ہے۔ مثال کے طور پر وائسرائے نے 6 فروری 1940 کو جناح سے، لاہور اجلاس سے چھ ہفتے پہلے یہ کہا تھا کہ "جس پارٹی کی ساری پالیسی نفی پر مبنی ہو اسے برطانوی تائید اور مدد کی امید نہیں رکھنی چاہیے۔" "اگر وہ اور ان کے ساتھی یہ چاہتے ہیں کہ مسلم معاملہ برطانیہ میں پوری توجہ حاصل کرے تو اس کے لیے یہ ضروری ہے کہ مستقبل قریب میں ہی اپنا منصوبہ تیار کر لیں۔" (حوالہ: اوما کورا صفحہ 149)۔

23 مارچ 1940 کی مشہور قرارداد میں، جس کا مسودہ سکندر حیات خاں نے تیار کیا تھا اور جسے کافی ترمیم و اضافے کے بعد فضل حق نے خلیق الزماں کی تائید سے پیش کیا تھا، یہ مطالبہ کیا گیا تھا کہ "جغرافیائی لحاظ سے باہم متصل علاقوں کو ایک ایسے منطقے کے طور پر نشان زد کیا جانا چاہیے کہ جن

علاقوں میں مسلمان تعداد کے لحاظ سے اکثریت میں ہیں جیسا کہ وہ ہندوستان کے شمال مغربی اور مشرقی خطوں میں ہیں، انھیں آزاد ریاستوں" کی شکل دینے کے لیے زمرہ بند کیا جانا چاہیے۔ اس زمرے میں شامل اکائیاں خود مختار اور آزاد ہوں گی۔" اس قرارداد کو جان بوجھ کر مبہم رکھا گیا تھا۔ اس میں نہ تو پاکستان کا ذکر کیا گیا تھا اور نہ ہی تقسیم کا اور 1940 کی دہائی کے اوائل میں کچھ مسلم سیاست دانوں کا کبھی کبھی یہ بھی کہنا تھا کہ ہندو اخبارات اور سیاست دانوں نے مسلمانوں کے حق بجانب اور معتدل مطالبوں میں رکاوٹ پیدا کرنے کے مقصد سے اس قرارداد کی غلط تاویل اور تشریح کر کے پاکستان کا ہوا کھڑا کیا تھا۔ بہر حال اس قرارداد میں علاقائی رد و بدل کی کوئی تشریح نہیں کی گئی تھی اور "آزاد ریاستوں" کا مطلب علاحدگی بھی تھا اور یہ بھی ہو سکتا تھا کہ انھیں ایک ڈھیلے ڈھالے وفاق میں مکمل خود مختاری حاصل ہو گی۔ جمع کے صیغے (آزاد ریاستوں) کے استعمال اور وفاق میں شامل اکائیوں کے اقتدار اعلا پر زور کو تقسیم کے بعد کافی اہمیت حاصل ہو گئی تھی کیونکہ ان دونوں باتوں سے عوامی لیگ کے اس ایجی ٹیشن کو جو کہ فضل الحق کے ذریعے شروع کیا گیا تھا، پنجاب کے غلبے والے پاکستان کے وحدانی تصور کے خلاف ایک نظریاتی بنیاد حاصل ہو گئی جو بالآخر بنگلہ دیش کی علاحدگی پر منتج ہوا۔

11/مارچ 1941 کو پنجاب اسمبلی کی ایک مشہور تقریر میں یونینسٹ پارٹی (جس میں کچھ سکھ اور چھوٹو رام جیسے ہندو جاٹ بھی شامل تھے) کے لیڈر سکندر حیات خاں نے یہ اعلان کیا کہ وہ ایسے پاکستان کے مخالف ہیں جس کے نتیجے میں کہیں مسلم حکومت اور کہیں ہندو حکومت قائم ہو گی "اگر پاکستان کا مطلب پنجاب میں ایک خالصۂ مسلم راج سے ہے تو ایسے پاکستان سے میرا کوئی واسطہ نہیں ہو گا۔ (وی۔ پی مینن ٹرانسفر آف پاور ان انڈیا۔ صفحہ 463) انھوں نے ایک ڈھیلے ڈھالے وفاق کے لیے اپنی اپیل پر ایک بار پھر زور دیا اور یہ دعوا بھی کیا کہ ان کی اصل لاہور قرارداد میں "مرکز اور مختلف اکائیوں کی سرگرمیوں میں تال میل ہم کا بھی ذکر کیا گیا تھا۔ در حقیقت پاکستان پر شروع میں بہت کم مسلم لیڈروں نے سنجیدگی سے توجہ دی تھی اور جناح نے تو کانگریس کو انگریزوں کی طرف سے ممکنہ آئینی رعایتوں میں رکاوٹ پیدا کرنے اور مسلمانوں کے حق میں سودے بازی کے ایک محض حربے کے طور پر استعمال کیا۔ بہر حال سکندر حیات کی تقریر میں یہ اعتراف تھا کہ "اگرچہ تعلیم یافتہ مسلمانوں کی بڑی اکثریت ان میں سے کسی بھی اسکیم میں یقین نہیں رکھتی، مگر ابہام اور لچک کی وجہ سے پاکستان کا نعرہ آسانی سے مسلم عوام کو متاثر کرنے لگا ہے" پنجاب میں فرقہ وارانہ اتحاد کے لیے یونینسٹ پارٹی کی دہائی کا تعلق موجودہ سیاسی اور سماجی صورتحال کے دفاع اور انگریزوں کے ساتھ کھلے عام یگانگت سے تھا۔ سکندر حیات خاں کے جانشیں، خضر حیات خاں وہ پہلے ہندوستانی سیاست داں تھے جن کی وادیل نے کھل کر ستائش کی تھی، بنگال ہی کی طرح پنجاب

میں بھی پاکستان کے نعرے کے سہارے فرقہ پرستی پہنچ گئی تھی اور ایک آزاد مسلم ریاست کو تمام مسائل کے حل کے طور پر پیش کیا جانے لگا تھا۔ اور یہ صورت حال آئندہ چند سال مزید جاری رہنے والی تھی۔ انگریزوں کے لیے پاکستان کا مطالبہ، ہندوستان میں آئینی تعطل کو برقرار رکھنے کا کارگر حربہ ثابت ہوا تھا، تاہم جناح کی حوصلہ افزائی کرنے کے ساتھ ساتھ انگریزان کے سارے مطالبے ماننے کے لیے بھی ہرگز تیار نہیں تھے۔ دفعہ 93 کے تحت صوبوں میں غیر سرکاری مسلم مشیر رکھنے، وائسرائے کی توسیع شدہ ایکزیکیٹیو میں مزید نمائندگی دینے اور اس ایکزیکیٹیو میں کانگریس کے شامل ہونے کے فیصلے کی صورت میں اس کے مساوی مسلم لیگ کو نمائندگی دینے سے متعلق لیگ کے دعووں کو انگریزوں نے یک لخت مسترد کر دیا تھا۔ بالآخر جناح نے "اگست پیش کش" کو مسترد کر دیا اور اگلے سال سکندر حیات خاں اور فضل الحق کو نئی قائم شدہ نیشنل ڈفینس کونسل کی رکنیت نہ قبول کرنے کے لیے مجبور کر دیا۔

کانگریس کے اندر رجحانات

1941-42 کے موسم سرما تک کانگریس کے اندر صف بندی زیادہ تر 1930 کی دہائی کے آخر میں قائم شدہ نہج پر ہی جاری رہی تھی۔ گاندھی اور دائیں غلبے والا اعلا کمان صبر و تحمل کی تلقین اور انگریزوں کے ساتھ کسی نہ کسی معاہدے کے لیے کوشاں رہا تھا۔ بعد میں اعلا کمان نے بادل نا خواستہ ایک ایسی تحریک کی اجازت دیدی جو بہت ہی چھوٹے پیمانے اور محدود نوعیت کی تھی۔ جب کہ بائیں گروپ نے جنگ اور حکومت کے خلاف تشدد پسندانہ اقدام کی اپیل کی۔ اگرچہ "کانگریسیوں کو کسی بڑے اقدام کی امید تھی" مگر سول نافرمانی کا کوئی فوری امکان نہیں تھا؛ گاندھی نے یہ بات کانگریس وزارتوں کے استعفے کے فوراً بعد ہی کہی تھی۔ گاندھی خود بھی کبھی کبھی یہ شک ظاہر کرتے تھے کہ آیا ان کا اہنسا (عدم تشدد) کا اصول جنگ کی تائید کی اجازت دیتا ہے؛ انھوں نے پولینڈ، فرانس اور برطانیہ کو بھی غیر تشدد پسندانہ مزاحمت کا مشورہ دیا تھا لیکن کانگریس کی ورکنگ کمیٹی بار بار یہ وضاحت کر رہی تھی کہ اگر انگریز جنگ کے بعد آزادی کے وعدے اور مرکز میں فوراً قومی حکومت کی تشکیل کے سلسلے میں چند رعایتیں ہی دیدیں تو وہ جنگ کی کوششوں کی تائید کے لیے تیار ہے۔

ایک طرف تو انگریزوں کی ہٹ تھی اور دوسری طرف اقدام کے لیے بائیں گروپ کا دباؤ بڑھ رہا تھا جس نے اعلا کمان کو نسبتاً زیادہ تشدد پسندانہ پالیسی کے اظہار کے لیے مجبور کر دیا۔ کانگریس کے رام گڑھ اجلاس (مارچ 1940) میں "کانگریس کے اس مقصد کے لیے فٹ سمجھے جاتے ہی سول نافرمانی" کی بات کہی گئی۔ مگر اس کے لیے وقت اور تحریک کی نوعیت طے کرنے کا معاملہ خالصتاً گاندھی کی ذاتی صوابدید پر چھوڑ دیا گیا۔ "اگست پیش کش" کے ناکام ہو جانے کے بعد گاندھی نے

کم از کم سول نافرمانی کی اجازت دیدی تھی، لیکن یہ اجازت بھی دانستہ طور پر محدود اور غیر موثر قسم کی تحریک کے لیے دی گئی تھی۔ اصل معاملہ تقریر کی آزادی بلکہ زیادہ واضح لفظوں، میں جنگ مخالف اعلانات اور بیانات کو عام کرنے کے حق کا تھا۔ انفرادی طور پر کانگریسیوں (شروع شروع میں گاندھی کے نامزد کردہ لوگوں) نے جنگ مخالف تقریروں کے ذریعے گرفتاریاں دینی شروع کیں (یہ سلسلہ ونوبا بھاوے نے 17/ اکتوبر کو اور جواہر لال نے 31 اکتوبر کو شروع کیا اور پھر گرفتاریاں دینے کا سلسلہ عام پیمانے پر جاری ہو گیا)۔ جون 1941 میں تحریک کے شباب کے زمانے میں 20,000 لوگ جیل جا چکے تھے مگر خزاں کا موسم آتے آتے تحریک دم توڑنے لگی تھی اور بیشتر لوگ رہا کر دیئے گئے تھے۔ یہ گاندھی کی اب تک کی سب سے کمزور اور سب سے غیر موثر تحریک تھی بلکہ ایک سال بعد یعنی اگست 1942 کے واقعات کے قطعی متضاد تھی۔ اس تحریک کا مقصد انگریزوں کو واقعی پریشان کرنا ہرگز نہیں تھا، بلکہ محض کانگریس کی موجودگی اور صلاح مشورے کے بغیر ہی شروع کی گئی جنگ کی مخالفت کا احساس دلانا تھا، اس کے ساتھ ہی اس کا مقصد لنلتھگو کو کسی بڑی تدار کی کارروائی کا موقع بھی نہیں دینا تھا۔ انگریز جنگ کے زمانے کے خصوصی اختیارات کا استعمال بڑی بے صبری سے کرتے، اس بات کا اشارہ نہرو کو شروع میں سنائی گئی چار سال قید با مشقت کی سزا سے بھی ملتا ہے۔ جنوری 1941 میں برلا کے ساتھ بات چیت کرتے ہوئے گاندھی نے یہ ظاہر کر دیا تھا "وہ اپنی اس تحریک سے کم سے کم پریشانی پیدا کرنا چاہتے ہیں" (مثال کے طور پر کرسمس کے موقع پر، اتوار کے دن یا صبح 9 بجے سے پہلے کوئی ستیہ گرہ نہیں کیا جائے گا)۔ گاندھی نے اس کے ساتھ ہی "اپنے نوعمر لوگوں کی ذہنیت" کے بارے میں بھی تشویش ظاہر کی تھی۔ "بدقسمتی سے فرقہ پرستی نوجوانوں کے لیے بہت کشش رکھتی ہے" (ٹھاکر داس پیپر س، ایف این، 177)۔ جیسا کہ پہلے بھی برابر ہوتا رہا، زیادہ شدت پسندانہ دباؤ کو درکنار کر دینے کی خواہش ہی گاندھیائی حکمت عملی میں آنے والی تبدیلیوں کا باعث رہی۔

ایم۔ این۔ رائے کے گروپ کے استثناء کے ساتھ، جس کا خیال یہ تھا کہ یہ جنگ فاشزم کے خلاف ہے اس لیے اس کی بلا شرط تائید کی جائے، باقی سارا بایاں گروپ 1941 کے آخر تک شدت پسندانہ جنگ مخالف جدوجہد کے دباؤ میں ہی رہا۔ بلاشبہ سبھاش بوس کا یہی خیال تھا کہ برطانیہ کی موجودہ مشکلات کو ہندوستان کے لیے ایک سنہرے موقع میں تبدیل کر دیا جائے اور انھو نے کانگریس کے رام گڈھ اجلاس کے ساتھ ساتھ اس مفاہمت مخالف کانفرنس کی صدارت بھی کی جس میں گاندھی کی اعتدال پسندی کی مذمت کی گئی تھی۔ سوشلسٹ لیڈر بہت زیادہ شدت پسند موڈ میں تھے، یہاں تک کہ جے پرکاش نرائن 1941 میں جیل میں بند ہونے کے دوران مسلح جدوجہد کے بارے میں بھی سوچ رہے تھے۔ اگرچہ بہت سے بہترین سی ایس پی لیڈروں اور یونٹوں پر سی پی

آئی کا قبضہ ہو جانے کے نتیجے میں سوشلسٹوں اور کیونسٹوں کے تعلقات اور بھی خراب ہو چکے تھے مگر جنگ کے تعلق سے ان دونوں گروپوں کے درمیان 1941 کے آخر تک کوئی بڑا سیاسی اختلاف رائے پیدا نہیں ہوا تھا۔ اگست 1939 کے نازی - سوویت معاہدے کے بعد کوم ان ٹرن (بین الاقوامی کیونسٹ تنظیم) کی پالیسی میں انقلابی تبدیلی سے یوروپ میں کیونسٹوں کو زبردست دھکا لگا تھا، مگر اس سے کیونسٹوں کے ہندوستانی ساتھیوں کو راحت ملی تھی، کیونکہ اس طرح برطانوی جنگ کی قوم پرستانہ مخالفت کے ساتھ سوویت پالیسیوں کی بین الاقوامی تائید کا تال میل قائم رکھا جاسکتا تھا۔ بہر حال یہ ایک ایسی صورت حال تھی جو 22 جون 1941 کو روس پر ہٹلر کے حملے کے بعد بالکل الٹ پلٹ ہو گئی تھی۔

بہر حال یہ بھی واقعہ ہے کہ انگریزوں کے زبردست استبدادی اقدامات کی وجہ سے بایاں گروپ اپنی تحریک کو موثر طریقے پر جاری نہیں رکھ سکا۔ سبھاش بوس نے ہال ویل (Hol well) یادگار مینہ بلیک ہول کے برطانوی متاثرین کی یادگار) کو ہٹانے کے مطالبے کو لے کر جولائی 1940 میں ایک کامیاب ستیہ گرہ کی قیادت کی۔ مسلم طالب علموں نے ایسی تحریک میں بھاری تعداد میں حصہ لیا جو کہ بنگال کے آخری مسلم حکمراں سراج الدولہ کے احترام سے تعلق رکھتی تھی، لیکن ہندو مسلم اتحاد سے قطع نظر اس سارے معاملے کی اہمیت بہت ہی محدود تھی۔ بوس نظر بندی (خانہ بندی) سے جنوری 1941 میں فرار ہو گئے اور افغانستان نیز روس کے راستے جرمنی پہونچنے کے لیے کیونسٹوں کے خفیہ جال کو استعمال کیا۔ انھوں نے اس طرح اپنی قوم پرستانہ زندگی کا سب سے ڈرامائی اور آخری سفر شروع کیا تھا مگر محض برطانیہ کے دشمنوں کی تائید اور مدد پر ہی سارا انحصار اندرونی کمزوریوں کا اعتراف ہونے کے علاوہ پہلی بار عالمی جنگ کے دوران اختیار کردہ دہشت پسندانہ طریقوں کا ایک طرح سے اعادہ بھی تھا۔ میسور اسٹیٹ کانگریس (جو کہ سوشلسٹوں کے غلبے والی کرناٹک پی سی سی سے جڑی ہوئی تھی) نے ستمبر 1939 سے تین ماہ تک ایک زوردار ستیہ گرہ چلایا تھا جس میں اسے کسانوں کی موثر تائید حاصل رہی تھی۔ اس ستیہ گرہ کے دوران جو 2801 لوگ گرفتار کیے گئے تھے ان میں 641 لوگ زراعت کے میدان سے تعلق رکھتے تھے جب کہ گرفتار کیے جانے والے وکلاء کی تعداد محض 23 تھی۔ بائیں گروپ کے کنٹرول والی ایک دوسری صوبائی کانگریس یعنی کیرالہ کانگریس کمیٹی نے پولس ظلم و زیادتی کے خلاف 15 ستمبر 1940 کو ایک یوم احتجاج کا اہتمام کیا جس کے دوران میلچری، مٹن پورا اور مورازا میں پولس فائرنگ ہوئی تھی۔ مارچ 1941ء میں مالابار میں کسانوں اور زمینداروں کے درمیان ٹکراؤ کے ایک واقعے کے نتیجے میں چار کسان نوجوانوں کو سزائے موت دی گئی تھی، جنھیں ملک گیر شہرت حاصل ہو گئی تھی۔ شمالی بہار کے پورنیہ اور شمالی بنگال کے دیناج پور میں کیونسٹوں کی قیادت میں شروع ہونے والی کسان تحریکوں کو ایک نئی طرح کی

شدت پسندی حاصل ہو گئی تھی۔ یہ تحریکیں متوسط کسانوں سے شروع ہو کر قبائلی یا نیم قبائلی بٹائی داروں (سنتھالیوں اور راج بنسیوں) تک پھیل گئی تھیں۔ مگر اس طرح کی منتشر اور مقامی نوعیت کی شدت پسندی انگریزی حکومت کے لیے کسی طرح کا چیلنج پیش کرنے سے قطعی قاصر تھی۔

معاشی عواقب

1939 اور 1941 کی درمیانی مدت میں قومی تحریک کے نسبتاً کمزور پڑ جانے کے کچھ معاشی عوامل بھی تھے۔ یہ جنگ، جو کہ ہندوستان سے کافی دور چل رہی تھی، ملک کی آبادی کے ایک قابل لحاظ حصے کے لیے نقصان کی بجائے مالی منفعت کا باعث ثابت ہو رہی تھی۔ زرعی اشیاء کی قیمتوں میں اتنی تیزی سے اضافہ نہیں ہوا تھا، بلکہ یہ اضافہ بھی دراصل ایک دہائی سے مندے کے شکار کسان طبقے کے لیے راحت کا باعث ثابت ہوا تھا۔ پہلی عالمی جنگ کے ہی زمانے کی طرح جنگی مانگ کی وجہ سے ہندوستان کی صنعتی ترقی کو کافی ترغیب ملی کیونکہ درآمدات میں بھاری کٹوتی کر دی گئی تھی۔ اس کے علاوہ جنگ کی وجہ سے دیسی مصنوعات اور اشیاء پر ہی انحصار کرنا پڑ رہا تھا۔ یہ دوسری بات ہے کہ انگریز اب بھی موٹر گاڑیاں، بحری جہاز، ہوائی جہاز وغیرہ اندرون ملک بنانے کے لیے ہندوستانیوں (وال چند ہیرا چند، اور میسور کے مرزا اسماعیل) کی کوششوں میں رخنہ اندازی کی بھرپور کوشش کر رہے تھے۔ 1939 اور 1942 کی درمیانی مدت میں کارخانوں میں روزگار میں 31 فی صد اضافہ ہو اتھا جب کہ 1922 اور 1939 کی درمیانی مدت میں اس روزگار کی تعداد 13,61,000 سے بڑھ کر محض 17,51,000 تک ہی پہونچ سکی تھی (واڈیا اینڈ مرچنٹ، آور اکونومک پرابلم، چھٹی اشاعت، بمبئی 1959، صفحہ 335)۔ مزدور طبقے کی بے چینی جنگی کوششوں کے لیے ایک چیلنج بن سکتی تھی۔ مگر بڑے شہروں میں اسے ہنگامی بھتے میں اضافے اور رعایتی شرحوں پر لازمی اشیاء کی سپلائی کے ذریعے کنٹرول میں رکھا گیا تھا۔ ہندوستان کے کاروباری اور تاجر حلقوں کے لیے یہ جنگ فوری نفع اندوزی کا وسیلہ ثابت ہوئی تھی تاوقتیکہ یہ جنگ ہندوستان کے اپنے علاقوں سے دور ہی رہتی اور یہاں کے لوگوں کی املاک کے لیے بم باری یا انخلاء کی وجہ سے خطرہ نہ بن جاتی۔ اس سلسلے میں خلیق الزماں نے بڑی دلچسپ بات یہ کہی تھی کہ بڑے بڑے تاجروں "اور ہمارے مسلم تعلقہ داروں نیز زمینداروں کے توسط سے "انگریزوں کے ساتھ زیادہ سے زیادہ تعاون کے لیے مسلم لیگ پر دباؤ ڈالا گیا تھا۔ یہ وہ تعلقہ دار اور زمیندار تھے جو لکڑی، چارکول اور دوسری چھوٹی موٹی اشیاء کی سپلائی کے چھوٹے موٹے ٹھیکوں میں دلچسپی رکھتے تھے۔ یہ توقع ہی فضول تھی کہ یہ لوگ زندگی میں ایک بار ملنے والے اس موقع سے فائدہ نہیں اٹھائیں گے" (پاتھ وے ٹو پاکستان، صفحہ 243)۔ ظاہر ہے کہ اس طرح کا دباؤ کانگریس پر بھی یقیناً رہا ہو گا۔

جنگ کا نیا مرحلہ

1941 کے نصف آخر کے دو عالمی واقعات نے ہندوستانی صورت حال کو بالکل الٹ پلٹ کر دیا۔ ان میں سے ایک روس پر ہٹلر کا حملہ تھا اور دوسرا واقعہ یہ کہ دسمبر 1941 سے جاپانی فوج پورے جنوب مشرقی اشیاء میں کافی تیز رفتاری سے پیش قدمی کر رہی تھی۔ جاپانی فوج نے برطانوی فوج کو ملایا، سنگاپور، اور برما سے کھدیڑ دیا تھا اور کسی بھی وقت ہندوستان کو بھی جاپانی مملکت میں شامل کر لینے کی پوزیشن میں معلوم ہونے لگی تھی۔ روس پر جرمنی کے حملے سے ہندوستانی کیمونسٹوں کے لیے ایک بڑی مشکل پیدا ہو گئی تھی۔ جہاں ہندوستان میں انگریزوں کی استبدادی اور رجعت پسندانہ پالیسیوں میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی، وہیں دوسری طرف برطانیہ دنیا کی اس واحد سوشلسٹ ریاست کا اتحادی تھا جو اپنی بقاء کے لیے زندگی اور موت کی جدوجہد کر رہی تھی۔ بہر حال چھ ماہ کے پس و پیش اور داخلی بحث و مباحثے کے بعد جنوری 1942 میں کیمونسٹ پارٹی آف انڈیا نے ایک طرف تو فاشزم کے خلاف "عوام کی جنگ" کے تئیں بین الاقوامی کیمونسٹ تحریک کی طرف سے مکمل ساتھ دینے کا فیصلہ کیا اور دوسری طرف جنگ کے بعد آزادی کے وعدے اور فوراً قومی حکومت کی تشکیل سے متعلق کانگریس کے مطالبے کو بھی دوہراتی رہی۔ اگرچہ یہ دونوں مطالبے اب بھی کافی سمجھے جاتے تھے مگر اب انھیں انگریزوں کی جنگی تائید کی شرط کی حیثیت حاصل نہیں رہی تھی۔ روس کے لیے تشویش اور ہمدردی صرف کیمونسٹوں تک ہی محدود نہیں تھی، رابندر ناتھ نے اگست 1941 میں جب کہ وہ بستر مرگ پر تھے، روس کی خبر کے بارے میں پوچھا تھا اور اپنے اس یقین کا اظہار بھی کیا تھا کہ بالآخر روسی "فاشزم" کے دیو کی پیش قدمی روک دینے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ نہرو نے بین الاقوامیت کی تائید اور فاشزم کے خلاف اپنی گہری عہد بستگی کے ساتھ ایک طرف تو جنگ میں ملوث روس اور چین کی کھل کر ستائش کی اور دوسری طرف انگریزوں کے ساتھ مفاہمت کی بھرپور کوشش کی تاکہ ہندوستان کرپس مشن کی گفت و شنید کے دوران جنگ کی تائید کر سکے۔ انھوں نے اعلانیہ طور پر یہ بھی کہا کہ جاپانی حملہ آوروں کی چھاپہ مار مزاحمت کی ضرورت ہے۔ انھوں نے اس سلسلے میں "بھارت چھوڑو تحریک" کے تئیں اپنی رائے محفوظ رکھی تھی۔ بہر حال ہندوستان کے عام وطن پرستوں سے، جن میں کانگریس کے دائیں گروپ کے لوگ، گاندھیائی، سوشلسٹ، یا بوس کے پیروکار، غرضیکہ سبھی شامل تھے، اس طرح کے بین الاقوامی تناظر کی امید نہیں کی جاسکتی تھی؛ ان میں سے بیشتر کا خیال یہ تھا کہ اس جنگ میں برطانیہ کو شکست ہونے جارہی ہے اور آزادی کے لیے زبردست وار کرنے کا وقت آگیا ہے۔

کرپس مشن

جیسے جیسے جنگ ہندوستان سے قریب تر ہوتی جارہی تھی (15/ فروری 1942 کو سنگاپور پر، 8/ مارچ کو رنگون پر، اور جزائر انڈمان پر 23/ مارچ کو قبضہ ہو چکا تھا)، انگریز یہ سوچنے پر مجبور ہوتے جارہے تھے کہ ہندوستانی رائے عامہ کو اپنے حق میں کرنے کے لیے کچھ نہ کچھ کرنا ضروری ہے۔ روزویلٹ نے دسمبر 1941 میں واشنگٹن میں چرچل سے بات کرتے ہوئے ہندوستان میں سیاسی اصلاح کا سوال اٹھایا، 2 جنوری کو سپرو اور جیاکار جیسے ہندوستانی لبرل لیڈروں نے ہندوستان کو فوراً ڈومنی ان کا درجہ دینے اور وائسرائے کی ایکزیکیٹیو کی توسیع کر کے اسے قومی حکومت کی شکل دینے کی اپیل کی تھی اور فروری میں چیانگ کائی شیک نے ہندوستان کا دورہ کرتے ہوئے ہندوستان کی جد وجہد آزادی کے تئیں کھلم کھلا ہمدردی ظاہر کی تھی۔ ان تمام باتوں سے برطانیہ کے ہندوستان حامی گروپوں کو کچھ نہ کچھ کہنے کا موقع مل گیا۔ جنگی کابینہ کے کرپس اور ایٹلی جیسے لبرل ممبران، نیز 1931 میں گاندھی کے دورۂ برطانیہ کے موقع پر قائم کیے گئے اور کوئیکروں (Quakers) کے غلبے والا انڈیا کنسی لی ایشن گروپ، جس کے ساتھ نہرو نے بھی 1938 میں دوستانہ روابط پیدا کر لیے تھے، اس گروپ میں شامل تھا۔ کرپس دسمبر 1939 میں ہندوستان کا نجی طور پر دورہ کر چکا تھا، اور یوپی کے ابھرتے ہوئے لیگی لیڈر لیاقت علی خاں کے ساتھ بات چیت کے بعد یہ طے کر چکا تھا کہ Filkins کے جون 1938 کے فارمولے میں ردو بدل کی ضرورت ہے۔ "ایک ایسے ڈھیلے ڈھالے وفاق کی تصویر زیادہ ابھرتی ہے...... جس میں صوبوں کو الگ ہو جانے کا اختیار حاصل ہو"۔ اس طرح اس "صوبائی اختیار" کی تخم کاری کردی گئی تھی جو دو سال بعد "کرپس منصوبے" کی بنیاد ثابت ہوا تھا۔ (آر۔ جی۔ مور، چرچل، کرپس اینڈ انڈیا، 45-1939 آکسفورڈ، 1979)۔

مارچ 1942 کے پہلے ہفتے میں کرپس جنگی کابینہ کو ایک ایسے اعلان کے مسودے پر راضی کرنے میں کامیاب ہو گیا جس میں جنگ کے بعد ہندوستان کو ڈومنی ان حیثیت (صوبوں کو الگ رہنے کے حق کے ساتھ) دینے، صوبائی اسمبلیوں کے ذریعے چنے جانے والے دستور ساز ادارے (اس ادارے میں شامل نہ ہونے کے حق کے ساتھ) کی تشکیل کرنے اور ریاستوں کو اس کے لیے اپنا نمائندہ نامزد کرنے کی دعوت دینے کے وعدے شامل تھے۔ اس مسودے کے پیرا (E) میں ہندوستانی عوام کے تمام بڑے حلقوں کے لیڈروں کو فوری نوعیت کے امور کے سلسلے میں صلاح مشورہ میں فوری اور مؤثر حصہ داری کی دعوت دی گئی تھی اور یہ اصرار بھی تھا کہ جنگ کے دوران انگریز "دفاع ہند" کا سارا کنٹرول اور رہنمائی اپنے ہاتھ میں ہی رکھیں گے۔ اس اعلان نامے کو فوراً ہی شائع نہیں کیا گیا تھا، لیکن کرپس نے اس کی بنیاد پر ہندوستانی لیڈروں کے ساتھ گفت و

شنید کی غرض سے 23/ مارچ کو ہند کا سفر کیا۔ لنلتھگو نے استعفٰی کی دھمکی دیدی تھی لیکن چرچل نے یہ وضاحت کی کہ "بد بختانہ افواہوں اور تشہیر کی وجہ سے اور عام امریکی نقطہ نگاہ سے، ایک خالصتاً منفی موقف پر قائم رہنا ناممکن ہوگا اور ہماری نیت کے اخلاص کو ثابت کرنے کے لیے کرپس مشن ناگزیر ہے...... اگر ہندوستانی پارٹیاں اسے مسترد کردیتی ہیں...... تو اس طرح بھی ہماری سنجیدگی پوری دنیا پر واضح ہو جائے گی۔" (چرچل بنام لنلتھگو، 10مارچ1942، محولہ: ٹرانسفر آف پاور، جلد 1، لندن، 1970، صفحہ 394،395)۔

کرپس مشن شروع سے ہی مشکلات کا شکار رہا، اور بالآخر مختلف قسم کے ابہامات اور پیچیدگیوں کی وجہ سے بالکل ہی ناکام ثابت ہوگیا۔ چرچل نے لنلتھگو کو یہ یقین دہانی کرائی تھی کہ "...... وہ بہر حال مسودہ اعلان کا پابند ہے جو کہ ہماری آخری حد ہے" مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کرپس آزاد اور نہرو کے ساتھ اپنی بات چیت میں کانگریس کے ابتدائی غیر موافقانہ رد عمل کی وجہ سے نہیں بلکہ مفاہمت پیدا کرنے کی خواہش کے تحت ہی اس حد کو پار کر گیا تھا۔ کانگریس نے ریاستی حکمرانوں کے ذریعے نمائندوں کی نامزدگی نیز صوبوں کو شامل یا الگ ہونے کے اختیار (جس کے بارے میں Amery نے نجی طور پر 2/ مارچ کو یہ اعتراف کیا تھا کہ یہ "پاکستان کے امکان کا پہلا عوامی اعتراف تھا") سے متعلق شقوں کی قدرتی طور پر سخت مخالفت کی اور ہندوستان میں کرپس کے قیام کے پورے عرصے میں گاندھی نے خود کو پس منظر میں رکھا تھا۔ لیکن کانگریس کے باضابطہ مذاکرہ کار، نہرو اور آزاد (جو کہ اس وقت کانگریس کے صدر تھے) نے ساری بات چیت کو مسودے کے پیرا (E) میں مذکور فوری تبدیلیوں کے لیے بندوبست پر ہی مرکوز رکھا۔ بظاہر کرپس نے ان دونوں سے یہ کہا تھا کہ وائسرائے کی نئی ایکزیکٹیو قریب قریب کابینی حکومت جیسی ہوگی جو باضابطہ طریقے پر نہیں (کیونکہ زمانہ جنگ میں 1935 کا ایکٹ تبدیل نہیں کیا جاسکتا) بلکہ عملاً رسم و روایت کے مطابق کام کرے گی، بالکل اسی طرح جس طرح کہ گورنر کے خصوصی اختیارات 39-1937 کے دوران کانگریسی وزارتوں کی موثر کارکردگی میں مانع نہیں ہوئے تھے۔ چرچل کے نام اپنے 4/ اپریل کے ٹیلی گرام میں کرپس نے اس "نئے بندوبست کا ذکر کیا تھا جس کی رو سے وائسرائے کی ایکزیکٹیو قریب قریب کابینہ جیسی ہوگی"۔

انجام کار بحث و مباحثہ دفاع کے کنٹرول کے معاملے پر ہی مرکوز رہا، اور اس سلسلے میں بھی 9/ اپریل کو کسی نہ کسی مفاہمت کے آثار معلوم ہونے لگے تھے، اور اس کی وجہ یہ تھی کہ روزویلٹ کے ذاتی نمائندے، کرنل جانسن نے، جو کہ ان دنوں فوجی مسائل پر گفتگو کے لیے نئی دہلی آئے ہوئے تھے، ثالثی کی پیش کش کی تھی۔ ایک مصالحتی فارمولا تیار کر لیا گیا تھا جس کی رو سے محکمہ دفاع کا انچارج کوئی ہندوستانی ہوتا جب کہ میدان جنگ کی کارروائیوں پر برطانوی کمانڈر ان چیف

کا کنٹرول ہوتا۔ مگر اس وقت تک گفتگو اور کمانڈر ان چیف داویل کے لیے یہ بھاری تشویش پیدا ہو چکی تھی کہ ان کے خیال میں کرپس کانگریس کو بہت زیادہ حقیقی اختیارات دینے کی بات تسلیم کرتا جارہا تھا۔ چنانچہ یہ دونوں چرچل کے ساتھ مل کر اس مفاہمت کو عین وقت پر ناکام بنانے میں کامیاب ہو گئے۔ 9/اپریل کو برطانیہ کی جنگی کابینہ نے ٹیلی گرام کے ذریعے کرپس کی زوردار سرزنش کی کہ اس نے اس سلسلے میں گفتگو اور داویل سے صلاح مشورہ کیوں نہیں کیا تھا، اور اس سلسلے میں کرنل جانسن کو اتنی اہمیت کیوں دی گئی تھی۔ اس ٹیلی گرام کے ذریعے "ایک قومی حکومت کی طرف کنائے" کی مذمت کی گئی تھی اور...... سارے معاملے کو پھر سے کیبنیٹ منصوبے پر واپس لانے کی ضرورت" پر زور دیا گیا تھا۔ کانگریسی مذاکرہ کاروں نے اسی شام کرپس کا انداز قطعی بدلا ہوا پایا اور اس طرح بات چیت اچانک ہی ٹوٹ گئی۔

نہرو نے مصالحت کی بھرپور کوشش کی، جس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ وہ واقعی فاشزم کے خلاف جنگ میں ہندوستان کے تعاون کو متحرک کرنا چاہتے تھے، جب کہ ورکنگ کمیٹی کے بیشتر ارکان اور خود گاندھی بھی اس معاملے سے لاتعلق یا بے حس رہے تھے۔ چنانچہ اب ان کی پوزیشن کافی خراب ہو گئی تھی اور اس ناکامی کے لیے کرپس کے ذریعے کانگریس کو متواتر اور غلط طریقے پر مورد الزام ٹھہرائے جانے سے بھی کوئی مدد نہیں مل تھی۔ اس معاملے میں کانگریسی موقف کی نشان دہی کرشامینن کے نام نہرو کے 13/اپریل کے ٹلی گرام سے ہوتی ہے "...... شروع میں کرپس نے یہ واضح کیا تھا کہ اس کے ذہن میں ایک ایسی کابینہ کا خاکہ ہے جس کا دستوری سربراہ وائسرائے ہوگا۔ جس طرح تاج برطانیہ ہے، دفاع کے معاملے میں ریزویشن کے ساتھ ...... چنانچہ بات چیت دفاع کے معاملے پر ہی مرکوز رہی...... کرپس کا آخر کار یہ کہنا تھا کہ ...... مشترکہ جواب دہی کے ساتھ نہ تو کوئی قومی حکومت ہی ممکن ہے اور نہ ہی وائسرائے کے اختیار تنسیخ (ویٹو) کے استعمال کے بارے میں کسی طرح کی یقین دہانی کرائی جاسکتی ہے۔ کرپس کی اصل تجویز کے لحاظ سے یہ بالکل ہی مختلف بات تھی"۔ (R. J. Moore : PP. 129-130)۔

جہاں تک انگریزوں کا تعلق ہے تو یہ شبہ کیا جاسکتا ہے کہ وہ اس سلسلے میں دوہری چال چل رہے تھے۔ مگر اس بابت اختلاف رائے ہو سکتا ہے کہ کرپس بھی دانستہ یا غیر شعوری طور پر اسی طرح کا رول ادا کر رہا تھا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ چرچل کے نزدیک "اس بات کی بجائے کہ کچھ کیا جانا چاہیے زیادہ اہمیت یہ تاثر دینے کی تھی کہ کچھ کرنے کی کوشش کی جارہی ہے"۔

Tomlinson: The Indian National Congress. and the Raj.)

P.156)۔ اور اس (چرچل) نے یہ ثابت کرنے کے لیے کہ مصالحت کے لیے انگریز کتنا زیادہ خواہش مند تھے، کرپس کی کوششوں کے لیے 11/اپریل کو گرمجوشانہ مبارک باد بھی دی تھی"

اور یہ کہ "...... اس کا اثر برطانیہ اور پورے امریکہ میں انگریزوں کے لحاظ سے کافی سود مند ثابت ہوا"۔(Mansergh: Vol I, Po 739)۔

جہاں کرپس مشن کی ناکامی کے لیے ہر طرح انگریز ہی ذمہ دار تھے، وہیں یہ بھی ایک سچائی ہے کہ کانگریسی لیڈروں اور کارکنوں کی بھاری اکثریت اس سے شروع سے ہی لاتعلق رہی تھی۔ صورت حال اب تیزی سے تبدیل ہو کر ہندوستان چھوڑو تحریک کی شکل میں مکمل ٹکراؤ کی طرف بڑھ رہی تھی۔

1942-45: ہندوستان چھوڑو تحریک، قحط اور جنگ کا آخری مرحلہ

سرکشی کا سرچشمہ

1942 کے موسم گرما میں گاندھی شدت پسندانہ موڈ میں آگئے تھے جو کہ ایک عجیب اور نادر بات تھی۔ وہ انگریزوں سے بار بار یہ کہہ چکے تھے کہ وہ ہندوستان کو خدا کے یا لاقانونیت کے رحم و کرم پر چھوڑ دیں۔ ان کا کہنا تھا کہ "......(انگریزوں کی) اس منظم اور منضبط انارکی کو ختم ہی ہونا چاہیے"۔ اور "اگر اس کے نتیجے میں مکمل لاقانونیت پیدا ہوتی ہے تو وہ یہ خطرہ بھی مول لینے کے لیے تیار ہیں"۔ (آمیری کے نام لنلتھگو کے مکتوب میں گاندھی کے 16/مئی کے اخباری انٹرویو کا ذکر، محولہ وائسرائے جرنل، جلد دو صفحہ 96)۔ گاندھی کا یہ بھی کہنا تھا کہ اگر "انگریز یہاں سے چلے جاتے ہیں تو جاپانی بھی اپنے منصوبے پر نظر ثانی کے لیے مجبور ہو جائیں گے"۔ (ہری جن، مضمون، 3 مئی) اور یہ کہ معاملہ اپنے طور پر نمٹانے کے لیے خود ہندوستانیوں پر ہی چھوڑ دیا جائے۔ "اگرچہ عدم تشدد پر اصرار برابر جاری رہا تھا؛ 8/اگست 1942 کو آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے بمبئی اجلاس میں پاس کی گئی "ہندوستان چھوڑو" کی مشہور قرارداد میں غیر تشدد پسندانہ طریقے اور انتہائی وسیع پیمانے پر نیز گاندھی کی قیادت میں عوامی جدوجہد کا نعرہ دیا گیا تھا اور وہ بھی اس وضاحت کے ساتھ کہ "گرفتاری کی وجہ سے کانگریسی قیادت کا خلاء پیدا ہو جانے کی صورت میں، ہر وہ ہندوستانی جو آزادی کی خواہش رکھتا ہے اور اس کے لیے جدوجہد کر رہا ہے، وہ خود ہی اپنا رہنما ہو"...... ہر ہندوستانی خود کو ایک آزاد انسان سمجھے...... صرف جیل جانے سے ہی بات نہیں بنے گی"۔ گاندھی نے یہ باتیں اسی دن اپنی مشہور "کرو یا مرو" تقریر کے دوران کہی تھی۔ ان کا یہ بھی کہنا تھا کہ ......"اگر عام ہڑتال واقعی بہت ضروری ہو جائے گی تو میں پیچھے نہیں ہٹوں گا"۔ جملہ معترضہ کے طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ گاندھی اب جوابی سیاسی اقدام کے لیے بھی تیار ہو گئے تھے،

اور وہ بھی خاص طور پر ایسے وقت میں جب کہ کیمونسٹ ان سے قطعی طور پر کنارہ کش رہنے پر مجبور تھے۔ ظاہر ہے کہ گاندھی کا یہ رویہ 29-1928 میں یا پھر 1930 کی دہائی کے آخر میں بائیں گروپ کی قیادت میں محنت کش طبقے کی شدت پسندی کے دوران اختیار کردہ رویے کے قطعی برعکس تھا۔ کانگریس ورکنگ کمیٹی کی 16/ جولائی کی وار دھا قرار داد میں سماجی انتہا پسندی جیسی ایک غیر معمولی بات بھی کہی گئی تھی۔ "راجے مہاراجے جاگیر دار، زمیندار، صاحب جائیداد اور صاحب دولت طبقے، دولت اور جائیداد دراصل فیکٹریوں میں پسینہ بہانے والے محنت کش طبقے اور کھیتوں میں کام کرنے والے مزدوروں سے ہی حاصل کرتے ہیں، یہی وہ مزدور اور کسان ہیں جنھیں دولت اور جائیداد کا حقیقی مالک ہونا چاہیے"۔(وائسرائے جرنل، جلد دو، صفحہ 388)۔

اس نئے موڑ نے کانگریس کے اندر تمام پرانی صف بندیوں کو الٹ پلٹ کر دیا۔ کرپس مشن کے ناکام ہو جانے کے بعد ورکنگ کمیٹی کے 27/اپریل تا یکم مئی کے اہم اجلاس میں گاندھی کے اس سخت موقف کی تائید پٹیل، راجندر پرساد اور کرپلانی جیسے دائیں گروپ کے لیڈروں کے ساتھ ساتھ اچیوت پٹوردھن، اور نریندر دیو جیسے سوشلسٹ لیڈروں نے بھی کی۔ جب کہ نہرو نے خود کو راج گوپال آچاری اور بھولا بھائی ڈیسائی جیسے انتہائی اعتدال پسند لیڈروں کی صف میں پایا۔ راجہ جی 1942 کے اوائل سے ہی یہ کہتے آرہے تھے کہ، آزادی کے بعد مسلم اکثریت کے صوبوں کے لیے رائے شماری کے ذریعے وفاق سے الگ ہونے کے حق کو مان کر مسلم لیگ کے ساتھ مفاہمت کر لینی چاہیے، اور ایک دوسری حیرت انگیز صف بندی یہ بھی دیکھنے میں آئی کہ آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے بمبئی اجلاس میں کیمونسٹوں نے بھی اسی طرح کا موقف اختیار کرتے ہوئے، علاحدگی کے حق کی بنیاد پر مسلم لیگ کے ساتھ مفاہمت کی اپیل کی تھی۔ (8/اگست کی قرار داد میں ڈاکٹر کے۔ ایم۔ اشرف اور ایس۔ جی سارڈیسائی کے ذریعے پیش کی گئی ترمیم کی تجویز)۔ نہرو حسب سابق اس مرتبہ بھی اپنے شکوک وشبہات کو پی گئے اور "ہندوستان چھوڑو" قرار داد پیش کی جس کی مخالفت آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے صرف کیمونسٹ ممبروں نے ہی کی۔ بھولا بھائی اور راجہ جی جولائی میں ہی مستعفی ہو چکے تھے۔

"ہندوستان چھوڑو" تحریک کے دوران اور بعد میں بھی، انگریزوں نے TO TTENHAM کی مرتب کردہ CONGRESS RESPONSIBILITY FOR THE DISTURBANCES (1943) جیسی دستاویزوں کے ذریعے کانگریس پر محوری طاقتوں کے ساتھ خفیہ طریقے پر ہمدردی رکھنے کا الزام لگایا۔ بلاشبہ ایک زبردست عوامی تحریک کو کچل دینے کے سلسلے میں فاشزم مخالف عالمی رائے عامہ کو اپنے حق میں کرنے کا بہترین طریقہ یہی تھا کہ ہندوستان چھوڑو تحریک کو جرائم پیشہ افراد کی سوچی سمجھی سازش قرار دیدیا جائے۔ انگریز اپنی اس

مہم میں اس بات کو بھی جان بوجھ کر نظر انداز کر گئے کانگریس 1930 کی دہائی کے پورے عرصے بین الاقوامی سطح پر بیانگ دہل فاشزم کی مذمت کرتی آئی تھی جب کہ یہی انگریز اسپین، آسٹریا اور چیکو سلوواکیہ کو فاشزم کے ہاتھوں نیلام کر رہے تھے۔ اس کے علاوہ انگریزوں نے روس اور چین کے تئیں ہمدردی اور اتحادی ملکوں کے تئیں تائید کے بار بار کے اعلانوں (الہ آباد، واردھا اور بمبئی میں بالترتیب یکم مئی 16 جولائی اور 8/ اگست کو منظور کی گئی قرار دادیں) کو بھی پس پشت ڈال دیا تھا۔ گاندھی نے تو اپنی مشہور "کرو یا مرو" تقریر میں یہ تک کہا تھا کہ "میں روس کی شکست کا یا چین کی شکست کا وسیلہ نہیں بننا چاہتا، انھوں نے مئی میں اپنی ایک نجی گفتگو میں (جس کا ذکر پی۔ سی۔ جوشی کے نام ایک کمیونسٹ کے اس مکتوب میں کیا گیا ہے جسے پولس نے پکڑ لیا تھا) ان لوگوں کے ساتھ عدم اتفاق ظاہر کیا تھا جو یہ سمجھتے تھے کہ جاپانی "نجات دہندہ" ثابت ہوں گے"۔ در حقیقت میں یہ سمجھتا ہوں کہ ہمیں سبھاس بوس کی مزاحمت کرنی ہوگی۔" (آئی۔ بی۔ نوٹ، 26 مئی، محولہ وائسرائے جرنل، جلد دوم، صفحہ 32-127)۔

بہر حال ایک طرح کا اختلاف رائے بھی موجود تھا؛ ایک طرف نہرو کے بشمول اقلیتی گروپ کا کہنا یہ تھا کہ شکست خوردہ اور برباد روس نیز فاتح ہٹلر اور ٹوجو والی دنیا کا تصور بھی ناقابل برداشت ہے، جب کہ ہندوستانی قوم پرستوں کی بھاری اکثریت کا پیمانہ صبر لبریز ہو چکا تھا اور وہ ہندوستان کا قومی مفاد اتحادی ملکوں کی شکست میں ہی مضمر سمجھتی تھی۔ ورکنگ کمیٹی کے الہ آباد اجلاس (اپریل) کے لیے گاندھی کے تیار کردہ اصل مسودے میں اس طرح کے جملے بھی تھے۔ "......اگر ہندوستان آزاد ہو جائے گا تو اس کا پہلا قدم جاپان کے ساتھ گفت و شنید شروع کرنے کا ہوگا...... جاپان کے ساتھ ہندوستان کی کوئی دشمنی نہیں ہے"۔ یہ جملے نہرو کے اصرار پر حذف کر دیئے گئے تھے۔ جواہر لال نہرو نے اس وقت بھرپور وار کیا جب انھوں نے اجلاس کے دوران یہ کہا کہ "...... یہ خیال گاندھی کا ہے کہ جاپان اور جرمنی کی فتح ہوگی اور غیر شعوری طور پر ان کے فیصلے اسی احساس کے تابع ہوتے ہیں"۔ (Congress Responsibility for the Disturbances، ضمیمہ 1)۔ ہمیں یہ بات ہر حال میں یاد رکھنی چاہیے کہ اسٹالن گراڈ میں جنگ کا رخ اچانک بدل جانے سے پہلے یعنی 1942 کے وسط میں ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اتحادی ملکوں کو جلد ہی شکست ہو جائے گی۔

بہر حال 9/ اگست کو صبح سویرے گرفتاریوں کی شکل میں کانگریس لیڈروں کے منظر نامے سے ہٹ جانے کے بعد تحریک کے بے مہار ہو جانے کے سلسلے میں کانگریسیوں کے تخمینوں سے حقائق کی محض جزوی ہی عکاسی ہوتی ہے۔ اس بات پر زور دینے کی ضرورت ہے کہ جلد ہی شروع کی جانے والی تحریک کی تفصیلات کے تعلق سے ہندوستان چھوڑو قرار داد قابل لحاظ حد تک مبہم

تھی۔ ایک تو یہ کہ مزید گفت و شنید کو خارج از سوال قرار نہیں دیا گیا تھا، اور سودے بازی میں موقف کو مضبوط بنانے کی یہ کوشش اس لیے دھاکہ خیز ہوگئی تھی کہ انگریزوں نے اسے پوری طاقت سے کچل دینے کا فیصلہ کرایا تھا۔ بہر حال انگریز تمام تر کوشش کے باوجود بھی اپنا یہ مقدمہ بنانے میں ناکام رہے کہ کانگریس نے واقعی 9/اگست سے پہلے پر تشدد بغاوت کا منصوبہ بنایا تھا۔ آندھرا پردیش کانگریس کمیٹی کے 29 جولائی کے اس گشتی مراسلے میں جس کا Tottenham کی رپورٹ میں حوالہ دیا گیا ہے، کانگریسیوں سے محض "تیار ہو جانے، منظم ہونے، ہوشیار رہنے کی، لیکن اس وقت تک اقدام نہ کرنے کی" اپیل کی گئی تھی" تاوقتیکہ مہاتما جی فیصلہ نہ کریں"۔ اس گشتی مراسلے میں چھ مراحل پر مشتمل جس پروگرام کا خاکہ پیش کیا گیا تھا، اس میں نمک، اسکولوں، عدالتوں اور سرکاری نوکریوں کے بائیکاٹ، غیر ملکی شراب اور کپڑے کے خلاف مظاہرے، اور "آخری کارروائی کے طور پر" محصول نہ ادا کرنے جیسے گاندھیائی طریقوں کو ہی اپنانے پر زور دیا گیا تھا۔ لگان بھی ادا نہ کرنے کے لیے کہا گیا تھا مگر صرف اسی صورت میں کہ زمیندار اس تحریک میں شامل نہ ہوں!! اس مراسلے میں "مزدوروں کی ہڑتالوں" کی بات بھی کہی گئی تھی اور ٹرینوں کو محض زنجیر کھینچ کر روکنے سے منع بھی نہیں کیا گیا تھا اور اس کی حوصلہ افزائی بھی نہیں کی گئی تھی۔ بغیر ٹکٹ سفر کرنے اور ٹیلی فون اور ٹیلی گراف کے تار کاٹنے کی بات بھی شامل تھی۔ تاہم اس انتہا پسندانہ دستاویز میں بھی ٹیلی مواصلات، نیز سرکاری اقتدار کی دوسری علامتوں کو بڑے پیمانے پر اور پر تشدد طریقے سے نشانہ بنانے کی بھی کوئی بات نہیں کہی گئی تھی جب کہ ہندوستان کے بہت سے حصوں میں 9/اگست کے بعد اس طرح کے بھی واقعات ہوئے تھے۔

اس طرح اس معاملے میں انگریزوں کی اشتعال انگیزی کا عنصر پوری طرح واضح ہے۔ جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں، جنگ چھڑ جانے کے وقت سے ہی، افسر شاہی 1932 کی ہی طرز پر کانگریس کے خلاف بھرپور کارروائی کا منصوبہ بناتی آرہی تھی جس کے لیے مفاہمت کی کوششوں کو مسترد کر کے ٹکراؤ کی صورت حال پیدا کی جارہی تھی۔ تاہم یہ بھی حقیقت ہے کہ انگریزوں کو بھی اس سے کہیں زیادہ ملا جس کے لیے انھوں نے سودے بازی کی تھی یعنی 1932 کے پیانے کی سول نافرمانی کی بجائے، جسے نسبتاً آسانی سے کچلا جا سکتا تھا، 9/اگست کے بعد لنلتھگو کے الفاظ میں "1857 کے بعد سب سے سنگین بغاوت" جیسی صورت حال پیدا ہو گئی تھی۔ "جس کی شدت اور نوعیت کو ہم دنیا کی نظروں سے محض فوجی سلامتی کی وجہ سے مخفی رکھتے آئے ہیں" (چرچل کے نام ٹیلی گرام، محولہ وائسرائے جرنل، جلد دو، صفحہ 853)۔ بہر حال ہمیں ان گہرے عوامل کو سمجھنے کی ضرورت ہے جو 1942 میں پیدا ہونے والے نئے عوامی موڑ کے پس پشت کارفرما رہے تھے، اور جنھیں گاندھی جی نے یقیناً بھانپ لیا تھا اور انھیں کمیونسٹوں سے کہیں زیادہ بہتر طریقے پر بروئے کار لائے تھے۔

ایک ایشائی طاقت کی فتح کے بعد جنوب مشرقی ایشاء میں پیدا ہونے والی افراتفری سے نہ صرف گوروں کے وقار کو سخت دھکا پہونچا تھابلکہ ہندوستانی حکمرانوں کی نسل پرستی بھی ایک بار پھر کھل کر سامنے آگئی تھی۔ ملایا، سنگاپور اور برما کے سارے گورے نقل وحمل کے سارے وسائل کو خود ہی استعمال کرتے ہوئے ان علاقوں سے شرم ناک طریقے پر نکل بھاگے تھے اور ہندوستانی تارکین وطن کو دشوار گزار جنگلوں اور پہاڑوں میں دھکے کھانے کے لیے وہیں چھوڑ گئے تھے۔ اس کا نتیجہ گوروں کے خلاف شدید غیض وغضب اور اس امید کی شکل میں سامنے آیا کہ اب انگریزی راج ختم ہونے جارہا ہے،---یہی وہ موڑ ہے جو اگست 1942 کی تحریک میں بھی حاوی رہا تھا۔ یہ محض اتفاق نہیں ہے کہ مشرقی یوپی اور شمالی ومغربی بہار، جہاں کہ اگست بغاوت شدید ترین شکل میں سامنے آئی تھی، وہ روایتی علاقے تھے جہاں سے سب سے زیادہ تارک وطن مزدور جنوب مشرقی ایشیا اور دنیا کے دوسرے حصوں میں جاتے تھے۔ مثال کے طور پر مشرقی یوپی کے ضلع اعظم گڈھ میں ہر سال تقریباً30 لاکھ روپے غیر ملکی منی آرڈر کی شکل میں پہونچتے تھے۔(RN Niblett, Congress Rebellion in Azamgarh, Allahabad, 1957.P.2)۔

یہ اجڑے ہوئے لوگ جنگلوں اور پہاڑوں میں ٹھوکریں کھاتے ہوئے کسی نہ کسی طرح وطن واپس لوٹنے میں کامیاب ہو گئے تھے، انگریزوں نے ان کی کوئی مدد نہیں کی تھی۔ اسی طرح زخمی فوجی ٹرینوں میں بھر بھر کر برما کے محاذ سے واپس لوٹ رہے تھے۔ ان باتوں کی وجہ سے ہندستان کی اکثریت کا غم وغصہ کافی بڑھ گیا تھا، خاص طور پر اس لیے بھی کہ ان ہندوستانیوں کے خیال میں دوسرے علاقوں میں لڑی جانے والی دوسرے ملکوں کی جنگ ان کے لیے مصائب کا باعث بنی تھی۔ اس کے علاوہ ان لوگوں کو اس غیر ملکی حکمرانی کے خاتمے کی بھی امید تھی۔ ہندوستان میں رکھے گئے برطانوی، امریکی اور آسٹریلیائی فوجیوں کی بھاری اکثریت نے بھی اس "عوامی جنگ" میں مثالی مجاہدوں کے طرز عمل کا بھی ثبوت نہیں دیا تھا۔ مثال کے طور پر نسلی امتیاز کی بنیاد پر کی جانے والی بد سلوکی اور آبروریزی کے واقعات میں کافی اضافہ ہو گیا تھا، اور غیر ملکی فوجیوں کے ذریعے عورتوں کے ساتھ دست درازی کے واقعات پر کانگریس کو برابر احتجاج کرنا پڑتا تھا۔ اس دوران اشیاء کی قیمتوں میں تیزی سے اضافہ ہونے لگا تھا، اور بعض علاقوں میں چاول کی قلت پیدا ہو گئی تھی، کیونکہ برما سے چاول کی درآمد کاری رُک گئی تھی۔ اسی طرح نمک کی بھی قلت ہو گئی تھی۔ جو انگریز راشن کاری اور دوسرے طریقوں کو بروئے کار لا کر اپنے ملک میں جنگی معیشت کا بہت اچھا بندوبست کر رہے تھے، انھوں نے اپنی اس نو آبادی میں عام چور بازاری اور غذائی اجناس کی منافع خوری کی روک تھام کے لیے کوئی موثر کارروائی نہیں کی۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ 1943 میں بنگال کو خوفناک قحط کا سامنا کرنا پڑا۔ قیمتوں میں تیزی سے اضافے نیز غذائی اجناس کی قلت اور بھاری تعداد میں اتحادی

فوجوں کی آمد کے نتیجے میں یہ خدشات پیدا ہو گئے تھے کہ ملک میں غذائی اجناس کا ذخیرہ آرمی کا پیٹ بھرنے کے لیے خالی کیا جارہا ہے۔ افسر شاہی کے ذریعے جنگ کا غلط بندوبست اس وقت اپنے نقطہ عروج پر پہونچ گیا تھا جب حکومت بنگال نے تمام دیسی کشتیوں کو اپنے قبضے میں لے کر تباہ کر دینے کا حکم جاری کیا تھا۔ 1942 کے وسط میں انگریزوں کو یہ بھی بھروسہ نہیں رہا تھا کہ وہ جاپان کی طرف سے بھرپور حملے کی صورت میں آسام اور بنگال کا دفاع کر سکیں گے اور چھوٹا ناگ پور کی دفائی پٹی تک پسپا ہو جانے کا منصوبہ بھی بنانا شروع کر دیا تھا۔ "روس میں جلی ہوئی مٹی کو بھی موثر طریقے پر کام میں لایا جارہا تھا۔ روسیوں نے ایک حقیقی قوم پرستانہ عوامی جنگ لڑتے ہوئے اپنے Dnieper باندھ کو بھی اڑا دیا تھا جسے ان کی پانچ سالہ ترقیاتی منصوبے میں مایہ ناز حیثیت حاصل تھی، مگر یہ طریقہ ایک ماتحت (غلام) ملک میں اپنانے کی افسر شاہی کی کوشش نہ صرف یہ کہ ایک بھاری غلطی تھی بلکہ اشتعال انگیز بھی تھی۔ بنگال میں برسات کے موسم میں ایک گھر کے ساتھ دوسرے گھر کے رابطے کے لیے بھی کشتیوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ "مشرقی بنگال میں لوگوں کو کشتیوں سے محروم کر دینا جسم کے اہم ترین اعضاء کو کاٹ پھینکنے کے مترادف ہے۔" (گاندھی، ہری جن 3/ مئی 1942)۔

ہم دیکھ چکے ہیں کہ، ہندوستان میں بڑی تعداد میں ایسے لوگ بھی تھے، جنہیں جنگ کے پہلے مرحلے کے دوران کافی فائدہ ہوا تھا۔ ان میں صنعت کار، تاجر، اور کاروباری حلقے بطور خاص شامل تھے جنہوں نے جنگی ٹھیکوں کے ذریعے کافی منافع کمایا تھا۔ اس طرح کے فائدے جنگ کے پورے عرصے جاری رہے۔ زیادہ تر ٹھیکیدار اور چور بازاریئے آخر کار ہندوستانی ہی تھے۔ مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ 1942 میں ایک مختصر سے وقفے کے لیے ہندوستان کی تاجر برادری نے چند دوسری باتوں کا بھی لحاظ رکھا تھا۔ سی پی کے گورنر نے 25/ مئی 1942 کو لنلتھگو کو یہ لکھا تھا کہ ہندوستان کا کاروباری حلقہ دو سال قبل جنگ حامی رہا تھا۔ مگر ملایا اور برما میں ہونے والے نقصان کا بنیوں اور مارواڑیوں نے بہت زیادہ اثر لیا ہے، بہت زیادہ محصولات کی وجہ سے جس جنگ سے کوئی فائدہ نہ ہوتا ہو، اور جس کے سلسلے میں سنگاپور اور رنگون میں قربانیاں بھی دینی پڑی ہوں، یہ باتیں اس حلقے کو یقیناً اچھی نہیں لگیں گی...... یہ بھی بخوبی واضح ہے کہ کانگریس ورکنگ کمیٹی کے سرمایہ دار قسم کے عناصر کسی امکانی جاپانی حملے کے مضر اثرات سے خود اپنی اور اپنی املاک کی حفاظت کے لیے کسی بھی حد تک جا سکتے ہیں۔ (وائسرائے جرنل، جلد دو صفحہ 119-117)۔ اگرچہ اس موضوع پر ابھی تک کوئی تحقیقی کام نہیں ہوا ہے، مگر یہ ناممکن بھی نہیں ہے کہ ہندوستان کے کچھ کاروباری حلقے خواہ مختصر سی مدت کے لیے سہی، در پردہ طور پر کسی ایسی تحریک کی تائید کرنا چاہتے رہے ہوں جس کے ذریعے انگریزوں کو جلد ہی بھگایا جا سکتا ہو، اور مٹی کے جھلس جانے، بم باری یا

حقیقی جنگ کے ذریعے املاک کے نقصان اور انخلاء کا متبادل سامنے آنے پر وہ اپنے طور پر امن کے لیے بھی تیار ہو گئے ہوں۔ اس میں شک نہیں کہ جمشید پور اور احمد آباد کے صنعتی حلقوں نے ان ہڑتالوں کے بارے میں بہت ہی فلسفیانہ انداز فکر اپنایا تھا جن کی وجہ سے اگست اور ستمبر 1942 میں یہ دونوں صنعتی مراکز مفلوج ہو کر رہ گئے تھے۔ جیسے ہی تحریک ناکام ہو گئی اور جاپانیوں کی جارحانہ پیش قدمی آسام کی سرحد پر ہی روک دی گئی تھی، کاروباری حلقوں کے اندازوں میں بھی تبدیلی آگئی تھی اور انھوں نے انگریزوں کی جنگی کوششوں میں مدد اور تعاون کے ذریعے منافع خوری کا سلسلہ پھر شروع کر دیا تھا۔

عدم تعاون یا سول نافرمانی کی تحریکوں کے مقابلے میں "اگست بغاوت" کے تفصیلی تجزیوں میں ابھی بہت سے کھانچے باقی ہیں۔ تاہم اسی طرح کے اعداد و شمار کو اس تحریک کے سلسلے میں بھی پروجکٹ کیا جا سکتا ہے اور اس کے لیے علاقائی سطح کے تجزیوں سے مدد لی جا سکتی ہے۔

کل ہند وضع

9/ اگست کو بالکل صبح سویرے کانگریسی لیڈروں کے دھر لیے جانے پر ملک بھر میں غیض و غضب کی زبردست لہر دوڑ گئی تھی۔ سابقہ تحریکوں کی ہی طرح اس مرتبہ بھی اہم لیڈروں کے منظر نامے سے ہٹ جانے کی وجہ سے پارٹی کے نوعمر اور نسبتاً زیادہ شدت پسند کارکنوں کو اپنے طور پر اقدام کرنے اور نچلی سطح کے لوگوں کو اپنا دباؤ بڑھانے کا موقع مل گیا تھا۔

Amery کا یہ الزام بالکل الٹا پڑا کہ کانگریس نے ٹیلی مواصلات کے نظام کو نشانہ بنانے اور تخریب کاری کا منصوبہ بنایا تھا، کیونکہ کے۔ جی مشروو الا (جنھوں نے مہادیو ڈیسائی کی گرفتاری کے بعد 'ہری جن' کے دو بہت ہی سخت قسم کے شمارے شائع کیے تھے) جیسے بہت لوگوں کا خیال یہ تھا کہ ورکنگ کمیٹی کا ایسا کوئی منصوبہ نہیں تھا۔ تحریک کے بعد کے مرحلے میں، بہت سے روپوش گروپوں نے اے آئی سی سی کے نام سے بہت ساری "ہدایات" جاری کی تھیں اور اس کے ممبروں کی اکثریت جیل میں تھی۔

"ہندوستان چھوڑو" تحریک کو تین وسیع تر مرحلوں میں رکھا جا سکتا ہے۔ پہلے مرحلے میں، جو کہ بہت ہی زبردست اور پُر تشدد بھی تھا اور جسے بڑی تیزی سے کچل بھی دیا گیا تھا، زیادہ تر شہری علاقوں کے لوگوں نے حصہ لیا تھا۔ اس مرحلے میں تحریک زیادہ تر ہڑتالوں، نیز پولس اور آرمی کے ساتھ ٹکراؤ کے واقعات تک ہی محدود رہی۔ بمبئی 9/ سے 16/ اگست تک اس طرح کے ہنگاموں کا سب سے بڑا مرکز رہی، کلکتہ میں 10/ سے 17/ اگست تک ہڑتال رہی، دہلی میں زبردست ٹکراؤ کے واقعات ہوئے جن میں کافی جانی نقصان ہوا اور پٹنہ میں 11/ اگست کو سکریٹریٹ کے سامنے

مشہور ٹکراؤ کے بعد شہر پر دو دن تک انگریزوں کا کنٹرول نہیں رہا تھا۔ دہلی میں تشدد کی بڑی وجہ مل ورکروں کی ہڑتال تھی۔ (لنلتھگو بنام آمیری، 12/اگست)، اور پھر اگلے دن ہی وائسرائے نے لکھنؤ، کان پور، بمبئی، ناگ پور، اور احمد آباد میں بھی "ہڑتالوں کی رپورٹ دی تھی (وائسرائے نے جرنل، جلد دو صفحہ 669.682,683)۔ ہڑتال کی وجہ سے ٹاٹا اسٹیل کارخانہ 20/اگست سے 13 دن تک بند رہا تھا۔ اس ہڑتال میں ورکروں کا صرف یہی ایک نعرہ تھا" جب تک قومی حکومت تشکیل نہیں دی جائے گی، وہ کام پر واپس نہیں آئیں گے" (لنلتھگو بنام امیری، 21 اگست ایضا)۔

احمد آباد میں کپڑا ملوں کی ہڑتال ساڑھے تین ماہ چلی تھی، اور بعد میں ایک قوم پرست مقامی اخبار نے اس شہر کو "ہندوستان کا اسٹالن گراڈ" بتایا تھا۔ (گوبند سہائے، Rebellion 42، دہلی، 1947، صفحہ 128)۔ پہلے مرحلے میں جو کہ طالب علموں نے شروع کیا تھا، متوسط شہری طبقے نے نمایاں طور پر حصہ لیا تھا۔

بہر حال تقریباً اگست کے وسط سے ہی تحریک کا رُخ دیہی علاقوں کی طرف منتقل ہونا شروع ہو چکا تھا، کیونکہ بنارس، پٹنہ اور کٹک کے طلباؤ ٹیلی مواصلات کے نظام کو بڑے پیمانے پر نقصان پہونچاتے ہوئے اطراف میں پھیلنے لگے تھے اور کسان طبقوں کے اندر گوروں کی حکمرانی کے خلاف بغاوت کے جذبات بھڑکانے لگے تھے، جس سے 1857 کی بغاوت کی یادیں تازہ ہو گئی تھیں۔ شمالی اور مغربی بہار، مشرقی یوپی، بنگال میں مدناپور، نیز مہاراشٹر، کرناٹک اور اڑیسہ کے کچھ علاقے اِس دوسرے مرحلے کے اہم مرکز بن گئے تھے اور متعدد مقامات پر مقامی سطح کی "قومی حکومتیں" بھی قائم کی گئی تھیں۔ جو بہر حال بہت ہی عارضی ثابت ہوئی تھیں۔ یہ تحریک جو کہ انگریزوں کے انتہائی بہیمانہ اقدامات (12 ستمبر کو سکریٹری آف اسٹیٹ کو حکومتِ ہند کی رپورٹ کے مطابق آرمی کی کم از کم 57 بٹالینیں استعمال کی گئی تھیں؛ وائسرائے جرنل جلد دوم صفحہ 3-952) کے نتیجے میں کافی کمزور پڑ چکی تھی، ستمبر کے آخر میں اپنے طویل ترین اور کافی حد تک کم خطرناک مرحلے میں داخل ہوئی۔ اس مرحلے میں تعلیم یافتہ نوجوان ٹیلی مواصلات نیز پولس اور آرمی کی تنصیبات کو دہشت پسندانہ کارروائیوں کا نشانہ بناتے تھے، بلکہ ان کی کارروائیاں بعض اوقات چھاپہ مار جنگ (اسی طرح کی ایک جنگ شمالی بہار اور نیپال کی سرحد سے متصل علاقوں میں بھی لڑی گئی تھی جس کی قیادت جے۔ پرکاش نرائن نے کی تھی) کی حدود تک بھی پہنچ جاتی تھیں۔ ایسے جزوقتی کسان دستے تیار کئے گئے تھے جو دن میں کھیتی کا کام کرتے تھے اور رات میں تخریبی کارروائیوں میں مصروف رہتے تھے۔ (اسے مبینہ طور پر کرناٹک طریقہ کا نام دیا گیا تھا۔) بعض علاقوں میں خفیہ طریقے پر "قومی حکومتیں" بھی کام کرتی تھیں۔ اس طرح کی حکومتیں غالباً مدناپور کے تاملوک، میں، مہاراشٹر کے ستارا میں اور اڑیسہ کے تلچیر میں قائم کی گئی تھیں۔ اگر چہ یہ سب کارروائیاں ہر

لحاظ سے انتہائی اثر انگیز اور بہادرانہ تھیں مگر ان سے ہندوستان میں برطانیہ کی حکمرانی یا اتحادی ملکوں کے جنگی منصوبے کے لیے کسی طرح کا خطرہ نہیں تھا۔ مثال کے طور پر ضلع مدناپور کے الگ تھلک علاقے کے ایک کونے میں ایک بے اثر سی 'قومی حکومت" سے نہ تو کلکتہ کے لیے کسی طرح کا خطرہ تھا اور نہ ہی آراکان اور آسام کے محاذوں کے ساتھ ٹیلی رابطے کے لیے کوئی خطرہ پیدا ہو سکتا تھا، شاید اسی وجہ سے تاملوک کی "جاتیہ سرکار" ستمبر 1944 تک قائم رہ سکی تھی۔

سرکاری اعداد وشمار سے اس بغاوت کے دائرہ اثر اور حکومت کے انتہائی ظالمانہ اقدامات کی نوعیت کی کسی قدر نشان دہی ہوتی ہے۔ 1943 کے آخر تک 91,836 لوگ گرفتار کیے گئے تھے جن میں سب سے زیادہ، یعنی 24,416 لوگ بمبئی پریزیڈنسی میں، 16796 لوگ یوپی میں اور 16202 لوگ بہار میں گرفتار کیے گئے تھے۔ 208 پولس چوکیوں، 332 ریلوے اسٹیشنوں اور 945 ڈاک گھروں کو تباہ کر دیا گیا تھا یا نقصان پہونچایا گیا تھا۔ اور 664 بم دھماکے ہوئے تھے۔ پولس تھانوں پر بھیڑ کے سب سے زیادہ (208 میں سے 72) حملے بہار میں ہوئے تھے جب کہ بمبئی کے 447 کے مقابلے میں بہار میں محض 8 بم دھماکے ہوئے تھے۔ اس سے صاف پتہ چلتا ہے کہ تحریک میں سب سے زیادہ حصہ بہار کے لوگوں نے لیا تھا جب کہ بمبئی میں دہشت پسندانہ کاروائیاں زیادہ منظم طریقے پر کی گئی تھیں۔ پولس یا آرمی کی فائرنگ میں 1060 لوگ مارے گئے تھے (حالانکہ یہ تعداد کافی کم بتائی گئی ہے)، جب کہ اس بغاوت کا مقابلہ کرتے ہوئے 63 پولس مین بھی مارے گئے تھے، اور 216 پولس مین حکومت سے منحرف ہو گئے تھے، ان میں کم از کم 205 بہار میں ہی منحرف ہوئے تھے۔ (ہوم، پولٹیکل، 3/52/1943، محولہ: وائی۔ پی ماتھر؛ کوئٹ انڈیا موومنٹ، دہلی 1979، صفحہ 2-190)۔ جہاں تک سرکاری زیادتیوں کا سوال ہے، ایک کانگریسی ذریعے نے، تاملوک تحصیل میں آبروریزی کے 74 واقعات کی فہرست تیار کی تھی، جن میں 46 واقعات 9/اگست کو صرف ایک ہی گاؤں میں ہوئے تھے (ستیش سامنت، اگست ریوولیوشن اینڈ ٹوائیرس نیشنل گورنمنٹ ان مدناپور۔ کلکتہ 1946، صفحہ 40)۔ اعظم گڈھ (مشرقی یوپی) کے ضلع مجسٹریٹ آر۔ ایچ۔ Niblett نے، جسے کہ نرم رویہ اپنانے پر ہٹا دیا گیا تھا، اپنی ڈائری میں "غیر ضروری سفید دہشت پسندی...... کی متعدد مثالوں کا ذکر کیا ہے۔ اس کے مطابق انگریزوں نے اپنی اس غیر ضروری سرکاری دہشت گردی کے دوران "بے مہار پولس کو میلوں تک دیہات کو نذر آتش کر دینے کے لیے کھلی چھوٹ دیدی تھی۔ Niblett نے اپنے اس روز نامچے میں اس "سرکاری بدحواسی' کا ذکر بھی کیا ہے جس میں بے لگام انتقامی کارروائی کی جارہی تھی اور سرکاری ڈاکہ زنی کے طور پر لوگوں پر اجتماعی جرمانے لگائے جاتے تھے" Niblett نے یہ بھی ذکر کیا ہے کہ وہ کس طرح اپنے آدمیوں کو بیکار ہی برابر خبر دار کرتا رہتا تھا کہ وہ "ہمیشہ یہ یاد رکھیں کہ وہ نہ تو شکار

کے لیے نکلے ہیں اور نہ ہی تباہی و بربادی برپا کرنے کے لیے" (RH. Niblett
P.P.26,40,44,49)۔ سر عام کوڑے مارنے کی سزا کے ساتھ ساتھ ڈنڈا کھسیڑ نے جیسے اذیت رسانی کے طریقوں کا استعمال عام تھا۔ گویا ایک بار پھر 1857 برپا کیا جارہا تھا، صرف اس فرق کے ساتھ کہ اب جدید فوجی علوم کے سارے وسائل انگریزوں کے تسلط میں تھے جب کہ ہندوستانی عوام مکمل طور پر غیر مسلح تھے۔ 15/اگست کو ہی لنلتھگو پٹنہ کے ارد گرد ٹیلی مواصلات میں خلل پیدا کرنے والوں پر فضا سے مشین گنوں کے ذریعے فائرنگ کرنے کا حکم دے چکا تھا جب کہ بہار کے بھاگل پور اور مونگیر میں، بنگال کے تاملوک اور ندیا میں اور اڑیسہ کے تلچر میں ہوائی جہاز بھی استعمال کیے گئے تھے۔

سماجی بناوٹ

جیسا کہ ہم پہلے ہی دیکھ چکے ہیں، سماجی بناوٹ کے نقطۂ نظر سے یہ پتہ چلتا ہے کہ اس تحریک میں محنت کش طبقے نے کسی قدر پہلے ہی مگر محدود پیمانے پر اور مختصر سی مدت کے لیے ہی حصہ لیا تھا۔ لنلتھگو نے 16/اگست کو ہی یہ رپورٹ دیدی تھی کہ "مل عناصر الگ ہو رہے ہیں" اور گووند سہائے کی روایت کے مطابق بمبئی شہر میں "عام طور پر مزدور طبقے نے اور خاص طور پر کپڑا ملوں کے ورکروں نے بہت ہی محدود رول ادا کیا تھا" (وائسرائے جرنل، جلد دو، صفحہ 91، گووند سہائے، صفحہ 89)۔ کلکتہ کی صنعتی پٹی بھی زیادہ تر پرسکون ہی رہی تھی، اس طرح ان دونوں مقامات پر کمیونسٹوں کے ذریعے تحریک کی مخالفت نے ورکروں کو کنٹرول رکھنے میں اہم رول ادا کیا۔ جمشید پور اور احمد آباد کے علاوہ احمد نگر اور پونا جیسے چھوٹے مرکزوں میں محنت کش طبقے کی قابل لحاظ شمولیت مہینوں جاری رہی تھی۔ یہ وہ مقامات تھے جہاں کمیونسٹوں کے اثرات کافی کم تھے اور گاندھی کے اثر کی وجہ سے "محنت کش طبقے اور سرمائے کے درمیان خوشگوار تعلقات" تھے۔ اور" مل مالکان نے ورکروں کی غیر حاضری پر کوئی ناگواری ظاہر نہیں کی تھی۔" (گووند سہائے، صفحہ 110)۔ بنگلور شہر میں جہاں کہ کانگریسی لیڈر کے ٹی بھاشیم برسوں ٹریڈ یونین کے میدان میں سرگرم رہے تھے، 30,000 ورکروں نے مختصر سی مدت کے لیے ہڑتال کی۔ (جیمس مینور، صفحہ 136,147)۔ کاروباری طبقے کی شمولیت کی نوعیت کا تاحال کوئی تفصیلی تجزیہ نہیں کیا گیا ہے، مگر سہائے کی روایت کے مطابق بمبئی میں یہ شمولیت قابل لحاظ تھی یہ ایک دلچسپ بات ہے کہ دسمبر 1942 میں ایک خلاف قانون سوشلسٹ کتابچے "دی فریڈم اسٹرگل فرنٹ" کے ذریعے خبردار کیا گیا تھا کہ "طبقاتی امور کی پامالی کے خوف کو متمول مل مالکان یا بینکروں سے مالی مدد کے حصول کی راہ میں رکاوٹ" نہیں بننے دینا چاہیے۔ اس طرح کی کہانیاں بھی ہیں کہ اعلا طبقے اور اعلا ہندوستانی

افسروں نے بھی خفیہ طور پر اس تحریک میں کافی لحاظ حد تک مدد کی تھی۔ اس طرح کی تائید اور مدد کے نتیجے میں تحریک کے سرگرم کارکنوں کو (جن میں بیشتر ایسے تھے جو دہشت پسندوں یا کمیونسٹوں کے برخلاف زمین دوز طریقہ کار کا کوئی تجربہ نہیں رکھتے تھے) موثر اور غیر قانونی ساز و سامان کی تیاری اور فراہمی میں مدد ملی تھی۔ مثال کے طور پر بمبئی میں اوشامہتہ کی نگرانی میں تین ماہ تک ایک خفیہ ریڈیو اسٹیشن بھی چلایا گیا تھا۔

سول نافرمانی کی تحریک کے برخلاف 1942 کی تحریک میں متوسط طبقے کے طلباء پیش پیش رہے تھے: شہری علاقوں میں حکومت کے ساتھ ٹکراؤ کی صورت میں، تخریب کاری منظم کرنے کی صورت میں اور کسانوں کو بغاوت کے لیے اکسانے کی صورت میں! بہر حال اگست تحریک کے اتنی بھیانک شکل اختیار کر جانے کی وجہ یہ تھی کہ مخصوص علاقوں میں کسان طبقہ بُری طرح سے بھڑک گیا تھا۔ اس سلسلے میں سرکاری افسران نت نئی دریافتیں کر رہے تھے۔ مثلاً بہار کا ایک پورا علاقہ (سارن) "اعلانیہ جرائم پیشہ ضلع تھا" یا یہ کہ طالب علموں کو "بہار کے گاؤوں میں پھیلی ہوئی جرائم پیشہ آبادی" سے دوست اور مددگار مل رہے ہیں" (بہار کے گورنر اسٹیورٹ کا مکتوب بنام لنلتھگو، وائسرائے جرنل، جلد دو، صفحہ 790) مشرقی یوپی۔ مغربی بہار کے خطے میں لفظ "ہجوم" (بھیڑ) کا شماریاتی تجزیہ کرنے کی کوشش (میکس ہرکورٹ، کانگریس اینڈ دی راج،) سے یہ اشارہ ملتا ہے کہ دوسری تمام قوم پرستانہ شورشوں کی طرح ہی 1942 کی تحریک بھی عادی مجرموں اور بد معاشوں کی تحریک ہونے کی بجائے چھوٹے جوت داروں کا ایک زبردست اُبال تھا۔ گرفتار ہونے والوں میں بھاری اکثریت متوسط طبقے کے لوگوں (1214 کے ایک نمونے میں 17 فی صد براہمن، 27.5 فی صد راجپوت اور بھومیار تھے، جب کہ اچھوت محض 7.4 فی صد اور قبائلی 4.2 فی صد تھے) کی تھی جب کہ 242 کے ایک دوسرے نمونے میں کسان 36.50 فی صد زمیندار 0.8 فی صد اور زرعی مزدور 3.5 فیصد تھے۔ بد قسمتی سے یہ نمونے کافی چھوٹے ہیں، اور زمرے بھی غیر معین اور مبہم اور چند بھیانک قسم کی غلطیوں (مثلاً Nilbett کے بیان کو اعظم گڈھ کی بجائے بلیا کی بابت بتایا گیا ہے) کی وجہ سے پورا مقالہ ہی مشتبہ ہو گیا ہے۔ اس لحاظ سے کہا جا سکتا ہے کہ اس موضوع کے سلسلے میں تحقیق کا میدان ابھی کافی وسیع ہے۔

جہاں 1942 کی تحریک انگریز مخالف شدت پسندی کی سطح کے لحاظ سے کانگریسی قیادت والی دوسری تمام تحریکوں کو کافی پیچھے چھوڑ گئی تھیں وہیں 1857 کی ہی طرح اس مرتبہ بھی غیر ملکی حکمرانوں کے خلاف جذبات داخلی طبقاتی تناؤ، اور سماجی انتہاپسندی میں شاید کمی کا باعث ہوئے تھے۔ جدوجہد آزادی محاذ (The Freedom Struggle Front) کا معذرت خواہانہ انداز میں یہ کہنا تھا کہ..... طبقاتی جنگ کا مرحلہ آ سکتا ہے، مگر ابھی نہیں، کم سے کم اس وقت تک ہرگز

نہیں جب تک غیر ملکی استحصال سے نجات حاصل نہیں ہو جاتی۔ اور اے آئی سی سی یا "گاندھی بابا" کے نام سے جاری کی جانے والی خفیہ ہدایات میں "لگان صرف اسی حالت میں ادا نہ کرنے کی تاکید کی جاتی تھی جب کہ زمیندار حکومت کے وفادار پائے جائیں" (کانگریس ریسپانسیبلیٹی فار دی ڈسٹربنسز، ضمیمہ نمبر پانچ، چھ، سات، آٹھ اور نو)۔ "اس تحریک کی نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ نجی املاک کو ہرگز نشانہ نہیں بنایا گیا تھا (گووند سہائے، صفحہ 96)۔ اور لگان کی عدم ادائیگی پر بھی 1930-34 کی تحریک کی طرح زور نہیں دیا گیا تھا۔ "یہ بات کہنے میں کتنی عجیب لگتی ہے کہ، لگان کی تحصیل میں کوئی خاص مشکل پیش نہیں آتی تھی" اور یہ کہ پٹواریوں سے رکارڈ چھین لینے اور جلا دینے کے صرف دو یا تین واقعات کا ہی رکارڈ ملتا ہے" یہ بات Niblett نے اعظم گڈھ کے سلسلے میں تحریر کی ہے۔ اس کے بیان کے مطابق ضلع بھر میں نجی املاک پر حملے کا صرف ایک واقعہ ہوا تھا، اور یہ جائیداد بھی ایک ناموجود گورے زمیندار کی تھی جب کہ دوسرے تمام مقامات پر "بیج کے ذخیروں پر بھی لوٹ پاٹ نہیں کی گئی"۔ (Niblett- P. 29, 31,175)۔ Niblett کی تفصیلات سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ لوگوں نے "تھانوں" پر قبضہ کر لیا تھا کیونکہ ان کا خیال تھا کہ آزادی حاصل ہو گئی ہے (ایضاً صفحہ 13) پھر جیسے ہی انگریزوں کے استبدادی اقدامات کی وجہ سے یہ خواب ٹوٹ گیا تھا، کسانوں کا جوش و خروش بھی ٹھنڈا پڑتا گیا تھا کیونکہ ان کی فوری ضرورتوں کے سلسلے میں کوئی بھی ٹھوس پروگرام نہیں تھا۔ روپوش لیڈروں نے زیادہ بہتر تکنیکی طریقوں سے تحریک میں پھر سے جان ڈالنے کی کوشش کی۔ (جے۔ پرکاش۔ نرائن نے اپنے کتابچے "تمام مجاہدین آزادی کے نام" (To all Fighters Freedom) یا ABC of Dislocation کے ذریعے ایک باضابطہ انقلابی گوریلا آرمی بنانے کا نعرہ دیا تھا) مگر صورت حال میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہو سکی۔ جیسا کہ ہم آگے چل کر دیکھیں گے، یہ ایک دلچسپ بات ہے کہ تاملوک، تلچر، اور ستارا جیسے علاقوں میں جہاں کے مقامی حالات نے شاید شدت پسندوں کو زیادہ ٹھوس اور انتہا پسندانہ سماجی و معاشی پالیسیاں اپنانے پر مجبور کر دیا تھا، 'قومی حکومتیں" زیادہ دیرپا ثابت ہوئی تھیں۔

علاقائی فرق

1942 کی تحریک کا ابھی تک کوئی علاقائی تجزیہ تو نہیں کیا گیا ہے، البتہ تحریک کی نوعیت اور دائرہ اثر کے فرق کے بارے میں کچھ عام اشارے یقیناً کیے جا سکتے ہیں۔ پنجاب اور کانگریسی صوبۂ سرحد مکمل طور پر پُر سکون رہا تھا، اس طرح کہ ان میں سے ہر ایک صوبے میں پولس فائرنگ کے محض دو واقعات ہوئے تھے اور 2500 گرفتاریاں ہوئی تھیں۔ پنجاب کی سیاست پہلے ہی ہندو، مسلم اور سکھ کے خانوں میں تقسیم ہو کر فرقہ وارانہ رنگ اختیار کر چکی تھی جب کہ جنگ کے زمانے میں

آرمی کی ملازمت اور غذائی اجناس کی قیمتوں میں اضافے کی وجہ سے کسان طبقہ خاموش تھا جو کہ کافی خوش حال ہو چکا تھا۔ صوبہ سرحد میں کانگریس کی کمزوری اس طرح سامنے آرہی تھی کہ اس کے تئیں مسلمانوں کی تائید کم ہوتی جارہی تھی۔ یہ بھی واقعہ ہے کہ تقریباً سبھی مقامات پر مسلمانوں نے خود کو 1942 کی تحریک سے الگ ہی رکھا تھا، البتہ یہ مسلمان انگریز مخالف یا انگریز حامی رویہ اپنانے کی بجائے پوری طرح غیر جانب دار ہی رہے تھے۔ تحریک کے دوراں کہیں کوئی بڑا فرقہ وارانہ واقعہ بھی نہیں ہوا۔ مدراس ریزیڈنسی میں بھی تحریک کافی کمزور رہی تھی، ماسوا ساحلی آندھرا کے کنلور اور مغربی گوداری جیسے چند منتشر علاقوں نیز تامل ناڈو کے کوئمبتور اور رمناڈ جیسے علاقوں کے! ہو سکتا ہے کہ راجہ جی کے ذریعے تحریک کی مخالفت نے اس سلسلے میں رول ادا کیا ہو، بہر حال کیرالہ میں بھی کمیونسٹوں کی طرف سے اپنائے گئے معاندانہ رویہ کی وجہ سے تحریک نہیں کے برابر رہی تھی۔ ریاست کے عوام سے روپوش کانگریسی اور سوشلسٹ لیڈروں کی بار بار کی اپیلوں کے باوجود بھی رجواڑوں میں بھی یہ تحریک 39-1938 کے دوران ظاہر کی گئی شدت سے بھی کم تر رہی۔ بڑے رجواڑوں میں صرف میسور کی ریاست ہی سب سے زیادہ متاثر رہی تھی۔ یہاں بھی تحریک کل ہند سطح کی ہی طرح تینوں مرحلوں سے گزری۔ شہری علاقوں میں مظاہرے اور بنگلور میں ہڑتالیں؛ گاؤں میں تحریکیں؛ اور طالب علموں کے خفیہ گروپوں کے ذریعے تخریبی کارروائیاں۔

تحریک کے چار بڑے ہنگامہ خیز مرکز بہار و مشرقی یوپی، مدناپور، اڑیسہ اور مہاراشٹر و کرناٹک اس بھیانک عوامی بغاوت کی ایک بالکل ہی مختلف تصویر پیش کرتے ہیں۔ تحریک میں سب سے زیادہ شدت اور زیادہ دائرہ اثر بہار میں تھا، جو کہ 1930 کی دہائی میں کسان سبھا کا سب سے بڑا مرکز رہا تھا اور جہاں کسان سبھا کے بیشتر لوگ (کادر) کیمونسٹوں اور سہج آنند کے ذریعے اپنائے جانے والے نئے جنگ حامی موقف کے باوجود بھی سوشلسٹوں سے جا ملے تھے۔ کچھ عرصہ کے لیے پٹنہ، گیا کے علاوہ باقی تمام اضلاع سے کٹ گیا تھا، اور شمالی و وسطی بہار کے دس اضلاع میں تقریباً 80 فی صد پولس تھانوں پر قبضہ کر لیا گیا تھا یا انھیں خالی کرا لیا گیا تھا، تحریک میں قبائلیوں نے بھی قابل لحاظ حصہ لیا تھا، کیونکہ ایک کانگریسی ذریعے نے سب سے زیادہ ہلاکتوں کا تخمینہ ہزاری باغ (کل 1761 میں سے 533) کا لگایا تھا، (گووند سہائے، صفحہ 135)۔ بغاوت کی لہر مغربی بہار کے بھوجپوری علاقے سے بڑی تیزی سے پھیل کر یکساں معیشت اور ثقافت والے یوپی کے بنارس ڈویژن تک پہونچ گئی تھی۔ بلیا میں تمام دس پولس تھانوں پر قبضہ کر لیا گیا تھا اور یہاں کانگریسی لیڈر چیتو پانڈے کے سرکردگی میں اور غازی پور میں "قومی حکومتیں" قائم کر دی گئی تھیں۔ 17-15/ اگست کو اعظم گڈھ میں مدھوبن پولس تھانے پر قبضے کا ذکر Niblett نے بڑے نادر انداز سے کیا ہے۔

تھانے کی طرف 5000 کی بھیڑ اس طرح بڑھ رہی تھی کہ لوگوں کے کاندھوں پر لاٹھیوں اور بلموں کے ساتھ ساتھ ہلوں کے پھالے، ہتھوڑے، درانتیاں اور پھاوڑے بھی تھے...... دور سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا سرکنڈوں کا جنگل چلا آرہا ہو"۔ واقعہ تو یہ ہے کہ دو زمینداروں کے ذریعے دیہی آبادی سے اجتماعی وصولی کرکے محصور محافظ دستے کو رسدات فراہم کی جاسکی تھیں (Niblett. pp. 13-18)۔ مشرقی یوپی اور بہار کے انتہائی متاثرہ 16 اضلاع میں ٹیلی مواصلات نظام اور امن و قانون کی بحالی کے لیے بھاری تعداد میں آرمی اور پولس کو ہفتوں بروئے کار لانا پڑا تھا اور اس کے باوجود بھی اِکادُکا چھاپہ مار سرگرمیوں کا سلسلہ 1944 تک جاری رہا تھا، اور متعدد مقامی متوازی قومی حکومتیں بھی برقرار رہی تھیں جو کہ نیپال کی سرحد پر سے۔ پرکاش نرائن اور رام منوہر لوہیا کی عبوری حکومت سے وابستہ تھیں۔

اگر کسی باغی "قومی حکومت" کی سب سے عمدہ وضاحت ملتی ہے تو وہ مدناپور کی تاملوک تحصیل کی تھی جس کی تفصیل حیش ساست جیسے مقامی کانگریسی لیڈروں نے بیان کی ہے جو کہ تاملوک جاتیہ سرکار، کے پہلے "سربھ ادھیانیک" تھے۔ تاملوک اور پڑوس کی 'کونتائی، تحصیل گاندھیائی لیڈروں کا ایک پرانا مرکز رہ چکی تھی، جہاں دیہی تعمیراتی کام کی ایک مسلسل تاریخ تھی۔ بہار اور مشرقی یوپی کے مقابلے اس علاقے میں 1942 کی تحریک نسبتاً کم تشدد آمیز تو رہی تھی مگر زیادہ منظم طریقے پر چلائی گئی تھی؛ اور مخصوص حالات (کشتیوں اور سائکلوں کو تباہ کرنے کی انگریزوں کی تردیدی "پالیسی کی مزاحمت کرنے اور 16 اکتوبر 1942 کے سمندری طوفان اور پھر اگلے سال کے قحط کے متاثرین کو راحت فراہم کرنے کی ضرورت) نے نسبتاً زیادہ انتہاپسندانہ معاشی پالیسی کے لیے مجبور کردیا تھا۔ کانگریس 1942 کے وسط سے تردیدی پالیسی کی مزاحمت اور علاقے سے غذائی اجناس کی برآمدکاری پر روک لگانے کے نعروں کی بنیاد پر تحریک چلاتی آرہی تھی اور تاملوک تحصیل میں پہلا ٹکراؤ 8/ستمبر کو اس وقت ہوا تھا جب دانی پور گاؤں والوں نے ایک مل مالک کے ذریعے چاول کی برآمدکاری میں اپنے طور پر رُکاوٹ پیدا کردی تھی، اور اس کے بعد قوم پرست رضاکاروں کی مدد طلب کی تھی۔ 29 ستمبر کو تاملوک، مہی شڈل، ست ہاٹا، نندی گرام کے ساتھ ساتھ کونتائی کے بھگوان پور میں ٹیلی مواصلات کے نظام اور پولس تھانوں پر ایک ساتھ حملے کیے گئے تھے اور لوگوں نے بڑی بڑی بھیڑ کی شکل میں اکٹھا ہو کر پولس تھانوں پر ہلہ بول دیا تھا۔ ست ہاٹا تھانے پر تو قبضہ بھی ہو گیا تھا مگر دوسرے مقامات پر کافی خون خرابہ ہوا تھا اور صرف ایک ہی دن میں 44 لوگ مارے گئے تھے جن میں تاملوک کی ایک 73 سالہ غریب بیوہ ماتنگنی ہزرا بھی شامل تھی جس نے گولی کھانے کے بعد بھی قومی جھنڈا اُٹھائے رکھا تھا۔ دو ہفتے بعد سمندری طوفان سے تاملوک تحصیل میں 50 فی صد فصل اور 70.000 مویشی ضائع اور 4000 لوگ ہلاک ہوگئے

تھے۔ حکومت کی طرف سے کوئی خاص راحت (دانستہ طور پر) نہ دیئے جانے پر کانگریسی رضاکاروں کو بڑے پیانے پر آپ اپنی مدد کا پروگرام شروع کرنا پڑا تھا، اور 17/دسمبر 1942 کو قائم کی گئی "تامر لپت جاتیہ سرکار نے" بطور خاص اس کام کو ہی اپنے ہاتھ میں لیا تھا، بعد میں اس حکومت کی ماتحت شاخیں ست ہاٹا، نندی گرام، مہی شدل میں بھی قائم ہو گئی تھیں۔ یہ جاتیہ (قومی) سرکار ستمبر 1944 تک قائم رہی تھی، جس کے پاس ایک مسلح ودیوت واہنی تھی۔ اس نے مصالحتی عدالتوں کا بھی ایک نظام قائم کیا تھا جنھوں نے ایک دعوے کے مطابق، 1681 معاملات کا تصفیہ کیا تھا۔ اس حکومت نے اسکولوں کو مالی مدد فراہم کی، 79,000 روپے کی بقدر راحت رسانی کا بندوبست کیا، اور سب سے دلچسپ بات یہ ہے کہ "خوش حال لوگوں کا فاضل دھان...... ضرورت مند گاؤں والوں میں تقسیم کیا۔ اس جاتیہ سرکار نے متمول ذخیرہ کاروں اور منافع خوروں کو خبردار کیا کہ وہ استحصال کا سلسلہ فوراً بند کر دیں۔ انھیں قابل لحاظ مقدار میں رقم اور دھان ادا کرنے کے لیے بھی مجبور کیا تھا جسے پریشان حال لوگوں میں تقسیم کیا گیا تھا۔

اڑیسہ کے ضلع بالاسور میں جو کہ مدناپور سے لگتا ہے، کانگریس نے نمک کے ذخیروں کو تباہ کرنے، ٹیلی مواصلات میں خلل پیدا کرنے اور گاؤں سوراج پنچایت کے ذریعے غذائی اجناس کے ذخیروں کے بندوبست کے پروگراموں کو منظم کیا تھا۔ 28/ستمبر کو ارام۔ باسودیو پور کے پولس تھانے پر ایک بڑی بھیڑ کے حملے میں 35 لوگ مارے گئے تھے، اور گروپال علاقے میں ایک قومی حکومت نے بھی کچھ عرصہ تک کام کیا تھا۔ ارام۔ باسودیو پور فائرنگ سے متعلق سرکاری تحقیقاتی رپورٹ میں کہا گیا تھا کہ یہ افواہ پھیل گئی تھی کہ ایک ہفتے کے اندر اندر سوراج حاصل کرلیا جائے گا...... اور یہ کہ سوراجی حکومت میں کسی بھی طرح کا محصول ادا نہیں کرنا پڑے گا اور مالدار لوگوں کا دھان غریبوں کے بھی کام آئے گا۔ کٹک بھی ہنگاموں کا مرکز رہا تھا، یہ دوسری بات ہے کہ یہاں ایک مقامی تنظیم، رکت واہنی کے ذریعے منظم کی گئی دہشت پسندانہ سرگرمی عوامی اقدام سے کہیں زیادہ اہمیت حاصل کر گئی تھی۔ کوراپٹ میں جس کی زیادہ تر آبادی قبائلیوں پر مشتمل تھی، زبردست عوامی شورش برپا ہوئی تھی جس کے دوران جے پور، زمینداری کے خلاف تحریکیں بھی چلائی گئی تھیں، محفوظ جنگلات پر ہلہ بولا گیا تھا اور پولس تھانوں پر حملوں کے واقعات ہوئے تھے۔ اس شورش کی قیادت ایک ناخواندہ دیہاتی لکشمن نائک نے کی تھی جسے ایک فوریسٹ گارڈ کے قتل کے الزام میں 16/نومبر کو پھانسی دیدی گئی تھی۔ (ایچ۔ مہتاب، ہسٹری آف فریڈم مومنٹ ان اڑیسہ، جلد 4، کٹک 59-1957، صفحہ 94،88)۔ تلچیر ریاست میں چھاپہ مار سرگرمیاں مئی 1943 تک جاری رہی تھیں، جس کے دوران "چاسی مولیا" (کسان۔ مزدور) راج" بھی قائم کیا گیا تھا جس کا دائرہ اثر تقریباً 400 مربع کلو میٹر کے رقبے میں پھیلا ہوا تھا اور 7/ستمبر 1942 کو تلچیر قصبے پر حملہ

بھی کیا گیا تھا۔ اس حملے کو ہوائی جہازوں کے استعمال کے ذریعے ہی پسپا کیا جا سکا تھا۔ تلچیر میں جہاں کہ جبریہ مزدوری (بیٹھی) جنگلاتی قوانین اور ظالمانہ قواعد و ضوابط کے خلاف ستمبر 1938 میں بھی عوامی تحریک چلی تھی، 1942 کی شورش کی بڑی وجہ یہ افواہ تھی کہ ریاستی پرجامنڈل کے صدر رودہترا موہن پردھان کو قتل کر دیا گیا ہے (گووند سہائے، صفحہ 422-420)۔

ابتدائی مرحلے کی شہری شورش کے کچل دیئے جانے کے بعد بمبئی پریزیڈنسی کے علاقے میں یہ تحریک دو مختلف شکل اختیار کی گئی یعنی ایک طرف تو کچھ علاقوں میں کسان چھاپہ مار جنگ، بڑے پیمانے پر دہشت پسندانہ کارروائی اور تخریب کاری کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا، جس میں زیادہ تر تعلیم یافتہ لوگ ہی شامل تھے اور انھیں زبردست عوامی تائید حاصل تھی۔ مہاراشٹر میں مشرقی خاندیش اور ستارا نیز گجرات کے ضلع بروچ کے جمبوسار تعلقے اس کسان بغاوت کا اہم مرکز تھے۔ ستارا اور خاندیش کی تحریکوں میں کسی حد تک سماجی انتہاپسندی کا عنصر بھی شامل تھا، اس بات کا اشارہ کانگریسی تاریخ نگار گووند سہائے کے اس تبصرے سے ملتا ہے کہ "ستارا میں جرائم پیشہ عناصر نے ناناپاٹل کی قیادت میں چلائی جارہی تحریک کا فائدہ اٹھایا اور ستارا نیز جمبوسار میں ڈکیتی کے متعدد واقعات ہوئے جن میں ایک مقامی بدمعاش (ڈاکو) ملوث تھا۔ جس کا نام میگزی (Megzi) تھا اور جو ایک آزاد کردہ علاقے جیسے کسی بندوبست کے لیے جمبوسار تحریک کی تین ماہ تک مدد کرتا رہا تھا (گووند سہارے، صفحہ 118، 133)۔ حال ہی میں Gail Omvedt نے، تحریک کے شرکاء پر مبنی، ستارا کی 'پراتی سرکار' کا جو تفصیلی تجزیہ کیا ہے اس سے چند ممتاز خصوصیات کا پتہ چلتا ہے۔ ستارا کی تحریک کسانوں کی غیر براہمن "باہیاجن سماج" روایت سے گہرا تعلق رکھتی تھی جو کہ اس علاقے میں بہت مضبوط تھی۔ متوازی حکومت بہت بعد میں، 1943 کے وسط میں ہی بن پائی تھی اور اسی طرح 1945.46 کے آخر تک برقرار بھی رہی تھی۔ عوامی عدالتوں (نیائے دان منڈل) کا چلانا اور چھاپہ مار جنگ کے ساتھ ساتھ۔ گاندھیائی خطوط پر تعمیراتی کام کرانا بھی اس کی سرگرمیوں میں شامل تھا۔ 1942 میں دوسرے مقامات کی طرح ہی اس علاقے میں بھی قوم پرستانہ شدت پسندی نے کسی حد تک سماجی انتہاپسندی کی دھار اور کند کر دی تھی؛ تاہم چند ایسے واقعات بھی ہوئے تھے جن میں رہن شدہ زمین غریب کسانوں کو واپس کرا دی گئی تھی اور گاؤں کے مکھیا لوگوں کے ذریعے عورتوں کی آبروریزی اور استحصال کے ذمہ داروں کو سخت سزائیں دی گئیں تھیں۔ اس تحریک کے کارکنوں کا کہنا ہے کہ "ہم نے جائیداد سے متعلق روابط کو ہرگز ہاتھ نہیں لگایا تھا"۔ یہ بھی ایک دلچسپ بات ہے کہ "پراتی سرکار" نے مقامی ڈاکوؤں کے خلاف بھی موثر کارروائی کی جس سے پتہ چلتا ہے کہ غالباً نچلے درجے کے سماجی مجرموں کے مقابلے پر صاحب جائیداد اور ابھی تک دبے ہوئے کسانوں کی ضرورتوں کا زیادہ خیال رکھا گیا تھا۔ یہ سماجی جرائم پیشہ

طبقہ ستارا کے پہاڑی علاقوں میں کافی مضبوط پوزیشن میں تھا۔ یہاں اس بات کا بھی ذکر کیا جاسکتا ہے کہ فرانسیسی انقلاب میں 1789 میں جب کسان حرکت پذیر ہوئے تھے تو انھوں نے ساتھ میں بے بنیاد قسم کی "اشرافی سازش" اور راہزنی کو بھی اپنا نشانہ بنانے کی کوشش کی تھی۔ پریزیڈنسی کے دوسرے مقامات پر سوشلسٹوں نے موثر دہشت پسندانہ زمین دوز سرگرمیوں کو منظم کیا۔ یہ سرگرمیاں بمبئی شہر سے ارونا آصف علی اور ان جیسے رہنما کنٹرول کر رہے تھے۔ اس سلسلے میں کرناٹک علاقے میں نظام کو درہم برہم کرنے کے سلسلے میں جو خلل اندازیاں کی گئیں ان میں ٹیلی گراف کی لائنوں پر 1600 حملے، 26 ریل اسٹیشنوں اور 32 ڈاک خانوں پر چھاپے، شامل ہیں۔ مگر محصول کی عدم ادائیگی کے سلسلے میں اس مرتبہ کوئی نعرہ نہیں دیا گیا تھا بلکہ کھیڑا اور باردولی علاقوں میں بھی مال گزاری ادانہ کرنے کی بھی کوئی بات نہیں کہی گئی تھی۔ ان دونوں علاقوں میں اعلا طبقے کے پٹی دار گھرانوں کے نوجوانوں نے دہشت پسندانہ سرگرمیوں میں نمایاں حصہ لیا تھا۔ ہارڈی مین کا یہ کہنا ہے کہ "نچلے طبقے کے (چھوٹے) پٹی داروں کے جوش و خروش کو خوش حالی کا گھن لگ گیا تھا! یہ نئی نئی خوش حالی جنوبی افریقہ سے بھاری ترسیل زر، تمباکو کی کاشت میں اضافے، جنگ کے زمانے میں غذائی اجناس کی قیمتوں میں بڑھوتری کے ساتھ ساتھ اس بات کا بھی نتیجہ تھی کہ 1928 کے بعد سے مال گزاری میں کوئی اضافہ نہیں کیا گیا تھا۔ (کانگریس اینڈ دی راج، صفحہ 7) عمومیت کی بنیاد پر یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ جن علاقوں میں کسی حد تک زرعی پیش رفت ہوئی تھی، اور جہاں خوش حال اور متمول کسانوں کا ایک اعلا طبقہ ابھرا تھا، وہ علاقے 1942 کی بغاوت سے دور ہی رہے تھے۔ پنجاب، مغربی یوپی، گجرات، تامل ناڈو کا تنجاور ڈیلٹا وغیرہ اس طرح کے علاقے تھے۔ اس کے مقابلے میں کسان بغاوت کے سارے اہم مرکز مشرق میں رہے تھے، جہاں Blyn کے اعداد و شمار سے یہ پتہ چلتا ہے کہ فی کس زرعی پیداوار یا تو جامد رہی تھی یا اس میں کمی آگئی تھی۔ جن "بالادست" قسم کے کسانوں کے بارے میں تاریخ کی حال کی کتابوں (مثلاً کانگریس اینڈ دی راج، میں Cow کا تعارف) میں بہت کچھ پڑھنے کو ملتا ہے: کانگریس کی قوم پرستی سے سب سے زیادہ فائدہ انھیں کو پہونچا، جب کہ تحریک میں سب سے زیادہ حصہ سماجی اور معاشی اعتبار سے نچلے طبقوں نے ہی لیا تھا۔

مابعد بغاوت

1942 کے آخر تک انگریز ہندوستان کی قوم پرستی کے ساتھ مکمل ٹکراؤ میں پوری طرح فتح یاب ہو چکے تھے اور جنگ کے باقی ڈھائی سال اندرون ملک کسی قسم کے اہم سیاسی چیلنج کے بغیر ہی گزر گئے۔ تاہم انگریزوں کی یہ "فتح" مبہم بھی تھی اور کئی لحاظ سے انتہائی محدود بھی، اور ممکن بھی

اس لیے ہو سکی تھی کہ جنگ کے حالات کی وجہ سے انگریزوں کے لیے طاقت کا بے رحمانہ استعمال آسان ہو گیا تھا۔ انگریز آئندہ اس طرح کے ٹکراؤ کا خطرہ مول لینے کے لیے ہر گز تیار نہیں تھے اور 1945 میں ان کا یہ فیصلہ کہ گفت و شنید کے ذریعے حل تلاش کرنے کی کوشش کی جانی چاہیے محض برطانیہ کی نئی لیبر حکومت کا ہندوستانیوں کے لیے ایک تحفہ نہیں تھا، اس بات کا اشارہ واویل کے رویے سے ملتا ہے، جو کہ کسی بھی لحاظ سے ایک انتہائی لبرل آرمی کمانڈر نہیں تھا اور اکتوبر 1943 میں وائسرائے بنایا گیا تھا۔ واویل نے چرچل کے نام 24/ اکتوبر 1944 کے مکتوب میں یہ کہا تھا کہ جنگ کے بعد ہندوستان پر طاقت کے ذریعے اپنی عملداری قائم رکھنا ناممکن ہو جائے گا؛ خاص طور پر عالمی رائے عامہ اور انگریزوں کے عوامی اور فوجی رویے کے پیش نظر تو ایسا کرنا اور بھی ناممکن ہو جائے گا۔ "ہمیں اس طرح کے باغیوں کے ساتھ پہلے بھی بات چیت کرنی چاہیے تھی"...... "در حقیقت دانش مندی کا تقاضہ یہ ہوگا کہ جنگ کے خاتمے پر قیدیوں کی رہائی، نیز جمود اور بے روزگاری کے نتیجے میں بے چینی پیدا ہونے سے پہلے ہی گفت و شنید کا سلسلہ شروع کر دینا چاہیے، کیونکہ اگر ہم نے کانگریس کی توانائیوں کو ہندوستان کے انتظامی مسائل سے عہدہ برآ ہونے اور دستوری مسائل کو حل کرنے کی کوشش جیسے دوسرے زیادہ سود مند کاموں میں لگانے کی کوشش نہ کی تو جنگ کے بعد پیدا ہونے والی مذکورہ بے چینی کسی بھی ایجی ٹیشن کے لیے سازگار ماحول پیدا کرنے کی باعث ہوگی"۔ (واویل، وائسرائے جرنل، آکسفورڈ۔ 1973، صفحہ 98-97)۔ چرچل کی خودسری کی وجہ سے اس عمل کے شروع ہونے میں تاخیر ہوئی لیکن انگریزوں نے یہ کام 1945 کے بعد کرنے کے لیے کانگریس کو تیار کر لیا۔

کانگریسی رہنماؤں کے نقطہ نگاہ سے یہ قید و بند اور تحریک کی ناکامی ان کے لیے چند فوائد کا بھی باعث ہوئی۔ جیلوں میں الگ تھلگ پڑ جانے کی وجہ سے انہیں جاپان حامی یا جاپان مخالف جنگی معاملے کے سلسلے میں کوئی عوامی موقف اختیار کرنے سے بچنے میں کافی مدد ملی۔ یہ ایک ایسا معاملہ تھا جو 1944 کے چند مہینوں کے دوران، جب کہ سبھاش بوس کی آزاد ہند فوج ایک ایسے وقت میں آسام کی سرحدوں پر نمودار ہوئی تھی جب کہ عالمی پیمانے پر اتحادی فوجوں کو جنگ میں فتح حاصل ہو رہی تھی، کانگریس کے لیے کافی پریشان کن ثابت ہو سکتا تھا۔ اس سے بھی زیادہ اہم یہ بات تھی کہ "جیل اور کنسنٹریشن کیمپ کے گلیمر نے کانگریس وزارتوں کی یاد کو بھلا دیا تھا اور اس طرح عوام میں تنظیم کی مقبولیت بحال ہو گئی تھی۔ (The Bourgeoisie Comes of Age in India. Poona . P.17) کانگریس کے دائیں گروپ کے جو لیڈر 1930 کی دہائی کے آخر میں انگریزوں کے ساتھ زیادہ تعاون کی اپیل کرتے آئے تھے اور بحیثیت وزیر کے رجعت پسندانہ پالیسیوں پر عمل پیرا رہے تھے، اب ان سوشلسٹوں کی ہی طرح، جنھوں نے 1942 میں حقیقی لڑائی لڑی تھی، وطن

پرستانہ ایثار کی بات کر رہے تھے، جب کہ جن کیمونسٹوں نے ان دونوں ہی گروپوں کو نکتہ چینی کا نشانہ بنایا تھا، انھیں قوم پرست رائے عامہ انگریزوں کا وفادار اور قوم کا غدار سمجھ رہی تھی۔

اگر انگریزوں نے ہندوستان چھوڑو تحریک کے تجربے سے آخر کار یہ محسوس کر لیا تھا کہ گفت و شنید کے ذریعے ہی اقتدار کی منتقلی میں سمجھداری ہے، تو یہ بھی واقعہ ہے کہ 1942 کی بغاوت اور مابعد کے واقعات سے ان طاقتوں کو بھی تقویت ملی جو کہ کانگریس کے رجعت پسندوں (داہنے گروپ) کی قدر و منزلت کے ذریعے کانگریس کی طرف سے مفاہمت کو ترجیح دے رہی تھیں۔ دراصل ترقی پسند (Left) متبادل دو وجوہ سے کمزور پڑ گیا تھا۔ ایک تو اس جدو جہد کی وجہ سے جو کہ بہادرانہ اور فطری ہونے کے ساتھ ساتھ بے محل اور ناکام بھی ثابت ہونے والی تھی کیونکہ 1942 میں انگریزوں کو زبردست فوجی وسائل حاصل تھے۔ استبدادی کارروائیوں کے نتیجے میں وہ بہت سے کسان مرکز بھی یقیناً توانائیوں سے تہی دامن ہو گئے ہوں گے جو کہ برسوں کے گاندھیائی تعمیراتی کاموں یا کسان سبھا کی انتہاپسندانہ سرگرمی کے نتیجے میں تیار ہوئے تھے۔ یہ ایک اہم بات ہے کہ بہار اور مشرقی یوپی، کے علاوہ مہاراشٹر، کرناٹک اور اڑیسہ کے دیہی علاقوں نے 46-1945 کی سامراج مخالف شورش میں بہت کم یا نہیں کے برابر حصہ لیا، جب کہ مدناپور اور ہگلی کے دیہی علاقوں کے بیشتر گاندھیائی کارکنوں اور لیڈروں کو بنگال کانگریس کی مابعد جنگ اور مابعد آزادی سیاست میں بالکل درکنار کر دیا گیا تھا۔ دوسرے یہ کہ اس وقت بایاں متبادل اس حد تک اختلاف کا شکار تھا کہ ایسا کبھی نہیں رہا تھا۔ 1942 کی تلخ یادوں نیز "دغا بازی" اور 'مجرمانہ سرگرمیوں' کے الزامات اور جوابی الزامات کی وجہ سے ایک بڑی دیوار کھڑی ہو گئی تھی جس کی ایک طرف سوشلسٹ اور بوس کے پیروکار تھے اور دوسری طرف کیمونسٹ تھے۔ یہ دیوار ایک نسل کے گزر جانے کے بعد بھی ویسی ہی کھڑی ہے۔

جنگ اور ہندوستانی معیشت

قحط اور غیر معمولی (زاید) منافع خوری

جنگ کے معاشی اثرات نے بحیثیت مجموعی عوامی قوتوں کے خاتمے کے عمل کو اور بھی سنگین بنادیا تھا تاہم اس کی وجہ سے 47-1945 میں تقریباً انقلاب جیسی سنگین قسم کی بے چینی اور شورش بھی پیدا ہو گئی تھی۔ اگرچہ ہندوستان (1944 میں کوہیما۔ امپھال سرحد اور اکادکا ہوائی حملوں کے ماسوا) حقیقی فوجی تباہی و بربادی سے محفوظ رہا تھا، مگر عام لوگوں کے مصائب کسی طرح بھی کم سنگین نہیں تھے، کیونکہ جنگ کا مطلب تھا زبردست افراط زر! جو کرنسی نوٹ 1939 میں

2300 ملین کے بقدر چلن میں تھے وہ 1945 میں بڑھ کر 12,100 ملین کے بقدر پہونچ گئے تھے۔ اس کے علاوہ ہر طرف بد عنوانی کا بول بالا تھا، اشیاء کی قلت کی وجہ سے چور بازاری کا بازار گرم تھا اور پھر 1943 میں ملک کو بھیانک قحط کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ غذائی بحران دراصل برما اور جنوب مشرقی اشیاء سے چاول کی درآمد کاری رُک جانے کا نتیجہ تھا، اس کے ساتھ ہی بہت بڑے پیانے پر بڑھائی گئی آرمی کی غذائی ضرورتوں کو بھی پورا کرنا پڑتا تھا، بہر حال غذائی کی بحران کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ غذائی اجناس کا درست بندوبست نہیں کیا گیا تھا اور منافع خوری کو دانستہ بڑھنے دیا گیا تھا۔ راشن کاری کے اقدامات بھی درست نہیں تھے اور صرف چند بڑے شہروں تک ہی محدود تھے، اور واویل نے نجی ملاقات میں "ہندوستان کے غذائی مسائل کے تئیں حکومت برطانیہ کی بے حسی کی شکایت کی تھی، اور 'فاقہ کشی یورپ میں ہونے کی صورت میں، فاقہ کشی کے شکار عوام کی غذائی ضروریات پورا کرنے کے تئیں مختلف رویے' کا ذکر کیا تھا (اس کا اشارہ 1945 کے اوائل میں ہالینڈ کے لیے روانہ کی گئی رسدات کی طرف تھا، وائسرائے جرنل، اندراج بابت 9/اپریل 1945، صفحہ 123)۔ 1943 کے تکلیف دہ موسم گرما اور موسم خزاں میں، لاکھوں لوگ فاقہ کشی سے شہر کی سڑکوں پر دم توڑ دینے کے لیے کلکتہ پہونچے تھے، وہ چاول کی بھیک مانگنے کی بجائے اس پانی کی بھیک مانگتے تھے جس میں چاول پکایا جاتا تھا۔ بنیادی طور پر انسان ہی کے تھوپے گئے اس قحط میں 15 سے 30 لاکھ تک لوگ بنگال میں دم توڑ گئے تھے۔ چونکہ فاقہ کشی اور ناقص تغذیہ کی وجہ سے ملیریا، ہیضہ اور چیچک جیسی وبائیں بھی پھوٹ پڑی تھیں اس لیے بنگال میں 1943 کے بعد کے برسوں کے دوران بھی شرح اموات بہت زیادہ رہی تھی، انگریزوں کی راست عمل داری کا سلسلہ 1770 کے قحط کے ساتھ شروع ہوا تھا، اور اب یہ عمل داری اپنے اختتام کو بھی اسی طرح کی بھیانک تباہی و بربادی کے ساتھ پہونچ رہی تھی۔ اس قحط سے سب سے زیادہ جنوب مغربی بنگال میں تاملوک۔ کونتائی۔ ڈائمنڈ ہاربر کا علاقہ، نیز ڈھاکہ، فرید پور، ٹپیرا، اور نواکھالی اضلاع متاثر رہے تھے۔ بنگال کے چھوٹے کسانوں کی معیشت کو زبردست دھکا لگا تھا اور 1943 کے دوران 600,000 لگان داروں کو اپنی جوت سے محروم ہونا پڑا تھا۔ اور صرف ایک ہی سال میں مویشی دولت 20 فی صد کم ہو گئی تھی۔ سب سے زیادہ زرعی مزدور متاثر ہوئے تھے اور یہ غیر متوقع بات بھی نہیں تھی: 1944 میں فرید پور کے پانچ گاؤں کے ایک سروے میں یہ پتہ لگا تھا کہ تقریباً 40.3 فی صد لوگوں کا صفایا ہو گیا تھا جب کہ عام اوسط شرح اموات 15.2 فی صد رہا کرتی تھی۔ (اے۔ کے۔ سین۔ نے مائین مور ٹالیٹی، اے اسٹڈی آف دی بنگال نے مائین، آف 1943)۔

بہر حال یہ جنگ اور یہ بھیانک قحط کچھ لوگوں کے لیے غیر معمولی (Super) منافع کا بھی باعث ثابت ہوئے۔ 18-1914 کی ہی طرح ہندوستان کے بورژوائی طبقے کے لیے یہ حالات ایک

اہم پیش رفت کی بھی حیثیت رکھتے تھے۔

ہند۔ برطانیہ معاشی روابط کی نوعیت میں کافی رد و بدل ہوا تھا؛1945 کے آتے آتے ہندوستان کی در آمدات کا سب سے بڑا سر چشمہ برطانیہ کی بجائے اب امریکہ ہو گیا تھا۔ ہندوستان سے منگائے جانے والے جنگی سامان کی ادائیگی کے لیے برطانیہ، ہندوستان کی ان امریکی در آمدات کو خرید لیتا تھا اور اس طرح ہندوستان کے پونڈ اسٹرلنگ قرضوں کی نقد ادائیگی ہو جاتی تھی۔ 1945 تک ہندوستان کے پاس 1000 ملین پونڈ سے بھی زائد اسٹرلنگ فاضلات (Sterling balances) اکٹھا ہو گئے تھے؛ اگرچہ ان فاضلات کی اہمیت، زمانہ جنگ میں ہندوستان سے بڑے پیمانے پر وسائل کی منتقلی کے سلسلے میں جاری کی جانے والی درشنی ہنڈیوں سے زیادہ نہیں تھی؛ مگر ان کی وجہ سے آزاد ہندوستان میں غیر ملکی زر مبادلہ کے ذخائر کو کافی تقویت ملتی۔ دولت کے بہاؤ (Drain of Wealth) کی روایتی مد "مطالبات قرض" (Debt Charges) رفتہ رفتہ غائب ہو گئی تھی۔ دوسرے یہ کہ جنگی مانگ اور در آمدات کی بجائے ملکی وسائل سے کام چلانے پر زور دینے کے نتیجے میں کپڑا، فولاد، لوہا، سمنٹ اور کاغذ کے ساتھ ساتھ بعض کیمیاوی اور انجینئرنگ سامان کی تیاری کے میدان میں کافی پیش رفت ہوئی تاہم انگریزوں نے ہندوستان میں بحری جہازوں، موٹر گاڑیوں اور ہوائی جہازوں کی تیاری میں رکاوٹ کے سلسلے کو بدستور جاری رکھا۔ چنانچہ صنعتی نشو و نما کی رفتار کافی سست رہی اور مجموعی پیداوار میں بھی "بہت کم اضافہ ہوا۔ 1937 کو بنیادی سال فرض کر لینے کی صورت میں یہ اضافہ 1945 میں 120 تک ہی پہونچ پایا تھا جب کہ فولاد کی پیداوار 142.9 تک، کیمیاوی اشیاء کی پیداوار 134.1 تک اور سیمنٹ کی پیداوار 196.5 تک پہونچ گئی تھی (واڈیا اینڈ مرچنٹ، صفحہ 360)۔

در حقیقت حیرت انگیز اضافہ اشیاء کی پیداوار کی بجائے منافع خوری میں ہوا تھا؛ اور یہ اضافہ غذائی اجناس کی سٹہ بازاری اور چور بازاری کے ذریعے منافع خوری میں کہیں زیادہ ہوا تھا۔ دراصل ہندوستان کا بورژوائی طبقہ بالکل منفرد نوعیت کا بورژوائی طبقہ تھا؛ غاصبانہ لالچ اس کی گھٹی میں شامل تھا۔ یہ طبقہ پیداوار یت کو فروغ دینے کے لیے کسی طرح کے اقدام، اختراع یا کارکردگی سے کام لینے کی بجائے محض خیالی گھوڑے دوڑانے کے خبط میں مبتلا تھا (کوسامبی صفحہ 14)۔ یہ طبقہ تکنیکی پس ماندگی کی وجہ سے اب غیر ملکی اشتراک اور تعاون کے لئے مجبور تھا، پھر یہ کہ بدلے ہوئے معاشی اور سیاسی حالات میں اس طبقے کو یہ بھی امید تھی کہ وہ اگلی گفت و شنید میں کسی قدر کم غیر مساوی شرطوں کے ساتھ حصہ لے سکے گا۔ چنانچہ 1945 کے موسم گرما میں برلا اور ٹاٹا ایک کاروباری وفد لے کر امریکہ اور برطانیہ گئے اور اسی سال کے دوران برلا اور Nolfield کے درمیان ایک معاہدے (ہندوستان موٹرس فرم کے قیام کے لیے) اور ٹاٹا اور امپیریل کیمیکلز کے

درمیان ایک معاہدے کو آخری شکل دی گئی۔ اس کے ساتھ ہی ہندوستان کے بورژوائی لیڈر بھاری صنعتوں، بجلی، آبپاشی، وغیرہ جیسے سیکٹروں میں سرکاری سرمایہ کاری کو تسلیم کر لینے یا اس کے لیے اپیل کرنے کے بھی خواہش مند تھے۔ یہ وہ سیکٹر تھے جن میں منافع بہت کم ہو سکتا تھا۔ ہندوستان کے سرکردہ صنعت کاروں اور تاجروں (بشمول جے۔ آر۔ ڈی۔ ٹاٹا۔، جی، ڈی برلا، پی۔ ٹھاکرداس، شری رام، اور کستور بھائی لال بھائی) کے تیار کردہ جنوری 1944 کے 'بمبئی منصوبے' میں بنیادی صنعتوں کی تیز رفتار ترقی کے ذریعے فی کس قومی آمدنی میں 15 سال کے اندر دوگنا اضافہ کرنے کی بات کہی گئی تھی۔ جہاں "اس بمبئی منصوبے" کے ذریعے مقاصد کی وضاحت کرنے کے ساتھ ساتھ، تقسیم کاری اور سرکاری کنٹرول کی نوعیت کے بارے میں ابہام سے کام لیا گیا تھا وہیں ترقی کے مفاد میں "کاروبار کی آزادی" پر 'عارضی قدغن' لگانے کی بات بھی کہی گئی تھی اور یہاں تک کہ اس سلسلے میں بعض روسی تجربوں کا بھی بڑی گرم جوشی سے حوالہ دیا گیا تھا۔ اس سلسلے میں ایک بار پھر Kosambi کا حوالہ دیا جا سکتا ہے کہ بورژوائی طبقے کو ......" نہرو کی قیادت کی ضرورت ہے" بالکل اسی طرح جس طرح کہ اس طبقے نے سابقہ عوامی تحریکوں کے زمانے میں بھی بڑی عیاری سے کام لے کر "مہاتما کی ہر طرح کی تعلیمات کو اپنے لیے مفید مطلب بنا کر ان کا استحصال کیا" اور ہر طرح کی تعلیمات کو اپنے لیے مفید مطلب بنا کر ان کا استحصال کیا" اور ہر طرح کے خطرناک اعلانات کی سنگینی کو گھٹا کر انھیں محض منفی قسم کے فلسفیانہ نکات کے طور پر پیش کیا (کوسامبی، صفحہ 18)۔

ہندوستان کا یہ بورژوائی طبقہ، جو کہ ہندوستانی عوام کے انتہائی اور بے مثال مصائب کے زمانے میں بھی پوری طرح شادکام رہا تھا، اب کسی بھی ایسی عوامی جدوجہد کا مخالف تھا جو بے قابو قسم کے انتہاپسندانہ نتائج کی حامل ثابت ہو سکتی تھی، چنانچہ اس طبقے نے اپنا سارا اثر بات چیت کے ذریعے مصالحانہ مفاہمت پر صرف کر دیا۔ بہر حال 47-1945 کے حالات و واقعات سے یہ الم ناک حقیقت سامنے آئی کہ ہندوستان کے حوالے سے، بات چیت کے ذریعے "اقتدار کی منتقلی" کی قیمت علاحدگی پسند قوتوں کی حوصلہ افزائی کی شکل میں ادا کرنی پڑی جس کا نتیجہ ملک کی تقسیم کی شکل میں سامنے آیا۔ خون بہائے بغیر آزادی کے حصول، کے ساتھ ساتھ ناقابل تصور فرقہ وارانہ تباہی اور بربادی کا سیلاب بھی آنا تھا۔

مسلم لیگ کا عروج

دوسری عالمی جنگ کے آخری برسوں کے دوران کانگریس کے خلاف حکومت کے تعزیری اقدامات کا فائدہ اٹھاتے ہوئے مسلم لیگ بڑی تیزی کے ساتھ اپنے قدم جماتی گئی جسے اس زمانے کا

سب سے اہم اور نمایاں سیاسی مظہر کہا جاسکتا ہے۔ چنانچہ 1943 تک آسام (اگست 1942)، سندھ (اکتوبر 1942)، بنگال (مارچ 1943) اور صوبۂ سرحد (مئی 1943) میں مسلم لیگ کی وزارتیں قائم ہو چکی تھیں؛ لیگ کی مرکزی قیادت صوبائی یونٹوں پر اپنی گرفت مضبوط کرتی جارہی تھی، صوبوں میں اپنی رضاکار تنظیم کا جال پھیلاتی جارہی تھی، نیز محمد علی جناح نہ صرف یہ کہ خود کو ساری مسلم آبادی کا واحد نمائندہ ثابت کرنے کی کوشش میں کسی حد تک کامیاب معلوم ہو رہے تھے، بلکہ گاندھی کی قیادت والی 'ہندو' کانگریس کے تعلق سے مسلم لیگ کے ساتھ مساوی درجے کا سلوک کیے جانے پر بھی اصرار کر رہے تھے۔ ظاہر ہے کہ اس معاملے میں مسلم لیگ کو انگریزوں کی تائید حاصل تھی۔ آسام میں صلاح الدین وزارت اور سندھ میں اورنگ زیب خاں وزارت کی تشکیل اس لیے ممکن ہو سکی تھی کہ ان دونوں صوبوں میں بیشتر کانگریسی ممبران اسمبلی جیل میں تھے۔ صوبۂ سندھ کے کانگریس حامی مسلم وزیر اعظم اللہ بخش کو گورنر نے اس لیے برخواست کر دیا تھا کہ انھوں نے اپنے سرکاری اعزازات لوٹا دیے تھے جب کہ بنگال میں یوروپی ممبران اسمبلی نے ہی ناظم الدین وزارت بنوائی تھی۔ حالانکہ سب سے زیادہ مسلم اکثریت والے یہ دونوں صوبے، یعنی بنگال اور پنجاب اب بھی جناح کے لیے پریشان کن بنے ہوئے تھے۔ بہر حال لیگ کی مرکزی قیادت مارچ 1943 میں فضل الحق کو اقتدار سے بے دخل کرنے میں کامیاب ہو گئی تھی (واضح رہے کہ فضل الحق مسلسل جناح کو اپنی نکتہ چینی کا نشانہ بناتے آرہے تھے اور دسمبر 1941 میں انھوں نے بالکل غیر متوقع طریقے پر ہندو مہاسبھا کے لیڈر شیام پرساد مکرجی کے ساتھ سیاسی اتحاد بھی قائم کر لیا تھا)۔ لیگ نے اس سلسلے میں کلکتہ کے ایک بہت بڑے کاروباری گھرانے 'اصفہانیوں' کی مدد بھی لی تھی جس کے رابطے ملک بھر میں قائم تھے۔ بنگال کے مسلم سیاست دانوں کو لیگ کی مرکزی قیادت کے اشارے پر نچانے کی یہ روش اس سے پہلے کانگریس بھی اس وقت اپنا چکی تھی جب کانگریس کی مرکزی قیادت نے، جس کے کلکتہ کے برلا جیسے مارواڑیوں کے ساتھ قریبی روابط تھے، سبھاش بوس کو بے دست وپا کر دیا تھا۔ جناح کو پنجاب میں قدم جمانے میں اس بات سے بھی کافی مدد ملی تھی کہ دسمبر 1942 میں سکندر حیات خان کا انتقال ہو گیا تھا۔ یہ دوسری بات ہے کہ سکندر حیات خاں کے کمزور جانشیں خضر حیات خان 1945 میں مسلم جاٹ سیاسی اتحاد کے خلاف لیگ کے دباؤ کی مزاحمت کر رہے تھے۔

بہر حال مسلم لیگ کی اس پیش قدمی کے پس پشت اسمبلی سیاست یا سرکاری سرپرستی کے علاوہ کچھ دوسرے عوامل بھی کار فرما تھے۔ متنوع اسباب کے تحت پاکستان کا نعرہ ہندوستانی مسلمانوں کے ایک بڑے حلقے کے اندر گھر کرتا جارہا تھا۔ بنگال اور پنجاب کے مسلم کسانوں کو یہ باور کرایا جارہا تھا کہ پاکستان بن جانے کی صورت میں ہندو زمیندار اور مہاجن کا ظلم اور استحصال ختم

ہو جائے گا۔ نومبر 1943 سے بنگال مسلم لیگ کے حرکی سکریٹری عبدالہاشم نے مسلم لیگ کو ایک انقلابی پارٹی کی شکل میں پیش کرنے کی بھرپور کوشش کی اور 1944 میں جاری کردہ منشور میں لگان پر سود کے خاتمے کا وعدہ بھی کیا تھا۔ اس سے بھی زیادہ اہم بات یہ تھی کہ ایک ایسے پاکستان کا وعدہ کیا جارہا تھا جو طاقت ور ہندو کاروباری گروپوں اور پیشہ وروں کی تجارتی مقابلہ بازی سے محفوظ ہوگا تاکہ چھوٹے مسلم کاروباری طبقے بھی پھل پھول سکیں اور تعلیم یافتہ مسلم طبقے کو روزگار کے مواقع مل سکیں (حوالہ: امیہ باگچی، صفحہ 432، 433)۔ اس طرح کے امکانات خاص طور پر یوپی اور بمبئی کے مسلم پیشہ ور گروپوں کے لیے اور کافی حد تک سیاست دانوں کے لیے کافی کشش رکھتے تھے کیونکہ ان علاقوں میں مسلمان چھوٹی اقلیت تھے۔ بنگال نیز پنجاب میں، جہاں پاکستان کا مطلب یہ تھا کہ علاقائی اتحاد منتشر ہو جاتا اور کلکتہ نیز امرت سر جیسے انتہائی اہم علاقے ہاتھ سے نکل جاتے (اور ایسا ہی ہوا بھی) پاکستان کا نعرہ زیادہ کشش کا باعث نہیں تھا۔ اس بات پر توجہ دینے کی ضرورت ہے کہ مسلم علاحدگی پسندی کے پس پشت کارفرما معاشی عوامل کا سرچشمہ طرز قدیم کے تعلقہ داروں، زمینداروں اور ڈھاکہ کے نواب سمیع اللہ خاں تک ہی محدود نہیں رہا تھا بلکہ اب اصفہانی اور آدم جی جیسے تجارتی گھرانے بھی مسلم لیگ کی پشت پر آچکے تھے اور اس کے اخبارات کی کھل کر مدد کررہے تھے (کلکتہ کا شام نامہ 'اسٹار آف انڈیا' اور دہلی کا انگریزی روزنامہ 'ڈان' کا سلسلہ 1942 میں شروع ہوا تھا)۔ اسی طرح جناح کے ہی سایہ عاطفت میں اپریل 1945 میں فیڈریشن آف مسلم چیمبرس آف کامرس اینڈ انڈسٹری کی داغ بیل ڈالی گئی تھی اور جنگ کے فوراً بعد مسلم بنکوں اور ایک ایرلائن کمپنی شروع کرنے کا بھی منصوبہ بھی بنایا گیا تھا۔ ہندوستان کا بورژوائی طبقہ کبھی بھی فرقہ وارانہ کشیدگی سے آزاد نہیں رہا (مثال کے طور پر ہندو تاجر انتہائی حد تک قدامت پرست تھے اور احیاء پسندی، گائے کے تحفظ کی تحریکوں اور ہندو مہاسبھا کے ساتھ قریبی روابط رکھتے تھے)۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ بڑے مسلم سرمایہ داروں کا تناسب بہت کم تھا اور 1947 کے قبل بڑی صنعتیں برائے نام ہی تھیں، البتہ چھوٹے پیمانے کے کاروبار شروع ہونے لگے تھے جو کہ زیادہ تر علاقے کی زرعی پیداوار سے ہی جڑے ہوتے تھے۔ ملک کی تقسیم اس طرح کے لوگوں کے لیے ایک نعمت ثابت ہو سکتی تھی کیونکہ اس طرح یہ لوگ ہندوستان کے بڑے اور مضبوط صنعتی اور تجارتی گھرانوں کے کاروباری مقابلے سے محفوظ ہو سکتے تھے۔

آزاد ہند فوج

چونکہ جنگ کے فوراً بعد کے برسوں میں سامراج مخالف عوامی تحریک ابھی پوری طرح ابھر کر سامنے نہیں آپائی تھی اس لیے مفاہمت اور تقسیم کے تئیں عوامی توانائیوں اور رجحانوں میں کمی

طرح کی کمی سے 1942 کے بعد کے ہندوستان کی مکمل تصویر واضح نہیں ہوتی۔ چنانچہ انگریزوں کے خلاف مسلسل عوامی جدوجہد کے لیے ایک بہت اہم ترغیب سبھاش بوس کی بیرونِ ملک مہم جوئیوں سے حاصل ہو رہی تھی۔ سبھاش بوس نے 1941 میں برلن میں ایک ہندوستانی دستہ (Indian Legion) قائم کیا تھا، لیکن ان کے لیے اس وقت مشکلات پیدا ہو گئیں جب جرمنوں نے ان کے اس دستے کو روسیوں کے خلاف استعمال کرنے کی کوشش کی۔ اس لیے سبھاش بوس نے جنوب مشرقی ایشیاء چلے جانے کا فیصلہ کیا۔ چنانچہ وہ ایک آبدوز کے ذریعے جولائی 1943 میں سنگاپور پہونچ گئے جس پر جاپان کا کنٹرول تھا جہاں سے انھوں نے اپنی مشہور اپیل "دہلی چلو" جاری کی۔ انھوں نے 21/ اکتوبر 1943 کو آزاد ہند حکومت اور آزاد ہند فوج قائم کی۔ انھوں نے اس حکومت میں راس بہاری بوس کو ایک اعزازی عہدہ دے کر قدیم انقلابی۔ دہشت پسند روایت کے ساتھ اپنے تعلق پر زور دینے کی کوشش کی۔ راس بہاری بوس 1915 سے جاپان میں جلاوطنی کی زندگی گزار رہے تھے۔ بوس گاندھی کے ساتھ اپنے تمام تر اختلافات کے باوجود بھی آزاد ہند حکومت اور آزاد ہند فوج شروع کرتے وقت 'بابائے قوم' کا آشیرواد لینا نہیں بھولے تھے۔ جاپانی کیمپوں میں موجود ہندوستانی جنگی قیدی آزاد ہند فوج میں بھرتی کا ایک بڑا وسیلہ ثابت ہوئے اور 60,000 جنگی قیدیوں میں سے 20,000 آزاد ہند فوج میں بھرتی ہو گئے؛ جب کہ مالی امداد اور رضاکار جنوب مشرقی ایشیاء میں آباد ہندوستانی تجارتی برادریوں نے فراہم کیے۔ آزاد ہند فوج خالصۃً ایک غیر فرقہ وارانہ تنظیم تھی۔ اس کے افسروں، فوجیوں اور رضاکاروں کا ایک بڑا تناسب مسلمانوں پر مشتمل تھا۔ اس میں عورتوں کو بھی شامل کیا گیا تھا اور ان کے دستے کا نام رانی جھانسی دستہ رکھا گیا تھا۔ 1944 میں مارچ سے جون تک آزاد ہند فوج ہندوستانی سرزمین میں فعال رہی تھی اور جاپانی فوجوں کے ساتھ مل کر امپھال پر قبضہ کرنے میں کامیاب ہو گئی تھی۔ یہ دوسری بات ہے کہ یہ مہم جلد ہی ناکام ثابت ہو گئی تھی۔ اگلے سال جنگ میں جاپان کی شکست کے نتیجے میں آزاد ہند فوج کے لوگ پھر سے قیدی بنا لیے گئے۔ جہاں بوس پُراسرار طریقے پر غائب ہو گئے (کہا جاتا ہے کہ بوس ایک فضائی حادثے میں ہلاک ہو گئے جب کہ کچھ لوگ اس فضائی حادثے کو محض ایک ڈرامہ بتاتے ہیں)۔

سبھاش بوس کی قومی سرگرمیوں کے آخری مرحلے کی قدر و قیمت کا تعین کرنے کے لیے فوری نوعیت کی کامیابیوں اور انجام کار اثرات کے درمیان خط امتیاز قائم کرنا بہت ضروری ہے۔ آزاد ہند فوج کو کبھی بھی ایک باقاعدہ فوج کی حیثیت حاصل نہیں ہو سکی اور اگر اس کا اثر محسوس بھی کیا گیا تو وہ بھی کافی تاخیر سے! اس کی وجہ یہ ہے کہ 1944 کے آتے آتے تمام محوری طاقتیں پسپا ہونے لگی تھیں۔ ہندوستان میں ایک دوسری روپوش تنظیم، فارورڈ بلاک کو، جو کہ امپھال۔ کوہیما

کے خلاف فوج کشی میں معاون ہو سکتی تھی، اس سے پہلے ہی کچلا جا چکا تھا (فارورڈ بلاک سے متعلق سکریٹری آف اسٹیٹ کی عرضداشت مورخہ 30/اگست، 1945)۔ ان باتوں کے باوجود بھی آزاد ہند فوج نے قوم پرستی کا جو اثر قائم کیا اس کی زبردست اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ یہ یقیناً ایک ایسی فوج تھی جو ایک بنگالی کی قیادت میں ملک کو غلامی سے آزاد کرانے کے لیے برسر جنگ رہی تھی، نومبر 1945 میں انگریزوں نے آزاد ہند فوج کے لوگوں کے خلاف مقدمہ چلانا چاہا جس پر ملک بھر میں فوراً ہی احتجاج اور مظاہرے کی لہر دوڑ گئی۔ اس سے بھی اہم بات تو یہ ہے کہ 46-1945 کے موسم سرما کے دوران آزاد ہند فوج کے ساتھ ساتھ خود برطانوی ہند کی آرمی میں بھی بے چینی پیدا ہو گئی تھی جو کہ فروری 1946 میں بمبئی کی بحری فوج کی عظیم ہڑتال کی شکل میں ابھر کر سامنے آئی تھی۔ غالب گمان یہ ہے کہ انگریزوں نے ہندوستان سے اپنا بوریا بستر جلد ہی گول کرنے کا فیصلہ برطانوی ہند کی فوج کی اس بے چینی کے پیش نظر کیا تھا۔

کمیونسٹ اور عوام کی جنگ

عالمی جنگ کے بعد سامراج مخالف سرگرمیوں میں شدت کا ایک دوسرا عامل یہ تھا کہ کمیونسٹ بڑی تیزی کے ساتھ منظم ہو رہے تھے۔ یہ کمیونسٹ 45-1942 کے دوران بوس اور ان کے پیروکاروں کی شدید مخالفت کرتے رہے تھے۔ "عوامی جنگ" کا لائحہ عمل اپنانے کی وجہ سے ہندوستانی کمیونسٹ پارٹی یقیناً الگ تھلگ پڑ گئی تھی۔ اس کے علاوہ کمیونسٹوں نے پاکستان اور قومی اتحاد کے تعلق سے اگست ستمبر 1942 میں "ادھیکاری" نظریہ اپنا کر اپنے لیے مزید مشکلات پیدا کر لی تھیں۔ اس کا سلسلہ اس طرح شروع ہوا کہ سب سے پہلے تو ہندوستان کے ایک کثیر لسانی ملک ہونے کے ناطے اس کے ایک کثیر اقوامی ملک ہونے (اور اس طرح سوویت یونین کی طرح ہی یہاں بھی ملک سے الگ ہونے کے حق کو تسلیم کرنے) پر زور دیا گیا تھا جو کہ بلاوجہ نہیں تھا، مگر پھر جلد ہی سندھی، بلوچ، پنجابی (مسلم) جیسی مسلم قومیتوں کے تصور کو اپنا لیا گیا۔ اس کا سلسلہ اس اصرار پر ختم ہوا کہ اب مسلم لیگ کی قیادت "سامراج کے تعلق سے اپوزیشن کا رول ادا کر رہی ہے، اس طرح کہ اس کا یہ رول خود کانگریسی قیادت کے متوازی معلوم ہوتا ہے" (جی ادھیکاری : نیشنل یونیٹی ناؤ، پیوپلز وار، 8/اگست 1942)۔ چنانچہ کمیونسٹوں نے لیگ کے اندر ابوالحسن جیسے "ترقی پسند" عناصر کی برسوں تلاش کی، گاندھی اور جناح کے درمیان مفاہمت کی اپیل کرتے رہے اور پاکستان کے مطالبے کو تو قریب قریب تسلیم ہی کر لیا تھا جو کہ ایک موقع پرستانہ بات تھی۔ وجہ یہ تھی کہ کانگریس کے ساتھ تعلقات میں تناؤ پیدا ہو جانے پر کمیونسٹوں کو کسی دوسری بڑی قومی طاقت سے نزدیکی کی ضرورت تھی۔ بہر حال دیانت داری سے کام لیتے ہوئے یہ بھی کہنا پڑے گا کہ

1942 میں کچھ ایسے دوسرے افراد اور گروپ بھی تھے جو کیمونسٹوں کی طرح ہی غیر محب وطن معلوم ہوتے تھے۔ سرکردہ گاندھیائی اور جنوبی ہندوستان میں کانگریس کے دائیں بازوں کے لیڈر راج گوپال آچاری نے ہندوستان چھوڑو تحریک کی مخالفت کی تھی اور پاکستان کے مطالبے پر گفت و شنید شروع کرنے کی اپیل کی تھی۔ گول والکر کی آر۔ایس۔ایس نے خود کو اگست کی بغاوت سے بالکل الگ رکھا تھا۔ ساورکر نے 6/اگست 1942 کو مقامی اداروں، قانون ساز اداروں اور سرکاری نوکریوں میں شامل ہندو مہاسبھا کے ممبران سے اپیل کی تھی کہ۔ وہ اپنے اپنے عہدوں پر ڈٹے رہیں اور اپنے فرائض تن دہی سے انجام دیتے رہیں۔ اسی طرح جب مدناپور کو روندا جارہا تھا تو شیاما پرساد مکھرجی بنگال کے ایک سرگرم وزیر بنے رہے تھے۔ حال میں شائع شدہ دستاویزات سے یہ واضح طور پر پتہ چلتا ہے کہ تعاون کے لیے کیونسٹوں کی اچانک پیش کش، خاص طور پر جاپان کے خلاف چھاپہ مار جنگ کی تربیت کے لیے ان کی درخواستوں کو بیشتر افسران شک و شبہے کی نظر سے دیکھتے تھے۔ بہار کے گورنر اسٹیوارٹ کے مطابق "ظاہری طور پر یہ (کیونسٹ) فاشزم مخالف اور جنگ حامی ہیں؛ باطنی طور پر یہ سامراج مخالف ہیں اور ہتھیاروں کے لیے ان کی مانگ دونوں میں سے کسی بھی مقصد کے تابع ہو سکتی ہے" (مکتوب بنام لنلتھگو، مورخہ 6/مئی 1942)۔ بہر حال اس کے برخلاف ایم۔این۔ رائے نے آل انڈیا ٹریڈ یونین کانگریس سے علاحدہ شدہ اپنی تنظیم۔ انڈین فیڈریشن آف لیبر کے لیے حکومت سے مالی اعانت حاصل کی تھی یہ دوسری بات ہے کہ ان کے مطالبے کے باوجود بھی انھیں وائسرائے کی ایکزیکیٹو میں جگہ نہیں دی گئی تھی (حوالہ: وائسرائے جرنل، 14/فروری 1944 صفحہ 55)۔

فاش غلطیوں (بلکہ سبھاش چندر بوس کو ایک Quisling (غدار) قرار دینے کی مضحکہ خیز حرکت) اور قابل لحاظ عدم مقبولیت کے باوجود بھی 1942 کے بعد کے سال ہندوستان میں کیونسٹ تحریک کی تاریخ کے لیے مکمل طور پر ایک منفی تجربے کی حیثیت نہیں رکھتے، جولائی 1942 میں قانونی حیثیت حاصل ہو جانے کے نتیجے میں کیونسٹوں کو تنظیمی فوائد حاصل ہوئے۔ وجہ یہ ہے کہ انگریزوں نے 1920 کی دہائی میں کیونسٹ تحریک کے شروع ہونے کے وقت سے ہی کیونسٹوں کے خلاف کارروائی جاری رکھی تھی۔ اور کیونسٹ پارٹی 1934 سے ہی خلاف قانون چلی آرہی تھی۔ اس کی جو رکنیت 1942 میں محض 4000 تھی، وہ مئی 1943 میں 15000 ہو گئی۔ رکنیت میں تیزی کے ساتھ اضافہ جاری رہا، اس طرح کہ 1946 کے وسط میں 53,000 تک اور 1948 میں سکنڈ پارٹی کانگریس کے موقع پر 1,00,000 سے بھی تجاوز کر گئی۔ آل انڈیا ٹریڈ یونین کانگریس کی رکنیت میں بھی دوگنا اضافہ ہوا۔ اس کی رکنیت 1942 میں ڈھائی لاکھ سے بڑھ کر 1944 میں پانچ لاکھ ہو گئی (آر۔پی۔دت۔انڈیا ٹوڈے، صفحہ 353)۔ الگ تھلگ پڑ جانے کے نتیجے

میں کمیونسٹوں کے اندر شدت پسندی، ایثار، اور عینیت کا احساس پیدا ہوا اور بنگال کی اکائی نے تو قحط کے زمانے میں پوری لگن اور جانفشانی کے ساتھ راحت رسانی کے ذریعے 1942 کے بعد خود کو کافی مستحکم کر لیا تھا۔ فاشزم کے خلاف 'عوامی جنگ' کا نعرہ عوام کے لیے اور خاص کر کسانوں کے لیے بھلے ہی کوئی خاص کشش نہ رکھتا رہا ہو، مگر اس نے عالمی حالات و واقعات سے باخبر دانشور طبقے کو یقیناً متاثر کیا تھا۔ یہی وہ زمانہ ہے جب کلکتہ کے متوسط طبقوں کی ثقافتی زندگی مارکسزم کا اثر قبول کرنے لگی تھی۔ کمیونسٹ پارٹی کے سکریٹری پی۔ سی۔ جوشی نے عوامی ذرائع ابلاغ اور ثقافتی طور طریقوں کو بہت نئے ڈھنگ سے بروئے کار لانے کی کوشش کی۔ اس سلسلے میں انڈین پیوپلز تھیٹر ایسوسی ایشن (IPTA) نے 45-1944 کے دوران زبردست کامیابی حاصل کی۔ IPTA کی ایک مرکزی ٹیم نے ملک بھر کا دورہ کر کے بنگال کے قحط زدگان کے لیے چندہ اکٹھا کیا۔ IPTA اور اس طرح کی دوسری ثقافتی تنظیموں سے بڑے بڑے نام جڑ گئے تھے۔ بلراج ساہنی، خواجہ احمد عباس، کیفی اعظمی، سلیل چودھری، شمبھو مترا، دیبراتا بسواس، چترا مکھرجی، سکانتا بھٹاچارجی، وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ خود بنگال میں جیوترا اندر میترا کے نباجیون نرگان اور بجون بھٹاچارجی کے ڈرامے 'نبانا' میں ثقافتی حدود سے انحراف کیا گیا، جب کہ ناول نگار مانک بندھوپادھیائے یا شاعروں میں بشنوڈے، سمرسین اور سبھاش مکھرجی یا تو کمیونسٹ تحریک کے بہت قریب آ گئے تھے یا اس میں شامل ہی ہو گئے تھے۔

دیہی علاقوں میں بھی، کسان سبھائیں، بٹائی داروں اور زرعی مزدوروں کی تنظیمیں ان علاقوں میں کافی پھیلتی پھولتی گئیں جو 1942 کے واقعات سے زیادہ یا براہ راست طور پر متاثر نہیں ہوئے تھے۔ یہ علاقے تھے کیرالا، ساحلی آندھرا، اور تلنگانہ، شمالی بنگال، نیز پنجاب، مہا راشٹرا، اور تامل ناڈو کے کچھ حصے! جنگ کے خاتمے پر کمیونسٹ پارٹی ملک کی تیسری بڑی پارٹی ہونے کا دعوا کرنے میں حق بجانب تھی حالانکہ کانگریس یا مسلم لیگ سے اس کا کوئی موازنہ نہیں تھا۔

باب آٹھ

آزادی اور ملک کی تقسیم: 1945-47

برطانوی حکمرانی کے آخری دو برسوں کی سرگرمیوں کی نوعیت سے دو سلسلۂ واقعات ابھر کر سامنے آتے ہیں: ایک تو انگریزوں، کانگریسی اور مسلم لیگی لیڈروں کے مابین نازک نوعیت کی گفت و شنید، فرقہ وارانہ فسادات، انجام کار آزادی کا حصول اور ملک کی خون فشاں تقسیم؛ اور دوسری طرف اکاذکا اور خالصتہً مقامی نوعیت کے شدت پسندانہ اور متحدہ اقدامات (جیسے کہ آزاد ہند فوج کی تحریک اور 1945-46 میں سمندری فوج کی بغاوت)، پورے عرصہ کے دوران ہڑتالوں اور 1946-47 میں بنگال میں 'تبھاگا' شورش، ٹراونکور کی شورش اور حیدر آباد میں تلنگانہ کے کسانوں کی مسلح شورش کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ پہلے سلسلہ واقعات سے متعلق بہت زیادہ تاریخی مواد موجود ہے۔ ساتھ میں جو دوسری قابل قدر دستاویزات بھی دستیاب ہیں ان میں وی۔ پی مینن، کیمبل جانسن، ایچ۔ وی ہڈسن، پینڈرل مون کی تصنیفات، وادیل کا جریدہ، مانسرگ کی ضخیم دستاویزات، گاندھی کے آخری ایام (برسوں) سے متعلق پیارے لال کے تجزیے اور 1945 کے بعد سردار پٹیل کی خط و کتابت قابل ذکر ہیں۔ اس کے قطعی برعکس عوامی تحریکوں کے بارے میں اگر کچھ دستیاب ہے تو وہ خود ان تحریکوں کے شرکاء کی یادداشتیں ہیں؛ اس سلسلے میں کوئی تحقیقی یا تاریخی کام ابھی تک سامنے نہیں آسکا ہے۔ بہر حال جیسا کہ جدید ہندوستان کے پورے تاریخی عرصہ میں ہوتا رہا، ہندوستانی لیڈروں اور انگریزوں کے فیصلوں اور اقدامات کو نچلی سطح سے پڑنے والے دباؤ کو مد نظر رکھے بغیر صحیح طور پر سمجھنا مشکل ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ عوامی تحریکوں اور اقدامات نے انگریزوں کے اقتدار کو ہمیشہ متزلزل رکھا؛ عوامی "زیادتیوں" کے خدشے نے کانگریس کو گفت و شنید کا سلسلہ جاری رکھنے پر مجبور رکھا بلکہ آزادی کی لازمی قیمت کے طور پر ملک کی تقسیم کو بھی تسلیم کرنے پر مجبور کر دیا۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ سامراج مخالف تحریکوں کی وجہ سے ہی اگست 1947 کا کٹا پھٹا تصفیہ ممکن ہو سکا تھا۔

1945-46۔ آتش فشاں کا سر آغاز

گفت و شنید کی تمہید

مابعد جنگ گفت و شنید کی تمہید جنگ کے ان آخری دنوں میں ہی اس طرح تیار ہو گئی تھی کہ انگریزوں نے مرکزی حکومت کے موجودہ ڈھانچے میں کانگریس اور لیگ کی شمولیت کی کوشش شروع کر دی تھی۔ اس دوران پاکستان کے سوال پر گاندھی اور جناح کے درمیان بات چیت کے کچھ ناکام سلسلے بھی چلے تھے۔ واویل نے اپنی ذمہ داری سنبھالنے سے پہلے ہی، ستمبر 1943 میں اور پھر زیادہ واضح طریقے پر گاندھی کی رہائی (مئی 1944) کے بعد، مرکز میں ایک ایسی سیاسی حکومت قائم کرنے کی تجویز رکھی جو کانگریس اور لیگ کی شمولیت پر مبنی ہو تاکہ جنگ کے معاملات کے سلسلے میں بھرپور ہندوستانی تعاون حاصل کیا جا سکے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ "ہندوستانیوں کی توانائیوں کو احتجاج و مظاہرے کی بجائے نسبتاً زیادہ سودمند کاموں کی طرف منتقل کیا جا سکے۔ (حوالہ: مراسلہ بہ نام چرچل، مورخہ 24/اکتوبر 1944)۔ جیسا کہ جولائی۔ اگست 1944 کے دوران گاندھی اور واویل کی خط و کتابت سے بھی یہ بات ثابت ہو گئی تھی کہ وائسرائے کی اس تجویز میں کانگریس کے اقل ترین مطالبوں کو شامل ہی نہیں کیا گیا تھا؛ کانگریس کا مطالبہ "ایک ایسی قومی حکومت کی تشکیل کا تھا جو اسمبلی کو جواب دہ ہو، صرف جنگی امور اور فیصلے عارضی طور پر انگریزوں کے ہاتھ میں رہیں اور جنگ کے فوراً بعد آزادی کا واضح وعدہ کیا جائے۔" بہر حال اگر واویل کے ان وعدوں سے کچھ حاصل ہونے کے آثار پیدا بھی ہوئے تو بھی گاندھی جی 1942 کی کرپس کی تجاویز کی طرح ہی انھیں بھی آگے چل کر ناکام ہی بنا دیتے۔ چرچل نے 5/جولائی 1944 کو ایک ٹیلی گرام کے ذریعے یہ دریافت کیا کہ آخر گاندھی کی ابھی تک موت کیوں واقع نہیں ہوئی۔ جسے آمیری (Amery) نے اپنی ایک نجی گفتگو میں "ہندوستانی معاملات کے تئیں ہٹلری رویہ" بتایا تھا۔ اور مارچ 1945 میں واویل سے یہ کہا تھا کہ جب تک ممکن ہو سکے، اس معاملے کو ٹھنڈا ہی رکھا جائے "ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ (چرچل) ملک کو ہندوستان، پاکستان، پرنستان (Princestan) وغیرہ میں تقسیم کر دینے کے حامی ہیں (وائسرائے کا جرنل، صفحہ 120.89.78)۔

جولائی 1944 میں گاندھی کو ہندو مہاسبھا کی شدید مخالفت کا سامنا کرنا پڑا۔ انھوں نے گذشتہ سال اپریل میں راج گوپال آچاری کی طرف سے پیش کردہ فارمولے کی بنیاد پر جناح کے ساتھ گفت و شنید کی تجویز رکھی۔ فارمولا یہ تھا کہ شمال مغربی اور شمال مشرقی ہندوستان کے ان اضلاع کی حد بندی کے لیے جہاں مسلمان اکثریت میں ہیں، جنگ کے بعد ایک کمیشن قائم کیا جائے۔ ان

علاقوں میں یہ رائے شماری کرائی جائے کہ کیا وہ ایک جداگانہ پاکستان کو ترجیح دیں گے؛ علاحدگی کی شکل میں، دفاع اور مواصلات جیسی عام اور لازمی خدمات کو جاری رکھنے کے لیے ایک باہمی معاہدہ ہونا چاہیے، اور ان اسکیموں پر عمل در آمد انگریزوں کے ذریعہ اقتدار کی مکمل منتقلی (اس طرح کہ لیگ، کانگریس کے مطالبہ' آزادی کی توثیق کرے اور عبوری دور کے لیے ایک عبوری حکومت کی تشکیل میں کانگریس کے ساتھ تعاون کرے) کے بعد ہوگا۔ جناح نے 30 جولائی کو چھ صوبوں (پنجاب، سندھ، بلوچستان، سرحد، بنگال اور آسام) کی مکمل علاحدگی کے مطالبے کو دوہرایا اور فارمولے پر شدید نکتہ چینی کرتے ہوئے اسے محض ایک بہلاوا بتایا۔ ان کا یہ بھی کہنا تھا کہ علاحدگی کو آزادی تک ملتوی نہیں رکھا جا سکتا۔ ان کا خیال تھا کہ مشترکہ خدمات والی بات قطعی غیر ضروری ہے اور یہ کہ رائے شماری میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے ساتھ ساتھ حصہ لینے سے اس بنیادی تصور کی نفی ہوتی ہے کہ مسلمان ایک جداگانہ قوم ہیں جنھیں حق خود ارادیت حاصل ہے۔

ستمبر 1944 میں گاندھی۔ جناح مذاکرات انجام کار ناکام ہو گئے۔ بہر حال سینٹرل اسمبلی میں دونوں پارٹیوں کا باہمی تعاون برقرار رہا، یہاں تک کہ جنوری 1945 میں سینٹرل اسمبلی میں دونوں پارٹیوں کے لیڈر، بھولا بھائی دیسائی اور لیاقت علی خاں کے درمیان ایک ایسے معاہدے کی افواہ بھی پھیل گئی تھی کہ زمانہ جنگ کے ایک بندوبست کے طور پر کانگریس اور لیگ مل کر مرکز میں اور صوبوں میں حکومت بنائیں گی۔ بعد میں جناح کو اس افواہ کی باقاعدہ تردید کرنی پڑی تھی۔ یہ ذہن نشیں رکھنا بہت ضروری ہے کہ 1945 کے اوائل میں مسلم لیگ کی پوزیشن کافی کمزور ہو گئی تھی۔ کانگریس ممبران اسمبلی کی رہائی کی وجہ سے صوبہ سرحد میں مسلم لیگ کی وزارت کی جگہ پر خاں صاحب کی قیادت میں کانگریس وزارت قائم ہو گئی تھی، جب کہ پنجاب میں خضر حیات خاں کی یونینسٹ پارٹی کے لیڈر 1944 کے وسط میں ہی جناح سے ترک تعلق کر چکے تھے اور مارچ 1945 میں بنگال میں ناظم الدین وزارت ٹوٹ گئی تھی جہاں گورنر رول قائم کر دیا گیا تھا، یہاں تک کہ سندھ اور آسام میں بھی لیگی وزارتیں کانگریس کے رحم و کرم پر تھیں۔ اس طرح اگست 1946 تک بھی ایسے کوئی آثار نہیں تھے کہ مسلم لیگ اپنے مطالبہ پاکستان کے حق میں کوئی عوامی تائید کھڑی کر پائے گی۔ عوامی تائید یا اقدام سے لیگ کا کبھی بھی لینا دینا نہیں رہا تھا۔ اور "لڑ کر لیں گے پاکستان" کا نعرہ اب بھی محض زبانی جمع خرچ سے آگے نہیں بڑھ پایا تھا۔

شملہ کانفرنس

برطانوی انتخابات کو ایک ماہ رہ گیا تھا کہ چرچل نے آخر کار جون 1945 میں واویل کو ہندوستانی لیڈروں کے ساتھ بات چیت شروع کرنے کی اجازت دیدی۔ واویل نے 14 / جون کو

کانگریس ورکنگ کمیٹی کے تمام ممبروں کی رہائی کا حکم دیدیااور وائسرائے نیز کمانڈر ان چیف کے علاوہ تمام تر ہندوستانی ممبروں پر مشتمل ایکزیکیٹو کونسل کی تشکیل کے سلسلے میں مذاکرات کی پیش کش کی۔ پیش کش میں کہا گیا کہ اس ایکزیکیٹو کونسل میں ذ تیلے ہندوؤں اور مسلمانوں کو مساوی نمائندگی حاصل ہوگی اور یہ کونسل موجودہ دستور کے تحت ہی کام کرے گی، یعنی سینٹرل اسمبلی کو جواب دہ نہیں ہوگی۔ البتہ جنگ ختم ہوتے ہی ایک نئے دستور کی تیاری کے سلسلے میں بحث کرائی جا سکتی ہے۔ شملہ کانفرنس (25/جون تا14/جولائی) میں کانگریس نے "خود کو محض ذ تیلے ہندوؤں کی پارٹی" کا درجہ دیئے جانے پر سخت اعتراض کیااور اصرار کیا کہ اسے ایکزیکیٹو کونسل میں ہر فرقے اور ذات کے لوگوں کو نامزد کرنے کا حق دیا جائے۔ بہر حال جناح کے اس اصرار پر کہ تمام مسلم ممبروں کے انتخاب کا حق صرف مسلم لیگ کو ہی حاصل ہے اور یہ کہ ایکزیکیٹو کونسل میں فرقہ وارانہ بنیاد پر حق تنسیخ (ویٹو) بھی حاصل ہونا چاہیے، یہ کانفرنس ناکام ہوگئی۔ جناح کا یہ کہنا تھا کہ یہ حق تنسیخ اس طرح دیا جائے کہ جس معاملے کی مسلمان مخالفت کریں اس سے متعلق کوئی بھی فیصلہ دو تہائی اکثریت سے ہی کیا جا سکے۔ اس وقت کی سیاسی صورت حال کے لحاظ سے مسلم لیگ کا پہلا مطالبہ کافی مضحکہ خیز تھا، کیونکہ کانگریس کے دعوؤں سے قطع نظر (دلچسپ بات تو یہ ہے کہ کانگریس کے شملہ وفد کے قائد مولانا آزاد تھے)، خود انگریز بھی یونیسٹ پارٹی کے لیڈروں کو کھونے کے لیے ہرگز تیار نہیں تھے جو کہ اب بھی پنجاب کی حکومت اور سیاست پر پوری طرح غالب تھے اور ساتھ میں انگریزی حکومت کے وفادار بھی چلے آرہے تھے نیز مسلم لیگ کے مقابلے میں کہیں کم دردِ سر تھے۔ تاہم واویل نے مسلم لیگ کے ان دونوں مطالبون کی وجہ سے شملہ کانفرنس کو تحلیل کر کے دراصل جناح کو وہ Veto ویٹو دیدیا تھا جس کا وہ مطالبہ کر رہے تھے، کیونکہ لیگ کے غلط موقف کو سامنے لانے اور ضرورت پڑنے پر اس کی شمولیت کے بغیر ہی ایکزیکیٹو کونسل تشکیل دینے کے لیے کوئی کوشش نہیں کی گئی تھی۔

برطانیہ میں جولائی 1945 میں لیبر پارٹی کی زبردست انتخابی کامیابی کے نتیجے میں وہ سیاست داں برسر اقتدار آگئے جو کہ 1938 میں نہرو کے ساتھ Filkins کے مذاکرات سے وابستہ رہے تھے، اس کے علاوہ 1942 کی کرپس پیشکش سے بھی وابستہ رہ چکے تھے۔ شروع میں تو واویل نے کسی قدر بدحواسی کا مظاہرہ کیا: زبردست اکثریت حاصل ہوئی ہے اور لیبر پارٹی حکومت ہند کی باگ ڈور جلد از جلد اپنے ہندوستانی دوستوں کے حوالے کر دے گی اور ایسی صورت میں وائسرائے کو اپنی رفتار بڑھانے کی بجائے اس پر روک لگانے کی نوبت بھی آسکتی ہے" (وائسرائے کا جرنل، صفحہ 159،169،71)۔ واویل نے یہ بات بُری طرح محسوس کرلی تھی کہ رویوں کے درمیان موضوعی فرق بہت زیادہ ہے۔ کیونکہ لیبر پارٹی کے بہت سے لیڈروں، مثال کے طور پر وزیر داخلہ Bevin

کو "حقیقتاً سامراج وادی ہونے کی ناطے" ہمارے ہندوستان چھوڑنے کے خیال سے ہی چڑھے مگر دوسروں کی طرح ہی ان کے پاس بھی کوئی متبادل حل نہیں ہے" (اندراج بابت 24/ دسمبر 1946)۔ بہر حال ہندوستان کی طرح ہی پوری دنیا میں معروضی صورت حال بڑی تیزی سے تبدیل ہو رہی تھی۔ نازی جرمنی تباہ و برباد ہو چکا تھا اور اگست 1945 میں ہیروشیما واقعے کے بعد جاپان نے بھی ہتھیار ڈال دیئے تھے؛ پورے مشرقی یورپ میں اشتراکی نظام قائم ہو تا جا رہا تھا جس میں کیمونسٹ قیادت پیش پیش تھی بلکہ اس طرح کے آثار خود فرانس اور اٹلی میں بھی پیدا ہونے لگے تھے؛ چینی انقلاب کی پیش قدمی جاری تھی۔ جب کہ پورے جنوب مشرقی ایشیا کو سامراج مخالف لہر اپنی لپیٹ میں لے چکی تھی؛ ویت نام اور انڈونیشیا فرانسیسی اور ڈچ نو آبادیاتی نظام کی بحالی کی مزاحمت کر رہے تھے۔ برطانیہ کی آرمی اور عوام دونوں ہی جنگ سے بیزار ہو چکے تھے اور معیشت بھی خاصی خستہ ہو چکی تھی، اس لیے برطانیہ کو بھی پیچھے ہٹنا ہی پڑتا۔ انتخابات میں لیبر پارٹی کی فتح کی وجہ سے یہ عمل ذرا پہلے اور تیز رفتاری کے ساتھ شروع ہو گیا۔

داویل کے خدشات کے باوجود، اٹلی وزارت نے جن ابتدائی نوعیت کے اقدامات کے لیے کہا وہ کسی بھی لحاظ سے انقلابی نہیں تھے۔ آنے والے موسم سرما میں اگلے انتخابات کرانے کا اعلان جو کہ 21 اگست 1945 کو کیا گیا تھا، وہ جنگ کے خاتمے کے بعد ویسے بھی کرنا ہی پڑتا، کیونکہ مرکزی اسمبلی کے لیے پچھلے انتخابات 1934 میں اور صوبائی اسمبلیوں کے لیے 1937 میں کرائے گئے تھے۔ یہ اس لیے بھی لازمی تھا کیونکہ یوپی کے گورنر Hallet نے 14/ اگست کو واویل کو بتایا تھا کہ "احتجاجیوں کی آئینی سرگرمیوں کے پیش نظر بھی یہ اعلان ابتدائی قدم کی حیثیت رکھتا ہے۔ انگلینڈ میں بات چیت کے بعد واویل نے 19/ ستمبر کو "جلد از جلد مکمل حکومت خود اختیاری" کی تشکیل کے دعوے کو محض دوہرایا (لفظ آزادی کے استعمال سے ابھی تک گریز کیا جا رہا تھا) ایک دستور ساز ادارے کی تشکیل کے لیے الیکشن کے بعد ممبران اسمبلی اور ریاستوں کے ساتھ بات چیت شروع کرنے کا بھی وعدہ کیا جا رہا تھا اور ایک ایسی ایگزیکیٹو کونسل کی بھی بات کی جا رہی تھی جسے تمام ہندوستانی پارٹیوں کی تائید حاصل ہو گی (وائسرائے جرنل صفحہ 71-170)۔

آزاد ہند فوج مقدمہ

زبردست عوامی دباؤ کے تحت انگریزوں کی پالیسیوں میں فیصلہ کن، تبدیلی 46-1945 کے موسم خزاں اور موسم سرما میں آئی۔ یہ وہ مہینے ہیں جنھیں پیرڈیرل مون (Perderel Moon) نے واویل کے جرنل کی تدوین کرتے ہوئے آتش فشاں کے سر آغاز کا نام دیا ہے۔ انگریزوں نے انتہائی حماقت کا مظاہرہ کرتے ہوئے آزاد ہند فوج کے 20,000 قیدیوں میں سے چند سو کے

خلاف کھلے عام مقدمہ چلانے کا فیصلہ کیا (بلکہ 7000 سے زائد لوگوں کو ملازمتوں سے برطرف کر دیا گیا تھا اور مقدمہ چلائے بغیر انھیں قید رکھا گیا تھا)۔ انگریزوں نے مزید حماقت یہ کی کہ اس سلسلے کا پہلا مقدمہ نومبر 1945 میں دہلی کے لال قلعہ میں شروع کیا اور ایک ہندو، ایک مسلمان اور ایک سکھ (پی۔ کے۔ سہگل، شاہنواز خاں اور گوربخش سنگھ ڈھلوں) کو ایک ساتھ کٹہرے میں کھڑا کیا۔ بھولا بھائی ڈیسائی اور تیج بہادر سپرو، وکیل صفائی کے طور پر پیش ہوئے (آخرالذکر کو اپنا بیرسٹری گاؤن پورے 25 سال بعد استعمال کرنے کی نوبت آئی تھی۔) اس سلسلے میں ملک گیر سطح پر ہونے والے احتجاج میں مسلم لیگ نے بھی حصہ لیا۔ انٹلی جنس بیورو کے 20 نومبر کے ایک نوٹ میں یہ اعتراف ملتا ہے کہ "اس طرح کا کوئی دوسرا معاملہ دیکھنے میں نہیں آیا جس میں ہندوستانی عوام نے اتنی زیادہ دلچسپی لی ہو، محتاط طریقے پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ ہمدردی کی ایک ایسی شدید لہر تھی جو فرقہ وارانہ حدود کو بھی پار کر گئی تھی"۔ ایک صحافی شیوا راؤ نے اسی دن قلعہ لال کے قیدیوں کو دیکھنے کے بعد اپنی رپورٹ میں لکھا تھا "ان میں ہندو یا مسلمان ہونے کا ذرا بھی احساس نہیں ہے، لال قلعہ میں اپنے خلاف مقدمے کی سماعت کے منتظر مردوں میں اکثریت مسلمانوں کی ہے۔ ان میں سے بعض مردوں کو اس بات کا سخت ملال ہے کہ جناح پاکستان سے متعلق تنازع کو زندہ رکھے ہوئے ہیں۔ انگریز اس بات سے سخت پریشان تھے کہ کہیں آزاد ہند فوج کا جذبہ ہندوستانی آرمی کو بھی لپیٹ میں نہ لے لے اور جنوری میں پنجاب کے گورنر نے اپنی رپورٹ میں یہ کہا تھا کہ لاہور میں آزاد ہند فوج کے رہا شدہ قیدیوں کو جو استقبالیہ دیا گیا تھا اس میں ہندوستانی فوجیوں نے وردی میں شرکت کی تھی۔

انگریزوں نے اپنے لیے ایک دوسری مشکل، انڈونیشیا اور ویت نام میں نو آبادیاتی عمل داری پھر سے بحال کرنے کی کوشش میں ہندوستانی فوجوں کو استعمال کرنے کی شکل میں پیدا کر لی تھی۔ اس کا عام لوگوں (خصوصاً شہری علاقے کے لوگوں) اور آرمی کے حلقوں پر جو جذباتی اثر مرتب ہوا، اس کا اظہار اس طرح ہوا کہ سامراج مخالف شعور کو زبردست فروغ حاصل ہو تا گیا۔ ہندوستانی آرمی کے اس طرح استعمال سے واویل بد حواسی کی حد تک پریشان تھا مگر اتحادی فوجوں کے سپریم کمانڈر ماؤنٹ بیٹن نے اکتوبر 1945 میں واویل کی ایک نہیں چلنے دی۔ دریں اثنا جنگ کے بعد پیدا ہونے والے عام مسائل (بے روزگاری، قیمتوں میں بھاری اضافہ وغیرہ) غذائی بحران، بمبئی اور بنگال میں اجناس کی کم پیداوار، مدراس میں سمندری طوفان اور ضرورت سے زیادہ غلہ پیدا کرنے والے صوبے پنجاب میں بھی اجناس کی کم تحصیل کی وجہ سے اور بھی سنگین شکل اختیار کرتے جا رہے تھے۔ واویل نے 29/ جنوری 1946 کو غذائی اجناس میں 30 لاکھ ٹن کے بقدر کمی کا تخمینہ لگایا تھا، جب کہ امریکہ سے غذائی اجناس کی درآمد کاری غیر یقینی بنی ہوئی تھی اور راشن میں زبردست کمی

کے نتیجے میں فی کس کیلوری کی قدر محض 1200 رہ گئی تھی۔ جب کہ جنگ کے زمانے میں لندن میں یہ قدر 2800 کیلوری رہی تھی۔

انگریزوں کو 1945 کے موسم خزاں میں جس بات کا سب سے زیادہ خدشہ تھا وہ کانگریس کی دوبارہ بغاوت کا تھا، وجہ یہ تھی کہ اس مرتبہ 1942 کے واقعات کی تکرار نے صورت حال کو کافی سنگین بنا دیا تھا۔ کیونکہ اب مواصلاتی نظام کو نشانہ بنانے کے ساتھ ساتھ وسیع تر زرعی بغاوت، محنت کش طبقے کی شورش، آرمی کے اندر بے چینی، اور جنگی تجربہ رکھنے والے آزاد ہند فوجیوں کی تھوڑی بہت موجودگی، نیز اس طرح کے دوسرے امکانات نے انگریزوں کو تشویش میں مبتلا کر دیا تھا۔ (حوالہ: سی پی کے گورنر کا مراسلہ بنام واویل، مورخہ 10/ نومبر 1945، نیز صورت حال سے متعلق کمانڈر ان چیف Auchinleck کا تجزیہ، یکم دسمبر 1945)۔ واویل نے کانگریسی لیڈروں (بالخصوص نہرو، پٹیل نیز بہار۔ سی پی اور یوپی کے علاقائی لیڈروں) کی اشتعال انگیز تقریروں پر سخت اعتراض کیا تھا۔ ان تقریروں کے ذریعے 1942 کے مجاہدین آزادی اور شہیدوں کے کارناموں کی عظمت پر زور دیا جا رہا تھا؛ زیادتیوں میں ملوث سرکاری افسران کے خلاف سخت کارروائی کا مطالبہ کیا جا رہا تھا اور آزاد ہند فوج کے قیدیوں کی فوراً رہائی کا مطالبہ کیا جاتا تھا۔ بہر حال انگریزوں کو جلد ہی یہ احساس ہو گیا کہ یہ سب شور شرابا انتخابی پروپیگنڈا کے علاوہ کچھ اور نہیں ہے۔ اور یہ کہ کانگریسی لیڈر یہ سب کچھ خود کو عام لوگوں کے موڈ سے ہم آہنگ کرنے کی ضرورت کے تحت کر رہے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ 1942 کا سال کانگریس کے لیے الیکشن کے اعتبار سے ترپ کے پتے کی حیثیت رکھتا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ آصف علی نے اکتوبر میں اپنی ایک نجی گفتگو کے دوران یہ کہا تھا کہ اگر کانگریس نے آزاد ہند فوج کے لوگوں کے کاز کو اپنے ہاتھ میں نہ لیا تو اسے انتخابی نقصان کا سامنا کرنا پڑے گا، لیکن اگر کانگریس برسر اقتدار آئی تو وہ نہ صرف یہ کہ آزاد ہند فوج کے لوگوں کو آرمی سے الگ کر دے گی بلکہ ان میں سے کچھ کو تو جیل میں بھی ڈال سکتی ہے۔

اس حقیقت کی نشان دہی کمیونسٹوں کے خلاف زوردار تحریک سے بھی ہوتی ہے جس میں نہرو نے بہت ہی سرگرم رول ادا کیا؛ یہاں تک کہ کمیونسٹ پارٹی کے ممبران 5/ اکتوبر کو کانگریس سے مستعفی ہو گئے اور دسمبر میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے کمیونسٹ ممبران کو باقاعدہ طریقے پر کمیٹی سے نکال دیا گیا۔ کمیونسٹوں پر حملے کے واقعات بھی ہوئے اور ممبئی میں نہرو کی تقریر سے اشتعال میں آ کر ایک بھیڑ نے تو پارٹی کے صدر دفتر پر حملہ کر دیا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کمیونسٹوں کے خلاف اس مہم کی وجہ محض زمانہ جنگ میں ان کے رول پر واجب برہمی تک ہی محدود نہیں تھی، کیونکہ ہندو مہا سبھا کا رول بھی کچھ ایسا ہی رہا تھا مگر اس کے خلاف ایسی کوئی بات نہیں ہوئی تھی جب کہ اگست 1942 میں ہندو مہا سبھا کے کچھ لیڈر تو وزیر بھی بنے رہے تھے اور 1942 میں

پاکستان اور بھارت چھوڑ دو تحریک کے سلسلے میں خود راج گوپال آچاریہ کے نظریات بھی کیونسٹوں جیسے ہی رہے تھے مگر وہ بدستور کانگریس کے صف اول کے لیڈر تھے۔

جو طاقتیں کانگریس کے اندر شدت پسندی کو ہمیشہ کنٹرول کرتی آئی تھیں وہ ایک بار پھر سرگرم ہو گئی تھیں۔ 3 / نومبر کو سندھ کے گورنر نے، 17 / نومبر کو ممبر مالیات رالینڈس نے اور 30 / نومبر کو سکریٹری آف اسٹیٹ پی۔ لارنس نے اپنے اپنے طور پر جی۔ ڈی برلا سے کانگریسی لیڈروں کی تقریروں پر تشویش کا اظہار کیا تھا (وائسرائے جرنل صفحہ 185)۔ کانگریس ہائی کمان کے ساتھ برلا کے مسلسل رابطے (ہاٹ لائن) میں گاندھی کی جگہ سردار پٹیل نے لے لی تھی (حوالہ: In the Shadow of Mahatma)۔ 5 / دسمبر کو واویل نے سکریٹری آف اسٹیٹ کو یہ اطلاع دی تھی کہ "حال ہی میں اس طرح کہ اشارے ملے ہیں کہ کانگریسی لیڈر یہ واضح کر کے کہ الیکشن ختم ہونے سے پہلے کوئی عوامی تحریک ہرگز شروع نہیں کی جائے گی، سیاسی تناؤ کو کم کرنا چاہتے ہیں...... (وجہ یہ ہے کہ) کانگریس کے پس پشت مضبوط سرمایہ دار طبقہ اپنی املاک کی سلامتی کے سلسلے میں کافی پریشان ہوتا جارہا ہے"۔ پھر یہ کہ خود برلا نے بھی اگلے ہی دن لندن کے ایک افسر کو یہ یقین دہانی کرائی تھی کہ "جواہر لال کے بشمول ایسا کوئی لیڈر نہیں ہے جو کسی طرح کا بحران یا تشدد دیکھنا چاہتا ہو۔ اس طرح کی سخت تقریروں کے لیے عوامی بے چینی اور موجودہ ماحول ذمہ دار ہے۔ اکثر خود لیڈروں کو بھی پیروی کرنی پڑتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ آنے والے دنوں میں اس طرح کی بے لگام زبان کم سے کم سننے کو ملے گی" (وائسرائے جرنل، صفحہ 602,3.615)۔ واویل کے الفاظ میں وہ 'اہم موڑ، جو کہ کم از کم "عارضی مفاہمت کا باعث ہوا"، (مراسلہ بنام جارج ششم محولہ وائسرائے جرنل صفحہ 713)، 21 تا 23 / نومبر 1945 کو کلکتہ میں آزاد ہند فوج کے سوال پر عوامی دھماکے کی شکل میں سامنے آیا۔ اس سلسلے میں شہر میں انتشار کا سلسلہ بعد میں تقریباً ایک دہائی تک جاری رہا اور فرانس کے انقلاب کے دنوں میں پیرس میں ہونے والے واقعات کی یاد دلاتا رہا۔ فارورڈ بلاک کے زیر اہتمام طلباء نے آزاد ہند فوج کے لوگوں کی رہائی کا مطالبہ کرتے ہوئے ایک بڑا جلوس نکالا۔ جب اس جلوس کو ڈلہوزی چوک میں داخل ہونے سے روک دیا گیا اس نے رات بھر دھرم تلہ میں دھرنا دیا۔ بعد میں اس جلوس میں کیونسٹ اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے ارکان بھی شامل ہو گئے جو کہ اب تک فارورڈ بلاک کے زبردست دشمن سمجھے جاتے تھے۔ اسلامیہ کالج کے طلباء بھی مسلم لیگ کا ہرا جھنڈا اٹھائے ہوئے آملے۔ سرت بوس نے جو کہ سبھاش بوس کے بھائی سمجھے جانے لگے تھے، قطعی خلاف توقع طریقے پر اسٹیج پر آنے اور جلوس سے خطاب کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ انھوں نے بعد میں اشتعال بھڑکانے کے لیے کیونسٹوں کو ہی الزام دیا۔ بہر حال موجود طلباء نے موقع پر ہی فیصلہ کرتے ہوئے کانگریس کے جھنڈے، مسلم لیگ کے جھنڈے اور

کیونسٹوں کے لال جھنڈے کو سامراج مخالف اتحاد کے طور پر ایک ساتھ جوڑ لیا۔ پہلے راؤنڈ کی پولس فائرنگ کے بعد، جس میں دو طالب علم (ایک ہندو اور ایک مسلمان) مارے گئے تھے، 22 اور 23 / نومبر کو پورے شہر میں ہنگامہ ہو گیا۔ ٹیکسیوں کے سکھ ڈرائیوروں، کیونسٹوں کی قیادت والی ٹرام وے یونینوں اور بہت ساری فیکٹریوں کے ورکروں نے ہڑتال کر دی، جب کہ کلکتہ کارپوریشن کے ملازمین اپنے بعض مطالبات کو لے کر پہلے ہی سے ہڑتال پر تھے۔ کاروں اور لاریوں کو نذر آتش کیا جانے لگا، ٹرینوں کو چلنے نہیں دیا گیا، اور سڑکوں پر رکاوٹیں کھڑی کر دی گئیں تھیں۔ بعد کی پولس انکوائری میں ایک نئی بات یہ نوٹ کی گئی کہ جب بھیڑ پر فائرنگ کی گئی تھی تو زیادہ تر لوگ اپنی اپنی جگہ پر جمے رہے تھے اور بہت کم لوگ ادھر ادھر ہوئے تھے اور جلد ہی پھر سے سینہ سپر ہو گئے تھے۔ (گورنر کیسی بنام وادیل مورخہ 2/ جنوری 1946 محولہ وائسرائے کا جرنل صفحہ 225)۔ پولس فائرنگ کے 14 واقعات کے بعد ہی امن و قانون بحال ہو پایا تھا۔ فائرنگ کے ان واقعات میں 33 لوگ مارے گئے تھے اور تقریباً 200 لوگ زخمی ہوئے تھے۔ پولس اور آرمی کی تقریباً 150 گاڑیاں تباہ ہوئی تھیں۔ 70 انگریز اور 37 امریکی سپاہی زخمی ہوئے تھے۔ ان واقعات کا رد عمل بھی کافی اہم رہا تھا۔ پٹیل نے 24 نومبر کو بمبئی میں ایک انتخابی اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے پولس کے ساتھ اس طرح کے "چھوٹے موٹے" جھگڑوں میں توانائیوں کو "ضائع" کرنے کی مذمت کی تھی۔ (حوالہ: انڈین اینول رجسٹر)۔ دوسری طرف گاندھی نے بھی بنگال کے گورنر کے ساتھ دوستانہ مذاکرات شروع کر دیئے تھے اور کانگریس ورکنگ کمیٹی کے کلکتہ اجلاس (7 / تا 11 / دسمبر) نے آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے ستمبر اجلاس کے قطعی برعکس رویہ اپناتے ہوئے تشدد کی سخت ترین الفاظ میں مذمت کی تھی۔ ستمبر اجلاس میں بیشتر ممبروں نے 1942 کی جدوجہد کی زبردست اہمیت کو تسلیم کیا تھا جو کسی بھی شکل میں تشدد سے خالی نہیں رہی تھی۔ دوسری طرف انگریزوں کو بھی یہ احساس ہو گیا تھا کہ ان کی طرف سے چند مراعات کے اعلان کی ضرورت ہے۔ چنانچہ یکم دسمبر کو اعلان کیا گیا کہ آزاد ہند فوج کے صرف ان لوگوں پر مقدمہ چلایا جائے گا جن پر ساتھی قیدیوں کو قتل کرنے یا ان کے ساتھ ظالمانہ برتاؤ کرنے کا الزام ہے۔ اس طرح گویا اس سلسلے کے پہلے مقدمے میں عائد کردہ الزام، تاج برطانیہ کے خلاف جنگ چھیڑنے، کو واپس لے لیا گیا تھا اور پہلے جتھے کے خلاف سنائی گئی قید کی سزا بھی جنوری میں معاف کر دی گئی تھی۔ فروری 1946 میں ہند۔ چینی اور انڈونیشیا سے ہندوستانی فوجیوں کی واپسی شروع ہو گئی تھی۔ ہندوستانی امور سے متعلق برطانوی کابینہ کی سب کمیٹی نے 28/ نومبر کو یہ فیصلہ کیا کہ ہندوستان ایک پارلیمانی وفد بھیجا جائے؛ اور اس طرح 22 جنوری 1946 کو اس سے بھی اہم فیصلہ، ہندوستانی لیڈروں سے بات چیت کے لیے ایک کابینہ مشن بھیجنے کے سلسلے میں کیا گیا۔ اس اثناء میں

وائسرائے واویل نے اپنے ایک بریک ڈاؤن (تعطل) منصوبے کو تیار کرنا شروع کر دیا تھا۔ مئی 1946 میں کابینہ مشن کے سامنے پیش کئے گئے اس منصوبے میں "جبر و تشدد" اور "راہ فرار" اختیار کرنے کے درمیان ایک تیسرے متبادل کے طور پر یہ کہا گیا تھا کہ برطانوی فوجیوں اور افسروں کو صوبہ سرحد اور شمال مشرقی ہندوستان میں منتقل کر کے باقی سارا ہندوستان کانگریس کے حوالے کر دیا جائے۔ اگرچہ کابینہ مشن کی اپنی تجاویز کی وجہ سے یہ منصوبہ کالعدم ہو کر رہ گیا تھا، مگر یہ بھی اب اس بات کی واضح شہادت ہے کہ انگریزوں کو یہ احساس ہو گیا تھا کہ کانگریس کی قیادت میں شروع ہونے والی تحریک کو دبانا ممکن نہیں ہو گا اور یہ کہ کچھ اعلا انگریز افسران پاکستان کو ہندوستان کا شمالی آئیر لینڈ بنانا چاہتے تھے۔

ہندوستانی لیڈروں کو گفت و شنید کے لیے آمادہ کر لینے سے پہلے انگریزوں کو فروری 1946 میں ایک دوسرے بڑے بحران کا سامنا کرنا پڑا۔ 11 اور 13 فروری کی درمیانی مدت میں کلکتہ میں ایک بار پھر زبردست اتھل پتھل رہی کیونکہ آزاد ہند فوج کے عبد الرشید کو سات سال قید با مشقت کی سزا سنائی گئی تھی جس پر پورے شہر میں احتجاج کی شدید لہر دوڑ گئی تھی۔ مسلم لیگ سے وابستہ طلباء تنظیم نے ایک عام ہڑتال کا نعرہ دیا جس میں اسٹوڈنٹس فیڈریشن نے بھی ساتھ دیا اور نومبر 1945 کی طرح ہی، اس مرتبہ بھی شہر کی سڑکوں اور گلیوں میں طالب علموں اور محنت کشوں، ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان زبردست اتحاد دیکھنے میں آیا۔ 12 / فروری کو کیونسٹوں کے نعرے پر عام ہڑتال کی گئی جس کے نتیجے میں پورے کلکتہ میں صنعتی زندگی مفلوج ہو گئی تھی۔ اسی دن ویلنگٹن اسکوائر پر ایک بھاری اجتماع بھی ہوا جس سے مسلم لیگ کے لیڈر سہروردی، گاندھیائی کانگریس کے ستیس داس گپتا، اور کیونسٹ لیڈر سومناتھ لاہری نے خطاب کیا۔ سڑکوں پر اور گلیوں میں مسلسل دو دن تک مسلح ٹکراؤ جاری رہنے کے بعد ہی آرمی اور پولس امن و قانون بحال کرا پائی تھی۔ ان دو دنوں میں 84 لوگ مارے گئے تھے اور تقریباً 360 لوگ زخمی ہوئے تھے۔ اس اثناء میں ریل اور ڈاک کے ملازمین کی کل ہند تنظیمیں گرانی میں اضافے اور جنوری میں راشن میں کی گئی کٹوتی کے خلاف ہڑتال کی دھمکیاں دیتی آرہی تھیں اور سرکاری ملازمین نے بھی جلد ہی آواز میں آواز ملانا شروع کر دیا تھا۔ بنیادی نوعیت کے سیکٹروں میں مزدور تنظیموں کے اس طرح کل ہند سطح پر اور موثر انداز میں منظم ہو جانے کے نتیجے میں ہندوستان میں مزدور تحریک کو زبردست طاقت حاصل ہو گئی تھی۔ وجہ یہ ہے کہ اس سے پہلے یعنی 1920 اور 1930 کی دہائیوں کی ٹیکسٹائل ہڑتالیں صنعتی مرکزوں، خاص طور پر بمبئی اور کلکتہ کے کپڑا ملوں تک ہی محدود رہا کرتی تھی۔ اگرچہ راشن میں کٹوتی کو کانگریس اور مسلم لیگ، یعنی دونوں ہی نے تسلیم کر لیا تھا (3 / مارچ کو آزاد نے تو اس کٹوتی کا یہ کہہ کر خیر مقدم بھی کیا تھا کہ انگریز اب ایک نگراں حکومت کے طور پر کام کر رہے

ہیں۔ حوالہ : وائسرائے جرنل، جلد چھ، صفحہ 117)، مگر اس کے خلاف عوامی اُبال کو نہیں روکا جاسکا۔ فروری کے وسط میں الہ آباد جیسے شہر میں 80.000 سے زائد لوگوں نے مظاہرہ کیا جس میں راشن کے مرکزوں پر حملے بھی ہوئے (وائسرائے کا جرنل)۔

بحری فوج میں بغاوت

بہر حال انگریزوں کے لیے سب سے بڑا خطرہ بمبئی میں بحری فوج کے اندر بغاوت (18-23 فروری 1946) سے پیدا ہو گیا تھا۔ یہ بغاوت بھلے ہی بھلادی گئی ہو مگر ہماری تحریک آزادی کا سب سے بہادرانہ کارنامہ تھی۔ جنگ کے زمانے میں انڈین رایل نیوی میں کی گئی بھاری توسیع کے نتیجے میں اس میں ملک کے تمام حصوں سے لوگ شامل کیے گئے تھے جس کے نتیجے میں سیاسی اعتبار سے پس ماندہ جرار (Martial) نسلوں کے لوگوں کو ہی بھرتی کرنے کی قدیم فوجی روایت کافی کمزور ہو گئی تھی۔ ایک طرف تو بحری فوج میں نسل کی بنیاد پر کیا جانے والا امتیازی سلوک بدستور قائم رہا اور دوسری طرف بیرون ملک خدمات انجام دینے کے نتیجے میں عالمی حالات وواقعات سے واقفیت میں بھی اضافہ ہوا۔ آزاد ہند فوج سے وابستہ رہے لوگوں پر مقدمے نیز جنگ کے بعد ہندستان کے عوام میں ہونے والی اتھل پتھل بھی پوری طرح اثر انداز ہوئی۔ سگنل ٹریننگ کے شعبے، تلوار سے وابستہ ایک درجے کے فوجیوں نے ناقص خوراک اور نسلی امتیاز کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے 18 فروری کو بھوک ہڑتال کر دی۔ اگلے دن یہ ہڑتال ساحل سمندر پر واقع بیرکوں اور بمبئی بندرگاہ پر لنگر انداز 22 جہازوں تک پہونچ گئی اور باغی جہازوں کے مستولوں کی چوٹیوں پر کانگریسی، لیگی اور کمیونسٹ جھنڈے لہرائے گئے۔ بحری فوج کے ان ہڑتالی ملازمین نے ایم۔ ایس۔ خاں کی قیادت میں نیول سینٹرل اسٹرائک کمیٹی بھی تشکیل کی اور اپنے مطالبات کی فہرست تیار کی۔ ان میں بہتر خوراک اور ہندوستانی اور انگریز فوجیوں کے لیے مساوی مشاہرہ کا مطالبہ قابل ذکر تھا۔ اس کے علاوہ آزاد ہند فوج کے لوگوں اور دوسرے قیدیوں کی رہائی نیز ہندوستانی فوج کو انڈونیشیا سے واپس بلا لینے کا مطالبہ بھی شامل تھا۔ بہر حال یہ لوگ پُرامن ہڑتال اور مسلح بغاوت کے درمیان فرق قائم نہیں کر سکے۔ چنانچہ 20/ فروری کو اپنی اپنی بیرکوں میں اور جہازوں پر واپس لوٹ جانے کے حکم پر عمل کرنے پر انھوں نے خود کو آرمی گارڈوں سے گھرا ہوا پایا۔ جب ان فوجیوں نے اپنا حصار توڑنے کی کوشش کی تو لڑائی شروع ہو گئی جس میں جہازوں کے توپ خانے کی مدد لی گئی اور ایڈمرل گوڈفرے نے بم بار جہازوں کے ذریعے پرواز کر کے بحریہ کو تباہ و برباد کر دینے کی دھمکی دی۔ اسی شام بھائی چارے کا زبردست جذبہ دیکھنے میں آیا۔ لوگ باغی فوجیوں کے لیے ہجوم در ہجوم غذائی اشیاء اور دوسرا سامان لے کر گیٹ وے آف انڈیا پر پہونچنا

شروع ہو گئے تھے۔ اسی طرح دکانداروں نے بھی یہ اعلان کر دیا تھا کہ باغی جو بھی سامان چاہیں ان کی دکانوں سے لے سکتے ہیں۔ در حقیقت اس بغاوت کا سلسلہ واقعات مکمل طور پر 1905 کے پہلے روسی انقلاب کے دوران بحر اسود فوجی بیڑے کے غدر کی نہج پر چلا تھا۔ 1905 کا روسی غدر بھی دراصل ناقص خوراک کو لے کر شروع ہوا تھا اور اس وقت بھی بھائی چارے کا زبردست جذبہ دیکھنے میں آیا تھا اور لوگوں کی بھیڑ کو گولیوں سے بھون دیا گیا تھا۔ بعد میں اس غدر کے کچھ مناظر Eisenstein کی ایک کلاسیکی فلم 'بیٹل شپ پوٹم کن' میں بھی دکھائے گئے تھے۔ 22 فروری تک یہ ہڑتال ملک بھر کے بحری فوجی اڈوں بلکہ گہرے سمندروں میں موجود جہازوں تک بھی پھیل گئی تھی۔ ایک اندازے کے مطابق اس بغاوت (ہڑتال) میں 78 جہازوں، 20 ساحلی اڈوں، اور تقریباً 20,000 فوجیوں نے حصہ لیا تھا۔ کراچی میں جنگی جہاز 'ہندوستان' نے شدید جھڑپ کے بعد ہی ہتھیار ڈالے تھے جب کہ ہندوؤں اور مسلمانوں (طالب علموں) نے پولس اور آرمی کے ساتھ پر تشدد ٹکراؤ کے ذریعے باغیوں کے تئیں ہمدردی اور تائید کا اظہار کیا تھا۔

دوسرے تمام مقامات کی ہی طرح بمبئی میں بھی ان ڈرامائی واقعات کے سلسلے میں دو قطعی باہم مخالف رویے سامنے آئے۔ بمبئی کی کمیونسٹ پارٹی نے عام ہڑتال کا اعلان کیا جس کی تائید کانگریس سوشلسٹ لیڈروں ارونا آصف علی اور اچیوت پٹوردھن نے بھی کی۔ ان کے برخلاف سردار پٹیل نے لوگوں کو اپنے معمولات جاری رکھنے کا مشورہ دیا تھا۔ صوبائی کانگریس کے سربراہ ایس۔ کے پاٹل نیز صوبائی مسلم لیگ کے سربراہ چندریگر نے تو حالات کو معمول پر لانے کے لیے رضاکاروں کی پیش کش بھی کی تھی۔ کانگریس اور لیگ کی طرف سے مخالفت کے باوجود بھی 22 فروری کو بمبئی میں 3,00,000 لوگوں نے کام بند رکھا، تقریباً تمام ہی بڑے کارخانے بند رکھے گئے نیز لوگوں کی بھیڑ نے جگہ جگہ سڑکوں پر رکاوٹ کھڑی کرنے اور آس پاس کی عمارتوں سے سڑکوں اور گلیوں پر نشانہ قائم رکھنے کا سلسلہ دو دن تک جاری رکھا اور اس طرح پولس اور آرمی کے ساتھ پر تشدد ٹکراؤ بھی جاری رہا تھا۔ بمبئی شہر میں امن و قانون کی بحالی کے لیے بڑی تعداد میں فوج کی ضرورت پڑی تھی۔ سرکاری رکارڈ کے مطابق 228 شہری مارے گئے تھے اور 1046 زخمی ہوئے تھے۔ (3 پولس والے ہلاک اور 91 زخمی ہوئے تھے)۔

جناح کی یک بارگی مدد سے پٹیل 23/ فروری کو باغی فوجیوں سے ہتھیار ڈلوانے میں کامیاب ہو گئے تھے اور یہ یقین دہانی کرائی تھی کہ ملک کی قومی پارٹیاں کسی کے خلاف زیادتی نہیں ہونے دیں گی۔ اس یقین دہانی کو بڑی جلد فراموش کر دیا گیا۔ خود پٹیل نے یکم جنوری 1946 کو آندھرا کانگریس کے لیڈر دشوانا تھن کو یہ لکھا تھا کہ آرمی کے اندر نظم وضبط کے ساتھ کسی طرح کا کھلواڑ نہیں کیا جا سکتا ... ہم تو آزاد ہندوستان میں بھی آرمی چاہیں گے (مکتوبات سردار، جلد چار احمد

آباد 1977 صفحہ 165)۔ نہرو نے بمبئی آنے کے لیے ارونا آصف علی کی دعوت کو قبول کر لیا تھا مگر جلد ہی تشدد کے وحشیانہ اظہار کی سرکوبی کی ضرورت سے بھی متاثر ہو گئے تھے۔ یہ دوسری بات ہے کہ بعد میں انھوں نے بحری فوجیوں کی اس ہڑتال کی ستائش بھی کی تھی کیونکہ اس نے عوام اور آرمی کے درمیان حائل آہنی دیوار کو توڑ دیا تھا (وائسرائے جرنل، جلد چھ، صفحہ 1084-1117-18)۔ پٹیل کی طرح ہی گاندھی کا رویہ بھی انتہائی مخالفانہ رہا تھا۔ 22/ فروری کو انھوں نے "ہندوستان کے لیے ایک غلط اور نازیبا مثال" پیدا کرنے کے لیے باغی فوجیوں کی مذمت کی اور یہ مشورہ بھی دیا کہ اگر انھیں کوئی شکایت ہے تو اپنی ملازمتوں سے پُرامن طریقے پر مستعفی ہو جائیں۔ انھوں نے ساتھ میں یہ دلچسپ بیان بھی دیا کہ "کسی پُر تشدد اقدام کے لئے ہندوؤں، مسلمانوں اور دوسرے لوگوں کا اتحاد ناپاک گٹھ جوڑ کے مترادف ہے"۔ ارونا آصف علی نے اس کا ترکی بہ ترکی جواب دیتے ہوئے یہ کہا تھا کہ جو کانگریسی خود قانون ساز اسمبلیوں میں داخل ہونے جا رہے ہیں، انھیں ہرگز یہ کہنے کا منھ نہیں ہے کہ باغی فوجی اپنی ملازمتوں سے سبکدوش ہو جائیں" انھوں نے بہت صحیح طریقے پر یہ المناک پیش گوئی بھی کی تھی کہ "ہندوؤں اور مسلمانوں کو کسی دستوری محاذ کی بجائے کسی جنگی محاذ پر متحد کرنا بہت آسان ہے" (مکتوبات سردار، صفحہ 162-3)۔ گاندھی کے 22/ فروری کے بیان کے تناظر میں خود وادیل کے 30 مئی 1946 کے اس نجی تبصرے کو مدنظر رکھنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ ہمیں ہندوؤں اور مسلمانوں کے ساتھ ایک ساتھ آویزش سے ہر قیمت پر احتراز کرنا چاہیے (وائسرائے جرنل، صفحہ 485)۔

افسوس کی بات یہ ہے کہ آزاد ہند فوج کے قطعی برعکس فروری 1946 کی بحری بغاوت میں ملوث فوجیوں کو کبھی بھی قومی ہیرو کا درجہ نہیں دیا گیا۔ جب کہ ان لوگوں نے آزاد ہند فوج کے لوگوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ جوکھم بھرا قدم اٹھایا تھا۔ بحری مرکزی اسٹرائیک کمیٹی کے آخری پیغام کو یاد رکھنا بجائے خود ضروری ہے۔ اس پیغام میں کہا گیا تھا: ہماری اسٹرائیک ہماری قومی زندگی میں ایک تاریخی واقعے کی حیثیت رکھتی ہے۔ ہماری تاریخ میں پہلی بار کسی مشترکہ کاز کے لیے جوانوں اور عام لوگوں کا خون ایک ساتھ بہا ہے۔ ہم فوجی اسے کبھی فراموش نہیں کریں گے۔ ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ ہماری بہنیں ہمارے بھائی، یعنی دوسرے سبھی لوگ بھی اسے کبھی فراموش نہیں کریں گے۔ ہمارے عظیم عوام، زندہ باد" جے۔ ہند" (The RIN Strike p. 75)۔

مارچ۔اگست 1946: کیبنٹ مشن

انتخابات

کانگریسی رہنماؤں نے ہر طرح کے عوامی ٹکراؤ کے امکانات کو مسترد کرتے ہوئے 1945-46 کے موسم سرما کے دوران اپنی ساری توانائیوں کو انتخابات پر مرکوز رکھا۔ 1937 کی ہی طرح اس مرتبہ بھی نہرو کانگریس کے سب سے اہم اور نمایاں مقرر تھے مگر امیدواروں کے انتخاب کا سارا انتظام پٹیل کے کنٹرول میں تھا۔ اگرچہ کبھی کبھی سابق الذکر کی طرف سے یہ آواز بھی اٹھتی رہی کہ جو لوگ ماضی میں "ہمارے ساتھ دھوکہ کر چکے ہیں انھیں بھی ٹکٹ دیئے گئے ہیں" مگر خود نہرو نے اس بارے میں کچھ بھی نہیں کیا۔ نہرو کا یہ کہنا تھا کہ "میرے پاس مقامی نوعیت کے چھوٹے موٹے اختلافات کے لیے نہ تو وقت ہی ہے اور نہ ہی اس معاملے میں دخل دینے کا اُن کا کوئی ارادہ ہی ہے۔ (نہرو بنام پٹیل 31/ اکتوبر 1945، مرتبہ درگاداس)۔ کانگریس نے جنرل (غیر مسلم) علاقوں میں زبردست جیت حاصل کی اور سینٹرل اسمبلی میں 102 میں سے 57 سیٹیں حاصل کرلیں (جب کہ 1934 میں 36 سیٹیں حاصل ہوئیں تھیں) اس الیکشن میں کانگریس کو 91.3 فی صد غیر مسلم ووٹ حاصل ہوئے تھے۔ سندھ۔ بنگال اور پنجاب کے علاوہ اسے دوسرے تمام صوبوں میں اکثریت حاصل ہوئی تھی۔ ان انتخابات میں ہندو مہا سبھا کا بالکل صفایا ہو گیا تھا۔ جب کہ کیونسٹوں کی کارکردگی بھی بہت مایوس کن رہی تھی۔ کیونسٹوں کو بنگال میں محض 3، سیٹیں، جن میں جیوتی باسو کا ایک لیبر حلقۂ انتخاب بھی شامل تھا، نیز بمبئی اور مدراس میں دو دو سیٹیں حاصل ہوئی تھیں۔ بہر حال خاص بات یہ رہی کہ متعدد صوبوں میں کیونسٹ ہی کانگریس کے اصل مدمقابل کی شکل میں ابھر کر سامنے آئے۔ پٹیل نے "سخت مقابلے کے بعد کیونسٹوں کو ہر جگہ شکست دینے کے لیے" آندھرا کانگریس کے ایک رہنما کو باقاعدہ مبارک باد پیش کی تھی۔ (پٹیل بنام کالیسورراؤ)، 27 مارچ 1946) اور مدراس کے گورنر نے اپنی رپورٹ میں یہ کہا تھا کہ کانگریس کے دائیں بازو کے لیڈر بہت ہی مایوس انداز میں یہ پیش گوئی کر رہے ہیں کہ اگلے الیکشن میں کیونسٹ اکثریت حاصل کرلیں گے۔ (نائٹ بنام واویل، 5/ اپریل 1946 وائسرائے جرنل، جلد سات، صفحہ 152)۔

مسلم حلقوں میں لیگ کی کامیابی بھی کافی دلچسپ رہی؛ اس نے مرکز میں 86 فی صد سے زائد مسلم ووٹوں والی تمام محفوظ 30 سیٹیں اور صوبائی اسمبلیوں میں مسلمانوں کے لیے محفوظ کل 509 میں سے 442 سیٹیں حاصل کی تھیں۔ 1937 کے برخلاف اس مرتبہ کے انتخاب میں اس نے

مسلمانوں کی ایک غالب پارٹی کی حیثیت حاصل کر لی تھی۔ البتہ پنجاب میں زبردست کامیابی (کل 175 سیٹوں میں سے دو کی کمی پر (79 سیٹوں پر قبضے) کے باوجود بھی اس کلیدی صوبے میں وہ ابھی بھی اکثریت سے محروم رہی تھی اور خضر حیات خاں کانگریس اور اکالیوں کے ساتھ معاملہ کر کے اپنے اقتدار کو مزید ایک سال تک برقرار رکھنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ صوبہ سرحد اور آسام میں کانگریس نے شاندار اکثریت حاصل کی تھی حالانکہ ان دونوں صوبوں کو پاکستان میں شامل کرنے کا مطالبہ اور دعوا کیا جا رہا تھا، اور سندھ نیز بنگال میں جو لیگی وزارتیں بنی تھیں ان کی بقاء کا دارو مدار حکومت اور یوروپی ممبروں کی تائید اور مدد پر تھا۔

ان انتخابات میں سب سے اہم بات یہ رہی کہ ان مہینوں کے دوران کلکتہ، بمبئی بلکہ کراچی کی سڑکوں اور گلیوں میں اس سے پہلے جو باہمی اتحاد دیکھنے کو ملتا تھا، اس کے بالکل برعکس اس مرتبہ کے انتخابات میں فرقہ وارانہ بنیاد پر رائے دہی عام طور پر دیکھنے میں آئی۔ ممکن ہے کہ اس فرقہ وارانہ ووٹنگ کے پس پشت جداگانہ انتخابیہ کے ساتھ ساتھ یہ عامل بھی کار فرما رہا ہو کہ لوگوں نے بہت ہی محدود پیمانے (صوبوں میں آبادی کے دس فیصد کے بقدر اور مرکزی اسمبلی کے لیے 1 فیصد (1%) سے بھی کم) پر حصہ لیا تھا۔ مثلاً صوبۂ سرحد کے گورنر نے فروری 1946 میں وائسرائے واویل کو یہ رپورٹ دی تھی کہ جہاں مسلم افسران اور بڑے خان (زمیندار) مسلم لیگ کے حق میں گئے تھے وہیں کانگریس کو معاشی اصلاحات کے وعدوں کے طفیل میں اب بھی نادار اور کم حیثیت مسلمانوں کی تائید حاصل تھی۔ یہ دوسری بات ہے کہ ان وعدوں کو نہ تو 1937 کے بعد ہی اور نہ ہی 1946-47 میں عملی جامہ پہنایا گیا۔۔ (وائسرائے جرنل، صفحہ 1085)۔ اس وقت کے سلسلہ واقعات کو سمجھنے میں اس بات سے کافی مدد ملتی ہے کہ کانگریس نے 1930 کی دہائی کے اپنے ایک مرکزی مطالبے عام حق رائے دہی کے ذریعے دستور ساز اسمبلی کی تشکیل، کو بڑی چالاکی سے ترک کر دیا تھا۔ 1945-46 میں تمام سیاسی گروپوں میں صرف کمیونسٹ ہی ایسے تھے جنھوں نے اس مطالبے پر اصرار جاری رکھا تھا۔ مثال کے طور پر پی۔ سی جوشی کے تیار کردہ انتخابی منشور (For the Final Bid for Power 1945) میں عام حق رائے دہی کے ذریعے لسانی خطوں پر مبنی ایسی مقتدر اعلا قومی دستور ساز اسمبلیوں کی تشکیل پر زور دیا گیا تھا جو ایک کل ہند دستور ساز اسمبلی کا انتخاب کریں گی: اس طرح کہ ہر خطے یا قومیت کو علاحدگی کا حق حاصل ہوگا۔ اس کتابچے میں انگریزوں کے صالح ارادوں کی بابت کانگریس اور مسلم لیگ کی غلط فہمی کو شدید نکتہ چینی کا نشانہ بناتے ہوئے "انگریز حکمرانوں کے خلاف، یعنی اپنی بدنامی کے مشترکہ دھبے کے خلاف آخری جنگ اور اپنی مکمل عظمت اور فتح مندی کے لیے کانگریس، مسلم لیگ اور کمیونسٹوں پر مشتمل ایک مشترکہ محاذ کی تشکیل" کی زوردار اپیل بھی کی گئی تھی۔ پی۔ سی۔ جوشی نے 17/اپریل 1946 کو

کیبنٹ مشن کے ساتھ ملاقات میں بھی عام حق رائے دہی کے مطالبے کو دہرایا تھا۔ (وائسرائے جرنل۔ جلد ساتھ صفحہ 3-291)۔ اس کے قطعی برعکس کانگریسی لیڈروں نے محدود حق رائے دہی پر مبنی موجودہ صوبائی قانون ساز اسمبلیوں کے ذریعے مرکزی قانون ساز اسمبلی کے انتخاب کی بات کو بڑی خاموشی سے تسلیم کر لیا۔ ظاہر ہے کہ معاملہ مجرد جمہوری اصولوں کے سوال سے کہیں آگے کا تھا۔ مسلم لیگ مسلم اکثریت کی نمائندگی کے دعوے کی آزمائش کے بغیر ہی پاکستان کے مطالبے کو منوانے میں کامیاب ہو گئی تھی۔ اس کے اس دعوے کی پرکھ نہ تو کبھی مکمل طور پر جمہوری انتخابات کے ذریعے اور نہ ہی سرکاری جبر و تشدد کے مقابلے پر کسی طرح کی عوامی تحریک کے ذریعے ہو سکی تھی۔ جہاں 1947 کے بعد ہندوستان میں کانگریس مسلسل 30 سال تک کل ہند انتخابات جیتتی رہی تھی، مسلم لیگ کا مشرقی پاکستان میں پہلے ہی انتخابات (1956) میں مکمل طور پر صفایا ہو گیا تھا اور وہ مغربی پاکستان میں بھی سیاسی استحکام فراہم کرنے میں ناکام رہی تھی۔

کیبنٹ مشن

24 / مارچ سے جون 1946 تک برطانوی کابینہ کے تین ارکان؛ وزیر خارجہ پیتھک لارنس، کرپس اور الیگزینڈر پر مشتمل وفد نے وائسرائے واویل کے ساتھ مل کر دو امور، عبوری حکومت کی تشکیل نیز ہندوستان کو آزادی سے ہم کنار کرنے والے ایک نئے دستور کی تیاری سے متعلق اصولوں اور طریقہ کار کے تعین، کے سلسلے میں طویل اور صبر آزما نوعیت کی گفت و شنید کی۔ برطانوی پارلیمنٹ کے دارالعوام میں وزیر اعظم اٹلی کے ذریعے 15 مارچ کو کرائی گئی اس یقین دہانی سے کہ، ہندوستانیوں کو تیز رفتاری کے ساتھ مکمل آزادی دیدی جائے گی اور یہ کہ "اگرچہ اقلیتوں کے حقوق کا خیال رکھا جائے گا...... مگر ہم کسی بھی اقلیت کو اکثریت کی پیش قدمی کے خلاف حق تنسیخ نہیں دیں گے" کانگریس کی امیدیں کافی بڑھ گئی تھیں۔ کانگریسی لیڈروں کے ساتھ کیبنٹ مشن کے از حد دوستانہ رویہ سے واویل کے دل میں شکوک و شبہات پیدا ہونے لگے تھے بلکہ ایک بار تو کرپس نے گاندھی کے لیے پانی کا ایک گلاس لا کر واویل کو تو خوف زدہ ہی کر دیا تھا۔ وائسرائے کے جرنل نے تو یہ الزام بھی لگایا تھا کہ کینٹ مشن پوری طرح کانگریس کی جیب میں چلا گیا ہے" (صفحہ 5-236.324)۔ اگر کبھی کبھی مشن کا جھکاؤ کانگریس کی طرف معلوم ہوتا تھا، تو اس کی وجہ محض یہ نہیں تھی کہ لیبر حکومت کو قوم پرستوں کے ساتھ واقعی ہمدردی تھی یا یہ کہ نہرو کے ساتھ کرپس کے پرانے مراسم تھے بلکہ واویل کے 29 / مارچ کے اپنے بیان کے مطابق "کسی عوامی تحریک یا انقلاب سے بچنے کے لیے ایسا کرنا ضروری تھا، کیونکہ کانگریس اس طرح کی تحریک یا انقلاب کبھی بھی برپا کرنے کی پوزیشن میں تھی جس پر قابو پانا اب انگریزوں کے بس میں نہیں رہا

تھا(وائسرائے جرنل، صفحہ 232)۔ یہاں بدیہی طور پر یہی نتیجہ اخذ کیا جائے گا کہ کانگریسی رہنماؤں نے فوراً اور آسانی سے اقتدار کے حصول اور سماجی نظام کو ہر قیمت پر برقرار رکھنے کی خواہش کے تحت خود کو پوری طرح سے سمیٹ لیا تھا۔ اپریل میں وسیع پیمانے (مالا بار، انڈمان، ڈھاکہ، بہار اور دہلی) پر پولس ہڑتالیں ہوئی تھیں۔ موسم سرما میں ملک بھر میں ریلوں کا چکا جام کر دینے کی دھمکیاں دی گئی تھیں، جولائی میں ڈاک ملازمین کی ہڑتالیں ہوئی تھیں، اور اس ہڑتال کی ہمدردی میں 29 جولائی کو کمیونسٹ قیادت میں کلکتہ میں بھرپور اور متحدہ طریقے پر امن ہڑتال کی گئی تھی، جب کہ اس کے تین ہفتے بعد ہی یعنی 16/اگست کو کلکتہ میں لوگ بڑے پیمانے پر پولس اور آرمی کے ہاتھوں مارے گئے تھے۔ 5/اپریل کو ہوم ممبر نے خبردار کرتے ہوئے یہ کہا تھا کہ اسے اس بات میں شبہ ہے کہ اب کسی کانگریسی بغاوت کو کچلا بھی جاسکتا ہے، خاص طور پر اس لیے کہ اگر کسی عام ہڑتال کا نعرہ دیا گیا تو لوگ اس پر عمل کریں گے، کیونکہ ملک کا محنت کش طبقہ زیادہ تر کانگریس یا کمیونسٹوں کے ساتھ ہی ہے۔"(وائسرائے جرنل، جلد سات صفحہ 151)۔ یہ حقیقت ہے کہ 1946 میں ہڑتالوں کی جو لہر چلی تھی وہ پچھلے سارے رکارڈ توڑ گئی تھی۔ کام روک دینے کے 1629 واقعات ہوئے تھے جن میں 19,41,948 ملازمین نے حصہ لیا تھا اور 1,27,17,762 کام دنوں کا نقصان ہوا تھا۔ کانگریس اعلا کمان کے رویے کا اندازہ اس کی ورکنگ کمیٹی کی اگست کی اس قرارداد سے ہوتا ہے جس میں "محنت کشوں کے اندر نظم وضبط میں بڑھتی ہوئی کمی اور ذمہ داری کے احساس کے فقدان کی مذمت کی گئی تھی۔ (محنت کش طبقے سے متعلق جے۔ بی۔ کرپلانی کا نوٹ، اے آئی سی سی، 28/1946 جی)۔ بہرحال کانگریس نے کیبنٹ مشن کے ساتھ مذاکرات اور وزارت سازی میں خو کو لگائے رکھا۔ واویل کو اس بات سے کافی راحت ملی تھی کہ خود نہرو بھی ریل ملازمین کے مطالبات کو نامناسب (غیر معقول) محسوس کر رہے تھے بلکہ وہ ان ملازمین کے آگے جھک جانے کو ایک خطرہ سمجھنے لگے تھے۔ اسی طرح ستمبر میں عبوری حکومت میں وزیر بن جانے پر سرت بوس نے دہلی کے بجلی ملازمین کی طرف سے ہڑتال کی محض دھمکی کے پیش نظر ہی فوج اور انگریز تکنیکی ماہروں کو طلب کر کے خود واویل کو بھی حیرت زدہ کر دیا تھا۔ (وائسرائے جرنل صفحہ 352، 279) انجام کار کیبنٹ مشن منصوبہ اور عبوری حکومت سازی سے متعلق سرگرمیاں اور جوڑ توڑ عظیم فرقہ وارانہ تباہ کاری اور تقسیم کا سنگ میل ثابت ہوئے۔

پاکستان کے سوال پر جناح کے اصرار کی وجہ سے گفت وشنید میں رکاوٹ پیدا ہو جانے کے بعد کیبنٹ مشن نے 16/مئی کو ایک منصوبہ سامنے رکھا جس سے کچھ عرصہ کے لیے تعطل ٹوٹ جانے کی امید پیدا ہو گئی تھی۔ اس منصوبے کے تحت جناح کو یہ فیصلہ کرنا تھا کہ انھیں ایک کرم خوردہ پاکستان چاہیے یا ایک ایسا ڈھیلا ڈھالا اور سہ درجاتی وفاق چاہیے جس کے تحت مسلمانوں کو شمال مغرب

اور شمال مشرق میں غلبہ حاصل ہو سکے گا۔ مشن کے اس منصوبے میں یہ بھی کہا گیا تھا کہ ہر لحاظ سے مکمل پاکستان کی تشکیل ناممکن ہے، کیونکہ اس طرح کے پاکستان میں بڑی تعداد میں غیر مسلم (مثلاً بنگال اور آسام میں 48.3 فی صد) بھی شامل ہوں گے؛ مسلم لیگ جس فرقہ وارانہ حق خود ارادیت پر زور دے رہی ہے اس کی رو سے تو ہندو اکثریت والے مغربی بنگال (کلکتہ کے بشمول جہاں مسلمانوں کا تناسب محض 23.6 فی صد ہے) اور پنجاب میں سکھ نیز ہندو اکثریت والے امبالہ اور جالندھر ڈویژنوں کو الگ کرنا ہوگا۔ (اس اثناء میں کچھ سکھ لیڈروں نے یہ مطالبہ کرنا شروع کر دیا تھا کہ اگر واقعی ملک کو تقسیم کرنے کی نوبت آ جائے تو ان کی الگ ریاست بنائی جائے)۔ بنگال اور پنجاب کی تقسیم کے نتیجے میں علاقائی روابط درہم برہم ہو جائیں گے؛ بہت سے معاشی، انتظامی اور فوجی مسائل پیدا ہو جائیں گے اور اس کے باوجود بھی مسلم لیگ کی تسلی نہیں ہوگی۔ اس کا ایک متبادل یہ بھی پیش کیا گیا کہ مرکز کو زیادہ اختیارات نہ دے کر محض دفاع، امور خارجہ اور مواصلات پر ہی اس کا کنٹرول رکھا جائے اور دستور ساز اسمبلی کے انتخاب کے لیے موجودہ صوبائی اسمبلیوں کو تین زمروں (الف) ہندو اکثریت والے صوبوں، (ب) اور (ج) شمال مغرب اور شمال مشرق (بشمول آسام) کے مسلم اکثریت والے صوبوں میں رکھا جائے۔ صوبائی اسمبلیوں کے ان سیکشنوں کو درمیانی نوعیت کی ایکو یکیٹیو کونسلیں اور دستور اسمبلیاں قائم کرنے کا اختیار حاصل ہوگا۔

اس طویل مدتی منصوبے کی دونوں پارٹیوں کے ذریعے منظوری کو مولانا آزاد نے ایک "شاندار کارنامہ" قرار دیا تھا۔ (انڈیا ونس فریڈم صفحہ 151)۔ دراصل یہ معاہدہ کسی بھی طرح طویل مدتی ثابت نہیں ہو سکتا تھا کیونکہ اس کی بنیاد منصوبے کی باہم مخالف تشریح پر قائم تھی۔ مسلم لیگ یہ چاہتی تھی کہ صوبوں کی زمرہ بندی لازمی قرار دی جائے اس طرح کہ زمرہ (ب) اور زمرہ (ج) کے صوبوں کو ایک ٹھوس وجود کی حیثیت حاصل ہو جائے تاکہ بعد میں یہ صوبے الگ ہو کر پاکستان کی تشکیل کا باعث ہو سکیں۔ اس کے علاوہ جناح کا یہ بھی خیال تھا کہ کانگریس اس منصوبے کو مسترد کر دے گی اور ایسی صورت میں انگریز مرکز میں مسلم لیگ سے اپنے طور پر عبوری حکومت بنانے کے لیے بھی کہہ سکتے ہیں۔ خود ویول کا بھی اس طرح کا خیال تھا اور کانگریس کے ذریعے اس منصوبے کو تسلیم کیے جانے پر اسے سخت مایوسی ہوئی تھی۔ (وائسرائے جرنل، صفحہ 305)۔ کانگریس کا یہ کہنا تھا کہ صوبائی اسمبلیوں کی اس طرح کی زمرہ بندی سے صوبائی خود مختاری کے مطالبے کی نفی ہوتی ہے اور وہ 25 رمئی کو مشن کی طرف سے کی گئی اس وضاحت سے مطمئن نہیں تھی کہ شروع میں تو صوبائی اسمبلیوں کی یہ زمرہ بندی لازمی ہوگی مگر دستور کو آخری شکل دیئے جانے اور اس کے مطابق نئے انتخابات کرائے جانے کے بعد صوبوں کو اس سے الگ ہونے کا اختیار ہوگا۔ کانگریس کا ایک دوسرا بڑا اعتراض یہ تھا کہ اس منصوبے میں مجوزہ دستور ساز اسمبلی کے لیے رجواڑوں سے چنے جانے والے

ممبروں کے بارے میں کچھ نہیں کہا گیا تھا۔ کانگریس کے نئے صدر جواہر لال نہرو نے 10رجولائی کو پریس کانفرنس میں یہ اعلان کیا کہ ان کی پارٹی نے صرف یہی ایک وعدہ کیا ہے کہ وہ دستوری سازا سمبلی کے لیے انتخابات میں حصہ لے گی۔ "غالب امکان یہ ہے کہ ......اس طرح کی کوئی زمرہ بندی نہیں ہوگی" کیونکہ صوبہ سرحد اور آسام کو زمرہ (ب) اور زمرہ (ج) میں شامل کئے جانے پر اعتراض ہوگا۔ مسلم لیگ نے 30-29رجولائی کو اپنا ردعمل ظاہر کرتے ہوئے طویل مدتی منصوبے کو منظور کرنے کے فیصلے کو واپس لے لیا۔ اور پاکستان کے لیے "مسلم قوم" کو 16راگست سے 'راست اقدام کا نعرہ دیا۔ (وائسرائے جرنل، جلد آٹھ، صفحہ 25،26،139)۔

اس اثناء میں مرکز میں ایک قلیل مدتی عبوری حکومت کی تشکیل کے لیے واویل نے اپنی متوازی کوشش جاری رکھی تھی جو بالآخر ناکام رہی تھی۔ جناح اس میں ہندوؤں کے لیے پانچ، لیگی مسلمانوں کے لیے 5، سکھوں کے لیے 1، اور درج فہرست ذاتوں کے لیے 1، کا تناسب چاہتے تھے۔ کانگریس نے اسے شملہ کانفرنس میں رکھی گئی تجویز کے مقابلے میں بھی کہیں زیادہ نا قابل قبول قرار دیا۔ وہ ہندوؤں کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کو بھی اپنا امیدوار نامزد کرنے کا حق چاہتی تھی۔ چنانچہ اس نے 1942 کی طرح ہی پھر یہ مطالبہ کیا کہ نئی حکومت کی حیثیت محض وائسرائے کی ایکزیکیٹو کے تسلسل کی نہ ہو بلکہ اس کی واقعی ایک کابینہ بھی ہو۔ انجام کار واویل کو 4رجولائی کو افسران پر ہی مشتمل ایک نگرانی حکومت تشکیل دینی پڑی۔ بہر حال چند ہفتوں بعد ہی واویل نے عبوری حکومت میں کانگریس کی شمولیت پر اصرار کرنا شروع کردیا، خواہ لیگ اس سے باہر ہی کیوں نہ رہے۔ واویل کا یہ رویہ، شملہ کانفرنس میں اختیار کردہ اس کے موقف کے قطعی برعکس تھا بلکہ محض ایک ماہ قبل کے اس کے بیانات سے بھی مختلف تھا۔ اس کی توجیہ بھی یہی ہو سکتی ہے کہ اسے کسی امکانی عوامی اقدام کا خدشہ تھا۔ وجہ یہ تھی کہ جولائی کے ہی مہینے میں ایک طرف ریلوے ملازمین کی کل ہند ہڑتال کی دھمکی دی گئی تھی اور دوسری طرف ڈاک ملازمین نے تو کام بند بھی کر رکھا تھا۔ واویل نے سکریٹری آف اسٹیٹ کے نام اپنے 31رجولائی 1946 کے مکتوب میں لکھا تھا "اگر کانگریسی ذمہ داری قبول کر لیتے ہیں تو ایسی صورت میں انھیں یہ احساس ہو جائے گا کہ سرکش عناصر کو کنٹرول کرنا ضروری ہے۔ ایسی صورت میں وہ کمیونسٹوں کو دبانے کی کوشش کریں گے اور اپنی پارٹی کے بائیں بازو پر بھی بندش لگائیں گے۔ مجھے امید ہے کہ میں انھیں حکومت کے معاملات میں اس طرح مصروف رکھ سکوں گا کہ ان کے پاس سیاست کے لیے زیادہ وقت نہیں رہے گا۔" (وائسرائے جرنل، جلد آٹھ صفحہ 154) 9راگست کو تقریباً یہی بات انٹلی جنس بیورو کے ڈائریکٹر نے بھی کہی تھی...... "مزدور طبقے کی صورت حال روز بروز خطرناک ہوتی جارہی ہے ...... جب تک مرکز میں ایک ذمہ دار حکومت قائم نہیں ہوگی، اس وقت تک کچھ نہیں کیا جا سکے

گا..... مجھے یقین ہے کہ اگر مرکز میں کوئی ذمہ دار حکومت قائم کی جا سکے تو، وہ مزدور طبقے کے مسائل سے موجودہ بندوبست کے مقابلے میں کہیں زیادہ فیصلہ کن طریقے پر عہدہ براء ہو گی"(ہوم، پول، (1)2/جولائی 1946)۔ کانگریس ایک بار پھر جھانسے میں آگئی۔ 5/اگست کو واویل کو یہ اطلاع مل چکی تھی کہ پٹیل کو "یہ باور ہو چکا تھا کہ ملک میں انتشار کے پھیلاؤ کی روک تھام کے لیے کانگریس کو حکومت میں شامل ہو جانا ہی چاہیے"۔ بلکہ وہ اس کے لیے بھی تیار تھے کہ اگر ان کے خیالات کو قبول نہ کیا گیا تو وہ ورکنگ کمیٹی سے استعفیٰ دیدیں گے"(وائسرائے جرنل۔ صفحہ 329)۔ وائسرائے نے 27/اگست کو نہرو اور گاندھی کے ساتھ ملاقات کے دوران، دستور ساز اسمبلی کا اجلاس نہ بلانے کی دھمکی دے کر کانگریس کو لازمی زمرہ بندی کی تجویز کو قبول کرنے کے لیے مجبور کرنے کی کوشش کی لیکن جب آخرالذکر نے وائسرائے کے اس تحکمانہ انداز گفتگو پر سخت ردعمل ظاہر کیا(گاندھی نے 28/اگست کو واویل کو لکھا تھا-- ہم سب سیدھے سادے لوگ ہیں، ہو سکتا ہے کہ ہم میں سب سپاہی نہ ہوں، اور اس کے باوجود بھی ہم میں سے کچھ قانون سے واقف بھی ہو سکتے ہیں۔" وائسرائے جرنل، جلد آٹھ صفحہ 322) تو سکریٹری آف اسٹیٹ نے گھبرا کر اپنے ایک ٹیلی گرام کے ذریعے اصرار کیا کہ کسی طرح کا تعطل نہ پیدا ہونے دیا جائے۔ (وائسرائے جرنل، صفحہ 343)۔ 2/ستمبر کو نہرو کی قیادت میں کانگریس کی غالب اکثریت والی ایک عبوری حکومت کو حلف دلایا گیا۔ اگرچہ نہرو نے یہ بھی واضح کر دیا تھا کہ ان کی پارٹی لازمی زمرہ بندی کی اب بھی مخالفت کرتی ہے، تاہم انھوں نے یہ معاملہ کیبنٹ مشن کی مجوزہ فیڈرل کورٹ (وفاقی عدالت) کے سامنے رکھنے کی پیش کش کی تھی۔

1946-47: فرقہ وارانہ تباہ کاری اور کسان بغاوت

کلکتہ، نواکھالی، بہار، پنجاب

بہرحال بڑے پیمانے پر فرقہ وارانہ فسادات کی وجہ سے 16/اگست سے پورے ہندوستان کا نقشہ ہی بدل گیا تھا۔ ان فسادات کا سلسلہ 16۔19 اگست سے کلکتہ سے شروع ہوا تھا اور یکم ستمبر سے بمبئی کو اپنی لپیٹ میں لیتا ہوا مشرقی بنگال میں نواکھالی (10/اکتوبر)، بہار (25/اکتوبر)، یوپی میں گڑھ مکتیشور (نومبر) تک پھیل گیا تھا۔ بعد میں مارچ 1947 سے پنجاب بھی اس کی زد میں آگیا تھا۔ اگرچہ سارے مقامات پر فرقہ وارانہ جذبات کو بھڑکانے میں ایک جیسے ہی عوامل کارفرما رہے تھے، مگر نوعیت، شدت، اور فوری ذمہ داری کے لحاظ سے ان فسادات میں ایک دوسرے سے کافی فرق بھی تھا۔ کلکتہ میں، جہاں کہ لیگ وزارت نے "راست اقدام" کے دن عام تعطیل کا اعلان کیا

تھا۔میدان کراؤنڈ میں ایک اجتماع کے بعد مسلمانوں کی طرف سے حملوں کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ اس اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے وزیر اعلا سہروردی نے یہ وعدہ کیا تھا کہ پولس اور آرمی ہرگز دخل نہیں دے گی۔ سہروردی لال بازار کے کنٹرول روم میں کافی وقت گزارا کرتے تھے جہاں ان کے حمایتی بھی برابر ان کے ساتھ رہا کرتے تھے۔ وہ یہ دکھانے کی کوشش کرتے تھے کہ انھیں اپنے فرقہ کے لوگوں کی مشکلات کا بڑا خیال رہتا ہے۔ (مکتوب گورنر بنام وائسرائے واویل، 22 اگست 1946 وائسرائے جرنل، جلد آٹھ، صفحہ 300-297)۔ اس طرح کلکتہ میں نچلے طبقات کے درمیان جو منظم قتل و غارت گری کا سلسلہ شروع ہوا اس میں ہندوؤں اور خاص طور پر سکھوں نے بھی بھرپور جواب دیا۔ چنانچہ 19/اگست تک 4000 لوگ مارے گئے تھے اور 10,000 زخمی ہوئے تھے۔ بڑی تعداد میں ایسی مسخ شدہ لاشیں بھی برآمد ہوئی تھیں جو صحت کے لیے خطرہ ثابت ہونے لگی تھیں۔ (حوالہ وائسرائے جرنل، صفحہ 302)۔ کلکتہ میں اس مرتبہ کے فسادات کے دوران عبادت گاہوں اور مذہبی مقامات کی بے حرمتی کی بجائے سارا زور ایک دوسرے فرقہ کے لوگوں کو موت کے گھاٹ اتار دینے پر تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان فسادات میں ہندوؤں کے مقابلے میں مسلمان زیادہ مارے گئے تھے، جس کا اعتراف صرف واویل (وائسرائے جرنل) ہی نے نہیں بلکہ خود پٹیل نے بھی کیا تھا "کلکتہ میں ہندو غالب رہے، مگر یہ کوئی راحت کی بات نہیں ہے"۔ مکتوب بنام کرپس 19/اکتوبر 1946 مشمولہ وائسرائے جرنل، صفحہ 750)۔ اس کے لیے انگریز بھی واضح طور پر ذمہ دار تھے۔ نومبر 1945 یا فروری 1946 کے برخلاف اگست 1946 کے فسادات پر قابو پانے کے لیے آرمی پورے 24 گھنٹے بعد حرکت میں لائی گئی تھی؛ حالانکہ 17/اگست کی صبح کو شہر کے دورے کے وقت گورنر کو پہلی عالمی جنگ کے تجربے کی یاد دہانی کرادی گئی تھی۔ 26، مارچ اور یکم اپریل کی درمیانی مدت میں بھی کلکتہ میں فسادات کا دوسرا دور چلا تھا جس کا سلسلہ چھرے زنی اور تشدد کے اِکاذُکا واقعات کی شکل میں حصول آزادی تک جاری رہا تھا، اور ایک فرقے یا دوسرے فرقے کے لوگوں پر پورے شہر میں آمد و رفت پر پابندی لگی رہی تھی۔

بمبئی شہر میں بڑے پیمانے پر فسادات کی جگہ پر چھرا زنی کے اِکاذُکا واقعات ہوتے رہے تھے تاہم ان کی ہلاکت خیزی کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ ستمبر 1946 میں ہی 162 ہندو اور 158 مسلمان مارے گئے تھے (وائسرائے جرنل، صفحہ 532،648)۔ البتہ مشرقی بنگال کے دو اضلاع، نواکھالی اور ٹپیرا میں فرقہ وارانہ عنصر کے ساتھ ساتھ سماجی عنصر بھی شامل تھا۔ ان علاقوں میں کسانوں کی اکثریت مسلمان تھی جب کہ زمینداروں، تاجروں اور پیشہ ور گروپوں کی اکثریت ہندو تھی۔ جہاں کلکتہ کے فسادات میں سارا زور ایک دوسرے کو ٹھکانے لگا دینے پر تھا، نواکھالی کے فسادات میں زیادہ شدت املاک کو نقصان پہونچانے اور آبروریزی کے واقعات کو حاصل رہی۔

اگر چہ ان فسادات میں بھی تقریباً تین سو لوگ مارے گئے تھے مگر کروڑوں کی املاک تباہ کر دی گئی تھیں اور شروع شروع میں ہندوؤں نے اپنے زمینداروں، وکیلوں اور دوسرے معززین پر حملوں کے عام واقعات کی شکایات درج کرائی تھیں۔ Burrows کی رپورٹ میں کہا گیا تھا کہ "جنوب مشرقی بنگال میں پھوٹ پڑنے والے اس تشدد کو ہندوؤں کے خلاف مسلمانوں کی عام شورش کا نام نہیں دیا جا سکتا بلکہ یہ دراصل ان بدمعاشوں کے ایک ٹولے کی ایک منظم حرکت تھی جنھوں نے اس وقت کے مذہبی احساسات سے ناجائز فائدہ اٹھانے کی کوشش کی تھی"؛ چنانچہ ہلاکتیں نسبتاً کم رہی تھیں، البتہ املاک کا نقصان کہیں زیادہ ہوا تھا۔ لیگ انتظامیہ نے ایک بار پھر کھلی جانب داری کا مظاہرہ کیا۔ کل 1074 گرفتار شدہ لوگوں میں صرف 50 ہی اپریل 1947 تک جیل میں رہے تھے" (وائسرائے اے جرنل، صفحہ 753، 745، 725، جلد آٹھ، این کے بوس مائی ڈیئز ود گاندھی صفحہ 48، 33، 302)۔

25/ اکتوبر کو "یوم نواکھالی" منائے جانے کے موقع پر بہار میں بھڑک اٹھنے والے فسادات سے ایک ایسے دوسرے کالی مختلف رویے کی نشان دہی ہوتی ہے جس کی توجیہہ کرنا مشکل ہے۔ ہندو کسان مسلمانوں کے خلاف بُری طرح مشتعل ہو اٹھے تھے، جہاں نواکھالی سے کہیں زیادہ بھیانک طریقے پر لوگوں کو موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا۔ ایک اندازے کے مطابق ان فسادات میں کم سے کم 7000 لوگ مارے گئے تھے۔ نہرو نے مضطرب ہو کر اپنی رپورٹ میں کہا تھا کہ "لوگوں پر پاگل پن "سوار ہو گیا تھا۔ واضح رہے کہ یہ بہار شروع سے ہی کانگریس کا (اور اسی طرح کسان سبھا کا) ایک مضبوط گڑھ رہا تھا۔ ان کو شبہ تھا کہ چند زمینداروں نے "زرعی مسائل سے متعلق اپنے ظلم و تشدد سے توجہ ہٹانے کے لیے "لوگوں کو مشتعل کیا تھا۔ نہرو نے اپنی رپورٹ میں یہ بھی کہا تھا کہ صوبے میں کانگریسی انتظامیہ اور بہت سے پارٹی ممبر بھی فرقہ پرستی کا شکار ہو گئے تھے۔ "آج میرے خیال میں صورت حال کافی خراب ہے بلکہ اُن کے (لیگی لیڈروں کے) ظاہر کردہ خدشات سے بھی کہیں زیادہ خراب معلوم ہوتی ہے" (نہرو بنام پٹیل، 5/ نومبر 1946، درگا پرساد، جلد تین، صفحہ 165)۔ بہار کے بعد یوپی میں گڑھ مکتیشور میں بھی فساد بھڑک اٹھا تھا جہاں ہندو یاتریوں نے ایک ہزار سے زائد مسلمانوں کو تہ تیغ کر دیا تھا۔ اس طرح کے قتل عام کی خبروں سے صوبۂ سرحد میں کانگریس کی اب تک کی ناقابل شکست پوزیشن کافی کمزور ہوتی جارہی تھی۔ اکتوبر 1946 کے آخر میں صوبۂ سرحد کے دورے کے موقع پر نہرو کو قبائلیوں کے زبردست مظاہرے کا سامنا کرنا پڑا تھا اور جنوری 1947 میں ہزارہ میں فسادات کے بعد مردان کے ایک اہم ضمنی انتخاب میں کانگریس کو شکست کا منہ دیکھنا پڑا تھا۔

اس دوران پنجاب کے ہندو، مسلمان اور سکھ غرضیکہ سبھی فرقے اس وقت تک کی سب

سے بڑی فرقہ وارانہ تباہی و بربادی کے لیے تیاریاں کر رہے تھے۔ جنوری 1945 میں ہریانہ کے ہندو جاٹ لیڈر چھوٹو رام کے انتقال کے بعد، یونینسٹ بلاک کافی کمزور پڑ گیا تھا اور الیکشن کے بعد بھی کانگریس اور سکھوں کی تائید کے ذریعے خضر حیات وزارت کو سہارا دینے کے لیے بلدیو سنگھ کی کوششوں کے رد عمل میں مسلم لیگ کی 79 سیٹوں کے مقابلے میں یونینسٹ پارٹی کو محض 10 سیٹیں ملی تھیں۔ اس طرح مسلم فرقہ پرستوں اور پاکستان کے حامیوں کے رویے میں اور بھی شدت آگئی تھی۔ جنوری 1947 سے مسلم لیگ کی سول نافرمانی تحریک کے نتیجے میں خضر حیات وزارت 3 مارچ کو ٹوٹ گئی تھی۔ اگلے دن لاہور میں اسمبلی چیمبر کے سامنے سکھوں کے ایک پر اشتعال مظاہرے (جس میں تارا سنگھ ننگی تلوار لہراتے ہوئے 'راج کرے گا خالصہ' کے نعرے لگا رہے تھے) کے بعد لاہور امرت سر، ملتان، اٹک اور راول پنڈی نیز آخر الذکر تینوں اضلاع کے دیہی علاقوں میں بڑے پیمانے پر فسادات پھوٹ پڑے۔ مسلم اکثریت کے ان علاقوں میں اصل نشانہ ہندو اور سکھ تاجر اور ساہوکار (مہاجن) تھے۔ اگست میں ہی تقریباً 5000 لوگ مارے گئے تھے مگر یہ فسادات تو دراصل اس بھیانک فرقہ وارانہ پاگل پن کا محض ایک پیش خیمہ ثابت ہوئے تھے جس کا سلسلہ حصول آزادی کے فوراً بعد ہی سرحد کی دونوں طرف شروع ہو گیا تھا۔ بعض اوقات ایسا ہوتا تھا کہ انتقال آبادی کے لیے جو لوگ زندہ حالت میں ٹرینوں پر سوار ہوتے تھے منزل پر ان کی لاشیں پہونچی تھیں۔ پینڈرل مون کے مطابق اس پاگل پن میں 1,80,000 لوگ ہلاک ہوئے تھے جن میں 60,000 لوگ مغرب کی طرف اور 1,20,000 لوگ مشرق کی طرف مارے گئے تھے۔ مارچ 1948 تک 60 لاکھ مسلمان اور تقریباً 45 لاکھ ہندو اور سکھ پناہ گزیں بنا دیئے گئے تھے جس کے نتیجے میں مکمل اور جبریہ انتقال آبادی ناگزیر ہو گیا تھا۔ بہر حال مشرقی پنجاب میں 47 لاکھ اور مغربی پنجاب میں 67 لاکھ لوگ پھنس کر رہ گئے تھے۔ مختصر یہ کہ ان فسادات میں سب سے زیادہ جانی نقصان مسلمانوں کا اور سب سے زیادہ مالی نقصان ہندوؤں اور سکھوں کا ہوا۔ اس طرح جنوب مغربی پنجاب میں بھاول پور (جہاں کہ 1947 میں مون تعینات تھے) کے مسلمانوں کو جان مارنے سے کہیں زیادہ دلچسپی ہندو املاک اور لڑکیوں سے تھی۔ جان ماری کا زیادہ زور وسطی اور مشرقی پنجاب میں ہی رہا تھا جہاں ایک دوسرے کے مد مقابل فرقوں کی طاقت تقریباً برابر برابر تھی اور خاص طور پر سکھوں نے مسلمانوں کا صفایا کر دینے یا انھیں بے دخل کر دینے کی پوری کوشش کی تھی تاکہ مغربی پنجاب سے نقل وطن کر کے آنے والے 20 لاکھ سکھوں کے لیے زمینیں حاصل کی جا سکیں (Penderel Moon : Devide and Quit . Chapter XIV)۔

جو انگریز کسی متوقع کانگریسی تحریک کا مقابلہ کرنے کے لیے یہاں تک کہ جون 1946 میں بھی آرمی کی پانچ ڈویژن ہندوستان لانے کا منصوبہ بنا رہے تھے، انھوں نے بھی اس عظیم انسانی

المیے پر قابو پانے کے لیے کچھ بھی نہیں کیا تھا۔ خود برطانوی ذرائع سے سامنے آنے والی دو باتوں سے یہ صاف ظاہر ہو جاتا ہے اگر انگریز اس عظیم نسل کشی میں دانستہ طور پر ملوث نہیں بھی تھے تو بھی انھوں نے ان واقعات کو بہت ہی سرسری طریقے پر لیا تھا۔ فسادات کو رکوانے کے لیے بہار کے مسلمانوں نے فضائی بم باری کی درخواست کی تھی جس پر واویل نے 9/ نومبر 1946 کو یہ رائے زنی کی تھی کہ "فضا سے مشین گنوں کے ذریعے فائرنگ ایک ایسا طریقہ ہے جسے ہم بخوشی بروئے کار نہیں لانا چاہیں گے، یہ دوسری بات ہے کہ مسلمان یہ کہتے ہیں کہ ہم نے یہ ہتھیار 1942 میں استعمال کرنے میں کسی پس وپیش سے کام نہیں لیا تھا۔" (وائسرائے جرنل، صفحہ 347) مارچ 1947 میں امرت سر میں دونوں بڑے بازار تباہ کر دیے گئے تھے اور "پولس نے ایک گولی بھی نہیں چلائی تھی، جب کہ اسی شہر میں جلیان والا باغ کا سانحہ یادوں میں اب بھی زندہ تھا"۔

اس فرقہ وارانہ آتش فشاں کو نہرو کی عبوری حکومت بھی بے بسی سے دیکھتی رہی تھی۔ نام تبدیل ہو جانے کے باوجود بھی اس حکومت کی حیثیت وائسرائے کی پرانی ایکزیکیٹیو کونسل سے کچھ زیادہ نہیں تھی۔ یہاں تک کہ واویل نے 19/ مارچ 1947 کو اپنی کابینہ کی آخری میٹنگ میں آزاد ہند فوج کے قیدیوں کی رہائی کے سوال پر وزرا کی رائے کو القط کر دیا تھا۔ اور جب 26/ اکتوبر کو واویل نے ایک کانگریسی مسلمان کے مقابلے پر مسلم لیگ کے نامزد کردہ درج فہرست ذات کے ایک فرد (جوگن منڈل) کے ذریعہ معاملہ برابر کرنے کی بنیاد پر جناح کو حکومت میں شمولیت کے لیے راضی کر لیا تو اجتماعی طور پر یا کسی بھی دوسرے طریقے پر کام کرنا ممکن ہو گیا تھا۔ 'راست اقدام' پروگرام، کیبنٹ مشن کے طویل مدتی منصوبے کی مخالفت، صوبائی اسمبلیوں کی زمرہ بندی پر اصرار وغیرہ سے دست برداری کے بغیر ہی لیگ کو حکومت میں شامل ہونے کی اجازت دیدی گئی تھی۔ لیگ نے دستور ساز اسمبلی میں بھی حصہ لینے سے انکار کر دیا تھا جس کا اجلاس 9/ دسمبر سے شروع ہو چکا تھا اور جس کا کام فی الحال ایک عام **Objectives Resolution** پاس کرنا (جنوری 1947) تھا جس کا مسودہ نہرو نے ہی تیار کیا تھا اور جس میں خود مختار اکائیوں، اقلیتوں کے حقوق کے تحفظات نیز سماجی وسیاسی ومعاشی جمہوریت پر مبنی "آزاد اور خود مختار جمہوریہ" کا تصور پیش کیا گیا تھا۔ کانگریس کے مطابق لیگ نے اپنی روایتی خلل اندازی کو جاری رکھتے ہوئے نہرو کی کابینہ کی ٹی پارٹی میٹنگوں میں حصہ لینے سے انکار کر دیا تھا جن میں وائسرائے کے ساتھ ملاقات سے پہلے پالیسیوں میں تال میل قائم کرنے کی کوشش کی جاتی تھی، اس کے علاوہ وزیر مالیات لیاقت علی خاں نے فروری 1947 میں سستی مقبولیت حاصل کرنے کی غرض سے ایک بجٹ پیش کیا جس میں بڑے تجارتی گھرانوں پر بھاری ٹیکس لگائے گئے تھے۔ واضح رہے کہ ان بڑے تاجروں کی اکثریت ہندو ہی تھی۔ واویل کے خیال میں یہ "ایک عیارانہ چال تھی کیونکہ اس طرح کانگریس نیز برلا جیسے

اس کے بڑے تاجر حامیوں کے درمیان خلیج پیدا کرنا مقصود تھا۔(وائسرائے جرنل 28فروری 1997 صفحہ 424)۔ کلکتہ، نوا کھالی۔ بہار اور بنگال کے خون ریز فسادات سے کانگریس کے اندر بھی بہت سے لوگوں کے سیکولر نظریات متزلزل سے ہو گئے تھے۔ اگر ایک طرف نہرو بہار اور دوسرے علاقوں میں ہندو فرقہ پرستی کی مذمت کر رہے تھے تو دوسری طرف آزاد واویل پر سخت نکتہ چینی کر رہے تھے کیونکہ سہروردی کے ذریعے کلکتہ میں سماج دشمن عناصر کی طرف سے چلائی جارہی خون خرابے کی مہم کو کچلنے کے لیے فوج نہیں بلائی گئی تھی (واویل سے ملاقات 19/اگست 1946 محولہ وائسرائے جرنل، جلد آٹھ صفحہ 261)۔ پٹیل ان ہندوؤں کے ساتھ ہمدردی رکھتے تھے جو بہار کے واقعات کی مذمت کرنے کی وجہ سے نہرو کو اپنی نکتہ چینی کا نشانہ بنا رہے تھے "ہم بہار کے لوگوں اور ان کی وزارت کو لیگی لیڈروں کے پُر تشدد اور بازاری حملوں کے رحم وکرم پر چھوڑ کر سنگین غلطی کریں گے"(پٹیل بنام راجندر پرساد 11 نومبر 1946 درگاداس، جلد تین، صفحہ 171)۔

فرقہ وارانہ فسادات کے ساتھ ساتھ، کانگریس اور لیگ کی مخلوط حکومت کے نا قابل عمل ثابت ہو جانے کے نتیجے میں اب بہت سے لوگ اب تک کی نا قابل تصور بات کے بارے میں بھی سوچنے پر مجبور ہو گئے تھے، یعنی اب تقسیم کی بات تسلیم کرنے کے بارے میں سوچا جانا شروع ہو گیا تھا اور اس طرح کے لوگوں میں خود نہرو اور پٹیل بھی شامل ہو گئے تھے۔ اب اس تکلیف دہ حل کا مطالبہ بنگال اور پنجاب کے ہندو اور سکھ فرقوں نے بھی شروع کر دیا تھا۔ ان دونوں صوبوں کے ہندوؤں اور سکھوں کو مسلم غلبے والے حصوں کی لازمی زمرہ بندی کے امکان سے خدشات پیدا ہو گئے تھے کیونکہ اس لازمی زمرہ بندی کے بعد یہ مسلم حلقے بہ آسانی پاکستان کی تشکیل کرنے کے قابل ہو سکتے تھے، بہر حال ہندو مہاسبھا نے مغربی بنگال میں ایک علاحدہ ہندو صوبے کے امکانات کا جائزہ لینے کے لیے ایک تحقیقاتی کمیٹی قائم کی (وی۔ پی مینن، صفحہ 348)۔ 10 مارچ 1947 کو نہرو نے نجی طور پر واویل سے یہ کہا تھا کہ اگر کیبنٹ مشن کے منصوبے پر عمل کیا جا سکتا تو وہ سب سے اچھا حل ثابت ہوتا، مگر اب بنگال اور پنجاب کی تقسیم ہی حقیقی متبادل ہے۔"(وائسرائے جرنل، صفحہ 7-426)۔ ایک ماہ بعد کرپلانی نے ماؤنٹ بیٹن کو یہ اطلاع دی تھی کہ "لڑائی جھگڑے کی بجائے ہم انھیں پاکستان دیدیں گے بشرطیکہ آپ بھی منصفانہ طریقے پر پنجاب اور بنگال کی تقسیم کی اجازت دیدیں گے"(ایچ۔ وی۔ ہڈسن۔ دی گریٹ ڈوائیڈ لندن، 1969، صفحہ 236)۔

گاندھی کے بہترین لمحات

بہر حال ایک ایسا شخص بھی تھا جس کے لیے ایک ایسی اعلا سطحی سودے بازی، جس کے ذریعے کانگریس مذہبی خطوط پر تقسیم کی قیمت پر ملک کے بڑے حصے میں تیز رفتاری کے ساتھ بر

سر اقتدار آسکتی تھی، المناک حد تک نا قابل تصور اور نا قابل قبول تھی۔ گاندھی نے اپنے نجی ایلچی سدھیر گھوش کے توسط سے ایک، دو ناکام کوششوں، اور کیبنٹ مشن نیز ماؤنٹ بیٹن کے سامنے یہ تجویز پیش کرنے کے علاوہ کہ جناح کو وزارت عظمیٰ کی پیش کش کی جائے اور یہ کہ اقلیتی فرقے کے مفادات کے تحفظ کے لیے انگریز اقتدار کی منتقلی کے بعد بھی کچھ عرصے کے لیے ہندوستان میں رُکے رہیں، خود کو 1945 سے جاری گفت وشنید سے لا تعلق ہی رکھا تھا۔ کانگریسی قیادت سے الگ تھلگ پڑ جانے کے باوجود بھی اس 77 سالہ مرد بزرگ نے، جس کی ہمت و حوصلہ میں ذرا بھی کمی نہیں آئی تھی، اپنی زندگی بھر کے اصولوں خصوصاً لوگوں کے دلوں میں تبدیلی لانے اور عدم تشدد کے فلسفے کو برحق ثابت کرنے کی ٹھان لی۔ پہلے تو نوا کھالی کے دیہی علاقوں کا رخ کیا، پھر وہاں سے بہار پہونچے اور پھر کلکتہ اور دہلی کی فساد زدہ بستیوں میں ڈیرا ڈالا۔ انھوں نے برہم مسلمانوں کی اکثریت والے گاؤوں میں قیام کیا، بہار کے ہندوؤں کے راہ راست پر نہ آنے کی شکل میں مرن برت رکھنے کی دھمکی تک دی۔ (6/ستمبر 1946) اور جنوری 1947 سے نوا کھالی کے دیہاتوں کی سڑکوں پر برہنہ پا ہی نکل پڑے۔ برہم مسلمانوں کے ذریعے راہ میں ڈالی گئی گندگی کو اپنے ہاتھوں سے صاف کرتے گئے اور اپنے معمولات کا آغاز رابندر ناتھ کی اس مشہور نظم سے کرتے تھے جس میں یہ کہا گیا ہے کہ اگر تمہاری آواز پر کوئی بھی لبیک نہ کہے تو بھی اکیلے ہی چل پڑو۔ (ایکلا چلو رے)۔ گاندھی کی ذاتی صفات اور حقیقی عظمت کا شاندار مظاہرہ ان کی زندگی کے آخری مہینوں میں ہی ہوا؛ یعنی انھوں نے ہر طرح کے اقتدار سے خود کو مکمل طور پر ماوراء کر لیا تھا، اور یہ کہ وہ فرقہ پرستی کے خلاف ایک مضبوط آہنی دیوار ثابت ہوئے تھے۔ ملک کی تقسیم کے ایک ماہ بعد، جب کہ فرقہ وارانہ فسادات کے شعلے بھڑک رہے تھے، انھوں نے ایک لیگی لیڈر سے یہ کہا تھا کہ "میں اپنی زندگی داؤ پر لگا کر اس کا مقابلہ کروں گا۔ میں مسلمانوں کو ہندوستان کی سڑکوں پر گھسٹنے نہیں دوں گا۔ انھیں وقار کے ساتھ سر اونچا کر کے چلنا ہو گا"۔ (خلیق الزماں۔ پاتھ وے ٹو پاکستان، صفحہ 404)۔ کلکتہ کے ایک باشندے کو، جس کی گاندھی کے ساتھ کوئی خاص وابستگی نہیں تھی، اب بھی بخوبی یاد ہے کہ گاندھی کس طرح اپنی پرار تھنا سبھاؤں میں مسکرا کر اس خیال کی تردید کرتے تھے کہ ہندو اور مسلمان دو الگ الگ قومیں ہیں۔

کبھی کبھی ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گاندھی کی موجودگی معجزاتی طور پر اپنا اثر دکھا رہی ہے، کیونکہ انھوں نے سہروردی کو اپنے ساتھ فساد زدہ علاقوں میں ٹھہرنے پر راضی کر لیا تھا جس کے بعد 15/اگست کے موقع پر کلکتہ میں امن بحال ہو گیا تھا اور 31/اگست کو شہر میں پھر فساد ہوتے ہوتے رہ گیا تھا کیونکہ گاندھی نے یکم سے 4/ستمبر 1947 تک مرن برت رکھ لیا تھا۔ اس کے فوراً بعد ہی دہلی میں فسادات شروع ہو گئے تھے اور پنجاب میں ہندوؤں اور سکھوں کے قتل عام کے

بدلے میں ہندوؤں نے مسلمانوں کا قتل عام شروع کر دیا تھا جس پر گاندھی کو ایک بار پھر جنوری 1948 میں برت رکھنا پڑا تھا جس کا محض عارضی اثر ہوا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ آخری برت کسی حد تک پٹیل کے بڑھتے ہوئے فرقہ وارانہ رویوں (وزیر داخلہ نے پنجاب میں مکمل انتقال آبادی کے بارے میں سوچنا شروع کر دیا تھا۔ اور وہ اس سابقہ معاہدے کا احترام کرنے سے انکار کر رہے تھے جس کی رو سے حکومت ہند کو تقسیم سے پہلے کے سرکاری اثاثوں میں 55 کروڑ روپے حکومت پاکستان کو ادا کرنے تھے) کے خلاف بھی تھا۔ کہا جاتا ہے کہ گاندھی نے اپنے برت کے دوران یہ کہا تھا کہ "تم وہ سردار نہیں ہو جسے میں پہلے جانتا تھا۔" جسے مسلمان سب سے خطرناک ہندو لیڈر سمجھتے آئے تھے، اسے ہی انھوں نے 27/ جنوری 1948 کو دہلی میں اپنے ایک مذہبی مقام سے تقریر کرنے کے لیے مدعو کیا تھا۔ اس کے تین دن بعد مہاتما اس دنیا میں نہیں رہے تھے۔ انھیں وی۔ ڈی ساورکر سے ترغیب پا کر پونا کے ایک براہمن گروپ کی سازش کے تحت ایک جنونی ہندو ناتھورام گوڈسے نے شہید کر دیا تھا۔ اس سازش کے سلسلے میں پہلے سے ہی وارننگ ملنے کے بعد بھی دہلی اور بمبئی کی پولس نے کچھ نہیں کیا تھا۔

47-1946 کے دوران گاندھی کا جرأت مندانہ اور اثر انگیز طریقہ کار ایک ذاتی کوشش کے علاوہ کچھ نہیں تھا جس کا اثر مقامی سطح کا اور عارضی رہا تھا۔ اب اگرچہ اس قیاس آرائی کا کوئی تک نہیں ہے کہ ایسا یا ویسا ہوا ہوتا، مگر یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ اس وقت صرف یہی ایک متبادل تھا کہ سامراج اور اس کے ہندوستانی اتحادیوں کے خلاف متحدہ شدت پسندانہ عوامی تحریک چلائی گئی ہوتی۔ یہی وہ چیز تھی جس سے انگریز بہت خوف زدہ رہا کرتے تھے۔ فسادات کی وجہ سے جو انتشار برپا ہوا وہ تو ہوا ہی، ساتھ میں یہ کہ اس متحدہ تحریک کے امکان کا 47-1946 کے موسم سرما ہی میں سد باب کر دیا گیا تھا۔ اگست کے فسادات کے پانچ ماہ بعد 21/ جنوری 1947 کو کلکتہ کے طلباء فرانسیسی طیاروں کے ذریعے ڈم ڈم ہوائی اڈے کے استعمال کے خلاف مظاہرہ کرتے ہوئے سڑکوں پر آگئے تھے۔ ان کا ایک نعرہ تھا "ویت نام سے دور رہو، کیونسٹ قیادت میں 85 دن تک ٹرام کی کامیاب ہڑتال رہی اور اس پورے عرصہ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ فرقہ وارانہ تفریق جیسی کوئی چیز باقی نہ رہ گئی ہو۔ یہ ہڑتال بھی طلباء کے مظاہرے کے دن ہی شروع ہوئی تھی جس میں بندرگاہ کے ملازمین نیز ہوڑہ انجینئرنگ کارخانے کے ملازمین بھی شامل ہو گئے تھے۔ جنوری اور فروری میں تو ہڑتالوں کا ایک نیا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ کان پور میں کپڑا ملوں کے ایک لاکھ ملازمین باہر آگئے تھے، کوئلے کی نقل وحمل روک دینے کی دھمکی دیدی گئی تھی، نیز کوئمبٹور اور کراچی وغیرہ میں بھی ہڑتالیں ہوئی تھیں۔ 18 جنوری کو جی۔ ڈی برلا نے گاندھی کے سکریٹری پیارے لال کو لکھا تھا "ہر طرف ہڑتالیں ہو رہی ہیں...... ہر شخص زیادہ تنخواہ اور کم کام چاہتا ہے" (جی۔ ڈی برلا، باپو، صفحہ

434)۔ بہر حال یہ ساری ہڑتالیں معاشی مطالبوں کے لیے ہی تھیں، اور انہیں کسی طرح کی موثر سیاسی قیادت حاصل نہیں تھی۔

اس اثناء میں 47-1946 کے دوران ملک کے مختلف علاقوں خاص طور پر بنگال میں نیز کیرالہ میں اور ریاست حیدر آباد کے تلنگانہ کے دیہی علاقوں میں سورش جیسے حالات پیدا ہو گئے تھے۔ ہر جگہ کیمونسٹوں کی قیادت میں کسان سبھائیں زیادہ تشدد پسندانہ اقدامات کی طرف گامزن ہوتی جارہی تھیں اور ساتھ میں مال گزار اور لگان گزار جوت دار کسانوں سے نیچے کے طبقوں، بٹائی داروں، بے زمین زرعی مزدوروں اور قبائلیوں کو اپنے دائرہ اثر میں لیتی جارہی تھیں۔

1945 سے شام راؤ اور گوداوری پارولے کر جیسے کیمونسٹ کارکنوں نے بمبئی سے متصل ضلع تھانہ کے امبر گاؤں اور دہانو تعلقوں کے استحصال کے شکار اور پس ماندہ ورلی قبائلیوں کے درمیان رہنا شروع کر دیا تھا۔ ان دونوں نے جنگل کے ٹھیکیداروں، بیوپاروں، ساہو کاروں اور باہر کے زمینداروں کے خلاف بہت کامیاب تحریکیں چلائیں۔ ان کی لڑائی، بندھوا مزدوری، وٹھ یا وٹھی (بیگار)، نیز فصل، درختوں اور گھاس کی کٹائی کی بہت کم اجرت کے خلاف تھی۔

تبھاگا

ستمبر 1946 میں بنگال کی صوبائی کسان سبھا نے بٹائی داروں (برگ داروں، بھاگ چاسیوں، یا ادھیاروں) کو فصل کے نصف یا اس سے بھی کم کی جگہ پر دو تہائی حصہ (تبھاگا) دینے سے متعلق فلاؤڈ کمیشن کی سفارش پر عمل درآمد کے لیے عوامی تحریک کے ذریعے مطالبہ کیا۔ بیشتر تشدد پسند طلبا کے بشمول، کیمونسٹ کارکنان نے برگ داروں کو منظم کرنے کے لیے دیہی علاقوں کا رخ کر لیا تھا۔ یہ برگ دار (بٹائی دار) خشک سالی (قحط) یا زبردست مندے کی وجہ سے اپنی زمینوں سے محروم ہو چکے تھے اور بٹائی پر کھیتی کرنے کے لیے مجبور ہو گئے تھے۔ بعض علاقوں میں پوری آبادی میں ان کا تناسب 60 فی صد سے بھی زیادہ تھا۔ یہ علاقے تبھاگا لوگوں کا مضبوط گڑھ بن گئے تھے۔ نومبر میں فصل کی کٹائی کے وقت سے اس تحریک میں بڑی تیزی سے شدت آنی شروع ہو گئی تھی اور مرکزی نعرہ یہ تھا کہ "نج۔ کھمارے دھان تولو"۔ بٹائی دار دھان کے بوجھ جوت دار کے گھر کی بجائے اپنے اپنے کھلیان میں لے گئے تھے تا کہ تبھاگا کے مطالبے کو منوا سکیں۔ اس تحریک کا سارا زور شمالی بنگال میں اور خاص طور پر ضلع دیناجپور کی ٹھاکر گاؤں تحصیل، نیز متصل علاقوں جلپائی گوڑی، رنگ پور اور مالدہ میں رہا تھا۔ تبھاگا تحریک کے اثرات میمن سنگھ (کشور گنج)، مدناپور (ماہی سندل، ست ہٹا، اور نندی گرام) اور 24 پرگنہ (کاک دیپ) میں بھی محسوس کیے گئے تھے جب کہ شمالی میمن سنگھ کے ہاجنگوں نے جو کہ 38-1937 میں پیداوار لگان کم کرانے میں کامیاب ہو چکے

تھے، اسے نقد ادائیگی میں تبدیل کرنے کا مطالبہ کیا تاکہ بڑھی ہوئی قیمتوں سے فائدہ اٹھا سکیں۔
شمالی بنگال کا علاقہ موٹے طور پر راج بنسیوں کا گڑھ تھا جو کہ اصلاً قبائلی تھے اور نچلی ذات سے تعلق رکھتے تھے اور جن کی غالب اکثریت ادھیاروں (بٹائی داروں) پر مشتمل تھی۔ ان میں چند بڑے جوت دار بھی شامل تھے جن کی طبقے کی بنیاد پر قائم تنظیم نے سنسکریتانے کی اس سابقہ تحریک کو بے اثر کر دیا تھا جس کے ذریعے راج بنسی خود کو چھتری کا درجہ دینے لگے تھے (چنانچہ کیونسٹ روپ نرائن نے 1946 میں کانگریس نیز چھتری سمتی کے امیدواروں کو شکست دے کر دیناج پور کی سیٹ جیت لی تھی)۔ تبھاگا علاقوں میں مسلمانوں کا بھی قابل لحاظ حصہ تھا، جب کہ کلکتہ اور نواکھالی میں حاجی محمد دانش، نعمت علی جیسے لیڈر اور چند ایسے مولوی بھی پیدا ہوئے جو جوت داروں کے ظلم و ستم کی مذمت کرتے ہوئے قرآن کا بھی حوالہ دیا کرتے تھے۔ بہر حال جنوب مشرقی بنگال اس تحریک سے قطعی لاتعلق رہا تھا۔ ان میں تپرا کا علاقہ بھی شامل تھا جو کہ اس سے پہلے پرانی کسان سبھا کا گڑھ رہ چکا تھا۔ جوت داروں اور پولس کی زیادتیوں کا مقابلہ لاٹھی بردار رضاکاروں کے ذریعے کرنے کی کوشش کی گئی۔ "یہ دیکھ کر نہ صرف حیرت ہوتی ہے بلکہ ترغیب بھی ملتی ہے کہ جو برگ دار (بٹائی دار) صدیوں سے بے زبان رہا تھا وہ اب اپنے ساتھیوں کے ساتھ کھیتوں سے اس طرح گزرتا ہے کہ ہر ایک کے کاندھے پر بندوق کے انداز میں لاٹھی ہوتی ہے اور ان کے آگے آگے ایک لال جھنڈا بھی لہراتا ہوا چلتا ہے۔ (اسٹیٹس مین مورخہ 19 مارچ 1947)۔

مگر لاٹھیاں بندوقوں کا کام نہیں کرتیں اور جب مسلم لیگ کی وزارت نے فروری 1947 سے بڑھتے ہوئے ظلم و ستم کو برابر کرنے کی غرض سے برگ دار بل (جو کہ 1950 سے پہلے قانون کی شکل اختیار نہیں کر سکا تھا اور قانون بن جانے کے بعد بھی اس پر مشکل سے ہی عمل در آمد ہو سکا تھا) کی شکل میں برگ داروں کی اشک شوئی کی کوشش کی تو تبھاگا تحریک ایک بحران سے گھر گئی جو بہت ہی تباہ کن ثابت ہوا۔ ہوا یہ کہ بالور گھاٹ میں پولس کے ساتھ ٹکراؤ میں 20 سنتھالی مارے گئے تھے۔ سنیل سین کے مطابق اس ٹکراؤ میں کل 49 کسان شہید ہوئے تھے۔ نئے حالات میں کچھ کسان خود کو ہتھیاروں سے مسلح کرنے کی تگ و دو میں تھے، جو کہ کیونسٹوں کے پاس نہیں تھے پھر یہ کہ کیونسٹوں نے بھرپور مسلح جدوجہد کے بارے میں بھی کبھی نہیں سوچا تھا۔ مزید یہ کہ سماجی اعتبار سے بھی کچھ اہم رکاوٹیں سامنے آنے لگی تھیں۔ مثلاً قبائلی عناصر زیادہ شدت پسندی پر زور دے رہے تھے اور ان میں جلپائی گوڑی ضلع کے دوارس علاقے کے چائے باغان کے کچھ قلی بھی شامل تھے، مگر متوسط اور نچلے طبقے کے کسانوں کی تائید کمزور پڑتی جا رہی تھی، جب کہ شمالی بنگال کے قصباتی علاقوں میں وہ پیشہ ور گروپ، جو کہ قومی تحریک کا ستون تھے، سخت مخالف تھے۔
ان پیشہ ور گروپوں میں بہت سے ایسے زمیندار بھی تھے جن کی زمینوں پر یہی برگ دار (بٹائی دار)

کاشت کرتے تھے۔ کیونسٹوں نے 28/مارچ کو عام ہڑتال کا منصوبہ بنایا تھا مگر یہ وہ زمانہ تھا جب بنگال کی تقسیم کے لیے ہندو مہاسبھا کی مہم زور پکڑتی جارہی تھی اور کلکتہ میں 27 مارچ سے فسادات کا سلسلہ پھر سے شروع ہو گیا تھا جس کے نتیجے میں شہری علاقوں میں تبھاگا تحریک کے لیے مؤثر ہمدردی کے سارے امکانات ختم ہو گئے تھے۔

Punnapra Vayalar

شمال مغربی ٹراونکور ریاست کی شیر تلائی ۔ الپئے۔ امبالا پوزا علاقوں میں 1946 تک کیونسٹوں کی ایک مضبوط بنیاد قائم ہو چکی تھی۔ ان علاقوں کے ناریل کے ریشے کی مصنوعات سے وابستہ ورکر، مچھیرے، دھان مزدور، اور زرعی مزدور مکمل طور پر کیونسٹوں کے زیر اثر آ چکے تھے۔ چونکہ چھوٹے شہروں کی صنعتوں اور زراعت پر مبنی پیشوں کے درمیان کافی قربت مکانی تھی، اس لیے مزدور۔کسان اتحاد کا فارمولا اس علاقے میں حقیقت کی شکل میں سامنے آیا اور اس علاقے میں ٹریڈ یونینیں اتنی زیادہ طاقت ور ہو گئی تھیں کہ ناریل کے ریشے کی مصنوعات کے کارخانوں میں بھرتی کے امور کو کنٹرول کرنے لگی تھیں بلکہ تنازعات کے حل کے لیے ثالثی عدالتوں کے قیام اور جولائی 1946 میں ایک ہڑتال کے بعد اپنی راشن دکانیں چلانے کا حق حاصل کرنے میں بھی کامیاب ہو گئی تھیں۔ بہر حال اس اثناء میں ایک طرف تو غذائی اجناس کی شدید قلت پیدا ہو گئی تھی اور دوسری طرف اس کے ساتھ ہی دیوان سی۔ پی راماسوامی ایر نے امریکی طرز کے ایک دستور کا اعلان کر دیا تھا جس میں اسمبلیوں کا انتخاب عام رائے دہی کے ذریعے کرنے اور ایک ایسی ایکزیکیٹیو کی بات کہی گئی تھی جو مہاراجہ کے ذریعے تشکیل دی جائے گی اور دیوان کی قیادت میں کام کرے گی۔ ان دونوں باتوں کی وجہ سے دھماکہ خیز سیاسی صورت حال پیدا ہو گئی تھی۔ ظاہر ہے کہ جاہ پسند دیوان ایک آزاد ٹراونکور ریاست کا خواب دیکھ رہا تھا جس کی باگ ڈور اس کے اپنے ہاتھ میں ہو گی۔ اس کا ارادہ یہ تھا کہ وہ اس کا اعلان جون 1947 میں کر دے گا۔ جہاں ریاستی کانگریس نے ابن الوقتی کا ثبوت دیا اور پٹم تھانو پلائی جیسے کچھ لیڈر تو اس سلسلے میں رام سوامی ایر کے ساتھ سودے بازی کے بھی حق میں تھے۔ مگر کیونسٹوں نے ایک زوردار عوامی تحریک شروع کر دی تھی۔ ان کا نعرہ تھا امریکن ماڈل۔ عربین کنال، یعنی امریکی ماڈل کو بحیرۂ عرب میں پھینک دو۔ ستمبر 1946 سے، ریاستی حکومت نے کیونسٹوں کے خلاف بھرپور مہم شروع کر دی تھی۔ الپئی علاقے کے کیونسٹوں اور ٹریڈ یونینوں کو بطور خاص اس مہم کا نشانہ بنایا گیا۔ جگہ جگہ پولس کیمپ قائم کئے گئے۔ بڑے پیمانے پر اندھادھند گرفتاریاں کی گئیں اور جیلوں میں اذیتیں دی گئیں۔ ورکروں نے کسی باغیانہ منصوبہ کی بجائے محض اپنے بچاؤ کے لیے کیمپ قائم کیے جہاں

مصیبت زدہ ورکر پناہ لیتے تھے اور رضاکار ان کی حفاظت کرتے تھے۔ ان رضاکاروں کو ابتدائی نوعیت کی فوجی تربیت دی گئی تھی۔ 22/اکتوبر سے الیپی۔ شیر تلائی علاقے میں عام ہڑتال شروع ہوئی اور دو دن بعد الیپی سے چار میل کے فاصلے پر واقع Pannapra پولس کیمپ پر حملہ ہوا جو کسی حد تک کامیاب رہا تھا۔ زبردست پولس فائرنگ کے باوجود بھی بھالے اور برچھے لیے ہوئے رضاکار آگے ہی بڑھتے گئے تھے۔ اس کے لیے انھیں پولس سے دو بدو لڑنا بھی پڑا تھا۔ نو رائفلیں چھین لی گئی تھیں یہ دوسری بات ہے کہ ان رائفلوں سے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا جاسکا تھا۔ 25/اکتوبر کو مارشل لا نافذ کر دیا گیا تھا اور 27/ تاریخ کو شیر تلائی کے قریب واقع دیالار میں رضاکاروں کے سب سے بڑے ٹھکانے پر آرمی نے کافی خون خرابہ کے بعد حملہ کر دیا تھا۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق اس مختصر مگر خونین شورش میں تقریباً 800 مارے گئے تھے۔ اس قتل عام کی وجہ سے دیوان اور کانگریس کے درمیان اتحاد قائم نہیں ہو سکا، بلکہ اگلے سال کانگریس نے کافی احتیاط پسندی سے کام لیتے ہوئے "عوامی تحریک کی بجائے محض دباؤ کے ہتھکنڈے سے کام لیتے ہوئے ریاست ٹراونکور کا الحاق ہندوستان کے ساتھ کر دیا تھا۔ کانگریس کا دباؤ کا ہتھکنڈا اس لیے کامیاب رہا تھا کہ دیوان راما سوامی ایر کو یہ احساس ہو گیا تھا کہ پُرامن خود سپردگی سے کام نہ لینے کا متبادل پر تشدد انقلاب ہی ہو سکتا تھا۔ اس لحاظ سے پناپرا۔ دیالار شورش تقسیم میں رکاوٹ ثابت ہو کر ہندوستان کے ساتھ ٹراونکور الحاق کا باعث ہوئی۔ جہاں تک کمیونسٹوں کا تعلق ہے، بھاری مصائب کا سامنا کرنے اور وقتی طور پر ناکامی کا منہ دیکھنے کے باوجود پناپرا۔ دیالار کی شورش تمام تر جرأت مندانہ اور بہادرانہ شہادت سے عبارت تھی اور اس کی نشان دہی کیرالہ میں 1957 سے کمیونسٹ وزارتوں سے بھی ہوتی ہے کیونکہ کمیونسٹ وزراء وزارت کی ذمہ داری قبول کرنے سے پہلے ان دونوں دیہاتوں میں حاضری دینا فریضہ سمجھتے ہیں۔

تلنگانہ

جہاں سمھاگا نیز پناپرا۔ دیالار جدوجہد مسلح جدوجہد کی شکل اختیار کر گئی تھی، مگر اس سے آگے نہیں بڑھ سکی تھی، جولائی 1946 اور اکتوبر 1951 کی درمیانی مدت میں تلنگانہ تحریک کسانوں کی سب سے بڑی چھاپہ مار جنگ کی شکل اختیار کر گئی تھی جس کی جدید ہندوستان کی تاریخ میں کوئی مثال نہیں ملتی۔ شباب کے زمانے میں تقریباً 3000 گاؤں اس چھاپہ مار جنگ سے متاثر ہوئے تھے۔ یہ تحریک 16.000 مربع میل رقبے میں پھیلی ہوئی تھی جس میں 30 لاکھ لوگ ملوث رہے تھے۔ آصف جاہی نظاموں کے دور اقتدار میں حیدر آباد میں بھاری اکثریت والے ہندوؤں (تلگو، مراٹھی اور کنڑ لسانی گروہوں) پر ایک چھوٹے سے اعلا طبقاتی گروہ (اردو بولنے والے

مسلمانوں) کا غلبہ تھا، جہاں شہری اور سیاسی آزادی نام کی کوئی چیز نہیں تھی اور پوری ریاست میں اور خاص طور پر تلنگانہ خطے میں جہاں کہ مسلمان اور اونچی ذات کے ہندو دیش کھ (جو کہ لگان کی وصولی کرتے کرتے زمیندار بن بیٹھے تھے) اور جاگیر دار نچلی ذات والوں، قبائلی کسانوں اور بندھوا مزدوروں سے یا تو بیگار لیا کرتے تھے یا معمولی سی اجرت پر کام کر لیا کرتے تھے۔ اس طرح پورا تلنگانہ خطہ جاگیر دارانہ استحصال کی تصویر بن کر رہ گیا تھا۔ دوراؤں (آقاؤں۔ زمینداروں) کے ذریعے زمینوں پر ناجائز قبضے کی وجہ سے کسانوں کی حالت مندے (کساد بازاری) کے وقت سے خستہ ہوتی جارہی تھی۔ تھماگایا اس سے بھی کہیں زیادہ ٹرانکور کے قطعی بر خلاف، کیمونسٹوں کی قیادت میں زرعی بغاوت کا سلسلہ ستمبر 1948 میں انڈین آرمی کے پہونچنے تک جاری رہا تھا، نظام اور اس کے رضاکار دستوں کے خلاف قومی جدوجہد آزادی سے شہری مسلم آبادی نہ صرف الگ تھلگ رہی تھی بلکہ مقابلے پر صف آراء بھی رہی تھی اور ان میں محنت کش طبقے کا ایک حلقہ بھی شامل تھا۔ ایک دوسری فیصلہ کن بات یہ رہی تھی کہ ریاست میں اسلحہ ایکٹ کا نفاذ کافی ڈھیلے ڈھالے طریقے پر کیا گیا تھا، جب کہ برطانوی ہند میں اسلحہ ایکٹ پر سختی سے پابندی کرائی جاتی تھی۔ چنانچہ ریاست حیدر آباد میں "دیسی ساخت کی اور توڑے کی بندوقیں کھلے عام دستیاب اور استعمال میں تھیں" ستمبر 1948 تک ہتھیاروں کی خریداری کے لیے رقوم مدراس کے پڑوسی آندھرا اضلاع میں کھلے عام اکٹھا کی جاتی تھیں۔ وجہ یہ تھی کہ کانگریس کے بشمول سبھی گروپ رضاکاروں اور مسلم غلبے والی ایک آزاد مسلم ریاست کے قیام کے لیے نظام کی کوششوں کی مزاحمت کرنا چاہتے تھے۔ سندریا کے مطابق صرف وجے واڑہ میں ہی تین دن میں 20,000 روپے اکٹھا ہوئے تھے (پی۔ سندریا۔ تلنگانہ پیوپلز اسٹرگل اینڈ اٹس لیسنز، کلکتہ 1972، صفحہ 2,7,9,40)۔

کیمونسٹوں نے زمانۂ جنگ میں آندھرا مہاسبھا کے وسیلے سے تلنگانہ میں کافی اثر قائم کر لیا تھا اور زمانہ جنگ کی جبری وصولیوں، راشن کارڈ کے غلط استعمال، بہت زیادہ لگان اور وَٹھی (بیگار) جیسے امور کے سلسلے میں مقامی نوعیت کی متعدد تحریکوں کی قیادت کر چکے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ اس شورش کا سلسلہ 4/جولائی 1946 سے اس وقت شروع ہوا تھا جب تلنگانہ کے سب سے بڑے اور ظالم زمیندار (40,000 ایکڑ زمین کے مالک) وسنور کے دیش کھ کے غنڈوں نے نلگونڈا کے جن گاؤں تعلقہ میں گاؤں کے ایک شدت پسند شخص ڈوڈی کماریا کو قتل کر دیا تھا۔ ڈوڈی کماریا کا جرم یہ تھا کہ وہ ایک غریب دھوبن کی زمین کو بچانے کی کوشش کر رہا تھا۔ ابتداء میں نلگونڈا کے جن گاؤں، سراپیٹ اور حضور نگر تعلقے مزاحمت کا مرکز تھے مگر تحریک جلد ہی پڑوس کے وارنگل اور کریم نگر اضلاع تک بھی پھیل گئی۔ کسانوں نے گاؤں سنگھوں کی شکل میں منظم ہو کر لاٹھیوں، پتھروں اور پسی ہوئی مرچ سے مسلح ہو کر تحریک میں حصہ لینا شروع کر دیا تھا۔ ظالمانہ کارروائیوں میں شدت

آجانے پر 1947 کے اوائل سے مسلح چھاپہ مار دستوں کی تشکیل شروع ہو گئی تھی۔ 100 یا 120 رضاکاروں پر مشتمل یہ چھاپہ مار دستے تھوڑی بہت تربیت بھی حاصل کرتے تھے۔ تحریک کے شباب کے زمانے میں گاؤں دفاعی رضاکاروں کی تعداد 10.000 اور باقاعدہ چھاپہ ماروں کی تعداد 2000 تک پہونچ گئی تھی۔ اس جدوجہد کا سب سے زیادہ زور اگست 1947 اور ستمبر 1948 کے درمیانی مدت میں رہا جس میں کیونسٹوں نے نظام کے خلاف کانگریسی لیڈروں کے نعروں کا نہ صرف یہ کہ بڑی چابکدستی سے استعمال کیا بلکہ ان کو زیادہ سے زیادہ انقلابی آہنگ بھی دیا۔ واضح رہے کہ نظام کے خلاف یہ کانگریسی لیڈر کیونسٹوں کے برخلاریاست حیدر آباد سے باہر ہندوستانی سرزمین پر ہی سرگرم تھے۔ بہر حال مالیہ کے افسران کے استعفے سے متعلق کانگریسی لیڈروں کے نعرے کو کیونسٹوں نے مال گزاری اور لگان کے رکارڈوں کو تباہ کر دینے کے نعرے میں تبدیل کر دیا تھا۔ ستمبر 1948 میں پولس ایکشن کے موقع پر کیونسٹوں کو ان کے دشمن بھی "چکاتی دورالو" (رات کے بادشاہ) مانتے تھے۔ چھاپہ ماروں کے کنٹرول والے گاؤں میں بیگار (وٹی) اور بندھوا مزدور ناپید ہو گئے تھے۔ زرعی مزدوروں کی اجرتوں میں اضافہ کر دیا گیا تھا، ناجائز طریقے پر قبضہ کی گئی زمینوں کو ان کے سابقہ کسان جوت داروں کو لوٹادیا گیا تھا، بیکار زمینوں، نیز خشک کھیتی والی 100 ایکڑ زمینوں اور بارانی کھیتی والی 10 ایکڑ زمینوں (حدبندی کی یہ زیادہ سطح اس لیے رکھی گئی تھی کہ خوش حال کسان ناراض نہ ہو جائیں، حالانکہ یہ سطح بھی بعد میں کانگریسی حکومت کے ذریعے طے کی گئی سطح سے کہیں کم تھی) کی حدبندی کے علاوہ زمینوں کو پھر سے تقسیم کرنے کے لیے قدم اٹھایا گیا۔ مسلح جدوجہد کی ایک سرکردہ شخصیت، سندریا نے آزاد کرائے گئے علاقوں میں زندگی کی واضح اور اثرانگیز تصویر کشی کی ہے اور آبپاشی کے وسائل کو بہتر بنانے اور ملیریا کے خلاف جدوجہد کے اقدامات، کسانوں کے باہمی اور گھریلو تنازعات کو مصالحت کے ذریعے طے کرانے، عورتوں کی حالت میں بہتری، چھوت چھات میں کمی اور انقلابی روایات کی توسیع کے لیے لوک گیتوں اور ڈراموں کے استعمال کا بھی تفصیل سے ذکر کیا ہے۔

بہر حال ستمبر 1948 کے بعد حالات بڑی تیزی سے تبدیل ہو گئے۔ بلکہ واقعہ تو یہ ہے کہ بہت سے قصبوں میں پولس ایکشن کا اصل مقصد کیونسٹوں کی پیش قدمی کو روکنا تھا، ورنہ دہلی کی حکومت اور خاص طور پر سردار پٹیل تو نظام کے ساتھ معاملہ کرنے کے خواہش مند تھے۔ "مجھے حیرت ہے کہ آخر حکومت ہند نظام کے سلسلے میں نامناسب نرمی سے کیوں کام لے رہی ہے۔" یہ الفاظ ریاستی کانگریس کے لیڈر سوامی رامانند تیرتھ کے تھے (میموریز آف حیدر آباد فریڈم اسٹرگل صفحہ 190)۔ رضاکاروں کا قلع قمع ہو جانے کے نتیجے میں چھاپہ ماروں کے پاس کافی اسلحہ آگیا تھا۔ مگر اب انھیں کہیں زیادہ بہتر طریقے پر مسلح اور باقاعدہ ہندوستانی آرمی کا سامنا تھا۔ پھر یہ کہ تازہ

تازہ آزادی حاصل کرنے والے ہندوستان کی حکومت کو اکھاڑ پھینکنے کا نعرہ بھی اس سے پہلے کے نظام مخالف نعرے کے مقابلے میں بہت کم کشش رکھتا تھا جیسا کہ بعد میں خود کیونسٹوں کو بھی احساس ہو گیا تھا۔ دانش مندی کی بات یہ ہوتی کہ 1948 کے بعد اس جدو جہد کو صرف زرعی اصلاح تک ہی محدود رکھا جاتا۔ روی نارائین ریڈی جیسے کچھ لوگوں کا یہ کہنا ہے کہ انڈین آرمی کے طلب کر لیے جانے کے بعد بھی چھاپہ مار جنگ کو جاری رکھنا ایک بھاری غلطی تھی (سندریا، صفحہ 121.122.135روی نارائن ریڈی۔ ہیروئک تلنگانہ، نئی دہلی، 1973، صفحہ 60)۔ کیونسٹ خوش حال کسانوں کی تائید سے بھی کافی جلد ہی محروم ہو گئے تھے اور زور دار نیز بے رحمانہ فوجی کارروائی کی وجہ سے انھیں نلگونڈا، وارنگل اور کھمام کے میدانی علاقوں سے راہ فرار اختیار کر کے کرشنادریا کے جنوب میں نلا ملائی کے گھنے جنگلوں کا رخ کرنا پڑا تھا۔ ان جنگلوں نیز گوداوری کے شمال مشرق کے خطوں میں آباد چینچو اور کویا قبائل کو محکمہ جنگلات کے افسروں کے چنگل سے نجات دلا کر اور مہاجنوں کی زیادتیوں سے چھٹکارا دلا کر چھاپہ ماروں نے ان علاقوں میں اپنے لیے مضبوط ٹھکانے پیدا کر لیے تھے؛ لیکن 1950-51 کے آتے آتے یہ چھاپہ مار کارروائی گھٹتے گھٹتے انفرادی نوعیت کے حملوں اور قتل وغارت گری کی شکل اختیار کر گئی تھی، اندرون خانہ زبردست سیاسی اختلافات بھی پیدا ہو گئے تھے اور سب سے بڑا مسئلہ بقاء کا پیدا ہو گیا تھا۔ یہ ایک دلچسپ بات ہے کہ تلنگانہ چھاپہ ماروں کا آخری ٹھکانہ گوداوری کے جنگلاتی علاقوں میں رہا تھا جہاں کہ الوری سیتا رام راجو ایک نسل قبل چھاپہ مار جنگ لڑ چکے تھے۔

ہزیمت کے باوجود بھی کیونسٹوں کو بعد کے چند برسوں تک بھی بھاری تائید حاصل رہی تھی، کیونکہ 1952 میں نلگونڈا اور وارنگل سے تمام اسمبلی سیٹیں یہ کیونسٹ ہی جیتے تھے اور روی نارائن ریڈی تو نہرو سے بھی کہیں زیادہ اکثریت سے پارلیمنٹ کے لیے چنے گئے تھے۔ تلنگانہ تحریک کی بالواسطہ یا راست کامیابیاں کم اہم نہیں تھیں۔ ان کسان چھاپہ ماروں نے ہندوستان کی سب سے بڑی ریاست کے شخصی اور جاگیر دارانہ نظام کا خاتمہ کر دیا تھا۔ انھوں نے یہ کامیابی صورت حال کو جوں کا توں رکھنے کے لیے سردار پٹیل اور وی۔ پی مینن کے نومبر 1947 کے معاہدے کو ناکام بنا کر حاصل کی تھی۔ ریاست حیدر آباد کے خاتمے سے ہی چند سال بعد لسانی بنیاد پر آندھرا پردیش کی تشکیل کے لیے راہ صاف ہو پائی تھی۔

اس طرح یہ تحریک اس علاقے میں قومی جدو جہد آزادی کے ایک اہم نصب العین کی تکمیل کا بھی باعث ہوئی تھی۔ اس کے علاوہ خود کسانوں کو بھی کچھ اہم فائدے ہوئے۔ ویٹی (بیگار) کو پھر سے چلن نہیں دیا جا سکا، از سر نو تقسیم کی گئی ساری زمین یوں ہی رائیگاں نہیں گئی، کانگریس حکومت کو جاگیر داری نظام کے خاتمے کے لیے اقدام کرنا پڑا تھا اور زمین کی ملکیت کی حد

قائم کرنی پڑی تھی۔ قابل ذکر بات تو یہ بھی ہے کہ ونوبا بھاوے کی بھودان تحریک بھی تلنگانہ سے ہی شروع ہوئی تھی۔ یہ درست ہے کہ جزوی نوعیت کے ان فوائد کی وجہ سے تلنگانہ کے خوش حال کسان 1950 کی دہائی کے وسط سے سیاسی اعتبار سے قدامت پرست ہوتے چلے گئے تھے؛ مگر یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جس کا سامنا کسانوں کی بیشتر انقلابی تحریکوں کو کرنا پڑا ہے۔

1947: آزادی اور تقسیم

سماجی انقلابی تحریکیں، جن کا تلنگانہ تحریک نقطۂ عروج تھی، کبھی بھی ملک گیر سطح پر ایک منظم اور موثر سیاسی متبادل کی شکل اختیار نہیں کر سکیں۔ بہر حال ان تحریکوں کے ذریعے سامنے آنے والے خدشات کے ہی نتیجے میں حتمی سودے بازی ہو سکی تھی اور ملک کی تقسیم نیز زبردست فرقہ وارانہ تباہی و بربادی کے بدلے میں اقتدار کی "پرامن" منتقلی عمل میں آپائی تھی۔ سینئر بیورو کریٹ وی۔ پی۔ مینن نے جنھوں نے آگے چل کر 48-1947 میں پٹیل کے معتمد نیز واویل اور پھر بعد میں ماؤنٹ بیٹن کے بھروسے مند صلاح کار کی حیثیت میں کلیدی رول ادا کیا، 1947 کے اوائل میں ہڑتالوں کی لہر کے دوران وائسرائے کو یہ رپورٹ دی تھی کہ "کانگریس لیڈر عوامی مقبولیت کھوتے جا رہے ہیں...... کانگریس کے اندر کچھ شدید قسم کی مشکلیں پیدا ہو گئی ہیں، بائیں بازو کا خطرہ بڑھتا جا رہا ہے، محنت کش طبقے کی طرف سے لاحق خطرہ بھی ہے" اس کے ایک ہفتے کے بعد واویل کے جرنل میں پٹیل کے ساتھ ایک گفتگو کا ذکر اس طرح کیا گیا تھا۔ "کمیونسٹوں کے خطرے کے بارے میں بات ہوئی تھی۔ میں نے یہ تاثر لیا ہے کہ وہ "کمیونسٹ پارٹی کو خلاف قانون قرار دیدیں گے"۔ یہ ایک ایسی خواہش تھی جسے وزیر داخلہ نے آزادی کے چند ہی ماہ بعد مارچ 1948 میں پورا کر دکھایا تھا (وائسرائے کے جرنل اندراجات بابت 9/ اور 15/ جنوری 1947، صفحہ 408,411)۔ اس وقت حکومت برطانیہ نے بھی ایک ڈرامائی اعلان کرنے میں بڑی تیزی دکھائی تھی جب فروری 1947 میں لیگ نے دستور ساز اسمبلی میں حصہ لینے اور کابینہ کے کاموں میں تعاون سے انکار کر دیا تھا اور ایک بڑا سیاسی بحران پیدا ہو گیا تھا کیونکہ کانگریس نے بھی لیگی وزیروں کے استعفے کا مطالبہ کرتے ہوئے یہ دھمکی بھی دینی شروع کر دی تھی کہ وہ خود بھی عبوری حکومت سے الگ ہو پائے گی۔ ان باتوں کا تعلق دراصل 20/ فروری 1947 کو دارالعوام میں لارڈ اٹلی کے اس مشہور اعلان سے تھا جس میں اقتدار کی منتقلی کے لیے جون 1948 آخری میعاد طے کی گئی تھی۔ اس اعلان میں یہ بھی کہا گیا تھا کہ اگر اس میعاد کے اندر اندر کسی ایک دستور پر ہندوستانیوں میں اتفاق رائے نہ ہوا تو بھی حکومت برطانیہ اقتدار سے دست بردار ہو جائے گی خواہ اس کی شکل یہ ہو کہ پورے برطانوی ہند میں ایک مرکزی حکومت ہو، یا پھر یہ کہ کچھ علاقوں میں

موجودہ صوبائی حکومتوں کو ہی برقرار رکھا جائے یا پھر کوئی ایسی شکل ہو جو کہ ہندوستانی عوام کے لیے سب سے زیادہ معقول پسندانہ اور ان کے بہترین مفاد میں سمجھی جائے"۔ اقتدار کی منتقلی کے ساتھ ہی ریاستوں (راجواڑوں) کے تئیں انگریزوں کے اختیارات اور ذمہ داریاں بھی ختم ہو جائیں گی: لیکن یہ اختیارات برطانوی ہند میں قائم ہونے والی کسی بھی جانشیں حکومت کو منتقل نہیں ہوں گے" اس اعلان میں ملک کی تقسیم یا ریاستوں کی شکل میں تقسیم در تقسیم کا اشارہ بالکل واضح تھا مگر ایک طے شدہ مدت کے اندر اقتدار کی مکمل منتقلی کی ترغیب اتنی زبردست تھی کہ اس سے بچنا مشکل ہی ناممکن بھی تھا: خاص طور پر اس لیے بھی کہ بصورت دیگر کانگریس ایک دوسرے عوامی ٹکراؤ کا شکار ہو جاتی جو فرقہ وارانہ فسادات کے لحاظ سے کہیں زیادہ سنگین اور کمیونسٹ لہر کے لحاظ سے کہیں زیادہ خطرناک ہوتا۔ برطانوی وزیر اعظم نے اپنی اس تقریر میں واویل کی جگہ پر ماؤنٹ بیٹن کو وائسرائے بنائے جانے کا بھی اعلان کیا تھا۔

ماؤنٹ بیٹن کا منصوبہ

ماؤنٹ بیٹن کی شخصیت کے ارد گرد ایک طرح کا عقیدت مندانہ جال سا بن دیا گیا ہے: مشہور زمانہ صحافتی تصنیف "Freedum at Midnight" میں، بلکہ برطانیہ اور خود ہندوستان کے کچھ حلقوں میں بھی ماؤنٹ بیٹن کو ایک ایسے سحر آفریں اور عظیم مدبر کی شکل میں پیش کیا گیا ہے جس نے برصغیر کے مسائل کو فوجی صلابت، ذاتی خصوصیات اور ہوشیاری سے کم سے کم وقت میں حل کر دیا تھا۔ ظاہر ہے کہ یہ ایک محض مبالغہ آرائی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اگر واویل اور دوسرے وائسرائے کے مقابلے میں ماؤنٹ بیٹن نے فیصلہ کن قدم اٹھانے یا فیصلے کرنے میں زیادہ تیزی دکھائی تو اس کی وجہ یہ تھی کہ برطانوی حکومت نے ماؤنٹ بیٹن کو موقع پر ہی اہم فیصلے لینے کا اختیار دیدیا تھا۔ پھر یہ کہ اس کے پس پشت یہ عامل بھی کار فرما تھا کہ انگریز ہندوستان کو جلد از جلد خیر باد کہنے کا فیصلہ بھی کر چکے تھے، کیونکہ دوسری صورت میں جیسا کہ دار العوام میں اٹلی کے بیان کے موقع پر کرپس نے بھی واضح کر دیا تھا کہ "انگریزوں کو بھرپور جبر و تشدد سے کام لینا پڑے گا اور ہندوستان میں برسوں انگریزی فوج بھی رکھنی پڑے گی، جس کی اجازت انگریز عوام افرادی قوت کی قلت کے پیش نظر کبھی نہیں دیں گے۔" اور پھر یہ کہ "......یہ بات قومی اور بین الاقوامی نقطۂ نظر سے بھی ناقابل عمل ثابت ہو گی" اور " ہندوستان میں ساری ہی پارٹیاں ہماری سخت مخالف ہو جائیں گی" (محولہ، وی پی۔ مینن ٹرانسفر آف پاور ان انڈیا، صفحہ 346)۔ واویل ستمبر 1946 میں اپنے بریک ڈاؤن منصوبے کے حتمی مسودے میں 31 مارچ 1948 تک انگریزوں کی مکمل واپسی کا مشورہ دے چکا تھا۔ (وائسرائے جرنل، صفحہ 344) ماؤنٹ بیٹن کے ذمہ داریاں سنبھالنے سے

پہلے ہی یہ واضح ہو چکا تھا کہ تقسیم کے ساتھ آزادی کے فارمولے کو تسلیم کر لیا جائے گا۔ نئے سیاسی ڈھانچے کے سلسلے میں دستور ساز اسمبلی کے اتفاق رائے کی شرط کو نظر انداز کرتے ہوئے محض ڈومینین درجے کی بنیاد پر (جس میں کہ علاقوں کو علاحدگی کا حق بھی حاصل ہو) اقتدار کی منتقلی کی تجویز سکریٹری آف اسٹیٹ کو ماؤنٹ بیٹن کی بجائے وی۔پی۔ مینن نے جنوری 1947 میں پیش کی تھی۔ خاص بات یہ ہے کہ نجی طور پر پٹیل نے بھی اس تجویز سے اتفاق کر لیا تھا حالانکہ یہ تجویز 1929 کی لاہور قرارداد کے قطعی منافی تھی۔ اس تجویز کے حق میں یہ دلیل دی گئی تھی کہ ڈومنی ان (Dominion) حیثیت سے اقتدار کی پرامن اور جلد منتقلی عمل میں آئے گی۔ ہندوستان کو برطانیہ میں بہت سے بااثر دوست مل جائیں گے اور کچھ انگریزوں کو افسر شاہی اور آرمی میں برقرار رہنے دیا جائے گا" (مینن، صفحہ 364-363)۔ خطرناک تیز رفتاری کے ساتھ اقتدار کی منتقلی ایک حد تک ماؤنٹ بٹن کی وجہ سے بھی عمل میں آئی، مگر اس جلد بازی کی وجہ سے تقسیم کی تفصیلات کے تعین میں کئی خامیاں بھی رہ گئی تھیں اور پنجاب میں نسل کشی کو روکا نہیں جا سکا تھا۔ بہر حال پینڈرل مون کے اس بیان سے اتفاق کرنا پڑتا ہے کہ ہندوستان سے ہماری واپسی کے طریقہ کار کے بارے میں ماؤنٹ بیٹن کا دعوا بے بنیاد معلوم ہوتا ہے۔(Devide and Quit p-283)۔

24/ مارچ سے 6/ مئی تک کی درمیانی مدت میں ہندوستانی لیڈروں کے ساتھ 133 ملاقاتوں کے بعد ماؤنٹ بیٹن نے یہ فیصلہ کیا کہ کینٹ مشن کا تیار کردہ خاکہ ناقابل مدافعت ہو اور ''منصوبۂ بلقان'' کے ایک رمزیہ نام سے ایک متبادل فارمولہ تیار کیا۔ اس منصوبے میں علاحدہ شدہ صوبوں کو (یا اقتدار کی منتقلی سے قبل قائم ہونے والی کنفیڈریشنوں کو) اقتدار منتقل کرنے کی بات کہی گئی تھی؛ اس طرح کہ پنجاب اور بنگال کی صوبائی اسمبلیوں کو اپنے اپنے صوبوں کی تقسیم کے لیے رائے دینے کا اختیار حاصل ہوگا، اور اس طرح تشکیل پانے والی مختلف اکائیوں نیز انگریزوں کے اقتدار اعلا کے خاتمے کے نتیجے میں آزاد ہونے والے رجواڑوں کو ہندوستان یا پاکستان کے ساتھ الحاق یا دونوں سے الگ رہنے کا حق حاصل ہوگا۔ جب 10/ مئی کو شملہ میں ماؤنٹ بیٹن نے اس فارمولے کے بارے میں نہرو کو بتایا اور انھوں نے اس پر شدید رد عمل ظاہر کیا تو اس فارمولے کو ترک کر دیا گیا۔ اور اس کی جگہ پر ڈومنی ان حیثیت کی بنیاد پر ہندوستان اور پاکستان کی حکومتوں کو اقتدار کی منتقلی سے متعلق وی۔پی مینن اور پٹیل کی تجویز کو اختیار کر لیا گیا۔ کانگریس، لیگ اور سکھوں کے لیڈروں نے اس تجویز کو 2/ جون کو تسلیم کر لیا جس کا اعلان اگلے ہی روز کر دیا گیا۔ اس فارمولے کو آزادی ہند ایکٹ کی بنیاد کی حیثیت حاصل ہو گئی۔ اس ایکٹ کو برطانوی پارلیمنٹ اور تاج برطانیہ نے 18/ جولائی کو منظوری دی اور ایکٹ 15 اگست کو عمل میں آ گیا۔ خود ماؤنٹ بیٹن اور ان کے مداحوں نے اس فیصلے کی خوب ستائش کی ہے کہ انھوں نے اپنا فارمولا پہلے ہی نجی طور پر

نہرو کو دکھادیا تھا؛ مگر اصل سوال یہ ہے کہ کیا محض نہرو کی مخالفت پر ہی ماؤنٹ بیٹن نے اپنا دہ فارمولا واپس لے لیا تھا جس پر انگریز افسروں نے ہفتوں محنت کی تھی۔ تاہم اس سے کانگریس کی مضبوط پوزیشن اور اس کی طاقت کا انکشاف ہوتا ہے جسے کانگریسی لیڈر اقتدار کے جلد اور پرامن حصول کی خواہش کی وجہ سے بروئے کار لانے میں ناکام رہے۔ بہر حال یہ درست ہے کہ نہرو نے تقسیم در تقسیم کے ذریعے ہندوستان میں بہت سی چھوٹی چھوٹی ماتحت ریاستوں کے قیام کے ذریعے شمالی آئرلینڈ جیسا مسئلہ پیدا کرنے کے سامراجی ارادوں کو بالکل ٹھیک بھانپ لیا تھا۔ مگر اس کے متبادل کے طور پر جو راستہ اختیار کیا گیا اس سے چند دلچسپ غیر فرقہ وارانہ علاقائی امکانات پر روک لگ گئی۔ مثلاً بنگال میں لیگ کے اندر ایک بڑا تناسب ایسے لوگوں کا بھی تھا جو دور دراز کے پنجاب کی ماتحتی قبول کرنے کے لیے ہرگز تیار نہیں تھے۔ چنانچہ سہروردی اور ابوالہاشم نے تو ایک متحدہ آزاد بنگال کا منصوبہ بھی پیش کیا تھا جس پر سرت بوس جیسے چند اہم کانگریسی لیڈر بھی غور کرنے کے لیے تیار معلوم ہوتے تھے۔ اسی طرح شمالی مغربی سرحدی صوبے میں بھی ایک آزادی پٹھان ریاست کی تشکیل کے لیے مطالبہ کیا جارہا تھا اور خان عبدالغفار خاں کی قیادت میں مقامی کانگریسی لیڈروں کا خیال یہ تھا کہ صوبے کو پاکستان میں شامل کرنے کے لیے لیگ کی کوششوں کو اسی طرح کے نعروں سے ناکام کیا جاسکتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ ہندو اکثریت کے صوبوں میں مسلم مخالف فسادات کے نتیجے میں ہندوستانی قوم پرستی کے ساتھ یگانگت کے پرانے احساس کو شدید دھکا پہونچ چکا تھا۔ 3/جون کے منصوبے سے اس طرح کی باتوں پر روک لگ گئی اور صوبائی اسمبلیوں کو ہندوستان اور پاکسان میں سے کسی ایک کے ساتھ الحاق کے لیے مجبور کر دیا گیا۔ یہاں یہ بدیہی نتیجہ سامنے آتا ہے کہ کانگریسی قیادت نے 1947 میں ان پٹھانوں کے احساس کو بری طرح مجروح کر دیا تھا جو 1920 کی دہائی سے ہی قومی تحریک کی کھل کر تائید کرتے آئے تھے۔ اگرچہ اس وقت کی صوبۂ سرحد کی اسمبلی میں کانگریس کو ہی اکثریت حاصل تھی اور اس نے دستور ساز اسمبلی میں شمولیت کے حق میں رائے بھی دی تھی مگر اس کے باوجود بھی اس صوبے کو ہندوستان اور پاکستان میں سے کسی ایک کے ساتھ الحاق کے لیے رائے شماری میں حصہ لینے کے لیے مجبور کر دیا گیا تھا۔ اس پر کانگریس نے احتجاج تو کیا مگر اس طرح مخالفت نہیں کی جس طرح کہ نہرو نے "بلقان پلان" کی کی تھی، اور نہ ہی عام رائے وہی پر ہی اصرار کیا یہاں تک کہ آزاد پختونستان کا اختیار بھی رائے شماری میں شامل کرنے کے لیے کانگریس نے کوئی زور نہیں دیا۔ آخر کار صوبۂ سرحد کی کانگریس نے احتجاج کے طور پر رائے شماری کے بائیکاٹ کا فیصلہ کیا اور اس طرح ووٹروں کی محض 50.99 فیصد اکثریت سے ہی صوبۂ سرحد پاکستان کے نام لکھ دیا گیا، اس رائے شماری میں ایک بہت ہی محدود انتخابیہ (572,798 ووٹروں، کل آبادی کے 9.52 فی صد) نے حصہ لیا تھا۔ بعد میں سرحدی

گاندھی نے حق بجانب طور پر یہ اعلان کیا تھا کہ کانگریسی قیادت نے انھیں اور ان کی تحریک کو "بھیڑیوں" کے حوالے کر دیا۔

ریاستوں کا الحاق

انگریزی اقتدار اعلا کے انحطاط کے ساتھ ساتھ رجواڑوں کے مستقبل کا سوال بھی کافی اہمیت اختیار کرتا جا رہا تھا۔ بیشتر ریاستی حکمراں یان کے جاہ پسند دیوان (حیدر آباد، بھوپال، ٹراونکور) ایک ایسی آزادی کا خواب دیکھ رہے تھے جس میں اُن کی شخصی حکمرانی حسب سابق برقرار رہے گی اور ان حکمرانوں کی اس طرح کی امیدوں کو گورنمنٹ آف انڈیا کے پولیٹیکل ڈپارٹمنٹ کے سربراہ کونارڈ کورفیلڈ کے زمانے میں اس وقت تک کافی تقویت ملتی گئی تھی جب تک کہ ماؤنٹ بیٹن نے ایک زیادہ حقیقت پسندانہ پالیسی کا نفاذ نہیں کر دیا تھا۔ اس اثناء میں 47-1946 میں ان رجواڑوں میں عوامی تحریکوں کا ایک نیا سلسلہ بھی شروع ہو گیا تھا اور ہر جگہ سیاسی حقوق اور دستور ساز اسمبلی میں انتخابی نمائندگی کا مطالبہ کیا جا رہا تھا اور بعض مقامات پر سماجی اعتبار سے قابل لحاظ انتہا پسندی پر روک لگائی جا رہی تھی؛ جیسا کہ ہم حیدر آباد اور ٹراونکور کے سلسلے میں ذکر کر چکے ہیں۔ کانگریس نے کیبنٹ مشن کے منصوبے میں ریاستوں سے منتخب ممبروں کی عدم شمولیت پر نکتہ چینی کی۔ نہرو نے آل انڈیا اسٹیٹس پیوپلز کانفرنس کے اُدے پور اور گوالیار اجلاس (دسمبر 1945 اور اپریل 1947) کی صدارت کی تھی اور گوالیار میں یہ اعلان کیا تھا کہ جو ریاستیں دستور ساز اسمبلی میں حصہ لینے سے انکار کریں گی انھیں دشمن سمجھا جائے گا۔ مگر اس طرح کی زبانی دھمکیوں اور جمع خرچ سے قطع نظر، کانگریسی قیادت نے اور خاص طور پر پٹیل نے، جنھوں نے جولائی 1947 میں پولیٹیکل ڈپارٹمنٹ کی جگہ پر نئے محکمے، اسٹیٹس ڈپارٹمنٹ کا چارج لے لیا تھا، وی۔ پی مینن کے ساتھ مل کر جو کہ اس نئے محکمے کے سکریٹری بنائے گئے تھے، اس صورت حال سے پارٹی کے معیاری طریقہ کار سے عہدہ برآ ہونے کی کوشش کی، یعنی راجاؤں، مہاراجاؤں سے رعایتیں حاصل کرنے کے لیے ایک طرف تو عوامی تحریکوں کو دباؤ کے طور پر استعمال کیا اور دوسری طرف ان تحریکوں کو محدود رکھنے کی بھی کوشش کی بلکہ راجاؤں، مہاراجاؤں سے اپنی بات منوا لینے کے بعد ان تحریکوں کو دبانے کے لیے طاقت کا استعمال بھی کیا، جیسا کہ حیدر آباد میں کیا گیا۔ اس طرح کی وضع کا اشارہ پہلے ہی 1946 میں کشمیر میں مل چکا تھا۔ جب 20 مئی کو مسلم اکثریت والی ریاست کے ہندو اور مطلق العنان مہاراجہ کے خلاف نیشنل کانفرنس کی 'کشمیر چھوڑو' تحریک کی قیادت کرتے ہوئے شیخ عبداللہ کو گرفتار کر لیا گیا تھا تو شروع میں نہرو کشمیری لیڈر کی تائید میں ہی سری نگر پہونچے تھے اور ریاست میں اپنے داخلے پر پابندی کی خلاف ورزی کے جرم میں 20 جون کو کچھ دیر کے لیے گرفتار

بھی کر لیے گئے تھے۔ مگر پٹیل نے واویل کو یہ یقین دہانی کرائی تھی کہ "نہرو وہاں ان کی مرضی کے خلاف گئے تھے" (واویل۔ پٹیل ملاقات، 27/جون 1946)۔ اس کے ساتھ ہی پٹیل نے بہت جلد کشمیر کے وزیر اعظم کاک کے ساتھ گفت و شنید بھی شروع کر دی تھی جس کے نتیجے میں ہی مہاراجہ نے اکتوبر 1947 کے پاکستانی حملے کے بعد ہندوستان کے ساتھ الحاق کیا تھا۔ نئے اسٹیٹس (States) ڈپارٹمنٹ کے سربراہ کی حیثیت میں پٹیل اور مینن کے تقرر کی خبر پر بھوپال کے نواب نے یہ کہا تھا کہ "اس سے تو ریاستوں سے متعلق سارا نظریہ ہی تبدیل ہو جاتا ہے" اور 5/جولائی 1947 کو پٹیل نے رجواڑوں کو یہ یقین دلایا تھا کہ ...... کانگریس رجواڑہ نظام کی ہرگز دشمن نہیں ہے۔ البتہ کانگریس ان راجواڑوں اور ان کی رعایا کی خوشی اور خوش حالی کی متمنی ہے (وی۔ پی۔ مینن، دی اسٹوری آف دی انٹگریشن آف انڈین اسٹیٹس، صفحہ 96)۔

ہندوستانی ریاستوں کے الحاق کا عمل دو مرحلوں میں پورا ہوا، اس طرح کہ ان دونوں ہی مرحلوں میں ترغیبات اور عوامی دباؤ کی دھمکیوں کا سلسلہ ایک ساتھ جاری رہا تھا۔ 15/اگست 1947 تک کشمیر، حیدر آباد اور جونا گڑھ کے علاوہ باقی تمام ریاستیں ہند کے ساتھ الحاق کے معاہدے پر دستخط کے لیے تیار ہو گئی تھیں (جب کہ بھاول پور جیسی کچھ ریاستیں پاکستان کے ساتھ الحاق کا فیصلہ کر چکی تھیں) اور دفاع، امور خارجہ اور مواصلات کے سلسلے میں مرکزی اختیارات کو تسلیم کر چکی تھیں۔ رجواڑے ان کے لیے بڑی آسانی سے رضامند ہو گئے تھے کیونکہ اس طرح وہ انھیں اختیارات سے 'دست بردار' ہو رہے تھے جو انھیں کبھی حاصل ہی نہیں رہے تھے (کیونکہ یہ تینوں محکمے ہمیشہ تاج برطانیہ کے اقتدار اعلا کے ماتحت ہی رہے تھے)، اور دوسرے یہ کہ داخلی سیاسی ڈھانچے میں کوئی تبدیلی نہیں کی گئی تھی۔ صوبوں کے اڑوس پڑوس میں واقع ریاستوں کے الحاق، یا کاٹھیاواڑ یونین، وندھیایا مدھیہ پردیش، راجستھان یا ہماچل پردیش جیسی نئی اکائیوں کی تشکیل اور اپنی پرانی سرحدوں کو چند برسوں تک برقرار رکھنے والی ریاستوں (حیدر آباد، میسور، ٹراونکور، کوچین) کی داخلی دستوری تبدیلیوں کے ساتھ الحاق کے مشکل عمل کو بھی ایک سال کی مدت میں ہی پورا کر لیا گیا۔ اس سلسلے میں جو سب سے اہم ترغیب دی گئی تھی وہ فراخ دلانہ خصوصی مراعات کی شکل میں تھی جب کہ کچھ مہاراجاؤں کو گورنر یا راج پرکھ بھی بنایا گیا تھا۔ اس میں شک نہیں کہ ہندوستان کو بڑی تیزی کے ساتھ وحدانی شکل دیدینا سردار پٹیل کا سب سے بڑا کارنامہ ہے مگر ہمیں یہ ہرگز فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ اس سلسلے میں عوامی دباؤ نے بھی قابل لحاظ رول ادا کیا۔ چنانچہ اڑیسہ میں نیلگری، ڈھینکنال اور تلچر جیسی ریاستوں میں پرجامنڈل (اور قبائلی) تحریک کی وجہ سے ہی ان ریاستوں کے ضدی راجاؤں کی بنائی ہوئی مشرقی ریاستی یونین دسمبر 1947 میں ٹوٹ گئی تھی۔ کاٹھیاواڑ میں ریاست جوناگڈھ کے مسلم حکمراں نے پاکستان کے ساتھ الحاق کرنا چاہا تھا مگر

زبردست عوامی تحریک اور پھر پولس ایکشن پر اسے ہتھیار ڈالنے پڑے تھے۔ کانگریس نے، جو کہ 1930 کی دہائی سے ہی میسور میں کافی مضبوط پوزیشن میں تھی، ستمبر 1947 میں اپنے ہی طور پر 'میسور چلو، تحریک شروع کی تھی جس کے نتیجے میں حکمراں کو 12/ اکتوبر تک جمہوری سمت میں اہم سیاسی تبدیلیاں کرنی پڑی تھیں۔ اسی طرح وی پی مینن نے "کیمونسٹ خطرے' کی نشان دہی کر کے ٹراونکور کے دیوان سی۔ پی راماسوامی ایر کو "امریکی ماڈل" پر ذاتی اقتدار کو برقرار رکھنے کا خواب نہ دیکھنے کے لیے راضی کر لیا تھا (ایضا، صفحہ 111)۔ جہاں تلنگانہ کی مسلح جدوجہد نے نظام کو کمزور کر دیا تھا وہیں وہ فوجی مداخلت کا ایک اہم سبب بھی ثابت ہوئی تھی"...... ہمارا پہلا کام رضاکاروں کا قلع قمع کرنا ہونا چاہیے...... ہمارا دوسرا کام، اہمیت کے لحاظ سے نہیں بلکہ اس لحاظ سے کہ تمام مقاصد ایک ساتھ ہی حاصل کرنے کی کوشش نہیں کی جا سکتی تھی، کیمونسٹوں کو حد میں رکھنا بلکہ ان کی بیخ کنی کرنا تھا"۔
(وی۔ پی، مینن اور فوجی گورنر جے۔ این چودھری کی بات چیت، ایضا صفحہ 362)۔

انگریزوں کی حکمرانی کے آخری ڈھائی مہینوں میں ماؤنٹ بیٹن کے منصوبے پر عمل درآمد کی تفصیلات بڑی تیز رفتاری سے طے کی گئیں، کیونکہ اب پنجاب کے ہندو سیاسی لیڈر اور سکھ نیز بنگال کے ہندو سیاسی لیڈر اب مسلم لیگ سے بھی بڑھ چڑھ کر تقسیم کے علمبردار ہو گئے تھے جسے پینڈریل مون نے اس طرح بیان کیا ہے کہ "تقریباً سبھی اتفاق رائے کے ساتھ اس راستے پر چل پڑے تھے جو قتل عام کی طرف جاتا تھا" (صفحہ 70)۔ جیسا کہ عام توقع تھی، بنگال اور پنجاب کی صوبائی اسمبلیوں کے اقلیتی ممبروں نے، جنھیں علاحدہ میٹنگ کرنے کا حق دیا گیا تھا، تقسیم کے حق میں ووٹ دیا؛ سندھ اسمبلی نے پاکستان کے ساتھ جانے کا فیصلہ کیا اور مسلم لیگ آسام کے مسلم اکثریت کے ضلع سلہٹ میں (موجودہ محدود رائے دہی کی بنیاد پر) کرائی گئی رائے شماری میں کامیاب رہی تھی۔ ایک بار پھر خطرناک جلد بازی کا مظاہرہ کرتے ہوئے دو کمیشنوں نے ایک برطانوی وکیل کی سرکردگی میں سرحدوں کا تعین کیا اور اس سلسلے میں مقامی نوعیت کی تفصیلات تک کو نظر انداز کر دیا گیا تھا اور اس کی وجہ یہ تھی کہ ان دونوں کمیشنوں کے سربراہ ریڈکلف (Radcliffe) کو ہندوستانی حالات اور جغرافیہ کی ذرا بھی شدبد نہیں تھی۔ فرقہ وارانہ پہلوؤں کے ساتھ ساتھ بعض معاشی اور حکمتی (Strategic) پہلوؤں کو بھی ملحوظ رکھنے کی کوشش کے نتیجے میں کئی خامیاں رہ گئیں: مسلمانوں نے پنجاب میں گرداس پور اور بنگال میں مرشد آباد، ندیا نیز کلکتہ کے ہاتھ سے نکل جانے پر اعتراض اور احتجاج کیا، جب کہ سکھوں اور ہندوؤں کو لاہور نیز کینال کالونیوں، کھلنا اور چٹاگانگ کے پہاڑی خطوں کے نقصان پر ملال تھا۔ بہر حال یہ سارا احتجاج قطعی نیم دلی کے ساتھ کیا گیا تھا کیونکہ اقتدار بھوکوں کے لیے کانگریس اور مسلم لیگ کسی بھی قسم کی رکاوٹ کی اجازت دینے کیلیے ہرگز تیار نہیں تھی۔ ماؤنٹ بیٹن نے نئی ہندوستانی

ڈومنی ان کے گورنر جنرل طور پر کام کرنے کی کانگریس کی درخواست کو قبول کرلیا؛ ماؤنٹ بیٹن کو پاکستان میں بھی اس طرح کا عہدہ قبول کرنے سے روک دیا گیا کیونکہ وہاں خود جناح اس کے خواہش مند تھے۔

پندرہ اگست

اس طرح اس برصغیر پر آزادی کا سورج طلوع ہوا، اور مجاہدین آزادی کے خوابوں کے لحاظ سے یہ آزادی بہت سے لوگوں کے لیے گمراہ بھی ثابت ہوئی۔ وجہ یہ ہے کہ ہندوستان میں بہت سے مسلمانوں اور پاکستان میں بہت سے ہندوؤں کے نزدیک تقسیم کے جلو میں حاصل ہونے والی آزادی کا مطلب برسوں یہ رہا تھا کہ انھیں یا تو اچانک پھوٹ پڑنے والے تشدد کے خطرات کے سائے میں زندگی گزارنی ہوگی اور روزگار و معیشت کے مواقع سے محروم رہنا ہوگا، یا پھر اپنی صدیوں پرانی جڑوں سے اکھڑ کر پناہ گزینوں کے کارواں در کارواں میں شامل ہونا ہوگا، ایک ایسا عظیم انسانی المیہ جس کی بہت پراثر عکاسی بلراج ساہنی کی آخری فلم "گرم ہوا" میں کی گئی ہے۔ ایک دوسری سطح، پر جسے کہ مکمل طور پر غیر متعلق بھی نہیں کہا جاسکتا، وہ معاشی اور سماجی تضادات جو کہ سامراج کے خلاف عوامی تحریک کی جڑوں میں پیوست تھے، دور نہیں کیے جاسکے تھے کیونکہ شہروں اور دیہی علاقوں کے مراعات یافتہ گروپ سیاسی آزادی کے حصول کو انتہا پسندانہ سماجی تبدیلیوں کے تقاضے سے الگ رکھنے میں کامیاب رہے تھے۔ انگریز تو چلے گئے تھے مگر ان کی فروغ دی ہوئی افسر شاہی اور پولس میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی اور اس لیے وہ پہلے ہی کی طرح بلکہ اس سے بھی زیادہ استبداد سے کام لینے لگی تھی۔ زندگی کے ان آخری مہینوں میں جس طرح مہاتما کانگریس قیادت کے عام دھارے سے الگ تھلگ ہو گئے تھے اس کی وجہ محض فرقہ وارانہ فسادات ہی نہیں تھے۔ انھوں نے اپنے قتل کے موقع پر خبردار کیا تھا کہ ملک کو اپنے سات لاکھ گاؤوں کے لحاظ سے "ابھی سماجی، اخلاقی اور معاشی آزادی حاصل کرنی ہے" اور یہ کہ "کانگریس نے ایسے انتخابی حلقے پیدا کردیے ہیں جو بدعنوانی کی طرف لے جاتے ہیں...... اور عوامی نیز جمہوری ادارے محض نام کے ہیں" اور اسی لیے "کانگریس کو بہ حیثیت پارٹی کے تحلیل ہو جانا چاہئے اور اس کی جگہ پر بے اور ایثار و قربانی کے جذبے سے سرشار دیہی تعمیراتی ورکروں پر مشتمل "لوک سیوک سنگھ" بنائی جانی چاہیے (این۔ کے بوس، مائی ڈیز ود مہاتما 1953، صفحہ 305.307)۔ بہت سے عہد بستہ (Committed) قسم کے اشتراکیت پسندوں کے نزدیک بھی یہ آزادی ایک مذاق ہی تھی" رائل انڈین نیوی کے جنگی جہاز عیاری اور دغابازی سے غیر مسلح کردیے جانے کے بعد بندرگاہوں پر بالکل جامد کھڑے ہیں، نواکھالی، بہار، گڑھ مکتیشور میں ہندوؤں اور مسلمانوں کو تہ تیغ کردیے

جانے کے بعد ہی اتحاد نصیب ہوپاتا ہے" اور یہ کہ "نوجوانوں کا جوش و خروش عمر رسیدہ سیاست دانوں کے لیے محض عیاشی کا وسیلہ بن کر رہ گیا ہے۔ کل کے محبان وطن آزادی ملنے پر کس طرح اقتدار کے بھوکے ہو گئے تھے اس سلسلے میں یہ اگرچہ یہ ایک بہت ہی سخت تبصرہ معلوم ہوتا ہے مگر غلط بھی نہیں ہے۔(سمر سین)۔

بہر حال پورے برصغیر میں جن کروڑوں عوام نے آزادی کا جشن منایا، اور نہرو کی نصف شب کی تقریر پر سر دھنا اور جن کے لیے 15/اگست کا دن ایک ناقابل فراموش یاد بن کر رہ گیا، وہ بھی پوری طرح کسی واہمے کا شکار نہیں کہے جا سکتے۔ کیونسٹوں کو 1948-51 کی درمیانی مدت میں اپنے وجود کی قیمت پر یہ پتہ چلا کہ "یہ آزادی جھوٹی ہے" کے نعرے کا کسی نے کوئی اثر نہیں لیا تھا۔ ہندوستان کی یہ آزادی دراصل دنیا سے نو آبادیاتی نظام کے خاتمے کا نقطۂ آغاز تھی۔ یہ نو آبادیاتی نظام کم از کم سیاسی آزادی کے لحاظ سے اب تک ناقابل مزاحمت ثابت ہوا تھا۔ نہرو کی قیادت میں ہندوستان نے برطانیہ یا امریکہ کی کٹھ پتلی بننے کی بجائے اپنے لیے ایک قطعی آزاد خارجہ پالیسی کو فروغ دیا جو کہ اس وقت کے نادر تصور، ناوابستگی کے علاوہ سوشلسٹ ملکوں اور ابھرتی ہوئی تیسری دنیا کے ساتھ دوستانہ تعلقات پر مبنی تھی۔ جنوری 1950 میں وسیع تر جمہوری دستور نافذ کیا گیا جو کہ بہت سی کمیوں کے باوجود بھی برطانوی ہند کے آئینی اداروں کے مقابلے میں کہیں زیادہ ترقی یافتہ تھا، کیونکہ برطانوی ہند میں آخر تک عام رائے دہی معدوم رہی تھی۔ راجاؤں، نوابوں اور زمینداروں کو دھیرے دھیرے چلتا کیا، زمین پر حد بندی قائم کی گئی (جس پر شاذ و نادر ہی عمل ہوا)، لسانی بنیاد پر ریاستوں کی تشکیل نو کے خواب کو 1956 میں پورا کر لیا گیا، سرکاری سیکٹر کی منصوبہ بند ترقی کے ذریعے بنیادی صنعتوں کا سلسلہ شروع کیا گیا، غذائی پیداوار میں قابل لحاظ اضافہ کیا گیا جب کہ صدی کا پورا نصف اول فاقہ کشی کے حالات میں گزرا تھا۔ یہ سب کچھ اگست 1947 کی وجہ سے از خود نہیں ہو گیا، کیونکہ ان میں سے بیشتر کامیابیاں تلخ قسم کی عوامی تحریکوں کے ہی نتیجے میں حاصل ہو سکی تھیں، یہ دوسری بات ہے کہ اس کے لیے آزادی کا حصول ایک لازمی شرط تھی۔ بہر حال تضادات اب بھی، بلکہ پہلے سے کہیں زیادہ شدت کے ساتھ موجود ہیں جن کی جڑیں سرمایہ دارانہ ترقی میں پیوست ہیں۔ اس سرمایہ دارانہ ترقی کی وضع ہماری قومی تحریک پر بھی چھائی رہی کیونکہ ہمارا بورژوائی طبقہ قومی تحریک پر اپنی عمومی قیادت قائم کرنے اور برقرار رکھنے میں کامیاب رہا تھا۔

ہم نے اس طرح تاریخ ہند کی جن چھ دہائیوں کا جائزہ لیا ہے ان کی معنویت اور افادیت جدوجہد کے ذریعے تبدیلی کے اس پیچیدہ عمل کے لحاظ سے اور بھی بڑھ جاتی ہے جو ہنوز ناتمام ہے۔ اس سلسلے میں تاریخ اور اس کے تضادات کے تعلق سے ایک برطانوی مفکر کے تاثرات شاید

مناسب ترین لوحِ مزار کا کام کر سکتے ہیں۔

'......اس بات پر غور کیا کہ لوگ کس طرح جنگیں لڑتے ہیں اور ہار جاتے ہیں، اور جس چیز کے لیے وہ جنگ لڑ چکے ہوتے ہیں وہ ان کی شکست کے باوجود بھی حاصل ہو جاتی ہے لیکن جب وہ چیز سامنے آتی ہے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ وہ چیز ہرگز نہیں ہے جس کے لیے جنگ لڑی گئی تھی، اس لیے ان کے مقصود کے لیے دوسرے لوگ کسی دوسرے نام سے جنگ لڑتے ہیں "(ولیم مورس، اے ڈریم آف جان بال 1887)۔

اشاریہ

آبادی، 54، 130، 289

احترام نفس تحریک 180-81، 270

احمد، 276

احیاء پسندی: ہندو، 89، 93، 133-4 مسلم: 95-96

اردو۔ناگری تنازعہ، 98، 104

آرمی، 32-33، 440-41، 455-57

آریہ سماج، 92-95، 118، 147،

اڑیسہ: اور سول نافرمانی، 330 ہندوستان چھوڑو تحریک، 431

آزاد، ابوالکلام 164: 170، 448 :

آزاد ہند فوج، 440-41

آزاد ہند فوج، مقدمات، 450-51: اثرات: 455-56،

آسام، کسان تحریکیں 70-71؛ قلیوں کا انخلاء 241؛ عدم تعاون تحریک 241؛ سول نا فرمانی 330......؛ اور پاکستان 438، 447، 462، 483؛

اسلامی اتحاد (پان اسلام ازم)، 80، 97،

اشتراکی تحریکیں، ملاحظہ کیجئے کیمونسٹ تحریک، کانگریس سوشلسٹ پارٹی، کسان سبھا

آغاخان، 162-3

افغانستان پالیسی: 30-31، 122

افغانی، جمال الدین: 97

اکالی تحریک، 233-4، 253

اگرکر، جی۔جی: 99، 117

اگست پیش کش، 411

الور، 350

امبیڈکر: بی آر، 74، 269

انجمن ترقی پسند مصنفین، 343

انتہاپسندی، سر چشمے، 115-119؛ اعتدال پسندوں کی نکتہ چینی، 117،

سماجی بنیاد 129-30؛ رجحانات 132-5؛ بنگال (میں) 133-4، 145...

یوپی(میں)145 گجرات(میں) 146 ...: پنجاب146-9......
آندھر 130: تامل ناڈو149؛ مہاراشٹر (میں)152-5......؛
آندھرا: قبائلی تحریکیں63-4، کسان تحریکیں268؛ ذات پات کی تحریکیں 75: لسانی تحریکیں
150، 185؛ انتہا پسندی150، 237-9، 474-7......؛ عدم تعاون237؛ سول نافرمانی329؛ اشتراکی
تحریکیں396-7......؛
انڈین ایسوسی ایشن، 84، 107، 114
انڈین پیپلز تھیٹرز ایسوسی ایشن، 447
انڈین کونسلز ایکٹ1861، 28
انڈین کونسلز ایکٹ1892، 35-36
انڈین کونسلز ایکٹ1909، 161
آنند مٹھ؛ 101
انوشیلن سمتی، ڈھاکہ، 141
انوشیلن سمتی، کلکتہ، 144-5
انجانی تحریک، 89
ایکا تحریک، 249
اینگلو گروہ، 116
اینٹی سرکلر سوسائٹی، 135، 141
باردولی قرارداد، 250-51،
باردولی کسان تحریک، 178-9، 235-6، 255، 306-8، 326
بالشوک انقلاب، ہند میں اثرات؛ 200، 280-81
بائیکاٹ، 1905-8، 132، 135-6، 153؛ ترک موالات 231؛ سول نافرمانی 325-29؛
ببر، اکالی، 235
بٹائی دار، 71؛ 74-475
بجولیا کسان تحریک 178، 224، 235، 267
بہار گنج (با بیال) 69؛ 130، 133، 138، 141
برلا، جی، ڈی 194، 265-6، 310-12، 323، 338، 342-3، 375-8، 441
برما، انگریز پالیسی، 30-31
برہمو تحریک، 89، 94، 99

بسو، اشودی رام، 144، 146

بمبئی منصوبہ، 440-41

بمبئی شہر، محنت کش طبقہ 79، 154-5، 222-23؛ 235-36؛ روشن خیال طبقہ: 84-88،

فرقہ وارانہ فسادات 78، 99؛ 465؛ انتہاپسندی: 152-55؛ ترک موالات 235-6؛

سول نافرمانی 325-6؛ ہندوستان چھوڑو تحریک 423؛ بحری فوج کی بغاوت 455-57؛

بنارس، 335

بندے ماترم: 101، 334-6

بنرجی، اشونی کمار 139-40،

بنرجی، سسی پاد، 79۔

بنرجی، سریندر ناتھ، 36، 84، 107، 111، 115، 131-3

بنگال، روشن خیال طبقہ 84-85؛ کسان تحریکیں 68-70، 445-7، 475؛

سودیشی تحریک 132-44

......؛ عدم تعاون 242-45، 350؛ سول نافرمانی 331-332؛ ہندوستان چھوڑو 433-4

......؛ فرقہ پرستی 141-2؛ 258-62؛ 464-65، کمیونسٹ تحریکیں 235-6، 273-77،

298-303، 331، 359-64؛

بنگال معاہدہ، 258-9

بوس، سبھاش چندر، 244، 258-60، 270-1، 312، 314، 390، 397، 403، 404، 413، 444

بہار؛ قبائلی تحریکیں 63-65، 176؛ کسان تحریکیں 178، 205-6، 224-5؛ ذات پات 74-76؛

عدم تعاون 221؛ سول نافرمانی 333-4؛ ہندوستان چھوڑو تحریک 428-9؛

فرقہ پرستی 78، 178-9، 466؛ کمیونسٹ تحریکیں 361-2؛

بھگت سنگھ 297-8، 341

بیسنٹ اینی 92؛ 100

پابند مزدوری، 59؛ 110

پاکستان: تصور کی ابتداء 409-10؛ لاہور قرارداد 410-11؛

تحریک پاکستان 441-3؛ 471-2؛ 484-5؛ 489؛

پال، بپن چندر، 99؛ 102؛ 120؛ 133؛ 139

پٹیل، ولبھ بھائی 307-8؛ 344-5، 375-86؛ 457؛ 459-61؛

پرارتھنا سماج، 89؛ 94

پرجا تحریک، 179-80، 267؛

پریم چند، 248؛ 373-4؛

پنار پرا۔ ویالار، 477-8

پنجاب، آریہ سماج 93-94؛ زمین ایکٹ 123؛ انتہاپسندی 148-51؛

......؛ رولٹ ستیہ گرہ 211-16؛ ترک موالات 234-5؛ سول نافرمانی، 332-4؛

......؛ اکالی سیاست 233-9؛ فرقہ وارانہ فسادات 78؛ 469-1

پونا سارو جنک سبھا؛ 70-72؛ 107؛ 114

پٹر کے، وسودیو، 65-66

پہلی عالمی جنگ، ہند میں اثرات 191-201؛

پھولے، جیوتی با، 74؛ 102

پشاور، 317-18

تاریخ نگاری، رجحانات 20-27، 84-5؛ 115-6، 180-1؛ قوم پرستانہ 20-21؛ فرقہ وارانہ 20-21؛

......؛ کیمبرج مکتب فکر 22-23، 115؛ مارکسی 25؛

تامل ناڈو، انتہاپسندی 150-1؛ دہشت پسندی 151؛

ذات پاک کی تحریکات 74-76؛ ترک موالات 238؛ سول نافرمانی 239؛

تبھاگا تحریک، 475-6

تجارتی گروپ (ہندوستانی)، اور سرمایہ دارانہ ترقی 55-59؛ اور سماجی

اصلاح 81-؛ اور نوآبادیاتی حکومت 82؛ اور سودیشی تحریک 153؛

اور پہلی عالمی جنگ 194؛ اور عدم تعاون 226؛ اور سوراجی سیاست داں 256-7؛ 263-64؛

اور کساد بازاری 288-9؛ اور سول نافرمانی 315، 321-2، 324-5؛ اور

کانگریسی رجعت پسند گروپ 361؛ 375-9؛ اور کانگریسی وزارتیں 389-92؛

اور منصوبہ بندی 391-2؛ اور ہندوستان چھوڑو تحریک 424-؛ 428؛

اور دوسری عالمی جنگ 438-41؛ اور مابعد جنگ بحران 423-4؛

تعلیم، انگریزوں کی پالیسی، 125-6

تعلیم یافتہ طبقہ، بے روزگاری اور قوم پرستی 100-1؛

تعمیری، سودیشی، 110-11؛ 133-4

تعمیری کام، گاندھیائی، نوعیت، 256-7؛ 358-60

تقسیم بنگال، مقاصد، 120-7؛ مخالفانہ جدوجہد 127-146؛ فیصلے کی واپسی 165؛

تلک، بال گنگادھر، 36؛ 71؛ 75؛ 87؛ 92؛ 99؛ 102؛ 116؛ 119-20؛ 153-7؛

تلنگانہ، کسان بغاوت 478-82؛

ٹھاکرداس، پرشوتم داس، 265-6؛ 340-1؛ 356-7؛

تھیوسوفیکل تحریک، 90-92؛

ٹیگور، رابندر ناتھ، 70؛ 118؛ 129؛ 132؛ 134؛ 135؛ 143؛ 169؛ 217

جسٹس پارٹی، 75؛ 76؛ 181-1؛

جلیان والا باغ، 214

جناح، محمد علی 291-2؛ 375-6؛ 383-8؛ 409-12؛ 441-3؛ 471-2؛ 484-5،

جنگلاتی تحریکیں، 176-7؛ 237-8؛ 247-50؛

جنگلاتی قوانین، 109

جوت دار، 70؛ 257؛ 478-82

جوشی، پی، سی، 370؛ 477

جوشی، جی۔ وی، 99؛ 107

چپلنکر، وشنو کرشن، 92؛ 102

چٹاگانگ، اسلحہ خانہ پر حملہ 317

چٹوپادھیائے، بنکم چندر 103

چمپارن، کسان تحریک 177-79؛ 206-7

چوری، چورا، 229؛ 250-52

حسین، لیاقت 139؛ 142

حق، فضل 179؛ 385؛ 409-12؛

خارجہ پالیسی 30-2؛ 121-1؛

خان، سکندر حیات 410؛

خان، عبد الغفار 317-8؛ 485-6؛

خلیق الزماں، چودھری 175؛ 384؛ 410-11؛

خواتین، اور سماجی اصلاح کی تحریکات 89-90؛ 92-94؛ سول نافرمانی میں رول 320؛

......؛ دہشت پسندی میں رول 344-5؛

داس، چترنجن 174؛ 218؛ 220؛ 228؛ 243-8؛ 251-2؛

دت، اشونی کمار 118؛ 133؛ 141؛

دت، رومیش چندر 69؛ 82؛ 99
درشن آنند، سوامی 224؛ 232؛ 272؛
درمیانی لگان دار، اور بنگال کی سیاست، 2-130
دروز تحریک، 6-75؛ 2-181؛
دکن اگری کلچرسٹ ریلیف ایکٹ (1879)، 68؛
دکن ایجوکیشن سوسائٹی، 99؛ 116
دوسری عالمی جنگ، معاشی اثرات 415؛ 41-438
دوعملی حکومت، 188؛ 190
دھڑابندی، قومی تحریک میں رول، 25؛ 16-115؛ 132؛ ذات پات تحریک میں رول 81-180؛
دہشت پسندی، بنگال میں 116؛ 4-143؛ پنجاب میں 149؛ 164؛ مہاراشٹر میں 155؛
......؛ تامل ناڈو میں 152؛ بیرون ملک 8-166؛ 1-170
دیانند، سوامی (ملاحظہ کیجیے، آریہ سماج) 92؛ 100
دیوبند (Deoband) 95؛ 97؛ 71-169؛ 317
-
ڈان سوسائٹی، 118؛ 133؛ 138؛
ڈانگے، ایس اے، 224؛ 237؛ 9-274؛
ذات پات، ورن اور جاتی، 3-72؛ اور طبقہ 6-72؛ 5-180؛ اور نوآبادیاتی
نظام 73-72؛ حرکت پذیری 6-72؛ 84-179؛ 2-270 ذات پات کی تحریکات 6-72؛ 5-180؛ 270-26
......؛
راج گوپال آچاری، سی آر، 239؛ 421؛ 455
راجو، الوری سیتارام 206،
راجواڑوں میں عوامی تحریکات، کل ہند، 372؛ 401-397
کشمیر۔ 7-346؛ 354؛ 7-486؛
راجستھان۔ 8-177؛ 5-224؛ 8-267؛ 486
گجرات۔ 268؛ 398؛ اڑیسہ؛ 398؛ 487
حیدرآباد۔ 401-399؛ 82-478؛ میسور۔ 399؛ 488
تراونکور۔ 401؛ 8-477

راشٹریہ سویم سیوک سنگھ (آر ایس ایس)، 388؛ 446

رام چندر، بابا 191؛ 206؛ 226؛ 249

رام کرشن مشن، 91

راناڈے، مہادیو گوبند 89؛ 99؛ 102؛ 111؛

رائے، ایم این، 168؛ 200؛ 250؛ 274-5؛

رنگا، این جی 269؛ 370

رولٹ ستیہ گرہ 16-211؛

گجرات میں 17-216؛ بمبئی شہر میں 118-117؛ کلکتہ 217؛

مدراس 217؛ سی پی میں 216؛ 217

-

زراعت کی تجارت کاری 49-47؛

زرعی پیداوار، 90-285؛ 490

زرعی روابط، 52-49

زرعی مزدور، 52؛ 2-371؛ 8-477؛

زمیندار طبقہ، 70-68؛ 1-130؛

-

ساورکر، وی ڈی، 155؛ 166

سائمن بائیکاٹ تحریک، 290؛

ستیہ شودھک سماج، 75؛ 181؛ 185؛

سسمال، بیرندرناتھ، 244؛ 245؛ 259

سلیم اللہ (نواب ڈھاکہ) 4-162

سماجی اصلاحی تحریکات ہندوؤں کے مابین 90-89؛ 94-92؛ مسلمانوں کے مابین 97-95؛

سمیتیاں، سودیشی بنگال میں، 2-140

سناتن دھرم سبھائیں، 94-93؛

سنکرتیانا، 238؛ 306؛ 347

سوراج پارٹی، 4-253؛ 60-258

سورت، کانگریس میں تقسیم 8-156،

سول نافرمانی، 31-1930، کے مراحل 319؛ سماجی بناوٹ 319؛ 337؛

علاقائی اختلافات 325-36؛ صوبہ سرحد 317، بمبئی شہر 326-7؛
سندھ میں 327؛ گجرات میں 327؛ مہاراشٹر میں 328؛
وسطی صوبہ جات (سی پی) میں 328؛ کرناٹک 329؛ کیرالہ 330؛
تامل ناڈو 329؛ آندھرا میں 330؛ اڑیسہ 331؛ آسام میں 331؛
بنگال میں 332-3؛ پنجاب 333-4؛ بہار 334-5؛ یوپی میں 334؛
سول نافرمانی، 1932-34، استبدادی اقدامات 351-5؛ علاقائی
اختلافات 351-55؛

سید احمد خاں، 95-7؛ 113

سین گپتا، جے ایم، 244-5؛ 259؛

شردھانند، سوامی 92-3؛ 216؛

شری نرائن، گرو، 73؛

شملہ کانفرنس 450-2؛

شملہ وفد، 162؛

شولاپور، عوامی شرکت 318-9؛

شیواجی، تاویلات 102، شیواجی اتسو 135؛

—

صنعتی مزدور طبقہ، بھرتی 58؛ 79-80 شعور اور بیداری 79-81؛ مزدور طبقہ اور سودیشی تحریک 139-40؛ 154-6؛ مزدور طبقہ اور پہلی عالمی جنگ 197-9؛ 20 کی دہائی میں 272-5؛ 30 کی دہائی میں 319-22؛ ہندوستان چھوڑو تحریک میں 426-9؛

صوبہ جات متحدہ، عدم تعاون تحریک میں 248-50؛ سول نافرمانی تحریک میں، 335-7
......؛ ہندوستان چھوڑو تحریک میں 432-3؛ فرقہ وارانہ فسادات میں 78؛ 469-70
......؛ کسانوں کی تحریکوں میں 226-7؛ 247-8؛ 267-9؛

صوبہ سرحد، اور سول نافرمانی تحریک 317-8؛ 485؛ اور تقسیم 485؛

—

علی، شوکت علی 165؛ 171؛ 219؛ 236

علی، محمد، 171؛ 219؛

علی گڈھ تحریک، 95-96؛ اور مسلم لیگ 162-6؛ ینگ پارٹی 165؛

عدم تعاون، مختلف مراحل 228-30؛ سماجی بناوٹ 230-4؛ پنجاب میں 234-5؛

راجستھان میں 234؛ سندھ میں 236؛ گجرات میں 236؛ بمبئی شہر میں 236-7؛
مہاراشٹر میں 237؛ مدراس شہر 238؛
تامل ناڈو 238-9؛ آندھرا 239؛ آسام میں 242-3؛ بنگال 242-4؛
......؛ بہار میں 246-47؛ یوپی میں 248-50؛

--

غازی پور، 306؛ 429؛ 632
غدر، بحری فوج (RIN)؛ 458-60
غدر تحریک، 166-8؛
غیر براہمن تحریکات، 75-76؛ 186-7؛ 270-2؛
غیر ملکی سرمایہ مہاراشٹر میں 54-55؛ 391؛ 438-41؛

--

فرقہ واریت 77-81، تحفظ گاؤ سے متعلق فسادات 78؛ 80؛ 98-99؛ 179-80؛ سودیشی بنگال میں 142-6؛
1920 کی دہائی کے وسط میں بڑھاوا 260-4؛ اور کانگریسی وزارتیں 383-8؛ نیز ملاحظہ کیجئے: علی گڑھ تحریک، آریہ سماج، ہندو مہاسبھا، مسلم لیگ اور راشٹریہ سویم سیوک سنگھ،
فضل حسین، 292؛ 305؛
فیکٹری ایکٹس، 79؛ 106

--

قانون گو، ہیم چندر 134؛ 144-45
قبائلی تحریکیں، نوعیت 61-62؛ رمپا گوڈیم میں 63-64؛ بستر 176؛
کھونڈ قبائل 176؛ میور بھانج 176؛ برسامنڈا 63؛ 64؛
ناگا بھگت 177؛ منی پور 177؛ بھیل قبائل 177؛
ورلی قبائل 475؛ سول نافرمانی 328-31؛ انگریزوں کی لڑاؤ اور حکومت کرو پالیسی 177؛
قحط، 52-54؛ 438-9
قوم پرستانہ معاشی نظریہ، 104-6؛
قوم پرستی، اعلا طبقاتی تاویل 22؛ 85-6
قومی آمدنی، تخمینے 58-59؛ 131-2؛
قومی تعلیم؛ سودیشی بنگال میں 138، تحریک عدم تعاون میں 228؛

قومی منصوبہ بندی کمیٹی، 391-2؛
قیمتیں، 130-2؛ 193-4؛ 285—6

--

کارگو کلٹ، 67
کانگریس، انڈین نیشنل، قیام 83؛ 107-8؛ اجلاس 156-8؛ 217-18؛ 220-21،
نیز ملاحظہ کیجئے اعتدال پسند کانگریسی......، انتہا پسندی، ......؛
گاندھی......؛ ترک موالات......؛ سول نافرمانی......؛ ہندوستان چھوڑو......؛
اور کانگریسی وزارتیں......؛
کانگریسی وزارتیں، تشکیل 380-1؛ عام اثرات 381-2؛ اور افسر شاہی 383
......؛ اور فرقہ پرستی 383-8؛ اور گاندھیائی اصلاحات 388-9؛
اور کاروباری گروپ 389-92؛ اور منصوبہ بندی 391-2؛ اور
محنت کش طبقہ 392-3؛ اور کسان 394-5؛ اور کانگریس کے اندر
تفریق 401-6؛ استعفے 406؛
کانگریس سوشلسٹ پارٹی، 362-7
کرپس مشن، 416-20
کرزن 115-6، خارجہ پالیسی 121-2، انتظامی اصلاحات 122-5؛ اور کانگریس 125-6؛
اور بنگال کی تقسیم 126-7؛
کرشن ورما، شیام جی، 166
کرناٹک، سول نافرمانی 328-29؛ ہندوستان چھوڑو تحریک 435-6؛
کساد بازاری؛ ہندوستان پر اثرات 285-90؛ 323؛ 335؛
کسان تحریکات، نوعیتیں 68-72؛ اور فرقہ وارانہ تفریق 64-70؛ 179-80؛ آندھرا
میں 300؛ آسام 71؛ بنگال 68-70، بہار 225-6،
گجرات 71؛ کرناٹک 435؛ کیرالہ 414؛ مہاراشٹر 435-6،
اڑیسہ 434؛ پنجاب 433؛ راجستھان 268-9؛ صوبہ جات متحدہ 191؛ 226-7
......؛ نیز ملاحظہ کیجئے عدم تعاون تحریک، سول نافرمانی تحریک کسان سبھا وغیرہ وغیرہ۔
کشمیر نیشنل کانفرنس، 346-7؛ 354؛ 352؛ 487
کلکتہ؛ مزدور طبقہ 299-304؛ سودیشی تحریک 129؛ 132-33؛ عدم تعاون تحریک 243-4؛
سول نافرمانی تحریک 332؛ ہندوستان چھوڑو تحریک 426؛ فرقہ وارانہ فسادات 78

79-80؛ 179-80؛ 467-9؛
کمیونسٹ تحریک قیام 200؛ اور مزدور طبقہ 299-304؛ اور سول نافرمانی 319
......؛ اور متحدہ محاذ 362-7؛ اور عوام کی جنگ 445؛ اور
مابعد جنگ شورش 495-9؛ اور ثقافت 373؛ 446؛
کوکا، 99؛
کھیڑا، کسان تحریک 72؛ 218-20؛ خلافت تحریک 97؛ 218-20؛ نیز ملاحظہ کیجئے عدم تعاون
تحریک......؛
کیبنٹ مشن 7؛ 463،
کیرالہ، ذات پات کی تحریک 73-75؛ 184-5؛ سول نافرمانی تحریک 330؛
کسان تحریکیں 414؛ 475؛ کمیونسٹ تحریک 359-64؛ 68؛
کینال کالونیاں، 149-50

--

گاندھی، موہن داس کرم چند، 111؛ 167؛ 175؛ 179؛ اور جنوبی افریقہ 201-2؛ بنیادی تصورات
202-3؛ افواہیں 205؛ اور چمپارن 206؛ اور کھیڑا 208؛ احمد آباد 209
......برولٹ ستیہ گرہ 211-18؛ کانگریس پر قبضہ 218-20؛ عدم تعاون
تحریک 228-51؛ ہری جن 359-61؛ اور کانگریسی رجعت پسند 375-9؛
کانگریسی وزارتیں 381-2؛ ریاستوں کے عوام 397-401؛ تری پوری 404-5؛
انفرادی سول نافرمانی 412-9؛ کرپس مشن 416؛
ہندوستان چھوڑو تحریک 417-23؛ 1946-7 کے فسادات 472-9؛
تقسیم 472؛ 489-90؛
گاندھی-اروِن معاہدہ، 340-1؛ غیر واضح اثرات 342-3؛
گجرات، کسان تحریکیں 72؛ 178؛ عدم تعاون تحریک 225-6؛ سول نافرمانی تحریک 327؛
گرنی کامگار یونین، 275
گن پتی اتسو، 78
گنگولی، دوارکا ناتھ، 79؛ 107؛ 109؛
گوکھلے، جی کے، 36؛ 85؛ 87؛ 111
گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ، 367-8
گول میز کانفرنس، پہلی 338-9؛ دوسری ... 349؛

گھوش، اربندو، 36؛ 82؛ 112؛ 118؛

لاجپت رائے، لالہ 92-93؛ 99-100؛ 119؛ 147-50؛ 156-8؛ 234؛ 259

لڑاؤ اور حکومت کرو، برطانوی پالیسیاں 36-7؛ 159-61؛ دولت کا بہاؤ 41-44؛

اور قوم پرستی 104-106؛ 109؛ اور پہلی عالمی جنگ 109؛

لکھنؤ معاہدہ، 172-73

لنکاشائر ٹکسائلز، ہندوستان پر اثرات، 44-7؛ 79؛ 191-201؛ 285-6؛ 355-8؛

لیس۔ مودی معاہدہ، 357-8

سامراج مخالف لیگ؛ 382

--

مالویہ، مدن موہن مالویہ، 88؛ 146-7؛ 259؛ 262-3

مالیات، 33-34؛ 191-201

مائی لاپور گروہ؛ 116-7

ماؤنٹ بیٹن منصوبہ، 483-6

متحملانہ مزاحمت، انتہاپسندانہ شکل 120؛ 133-4؛

متر ادین بندھو، 101

مدراس مہاجن سبھا، 87؛ 115

مدناپور، ذات پات کی تحریکیں 76؛ کسان تحریکیں 244-7؛؛ دہشت پسندی 243-6؛

عدم تعاون......؛ سول نافرمانی 332-3؛

ہندوستان چھوڑو تحریک 423-4؛

مسلم لیگ، 161-6؛ 292-3؛ 384-8؛ 409؛

موپلا، بغاوتوں کا پس منظر 66-67؛ 19ویں صدی کی بغاوتیں 49-50؛ 1921 کی بغاوت 240-1،

مونٹیگو۔ چیمسفورڈ اصلاحات؛ 188-91

مہاراشٹر، کسان تحریکیں 65-66؛ 68؛ 270-2؛ 435-6؛ ذات پات 74-75؛ 103

؛ 180-5؛ 270-2؛

انتہاپسندی 119-20؛ 153-6؛ عدم تعاون 237؛ سول نافرمانی 328-9؛

ہندوستان چھوڑو 435-36؛ فرقہ واریت 97-98؛ 387-8؛ 445-6؛

مہتہ، فیروز شاہ، 88؛ 100؛ 107؛ 111؛ 116؛ 147

میک ڈونالڈ ایوارڈ، 349-50

میمن سنگھ، کسان تحریکیں، 69؛ 474-5؛ عدم تعاون 244-6؛ فرقہ وارانہ فسادات
142-3؛ 331-3؛
نارائن۔ جے پرکاش، 363؛ 375؛
ناروجی۔ دادابھائی، 82؛ 88؛ 99؛ 106؛ 109؛ 115؛
ناصنعت کاری؛ 44-47
نسل پرستی، سفید فام؛ 38-40؛
نمبودری پاد، ای ایم ایس 184-5؛ 371-2؛ 401
نوجوان بھارت سبھا، 298؛ 341
نہرو، جواہر لال، 175؛ 220؛ 227؛ 248؛ 281؛ 293؛ 295؛ 312-3؛
نہرو رپورٹ، 290-4؛
نہرو، موتی لال، 146؛ 220؛ 227؛ 253؛ 291؛ 342
واچا، دن شا، 87-88؛ 110-111؛ 153؛
ودیاساگر، ایشور چندر، 89؛ 94
ودیانند، سوامی 206؛ 226
وراسالنگم 89؛
وسطی صوبہ جات (سی پی)، عدم تعاون تحریک 238؛ سول نافرمانی 328؛
کانگریسی وزارت 383؛
وشوانند، سوامی، 206؛ 225
وطن پرستانہ ادب، بنگالی 101-2؛ 132؛ مراٹھی 102؛ ہندی 104؛ 248؛ 373؛
وفاق کے منصوبے، 283؛ 367-9؛
ونکپیا، کونڈا، 271؛
وہابی تحریک، 97
ویویکانند، 91؛ 92؛ 118؛ 129-30
ہاٹ کی لوٹ؛ 71؛ 199؛ 247؛
ہردیال، 167-68؛
ہری جن، 358-60؛ 388-9؛
ہندوستان چھوڑو تحریک، تحریک کا سرچشمہ 420-6؛ کل ہند وضع 426-29؛
سماجی بناوٹ 429؛ بہار میں 432؛ مشرقی یوپی میں 432؛

......؛ ناگپور 433؛ اڑیسہ 434؛ بمبئی پریزیڈنسی 435-6
......؛ انگریزوں پر اثرات 436-8؛ کانگریز پر اثرات 438؛
ہندوستان سوشلسٹ ری پبلک ایسوسی ایشن؛ 279؛ 297-8
ہندو مہا سبھا، 3-261؛ 2-291؛ 8-387؛ 1-400؛ 425-6
ہندو میلہ، 101؛
ہوم رول ایجی ٹیشن، 5-173؛
ہیوم، ایلن اوکٹوین، 8-107
یاجنک، اندولال 175؛ 2-371؛
ینگ پارٹی، 165؛ 173
یونیورسٹیز ایکٹ، (1904)؛ 127

قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان کی چند مطبوعات

نوٹ: طلبہ واساتذہ کے لیے خصوصی رعایت۔ تاجرانِ کتب کو حسبِ ضوابط کمیشن دیا جائے گا۔

شہیدانِ آزادی جلد اوّل

مصنف:
ڈاکٹر پی۔این۔چوپڑا
صفحات: 574
قیمت: -/113روپے

ریاست حیدرآباد میں جدّ وجہدِ آزادی

مصنف:
سیدّ محمد جوّاد رضوی
صفحات: 280
قیمت: -/72 روپے

تاریخ تمدن ہند

مصنف:
محمد مجیب
صفحات: 280
قیمت: -/72 روپے

جان کمپنی سے جمہوریہ تک جدید ہندستان کی کہانی

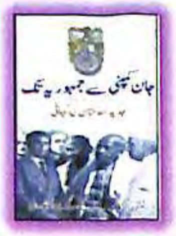

مصنف:
مشیرالحسن
صفحات: 345
قیمت: -/114روپے

ہندوستان کی معاشی تاریخ جلد اوّل

مصنف:
رمیش دت
صفحات: 436
قیمت:-/18.75 روپے

ہندوستان کی معاشی تاریخ جلد دوم

مصنف:
رمیش دت
صفحات: 615
قیمت: -/26 روپے

कौमी काउन्सिल बराए फरोग़-ए-उर्दू ज़बान
قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
National Council for Promotion of Urdu Language
West Block-1, R.K. Puram, New Delhi-110066